جاسوسی ڈائجسٹ کا تہلکہ خیز سلسلہ

آتش فشاں

حصہ 5

آتش فشاں

تحریر: اقبال کاظمی　　راوی: وجدان علی

ظلم وستم کے شعلوں میں جلنے والے ایک معصوم ذہن کی لرزہ خیز سرگزشت

وہ اپنے ماں باپ کے بہیمانہ قتل کا عینی شاھد تھا۔ اس کے سینے میں ایک قبرستان آباد تھا اور اس کا دماغ کسی آتش فشاں کی طرح ابل رہا تھا۔ اس کے شب و روز کی ہر کروٹ اس کے لئے نت نئے ہنگاموں کی پیامبر تھی۔ بے رحم و سفاک قاتل اسے بھی صفحۂ ہستی سے مٹا دینا چاھتے تھے۔ وہ اپنے دشمنوں کو خوب جانتا پہچانتا تھا لیکن ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا۔ اس کو ایسی پناہ گاہ کی تلاش تھی۔ جہاں وہ ان درندوں سے محفوظ رہ کر خود کو اتنا توانا و طاقت ور بناسکے کہ وہ اس کا بال بھی بیکا نہ کرسکیں۔ بالآخر قدرت اسے ایک ایسی جگہ لے گئی جہاں اس کی زندگی ایک نئے سانچے میں ڈھلنے والی تھی۔

ظلم وجبر کی فضا میں سانس لینے والے ایک معصوم بچے کی لرزہ خیز داستان

"میں ریسٹورنٹ چھوڑ کر اوپر آگیا اور یہ تصدیق ہوجانے کے بعد کہ وہ چاروں چوتھی منزل والے کمرے میں موجود ہیں' میں نے پولیس کو بلالیا اور جب اس کمرے کا دروازہ کھلوایا گیا تو لڑکی کے جسم پر لباس برائے نام ہی رہ گیا تھا اور وہ تینوں کھلونا سمجھ کر اس سے کھیل رہے تھے۔

"ان کے ساتھ مجھے بھی پولیس اسٹیشن جانا پڑا۔ ایک تھپڑ کھانے کے بعد لڑکی ہوش میں آگئی تھی۔ اس نے اپنی غلطی کا اعتراف کرلیا۔ ان دونوں میں سے ایک لڑکا اس کا کلاس فیلو تھا اور دوسرا اس کا دوست۔ وہ دونوں اسے ورغلا کرلے آئے تھے۔ اسے زبردستی شراب پلائی گئی۔ وہ اپنے حواس میں نہیں رہی کہ وہ دونوں اسے کہاں کہاں لیے پھرتے رہے۔ اسے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ اس ہوٹل کے کمرے میں کس طرح آئی تھی۔

"ہوش میں آنے کے بعد لڑکی نے ذلت و رسوائی کے خوف سے اپنے ماں باپ یا گھر والوں کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ تاہم اس کے کلاس فیلو سے معلوم ہوگیا کہ وہ ایک مہمان پنڈت کی بیٹی ہے۔ وہ منت سماجت کرنے لگی کہ اس کے باپ کو کچھ نہ بتایا جائے' اور اس نے گھر جانے سے بھی انکار کردیا۔ نجانے کیوں اس نے میرے ساتھ جانے کو ترجیح دی۔

"ان تینوں آدمیوں کو حوالات میں بند کردیا گیا اور میں لڑکی کو اپنی ضمانت پر اپنی حویلی لے آیا۔

"میں کوئی پارسا یا دیوتا نہیں ہوں لیکن اس لڑکی کے لیے میرے دل میں کوئی میل نہیں آیا۔ یہ دو دن میرے پاس رہی۔ میں اسے سمجھاتا رہا۔ دنیا کی اونچ نیچ سے آگاہ کرنے کی کوشش کرتا رہا۔

"دو دن بعد یہ چلی گئی اور کئی روز بعد ایک شام میرے ہوٹل آگئی۔ بہت دیر تک میرے پاس بیٹھی رہی اور پھر اس کے بعد ہماری دوستی ہوگئی۔ یہ کئی کئی روز تک میری حویلی میں رہ جاتی ہے۔ پنڈت جی نے اس سے کبھی نہیں پوچھا کہ یہ کہاں غائب رہتی ہے۔

"یہ اس مہمان پنڈت کی بیٹی ہے جس نے میرے خلاف بھی بہت زہر اگلا تھا۔ مجھے مسلموں کا پٹھو' دلال اور نجانے کیا کیا کہا تھا۔ اگر اسے معلوم ہوجائے کہ اس کی بیٹی کئی کئی روز تک میرے پاس رہتی ہے تو شاید وہ خودکشی کرلے۔" ٹھاکر

خاموش ہو کر بلا کی طرف دیکھنے لگا۔

میں نے بھی بلا کی طرف دیکھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ ٹھاکر کی باتوں کا برا مان گئی ہوگی لیکن اس کے چہرے پر ایسے کوئی تاثرات نظر نہیں آئے۔ اس کے برعکس اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ تھی۔

میں نے دیوار گیر گھڑی کی طرف دیکھا تو چونک گیا۔ رات کے تین بج رہے تھے۔ یہ تو غنیمت تھا کہ یہاں آنے کے تھوڑی دیر بعد ہی ٹھاکر نے ٹیلی فون پر جانکی اور روپ متی کو اطلاع دے دی تھی کہ ہم یہاں ہیں اور وہاں نہیں آئیں گے۔

"اچھا بھئی۔ میں تو چلا۔ نیند آرہی ہے۔" ٹھاکر اٹھتے ہوئے بولا "تم بھی اس کمرے میں جاکر سو جاؤ۔" اس نے یہ جملہ مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا اور ساتھ ہی ہال کی دوسری طرف ایک کمرے کی طرف اشارہ کردیا۔

"ہاں۔ نیند تو مجھے بھی آرہی ہے۔" میں بھی اٹھ گیا۔

میرا خیال تھا کہ میں ٹھاکر کو سہارا دے کر اس کے کمرے تک چھوڑ آؤں گا لیکن بلا نے مجھ سے پہلے ہی اٹھ کر اس کا بازو اپنے کندھوں پر رکھ لیا اور اپنا ایک بازو اس کی کمر میں حمائل کردیا اور اس طرح ٹھاکر کو سہارا دے کر اس کے کمرے کی طرف لے جانے لگی۔

میں چند لمحے ان کی طرف دیکھتا رہا پھر اسی کمرے میں آگیا جس کی نشان دہی ٹھاکر نے کی تھی۔

وہ بہت شان دار بیڈ روم تھا۔ میں نے ٹیوب لائٹ بجھا کر نائٹ بلب روشن کردیا اور بستر پر لیٹ گیا لیکن نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ میں کروٹ کے بل لیٹا بلا کے بارے میں سوچتا رہا۔

مجھے اس کمرے میں آئے ہوئے شاید آدھا گھنٹا ہوا تھا۔ میں سونے کی کوشش کررہا تھا لیکن بلا کا خیال کسی طرح ذہن سے نہیں نکل رہا تھا۔ کتنی حسین تھی وہ۔ کبھی تو اس کے بارے میں سوچتے ہوئے میرے دل میں گدگدی سی ہونے لگتی اور کبھی میں اداس ہوجاتا۔ وہ حالات کا شکار ہوئی تھی۔ اس کی شخصیت بکھر گئی تھی اور یہ بھی غنیمت تھا کہ اسے ٹھاکر بھانوت سنگھ جیسا دوست ملا تھا۔ اگر وہ ان بدمعاشوں کے ہتھے چڑھ جاتی تو آج وہ نہ ہوتی جو نظر آرہی تھی۔

میں یہ سب کچھ سوچ رہا تھا کہ "چٹ" کی ہلکی سی آواز کے ساتھ ہی کمرے میں تیز دودھیا روشنی بھر گئی۔ میں نے جلدی سے مڑ کر دیکھا اور اس کے ساتھ ہی میرے دل کی دھڑکن بے ربط ہونے لگی۔

بلا دروازے میں کھڑی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر بڑی دل فریب مسکراہٹ تھی۔

بلا نے شاید میرے چہرے سے میری اندرونی کیفیت کا اندازہ لگالیا تھا۔ اس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ گہری ہوگئی۔ وہ دو قدم آگے بڑھ آئی۔

"بیاکل (بے قرار) ہوگئے؟" وہ میرے چہرے کو دیکھتے ہوئے بولی "چنتا (فکر) مت کرو۔ میں تمہیں کوئی کشٹ (تکلیف) نہیں دوں گی۔" اس کے لہجے میں بے باکی تھی "میں جانتی تھی تم سوئے نہیں ہوگے اس لیے میں یہاں آگئی۔ مجھے بھی نیند نہیں آرہی۔ باتیں کریں گے دونوں۔"

وہ بے تکلفی سے پلنگ پر چڑھ کر میرے سامنے آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی۔ مجھے سینے میں سانس رکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ اس کے بیٹھنے کا انداز کچھ ایسا تھا کہ میرے اندر اوپر سے نیچے تک سنسنی کی لہری دوڑ گئی۔

میں نے دروازے کی طرف دیکھا جو چوپٹ کھلا ہوا تھا۔ میرے ذہن میں عجیب سے خیال آرہے تھے۔ وہ ٹھاکر بھانوت سنگھ کی دوست تھی اور ٹھاکر میرا محسن تھا۔ میری خاطر اس نے بہت کشٹ اٹھائے تھے۔ اس کا ریسٹورنٹ جلا دیا گیا تھا۔ اس پر قاتلانہ حملے ہوئے تھے۔ وہ زخمی ہوا تھا۔ اس کے دھرم (مذہب) کے لوگ اس کی جان کے دشمن ہوگئے تھے۔ بلا کے بارے میں اس نے مجھے سب کچھ بتا دیا تھا۔ وہ اس کی دوست تھی اور میں سوچ رہا تھا کہ کوئی ایسی بات نہ ہوجائے جس سے ٹھاکر کو ناراض ہونے کا موقع ملے۔

"میں ٹھاکر کی دوست ہوں..... رکھیل نہیں۔" بلا نے جیسے میرے خیالات پڑھ لیے تھے "تم کوئی چنتا مت کرو۔ اس نے اگر مجھے تمہارے پاس بیٹھے ہوئے دیکھ بھی لیا تو کچھ کہے گا نہیں۔ ہم تو یہاں باتیں کریں گے۔ صرف باتیں۔" اس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ کچھ اور گہری ہوگئی "ایک بات بتاؤ تم مجھے دیکھ کر اتنے بیاکل کیوں ہو رہے ہو۔ کیا کبھی کسی ناری کو اتنے قریب سے نہیں دیکھا؟"

وہ واقعی بڑی ذہین تھی۔ اس نے میری بے چینی کا اندازہ لگالیا تھا۔

"ناریاں تو میں نے بہت دیکھی ہیں پر....."

"مجھ جیسی کوئی نہیں دیکھی۔" اس نے ہنستے ہوئے میری بات کاٹ دی "پرنتو (مگر) میں کوئی دو سروں سے مختلف تو نہیں۔ بالکل ویسی ہوں جیسے دوسری ناریاں ہوتی ہیں۔ ہاں۔ تم مجھے ذرا بگڑی ہوئی کہہ سکتے ہو۔ پر میں اتنی بگڑی ہوئی

بھی نہیں۔"

"ہاں۔ یہ تو ہے۔ اتنی بگڑی ہوئی ہوتیں تو یہاں ٹھاکر بھانوت سنگھ کی حویلی میں نظر نہ آتیں۔" میں نے اپنی اندرونی کیفیت پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"مجھے اپنے بارے میں بتاؤ۔" وہ موضوع بدلتے ہوئے بولی "تمہارا نام ہمت سنگھ تو نہیں ہوسکتا۔ سارے شہر میں تمہارا چرچا ہے۔ تم مسلمان ہو۔ راج کماری روپ متی سے تمہاری دوستی ہے اور یہ دوستی ہی ان ہنگاموں کا باعث بنی ہے۔ کیا واقعی.....؟"

"اب تم بھی کسی پنڈت کی طرح سوچنے لگیں۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی۔

"پنڈت۔ پجاری۔" بلا کے منہ سے گہرا سانس نکل گیا "انہوں نے دھرم کا ٹھیکا لے رکھا ہے اور دھرم کو سب سے زیادہ نقصان پہنچانے والے بھی یہی لوگ ہیں۔ جاتیوں (ذات پات) کا زہر بھی انہی پنڈتوں اور پجاریوں نے پھیلایا ہے۔ میرے پتا جی برہمن ہیں۔ ہندو دھرم میں سب سے اونچی اور پوتر جاتی (ذات) مگر ان کے کرم (اعمال) نیچی جاتی کے لوگوں سے بھی بدتر ہیں۔ لیچھ ہیں وہ....."

"بہت نفرت ہے تمہیں اپنے پتا جی سے۔" میں نے کہا "باپ کتنا ہی برا کیوں نہ ہو' اولاد کے لیے تو دیوتا سمان (جیسا) ہوتا ہے مگر تمہاری یہ نفرت..... اس کی وجہ یہ تو نہیں کہ تم پر ضرورت سے زیادہ سختی کی گئی ہے یا....."

"پتا جی سے نفرت کا کارن (وجہ) وہ کشٹ نہیں جو میں نے ان کی اور (طرف) سے اٹھائے ہیں۔" بلا نے جواب دیا "ماں باپ اولاد پر تھوڑی بہت سختیاں کرتے ہیں اور اولاد ان باتوں کا کبھی برا نہیں مانتی۔ یہ سختیاں ان کی بھلائی کے لیے ہوتی ہیں۔ پر ہمارے پتا جی نے ہم پر ضرورت سے زیادہ دباؤ ڈالا۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بولی "تم نے ٹھیک کہا۔ پتا اولاد کے لیے دیوتا سمان ہوتا ہے۔ اسے دیکھ کر ہی اولاد اپنی زندگی کے راستے کا تعین کرتی ہے۔ باپ ہی اگر اولاد کے سامنے نگی باتیں کرے گا۔ نگی حرکتیں کرے گا تو اولاد سے یہ توقع کیسے کی جاتی ہے کہ وہ فرشتوں کی طرح نیک اور معصوم ہوگی۔

"میرے پتا جی کے کرم بھی کچھ ویسے ہی ہیں۔ وہ غیر عورتوں کو حویلی میں لے کر آتے۔ میری ماتا جی کو مجبور کرتے کہ ان کی سیوا کرے۔ انہیں اپنے ہاتھوں سے دارو پلائے۔ بات صرف عورتوں تک ہوتی تو قابل برداشت ہوتی۔ وہ تو عورتوں کے ساتھ دوسرے پنڈتوں کو بھی لے کر آتے تھے اور ماتا جی کو مجبور کیا جاتا تھا کہ ان پنڈتوں کو اپنے ہاتھوں سے دارو پلائے۔

"یہ سب کچھ ماتا جی کے لیے ناقابل برداشت تھا لیکن وہ یہ دکھ سہنے پر مجبور تھیں۔ ان کی موجودگی میں عورتوں کو ننگا کیا جاتا۔ یہ دھرماتما انہیں نوچتے کھسوٹتے۔ ماتا جی وہاں سے جانا چاہتیں تو انہیں زبردستی روک لیا جاتا اور یہ سب کچھ دیکھنے پر مجبور کیا جاتا۔

"ماتا جی نے انہی دکھوں میں گھل گھل کر جان دے دی۔ پتا جی اس پر بھی نہیں سنبھلے۔ یہ سلسلے اس کے بعد بھی جاری رہے۔ انہیں یہ بھی احساس نہیں رہا کہ ان کے گھر میں بھی دو جوان بیٹیاں ہیں۔

"اور پھر ایک رات تو۔ بہ غیرتی کی انتہا ہوگئی۔ اس رات پنڈت شیو ناتھ آیا ہوا تھا۔ ایک ناری بھی تھی۔ دارو پیتے پیتے وہ اپنے حواس کھو بیٹھے تھے۔

"پتا جی نے پوجا کو آواز دے کر پانی منگوایا۔ پوجا پانی لے کر اندر گئی۔ وہ جگ رکھ کر لوٹنے لگی تو پنڈت شیو ناتھ نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ پوجا نے ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی تو پنڈت اس سے لپٹ گیا۔ اس کے کپڑے پھاڑ دیے۔ پوجا نے اپنے آپ کو چھڑا کر بھاگنے کی کوشش کی تو پتا جی نے اس کا راستہ روک لیا اور کہا "میرے دوست کو خوش کردو پتری۔ شیو ناتھ مہان پنڈت ہیں۔ شہر کے سب سے بڑے مندر کے پروہت ہیں۔ یہ خوش ہوجائیں گے تو اپنی گدی مجھے دے دیں گے۔"

"دارو کے نشے میں باپ اپنے حواس کھو بیٹھا تھا۔ اسے یہ بھی ہوش نہیں رہا تھا کہ وہ اپنی بیٹی سے کیا کہہ رہا ہے۔ پوجا کسی نہ کسی طرح اپنے آپ کو بچا کر وہاں سے نکل آئی اور مجھے ساتھ لے کر ایک کمرے میں بند ہوگئی۔ وہ رات بھر روتی رہی اور اگلے روز صبح ہی بمبئی چلی گئی۔ مجھے بھی اس نے خبردار کردیا تھا کہ میں اپنا بندوبست کرلوں ورنہ میرا باپ کسی دن اپنے ہی ہاتھوں مجھے ننگا کروے گا۔

"پوجا چلی گئی۔ اس نے اپنی زبان بند رکھی تھی۔ میں نے بھی اپنے ہونٹ سی لیے تھے۔ اگر لوگوں کو پتا چل جاتا کہ پاپ (گناہ) اور پُن (ثواب) پر لمبے لمبے بھاشن دینے والے پنڈت رام سروپ کے اپنے کرم کیا ہیں تو اس کی بوٹیاں نوچ کر کتوں کو کھلا دیتے۔

"یہ ہیں ہمارے دھرم چاریوں کے کرتوت۔" بلا نے گہرا سانس لیا اور پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولی "اپنے پتا کا اصل روپ دیکھ کر مجھے اس سے شدید نفرت ہوگئی۔ دھرم کا

پرچار کرنے والے خود گندگی کی دلدل میں پھنسے ہوئے ہیں۔ گاؤ ماتا کو بھگوان کا درجہ دیتے ہیں۔ اس کی پوجا کرتے ہیں۔ اس کے گوبر کو پوتر سمجھ کر اپنے شریر پر ملتے ہیں۔ اسے کوئی کشٹ دینا بہت بڑا پاپ سمجھتے ہیں مگر یہی لوگ اس گاؤ ماتا کو مسلمان قصائیوں کے ہاتھ بیچ دیتے ہیں کہ اس کے گلے پر چھری پھیرو اور اس کی بوٹیاں کھاؤ۔ اس کی کھال کے جوتے بنا کر پیروں میں پہنو۔ عجیب دھرم ہے اور عجیب تر دھرم چاری ہیں۔

"مجھے اپنے پتا سے شدید نفرت ہے مگر میں نے کسی کے سامنے ان کے خلاف کبھی زبان نہیں کھولی۔ تم پہلے شخص ہو جسے میں اپنا دکھ بتا رہی ہوں۔

"نانا جی انہی دکھوں میں گزر گئیں۔ ایک بیٹی گھر چھوڑ کر چلی گئی۔ دوسری کٹی پتنگ کی طرح ڈانواں ڈول پھر رہی ہے مگر پتا جی کو اب بھی ہوش نہیں آیا۔ کسی دُشٹ (بدمعاش) کے بہکانے میں آکر انہوں نے شہر میں ہنگامے شروع کرا دیے۔ مسلمانوں کے خلاف زہر اگلتے ہوئے ان کی زبان نہیں تھکتی تھی۔ انہیں دکھ تھا کہ ایک مسلمان کسی ہندو ناری کو بغل میں لے کر کیوں گھوم رہا ہے۔ ان کے خیال میں دھرم کے خلاف یہ بہت بڑی سازش تھی۔ دھرم کو نشٹ (تباہ) کیا جا رہا تھا مگر وہ یہ بھول گئے تھے کہ ان کے اپنے کرم کیا ہیں۔ وہ خود دھرم کو کتنا نقصان پہنچا رہے ہیں۔ وہ یہ بھی بھول گئے تھے کہ ان کی اپنی ایک بیٹی ایک مسلمان کے ساتھ اس کے فلیٹ میں رہ رہی ہے۔

"ممکن ہے وہ ان ہنگاموں کو مزید ہوا دیتے مگر فیروز شاہ نے پوجا اور سلیم کی تصویر دکھا کر ان کی زبان بند کرا دی اور وہ حویلی میں بند ہو کر رہ گئے۔

"اس رات اگر ٹھاکر بھانوت سنگھ مجھے ان بدمعاشوں سے نہ بچاتا تو میں برباد ہو چکی ہوتی۔ میں عزت سے یہاں نہ بیٹھی ہوتی۔ ویشیا (طوائف) بن جاتی۔

"کوئی پتری اپنے پتا کے خلاف اس طرح نہیں بولی ہوگی جس طرح تم نے مجھے کہتے سنا۔ میرا پتا انسان نہیں راکشش (وحشی۔ حیوان۔ جنگلی) ہے۔۔۔ ان کے کارن مجھے بھی اس دھرم سے نفرت ہو گئی ہے جس دھرم میں جھوٹ ہو۔ مکاری ہو، دھوکا اور فریب ہو وہ دھرم سچا کیسے ہو سکتا ہے۔"

"بات دھرم کی نہیں۔" میں نے اس کے خاموش ہونے پر کہا "بات ان لوگوں کی ہے جو اپنی بداعمالیوں سے دھرم کو بدنام کرتے ہیں۔ بہرحال، تمہارے ساتھ جو کچھ بھی ہوا اس کا مجھے افسوس ہے۔"

"میں اپنا بکھیڑا لے کر بیٹھ گئی۔" بہت دیر بعد بملا کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آئی تھی "میں تم سے تمہارے بارے میں پوچھنا چاہتی تھی۔ تم مسلمان ہو۔ راج کماری روپ متی اور ٹھاکر سے تمہاری دوستی ہے۔ اپنے پتا جی اور دوسرے پنڈتوں اور پجاریوں کو تو آج تک میں نے یہی کہتے سنا ہے کہ مسلمان ملیچھ (ناپاک غلیظ) ہیں لیکن ٹھاکر نے بتایا تھا کہ تم بھگوان کی طرح پوتر اور مہان (عظیم) ہو۔ تم نے ہندو ناری (روپ متی) کی نہ صرف عزت بچائی بلکہ کئی مرتبہ اس کی جان کی رکشا (حفاظت) بھی کی۔ یہ تمہاری مہانتا (عظمت) ہے کہ تم ایک ہندو ناری کے لیے ایک خطرناک یُد (لڑائی) لڑ رہے ہو۔"

"میں مہان نہیں۔ مہانتا تو ان لوگوں کی ہے جو سچائی کے راستے پر میرا ساتھ دے رہے ہیں۔" میں نے جواب دیا۔

"یہ میری خوش قسمتی ہے کہ تم سے ملاقات ہوگی۔" بملا نے کہا "میں اس عورت سے بھی ملنا چاہوں گی جس نے تمہارے لیے اپنا گھر بار اور سب کچھ چھوڑ دیا اور تمہارے ساتھ کئی ورشوں (سالوں) سے ماری ماری پھر رہی ہے۔"

"جانکی۔" میں مسکرا دیا "وہ میری بہت اچھی دوست ہے۔ اس نے واقعی میرے لیے بہت کشٹ اٹھائے ہیں۔ میں تمہیں اس سے ضرور ملاؤں گا لیکن اب یہ بتاؤ کہ تم یہاں سے جانے کا کیا لوگی۔"

"پہلی ہی ملاقات میں تنگ آ گئے ہو۔ میں تو تم سے بہت سی باتیں کرنا چاہتی ہوں۔" بملا نے کہا۔

"ساری باتیں ایک ہی ملاقات میں ختم ہو گئیں تو دوسری ملاقات میں کیا کرو گی؟" میں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

"تمہیں دیکھتی رہوں گی لیکن خیر۔" اس نے گہرا اور لمبا سانس لیا "تم کہتے ہو تو میں اس وقت چلی جاتی ہوں۔"

اس نے بیٹھے بیٹھے دونوں ہاتھ سر سے اوپر اٹھا کر ایک خوفناک جمائی لی اور بیڈ سے اتر گئی۔ چند لمحے میری طرف دیکھتی رہی پھر ہاتھ ہلاتی ہوئی باہر نکل گئی۔ جانے کے بعد وہ تیز روشنی کا بلب بجھانا نہیں بھولی تھی۔

میں نائٹ بلب کی نیلگوں روشنی میں بیڈ کی پشت سے ٹیک لگائے نیم دراز دیر تک بملا اور اس کے ہندو باپ کے بارے میں سوچتا رہا۔ اگر بملا نے اپنے باپ کے بارے میں جھوٹ نہیں بولا تھا تو وہ واقعی بہت بے غیرت آدمی تھا جسے اپنی بیٹیوں کی عزت کا بھی خیال نہیں تھا اور میرا خیال ہے

بملا نے کوئی بات غلط نہیں کہی تھی کیونکہ ٹھاکر بھی مجھے اس کے بارے میں بہت کچھ بتا چکا تھا۔

اس وقت صبح کے پانچ بج رہے تھے۔ اس وقت ایک نیا دن طلوع ہو رہا تھا۔ لوگ رات بھر کے آرام کے بعد بیدار ہو کر ایک نئے دن کے استقبال کی تیاری کر رہے تھے اور میں نیند کی لہروں میں غوطہ زن ہو رہا تھا۔

"میری آنکھ بارہ بجے سے پہلے نہیں کھل سکی تھی۔ میں بیدار ہونے کے بعد بھی دیر تک بستر پر پڑا اینٹھتا رہا۔ سویلی میں خاموشی تھی۔ کسی طرف سے آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ ٹھاکر بھی رات تین بجے کے لگ بھگ سویا تھا اور بملا بھی صبح پانچ بجے کے بعد ہی اپنے کمرے میں گئی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ وہ دونوں بھی ابھی تک سو رہے ہوں گے اور ملازم شاید باہر لان میں ہوگا اسی لیے حویلی میں خاموشی تھی۔

میں اٹھ کر باتھ روم میں گھس گیا اور دیر تک ٹھنڈے پانی کے شاور کے نیچے کھڑا رہا اور جب میں کپڑے پہن کر باہر نکلا تو اسی وقت نارائن نامی ملازم کمرے میں داخل ہوا۔

"آپ تیار ہو گئے سرکار۔ ناشتا لگا دوں؟" اس نے پوچھا۔

"بملا اور ٹھاکر جاگ گئے یا ابھی سو رہے ہیں؟" میں نے اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے سوال کر ڈالا۔

"بملا جی سو رہی ہیں اور ٹھاکر جی تو سویرے سات بجے ہی چلے گئے تھے۔" نارائن نے جواب دیا۔

"کہاں۔۔۔ ہوٹل؟" میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"ہوٹل نہیں سرکار۔" نارائن بولا "کسی نے چھوٹے سرکار کی ہتیا (جان لینا) کروی ہے۔ ٹھاکر جی وہاں گئے ہیں۔"

"کیا۔۔۔؟" میں اچھل پڑا "تمہارا مطلب ہے شیام سندر؟"

"جی سرکار۔" نارائن نے سر ہلا دیا۔ وہ نجانے کب سے ضبط کیے بیٹھا تھا۔ اس کی آنکھوں میں رکے ہوئے سیلاب کا بند ٹوٹ گیا اور آنسو بہہ نکلے۔

"کس نے ہتیا کی ڈاکٹر شیام سندر کی۔ کون تھا وہ؟" میں نے پوچھا۔ میرے دماغ میں دھماکے سے ہونے لگے تھے۔ سینے میں طوفان کروٹیں لینے لگا۔

"پتا نہیں سرکار، وہ کون سنگ دل تھا۔ بہو رانی پاروتی دیوی بھی بہت گھائل (زخمی) ہوئی ہیں۔ سنا ہے انہیں اسپتال بھیج دیا ہے۔"

میں چند لمحے نارائن کی صورت دیکھتا رہا پھر کمرے سے نکل آیا۔ ہال نما کمرے میں بملا سے سامنا ہو گیا۔ اس کے جسم پر شب خوابی کا ڈھیلا ڈھالا لباس تھا۔ بال بکھرے ہوئے اور آنکھیں سرخ تھیں۔ چہرہ ستا ہوا تھا۔ وہ ابھی ابھی سو کر اٹھی تھی اور غالباً اس وقت بھی اس کے دماغ پر نیند کا خمار طاری تھا۔ اس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر مجھے پرنام (سلام) کیا اور مسکراتے ہوئے بولی۔

"کہاں چل دیے شریمان جی سویرے سویرے۔"

"اس وقت دوپہر ہو رہی ہے بملا۔" میں نے کہا "میں ایک ضروری کام سے جا رہا ہوں۔ تم ناشتا کر لو۔"

میں وہاں رکے بغیر باہر آ گیا۔ ٹھاکر کی جیپ موجود تھی۔ البتہ وہ کار غائب تھی جو رات کو میں نے پورٹیکو میں کھڑی دیکھی تھی۔ جیپ کا اگلا ایک ٹائر پھٹا ہوا تھا۔ گزشتہ رات رامو وغیرہ نے ہمیں سنسان سڑک پر روکنے کے لیے گولی چلا کر ٹائر برسٹ کر دیا تھا اور ان کے فرار کے بعد جیپ کو میں ہی چلاتا ہوا حویلی تک لایا تھا اور میرا خیال تھا کہ ٹیوب تو بالکل ختم ہو چکی ہوگی۔ اگرچہ جیپ کے پچھلے حصے میں ایک فاضل ٹائر موجود تھا مگر میرے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ ٹائر تبدیل کر سکتا۔

گیٹ سے باہر نکلتے ہوئے میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ بملا برآمدے میں کھڑی الجھی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میں گیٹ سے نکل آیا اور تیز تیز قدموں سے ایک طرف چلنے لگا۔ اتفاق سے چند گز کا فاصلہ طے کرنے کے بعد ہی دائیں طرف کے موڑ سے ایک خالی ٹیکسی سامنے آ گئی۔ میں نے ہاتھ کے اشارے سے ٹیکسی رکوائی اور بڑی عجلت میں دروازہ کھول کر پچھلی نشست پر بیٹھ گیا۔

"کہاں چلنا ہے حکم۔" ڈرائیور نے سامنے لگے ہوئے آئینے میں دیکھتے ہوئے کہا "ٹیکسی کا میٹر ٹھیک نہیں ہے۔ بھاڑے (کرایے) کا آپ خیال رکھنا۔"

میرا دماغ بھنا گیا۔ دنیا بھر کے ٹیکسی ڈرائیور ایک جیسے ہی تھے۔ یہ لوگ کبھی میٹر درست نہیں رکھتے۔ کرایہ زیادہ وصول کرتے ہیں اور بخشش الگ سے طلب کرتے ہیں لیکن اس وقت میں میٹر پر اس سے بحث نہیں کر سکتا تھا۔

"کہاں جانے کا ہے حکم؟"

ڈرائیور نے دوبارہ پوچھا تو میں چونک گیا۔ گزشتہ رات ڈاکٹر شیام سندر کے بارے میں باتیں کرتے ہوئے ٹھاکر نے بتایا تھا کہ اس کا کلینک رام باغ میں ہے اور قریب ہی کسی بنگلے میں رہائش بھی ہے۔ رام باغ بہت بڑا علاقہ تھا اور مجھے کچھ اندازہ نہیں تھا کہ شیام سندر کا بنگلا کس طرف ہوگا۔

"پولیس اسٹیشن۔" میرے منہ سے غیر ارادی طور پر نکل گیا۔ "رام باغ کے علاقے کو جو تھانہ لگتا ہے وہاں چلو۔"

ڈرائیور نے مڑ کر میری طرف دیکھا اور پھر سنبھل کر بیٹھتے ہوئے ٹیکسی آگے بڑھادی۔

پولیس اسٹیشن تک پہنچنے میں پندرہ منٹ سے زیادہ نہیں لگے۔ عمارت کے سامنے ٹیکسی رکتے ہی میں دروازہ کھول کر نیچے اترا اور ڈرائیور کو انتظار کرنے کا کہہ کر تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا عمارت میں داخل ہوگیا۔ برآمدے میں مسلح سنتری نے میرا راستہ روک لیا۔

"کس کو ملنے کا ہے شریمان جی؟" اس نے گھورتی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھا۔

"کوئی آفیسر۔" میں نے کہا "وہ دراصل ٹھاکر بھانوت سنگھ کے بھائی کی ہتیا ہوگئی ہے۔ ٹھاکر میرا متر ہے مگر مجھے اس کے بنگلے کا پتا معلوم نہیں ہے۔ کوئی ایسا آدمی جو مجھے وہاں تک پہنچا سکے۔"

"اوہ..." سنتری نے ایک بار پھر مجھے گھورا "ایک منٹ رکو۔ میں دیکھتا ہوں۔"

سنتری اندر چلا گیا۔ میں وہیں کھڑا اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ تقریباً دو منٹ بعد سنتری واپس آیا تو اس کے ساتھ ایک سادہ پوش بھی تھا۔

"اس کو ساتھ لے جاؤ حکم۔" سنتری نے کہا "مگر میرا خیال ہے، ڈیڈ باڈی کو اسپتال بھیج دیا گیا ہوگا۔"

میں اس آدمی کے ساتھ باہر آگیا۔ میں تو پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا اور وہ آدمی آگے والی سیٹ پر براجمان ہوگیا اور ڈرائیور کو رام باغ پیلس ہوٹل کی طرف چلنے کو کہا۔ ٹیکسی حرکت میں آکر سڑکوں پر فراٹے بھرنے لگی اور میں ڈاکٹر شیام سندر کے بارے میں سوچنے لگا۔ اسے کس نے قتل کیا تھا۔ اس کی بیوی پاروتی ابھی تک زندہ ہے یا وہ بھی ختم ہوچکی ہے۔

ٹیکسی ایک جھٹکے سے رکی تو میں اپنے خیالات سے چونک گیا۔ اس بنگلے کے سامنے بہت سے لوگ جمع تھے۔ گیٹ پر دو پولیس کانسٹیبل کھڑے تھے۔ کچھ لوگ اندر بھی نظر آرہے تھے۔

سادہ پوش ساتھ ہونے کی وجہ سے گیٹ پر تعینات کانسٹیبلوں نے مجھے نہیں روکا۔ میں برآمدے میں پہنچا تو اندر کی راہداری میں وکرم ہوٹل کے اسسٹنٹ منیجر بھارت بھوشن کو دیکھ کر آگے بڑھ گیا۔ اس نے بھی مجھے پہچان لیا اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا میری طرف آگیا۔ اس کا چہرہ رنج و ملال کی تصویر بنا ہوا تھا۔

"ٹھاکر کہاں ہے اور شیام سندر۔۔۔"

"اسپتال۔" بھارت بھوشن نے مجھے بات پوری کرنے کا موقع نہیں دیا "ڈیڈ باڈی دو گھنٹے پہلے اسپتال بھیج دی گئی تھی اور پاروتی بھابی کو بھی۔ وہ شدید گھائل ہے۔ ٹھاکر بھی وہیں ہیں۔"

اسی دوران میں ایک سب انسپکٹر ہمارے قریب آگیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک کلپ بورڈ تھا۔ جس پر لگے ہوئے کاغذات پر وہ رپورٹ مرتب کررہا تھا۔ اس نے میرے بارے میں پوچھا تو بھارت بھوشن ہی نے بتایا کہ میں ٹھاکر بھانوت سنگھ کا قریبی دوست ہوں۔

سب انسپکٹر نے مجھ سے چند سوالات کیے۔ کچھ باتیں میں نے اس سے پوچھیں اور پھر وہ مجھے شیام سندر کے بیڈ روم میں لے گیا۔ بیڈ روم کے دروازے کے سامنے راہداری کے فرش اور دیواروں پر خون کے چھینٹے نظر آرہے تھے اور جب میں اندر داخل ہوا تو میری روح تک کانپ اٹھی۔

ہر چیز الٹ پلٹ نظر آرہی تھی۔ ڈبل بیڈ کی سفید چادر خون میں بھیگی ہوئی تھی۔ ہر طرف خون ہی خون تھا۔ کوئی چیز ایسی نظر نہیں آرہی تھی جس پر خون کے چھینٹے یا دھبے نہ ہوں۔ بیڈ سے ذرا ہٹ کر قالین پر بھی خون کا بہت بڑا دھبا تھا۔ لگتا تھا جیسے کچھ دیر پہلے یہاں خون کا بہت بڑا تالاب تھا جو قالین میں جذب ہوگیا تھا۔ یہ صورت حال دیکھ کر یہ بات کہی جاسکتی تھی۔۔۔ جیسے کسی بکرے کے گلے پر چھری پھیر کر پھوڑ دیا گیا ہو۔

میں نے زندگی میں بہت خون بہتے دیکھا تھا لیکن نجانے کیا بات تھی کہ یہاں کی صورت حال دیکھ کر میرا کلیجا منہ کو آنے لگا۔ میں باہر آگیا اور برآمدے میں رک کر تازہ ہوا میں گہرے گہرے سانس لینے لگا۔

"کون سے اسپتال میں لے کر گئے ہیں؟" میں نے بھارت بھوشن سے پوچھا۔ وہ بھی میرے ساتھ ہی باہر آگیا تھا۔

"سوائے جے سنگھ اسپتال۔" بھارت بھوشن نے بتایا۔

وہ کچھ اور بھی کہنا چاہتا تھا مگر میں اس کی پوری بات سنے بغیر تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا کوٹھی سے باہر آگیا۔ اس مرتبہ وہ سادہ لباس والا میرے ساتھ نہیں تھا۔

میں نے ٹیکسی میں بیٹھ کر ڈرائیور کو اسپتال کا نام بتادیا اور سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کرلیں۔ میں ٹھاکر کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ ڈاکٹر شیام سندر سے اس کا کوئی خونی رشتہ نہیں تھا۔ وہ اس کے ایک اردلی سے ملازم کا بیٹا تھا جسے اس کی ماں نے پالا تھا لیکن ٹھاکر کو شیام سندر سے حقیقی بھائیوں جیسی محبت تھی۔ وہ بھی اسے بہت چاہتا تھا۔ شیام سندر کی موت پر ٹھاکر کا کیا حال ہوگا!

سوائے جے سنگھ اسپتال ہوٹل جے پور اشوک سے ذرا آگے سوائے جے پور ہائی وے پر واقع تھا۔ بہت وسیع و عریض اور شان دار عمارت تھی۔ کئی بلاک تھے جو وسیع و عریض رقبے پر پھیلے ہوئے تھے۔

مین گیٹ پر میں نے ٹیکسی کو فارغ کردیا۔ استقبالیہ سے مجھے پتا چل گیا کہ پاروتی دیوی کو ابھی تک ایمرجنسی ہی میں رکھا ہوا ہے۔

ٹھاکر بھانوت سنگھ کشادہ راہداری میں ہی مل گیا۔ وہ سر کو دونوں ہاتھوں میں تھامے بینچ پر بیٹھا ہوا تھا۔ ریسٹورنٹ اور ہوٹل کے منیجر اور اس کے چند دوست بھی وہاں جمع تھے۔ میری آواز پر ٹھاکر نے سر اٹھا کر دیکھا اس کی آنکھیں خونِ کبوتر کی طرح سرخ ہورہی تھیں۔ پے در پے کرب کے آثار چہرے پر ہویدا تھے۔ مجھے دیکھ کر وہ ایک جھٹکے سے اٹھ گیا اور میرے ساتھ لپٹ کر دھاڑیں مار مار کر اس طرح رونے لگا کہ اسے سنبھالنا مشکل ہوگیا۔ اس کے دوست بھی بار بار اسے اپنے ساتھ لپٹا کر دلاسا دے رہے تھے۔

ٹھاکر دیر تک مجھ سے لپٹا ہچکیاں بھرتا رہا۔

"یہ سب کچھ کیسے ہوا۔ کون تھے وہ لوگ؟ کس نے یہ ظلم ڈھایا ہے۔" میں نے کہا "شیام سندر تو بہت معصوم تھا۔ وہ تو مسیحا تھا۔ دوسروں کو زندگی دینے والا۔ اس کی زندگی کس ظالم نے چھین لی۔"

"میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔" ٹھاکر کے حلق سے غراہٹ سی نکلی "اس کے شریر کے اتنے ٹکڑے کروں گا کہ کوئی گن نہیں سکے گا۔ اس کی بوٹیاں کتوں کو کھلا دوں گا۔ ایسا انتقام لوں گا اپنے سُتا کا کہ دنیا عبرت حاصل کرے گی۔"

"پر کون تھا وہ؟" میں نے اٹھتی ہوئی ٹیسوں سے اس کی طرف دیکھا "پتا چلا۔۔۔ وہ کون ظالم تھا؟"

"راسو۔" ٹھاکر کے منہ سے نکلا "وہ میرے انتقام سے بچ نہیں سکے گا۔"

"اوہ!" میں اچھل پڑا۔ میرے دماغ میں آندھیاں سی چلنے لگی تھیں۔ ہم اس وقت دوسرے لوگوں سے ذرا ہٹ کر کھڑے تھے "تمہیں کیسے پتا چلا؟" میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"صبح سات بجے مجھے پولیس نے ٹیلی فون پر اس دُرگھٹنا (سانحے) کی اطلاع دی تھی۔ میں نے سوچا تمہیں بھی جگا کر ساتھ لے چلوں مگر پھر خیال آیا کہ تم ساری رات جاگتے رہے تھے۔ میں نے تمہیں جگانا مناسب نہیں سمجھا اور شیام سندر کی کوٹھی پر پہنچ گیا۔

"کوٹھی کے باہر بہت سے لوگ جمع تھے۔ اندر پولیس بھری ہوئی تھی۔ پڑوس کے بنگلوں کے دو تین آدمی بھی موجود تھے۔ شیام سندر کی لاش دیکھ کر میں وقتی طور پر اپنے حواس کھو بیٹھا تھا۔ پاروتی کی دشا (حالت) بھی بہت بری تھی۔ وہ بہت گھائل تھی۔ میرے آنے کے تھوڑی ہی دیر بعد پاروتی کو اسپتال بھیج دیا گیا تاکہ اس کا جیون (زندگی) بچایا جاسکے۔

"شیام سندر کے پڑوسی نے بتایا کہ صبح چھ بجے دودھ والے نے انہیں جگا کر بتایا کہ بار بار گھنٹی بجانے کے باوجود کوئی دودھ لینے کے لیے باہر نہیں آرہا۔ اس نے کسی گڑبڑ کا شبہ ظاہر کیا تو پڑوسی دودھ والے کے ساتھ گیٹ پھاند کر اندر آگیا۔

"برآمدے والا دروازہ تھوڑا سا کھلا ہوا تھا۔ وہ شیام سندر کو پکارتے ہوئے اندر داخل ہوگئے اور بیڈ روم کا منظر دیکھ کر کانپ اٹھے۔ بیڈ کے قریب قالین پر شیام سندر کی زخموں سے چور لاش پڑی ہوئی تھی۔ پاروتی بھی اس کے قریب ہی پڑی تھی۔ اس کا سر شیام سندر کے پیروں پر تھا۔

"پاروتی بھی بہت گھائل تھی۔ پڑوسی پہلے تو یہ سمجھا کہ وہ بھی ختم ہوچکی ہے لیکن وہ زندہ تھی۔ ان دونوں نے اسے اٹھانے کی کوشش کی تو پاروتی نے آنکھیں کھول دیں۔ اس کے ہونٹوں سے صرف "رامو" کا لفظ نکلا اور وہ بے ہوش ہوگئی۔

"پڑوسی نے اپنے بنگلے سے پولیس کو اطلاع دے دی۔ پولیس نے یہاں کی صورت حال دیکھ کر مجھے فون کردیا اور میں فوراً ہی یہاں پہنچ گیا۔ آؤ۔ میں تمہیں دکھاؤں اس راکشش نے میرے بھائی کی کیا حالت کی ہے۔"

ٹھاکر مجھے لے کر ایک کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ دروازے پر ایک مسلح پولیس کانسٹیبل موجود تھا۔ اس نے ہمیں روکا نہیں۔

کمرے کی فضا برف خانے کی طرح سرد تھی۔ پہیوں والے اسٹریچر پر ایک لاش چادر سے ڈھکی ہوئی تھی۔ چادر اگرچہ سفید تھی لیکن اس پر خون کے اتنے دھبے تھے کہ سفیدی ختم ہوتی لگ رہی تھی۔

ٹھاکر نے چادر ہٹادی اور میں کانپ کر رہ گیا۔ شیام

سندر کے جسم پر کوئی لباس وغیرہ نہیں تھا اور لاش پر اتنے زخم تھے کہ میرے لیے انہیں گننا ممکن نہیں تھا۔

ٹھاکر جھک کر اس کی پیشانی پر بوسے دے رہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے ایک بار پھر آنسو بہہ نکلے تھے اور وہ سسکیاں لے رہا تھا۔ میں نے بڑی آہستگی سے اسے الگ ہٹایا اور لاش کو چادر سے ڈھک دیا۔

میں ٹھاکر کو لے کر سرد خانے سے باہر آگیا۔ راہداری میں بہت سے لوگ جمع تھے۔ ان میں ایک دو جانے پہچانے چہرے بھی نظر آئے لیکن اس وقت مجھے یاد نہیں آسکا کہ وہ کون تھے اور میں نے انہیں کہاں دیکھا تھا۔

ایک پولیس آفیسر ٹھاکر کو بازو سے پکڑ کر ایک طرف لے گیا اور دیر تک اس سے سرگوشیوں میں باتیں کرتا رہا۔ میں دیوار سے ٹیک لگائے کھڑا اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ اچانک مجھے ایک اور خیال آگیا۔ راہداری میں بہت سے لوگ جمع تھے۔ ان میں شیام سندر اور ٹھاکر کے دوست بھی تھے اور پاروتی کے رشتے دار بھی۔ اس کی ماں تو بار بار پچھاڑیں کھا رہی تھی۔ اس کے علاوہ کچھ اور خواتین بھی تھیں لیکن جاگی یا روپ متی دکھائی نہیں دیں۔

صبح سات بجے شیام سندر کے قتل کی اطلاع ملتے ہی ٹھاکر حویلی سے بھاگ کھڑا ہوا تھا۔ مجھے تو اس خیال سے نہیں جگایا تھا کہ میں رات بھر جاگا تھا اور پھر شیام سندر کی کوٹھی پر آنے کے بعد وہ اپنے حواس کھو بیٹھا تھا اور اس نے روپ متی کو اس دُرگھٹنا کی اطلاع نہیں دی تھی۔

میں نے ٹھاکر کی طرف دیکھا۔ انسپکٹر نے ایک ہاتھ اس کے کندھے پر رکھا ہوا تھا اور اس کے چہرے پر نظریں جمائے کچھ کہہ رہا تھا۔ میں اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے استقبالیہ کاؤنٹر کی طرف آگیا۔

بہت وسیع و عریض لابی تھی۔ اسے انتظار گاہ بھی کہا جاسکتا تھا۔ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر صوفے اور کرسیاں بچھی ہوئی تھیں۔ مناسب جگہوں پر کنکریٹ کے بڑے بڑے خوب صورت گملے بھی رکھے ہوئے تھے جن میں ایسے پودے لگے ہوئے تھے جو صرف سائے میں ہی نشوونما پاسکتے تھے۔

لمبے چوڑے استقبالیہ کاؤنٹر سے ذرا آگے ایک قطار میں چار ٹیلی فون بوتھ تھے۔ ایک بوتھ خالی تھا۔ ایک عورت اس طرف بڑھ رہی تھی۔ میں تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا اس سے پہلے ہی بوتھ میں گھس گیا۔ ریسیور اٹھا کر مطلوبہ سکے ڈالے اور نمبر ملانے لگا۔

دوسری طرف سے کال روپ متی نے ریسیو کی تھی۔

میں اِدھر اُدھر کی باتوں سے یہ ٹوہ لینے کی کوشش کرتا رہا کہ انہیں اس سانحے کی اطلاع ملی تھی یا نہیں۔ ٹھاکر نے رات ہی کو فون پر اسے رامو سے جھڑپ کے بارے میں بتا دیا اور اس وقت روپ متی میری اور ٹھاکر کی خیریت دریافت رہی تھی۔ اس کی باتوں سے اندازہ ہوگیا کہ ڈاکٹر شیام سندر کے قتل کی اسے کوئی خبر نہیں تھی۔

"ایک بری خبر ہے روپ متی۔" میں نے اصل موضوع پر آتے ہوئے کہا۔

"کہو میں سن رہی ہوں۔" روپ متی نے کہا "لیکن بھگوان کے لیے کوئی ایسی خبر مت سنانا جسے میں برداشت نہ کرسکوں۔"

"بات کچھ ایسی ہی ہے لیکن برداشت کرنا پڑے گا۔" میں نے کہا اور پھر مناسب الفاظ میں اسے ڈاکٹر شیام سندر کے قتل کے بارے میں بتانے لگا۔

روپ متی تفصیل جاننا چاہتی تھی۔ مجھے جتنا معلوم تھا' میں نے اسے بتا دیا اور پھر فون بند کرکے میں بوتھ سے باہر آگیا۔

جب میں راہداری میں پہنچا تو پاروتی کو ایمرجنسی روم سے باہر لایا جارہا تھا۔ وہ پہیوں والے اسٹریچر پر بے ہوش پڑی تھی۔ اس کا جسم سفید چادر سے ڈھکا ہوا تھا البتہ چہرے پر چادر نہیں تھی۔ خون زیادہ بہہ جانے کی وجہ سے اس کا چہرہ سفید ہو رہا تھا۔ دو وارڈ بوائز اسٹریچر کو دھکیل رہے تھے اور ایک نرس نے خون کی وہ بوتل اوپر کرکے اٹھا رکھی تھی جس سے منسلک ربر کی پتلی سی نلکی سے قطرہ قطرہ خون پاروتی کے جسم میں منتقل ہو رہا تھا۔

اسٹریچر کو پاروتی کے رشتے داروں نے گھیر رکھا تھا۔ اس کی ماں تو دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھی اور دو عورتوں نے اسے بڑی مشکل سے سنبھال رکھا تھا۔ پاروتی کے پتا رانا ایشوری سنگھ' ٹھاکر کو سہارا دیے چل رہا تھا۔ ان دونوں کی حالت خاصی ابتر تھی۔

پاروتی کو ایک پرائیویٹ روم میں پہنچا دیا گیا۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد جب ڈاکٹر کمرے سے نکلا تو رانا ایشوری سنگھ اور ٹھاکر کو تسلی دیتے ہوئے بولا۔

"مریضہ اب خطرے سے باہر ہے۔ تسویش کی کوئی بات نہیں۔ اسے شام تک ہوش آجائے گا۔"

رانا اور ٹھاکر کمرے میں چلے گئے۔ میں باہر کھڑا رہا۔ تھوڑی ہی دیر بعد جاگی اور روپ متی بھی پہنچ گئیں۔ روپ متی کی آنکھیں رو رو کر سرخ ہو رہی تھیں۔ یہاں میں نے ہر

شخص کی آنکھوں کو اشک بار دیکھا تھا۔ اس سے اندازہ ہوا کہ لوگ ڈاکٹر شیام سندر کو بھی کتنا چاہتے تھے۔ جاگی اور روپ متی کمرے میں چلی گئیں۔ دو مسلح پولیس کانسٹیبل بھی دروازے پر کھڑے ہوگئے تھے۔

وہ دن ہم نے اسپتال ہی میں گزارا۔ ٹھاکر صبح سات بجے اطلاع پاکر حویلی سے بھاگ کھڑا ہوا تھا۔ اس نے چائے تک نہیں پی تھی اور میں نے بھی ابھی تک کچھ نہیں کھایا پیا تھا۔ چار بجے کے قریب میں نے اور روپ متی نے زبردستی اسے تھوڑا بہت کھلا دیا۔ میں نے بھی ایک سینڈوچ لے لیا تھا۔

رات آٹھ بجے کے قریب پاروتی کو ہوش آگیا۔ پولیس آفیسر اس وقت اسپتال ہی میں موجود تھا۔ وہ ڈاکٹر کی اجازت پاکر پاروتی کا بیان لینے کے لیے آگیا۔

فالتو لوگوں کو کمرے سے نکال دیا گیا۔ رانا ایشوری سنگھ' ٹھاکر اور میرے علاوہ ڈاکٹر اور دو پولیس آفیسر تھے۔

پاروتی کو اگرچہ کسی نے یہ نہیں بتایا تھا کہ اس کا پتی اب اس سنسار (دنیا) میں نہیں رہا لیکن گھائل ہو کر بے ہوش ہونے سے پہلے اس نے جو کچھ دیکھا ہوگا اس سے اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ اس کا سہاگ اجڑ چکا ہے۔

ہچکیوں' آنسوؤں اور آہوں کے بیچ تقریباً ڈیڑھ گھنٹے میں اس نے اپنا بیان مکمل کیا۔

پاروتی کے بیان کے مطابق وہ دونوں اپنے بیڈ روم میں سو رہے تھے کہ صبح ساڑھے چار بجے کے قریب کوئی آہٹ سن کر اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے ڈاکٹر شیام سندر کو جگا دیا۔ لاؤنج کی طرف سے دوبارہ آہٹ سنائی دی تو شیام سندر اٹھ کر کمرے سے نکل گیا۔

اور پھر دوسرے ہی لمحے وہ شیام سندر کی چیخ سن کر وہ اچھل پڑی۔ وہ اٹھ کر دروازے کی طرف لپکی لیکن شیام سندر دروازے ہی میں اس سے ٹکرا گیا۔ وہ زخمی تھا۔ اس کے بازو سے خون بہہ رہا تھا۔

پاروتی ایک دم بدحواس ہوگئی۔ وہ پتی (شوہر) کو سہارا دینا چاہتی تھی کہ دو آدمی کمرے میں گھس آئے۔ ان دونوں کے ہاتھوں میں خنجر تھے۔ ان میں ایک لمبے قد کا مالک تھا۔ اس کی ناک پر بینڈیج لگی ہوئی تھی۔ اس نے پاروتی کو دھکا دے کر ایک طرف گرا دیا اور شیام سندر پر خنجر سے حملہ کردیا۔ پاروتی اسے بچانے کے لیے لپکی۔ اس مرتبہ دوسرے آدمی نے اسے ایک طرف پٹخ دیا۔

زخمی ناک والا شیام سندر پر پے در پے خنجر کے وار کر رہا تھا اور وہ اسے بچانے کے لیے بار بار لپک رہی تھی۔ اس طرح وہ کئی بار خود بھی خنجر کی زد میں آئی۔ زخمی ہونے کے باوجود وہ اپنے پتی کو بچانے کی کوشش کرتی رہی۔

زخمی ناک والے نے اس بار براہ راست پاروتی پر خنجر سے وار کیا اور اس کے ساتھ ہی اس نے بھیڑیے کی طرح غراتے ہوئے کہا تھا۔

"تمہاری اور ڈاکٹر کی لاشیں دیکھ کر ٹھاکر کو پتا چل جائے گا کہ رامو سے پنگے بازی کا نتیجہ کیا ہوتا ہے۔ آئندہ وہ رامو کا راستہ کاٹنے کی کوشش نہیں کرے گا۔"

وہ دونوں پے در پے خنجروں سے شیام سندر پر وار کرتے رہے اور پاروتی اسے بچانے کے لیے بار بار لپکتی رہی اور بالآخر وہ زخموں سے چور ہو کر گر پڑی۔

"میں شاید بے ہوش ہوگئی تھی۔" اس نے بتایا "پتا نہیں کتنی دیر بعد مجھے ہوش آیا۔ اس وقت ہمارا پڑوسی پریم چند میرے اوپر جھکا ہوا تھا۔ وہ پوچھ رہا تھا' یہ سب کیسے ہوا۔ وہ کون لوگ تھے۔ اس کی آواز مجھے بہت دور سے آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ میرے منہ سے صرف رامو کا نام نکل سکا تھا۔ اس کے بعد مجھے کچھ ہوش نہیں رہا۔"

پاروتی کے اس بیان سے تصدیق ہوگئی کہ ڈاکٹر شیام سندر کا قاتل رامو ہی تھا۔ وہ دو مرتبہ ہمارے ہاتھوں ہزیمت اٹھا چکا تھا۔ پہلی مرتبہ مجھ سے اس وقت پٹا تھا جب اس نے مجھے اور سونیا کو ویران سڑک پر روکا تھا اور دوسری مرتبہ گزشتہ رات جب اس نے مجھے اور ٹھاکر کو سیکریٹریٹ کے عقب میں سنسان سڑک پر روک کر ہمیں کچھ سبق سکھانے کی کوشش کی تھی لیکن خود ہی گدھے کی طرح مار کھا کر بھاگ نکلا تھا۔

بلونت سنگھ انتقام تو مجھ سے لینا چاہتا تھا۔ پہلے اس نے متعصب پنڈتوں اور پجاریوں کو میرے اور روپ متی کے پیچھے لگایا۔ اپنی اس کوشش میں ناکام ہو کر اس نے رامو جیسے غنڈے کی خدمات حاصل کیں۔ رامو کو اپنی طاقت پر بہت گھمنڈ تھا۔ وہ اس شہر کا بہت بڑا بدمعاش تھا۔ آٹھ قتل اس کے کھاتے میں تھے۔ سیکڑوں لوگوں کی موجودگی میں قتل جیسی سنگین وارداتیں کرکے بھی وہ قانون کی زد سے بچا ہوا تھا۔ شہر میں اس کے نام کی دہشت تھی۔ اسے گھمنڈ تھا کہ کوئی اس کے سامنے آنکھ نہیں اٹھا سکتا اور یہ شاید پہلا موقع تھا کہ اسے دو مرتبہ ہزیمت اٹھانی پڑی تھی۔

رامو مجھے انوا کرکے بلونت سنگھ کے پاس پہنچانا چاہتا تھا لیکن دونوں مرتبہ اپنی کوشش میں ناکام ہوچکا تھا۔ ٹھاکر

بھانوت سنگھ کو میری پشت پر پا کر وہ جھنجلا گیا تھا اور اس جھنجلاہٹ میں اس نے شیام سندر کو بے دردی سے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ وہ یقیناً پاروتی کو بھی زندہ نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ پاروتی کے اس بیان سے اس کے اس گھناؤنے عزائم کی تصدیق بھی ہوتی تھی اور وہ غالباً پاروتی کو مردہ سمجھ کر ہی چھوڑ گیا تھا۔ پاروتی کے جسم پر بھی خنجروں کے اتنے گھاؤ لگے تھے کہ اس کے زندہ بچ جانے کی امید کی بھی نہیں جاسکتی تھی لیکن وہ بڑی خوش قسمت ثابت ہوئی تھی۔ اتنا زیادہ خون بہہ جانے کے باوجود وہ بچ گئی تھی۔

رامو نے شاید یہ سوچا ہوگا کہ شیام سندر کے قتل کے بعد ٹھاکر سمندر کے جھاگ کی طرح بیٹھ جائے گا لیکن میں دیکھ رہا تھا کہ رامو کا نام سامنے آنے کے بعد ٹھاکر بھانوت سنگھ اس شیر کی طرح بپھر گیا تھا جسے زخمی کرکے چھوڑ دیا گیا ہو۔ میں اسے بڑی مشکل سے سنبھالے ہوئے تھا۔ اس کا بس نہیں چلتا تھا کہ ابھی جاکر رامو کے ٹکڑے ٹکڑے کرڈالے۔

پولیس نے ٹھاکر بھانوت سنگھ کا بیان بھی قلم بند کیا تھا اور ٹھاکر نے یہ بتا دیا تھا کہ گزشتہ رات رامو اور اس کے آدمیوں نے اسے راستے میں گھیر کر حملہ کیا تھا مگر خود ہی مار کھا کر بھاگ نکلا تھا اور اپنی اس شکست کا بدلہ لینے کے لیے اس نے شیام سندر کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ ٹھاکر نے اپنے بیان میں میرا نام تک نہیں لیا تھا اور اپنے گن مین کے زخمی ہونے کا تذکرہ بھی گول کرگیا تھا۔

ہمیں وہ رات بھی اسپتال ہی میں گزارنی پڑی۔ صبح آٹھ بجے کے قریب ڈاکٹر شیام سندر کی ڈیڈ باڈی ہمارے حوالے کردی گئی۔

ڈاکٹر شیام سندر کے کریا کرم (آخری رسومات) کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ حویلی میں بہت سے لوگ جمع تھے۔ ان میں عورتیں بھی تھیں اور مرد بھی۔ کئی سابق راجے مہاراجے تھے جو ٹھاکر کو گلے سے لگا لگا کر اسے دلاسا دے رہے تھے۔ ٹھاکر کا تعلق بھی کسی معمولی خاندان سے نہیں تھا۔ اسے سوسائٹی میں ایک اعلیٰ اور معزز مقام حاصل تھا۔ سب لوگ یہ بھی جانتے تھے کہ ڈاکٹر شیام سندر مالی کا بیٹا تھا۔ وہ نیچ ذات کا تھا مگر اسے ٹھاکر انی نے پالا تھا۔ اپنے سگے بیٹے کی طرح پرورش کی تھی۔ اسے اعلیٰ تعلیم دلائی تھی۔ ڈاکٹر بنایا تھا۔ ٹھاکر بھانوت سنگھ بھی اسے اپنے سگے بھائی کی طرح مانتا تھا۔ لوگ ان دونوں کی ایک دوسرے سے محبت سے آگاہ تھے۔ لوگ یہ بھول گئے تھے کہ شیام سندر نیچ جاتی کا تھا۔ وہ اسے ٹھاکر کا چھوٹا بھائی سمجھ کر اس کی موت کا پرسہ دینے آرہے تھے۔

سہ پہر کے قریب ارتھی اٹھائی گئی۔ جنازے کے اس جلوس میں سیکڑوں لوگ تھے اور میں پہلی مرتبہ کسی ہندو کے جنازے میں شریک ہوا تھا۔ ہر طرف سے "رام نام ست ہے۔ ہری اوم' ہری اوم۔ نارائن نارائن" اور مختلف آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

شمشان گھاٹ میں بھی بہت سے لوگ جمع تھے۔ کریا کرم کی تمام تیاریاں مکمل تھیں۔ چتا تیار تھی۔

شیام سندر کی لاش کو چتا پر لٹا کر رسیوں سے باندھ دیا گیا۔ میں یہ تو جانتا تھا کہ ہندو اپنے مُردوں کو جلاتے ہیں لیکن اپنی آنکھوں سے دیکھنے کا یہ پہلا موقع تھا اور یہ سب کچھ دیکھ کر مجھے بڑی حیرت ہو رہی تھی۔ لاش کے اوپر مزید لکڑیاں ڈال کر اسے پوری طرح ڈھک دیا گیا۔ جگہ جگہ ان لکڑیوں میں عود و لوبان ڈالا گیا۔ گھی کے دو کنستر چتا پر انڈیل دیے گئے۔ اس وقت وہاں تین چار پنڈت موجود تھے جو یہ سارے کام کرتے ہوئے اشلوک پڑھ رہے تھے اور پھر ٹھاکر بھانوت سنگھ نے چتا کو آگ دکھا دی۔ بھائی ہونے کے ناتے چتا کو آگ لگانا اسی کا ادھیکار (حق) تھا۔

لکڑیاں چٹخنے لگیں۔ آگ کے شعلے بلند ہوتے گئے۔ گاڑھا دھواں ہوا کے دوش پر ہماری مخالف سمت پھیلتا ہوا اوپر کو اٹھ رہا تھا۔

فضا میں عود و لوبان اور گھی کے جلنے کی خوشبو پھیلتی رہی اور پھر گوشت کے جلنے کی چراند پھیلنے لگی۔ میں بار بار تھتھنے سکوڑ رہا تھا۔ ماس (گوشت) کے جلنے کی بو بڑھتی جارہی تھی۔ مجھے متلی سی محسوس ہونے لگی۔ دماغ جیسے سڑ رہا تھا۔ میں نے کن انکھیوں سے اِدھر اُدھر دیکھا۔ سب لوگ بڑے اطمینان سے کھڑے جلتی ہوئی چتا کی طرف دیکھ رہے تھے۔ کسی کے چہرے پر ناگواری کا تاثر نہیں تھا۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں وہاں سے دور ہٹ جاؤں مگر دل پر جبر کیے کھڑا رہا۔

شعلے ماند پڑ گئے۔ اب صرف دہکتے ہوئے انگارے تھے اور انہیں ٹھنڈا ہونے کے لیے پوری رات کی ضرورت تھی۔

جب ہم واپس آئے تو شام ہو رہی تھی۔ حویلی کی فضا سوگوار تھی اور یہ سوگواری تین دن تک پوری شدومد کے ساتھ برقرار رہی۔ لوگ پرسے کے لیے آتے رہے۔

ٹھاکر کیا ہم میں سے کوئی بھی تین دن تک حویلی سے باہر نہیں نکلا تھا۔ تین دن تک ٹھاکر کا ریسٹورنٹ بند رہا۔ البتہ رہائشی ہوٹل کھلا رہا۔

کے بعد حویلی کی زندگی معمول پر آنے لگی۔ باہر سے آنے والے جو مہمان حویلی میں ٹھہرے ہوئے تھے' ایک ایک کرکے رخصت ہوگئے۔ میں' جانکی اور روپ متی رہ گئے۔

ٹھاکر نے اپنا کاروبار منیجروں کے حوالے کردیا تھا اور خود کو اس نے رامو سے انتقام لینے کے لیے مکمل طور پر تیار کرلیا تھا اور ظاہر ہے میں اس کے ساتھ تھا۔ یہ سب کچھ میری وجہ سے ہوا تھا تو میں پیچھے کیسے رہ سکتا تھا۔ جانکی اور روپ متی کو ٹیلے والی حویلی میں واپس بھیج دیا گیا۔ بملا بھی ان کے ساتھ ہی چلی گئی تھی۔ رامو اور بلونت سنگھ جیسے کینے دشمنوں سے کسی بھی اقدام کی توقع کی جاسکتی تھی اس لیے حویلی میں جانکی وغیرہ کی حفاظت کا بھی معقول بندوبست کردیا گیا تھا۔

اگلے روز دوپہر کے وقت میں اور ٹھاکر بھی وہاں پہنچ گئے۔ سہ پہر کے قریب ہم واپس آگئے اور شہر میں رامو کی تلاش شروع کردی اور رامو اتنا بے وقوف نہیں تھا کہ ٹھاکر کے بھائی کو قتل کرنے کے بعد آزادی سے گھومتا رہتا۔ ایک طرف پولیس اس کی تلاش میں چھاپے مار رہی تھی اور دوسری طرف ہم اس کا کھوج لگاتے پھر رہے تھے۔

مجھے ایسے کاموں کا بہت تجربہ تھا۔ زندگی ایسے ہی ہنگاموں میں گزری تھی۔ میں جانتا تھا کہ رامو جیسے لوگوں کو کس طرح تلاش کیا جاسکتا ہے۔ میں نے ٹھاکر کے سامنے اپنے خیال کا اظہار کیا تو وہ چونک گیا۔

"تم چاہتے ہو کہ ایک بدمعاش سے نمٹنے کے لیے دوسرے بدمعاشوں کو سر پر بٹھا لیا جائے۔" اس نے مجھے گھورا۔

"ایسا نہیں ہوگا ٹھاکر۔" میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "میری زندگی ایسے ہی لوگوں سے نمٹتے ہوئے گزری ہے۔ اس بڑے بدمعاش کا پتا چھوٹے بدمعاشوں ہی سے معلوم کیا جاسکتا ہے۔ انہی کے توسط سے ہم رامو تک پہنچ سکتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔" بات ٹھاکر کی سمجھ میں آگئی۔ وہ مٹھیاں بھینچتے ہوئے بولا "کاش! مجھے ایک موقع مل جائے۔ میں اس کا وہ حشر کروں گا کہ آئندہ کسی بدمعاش کو کسی شریف آدمی کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی ہمت نہیں ہوگی۔"

"چنتا مت کرو۔ تمہیں ایسا موقع ضرور ملے گا۔" میں نے کہا۔

اور پھر اسی رات ہم نے شہر کے ان علاقوں کے چکر لگانے شروع کردیے جہاں غنڈوں اور بدمعاشوں سے سامنا ہونے کی توقع تھی۔ زور آور گیٹ' تپولیا بازار' گھاٹ دروازہ' رام گنج بازار' نیو گیٹ' اسٹیشن روڈ۔ ہم نے کوئی ایسی جگہ نہیں چھوڑی جہاں عملی طور پر غنڈوں اور بدمعاشوں کا راج تھا لیکن ان دنوں پولیس کی سرگرمیاں بھی عروج پر تھیں۔ رامو کی تلاش میں جگہ جگہ چھاپے پڑ رہے تھے۔ چھوٹے موٹے غنڈوں کو بھی پکڑ کر بند کیا جارہا تھا۔ بہت سے غنڈے اپنے آپ کو بچانے کے لیے روپوش ہوگئے تھے۔

چوتھے روز کشن پول بازار میں اجمیری گیٹ کے قریب بھگت نامی ایک شخص سے ملاقات ہوہی گئی۔

بھگت کی عمر چالیس کے لگ بھگ تھی۔ گٹھے ہوئے مضبوط جسم کا مالک تھا اور شکل ہی سے غنڈا لگتا تھا۔ اس نے نیلی جینز اور گھٹنوں تک لمبا کھدر کا کرتہ پہن رکھا تھا۔

رامو کا نام سن کر وہ گڑبڑا سا گیا۔ اس نے گہری نظروں سے ہم دونوں کا جائزہ لیا۔

"رامو دادا آج کل روپوش ہے۔ پولیس اس کی تلاش میں جگہ جگہ چھاپے مار رہی ہے۔ اسے تو اس کے فرشتے بھی تلاش نہیں کرسکتے مگر تم کون ہو اور اس سے کیوں ملنا چاہتے ہو؟" اس نے پوچھا۔

"ایک کام لینا چاہتے ہیں اس سے۔" میں نے کہا "اگر تم اس کے بارے میں کوئی صحیح اطلاع دے سکو۔ میرا مطلب ہے رابطے کا کوئی ذریعہ بتا سکو تو تمہارا بھی کچھ فائدہ ہوسکتا ہے۔" میں نے بات کرتے ہوئے پتلون کی ایک جیب سے نوٹوں کی ایک موٹی سی گڈی نکال کر دوسری جیب میں منتقل کرلی۔ میرا انداز ایسا تھا جیسے یہ حرکت مجھ سے غیر ارادی طور پر سرزد ہوئی ہو۔

میرا مقصد پورا ہوگیا تھا۔ نوٹوں کی گڈی دیکھ کر بھگت کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ اس نے محتاط نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھا پھر بولا۔

"یہاں بات کرنا مناسب نہیں۔ میرے پیچھے پیچھے چلے آؤ۔"

ابھی رات کے دس بجے تھے۔ وہ بارونق علاقہ تھا۔ جگہ جگہ ریستوران تھے۔ کھانے پینے کی دکانیں تھیں۔ شراب خانے تھے۔ پان سگریٹ کے کیبن تھے۔ اِدھر اُدھر لوگ کھڑے تھے۔ ہمیں بھگت کے ساتھ دیکھ کر کسی کو شبہ ہوسکتا تھا۔ شاید بھگت بھی کچھ ڈرا ہوا تھا اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ کوئی ہمیں اس کے ساتھ دیکھ لے۔

وہ ہمیں لے کر ایک تاریک گلی میں گھس گیا۔ ہم اس سے آٹھ دس قدم پیچھے چل رہے تھے۔ دو اور گلیاں گھوم کر وہ

ایک جگہ رک گیا۔ ہمارے ساتھ دھوکا بھی ہوسکتا تھا لیکن ہم پوری طرح محتاط تھے۔

وہ بہت پرانی سی عمارت تھی جس میں چھوٹی چھوٹی کھولیاں بنی ہوئی تھیں۔ اس نے ایک کھولی کا دروازہ کھولا۔ اندر داخل ہو کر بتی جلائی اور ہمارے اندر داخل ہونے کے بعد دروازہ بند کردیا۔

"میں اس علاقے کی پولیس کے ایک ایک منش کو جانتا ہوں۔" وہ ہم دونوں کو نیچے سے اوپر تک دیکھتے ہوئے بولا "تم دونوں پولیس والے تو نہیں ہوسکتے۔ سی بی آئی سے ہو یا سی آئی ڈی سے؟"

"ہمارا تعلق نہ تو پولیس سے ہے نہ سی آئی ڈی اور نہ سی بی آئی سے۔" میں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا "لیکن کیا تم یہی کہنے کے لیے ہمیں یہاں لائے تھے؟"

"سے (وقت) بڑا نازک جارہا ہے مہاراج۔" اس نے دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا "من کی چنتا دور کرلینا ضروری ہے۔ ویسے تم لوگ رامو کو تلاش کیوں کررہے ہو؟"

"اس سے ایک کام لینا ہے۔" میں نے کہا۔

"کیا میں وہ کام نہیں کرسکتا۔ بھگت کا بھی علاقے میں بڑا ٹہکا ہے۔" اس نے کہا۔

"وہ آدمیوں کو قتل کرسکتے ہو؟" میں نے اس کے چہرے پر نظریں جمادیں۔

"نہ..... نہ سرکار۔" وہ جلدی سے بولا "اپن تو چھوٹے چھوٹے کام کرنے کا ہے۔ کسی کی پٹائی کرنی ہے۔ کسی کو اٹھانا ہے۔ کوئی لونڈیا چاہیے۔ بس سرکار۔ قتل جیسے کام میں اپن ہاتھ نہیں ڈالتا۔ ویسے....." وہ چند لمحے خاموش ہوا پھر بولا "ویسے اگر رامو مل بھی گیا تو وہ بھی تمہارا کام نہیں کرے گا۔ آج کل اس کا ستارہ بھی گروش میں ہے اور وہ چوہے کی طرح کسی بل میں گھسا ہوا ہے۔"

"کیوں۔ کیا وہ اتنا ہی بزدل ہے۔" میں نے کہا "ہم نے تو سنا ہے کہ وہ بڑا جگری آدمی ہے۔ پرجوم بازار میں کسی کو موت کے گھاٹ اتار دے تو پولیس اس پر ہاتھ نہیں ڈال سکتی۔"

"پہلے ایسا ہی تھا۔ پر نتو اب اس کا سے بدل گیا ہے۔" بھگت نے کہا "اس نے ایک غلط آدمی پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔ اس کے بھائی کا قتل کردیا۔ ٹھاکر بھانوت سنگھ اس شہر کا بہت بڑا اور عزت والا آدمی ہے۔ وہ اپنے بھائی کی ہتیا کا بدلہ لینے کے لیے بیاکل ہوا پھر رہا ہے۔ پر تم لوگ کس دنیا میں رہتے ہو۔ کیا تمہیں یہ سب کچھ معلوم نہیں۔ پورے شہر کی پولیس رامو کو کھوجتی پھر رہی ہے۔"

"ہمیں واقعی معلوم نہیں ہے۔" میں نے جواب دیا "ہم لوگ بیکانیر سے آئے ہیں لیکن کیا تم ٹھاکر بھانوت سنگھ کو جانتے ہو؟"

"وہ مہارُش (بڑا آدمی) ہے۔" بھگت نے جواب دیا "اپن نے اس کو دیکھا نہیں ہے۔ پر اس کے بارے میں سنا بہت کچھ ہے۔ اپن کا ایسا نصیب کہاں کہ اس جیسے مہان دیوتا کے درشن کرسکیں۔ پر مہاراج۔" وہ باری باری ہم دونوں کی طرف دیکھنے لگا "تم لوگ اپنا سے برباد نہ کرو۔ میری مانو تو بیکانیر واپس چلے جاؤ۔ پولیس رامو کا کھوج نہیں لگا سکی، تم کیا کرو گے۔ اپنے کام کے لیے بیکانیر ہی میں کسی کو تلاش کرلو۔"

میں نے ٹھاکر کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں بھی چمک سی ابھر آئی تھی اور میں بھی دل ہی دل میں مسکرا رہا تھا۔ بھگت ایک بدمعاش ضرور تھا لیکن اس کے دل میں کھوٹ نہیں تھا اور پھر ٹھاکر کے بارے میں بھی اس کے خیالات بہت اچھے تھے۔ وہ ہمارے کام آسکتا تھا۔

"بھگت۔" میں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا "اگر میں یہ کہوں کہ ٹھاکر بھانوت سنگھ کو رامو کی تلاش ہے تو کیا تم ہماری کچھ مدد کرو گے؟"

"ٹھاکر کو اپن دیکھا نہیں ہوں۔ لیکن ہاں بہت سنی ہیں۔ پر نتو اپنا نصیب کہاں کہ اس مہارُش کی کوئی سیوا (خدمت) کرسکوں۔ اپن تو بہت تھرڈ کلاس آدمی ہوں۔ چرس بیچ کر اور گانم گلوچ کرکے ایک وقت پیٹ بھر کے روٹی کھاتا ہوں۔ وہ ٹھاکر بھانوت سنگھ۔ کہاں وہ مہان ہستی اور کہاں بھگتا دھوبی۔ وہ کیا کہتے ہیں مہاراج۔ کہاں راجا بھوج اور کہاں گنگوا تیلی۔"

"راجا بھوج تمہارے سامنے ہے۔" میں نے کہا "ٹھاکر بھانوت سنگھ اس وقت تمہارے سامنے کھڑا ہے اور یہ تمہارے نصیب ہیں کہ یہ خود چل کر تمہارے پاس آئے ہیں۔"

"کیا.....!" بھگت اچھل پڑا۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ٹھاکر کو دیکھنے لگا پھر اس نے دیوار میں بنی ہوئی ہنومی الماری کے کنکریٹ کے سلیب پر رکھے ہوئے چند کپڑے اٹھا کر جھلنگا سی چارپائی پر پھینک دیے اور سلیب پر بچھا ہوا ہندی کا اخبار اٹھالیا۔

یہ اخبار کئی مہینے پرانا تھا اور صفحہ اول پر ٹھاکر بھانوت سنگھ کی تصویر چھپی ہوئی تھی۔ وہ ایک مندر کے سامنے

غریبوں میں کپڑے بانٹ رہا تھا۔ یہ تصویر اس کی ماتا جی کی برسی کے موقع پر کھینچی گئی تھی۔

بھگت کبھی تصویر کو دیکھتا کبھی سامنے کھڑے ہوئے ٹھاکر کو اور پھر اس نے بڑی تیزی سے جھک کر ٹھاکر کے چرن (قدم) چھوئے اور دونوں ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہوگیا۔

"میرے بھاگ۔" وہ بولا "کیا سیوا کروں مہاراج۔ چائے، ٹھنڈا۔" وہ بہت خوش نظر آرہا تھا جیسے کوئی دیوتا آکاش سے اتر کر اس کے سامنے آگیا ہو۔

"رامو کی تلاش کے سلسلے میں ہماری مدد کرسکو تو یہی تمہاری بہت بڑی سیوا ہوگی بلکہ ہم پر بہت بڑا احسان ہوگا۔"

"مجھے شرمندہ مت کیجئے مہاراج۔" بھگت بولا "رامو نے آپ کے بھائی کی ہتیا کرکے آپ کا بہت اپمان (بے عزتی) کیا ہے۔ پر نتو آپ نراش (دکھی) نہ ہوں۔ آپ کا یہ سیوک (خدمت گار) موجود ہے مہاراج۔ وہ بدمعاش جہاں کہیں بھی ہے اسے کھوج کر آپ کے چرنوں پر ڈال دے گا۔ آپ بیٹھئے نا۔" اس نے جلدی سے کمرے میں موجود واحد سالخوردہ سی کرسی صاف کی۔ بستر کی چادر جھاڑ کر بچھائی اور ہم سے ایک بار پھر بیٹھنے کی درخواست کی۔

ہم دونوں نے معنی خیز نگاہوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا پھر ٹھاکر تو کرسی پر بیٹھ گیا اور میں چارپائی کی پٹی پر ٹک گیا اور اس سے پہلے کہ ہم دونوں میں سے کوئی کچھ کہتا، بھگت دروازہ کھول کر تیزی سے باہر نکل گیا۔ اس کی واپسی تقریباً دس منٹ بعد ہوئی تھی۔ وہ تھمزاپ (THUMBS-UP) کی ٹھنڈی بوتلیں لے کر آیا تھا۔ اس نے بوتلیں کھول کر اسٹرا لگائے اور بوتلیں ہماری طرف بڑھا دیں۔

"میں جات کا دھوبی ہو سرکار۔" وہ بولا "پر نتو سنا ہے آپ ان باتوں پر دھیان نہیں دیتے۔ یہ آپ کی مہانتا ہے۔"

"میں ایسی باتوں پر واقعی دھیان نہیں دیتا بھگت۔" ٹھاکر نے یہ کہتے ہوئے اس کے ہاتھ سے بوتل لے لی۔

دوسری بوتل میں نے لے لی۔ اس نے میرے بارے میں پوچھا تو مجھ سے پہلے ٹھاکر بول اٹھا۔

"یہ ہمت سنگھ ہے۔ میرا متر....."

"او..... ہمت سنگھ!" بھگت کی آنکھوں میں چمک ابھر آئی "آپ کے ناؤں کا بھی بڑا چرچا ہے مہاراج۔ آج تو واقعی میرے بھاگ جاگ اٹھے ہیں۔"

بھگت تو ہمارے آنے سے خوش تھا ہی، میں بھی دل ہی دل میں خوش ہورہا تھا کہ ہم ٹھیک آدمی کے پاس پہنچے تھے۔ میں کولڈ ڈرنک کی چسکیاں لیتے ہوئے کمرے کا جائزہ لے رہا تھا۔ یہ کمرا دس بائی دس فٹ سے زیادہ نہیں تھا۔ دیواریں کالی ہورہی تھیں اور پلستر جگہ جگہ سے ادھڑا ہوا تھا۔ فرش اینٹوں کا تھا اور یہ بھی جگہ جگہ سے ٹوٹا ہوا تھا۔ ایک دیوار میں تو وہی ہنومی الماری تھی جس میں کنکریٹ کے تین سلیب لگے ہوئے تھے۔ ایک خانے میں کپڑے تھے۔ دوسرے خانے میں کنگھا، چنبیلی کے تیل کی بوتل، ایک چٹخا ہوا آئینہ اور اسی قسم کی چیزیں رکھی ہوئی تھیں۔ سب سے اوپر والے خانے میں کالی کی مورتی بھی رکھی ہوئی نظر آرہی تھی۔ سامنے والی دیوار پر کھونٹیوں پر چند میلے کپڑے ٹنگے ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ دیواروں پر کمی کا ٹکر، ہیما، سری دیوی اور دیگر فلم ایکٹریسوں کی نیم عریاں رنگین تصاویر چسپاں تھیں۔ یہ تصویریں اخباروں اور رسالوں سے کاٹ کر یہاں چپکائی گئی تھیں۔

بھگت کو غالباً کمرے کی صفائی کا کوئی دھیان نہیں تھا۔ فرش پر اِدھر اُدھر سگریٹوں کے ٹوٹے بکھرے ہوئے تھے جن کی وجہ سے کمرے میں کچھ ناگوار سی بو پھیلی ہوئی تھی۔ پچھلی دیوار میں بھی ایک دروازہ تھا اور یہ دروازہ غالباً عمارت کے کمپاؤنڈ میں کھلتا تھا۔

کمرے کی حالت دیکھ کر اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ بھگت کا دھندا کچھ ٹھیک نہیں چل رہا تھا اور غالباً اس نے یہ بات بھی ٹھیک ہی کہی تھی کہ وہ اپنے علاقے میں تھوڑی بہت بدمعاشی دکھا کر روٹی کا بندوبست کرلیا کرتا تھا۔

"ہاں تو بھگت۔" میں نے خالی بوتل ایک طرف رکھتے ہوئے کہا "تم رامو کی تلاش میں ہماری کیا سہائتا (مدد) کرسکتے ہو؟"

"سیدھے سیدھے رامو کو تلاش کرنا تو بڑا کٹھن ہے مہاراج ہے۔" اس نے جواب دیا "اس کے قریب کے آدمی بھی روپوش ہوچکے ہیں۔ پر میں ایک ایسے بندے کو جانتا ہوں جو ہمیں اس کا پتا بتا سکتا ہے۔"

"کون ہے وہ؟" مجھ سے پہلے ٹھاکر نے سوال کرڈالا۔

"کرن ناؤں (نام) ہے اس کا۔" بھگت نے جواب دیا "وہ رام گنج بازار میں رہتا ہے۔"

"کیا تم ابھی ہمیں اس کے پاس لے جاسکتے ہو؟" ٹھاکر نے کہا۔

"دھیرج مہاراج۔ بیاکل نہ ہوں۔" بھگت نے کہا "وہ بہت چھل کپٹ (عیار) آدمی ہے۔ تم دونوں کو میرے ساتھ دیکھ کر تڑنت (فوراً) سمجھ جائے گا کہ کوئی گڑبڑ اُدّر (ضرور)

ہے اور ہو سکتا ہے وہ آپ کو جانتا بھی ہو۔" اس نے ٹھاکر کی طرف اشارہ کیا "میں آج ہی جا کر پتا کرتا ہوں کہ وہ اپنے ٹھکانے پر ہے بھی یا نہیں۔ ہم کل رات کو اس پر چھاپا ڈالیں گے۔"

ٹھاکر کے منہ سے گہرا سانس نکل گیا۔ اس نے میری طرف دیکھا۔

"بھگت ٹھیک کہتا ہے۔" میں نے کہا "جلد بازی میں کام بگڑ سکتا ہے۔ ایک امید پیدا ہوئی ہے اگر کرن کو شبہ ہو گیا تو وہ بھی روپوش ہو جائے گا۔ بہتر ہو گا کہ پوری جانکاری ملنے کے بعد ہم اگلا قدم اٹھائیں۔"

"میری بھی یہی رائے ہے ٹھاکر جی۔" بھگت نے پہلی مرتبہ اسے ٹھاکر کہہ کر مخاطب کیا "میں آج رات کرن کے بارے میں پوری جانکاری پراپت (حاصل) کروں گا۔ کل اسی سمے آپ یہاں آجائیں۔"

"ہم یہاں نہیں آئیں گے۔" ٹھاکر نے کہا "تم میرے ہوٹل آجانا۔ وکرم ہوٹل۔ اسٹیشن روڈ پر ہے۔ دیکھا ہے نا؟"

"ضرور دیکھا ہے سرکار۔" بھگت بولا "پر باہر سے۔ ہم جیسے لوگ اس کے اندر جانے کی ہمت نہیں کر سکتے۔"

"کل، تمہیں کوئی نہیں روکے گا۔" ٹھاکر بولا "رات دس بجے آجانا۔ ہم تمہارے ساتھ چلیں گے۔"

ٹھاکر نے مجھے اشارہ کیا۔ ہم دونوں اٹھ گئے۔ میں نے جیب میں ہاتھ ڈال کر نوٹوں کی گڈی میں سے پانچ سو روپے کا نوٹ نکال کر بھگت کی طرف بڑھا دیا۔ وہ پیسے کے لالچ میں ہی ہمیں کچھ معلومات فراہم کرنے پر تیار ہوا تھا لیکن اس وقت اس نے پانچ سو روپے کا نوٹ لینے سے انکار کر دیا۔

"نہیں مہاراج۔" اس نے دونوں ہاتھ جوڑ دیے اور ٹھاکر کی طرف دیکھنے لگا "میں آپ کا سیوک ہوں ٹھاکر جی۔ یہ۔۔۔"

"یہ تمہارا ادیکار (حق) ہے۔ رکھ لو۔" ٹھاکر نے نرمی سے کہا۔

وہ پھر بھی پیسے لینے کو تیار نہیں تھا۔ میں نے نوٹ اس کی جیب میں ڈال دیا۔

"ہم چلتے ہیں۔" میں نے کہا "تم چند منٹ یہیں رکو۔ ہمارے بعد کھولی سے نکلنا تاکہ کوئی تمہیں ہمارے ساتھ نہ دیکھ سکے۔"

"جو آگیا (حکم) سرکار۔" بھگت نے کہا اور آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔

ہم تاریک گلیوں سے ہوتے ہوئے بازار میں اس جگہ پہنچ گئے جہاں ہماری جیپ کھڑی تھی۔ اس وقت ساڑھے گیارہ بج رہے تھے لیکن بازار کی رونق میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔

ڈرائیونگ سیٹ ٹھاکر ہی نے سنبھالی تھی۔ ہم اجیری گیٹ سے نکل کر ایم آئی روڈ پر آگئے۔ میرا خیال تھا کہ ٹھاکر اپنے ہوٹل یا بھوانی سنگھ مارگ والی حویلی کی طرف جائے گا مگر اس نے جیپ کا رخ آگرہ مارگ کی طرف موڑا تو میں سمجھ گیا کہ وہ کہاں جا رہا ہے۔

آدھے گھنٹے بعد ہم ٹیلے والی حویلی میں پہنچ گئے۔ جانکی وغیرہ جاگ رہی تھیں۔ وہ تینوں روپ متی والے کمرے میں بیڈ پر آدی ترچھی لیٹی باتیں کر رہی تھیں۔ میں کمرے میں جھانک کر واپس آگیا اور وہ بھی کمرے سے نکل کر ہال میں آگئیں۔

"کچھ کامیابی ہوئی؟" روپ متی نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں۔ ایک سراغ تو ملا ہے۔" میں نے گہرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا "لیکن صحیح صورت حال کل رات کو سامنے آئے گی۔"

"کیا مطلب؟" روپ متی نے مجھے گھورا۔

"مطلب یہ کہ ایک آدمی کا پتا چلا ہے جو رامو کی تلاش میں ہماری سہایتا کرنے کو تیار ہے۔" میں نے کہا اور پھر اسے بھگت سے ملاقات کی تفصیل بتانے لگا۔ جانکی اور بملا بھی غور سے ہماری باتیں سن رہی تھیں "کل ہم کرن کو تلاش کریں گے اور مجھے امید ہے کہ ہم کل ہی رامو کی گردن پر ہاتھ ڈال دیں گے۔"

"تم لوگ باتیں کرو۔ مجھے نیند آرہی ہے۔ میں تو چلا۔" ٹھاکر یہ کہتے ہوئے ایک جھٹکے سے اٹھ گیا۔

میں سمجھا وہ دوسری حویلی جانے کی بات کر رہا ہے لیکن اسے اپنے بیڈ روم کی طرف جاتے دیکھ کر میں نے اطمینان کا سانس لیا۔

ٹھاکر کے جانے کے بعد وہ تینوں بھی پھیل کر بیٹھ گئیں۔ میں صوفے پر کچھ بے آرامی سی محسوس کر رہا تھا اس لیے قالین پر بیٹھ کر ٹانگیں آگے پھیلا کر صوفے سے ٹیک لگا لی۔ وہ تینوں بھی قالین پر آگئیں۔

"مندری۔" روپ متی نے مندری کو آواز دی "چائے بنا کر لاؤ۔ اندر سبھا (راجا اندر کی محفل) جمی ہے۔"

جانکی میری طرف دیکھ کر مسکرا دی۔ روپ متی نے ٹھیک کہا تھا۔ یہ اندر سبھا ہی تھی۔ میں راجا اندر بنا بیٹھا تھا اور دنیا کی تین حسین ترین عورتیں میرے سامنے بیٹھی تھیں

لیکن میں راجا اندر ہوتے ہوئے بھی راجا اندر نہیں تھا۔

میری فطرت اس سے بہت مختلف تھی۔ میں عیاش نہیں تھا۔ زندگی میں ایسے بہت سے مواقع آئے تھے۔ کئی حسین لڑکیاں میری زندگی میں آئی تھیں اور ہوا کے خوشگوار جھونکے کی طرح نکل گئی تھیں۔ میں نے کسی کی طرف ان نظروں سے نہیں دیکھا تھا جو میرے دل میں ہوس کی نشان دہی کرتی ہوں۔ ایک مرتبہ۔۔۔ صرف ایک مرتبہ میں بہکا تھا۔ مجھے گولڈن ٹرائی اینگل کے اس غار میں سونیا کے ساتھ گزرنے والی وہ رات اب بھی یاد تھی جب سونیا نے مجھے زیر کر لیا تھا اور میں آج تک اپنے آپ سے شرمندہ تھا۔ جانکی کئی برسوں سے میرے ساتھ تھی۔ کئی مرتبہ اس نے مجھے گھیرنے کی کوشش کی تھی۔ اپنے حسن کے چٹکارے دکھائے تھے مگر میں ہر مرتبہ اپنے آپ کو بچاتا رہا تھا اور اب تو وہ مجھے اکثر سادھو کہہ کر پکارا کرتی تھی۔

یہاں روپ متی بھی تھی۔ اس نے بھی اس پہاڑ کو سر کرنے کی کوشش کی تھی مگر سنگلاخ چٹانوں سے سر ٹکرا کر رہ گئی تھی۔ میرے سامنے بیٹھی ہوئی یہ وہی روپ متی تھی جو گیارہ لاکھ کی آبادی والے اس گلابی شہر میں سیکس کی دیوی کے نام سے مشہور تھی۔ اس نے اپنے آپ کو اتنا گرا لیا تھا کہ ہوٹلوں کے ویٹر اور سڑک چھاپ تھرڈ ریٹ غنڈے بھی اس کے حسن و شباب سے فیض یاب ہونے کی امیدیں لگائے بیٹھے تھے۔ وہ بھول گئی تھی کہ وہ ایک راج کماری ہے۔ اس کا تعلق ایک عزت دار اور معزز گھرانے سے ہے۔

مجھے بھی وہ غلاموں کی منڈی سے اسی لیے خرید کر لائی تھی کہ مجھ سے اپنی ہوس کی بھڑکتی ہوئی آگ کو ٹھنڈا کر سکے۔ اس مقصد کے لیے روایتی حربوں میں ناکام ہونے کے بعد اس نے نشہ آور مشروب (سوم رس) پلا کر مجھے زیر کرنے کی کوشش بھی کی تھی لیکن اسے اس میں بھی ناکامی ہوئی تھی اور اپنی اس غلطی کا خمیازہ اسے اس طرح بھگتنا پڑا تھا کہ اس کے دشمنوں کو وار کرنے کا موقع مل گیا۔

مجھے وہ رات بھی یاد تھی جب شراب کے نشے میں مدہوش روپ متی نے ایک بار پھر مجھ پر چڑھائی کرنے کی کوشش کی تھی اور اس رات اس کے رخسار پر پڑنے والا میرا تھپڑ ہی اسے ہوش میں لے آیا تھا اور یہ وہی روپ متی تھی جو پہلے میری آقا تھی اور اب میری غلام بن گئی تھی۔

میں نے اسے ذلت و رسوائی کی دلدل سے نکالا تھا اور اس کے لیے تو اس کا پرانا دوست ٹھاکر بھانوتھ سنگھ بھی میرا شکر گزار تھا جو کچھ عرصہ پہلے اس کی طرف سے مایوس ہو چکا تھا اور اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا تھا۔

اور اس کے بعد حالات کچھ ایسا رخ اختیار کرتے گئے کہ ہم طاغوتی قوتوں کے چکر میں پھنس کر رہ گئے اور ان باطل قوتوں کا مقابلہ کرنے کے لیے ہم ایک اکائی بن گئے تھے۔

میری وجہ سے یہاں قتل و غارت شروع ہوئی تھی۔ روپ متی کے اور ٹھاکر کے نئے نئے دشمن پیدا ہو رہے تھے۔ ٹھاکر کا منہ بولا بھائی ڈاکٹر شیام سندر جو اسے سگے بھائی کی طرح پیارا تھا' بے دردی سے مارا گیا تھا۔

میں جب پیچھے مڑ کر دیکھتا ہوں تو بہت سی باتیں یاد آجاتی ہیں۔ وہ چہرے میری نظروں کے سامنے گھوم جاتے ہیں جنہوں نے میری خاطر اپنی جانیں قربان کر دیں۔ تھائی وانگ' چاچا پرتاب سنگھ' ماسٹر پھوکٹ' گانگ' رامن پرساد' پامیلا' ماسٹر پھوپھانگ اور نجانے کون کون۔ کس کس کو یاد کروں۔ کس کس کا نام لے کر آنسو بہاؤں۔

ممکن ہے میری اس سرگزشت کے کچھ حصے بعض پڑھنے والوں کو گراں گزریں لیکن جن لوگوں نے میری طرح مصیبتیں اٹھائی ہیں۔ دکھ جھیلے ہیں۔ مجھ جیسے ناگفتہ بہ حالات کا شکار رہے ہیں انہیں میرے درد اور کرب کا احساس ضرور ہو گا۔

میرا ورد' میری ذات کا دکھ' میرا کرب۔ میری گردشیں اور میرے مصائب ایسے نہیں کہ کوئی عام آدمی اس کا تصور بھی کر سکے۔ ایک کے بعد ایک حادثہ' یکے بعد دیگرے امتحان اور آزمائشوں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ۔ میرے اندر شکست و ریخت کے یہ مرحلے۔ اہل دل ہی انہیں محسوس کر سکتے ہیں۔ میری یہ داستان پڑھ کر انہی لوگوں کی آنکھوں سے آنسو ٹپکے ہوں گے جو کبھی خود ایسے الم ناک حادثات سے دوچار رہ چکے ہوں۔

گیارہ بارہ سال کا ایک معصوم بچہ جس کی نظروں کے سامنے اس کے ماں باپ کو بڑی بے دردی سے ذبح کر دیا گیا۔ وہ ان قاتلوں سے اپنے آپ کو بچانے کے لیے چھپتا پھرا' بھاگتا رہا۔ جس نے بھی اسے پناہ دی اسے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ آج وہی بچہ جوان ہے۔ اس کی کوئی منزل نہیں۔ اس کے سامنے کوئی راستہ نہیں۔ اس نے اپنے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کو بھولنا بھی چاہا تو نہیں بھولنے دیا گیا۔ زندگی کے ہر موڑ پر اسے ایک نیا زخم لگا دیا جاتا پھر وہ اپنے ماضی کو کیسے بھولتا۔ اس کے سینے میں انتقام کا لاوا کھولتا رہا جو بالآخر آتش فشاں بن کر پھٹ پڑا۔ اب اس کا ایک ہی مقصد تھا۔۔۔ انتقام! اپنے ماں باپ کا' اپنے ان ہمدردوں اور پیاروں کا

انتقام جنہوں نے صرف اور صرف اس کی خاطر اپنی جانیں قربان کردی تھیں۔

میں اس وقت بقول روپ متی کے' اندر سبھا میں بیٹھا تھا مگر یہ باتیں نجانے مجھے کیسے یاد آگئی تھیں۔ میرے دماغ میں لاوا سا پک رہا تھا۔

"کہاں کھو گئے سادھو مہاراج!"

جانکی کی آواز سن کر میں اچھل پڑا۔ اس نے مجھے پکارنے پر ہی اکتفا نہیں کیا تھا بلکہ میرا پیر بھی پکڑ کر زور سے ہلا دیا تھا۔ میرے خیالات منتشر ہوگئے اور میں جیسے ہوش میں آگیا۔

ہمارے بیچ قالین پر چائے کے کپ رکھے ہوئے تھے۔ مندری بھی قریب ہی بیٹھ گئی تھی اور وہ چاروں مجھے اس طرح گہری نظروں سے دیکھ رہی تھیں جیسے میرا چہرہ بدل گیا ہو اور پھر غیر اختیاری طور پر میرا ہاتھ اپنے چہرے پر پہنچ گیا۔

"کیا ہوا۔ تم ایک دم سے اتنا پریشان کیوں ہوگئے ہو؟" جانکی اٹھ کر میرے قریب آگئی۔ ظاہر ہے میرا سب سے زیادہ درد وہی محسوس کرسکتی تھی۔

"اوہ! کچھ نہیں۔" میں سنبھل کر بیٹھ گیا "ایسے ہی کچھ پرانی باتیں یاد آگئی تھیں۔" میں نے جھینپ مٹانے کے لیے کہا اور اپنے سامنے رکھا ہوا چائے کا کپ اٹھالیا۔

جانکی چند لمحے گہری نظروں سے میری طرف دیکھتی رہی اور پھر اٹھ کر دوبارہ اپنی جگہ پر چلی گئی۔ روپ متی وغیرہ کی موجودگی میں وہ کچھ کہنا نہیں چاہتی تھی۔

چند لمحے فضا کچھ اداس سی رہی یا شاید مجھے ایسا لگ رہا تھا لیکن روپ متی کے ایک چٹکلے نے یہ اداسی دور کردی اور پھر باتوں کا سلسلہ چل نکلا تو میں بھی بھول گیا کہ کچھ دیر پہلے مجھ پر کس قدر قنوطیت طاری تھی۔

اگلے روز میں صبح دیر تک سویا رہا اور جب بیدار ہوا تو میرے آس پاس کوئی نہیں تھا حالانکہ جانکی اور روپ متی وغیرہ بھی رات کے آخری پہر وہیں قالین پر آڑی ترچھی ہو کر سوگئی تھیں۔

میں اٹھ کر اپنے بیڈ روم میں آگیا اور دروازے میں قدم رکھتے ہی ٹھٹک کر رک گیا۔ بلا میرے بیڈ پر آڑی ترچھی پڑی سو رہی تھی۔ اس کا لباس سمٹا ہوا تھا۔ بال بکھرے ہوئے تھے۔ چہرے پر بے پناہ معصومیت تھی۔ وہ پہلے سے کہیں زیادہ حسین لگ رہی تھی۔ اسے دیکھ کر میرے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی۔ میرے قدم بے اختیار اس کی طرف اٹھنے لگے۔

اس وقت شاید میں اپنے آپ میں نہیں تھا۔ میرے حواس میرے بس میں نہیں تھے۔ میں بیڈ کے قریب کھڑا چند لمحے بلا کے چہرے کو دیکھتا رہا اور پھر آہستہ آہستہ اس پر جھکنے لگا۔

شاید وہ میرے بے ربط سانسوں کا لمس تھا کہ بلا نے آنکھیں کھول دیں۔ اس کی نظریں میرے چہرے پر کچھ ٹٹول رہی تھیں۔ آنکھوں میں خمار بھرا ہوا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر بڑی دل فریب مسکراہٹ آگئی اور اس نے دونوں ہاتھ اوپر اٹھادیے اور اس سے پہلے کہ میں پسٹری سے اتر جاتا' کھنکتے ہوئے نقرئی قہقہوں کی آواز مجھے ہوش میں لے آئی۔

جانکی اور روپ متی کے قہقہوں کی یہ آواز ہال کی طرف سے آئی تھی۔ میرے دماغ میں دھماکے سے ہونے لگے۔ پورے جسم میں سنسنی کی لہریں سی دوڑنے لگیں۔ میں ایک جھٹکے سے سیدھا ہوگیا اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا باتھ روم میں گھس گیا۔

میرا دماغ بری طرح سلگ رہا تھا۔ سینے میں بھی جیسے انگارے سے بھر گئے تھے۔ میں نے کپڑے جیسے اپنے جسم سے نوچ کر پھینک دیے اور شاور کھول دیا اور پھر اسی وقت کمرے سے روپ متی کے ہنسنے کی آواز سنائی دی۔ روپ متی اور جانکی کمرے میں آگئی تھیں۔

میں دیر تک شاور سے برستی ہوئی ٹھنڈے پانی کی پھوار کے نیچے کھڑا سوچتا رہا کہ مجھ سے یہ حماقت کیوں سرزد ہونے جارہی تھی۔ میں بلا کو دیکھ کر اتنا بے قابو کیوں ہوگیا تھا۔ مجھے اپنے آپ پر اختیار کیوں نہیں رہا تھا۔ بلا نے مجھے اپنے اوپر جھکے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ وہ میرے بارے میں کیا سوچتی ہوگی۔

باتھ روم کے دروازے پر دستک کی آواز سن کر میں چونک گیا۔ اس کے ساتھ ہی روپ متی کی آواز سنائی دی۔

"شریمان جی۔ اب جلدی سے باہر آجاؤ۔ ناشتا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔"

میں کچھ دیر اور شاور کے نیچے کھڑا رہا پھر تولیے سے رگڑ کر اپنا بدن خشک کیا اور کپڑے پہن کر باہر آگیا۔ اس وقت کمرے میں کوئی نہیں تھا۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ چند لمحے وہیں کھڑا رہا پھر باہر آگیا۔

وہ تینوں ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھی میرا انتظار کررہی تھیں۔ مندری نے مجھے کچن کی کھڑکی سے دیکھا اور اس کے دو تین منٹ بعد میز پر ناشتا لگادیا۔

بلا میرے سامنے بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر

بڑی شوخ سی مسکراہٹ تھی۔ میں اس کی طرف دیکھنے سے گریز کرتا رہا۔

اس وقت گیارہ بج رہے تھے۔ ناشتے سے فارغ ہو کر وہ تینوں تو وہیں بیٹھی باتیں کرتی رہیں اور میں اٹھ کر لان میں آگیا۔ آسمان پر بادل تھے اور موسم بڑا خوشگوار ہو رہا تھا۔

میں ڈاکٹر شیام سندر کے قتل کے بعد پیدا ہونے والی صورت حال پر غور کررہا تھا۔ رامو دو مرتبہ مجھ سے پٹ چکا تھا۔ وہ اپنے آپ کو بہت بڑا بدمعاش سمجھتا تھا۔ اس کے نام کی دہشت تھی۔ آج تک شاید کسی نے اس کے سامنے نظریں اٹھانے کی جرأت بھی نہیں کی تھی۔ وہ لوگوں کو اپنے قدموں پر جھکا دیکھنے کا عادی تھا لیکن... میں شاید پہلا شخص تھا جس نے اسے اپنے قدموں پر جھکا کر زمین چاٹنے پر مجبور کردیا تھا اور وہ بری طرح جھنجلا گیا تھا۔

رامو شاید یہ سمجھتا تھا کہ مجھے ٹھاکر کی پشت پناہی حاصل تھی۔ وہ دوبارہ ٹھاکر سے ٹکرانے کی ہمت تو نہیں کرسکا تھا تاہم جھنجلاہٹ میں اس نے معصوم اور بے گناہ ڈاکٹر شیام سندر کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ وہ تو پارو تی کو بھی مار ڈالنا چاہتا تھا مگر وہ خوش قسمتی سے بچ گئی تھی۔

رامو نے شاید یہ سوچا ہوگا کہ شیام سندر کے قتل کے بعد ٹھاکر میری پشت سے ہاتھ ہٹالے گا مگر اس کا اندازہ غلط نکلا۔ ٹھاکر کوئی معمولی آدمی نہیں تھا کہ اس معاملے کو نظر انداز کردیا جاتا۔ اس کی پشت پر بھی راجستھان کے کئی سابق راجے مہاراجے اور دیگر کئی اعلیٰ شخصیات تھیں۔ انہی کے دباؤ سے انتظامیہ کی پوری مشینری حرکت میں آگئی تھی اور شہر بھر کی پولیس نے اس کی تلاش میں چھاپے مارنا شروع کردیے تھے۔ اس کے کئی گرگوں کو پکڑ کر سلاخوں کے پیچھے بند کردیا گیا تھا۔

دوسری طرف ٹھاکر بھی زخمی شیر کی طرح بپھرا ہوا تھا۔ میری طرح اس کے سینے میں بھی بدلے کا لاوا کھول رہا تھا۔

سنا یہی تھا کہ رامو پہلے سرعام قتل جیسی سنگین وارداتیں کرنے کے بعد بھی آزادی سے دندناتا پھرتا تھا لیکن شاید یہ پہلا موقع تھا کہ وہ اس طرح بھاگا پھر رہا تھا اور اسے چھپنے کی جگہ نہیں مل رہی تھی۔

میں اس صورت حال پر غور کرتا رہا اور پھر میری ذہنی رو بھٹک گئی۔ اب میں بلا کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ میری زندگی میں کئی حسین لڑکیاں آئی تھیں مگر میں نے کسی کے لیے دل میں کسک محسوس نہیں کی تھی۔ کسی کے لیے دل اتنا مضطرب اور بے چین نہیں ہوا تھا۔ جانکی اور روپ متی بھی لاکھوں میں ایک تھیں۔ لوگ انہیں دیکھ کر گہرے سانس بھرتے تھے۔ وہ دونوں مجھے عزیز تھیں۔ ان دونوں کے لیے میرے سینے میں تڑپ تھی مگر وہ بات نہیں تھی کہ میں انہیں دیکھ کر سڑک چھاپ عاشقوں کی طرح گہرے سانس بھرتا رہتا لیکن نجانے کیا بات تھی کہ آج صبح بلا کو دیکھنے کے بعد میں بیاکل سا ہوگیا تھا اور اپنے آپ میں عجیب سا اضطراب محسوس کرنے لگا تھا۔ بلا میں ایسی کیا بات تھی جو وہ میرے حواس پر چھائی چلی جارہی تھی۔

میں یہ سب کچھ سوچ رہا تھا کہ ان تینوں کو برآمدے والے دروازے سے برآمد ہوتے دیکھ کر میرے خیالات منتشر ہوگئے۔ وہ تینوں میرے پاس آکر گھاس پر بیٹھ گئیں۔ میں بھی کرسی چھوڑ کر نیچے آگیا۔

میرا وہ دن بڑی بے چینی اور اضطراب کی کیفیت میں گزرا۔ میں بلا کا سامنا کرنے سے گریز کررہا تھا مگر وہ مختلف حیلوں بہانوں سے بار بار میرے سامنے آرہی تھی۔ اس کی آنکھوں کی چمک اور ہونٹوں پر کھیلنے والی دل فریب مسکراہٹ سے میرے دل کی دھڑکن بے قابو ہوجاتی۔

روپ متی نے یہ بات محسوس کرلی تھی۔ ہوسکتا ہے' جانکی نے بھی نوٹ کیا ہو لیکن اس نے اپنی باتوں یا چہرے کے تاثرات سے اس کا اظہار نہیں ہونے دیا۔ البتہ روپ متی اپنے آپ پر قابو نہیں رکھ سکی۔ ایک موقع پر مجھے اکیلے پاکر وہ شوخ نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

"کیا بات ہے' یہ حسین تتلی صبح سے تمہارے گرد منڈلا رہی ہے۔"

"کک... کون..." میں گڑبڑا سا گیا "کون سی تتلی...؟"

"اب زیادہ بننے کی کوشش مت کرو۔" روپ متی نے میری بات کاٹ دی "میں بلا کی بات کررہی ہوں اور میں نے یہ بھی دیکھا ہے کہ وہ جب بھی تمہارے قریب آتی ہے' تمہارے چہرے کا رنگ بدل جاتا ہے۔"

میرے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی۔ روپ متی بڑی گھاگ تھی۔ اس نے سب کچھ تاڑ لیا تھا۔ میں نے بات کو ٹالنے کی کوشش کی مگر وہ آسانی سے پیچھا چھوڑنے والی نہیں تھی۔ باتوں ہی باتوں میں مجھ سے کچھ اگلوانے کی کوشش کرتی رہی لیکن میں بھی سنبھل گیا تھا اور پھر جانکی کے آجانے سے موضوع بدل گیا۔

ٹھاکر صبح آٹھ بجے ہی چلا گیا تھا اور میرے لیے پیغام چھوڑ گیا تھا کہ میں رات دس بجے ہوٹل پہنچ جاؤں۔

رات نو بجے کے قریب ہم نے کھانا کھالیا۔ شنکر مجھے

روپ متی کی پجارو پر مین روڈ تک چھوڑ گیا جہاں سے مجھے ایک آٹو رکشا مل گیا اور میں پونے دس بجے کے قریب ریسٹورنٹ پہنچ گیا۔

ٹھاکر کاؤنٹر کے پیچھے منیجر کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے ریسٹورنٹ میں داخل ہو کر اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی اور دروازے کے قریب ہی ایک میز پر بیٹھ گیا۔ ٹھاکر بھی اٹھ کر میرے پاس آگیا۔

ٹھیک دس بجے بھگت ریسٹورنٹ کے سامنے دکھائی دیا۔ وہ شاید اندر داخل ہوتے ہوئے جھجک رہا تھا۔ ٹھاکر نے ویٹر کو اشارے سے قریب بلالیا۔

"اس آدمی کو اندر لے آؤ اور اسے کھانے چائے وغیرہ کا پوچھو اور اسے یہ بھی کہہ دینا کہ ہماری طرف نہ آئے البتہ جب ہم یہاں سے اٹھ کر باہر نکلیں تو ہمارے پیچھے چلا آئے۔"

ویٹر ریسٹورنٹ سے باہر نکل گیا۔ بھگت کے قریب رک کر اس نے ایک دو منٹ اس سے بات کی اور اسے اپنے ساتھ اندر لے آیا۔ بھگت ہماری میز کے قریب سے گزرا تھا۔ اس نے ہماری طرف دیکھا بھی تھا۔ وہ ذہین آدمی تھا۔ ہم سے شناسائی کا اظہار کیے بغیر ویٹر کے ساتھ آگے نکل گیا۔

اس وقت ہوٹل میں رش تھا۔ اس ریسٹورنٹ میں ہائی جینٹری کے لوگ آتے تھے۔ بھگت جیسے لوگوں کو تو دروازے کے قریب بھی نہیں پھٹکنے دیا جاتا تھا۔ گاہکوں میں اس وقت مردوں کے ساتھ عورتیں بھی معقول تعداد میں موجود تھیں۔ بعض لوگوں نے تو بڑی ناگوار سی نظروں سے بھگت کی طرف دیکھا تھا۔ ویٹر اسے ایک خالی میز پر بٹھا کر کچن کی طرف چلا گیا تھا۔

بھگت نے صرف چائے پر ہی اکتفا کیا تھا۔ چائے پینے کے بعد اس نے ویٹر کو بلا کر بل دینا چاہا تو ویٹر نے مسکرا کر کچھ کہا۔ بھگت نے نوٹ جیب میں رکھ لیا اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

ٹھاکر نے مجھے اشارہ کیا اور ہم اٹھ کر باہر آگئے۔ ٹھاکر کی جیپ پارکنگ والے حصے میں بائیں طرف سب سے آخر میں کھڑی تھی۔ جیپ پر بیٹھتے ہوئے میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ بھگت ریسٹورنٹ سے نکل رہا تھا۔ ٹھاکر نے انجن اسٹارٹ کردیا اور اسی وقت بھگت اچک کر پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

"کہاں جانا ہے۔ رام گنج بازار؟" ٹھاکر نے جیپ کو سڑک پر لانے کے بعد بھگت کی طرف دیکھے بغیر پوچھا۔

"نہیں سرکار۔" بھگت نے جواب دیا "جیپ کو رام گڑھ جھیل کی طرف جانے والی سڑک پر لے لو۔ شہر سے نکلتے ہی پانی کی سپلائی کا جو پمپنگ اسٹیشن ہے نا۔ کرن وہیں چھپا بیٹھا ہے۔"

ٹھاکر نے جیپ کا رخ چاند پول گیٹ سے اس سڑک پر موڑ دیا جو زور آور گیٹ کی طرف چلی گئی تھی۔ یہ وہی سنسان سڑک تھی جہاں اس رات رامو اور اس کے ساتھیوں نے مجھے اور سونیا کو روک کر اغوا کرنے کی کوشش کی تھی۔ زور آور گیٹ کے قریب سے ہوتے ہوئے ہم رام گڑھ جھیل کی طرف جانے والی سڑک پر نکل آئے۔

رات کے گیارہ بجنے والے تھے۔ اس سڑک پر بھی سناٹا تھا۔ ٹھاکر نے جیپ کے ہیڈ لیمپ بجھا دیے اور تقریباً دو میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد جیپ کو سڑک سے ہٹا کر روک لیا اور انجن بند کردیا۔

میں دائیں طرف دیکھنے لگا جہاں تقریباً تین سو گز کے فاصلے پر ایک بلب کی روشنی نظر آرہی تھی۔

وہ شہر کو پانی کی سپلائی کا پمپنگ اسٹیشن تھا۔ رام گڑھ جھیل کے قریب تالابوں سے آنے والا پانی اس پمپنگ اسٹیشن سے آگے پہنچایا جاتا تھا۔ پمپنگ اسٹیشن کی عمارت کے ساتھ انڈینڈنٹ کا کوارٹر تھا جہاں صرف ایک آدمی چوبیس گھنٹے ڈیوٹی دیتا تھا۔ بھگت نے بتایا کہ لکشمن نامی ایک شخص گزشتہ دو سال سے یہاں تعینات ہے۔ اس کی بیوی اور دو بچے بھی یہاں اس کے ساتھ ہی رہتے ہیں اور کرن بھی یہیں چھپا ہوا ہے۔

پمپنگ اسٹیشن تک جانے کے لیے کوئی پختہ سڑک نہیں تھی۔ ایک پتھریلا کشادہ راستہ تھا جس پر کبھی کبھار واٹر ورکس کے افسروں کی گاڑیوں کی آمد و رفت رہتی تھی۔ ہم اس راستے سے ہٹ کر چل رہے تھے۔

پمپنگ اسٹیشن تک پہنچنے میں ہمیں زیادہ دیر نہیں لگی تھی۔ قریب پہنچ کر ٹھاکر نے پستول نکال لیا۔ میری پنڈلی کے ساتھ خنجر بندھا ہوا تھا مگر میں نے اسے نکالنے کی ضرورت نہیں سمجھی۔

وہ کوارٹر دو کمروں پر مشتمل تھا۔ اس کے سامنے جھاڑیوں کی باڑ لگا کر آنگن سا بنالیا گیا تھا۔ ایک کمرے میں اندھیرا تھا البتہ دوسرے کمرے میں روشنی نظر آرہی تھی۔

بھگت خشک جھاڑیوں کی باڑ میں الجھ کر گرا۔ کانٹے چبھنے سے اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ اس کے ساتھ ہی کمرے کی بتی بجھ گئی اور ایک بھاری آواز سنائی دی۔

"کون ہے۔ ادھر کون ہے؟"

"میں بھگتا دھوبی ہوں کرن۔ تم سے ملنے آیا ہوں۔ ضروری کام ہے۔" بھگت نے چیخ کر کہا۔

جواب میں فضا فائر کی آواز سے گونج اٹھی۔ میں بھگت کے قریب ہی کھڑا تھا۔ گولی زناٹے کی آواز کے ساتھ میرے اور بھگت کے سروں کے درمیان سے گزر گئی۔ میں نے بڑی پھرتی سے ایک طرف چھلانگ لگادی۔

ٹھاکر نے بھی گولی چلا دی۔ وہ کرن ہی تھا جس نے ہم پر فائر کیا تھا۔ وہ ایک طرف بھاگ کھڑا ہوا۔ میں نے اور ٹھاکر نے بھی اس کے پیچھے دوڑ لگادی۔

کرن ٹیلوں میں اندھا دھند دوڑ رہا تھا۔ اس نے مڑ کر ایک دو فائر بھی کیے تھے۔ میں اور ٹھاکر مختلف سمتوں سے اس کا پیچھا کر رہے تھے۔ مجھے اندیشہ تھا کہ اگر کرن رات کی تاریکی میں ٹیلوں میں غائب ہوگیا تو ہماری ساری محنت پر پانی پھر جائے گا۔

لیکن میں نے اسے زیادہ دور جانے کا موقع نہیں دیا۔ میں نے دور ہی سے اس پر چھلانگ لگادی۔ میں نے مڑ کر فائر کیا لیکن ٹیلے کی ڈھلان پر اس کا پیر رپٹ گیا تھا۔ گولی میرے سر کے بہت اوپر سے گزر گئی تھی اور میں ہوا میں اڑتا ہوا اس کے اوپر گرا اور اسے دوسرا فائر کرنے کا موقع نہیں دیا۔

کرن کا پستول والا ہاتھ میری گرفت میں تھا۔ ہم دونوں ڈھلان پر لڑھکتے ہوئے ٹیلے کے دامن میں پہنچ گئے۔ میں نے جھٹکے سے اس کے ہاتھ سے پستول چھڑایا اور اس کی دھنائی شروع کردی۔ اس دوران میں ٹھاکر بھی وہاں پہنچ گیا۔

ہم کرن کو مارتے اور گھسیٹتے ہوئے پہنگ اسٹیشن والے کوارٹر میں لے آئے۔ بھگت نے پہنگ اسٹیشن کے اٹینڈنٹ لکشمن اور اس کے بیوی بچوں کو حراست میں لے رکھا تھا۔ وہ سب بہت خوف زدہ تھے اور پھر لکشمن نے یہ انکشاف کیا کہ کرن اس کا دور کا رشتے دار ہے مگر اس کی بدمعاشی کی وجہ سے عرصہ پہلے وہ اس سے ملنا جلنا چھوڑ چکا تھا۔

لکشمن کے کہنے کے مطابق کرن تین دن پہلے وہاں آیا تھا اور اس نے لکشمن کو دھمکی دی تھی کہ اگر اس کے بارے میں کسی کو بتایا گیا تو وہ اس کے بیوی بچوں کو قتل کردے گا۔ اس نے کہا تھا کہ وہ چند روز یہاں رہے گا اور حالات پرسکون ہوتے ہی چلا جائے گا۔

لکشمن بے قصور تھا۔ اس نے محض خوف کی وجہ سے کرن کو پناہ دے رکھی تھی۔ میں نے لکشمن اور اس کے بیوی بچوں کو دوسرے کمرے میں بھیج دیا اور کرن کی طرف متوجہ ہوگیا جو ٹھاکر کی چند ٹھوکریں کھانے کے بعد فرش پر پڑا کراہ رہا تھا۔

"ہم تم سے رامو کا پتا جاننا چاہتے ہیں۔" میں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا "اگر تم بتا دو کہ وہ کہاں چھپا ہوا ہے تو تمہیں کچھ نہیں کہا جائے گا اور اگر انکار کرو گے تو تمہیں بہت کشٹ اٹھانا پڑے گا۔"

"تم مجھ سے کچھ بھی معلوم نہیں کرسکو گے۔" کرن نے جواب دیا۔

میں چند لمحے گہری نظروں سے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر بھگت کو اشارہ کیا۔ بھگت پہلے ہی پرتول رہا تھا۔ اس نے کرن پر ٹھوکروں کی بارش کردی۔ کرن کی چیخیں کمرے میں گونج رہی تھیں مگر اس نے زبان نہیں کھولی۔ بھگت نے اسے پکڑ کر سر سے اوپر اٹھالیا اور پوری قوت سے سامنے والی دیوار کی طرف اچھال دیا۔

کرن کا سر دیوار سے ٹکرایا۔ اس کے منہ سے خوفناک چیخ نکلی۔ وہ "بھد" سے نیچے گرا اور سر کو دونوں ہاتھوں میں تھام کر تڑپنے لگا۔ اس کا سر پھٹ گیا تھا اور خون بہہ نکلا تھا۔

"بتا تیرا گرو کہاں ہے۔ نہیں تو ہڈیاں توڑ دوں گا۔" بھگت اسے زوردار ٹھوکر مارتے ہوئے غرایا۔

"نن۔۔۔ نہیں بتاؤں گا۔" کرن نے کراہتے ہوئے جواب دیا۔

بھگت نے اسے دو تین ٹھوکریں اور لگادیں۔

"ہٹ جاؤ بھگت۔" میں نے پتلون کے پائنچے سے خنجر نکال لیا "یہ ایسے کچھ نہیں بتائے گا۔"

میرے ہاتھ میں خنجر دیکھ کر کرن کی آنکھوں میں وحشت سی بھر گئی۔ میں نے خنجر کی نوک اس کے کرتے کے گریبان پر رکھ کر جھٹکا دیا۔ کرتہ نیچے تک پھٹ گیا اور اس کا سینہ برہنہ ہوگیا۔

میں نے خنجر کی نوک اس کے سینے پر رکھ کر ہلکا سا چرکا دیا۔ کرن چیخ اٹھا۔ کھال میں تقریباً تین انچ لمبا کٹ لگ گیا تھا جس سے خون رسنے لگا تھا۔

"کیا وچار (خیال) ہے؟" میں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا "میں تمہارے سینے پر سرخ رنگ کی اتنی لکیریں کھینچ دوں گا کہ شہر کا نقشہ بن جائے گا۔"

"وہ۔۔۔ وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑے گا۔" کرن نے اس مرتبہ فوراً ہی ہتھیار ڈال دیے "وہ انسان نہیں راکشش ہے۔ خوں خوار درندہ۔ اگر اسے پتا چل گیا کہ میں نے تمہیں اس کا پتا بتایا تھا تو وہ مجھے کتے کی موت مارے گا۔"

"میں وعدہ کرتا ہوں کہ وہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔ میں تمہاری رکھشا (حفاظت) کروں گا۔ بتاؤ۔۔۔ وہ درندہ کہاں چھپا ہوا ہے؟" میں نے کہا۔

"وہ۔۔۔ وہ۔۔۔" کرن کہتے کہتے رک گیا جیسے اسے ڈر ہو کہ زبان کھولتے ہی رامو اس کے سینے میں خنجر گھونپ دے گا "وہ۔۔۔ وہ کالی کے پرانے مندر میں چھپا ہوا ہے۔ اس کے ساتھ دو آدمی اور ہیں لیکن۔۔۔ میں تم لوگوں کو شُبھ شا (مشورہ) دوں گا کہ وہاں جانے کی غلطی مت کرنا۔ وہ واقعی خونی بھیڑیا ہے۔ مارڈالے گا تم لوگوں کو۔"

"کالی کا پرانا مندر کہاں ہے؟" میں نے اس کے مشورے کو نظرانداز کرتے ہوئے کہا۔

"سوائے مادھو پور کی طرف جانے والی سڑک پر۔ شہر سے تقریباً پانچ کوس آگے ایک بستی کے کھنڈر ہیں۔ وہ مندر انہی کھنڈروں میں ہے۔" کرن نے بتایا۔

"کیا اس کا گرو گھنشال بھی اسی مندر میں ہے۔ میرا مطلب ہے کنور بلونت سنگھ، جس کے لیے وہ آج کل کام کررہا ہے۔" میں نے پوچھا۔

"نہیں۔ بلونت سنگھ وہاں نہیں ہے۔" کرن نے جواب دیا "یہ سب کچھ اسی کا کیا دھرا ہے۔ اسی نے تمہیں اٹھانے کے لیے رامو کو پیسہ دیا تھا۔"

"اوہ! تو تم مجھے جانتے ہو!" میں نے پوچھا۔

"اس رات اس لونڈیا کے ساتھ تمہیں اٹھانے کی کوشش کی گئی تھی تو رامو کے ساتھ میں بھی تھا۔" کرن نے جواب دیا "میں نے تمہارے ہاتھ دیکھ لیے تھے اور رامو سے کہا تھا کہ بلونت سنگھ کا بیعانہ واپس کردے لیکن وہ تو کچھ اور ہی پھیل گیا تھا۔ زندگی میں پہلی بار اسے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا تھا۔ دوسری مرتبہ بھی اسے شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کا خیال تھا کہ اس مرتبہ تم ٹھاکر کی وجہ سے بچ گئے ہو۔" اس نے ٹھاکر کی طرف دیکھا "اس نے طیش میں آکر ٹھاکر کے بھائی کی ہتیا کردی۔ اس کا خیال تھا کہ اس طرح ٹھاکر تمہاری پشت پناہی سے باز آجائے گا مگر یہی اس کی زندگی کی سب سے بڑی غلطی تھی۔ اب وہ اپنے آپ کو بچانے کے لیے چھپتا پھر رہا ہے۔ بلونت سنگھ بھی غائب ہوچکا ہے۔"

"ٹھیک ہے کرن۔" میں نے کہا "ہو تو تم بھی بھیڑیوں کے گروہ میں سے ایک۔ تمہارے ہاتھوں بھی کوئی نہ کوئی بے گناہ مارا گیا ہوگا۔ جی تو یہ چاہتا ہے کہ یہ خنجر تمہارے سینے کے آر پار کردوں لیکن میں تمہیں دیے ہوئے اپنے وچن (وعدہ) کا پالن (ایفا) کروں گا۔ اس وقت میں تمہیں زندہ چھوڑ رہا ہوں۔ آج رات تم یہیں رہو گے۔ صبح سویرے لکشمن تمہیں لات مار کر یہاں سے نکال دے گا اگر اس کے بعد تم نظر آئے تو زندہ نہیں بچ سکو گے۔"

میں ٹھاکر کو اشارہ کرکے کمرے سے باہر آگیا۔ بھگت وہیں رہ گیا تھا۔ میں نے لکشمن کو بلا کر پچاس کا نوٹ اس کے ہاتھ میں تھمادیا۔

"اس کو باندھ کر رکھنا اور صبح ہوتے ہی یہاں سے بھگا دینا۔" میں نے کہا "یہ اب تم لوگوں کو نہ کوئی دھمکیاں دے گا اور نہ ہی کوئی نقصان پہنچائے گا۔ اس نے ایسا کیا تو ہم اسے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔"

لکشمن نے اسی وقت بھگت کی مدد سے کرن کو باندھ کر اس کمرے میں ڈال دیا۔ ہم وہاں سے رخصت ہوکر سڑک کی طرف آگئے جہاں جیپ کھڑی تھی۔

"اب کیا وچار ہیں ٹھاکر جی؟" بھگت نے پچھلی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"ہم اسی وقت کالی کے پرانے مندر جا رہے ہیں۔" ٹھاکر نے انجن اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا "تم اگر چاہو تو ہم تمہیں شہر میں کسی جگہ چھوڑ دیں گے۔"

"کیسی باتاں کرتے ہو ٹھاکر جی۔" بھگت جلدی سے بولا "میں تو اب آپ کا سیوک ہوں۔ اپنا جیون بھینٹ کردوں گا پر پیچھے نہیں ہٹوں گا۔"

"سوچ لو بھگت!" ٹھاکر نے یہ کہتے ہوئے جیپ آگے بڑھادی۔

"سوچا تو وہاں جاتا ہے ٹھاکر جی جہاں نقصان کا ڈر ہو۔" بھگت نے جواب دیا "آپ جیسے مہاتما کی سیوا کرکے تو زندگی سپھل (کامیاب و کامران) ہوجاوے گی۔"

"تو ٹھیک ہے۔" ٹھاکر جیپ کو گھما کر سڑک پر لے آیا "آج سے تم ہمارے ہوگئے۔ پچھلی زندگی سے تمہارا ناتا ختم ہوگیا۔ بھول جاؤ سب کچھ۔"

"بھول گیا ٹھاکر جی۔" بھگت خوش ہو کر بولا۔

میں نے کل بھی بھگت کی باتیں سنی تھیں اور آج بھی اسے دیکھ لیا تھا۔ شہر بھر کے غنڈے رامو کے نام سے تھر تھر کانپتے تھے لیکن بھگت اس کے خلاف جس طرح کھل کر ہمارا ساتھ دے رہا تھا وہ قابل تعریف تھا اور اس پر ہر لحاظ سے بھروسا کیا جاسکتا تھا۔

جیپ شہر کی بیرونی سڑکوں پر دوڑتی ہوئی گووند مارگ، انڈسٹریل روڈ اور سوائے مان سنگھ اسٹیڈیم کے قریب سے ہوتی ہوئی اس سڑک پر آگئی جو ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ

سوائے مادھوپور کی طرف چلی گئی تھی۔

آدھی رات کا وقت تھا۔ رات کے وقت شہر سے باہر جانے والی سڑکوں پر کسی قسم کا ٹریفک نہیں ہوتا تھا۔ ریگستان میں سفر کے دوران میں قدم قدم پر ڈاکوؤں کا خطرہ رہتا تھا۔ اس وقت یہ سڑک بھی سنسان تھی۔

چاند ان دنوں رات کے آخری پہر ہی نکلتا تھا۔ اگر اس وقت آسمان پر چاند ہوتا بھی تو اس سے کوئی فرق نہ پڑتا کیونکہ آسمان کو گہرے بادلوں نے ڈھک رکھا تھا۔ چاروں طرف گھٹاٹوپ اندھیرا تھا۔ ہیڈ لائٹس کی روشنی سے یوں لگتا تھا جیسے ہم کسی تاریک سرنگ میں سفر کررہے ہوں۔

تقریباً چار میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد ٹھاکر نے جیپ کی ہیڈ لائٹس بجھا دیں اور رفتار بھی کم کردی۔ اب ہمارے چاروں اور اندھیرا تھا۔ سڑک کے دونوں طرف ریگستان تھا۔ کہیں کہیں ٹیلے بھی نظر آرہے تھے۔ ٹھاکر نے رفتار مزید کم کردی۔

تقریباً ڈیڑھ کلو میل کا فاصلہ اور گزر گیا۔ ہم گہری نظروں سے دائیں طرف دیکھ رہے تھے اور بالآخر سڑک سے ہٹ کر اندھیرے میں کسی تباہ شدہ بستی کے کھنڈر دکھائی دیے۔ ٹھاکر نے جیپ اسی بستی کی طرف جانے والے کچے راستے پر موڑ دی۔

"تین چار سو گھروں پر مشتمل یہ چھوٹی سی بستی کبھی آباد ہوا کرتی تھی۔" ٹھاکر بتا رہا تھا "اس کی پرلی (دوسری) طرف میٹھے پانی کی ایک چھوٹی سی جھیل تھی جس کے اطراف میں دو تین میل تک کھیتی باڑی ہوتی تھی۔ ناریل کے باغات ہوا کرتے تھے۔ بڑا سبزہ تھا لیکن پھر ریگستان نے سبزے کو نگلنا شروع کردیا۔ سرسبز کھیتیاں غائب ہوتی گئیں اور ریت اس علاقے میں زندگی کو اپنی لپیٹ میں لیتی گئی اور جب میٹھے پانی کی اس جھیل کو بھی ریگستان نے نگلنا شروع کردیا تو یہ بستی بھی ویران ہونے لگی۔

"صرف چالیس سال پہلے یہاں زندگی تھی' زندگی کے ہنگامے تھے۔ میٹھے پانی کی جھیل صحرا کی ریت میں دفن ہوگئی اور زندگی یہاں سے روٹھ گئی۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ اس بستی کے لوگوں نے کالی ماتا کو ناراض کردیا تھا جس نے ان پر یہ تباہی نازل کردی۔ مصیبت یہ ہے کہ لوگ ہر اچھی بری بات کو دیوی دیوتاؤں سے منسوب کردیتے ہیں۔ یہ نہیں سوچتے کہ جو کچھ ہوا اس کی کچھ اور وجوہات بھی ہوسکتی ہیں۔ اس بستی ہی کی مثال لے لو۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بولا "ریگستانوں میں طوفان آتے رہتے ہیں۔ ہوا لپک جھپک کی دیر میں مُنوں ریت ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کردیتی ہے۔ یہاں بھی کچھ ایسی ہی بات ہوئی تھی۔ پھیلتی ہوئی ریت کو روکنے کا کوئی وچار نہیں کیا گیا اور جب جھیل ریت میں دفن ہوگئی تو اسے کالی دیوی کے عذاب سے منسوب کردیا گیا۔ ہوسکتا ہے اگلے ورشوں (سالوں) میں یہاں سے ریت اڑ جانے سے وہ جھیل پھر نمودار ہوجائے۔ اس وقت بھی لوگ یہی کہیں گے کہ کالی ماتا نے انہیں معاف کردیا۔

"یہ جے پور شہر جب آباد ہوا تو اس وقت بھی یہی مسئلہ تھا۔ ریگستان کی اڑتی ہوئی ریت شہر کی سڑکوں پر جمع ہوجاتی۔ راستے بند ہوجاتے۔ مکانوں کی دیواروں کے ساتھ راتوں رات ریت کے ٹیلے معرض وجود میں آجاتے۔ اس صورت حال سے نمٹنے کے لیے شہر کے گرد ایک بلند دیوار تعمیر کردی گئی۔ ریت کا پھیلاؤ رک گیا اور شہر محفوظ ہوگیا۔ اگر یہ شہر بھی ریت کے سمندر میں غرق ہوجاتا تو اسے بھی کالی ماتا کا عذاب گردانا جاتا۔"

ٹھاکر خاموش ہوگیا۔ اس کی باتوں سے میں پہلے بھی اندازہ لگا چکا تھا کہ دھرم کے معاملے میں بھی وہ اعتدال پسند ہے۔ نہ اتنا کٹر تھا کہ دیوی دیوتاؤں کے حوالے سے کہی جانے والی ہر بات پر آنکھیں بند کرکے یقین کرلے اور نہ اتنا آزاد کہ دھرم کو ماننے ہی سے انکار کردے۔ میں نے اسے حویلی کے ایک کمرے میں بنے ہوئے چھوٹے سے مندر میں پوجا کرتے ہوئے بھی دیکھا تھا۔ اس کے خیال میں دھرم کو سب سے زیادہ نقصان پنڈتوں اور پجاریوں نے پہنچایا تھا اور یہ بڑی حد تک درست بھی تھا۔ یہ سب کچھ تو میں خود اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا تھا اور بھگت بھی رہا تھا۔

ٹھاکر نے جیپ بستی کے شروع میں ایک گلی میں موڑ کر روک لی اور انجن بند کردیا۔ ہم تینوں نیچے اتر آئے۔

یہ بستی تیس چالیس سال پہلے ہی ویران ہوئی تھی اس لیے پوری طرح ملبے کے ڈھیر میں تبدیل نہیں ہوسکی تھی۔ بہت سے مکانوں کی دیواریں اب بھی کھڑی تھیں البتہ لکڑی کے دروازے' کھڑکیاں وغیرہ عرصہ پہلے غائب ہوچکی تھیں۔ چھتوں کے شہتیر بھی نکال لیے گئے تھے اس لیے کسی مکان کی چھت موجود نہیں تھی۔

کالی کا پرانا مندر بستی کی دوسری طرف تھا۔ اس کے اردگرد بھی مکان تھے۔ مندر کی عمارت زیادہ بڑی نہیں تھی تاہم اس کا ٹوٹا ہوا کلس رات کی تاریکی میں بھی دکھائی دے رہا تھا۔

ٹھاکر ایک جگہ رک گیا۔ اس نے جیب سے پستول نکال

لیا تھا۔ بھگت کے ہاتھ میں بھی پستول نظر آرہا تھا۔ میں نے بھی جھک کر پتلون کے پائنچے کے اندر سے خنجر نکال لیا۔

"تم اس طرف کھڑے رہو بھگت۔" ٹھاکر نے سرگوشیانہ لہجے میں کہا "اور ہمت سنگھ' تم اس طرف سے جاؤ۔ میں ادھر سے آگے بڑھتا ہوں۔"

ٹھاکر بائیں طرف چلا گیا اور میں دائیں طرف کھنڈروں کے بیچ ایک تنگ سی گلی میں چلنے لگا۔ پچیس تیس گز آگے جاکر میں ایک اور گلی میں مڑ گیا۔ اس گلی کے اختتام پر کچھ کھلی جگہ تھی اور اس سے آگے بہت بڑا چبوترہ تھا جس پر مندر کی عمارت تھی۔

مندر کے مرکزی ہال کے علاوہ شاید کمرے بھی تھے۔ ایک کھڑکی سے زرد رنگ کی مدھم سی روشنی نظر آرہی تھی۔ میں چند لمحے اپنی جگہ پر کھڑا رہا پھر دبے قدموں آگے بڑھنے لگا۔ خالی جگہ عبور کرکے میں تقریباً چھ فٹ اونچے چبوترے پر چڑھ گیا اور اس کھڑکی کی طرف دیکھنے لگا۔

وہ کھڑکی زمین کی سطح سے دس بارہ فٹ اونچی تھی اور اس میں سلاخیں بھی لگی ہوئی نظر آرہی تھیں۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا۔ خنجر پتلون کی بیلٹ میں اڑسا اور شکستہ دیوار پر اوپر چڑھنے لگا۔

دیوار کی اینٹیں جگہ جگہ سے اکھڑی ہوئی تھیں اور مجھے اوپر چڑھنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آرہی تھی۔ میں آہستہ آہستہ اوپر چڑھتا رہا اور بالآخر میں اس کھڑکی تک پہنچنے میں کامیاب ہوگیا۔ میں نے دو سلاخوں کو پکڑ لیا اور دونوں پیر' دیوار میں اکھڑی ہوئی اینٹوں کی جگہ بن جانے والے گڑھوں میں جمادیے۔

یہ کھڑکی نہیں' دراصل دو فٹ چوڑا اور چار فٹ دائیں بائیں لمبا روشن دان تھا۔ اب اس کمرے سے کچھ آوازیں بھی سنائی دینے لگی تھیں۔ ان میں ایک نسوانی آواز بھی تھی۔ دبی دبی ہنسی کی آواز۔

میں نے سلاخوں پر مضبوطی سے گرفت جما کر اپنے آپ کو پوری طرح اوپر اٹھا دیا اور اندر جھانکنے لگا۔ اندر کا منظر دیکھتے ہی میرے دماغ میں دھماکے سے ہونے لگے۔ پورے جسم میں سنسنی کی لہر سی دوڑ گئی۔

کمرا خاصا بڑا تھا۔ اندرونی دیواروں کی حالت قدرے بہتر تھی۔ ایک دیوار میں مشعل لگی ہوئی تھی جس میں کسی جانور کی چربی یا اس سے ملتی جلتی کوئی چیز جل رہی تھی۔ ناگوار سی ہلکی بو میرے نتھنوں سے ٹکرا رہی تھی۔

وہ منظر جس نے میرے بدن میں برقی لہریں سی دوڑا دی تھیں واقعی بڑا سنسنی خیز تھا۔ فرش پر بچھی چٹائی پر تین آدمی اس طرح نیم دراز تھے جیسے کسی مہاراجا کے سنگھاسن پر..... بےجان ہوں اور ایک حسین لڑکی ایلومینیم کے گلاس میں انہیں اپنے ہاتھوں سے شراب پلا رہی تھی۔ اس کے بدن پر لباس نام کے دو نہایت مختصر سے چیتھڑے تھے۔ وہ اس وقت جس آدمی کی آغوش میں گری شراب کا گلاس اس کے ہونٹوں سے لگا رہی تھی وہ رامو تھا۔ وہ شراب کے گھونٹ بھرتے ہوئے لڑکی کے بدن کو ٹٹول رہا تھا اور لڑکی کے منہ سے دبی دبی ہنسی کی آواز خارج ہورہی

"حرامی!" میں نے دل ہی دل میں اسے گالی دی۔ اس پر قتل کے کئی الزام تھے۔ اس وقت وہ ڈاکٹر شیام سندر کے قتل کے الزام میں پولیس کو مطلوب تھا۔ پولیس پورے شہر میں اسے تلاش کرتی پھر رہی تھی۔ ٹھاکر بھانوت سنگھ انگاروں پر لوٹ رہا تھا۔ وہ اس حرامی سے شیام سندر کے قتل کا بدلہ لینا چاہتا تھا اور یہ نظفنا تحقیق یہاں کالی کے مندر میں عیش کررہا تھا۔

"ارے چھمیا۔ ادھر کو تو آ۔ اپن کی پیاس بھی بجھا دے۔ یا تجھے اپنی میا کا کھسم یہ رامو جیادہ پسند آگیا ہے۔" رامو کے دائیں طرف بیٹھے ہوئے شخص نے لڑکی کو بازو سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچا۔

چھمیا اس کی طرف مڑ گئی۔ اس نے گلاس ابھی اس کے ہونٹوں سے لگایا ہی تھا کہ ایک اور آدمی تقریباً دوڑتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ میں اسے دیکھ کر بری طرح چونک گیا۔ روشن دان کی سلاخیں میرے ہاتھوں سے چھوٹتے چھوٹتے رہ گئیں۔

وہ لکشمن تھا۔ جے پور شہر کی پرلی طرف واٹر پمپنگ اسٹیشن کا اٹینڈنٹ جس پر بھروسا کرکے ہم نے کرن کو اس کے حوالے کردیا تھا۔

"رامو واوا۔ غضب ہوگیا۔" لکشمن آگے بڑھ کر رامو کے چرن چھوتے ہوئے بولا۔

"کیا ہوا بے حرامی۔" رامو اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے قریب پڑی ہوئی شراب کی بوتل اٹھا کر ایک دو گھونٹ بھرے پھر بولا "شہر کو آگ لگ گئی ہے یا بھونچال آگیا ہے؟"

"اس سے بھی زیادہ خطرناک بات ہے رامو واوا۔" لکشمن بولا۔

"ابے کچھ بکے گا یا خطرے کی گھنٹیاں بجاتا رہے گا۔" رامو دہاڑا۔

"رامو واوا۔" لکشمن بولا "ٹھاکر بھانوت سنگھ اور اس

کے دوست ہمت سنگھ نے میرے کوارٹر پر حملہ کرکے کرن کو پکڑلیا تھا۔ اسے بوٹ مارا ہے ان لوگوں نے۔ وہ بری طرح گھائل ہے اور میرے کوارٹر میں پڑا ہے۔" لکشمن ایک لمحے کو خاموش ہوا پھر رامو کو مداخلت کا موقع دیے بغیر بولا "کرن بہت گھائل ہے۔ وہ اپنے پیروں پر کھڑا بھی نہیں ہوسکتا۔ اس نے مجھے بھیج دیا ہے کہ تمہیں خبردار کردوں تاکہ تم اپنا بندوبست کرلو۔ ہوسکتا ہے وہ لوگ آج رات ہی یہاں حملہ کردیں یا پولیس کو تمہارے اس ٹھکانے کی خبر کردیں اور ہاں۔ ان کے ساتھ بھگت بھی تھا۔ اجیری گیٹ والا۔"

"وہ حرامی۔ نیچ۔ دھوبی کی اولاد۔" رامو دہاڑا "اس کی تو میں بوٹی بوٹی کتوں کو کھلا دوں گا۔ رامو کے مقابلے پر آنے کی ہمت کرکے اس نے اپنی موت کو آواز دی ہے۔ پر نتو یہاں کا پتا انہیں کس نے بتایا؟"

"کرن نے۔" لکشمن نے جواب دیا "اگر وہ زبان نہ کھولتا تو ہمت سنگھ خنجر سے اس کی کھال اتار دیتا۔ وہ مار ڈالتا اسے۔"

"وہ حرامی مُسلا۔" رامو نے دانت کچکچائے "آج اگر وہ یہاں آگیا تو کل صبح اس کی لاش پر گدھ دعوت اڑائیں گے۔ پر یہ بتا تو یہاں تک کیسے آیا ہے؟"

"موٹر سائیکل پر رامو دادا۔" لکشمن نے جواب دیا۔

مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ وہ موٹر سائیکل پر یہاں تک آگیا تھا اور میں نے موٹر سائیکل کی آواز نہیں سنی تھی۔ میں شاید کمرے کے اندر کا منظر دیکھنے میں کچھ زیادہ ہی محو ہوگیا تھا یا شاید وہ موٹر سائیکل کو بستی کے باہر چھوڑ آیا تھا۔

"میں جارہا ہوں رامو دادا۔ تم لوگ اپنا بندوبست کرلو۔ وہ لوگ اکیلے یا پولیس کو لے کر کسی بھی وقت یہاں پہنچ سکتے ہیں۔" لکشمن نے کہا۔

"ابے حرامی۔ رامو کو ڈراتا ہے۔" رامو نے کہا "اچھا ایسا کر تو اس چھمیا کو ساتھ لے جا۔ چل چھمیا کپڑے پہن لے اور اس کے ساتھ چلی جا ورنہ بے موت ماری جائے گی۔"

"نہیں رامو! اب یہاں سے کوئی نہیں جائے گا۔"

دروازے کی طرف سے ٹھاکر کی آواز سن کر میں ایک بار پھر چونک گیا۔ رامو اور اس کے ساتھی بھی اچھل پڑے۔ چھمیا کے منہ سے تو ہلکی سی چیخ نکل گئی تھی۔ وہ فرش پر پڑے ہوئے کپڑے اٹھا کر ایک کونے میں دبک گئی اور تھر تھر کانپنے لگی۔

لکشمن کی حالت بھی اس سے مختلف نہیں تھی۔ ٹھاکر کو دیکھ کر وہ تھر تھر کانپنے لگا۔

"میں نے تم سے کہا تھا نا کہ غداری مت کرنا۔" وہ اس کی طرف دیکھ کر غرایا "اگر مجھے وہاں شبہ بھی ہوجاتا انہی کے ساتھی ہوتے میں تمہیں وہیں ختم کردیتا اور کرن کو زندہ نہ چھوڑتا لیکن میرا خیال ہے کہ تمہاری موت تمہیں یہاں لے آئی ہے۔"

"موت تو تمہیں یہاں گھسیر کر لائی ہے ٹھاکر۔" رامو غراتے ہوئے کہا "میں نے تمہیں کہا تھا' رامو سے پنگا نہ لینا لیکن تم نے اپنے بھائی کی موت سے بھی کوئی سبق نہیں لیا۔ آج تیرا حساب بھی چکتا کر ہی دوں گا۔"

"آج پتا چل جائے گا کہ تم کتنے بڑے بدمعاش ہو۔" ٹھاکر نے بھی غرا کر جواب دیا "کالی کے اس مندر کو تمہارا چتا بنادوں گا۔"

ان دونوں میں مکالمات کا تبادلہ ہوتا رہا۔ وہ بڑے تند الفاظ میں ایک دوسرے پر حملے کررہے تھے۔ لکشمن بے ہوا کھڑا تھا اور رامو کے دوسرے ساتھی بھی بڑے چاق چوبند کھڑے شاید ٹھاکر پر حملہ کرنے کے لیے کسی موقع کی تلاش میں تھے لیکن ٹھاکر کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے پستول نے انہیں اپنی جگہوں پر کھڑے رہنے پر مجبور کررکھا تھا۔ وہ لڑکی چھمیا جیسے تیسے کرکے کپڑے پہن چکی تھی اور کونے میں دیوار کے ساتھ چپکی کھڑی تھر تھر کانپ رہی تھی۔

رامو کے جسم کے بالائی حصے پر کوئی لباس نہیں تھا۔ اس کا سینہ ریچھ کی طرح بالوں سے بھرا ہوا تھا۔ اس نے گہرے رنگ کی پتلون پہن رکھی تھی جس میں بیلٹ کے ساتھ خنجر لٹکا ہوا تو لگی ہوئی تھی لیکن خنجر ایک طرف چٹائی پر شراب کی بوتلوں کے پاس پڑا ہوا تھا۔ ٹھاکر اس طرح اچانک پستول بدست کمرے میں وارد ہوا تھا کہ رامو کو خنجر اٹھانے کا موقع ہی نہیں مل سکا تھا۔

شراب کی ایک بوتل رامو کے پیروں کے قریب پڑی تھی اور وہ اپنا سیدھا پیر بہت آہستہ آہستہ بوتل کی طرف بڑھا رہا تھا۔ میں نے اس کی یہ حرکت دیکھ لی لیکن قبل اس کے کہ میں اس کا مقصد سمجھ سکتا' اس نے بوتل کو پیر سے اچھال دیا۔

بوتل چنگاڑ کی طرح ہوا میں اڑتی ہوئی ٹھاکر کے ماتھے سے لگی۔ ٹھاکر کے لیے بھی یہ حملہ بالکل غیر متوقع اور اچانک تھا۔ وہ کراہ کر ایک طرف جھکا۔ اس کا پستول والا ہاتھ اوپر اٹھ گیا تھا۔

اور پھر یوں لگا جیسے جہنم کی ساری بلائیں بیک وقت

حرکت میں آگئی ہوں۔ رامو' اس کے دونوں ساتھی اور لکشمن بیک وقت چیختے ہوئے اپنی اپنی جگہ سے اچھلے تھے۔ رامو اپنے خنجر کی طرف لپکا تھا۔

لکشمن ٹھاکر کے قریب تھا۔ اس نے ٹھاکر کی طرف چھلانگ لگا دی لیکن اسی وقت کمرے کی فضا فائر کے دھماکے اور لکشمن کی خوفناک چیخ سے گونج اٹھی۔ کمرے کی دوسری طرف کھڑکی سے چلائی جانے والی گولی اس کی پشت میں لگی اور وہ ڈکراتا ہوا ڈھیر ہوگیا۔

میں نے چونک کر اس طرف دیکھا۔ وہ کھڑکی تو میں نے پہلے بھی دیکھی تھی مگر زیادہ توجہ نہیں دی تھی۔ اس کھڑکی میں بھی سلاخیں لگی ہوئی تھیں اور اس کی دوسری طرف بھگت دھوبی کا چہرہ دکھائی دے رہا تھا۔ اس کا پستول والا ہاتھ سلاخوں کے اندر تھا۔

رامو کے دونوں ساتھیوں میں سے ایک ٹھاکر سے ٹکرا چکا تھا۔ ٹھاکر سر پر لگنے والی بوتل کی ضرب سے ابھی پوری طرح نہیں سنبھل سکا تھا۔ وہ بدمعاش پوری قوت سے ٹھاکر سے ٹکرایا تھا اور ٹھاکر لڑکھڑاتا ہوا دیوار کے ساتھ ٹکرا گیا۔ اس کے ہاتھ سے پستول بھی چھوٹ گیا تھا۔

اس بدمعاش نے ارنا بھینسے کی طرح دہاڑتے ہوئے ٹھاکر کے سینے پر زور سے ٹکر ماری۔ ٹھاکر بھی بلبلا اٹھا۔

رامو اپنا خنجر اٹھانے کے لیے جھکا ہی تھا کہ کھڑکی کی طرف سے ایک اور فائر ہوا۔ گولی رامو کے ہاتھ پر لگی۔ اس کی چھوٹی انگلی اڑ گئی۔ وہ اچھل کے پیچھے ہٹ گیا اور زور زور سے ہاتھ جھٹکنے لگا۔ خون کے چھینٹے چاروں طرف اڑ رہے تھے۔

"تم اپنی جگہ سے حرکت نہیں کرو گے رامو۔" بھگت چیخا "اب اگر تم نے حرکت کی تو دوسری گولی تمہاری کھوپڑی میں لگے گی۔"

رامو بھیڑیے کی طرح غرا کر رہ گیا۔ رامو کا دوسرا ساتھی بھی ٹھاکر سے بھڑ گیا تھا۔ وہ ٹھاکر کو گرفت میں لینے کی کوشش کررہے تھے مگر ٹھاکر بھرپور انداز میں مزاحمت کررہا تھا۔

"اے!" کھڑکی میں کھڑا ہوا بھگت چیخا "ٹھاکر سے دور ہٹ جاؤ۔ ورنہ گولی ماردوں گا۔"

مگر ان دونوں پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ کمرے کی فضا ایک بار پھر فائر کی آواز سے گونج اٹھی۔ بھگت نے ہوائی فائر کیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ فائر کی آواز سن کر وہ دونوں ٹھاکر سے الگ ہٹ جائیں گے مگر ایسا نہیں ہوا۔ وہ اس طرح ٹھاکر سے الجھے ہوئے تھے کہ بھگت براہ راست کسی پر گولی نہیں چلا سکتا تھا کیونکہ اس طرح ٹھاکر کے بھی زد پر آجانے کا اندیشہ تھا۔

بھگت نے ایک بار پھر چیختے ہوئے ٹریگر دبا دیا۔ اس مرتبہ فائر نہیں ہوا۔ "سٹک" کی آواز ابھر کر رہ گئی۔ یا تو اس کا پستول خالی ہوگیا تھا یا کسی اور وجہ سے گولی نہیں چلی تھی۔

رامو ایک بار پھر اپنے خنجر کی طرف لپکا۔ اس مرتبہ اسے کوئی رکاوٹ پیش نہیں آئی۔

میرے لیے اب تماشائی بنے رہنا ممکن نہیں تھا۔ میں نے ٹھاکر کی طرف دیکھا۔ وہ بڑی بے جگری سے ان دونوں کا مقابلہ کررہا تھا۔

"ڈٹے رہو ٹھاکر۔ میں آرہا ہوں۔" میں نے چیخ کر کہا۔

رامو خنجر اٹھانے کے لیے جھکا ہوا تھا۔ میری آواز سن کر اس نے اوپر دیکھا۔ میں اس وقت روشن دان کے سامنے سے ہٹ گیا تھا۔

میں روشن دان کی سلاخوں کو پکڑے ہوئے نیچے لٹک گیا۔ ٹٹول کر ایک پیر ذرا نیچے والی دیوار کے کھڈے میں جمایا۔ سلاخوں کو چھوڑ کر دیوار کی ٹوٹی ہوئی اینٹوں پر گرفت رکھی اور آہستہ آہستہ نیچے اترنے لگا۔

دیوار پر چڑھنا تو آسان ثابت ہوا لیکن نیچے اترنا خاصا مشکل تھا۔ میں نے تقریباً آٹھ فٹ کی بلندی سے چھلانگ لگا دی اور اٹھ کر مندر کے دروازے کی طرف دوڑا۔

کمرے میں گھمسان کا رن مچا ہوا تھا۔ وہ دونوں غنڈے تو اب بھی ٹھاکر سے گتھم گتھا تھے اور بھگت دھوبی رامو سے بھڑا ہوا تھا۔ بھگت نے اس کا خنجر والا ہاتھ پکڑ رکھا تھا اور اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے رامو کے منہ سے غلیظ گالیوں کا گٹر ابل رہا تھا۔

میں نے ان دو غنڈوں میں سے ایک کو جو ٹھاکر سے گتھم گتھا ہورہے تھے' بالوں سے پکڑ کر کھینچ لیا اور اس کے چہرے پر تابڑ توڑ کئی گھونسے رسید کردیے۔ وہ بلبلاتا ہوا کمرے کے کونے میں چھمیا کے قریب جا گرا۔ چھمیا کے منہ سے چیخ نکل گئی اور وہ اچھل کر پیچھے ہٹ گئی۔

رامو نے بھگت کی ٹانگ میں اڑنگا لگا کر اسے گرا دیا اور خنجر لہراتا ہوا ٹھاکر کی طرف لپکا۔ میں اس کے راستے میں تھا۔ میں نے بڑی پھرتی سے اس کی ٹانگ میں ٹانگ پھنسا دی۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا اس طرح گرا کہ اس کا خنجر اپنے ہی ساتھی کی پشت میں پیوست ہوگیا جو ٹھاکر کو رگید رہا تھا۔

کمرا اس شخص کی بھیانک چیخ سے گونج اٹھا۔ رامو بھی وحشت زدہ سا ہوگیا۔ اس نے ایک جھٹکے سے ہاتھ پیچھے کھینچا

تو خنجر باہر آتے ہی اس شخص کی پشت سے خون کی دھار بہہ نکلی۔

رامو پلٹ کر وحشیانہ انداز میں میری طرف لپکا۔ اس نے خنجر سے بھرپور وار کیا تھا لیکن میں نے کلائی پر اس کا وار روکا اور دوسرے ہاتھ سے اس کے پیٹ پر زوردار گھونسا رسید کردیا۔ وہ چیخ کر دہرا ہوا تو میں نے اس کے بازو پر چوپ رسید کردیا جو میری گرفت میں تھا۔ اس مرتبہ وہ ذبح ہوتے ہوئے بکرے کی طرح بلبلا اٹھا۔ خنجر اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گر گیا۔ میں نے اس کی ٹانگوں کے بیچ گھٹنے سے زور دار ٹھوکر مار کر چھوڑ دیا۔ وہ چیختا ہوا پیچھے الٹ گیا۔

ٹھاکر اب سنبھل چکا تھا۔ اس کی پیشانی سے خون بہہ رہا تھا۔ ہونٹوں سے بھی خون رس رہا تھا لیکن وہ اس کی پروا کیے بغیر رامو پر پل پڑا اور اس پر ٹھوکروں کی بارش کردی۔

دوسری طرف بھگت دھوبی نے اس بدمعاش کو دبوچ رکھا تھا جسے میں نے چھمیا کے قریب گرایا تھا۔ بھگت اطمینان بخش طریقے سے اس کی ٹھکائی کررہا تھا۔

میں دوبارہ رامو کی طرف متوجہ ہوگیا۔ راموا اب میرے اور ٹھاکر کے درمیان فٹ بال بن گیا تھا۔ کبھی میں اسے ٹھوکر مارتا اور کبھی ٹھاکر اسے گھونسا رسید کردیتا۔

رامو ایک لات کھا کر دروازے میں گرا اور پھر دوسرے ہی لمحے اس نے اٹھ کر باہر کی طرف دوڑ لگا دی۔ میں بھی اس کے پیچھے لپکا۔ مندر کے ہال میں پہنچ کر رامو نے اچانک ہی پلٹ کر لات چلا دی۔ اس کی ٹھوکر میری پنڈلی پر لگی اور میں کراہتا ہوا گر گیا۔ رامو وہاں رکا نہیں۔ وہ دوڑتا ہوا مندر سے باہر نکل گیا۔ ٹھاکر نے بھی اس کے پیچھے دوڑ لگا دی تھی۔

رامو کی آخری ٹھوکر میری پنڈلی کی ہڈی پر لگی تھی۔ مجھے سنبھلنے میں چند سیکنڈ لگ گئے اور جب میں اٹھ کر لنگڑاتا ہوا مندر سے باہر آیا تو سامنے بستی کی گلیوں میں دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں اور پھر قدموں کی آوازیں معدوم ہوگئیں۔ ایک دم سناٹا چھا گیا جیسے یہاں زندگی کا وجود ختم ہوگیا ہو۔

اور پھر اچانک میں اچھل پڑا۔ وہ کسی گاڑی کا انجن اسٹارٹ ہونے کی آواز تھی۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ رامو نے اپنی گاڑی بستی کے کھنڈروں میں کہیں چھپا رکھی تھی اور اب وہ فرار ہونے کی کوشش کررہا تھا۔

اچانک میرے ذہن میں ایک اور خیال ابھرا۔ میں نے مندر والے چبوترے سے چھلانگ لگا دی اور گلیوں میں اس طرف دوڑنے لگا جہاں ہماری جیپ کھڑی تھی۔

رامو کی گاڑی کی آواز فضا میں گونج رہی تھی۔ میرے جسم کی تمام قوت ٹانگوں میں سمٹ آئی تھی اور میں گلیوں میں چکراتا ہوا برق رفتاری سے دوڑ رہا تھا اور صرف دو منٹ میں ٹھاکر کی جیپ تک پہنچ گیا۔

رامو کی گاڑی کی آواز قریب آتی جارہی تھی۔ میں اچھل کر ٹھاکر کی جیپ میں بیٹھ گیا اور یہ بھی مقام شکر تھا کہ چابی اگنیشن میں موجود تھی۔

میں نے انجن اسٹارٹ کیا اور جیپ کو ریورس میں کشادہ گلی میں لے آیا۔ بستی سے باہر نکلنے کا یہی راستہ تھا اور مجھے یقین تھا کہ رامو کی گاڑی اس طرف سے آئے گی اور بالفرض وہ کسی اور گلی سے بھی نکل گیا تو میں اس کا تعاقب کرنے کی پوزیشن میں تھا۔

میرا پہلا خیال درست نکلا۔ رامو کی گاڑی اسی طرف آرہی تھی۔ کھنڈروں میں ہیڈلائٹس کی روشنی چمکی تو میں نے اپنی جیپ کو گلی کے وسط میں اس طرح کھڑا کردیا کہ راستہ بند ہوگیا۔ دوسرے ہی لمحے رامو کی گاڑی بڑی تیزی سے اس طرف مڑی۔

وہ بھی جیپ تھی۔ رامو راستہ نہ پاکر شاید بدحواس ہوگیا تھا۔ اس نے تصادم سے بچنے کے لیے اپنی جیپ کو دائیں طرف گھما دیا۔ اس کا خیال تھا کہ شاید پہلو سے نکل جائے مگر بدحواسی میں اسٹیئرنگ کچھ زیادہ ہی گھوم گیا تھا۔ جیپ کے پیچھے لٹکے ہوئے ٹھاکر کو دیکھ کر بھی میں چونک گیا تھا۔ جیپ دائیں طرف ایک کھنڈر کی دیوار سے ٹکرا گئی۔ ٹھاکر اچھل کر دور جا گرا۔ رامو نے جیپ سے اچھلا لانگ لگا دی۔ اسی لمحے میں بھی اپنی جگہ سے اچھلا اور ہوا میں اڑتا ہوا رامو کے اوپر گرا۔

رامو میرے نیچے دبا ہوا تھا اور اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کررہا تھا اور وہ اپنے اس مقصد میں کامیاب بھی ہوگیا تھا۔ میری گرفت سے نکل کر وہ ایک طرف بھاگا تو ٹھاکر نے اسے چھاپ لیا۔

ٹھاکر کا زوردار گھونسا کھا کر رامو اپنی جیپ سے ٹکرا گیا۔ میں نے اپنا خنجر نکال لیا۔ میرے خیال میں اس کے استعمال کا وقت آگیا تھا۔ ٹھاکر نے خنجر میرے ہاتھ سے جھپٹ لیا اور رامو کے سامنے تن کر کھڑا ہوگیا۔

"مجھے معاف کردو ٹھاکر۔ چھما کردو مجھے۔" رامو نے دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔ اس کے چہرے پر بے پناہ خوف امڈا تھا۔ موت کو سامنے دیکھ کر وہ رحم کی بھیک مانگنے لگا تھا۔ اس

[illegible] طرح خنجر کے بے در[illegible] وار کرکے بڑی بے دردی سے موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ ماسٹر پھوپھانگ کو دو آدمیوں نے گرفت میں لے رکھا تھا تاکہ وہ مزاحمت نہ کرسکے اور یہاں ون ٹو ون مقابلہ تھا۔ رامو اپنا دفاع کرنے کے لیے آزاد تھا لیکن وہ اپنا دفاع نہیں کرسکا۔

رامو زخموں سے چور ہو کر زمین پر گر گیا۔ ٹھاکر کے جنون میں کمی نہیں آئی تھی۔ وہ اب بھی اس کے جسم کے مختلف حصوں پر خنجر کے وار کررہا تھا۔ رامو میں اب کچھ نہیں بچا تھا۔

میں نے آگے بڑھ کر ٹھاکر کو پکڑ لیا۔ وہ اپنے آپ کو چھڑا کر بار بار رامو پر خنجر کے وار کررہا تھا۔ بدلے کی آگ نے اسے پوری طرح اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ اس کے بھائی کا قاتل اس کے ہاتھوں ختم ہوچکا تھا مگر وہ آگ شاید ابھی ٹھنڈی نہیں ہوئی تھی۔

میں نے اسے بانہوں سے جکڑ کر پیچھے کھینچ لیا اور خنجر اس کے ہاتھ سے چھین لیا۔

"بس کرو ٹھاکر۔ وہ ختم ہوچکا ہے۔ ہوش میں آؤ۔ اپنے حواس پر قابو پاؤ۔" میں اسے کھینچتا ہوا رامو کی لاش سے دور لے گیا۔

کافی دیر بعد ٹھاکر اپنے حواس پر قابو پاسکا تھا۔ میں نے اسے ایک شکستہ چبوترے پر بٹھا دیا اور خود اس کے سامنے کھڑا ہوگیا۔ وہ گہرے گہرے سانس لے رہا تھا۔

اس وقت مندر کی طرف کھنڈروں کی کسی گلی سے نسوانی چیخوں کی آواز سنائی دینے لگی۔ میں ٹھاکر کو وہیں چھوڑ کر اس طرف دوڑ پڑا مگر چند قدم بعد ہی مجھے رک جانا پڑا۔

بھگت دھوبی چھمیا کو بالوں سے پکڑے گھسیٹتا ہوا لا رہا تھا اور چھمیا تکلیف سے چیخ رہی تھی۔

قریب پہنچ کر بھگت نے چھمیا کو زوردار دھکا دے کر گرا دیا۔ چھمیا منہ کے بل گری۔ اس کے منہ سے خوفناک چیخ نکل گئی تھی۔ جس جگہ ہم موجود تھے وہاں دونوں جیپوں کی ہیڈلائٹس کی روشنی پہنچ رہی تھی اور چھمیا کے چہرے پر خوف کے گہرے سائے صاف نظر آرہے تھے۔

"وہ کہاں گیا؟" میں نے بھگت سے رامو کے اس ساتھی کے بارے میں پوچھا جس سے اسے بھڑا ہوا چھوڑ کر آیا تھا۔

"نرک (جہنم) میں پہنچا دیا اس سالے حرامی کو بھی۔" بھگت نے جواب دیا۔

بھگت واقعی کام کا آدمی ثابت ہوا تھا۔ ٹھاکر نے اسے اپنا سیوک بنالیا تھا اور پہلے ہی موقع پر اس نے اپنی وفاداری

[illegible] جس کے بھائی کو اس نے خنجر سے چھلنی کردیا تھا اور بھابی [illegible] ادھ موا لرکے پھینک دیا تھا۔

"کیوں۔ نکل گئی ساری بدمعاشی؟" ٹھاکر غرایا "تم نے کتنوں کے بے گناہوں کو بے دردی سے موت کے گھاٹ اب تک اتارا ہے۔ انہوں نے بھی تم سے اسی طرح زندگی کی بھیک مانگی ہوگی۔ وہ بھی تمہارے سامنے اسی طرح ہاتھ جوڑ کر گھگھیائے ہوں گے۔ تم نے انہیں معاف کردیا تھا؟ اور میرے بھائی نے تمہارا کیا بگاڑا تھا؟ کیا جرم کیا تھا اس نے؟ تمہاری دشمنی مجھ سے تھی۔ مرد بن کر مجھے للکارتے مگر تمہاری بدمعاشی تو بے گناہوں پر ہی چلتی رہی ہے اور اب موت کو سامنے دیکھ کر گھگھیانے لگے۔"

"مجھے چھما (معاف) کردو ٹھاکر۔" رامو کی آواز رو دینے والی تھی "تم جو کہو گے میں کروں گا۔ مجھے بلونت سنگھ نے اکسایا تھا۔ تم کہو تو میں اس کی لاش تمہارے چرنوں میں ڈال دوں گا۔ مجھے ایک اَوسر (موقع) دو ٹھاکر۔"

"بلونت سنگھ کہاں ہے؟" ٹھاکر نے پوچھا۔

"سارسکا میں۔ وہ اپنے گرو کے ساتھ دو دن پہلے وہاں چلا گیا تھا۔" رامو نے جواب دیا۔

"کون گرو؟" ٹھاکر بولا۔

"وہ بدیشی مُسلا جو بھیس بدل کر پنڈتوں میں گھسا بیٹھا ہے۔" رامو نے کہا۔ اس کی بات سن کر میں بھی چونک گیا۔

"ان دونوں سے تو ہم بعد میں نمٹ لیں گے پہلے تم۔" ٹھاکر نے یہ کہتے ہوئے اس پر خنجر سے وار کردیا۔

رامو نے وار روکنے اور بچنے کی کوشش کی تھی مگر کامیاب نہیں ہوسکا۔ خنجر اس کے سینے میں پیوست ہوگیا اور اس کی خوفناک چیخ ویرانے میں گونج گئی۔

ٹھاکر نے بڑی پھرتی سے خنجر کھینچ لیا اور ایک لمحہ ضائع کیے بغیر دوسرا وار کردیا۔ خنجر اس مرتبہ بھی رامو کے سینے ہی میں پیوست ہوا اور اس کے منہ سے نکلنے والی دوسری چیخ پہلے سے بھی زیادہ خوفناک تھی۔

اور پھر ٹھاکر پر جیسے جنون طاری ہوگیا۔ وہ چیخ چیخ کر رامو کے سینے اور پیٹ پر خنجر کے پے در پے وار کرتا رہا۔ رامو کی پشت جیپ سے لگی ہوئی تھی۔ وہ چیخ چیخ کر اب بھی اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کررہا تھا مگر اب اس میں قوت مدافعت نہیں رہی تھی۔ اس کے سینے اور پیٹ پر ٹھاکر نے اتنے وار کیے تھے کہ پیٹ سے آنتیں بھی باہر لٹک گئی تھیں۔

مجھے بنکاک میں اندرا ریجنٹ ہوٹل کے سامنے کا وہ منظر یاد آگیا جب چی فانگ نے ماسٹر پھوپھانگ کو میری نظروں کے

ثابت کردی تھی۔ اس نے ہمارا مان رکھ لیا تھا۔

میں ٹھاکر کو اٹھا کر اپنی جیپ کے پاس لے آیا۔ اس کے کپڑے بھی خون میں لت پت ہو رہے تھے۔ خون کے کچھ چھینٹے میرے لباس پر بھی پڑے تھے۔

بھگت نے چھمیا کا بازو پکڑ رکھا تھا۔ رامو کی لاش دیکھ کر اس کے منہ سے خوفناک چیخ نکل گئی۔ بھگت نے اس کے منہ پر زوردار تھپڑ مار دیا۔

"اس حرامی کے ساتھ عیش کر رہی تھی نا۔ اس کا انجام بھی دیکھ لے۔" بھگت نے غرا کر کہا پھر ٹھاکر کی طرف دیکھتے ہوئے بولا "اس کا کیا کروں سرکار؟"

"اسے یہیں چھوڑ دو۔ صبح تک بھیڑیے اس کا بھی تیا پانچا کر دیں گے۔" ٹھاکر کے بجائے میں نے جواب دیا۔

"نہیں نہیں۔ مجھے یہاں مت چھوڑنا۔" چھمیا روتے ہوئے میرے قدموں پر گر گئی "میں نردوش (بے قصور) ہوں۔ میں نے کچھ نہیں کیا۔"

"اسے جیپ میں بٹھالو بھگت۔" ٹھاکر نے کہا "شہر میں کسی جگہ اتار دیں گے اسے۔"

"لیکن سرکار۔" بھگت بولا "اسے زندہ چھوڑنا بہت بڑے خطرے کی بات ہوگی۔ یہ پولیس کو بتا دے گی کہ یہاں کیا ہوا ہے۔"

"اگر یہ کسی کے سامنے زبان کھولے گی تو اس کا بھی رامو جیسا حشر ہوگا۔ بٹھالو اسے جیپ میں۔" ٹھاکر نے کہا۔

رامو نے چھمیا کو اٹھا کر جیپ کی پچھلی سیٹ پر پٹخ دیا۔ ٹھاکر اسٹیئرنگ کے سامنے بیٹھنا چاہتا تھا مگر میں نے اسے دوسری سیٹ پر بٹھایا اور خود ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔

میں جیپ کو کھنڈروں سے نکال کر سڑک پر لے آیا اور اسے شہر کی طرف دوڑا دیا۔ ٹھاکر اب پوری طرح اپنے حواس میں آچکا تھا لیکن اس کی باتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس کے انتقام کی آگ ابھی پوری طرح سرد نہیں ہوئی تھی۔ اب وہ بلونت سنگھ کو مزہ چکھانے کا پروگرام بنا رہا تھا جو دو دن پہلے اپنے گرو کے ساتھ سارسکا کی طرف فرار ہو چکا تھا۔

رامو نے جن الفاظ میں بلونت سنگھ کے گرو کا تذکرہ کیا تھا اس سے مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی تھی کہ بلونت سنگھ کا وہ گرو کون ہو سکتا ہے۔ بدیشی مُسلا۔۔۔ وہ دارا کے علاوہ کون ہو سکتا تھا!

وہ دارا ہی تھا جس نے یہ آگ بھڑکائی تھی۔ پہلے اس نے پنڈتوں کو ہمارے خلاف بھڑکایا پھر اتفاق سے اسے بلونت سنگھ مل گیا جو روپ متی سے خار کھائے بیٹھا تھا۔ وہ دونوں مل گئے تو ہمارے خلاف سازشوں کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو گیا۔ دارا مجھ سے پیچھا چھڑانا چاہتا تھا۔ بلونت سنگھ روپ متی سے اپنی توہین کا بدلہ لینا چاہتا تھا۔ ان دونوں نے مل کر پنڈتوں کو بھڑکایا تو انہوں نے ہندو مسلم فساد مچانے کی کوشش کی۔ یہ تو اتفاق تھا کہ کچھ لوگ ہمارے ہاتھ لگ گئے تھے جنہوں نے پریس کے سامنے یہ اعتراف کر لیا کہ مندر میں روپ متی کو کسی مسلمان کے ساتھ رنگ رلیاں مناتے ہوئے نہیں پکڑا گیا تھا بلکہ یہ ساری حرکتیں پنڈت لوگ ہی کر رہے تھے۔ دھرم کو کسی مسلمان نے نہیں انہی دھرماتماؤں نے نشٹ کیا تھا اور پھر یہ بھی محض اتفاق تھا کہ پنڈت رام سروپ فیروز شاہ کے ہتھے چڑھ گیا۔ پنڈت رام سروپ ہندوؤں کو بھڑکا رہا تھا کہ ایک مسلمان ہندو ناری کو بغل میں لے کر کیوں گھوم رہا ہے۔ لوگوں کے مذہبی جذبات کو بھڑکاتے ہوئے وہ بھول گیا تھا کہ اس کی اپنی بیٹی پوجا ایک مسلمان کے ساتھ رہ رہی تھی اور شاید اس خوف سے وہ اس ٹولے سے الگ ہو گیا تھا کہ اگر اس کی بیٹی کے بارے میں پتا چل گیا تو یہی پنڈت اور پجاری اس کی بوٹیاں نوچ ڈالیں گے۔

ہماری جوابی کارروائیوں کے باعث ان پنڈتوں کی بڑی سازشیں بری طرح ناکام ہو گئی تھیں۔ ان پنڈتوں کے سیاہ کرتوت بھی لوگوں کے سامنے آگئے تھے جس وجہ سے ہنگاموں نے شروع ہی میں دم توڑ دیا تھا تاہم جو پنڈت اور پجاری دارا اور بلونت سنگھ کے آلہ کار بنے ہوئے تھے وہ بھی ہمیں زک پہنچانے کے لیے اندر ہی اندر سازشوں میں مصروف تھے۔ ان میں سے پنڈت رام اوتار ہمارے قبضے میں تھا۔ اس سے ابھی ہم نے کام لینا تھا۔

بلونت سنگھ نے ہی رامو جیسے خطرناک بدمعاش اور کرائے کے قاتل کو ہمارے پیچھے لگا دیا تھا اور آج ہم نے اسے بھی ٹھکانے لگا دیا تھا۔

شروع میں ایک مرتبہ جب بات ہوئی تھی تو ٹھاکر نے کہا تھا کہ ان سارے ہنگاموں کے پیچھے بلونت سنگھ کا ہاتھ ہے اور میں نے کہا تھا کہ بلونت سنگھ کو بھی کسی اور کی آشیرباد حاصل ہے اور ٹھاکر کے ہاتھوں مرنے سے پہلے رامو کے بیان نے میرے اس خیال کی تصدیق کر دی تھی کہ بلونت سنگھ اپنے گرو کے ساتھ سارسکا کی طرف فرار ہو گیا تھا اور وہ گرو بدیشی مُسلا۔

شہر میں داخل ہونے کے بعد ہوا محل والی سڑک پر ریلوے برج کے قریب ٹھاکر کے کہنے پر میں نے جیپ روک لی۔

"بھگت۔" ٹھاکر نے پیچھے مڑ کر دیکھے بغیر کہا "اس چھوکری کو یہاں اتار دو۔"

"نہیں نہیں۔ مجھے یہاں مت اتارو۔" چھمیا جلدی سے بولی "یہاں سناٹا ہے۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ مجھے ریلوے اسٹیشن کے پاس اتار دینا۔"

"ہم اسٹیشن کی طرف نہیں جا رہے۔" ٹھاکر نے کہا "یہاں اگر کسی غنڈے نے تمہیں پکڑ بھی لیا تو تمہارے ساتھ وہی کچھ ہوگا جو تم کالی کے پرانے مندر میں ان حرامیوں کے ساتھ کر رہی تھیں۔ اترو نیچے۔ جلدی کرو۔"

بھگت نے چھمیا کو اٹھا کر جیپ سے نیچے پھینک دیا اور میں نے ایک جھٹکے سے جیپ آگے بڑھا دی۔

ریلوے برج پار کر کے ہم بھوانی سنگھ مارگ کی طرف نکل آئے اور پھر یوتھ ہوسٹل کے سامنے سے ہوتے ہوئے ٹھاکر کی حویلی تک پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں لگی تھی۔ اس وقت تین بج رہے تھے۔

ٹھاکر فوراً ہی اپنے کمرے کے باتھ روم میں گھس گیا۔ میں نے بھگت کو حویلی کے ملازم جیوے کے سپرد کر دیا۔

"اسے اپنے کپڑوں کا ایک جوڑا دے دو اور باتھ روم دکھا دو۔" میں نے کہا۔ بھگت کے کپڑوں پر بھی خون کے چھینٹے پڑے ہوئے تھے۔

بھگت بڑی حیرت سے اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ اس کی زندگی تنگ و تاریک گلیوں کی کھولیوں میں گزری تھی اور اس قسم کی عمارت میں داخل ہونے کا شاید پہلا موقع تھا اور وہ بھی ٹھاکر بھانوت سنگھ کی حویلی۔

جیوا بھگت کو باتھ روم میں چھوڑ کر آیا تو اس نے بتایا کہ تقریباً دو گھنٹے پہلے ٹیلے والی حویلی سے راج کماری روپ متی کا فون آیا تھا۔

اس وقت اگرچہ تین بج رہے تھے لیکن مجھے یقین تھا کہ وہ تینوں جاگ رہی ہوں گی۔ میں کونے والے صوفے پر بیٹھ گیا اور قریب رکھے ہوئے ٹیلی فون کا ریسیور اٹھا کر نمبر ملانے لگا۔

کال دوسری ہی گھنٹی پر ریسیو کر لی گئی۔ آواز روپ متی کی تھی۔

"کہاں غائب تھے تم لوگ؟" روپ متی نے میری آواز سنتے ہی کہا "تین بج رہے ہیں۔ تم لوگوں نے کوئی اطلاع بھی نہیں دی۔"

"ہم لوگ بھیڑیوں کا شکار کھیلنے کے لیے ریگستان کی طرف نکل گئے تھے۔ وہاں کوئی ٹیلی فون نہیں تھا جس سے تمہیں اطلاع دی جاتی۔" میں نے کہا۔

"کیا مطلب؟" روپ متی کے لہجے میں حیرت تھی۔

"مطلب تمہیں ٹیلی فون پر نہیں بتا سکتا۔ اس وقت تمہارے لیے یہی جان لینا کافی ہے کہ ہم خیریت سے ہیں۔ کل صبح ملاقات ہوگی۔" میں نے کہا۔

روپ متی لمبی گفتگو کے موڈ میں تھی لیکن میں نے چند رسمی جملوں کے تبادلے کے بعد فون بند کر دیا اور دوسرے کمرے میں جا کر ٹھاکر کے کپڑوں کا ایک جوڑا نکالا اور باتھ روم میں گھس گیا۔

تقریباً پندرہ منٹ بعد جب میں ہال میں آیا تو ٹھاکر اور بھگت وہاں موجود تھے۔ ٹھاکر صوفے پر بیٹھا تھا اور بھگت قالین پر آلتی پالتی مارے ہوئے تھا۔ اس وقت میں نے جیوا کو بھی ٹرے اٹھائے کچن کی طرف سے آتے ہوئے دیکھا۔ اسے معلوم تھا کہ ہم اس وقت چائے پینا پسند کریں گے اور ہمارے کہنے سے پہلے ہی وہ چائے بنا کر لے آیا تھا۔

چائے پیتے ہوئے میں ٹھاکر کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ بہت ہلکا پھلکا لگ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر اب وہ تناؤ بھی نہیں تھا۔ چائے پینے کے دوران میں ہم میں زیادہ گفتگو بھی نہیں ہوئی۔

پونے چار بجے کے قریب ہم اٹھ گئے۔ ٹھاکر اپنے کمرے میں چلا گیا اور میں دوسرے کمرے میں آگیا۔ بھگت ہال ہی میں قالین پر لیٹ گیا تھا۔

میری آنکھوں میں مرچیں سی لگ رہی تھیں۔ میں سونا چاہتا تھا مگر آنکھیں بند نہیں ہو رہی تھیں۔ میں ٹھاکر کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ دکھ اور کرب کا احساس اس وقت ہوتا ہے جب اپنی آنکھوں کے سامنے اپنی عزیز ترین ہستیوں کو بے رحمی سے موت کے گھاٹ اتار دیا جائے۔ میں نے یہ کرب جھیلا تھا۔ اس دکھ کا بوجھ اب تک اٹھائے ہوئے ہوں۔ میرے سینے میں اب تک لاوا کھول رہا ہے۔

ٹھاکر نے اپنے منہ بولے بھائی کی لاش ادھڑی ہوئی دیکھی تھی اور وہ حواس کھو بیٹھا تھا۔ اتنے دنوں سے وہ ایک لمحے کو بھی چین سے نہیں بیٹھا تھا۔ پاگلوں کی طرح بھائی کے ہتیارے (قاتل) کو تلاش کرتا رہا تھا اور بالآخر آج اس نے بدلہ لے لیا تھا۔ اس کے سینے میں بھڑکتے ہوئے انتقام کے شعلے ٹھنڈے ہو گئے تھے۔ اسے سکون مل گیا تھا لیکن۔۔۔ میں۔۔۔ میرے سینے میں اب تک لاوا کھول رہا تھا۔

وہ بھیانک منظر میری نظروں میں گھوم گیا جب ہم رات کو اپنے گھر کے سامنے ٹیکسی سے اترے تھے اور دارا اور

اس کے گُرگوں نے میرے ممی اور ڈیڈی پر حملہ کردیا تھا۔ ان وحشیوں نے بھی ممی اور ڈیڈی کو اسی طرح ادھیڑا تھا۔

مجھے اس رات کی ایک ایک بات یاد تھی۔ میں کچھ بھی نہیں بھولا تھا۔ ممی اور ڈیڈی کی خوفناک چیخیں اب بھی مجھے اپنے کانوں میں گونجتی ہوئی محسوس ہورہی تھیں۔

یوں تو میں ایک لمحے کو بھی ممی ڈیڈی کو نہیں بھولا تھا لیکن آج بڑی شدت سے ان کی یاد آرہی تھی۔ میرے سینے میں آگ سی لگی ہوئی تھی۔ حلق خشک ہورہا تھا اور زبان اکڑ کر تالو سے چپکی جارہی تھی۔ مجھے سانس گھٹتا ہوا محسوس ہونے لگا۔

میں اٹھ کر کمرے سے باہر آگیا۔ کچن کے دروازے کے ساتھ فریج رکھا ہوا تھا۔ میں نے فریج کھولا اور پانی کی بوتل نکال کر ہونٹوں سے لگالی۔ میرا حلق تو تر ہوگیا لیکن نہ پیاس بجھی اور نہ ہی سینے میں بھڑکتی ہوئی آگ ٹھنڈی ہوئی۔

میں اپنے کمرے کی طرف واپس جارہا تھا کہ بھگت کی آواز سن کر ٹھٹک گیا۔ ہال میں اس وقت مدھم روشنی کا بلب جل رہا تھا۔ بھگت ابھی تک جاگ رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"کیا بات ہے سرکار۔ نیند نہیں آرہی۔"

میں نے رک کر بھگت کی طرف دیکھا اور پھر اس کے قریب ہی قالین پر بیٹھ گیا۔

"تم بھی تو ابھی تک جاگ رہے ہو۔" میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "آج کے واقعے نے شاید تمہیں بیاکل کر رکھا ہے۔"

"یہ بات نہیں ہے سرکار۔" بھگت نے جواب دیا "یہ سب کچھ تو میں بچپن ہی سے دیکھتا آرہا ہوں۔ اپن کا تو جیون ہی ایسی دشاؤں (حالات) میں گزرا ہے۔ جیون میں پہلی بار آج کسی بندے کو اوپر پہنچایا ہے۔ ہاں اس کی بھی چنتا ہے پر نیند نہ آنے کا کارن (سبب) کچھ اور ہے۔"

"اور وہ کارن کیا ہے؟" میں نے اس کی باتوں میں دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

"ہمت سنگھ جی۔" وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولا "اپنا جیون فٹ پاتھوں اور کھولیوں میں بیتا ہے۔ ہمیں تو ہمیشہ گندی نالیوں کے کیڑے ہی سمجھا گیا۔ اپن ٹنکے فرش اور کھری بان کی چارپائیوں پر سونے کے عادی ہیں۔ یہ اجنبی جگہ۔ یہ محل۔۔۔ بس یہی کارن ہے نیند نہ آنے کا۔"

"عادی ہوجاؤ گے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ایک بات بتانا ہمت سنگھ جی۔" وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولا "یہ جو کالی کے پرانے مندر میں چار کھون (قتل) ہوئے ہیں۔ ان میں دو تو اپن کے کھاتے میں ہیں۔ ایک کنگرولی کا رانا شمشیر سنگھ اور دوجا جو بعد میں میرے ہاتھوں اپنی کردن تڑوا بیٹھا وہ اور لونڈیا چنتیا۔ اس نے سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ اسے ٹھاکر جی نے چھوڑ دیا۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بولا "ان کھونوں کا پتا تو چل ہی جائے گا۔ کیا پولیس ٹھاکر جی کی حویلی پر نہیں آئے گی؟"

میں سمجھ گیا کہ وہ اندر ہی اندر خوف زدہ تھا لیکن کھل کر اپنے خوف کا اظہار نہیں کرنا چاہتا تھا۔

"قانون سے بالا دست تو کوئی بھی نہیں ہے۔" میں نے کہا "پر تمہیں ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ تم ٹھاکر بھانوت سنگھ کے شرن (پناہ) میں ہو۔ ظاہر ہے پولیس ٹھاکر جیسے معزز شخص کی بات کو اہمیت دے گی۔ اس طوائف کی بات کا یقین کون کرے گا۔ تم کوئی چنتا مت کرو۔ آرام سے رہو۔"

"اب میری چنتا مٹ گئی ہمت سنگھ جی۔" بھگت نے کہا اور اس کے چہرے پر واقعی طمانیت سی آگئی تھی۔ میں سمجھ گیا' اس کے ذہن میں جو انجانا خوف تھا وہ میری باتوں سے جاتا رہا تھا۔

مجھے نیند اب بھی نہیں آرہی تھی۔ میں بھگت سے باتیں کرتا رہا۔ اسے بھی شاید اس وقت کسی ایسے ہی آدمی کی ضرورت تھی جس سے وہ باتیں کرسکے۔

بھگت ذات کا دھوبی تھا اور کنگرولی کا رہنے والا تھا۔ وہ چھوٹا سا خوب صورت شہر جے پور سے تقریباً تین سو کلو میٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔

بھگت کی ماں شیلا دھوبن بے حد حسین تھی۔ اسے دیکھ کر بوڑھوں کے دل بھی کانپتے تھے۔ اس نے اپنے لیے خود بہت سی مصیبتیں پیدا کر رکھی تھیں۔ ہر وقت بنی سنوری رہتی۔ جب وہ گھر سے باہر نکلتی تو لونڈے لپاڑے اس کے پیچھے لگ جاتے اور بڑی عمر کے لوگ اسے دور ہی سے دیکھ کر ٹھنڈی سانسیں بھرتے۔

کنگرولی کا رانا شمشیر سنگھ بھی اس پر نگاہ رکھے ہوئے تھا۔ وہ علاقے کا بہت بڑا جاگیردار تھا۔ اس کی دو حویلیاں تھیں۔ ایک حویلی میں اس کے بیوی بچے اور خاندان کے دوسرے افراد رہتے تھے جبکہ شہر سے باہر دوسری حویلی اس کا عشرت کدہ تھی۔ وہاں مجرے ہوتے' راگ رنگ کی محفلیں جمتیں۔ شہر کی کون سی طوائف ایسی تھی جو رانا شمشیر سنگھ کی حویلی میں نہیں جاچکی تھی۔

رانا شمشیر سنگھ شیلا دھوبن کو بھی کچھ عرصے کے لیے اپنی حویلی کی زینت بنانا چاہتا تھا۔ شیلا کو اپنی حویلی تک لے جانا اس کے لیے کوئی مشکل نہیں تھا لیکن صرف ایک بات اس کے راستے کی رکاوٹ بنی ہوئی تھی۔ وہ ذات کا ٹھاکر تھا۔ برہمنوں کے بعد دوسری سب سے اونچی ذات۔ شیلا نچلی ذات کی دھوبن تھی۔ ذات کا یہ فرق ہی رانا کے قدم روکے ہوئے تھا لیکن اس نے شیلا کے حسن و شباب سے سیراب ہونے کا تہیہ کر رکھا تھا۔

دھوبیوں کی بستی شہر سے باہر تھی۔ ایک رات منگل سنگھ ڈاکو کے گروہ نے بستی پر حملہ کردیا۔ منگل سنگھ کے نام کی دور دور تک دہشت تھی۔ بڑے بڑے زمیں دار اور جاگیردار اس کے شر سے محفوظ رہنے کے لیے اسے بھتا دیتے تھے۔ ضرورت کے وقت اسے پناہ بھی دیتے تھے اور اپنے دشمنوں سے نمٹنے کے لیے اس سے کام بھی لیتے تھے۔ منگل سنگھ چھوٹی چھوٹی بستیوں کو بھی لوٹتا رہتا اور اس رات اس نے دھوبیوں کی بستی کا انتخاب کیا تھا۔

وہ جاتے ہوئے بستی کی دو لڑکیوں کو بھی اٹھا کر لے گیا تھا۔ ان میں ایک مالا تھی اور دوسری شیلا دھوبن۔

چھ مہینے بعد اڑتی اڑتی سی خبر سنی گئی کہ شیلا دھوبن رانا شمشیر سنگھ کی حویلی میں ہے۔ یہ بھی سنا گیا کہ جس رات دھوبی بستی پر منگل سنگھ نے حملہ کیا تھا' شیلا کو اسی رات رانا کی حویلی میں پہنچا دیا گیا تھا۔

شیلا دھوبن کے ماں باپ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے تھے۔ مزید ذلت و رسوائی سے بچنے کے لیے انہوں نے نہ صرف وہ بستی بلکہ شہر ہی چھوڑ دیا۔ کوئی نہیں جان سکا کہ وہ کہاں گئے تھے۔

چھ مہینے بعد رانا شمشیر سنگھ کے آدمی شیلا دھوبن کو چتوڑ گڑھ لے گئے۔ اس وقت شیلا تین مہینے کے حمل سے تھی مگر اس کی پروا کیے بغیر رانا کے آدمی اسے پامال کرتے رہے۔ وہ چتوڑ گڑھ سے سوائے مادھو پور اور وہاں سے جے پور آگئے اور شیلا دھوبن کا ہاتھ کسی اور کے ہاتھ میں تھما کر واپس چلے گئے۔

شیلا دھوبن پورے دنوں سے تھی جب ایک بدمعاش شیلا کو اس شخص سے چھین کر لے گیا۔ وہ پس ماندہ علاقے میں واقع ایک کھولی میں رہتا تھا۔ اسی کھولی میں شیلا نے ایک بچے کو جنم دیا جسے دوسرے ہی روز اناتھ آشرم (بے سہارا افراد کی پناہ گاہ) پہنچا دیا گیا۔

بچے کی پیدائش کے چند ہی روز بعد شیلا دھوبن پھر پہلے جیسی ہوگئی بلکہ اس کا حسن کچھ اور بھی نکھر آیا۔ اسے صرف بچے کا غم تھا لیکن جلد ہی وہ اسے بھی بھول گئی بلکہ اسے بھولنے پر مجبور کردیا گیا۔

شیلا دھوبن کا بیٹا بھگت اناتھ آشرم میں پلتا رہا۔ اسے کچھ معلوم نہیں تھا کہ اس کے ماں باپ کون ہیں۔ گیارہ سال کی عمر میں وہ اناتھ آشرم سے بھاگ نکلا اور جیب تراشوں کے ایک گروہ کے ہتھے چڑھ گیا۔ اسے پہلے جیب کترا بنایا گیا پھر وہ چھوٹے موٹے دوسرے جرائم میں بھی ہاتھ ڈالنے لگا۔

پکڑا جاتا تو سزا ہوجاتی۔ جیل سے نکلتا تو جرائم کے کچھ اور گُر سیکھ چکا تھا۔

اس کی زندگی اسی طرح گزرتی رہی۔ اس کی راتیں کبھی فٹ پاتھ پر اور کبھی کچی بستیوں کی تنگ و تاریک کھولیوں میں گزرتیں۔

بھگت نے چوری چکاری اور غنڈا گردی کے سوا کچھ نہیں سیکھا تھا۔ بڑا ہو کر بھی وہ واداگیری ہی کرتا رہا۔ اس نے کبھی کوئی بڑا جرم نہیں کیا تھا۔ سنگین جرائم سے وہ ہمیشہ بچتا رہا اسی لیے وہ کبھی بڑا بدمعاش نہیں بن سکا۔ زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ اس کے ہاتھ سے دو بندے مارے گئے تھے لیکن پشت پر ٹھاکر بھانوت جیسے آدمی کا ہاتھ ہونے کی وجہ سے وہ مطمئن تھا کہ وہ پکڑا نہیں جائے گا۔ وہ اس بات پر بھی خوش تھا کہ ٹھاکر جیسے آدمی نے اسے اپنے شرن (پناہ) میں لے لیا تھا اور آئندہ زندگی اس کی سیوا میں گزار دے گا اور جرائم سے اسے نجات مل جائے گی۔

بھگت کے ارادے اچھے تھے۔ نیت صاف تھی اور مجھے یقین تھا کہ اس کا اور ٹھاکر کا لمبا ساتھ رہے گا۔

بھگت باتیں کرتے کرتے اب اونگھنے لگا تھا۔ میں نے بھی صوفے کا کشن اٹھا کر سر کے نیچے رکھ لیا اور آنکھیں بند کرلیں اور پھر مجھے پتا نہیں' میں کب نیند کی آغوش میں پہنچ گیا۔

○☆○

جے پور سے ایک سو پانچ کلو میٹر کے فاصلے پر سارسکا کسی زمانے میں ایک آزاد ریاست ہوا کرتی تھی لیکن ریاست کی حیثیت سے اس کا وجود بتدریج ختم ہوتا چلا گیا اور اب یہ ریاست محض ایک ضلع بن کر رہ گئی تھی۔

سارسکا زیادہ بڑا شہر نہیں تھا لیکن چند تفریح گاہوں کی وجہ سے اسے دور دور تک خاصی شہرت حاصل تھی۔ شہر کے نواح میں ایک بہت بڑی اور خوب صورت میٹھے پانی کی جھیل تھی جسے چاروں طرف سے سبزے' کھجور اور ناریل کے

درختوں نے گھیر رکھا تھا۔ یہاں رہائش کے لیے ہٹس بھی تھے اور چند ریسٹورنٹس بھی۔ جھیل کا ایک حصہ جو ایک تنگ سی کھاڑی کی طرح خشکی میں دور تک چلا گیا تھا، مچھلی کا شکار کھیلنے والوں کے لیے مخصوص تھا۔ اس طرف کشتیاں وغیرہ نہیں جاتی تھیں۔

اس جھیل کے علاوہ چند قدیم تاریخی عمارتیں بھی تھیں جو سیاحوں کے لیے اپنے اندر خاصی کشش رکھتی تھیں۔ ان میں دو عمارتیں سب سے زیادہ اہم تھیں۔ ایک جین مندر اور دوسرا سارسکا پیلس۔ کسی مہاراجا کا یہ محل عرصے تک ویران رہا تھا اور اب یہاں ایک شان دار ہوٹل بنا دیا گیا تھا۔

جھیل اور تاریخی عمارتوں کے علاوہ سارسکا کی شہرت کی سب سے بڑی وجہ وہ شکار گاہ تھی جو شہر کے نواح سے شروع ہو کر میلوں دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ بڑا گنجان اور خوفناک جنگل تھا جو ایک طرف کوٹ پتلی اور دوسری طرف الور تک پھیلا ہوا تھا۔

میلوں دور تک پھیلے ہوئے اس جنگل میں بے ضرر جانوروں کے علاوہ نیل گائے، ہرن، بارہ سنگھا، سانبھر، ریچھ، چیتے اور شیر جیسے خوفناک درندے بھی بکثرت پائے جاتے تھے۔

شکار کے شوقین دور سے شکار کھیلنے کے لیے یہاں آتے تھے۔ کوئی شکار کرنے میں کامیاب ہو جاتا اور کوئی خود ان خوں خوار درندوں کا شکار ہو جاتا۔

سارسکا، جے پور دہلی نیشنل ہائی وے پر واقع ہے۔ جے پور سے اس کا فاصلہ ایک سو پانچ اور دہلی سے دو سو کلومیٹر ہے جبکہ الور نامی قصبہ صرف پینتیس کلو میٹر کے فاصلے پر ہے۔

سارسکا سے ایک سڑک کوٹ پتلی تک بھی چلی گئی ہے۔ تقریباً پچاس کلو میٹر تک یہ سڑک اس خوفناک جنگل میں سے گزرتی ہے۔ ندی نالوں کے علاوہ اس جنگل میں ایک چھوٹی سی جھیل بھی ہے جس کے کنارے ماہی گیروں کی مختصر سی بستی ہے۔ مچھلیوں کے علاوہ یہ ماہی گیر بے ضرر قسم کے جانور بھی پکڑ لیتے ہیں جنہیں شہر میں لے جا کر فروخت کر دیا جاتا ہے۔ یہ ان ماہی گیروں کا ہی حوصلہ ہے جو اس جنگل میں خوں خوار درندوں کے ساتھ زندگی بسر کر رہے ہیں۔ کوئی عام آدمی اس جنگل میں داخل ہونے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔

ہم صبح چھ بجے جے پور سے روانہ ہوئے تھے۔ روپ متی کی پجارو میں اگلی سیٹ پر میں بیٹھا تھا۔ پچھلی سیٹ پر ہمارے ساتھ آئی تھی۔ آخری سیٹ پر ٹھاکر کا ملازم شنکر اور بھگت بیٹھے ہوئے تھے۔ تھوڑا بہت سامان بھی ان کے پاس رکھا ہوا تھا۔ ڈرائیونگ سیٹ ٹھاکر نے سنبھال رکھی تھی۔ اگرچہ ایک خطرناک مشن پر جا رہے تھے لیکن دیکھنے والے کہہ سکتے تھے کہ ہم پکنک منانے جا رہے ہیں۔

کالی کے پرانے مندر میں رامو اور اس کے ساتھیوں کی موت کے گھاٹ اتارنے کے بعد ہم تین دن سے پوری محنت کر رہے تھے۔ اس دوران میں پولیس نے ان لاشوں کا پتا چلا لیا تھا۔

پولیس نے رام گڑھ جھیل والی سڑک پر واٹر پمپنگ اسٹیشن سے رامو کے ساتھی کرن کو بھی زخمی حالت میں گرفتار کر لیا تھا۔ اس نے اگرچہ الزام لگایا تھا کہ رامو اور اس کے ساتھیوں کی ہتیا میں میرا اور ٹھاکر بھانوت سنگھ کا ہاتھ ہے لیکن پولیس نے اس کی بات کا یقین نہیں کیا تھا۔ اس کی بات کا یقین بھی کیوں کیا جاتا۔ ٹھاکر بھانوت سنگھ اس شہر کا ایک معزز آدمی تھا اور پولیس کو ایک ایسے درندے سے نجات مل گئی تھی جس نے طویل عرصے سے شہر میں خوف و ہراس پھیلا رکھا تھا۔ پولیس تو ان لوگوں کی شکر گزار تھی جنہوں نے موت کے اس فرشتے کو موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ بہرحال، پولیس کے ریکارڈ میں اس واقعے کی جو رپورٹ لکھی گئی تھی وہ یہ تھی کہ ڈاکٹر شیام سندر کے قتل کے بعد رامو اور اس کے ساتھی پکڑے جانے کے خوف سے کالی کے پرانے مندر میں چھپے ہوئے تھے۔ ان کے ساتھ ایک عورت بھی تھی اور غالباً اس عورت کی وجہ سے ان کا آپس میں جھگڑا ہو گیا جس نے خوف ناک لڑائی کی صورت اختیار کر لی اور وہ آپس میں ایک دوسرے کو مار کر ختم ہو گئے۔

پولیس نے اپنی رپورٹ میں ایک عورت کا ذکر کیا تھا لیکن اس کا نام کہیں نہیں آیا تھا۔ وہ عورت چمیلا تھی جو اس رات پولیس کے ہاتھ لگ گئی تھی لیکن اس کے بعد نہ تو چمیلا کا نام سننے میں آیا اور نہ ہی وہ کہیں دیکھی گئی۔

ٹھاکر بھانوت سنگھ دو دن پولیس کے اعلیٰ افسروں کے ساتھ مصروف رہا تھا اور بالآخر یہ قضیہ ختم ہونے کے بعد تیسرے دن ہم سارسکا جا رہے تھے۔

ایک سو پانچ کلو میٹر کا فاصلہ دو گھنٹوں میں بڑی سہولت سے طے ہو گیا۔ یوں تو سارسکا میں سارسکا پیلس ہوٹل کے علاوہ دو تین اچھے رہائشی ہوٹل، دو گیسٹ ہاؤسز اور ایک ڈاک بنگلا بھی تھا لیکن ٹھاکر نے رہائش کے لیے اس ہٹ کو

ترجیح دی تھی جو آبادی اور سڑک سے ہٹ کر درختوں کے جھنڈ میں واقع تھا۔ اس کے قریب ہی تین چار ہٹس اور بھی تھے جو سب کے سب آباد تھے۔ یہ لوگ ہندوستان کے مختلف شہروں سے سیر و تفریح کے لیے آئے ہوئے تھے۔

ہم نے جس ہٹ میں پڑاؤ ڈالا تھا وہ ٹھاکر کے ایک دوست کی ملکیت تھا۔ ایک ملازم یہاں موجود تھا جسے پہلے سے ہماری آمد کی اطلاع دے دی گئی تھی۔ اسے بتا دیا گیا تھا کہ ہم آٹھ بجے یہاں پہنچیں گے اور ناشتا بھی کریں گے چنانچہ جب ہم یہاں پہنچے تو ناشتا تیار تھا۔

ایک دو گھنٹے آرام کرنے کے بعد میں اور ٹھاکر پیدل ہی بلونت سنگھ کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ پجارو ہم نے اس لیے نہیں لی تھی کہ بلونت سنگھ روپ متی کی اس گاڑی کو اچھی طرح پہچانتا تھا۔ ہم نے ہٹ سے روانہ ہونے سے پہلے اپنے حلیوں میں بھی تھوڑی بہت تبدیلی کر لی تھی تاکہ فوری طور پر ہمیں شناخت نہ کیا جا سکے۔

رامو کی فراہم کردہ اطلاع کے مطابق بلونت سنگھ کے ساتھ اس کا گرو بھی تھا۔ بدیشی مسلا جو پنڈت کا بہروپ بھرے ہوئے تھا اور وہ پنڈت دارا کے سوا کوئی اور نہیں ہو سکتا تھا۔ دارا کو ہندوستان کے مندر پسند آ گئے تھے۔ یہ مندر سونے کی کانیں تھیں، عیاشی کے اڈے تھے اور دارا کسی مندر پر قبضہ کرنا چاہتا تھا تاکہ باقی زندگی عیش و عشرت میں گزار سکے۔ اگر پنڈت مولی دھر، دارا کے بارے میں یہ انکشاف نہ کرتا تو مندروں کی طرف میرا دھیان کبھی نہ جاتا اور اب میں نے طے کر لیا تھا کہ اسے کہیں ٹکنے نہیں دوں گا۔

شہر میں چھوٹے بڑے کئی مندر تھے۔ سب سے بڑا جین مندر تھا جو آبادی کے وسط میں تھا۔ ہم نے فی الحال جین مندر کو نظر انداز کر دیا اور انہیں چھوٹے مندروں میں تلاش کرتے رہے لیکن ہمیں بڑی مایوسی ہوئی۔ شام تک ہم ان کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں کر سکے۔

تین دن گزر گئے۔ ہم نے شہر کا کوئی مندر نہیں چھوڑا تھا۔ جین مندر کو بھی چیک کر لیا۔ کئی پجاریوں کو نوٹوں کی جھلک دکھلا کر کسی اجنبی پنڈت کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش بھی کی لیکن ان کا کوئی سراغ نہیں ملا۔

"ضروری نہیں کہ وہ کسی مندر میں ہوں۔ ہو سکتا ہے وہ کسی کے گھر میں پناہ لیے ہوئے ہوں۔" چوتھے روز واپس آنے کے بعد میں نے کہا۔ اس وقت ہم سب ہٹ کے ایک کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے۔

"ایسی صورت میں انہیں تلاش کرنا مشکل ہو جائے گا لیکن میں مایوس نہیں ہوں۔ ایک نہ ایک دن ہم انہیں کھوج نکالیں گے۔ ہم یہیں رہیں گے۔ اس وقت تک جب تک ان کا سراغ نہ لگا لیں۔" ٹھاکر نے کہا۔

"تم لوگوں نے وہ محاورہ تو سنا ہو گا کہ جب تک چارا نہ ڈالا جائے، مچھلی کانٹے کے قریب نہیں پھٹکتی۔" جانکی نے ہماری گفتگو میں مداخلت کرتے ہوئے کہا۔

"کیا کہنا چاہتی ہو؟" ٹھاکر نے اسے گھورا۔

"چارے کا مطلب چارا ہی ہوتا ہے۔" جانکی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "کل میں تم لوگوں کے ساتھ چلوں گی۔ یعنی چارے کے طور پر۔ مجھے وشواس ہے کہ مجھے دیکھ کر وہ اپنے بل سے ضرور باہر نکل آئیں گے۔"

جانکی کی بات دل کو لگتی تھی۔ بس یہی ایک طریقہ تھا جس پر عمل کرنا باقی رہ گیا تھا لہٰذا یہ طے ہوا کہ کل جانکی ہمارے ساتھ جائے گی۔

رات کا کھانا کھانے کے بعد ہم بڑے کمرے میں بیٹھے گپ شپ کر رہے تھے کہ ملازم نے آ کر بتایا کہ ایک پجاری ہم سے ملنا چاہتا ہے۔ رات دس بجے کسی پجاری کا ہم کریں میں اچھل پڑا اور پھر میں اور ٹھاکر بیک وقت اپنی اپنی جگہ سے اٹھے تھے۔

وہ پجاری برآمدے میں کھڑا تھا۔ گیروے رنگ کی چادر

مضبوط جلد
خدایانِ سخن
خوبصورت سرورق
میر غالب مومن اور داغ
٭ ان چار "خدایانِ سخن" کی زندگی سے وابستہ چونکا دینے والے راز!
ضخامت 320
قیمت 200 روپے * ڈاک خرچ 25 روپے
طلبہ اور شائقین ادب کے لئے
بے حد دلچسپ اور معلومات افزا کتاب

اس کے جسم پر لپٹی ہوئی تھی۔ گلے میں موٹے موتیوں کی مالا' ماتھے پر تلسی۔ اس کے سر اور داڑھی کے بال بے تحاشا بڑھے ہوئے تھے۔ مونچھوں کے بال بھی داڑھی کے بالوں سے اس طرح ملے ہوئے تھے کہ منہ کا دہانہ چھپ کر رہ گیا تھا۔ ہمیں دیکھ کر اس نے دونوں ہاتھ سامنے جوڑ دیے۔

"آپ کو ایک پنڈت اور اس کے چیلے کی تلاش ہے مہاراج۔" وہ بولا "میں ایک ایسے ہی پنڈت کی خبر لایا ہوں جو اپنے چیلے کے ساتھ چند روز پہلے یہاں آیا تھا۔ وہ بہت گیان دھیان والا پنڈت ہے۔"

"ہاں ہاں۔ ہمیں اسی کی تلاش ہے۔ کہاں ہے وہ؟" میں نے جلدی سے پوچھا۔

پجاری اس کا پتا بتانے کے بجائے اِدھر اُدھر کی مارنے لگا۔ میں سمجھ گیا اور جیب سے سو روپے کا نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا۔

"وہ پنڈت اپنے چیلے کے ساتھ یہاں سے چار کوس دور دھول پور میں کالی کے مندر میں ملے گا۔" پجاری نے سو کا نوٹ مٹھی میں دباتے ہوئے کہا۔

"کیا اس وقت بھی وہ مندر میں ہوگا؟" یہ سوال ٹھاکر نے کیا تھا۔

"نہیں مہاراج۔" پجاری نے جواب دیا "اس کا اصل آستانہ کسی کو معلوم نہیں۔ وہ شام ہونے سے ذرا پہلے وہاں آتا ہے اور دو تین گھنٹوں بعد کہیں اور چلا جاتا ہے۔ وہ کہاں جاتا ہے؟ کوئی نہیں جانتا۔"

"دھنے واد (شکریہ) مہاراج۔" ٹھاکر نے کہا "وہ واقعی بہت گیان دھیان والا پنڈت ہے۔ مہاپرش۔۔۔ وہ جس کے سر پر ہاتھ دھر دیتا ہے' اس کے من کی آشا (خواہش' تمنا) اَوش (ضرور) پوری ہوتی ہے۔ ہم اسی لیے اس کی تلاش میں ہیں۔"

پجاری چند لمحے ہماری طرف دیکھتا رہا پھر "ہری اوم۔۔۔ ہری اوم۔۔۔ نارائن۔۔۔ نارائن" کی آواز لگاتا ہوا چلا گیا۔

اس رات ہم دیر تک گیان دھیان والے اس پنڈت اور اس کے چیلے کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ ہمیں یقین تھا کہ وہ دارا اور بلونت کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتے۔ انہیں چھپنے کے لیے کسی ایسی ہی جگہ کی ضرورت تھی جہاں کسی کا دھیان نہ جائے۔

اگلے روز سورج غروب ہونے سے دو گھنٹے پہلے میں اور ٹھاکر پجارو پر روانہ ہوگئے۔ جانکی بھی ضد کر کے ہمارے ساتھ ہولی تھی۔

یہ علاقہ تھور' کھجور' ببول اور دیگر کانٹے دار جھاڑیوں سے پٹا ہوا تھا۔ پجارو ہم نے دھول پور نامی اس بستی سے تقریباً نصف میل دور جھاڑیوں میں چھوڑ دی اور پیدل آگے چلتے رہے۔

وہ بستی چالیس پچاس گھروں پر مشتمل تھی۔ کالی کی بستی کی دوسری طرف تھا۔ بستی میں داخل ہوئے تو وہاں عجیب صورت حال کا سامنا کرنا پڑا۔ بستی کے ایک دیہانت (انتقال) ہو گیا تھا اور اس کے کریا کرم (آخری رسومات) کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ فضا میں سوگواری کا نمایاں تھا۔

ہم کالی کے مندر کی طرف پہنچے تو پتا چلا کہ وہ گیانی دھیان پنڈت اپنے چیلے کے ساتھ شمشان گھاٹ کی طرف گیا ہے جہاں وہ اپنی نگرانی میں چتا تیار کروا رہا ہے۔

شمشان گھاٹ مندر سے ذرا آگے تھا۔ ہم اس طرف جا کر جھاڑیوں میں چھپ گئے۔ سامنے پانچ چھ آدمی کھڑے تھے جن میں دو پنڈت بھی تھے۔ ان میں ایک تو وہی گیان دھیان والا پنڈت تھا اور دوسرا اس کا چیلا۔ انہیں دیکھ کر ہمیں بڑی مایوسی ہوئی۔ گیانی پنڈت چھوٹے قد کا بھاری بھرکم آدمی تھا۔ توند مٹکے کی طرح نکلی ہوئی تھی۔ وہ دارا ہرگز نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کا چیلا قد میں چھ فٹ سے نکلتا ہوا تھا۔ اس کی بھی بلونت سنگھ ہونے کا شبہ نہیں ہو سکتا تھا۔

اچانک کسی لڑکی کی چیخوں کی آواز سن کر ہم چونک گئے میں نے مڑ کر دیکھا۔ بستی کی طرف سے ارتھی کا جلوس آ تھا اور ایک لڑکی بری طرح چیخ رہی تھی۔ دو آدمیوں نے اسے بانہوں سے پکڑ رکھا تھا اور وہ اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی۔

ارتھی کا جلوس ہمارے سامنے سے گزر گیا۔ شاید گاؤں کے سب ہی لوگ اس میں شامل تھے۔ میں نے سامنے سے گزرتی ہوئی اس لڑکی کو بھی دیکھا جسے دو آدمیوں نے گرفت میں لے رکھا تھا۔ وہ بے حد خوب صورت لڑکی تھی۔ اس کی عمر بہ مشکل سترہ سال ہوگی۔ اس نے دلہنوں جیسا لباس پہن رکھا تھا۔

مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ عورتیں ارتھی کے ساتھ شمشان گھاٹ نہیں جاتیں اور پھر اس لڑکی نے دلہنوں جیسا لباس کیوں پہن رکھا تھا؟

"اس عورت کا پتی (شوہر) مر گیا ہے۔۔۔ اسے بھی ستی ہو جانا ہے۔" ٹھاکر نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

ستی۔۔۔ میں کانپ اٹھا۔ ہندوؤں کی یہ بڑی گھناؤنی رسم تھی۔ مرنے والے پتی کے ساتھ اس کی پتنی (بیوی) کو بھی چتا میں زندہ جلا دیا جاتا تھا لیکن اس ظالمانہ رسم پر پابندی لگا کر اسے ختم کیا جا چکا تھا۔۔۔ یہ۔۔۔

شمشان گھاٹ کی طرف دیکھتا رہا۔ مرنے والے کی لاش کو چتا پر رکھ دیا گیا تھا اور اب دلہن کے لباس میں اس لڑکی کو چتا پر رکھنے کی تیاری ہو رہی تھی۔ لڑکی بری طرح چیخ چلا رہی تھی۔ اپنے آپ کو چھڑانے کی بھرپور کوشش کر رہی تھی۔ وہ چیخ رہی تھی۔ بھگوان کے واسطے دے رہی تھی لیکن کسی پر اس کی آہ وفغاں کا اثر نہیں ہوا۔ پانچ چھ آدمیوں نے مل کر اسے زمین پر رکھے ہوئے لوہے کے اس فریم پر لٹا دیا جس پر بیچ میں لوہے کی پٹیاں لگی ہوئی تھیں۔

لڑکی ہاتھ پیر چلا رہی تھی لیکن پانچ چھ آدمیوں کے سامنے وہ بے بس ہو گئی۔ اس کو پٹیوں والے آہنی فریم پر چت لٹا کر اس کے ہاتھ پیر رسیوں سے باندھ دیے گئے اور اس کے جسم پر بھی کئی رسیاں لپیٹ دی گئیں تاکہ وہ اپنے جسم کے کسی حصے کو حرکت نہ دے سکے۔

لڑکی کی چیخیں آسمان کی خبر لا رہی تھیں اور جب اسے اٹھا کر اس کے پتی کی لاش کے پہلو میں چتا پر لٹا دیا گیا تو اس کی چیخیں کچھ اور بلند ہو گئیں۔

ایک آدمی نے گھی کا کنستر لاش اور اس لڑکی پر انڈیل دیا اور پھر ان کے اوپر لکڑیاں رکھی جانے لگیں۔ اس طرح چتا خاصی اونچی ہو گئی۔ لکڑیوں پر بھی گھی کے کنستر انڈیلے گئے۔ اس دوران میں لڑکی بدستور بری طرح چیختی رہی۔

اور پھر اچانک ہی ڈھول بجنے لگے اور وہ شاید لڑکے کا باپ تھا جس نے چتا کو آگ لگائی تھی۔ شعلے بلند ہونے لگے۔ خشک لکڑیاں چٹخنے لگیں۔ لڑکی کی چیخوں کی آواز ڈھول کی آواز سے بھی تیز تھی۔ میں متوحش نظروں سے چتا کی طرف دیکھ رہا تھا۔ چتا کے اندر لکڑیوں میں ہلچل سی مچی۔ آگ نے اس لڑکی کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا اور شاید اس نے آخری مرتبہ پوری قوت استعمال کر کے اپنی بندشیں توڑنے کی کوشش کی تھی اور وہ فریم سمیت الٹ کر چتا کی لاش پر جا گری تھی۔

ڈھول کی آواز میں اس کی چیخیں بلند ہوتی گئیں۔ فضا میں گوشت جلنے کی بو پھیلنے لگی۔ لڑکی کی چیخیں معدوم ہوتی گئیں اور اب وہاں صرف لکڑیوں کے چٹخنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

میں نے مڑ کر دیکھا۔ جانکی موجود نہیں تھی۔ گاؤں کے لوگ اب بھی چتا کے چاروں طرف جمع تھے۔ ڈھول بج رہے تھے اور لوگ ناچ رہے تھے۔

ٹھاکر نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور ہم جھاڑیوں سے نکل کر اس طرف چل پڑے جہاں ہماری پجارو کھڑی تھی۔ جانکی پجارو سے ٹیک لگائے کھڑی ہانپ رہی تھی۔ وہ شاید اس وقت بھاگ آئی تھی جب اس لڑکی کے ہاتھ پیر باندھے جا رہے تھے۔

"حیرت کی بات ہے۔" میں نے پجارو میں بیٹھتے ہوئے کہا "ایک عورت کو زندہ جلا دیا گیا اور کسی نے بچانے کی کوشش نہیں کی۔"

"اگر کوئی بچانے کی کوشش کرتا تو اسے بھی چتا میں پھینک دیا جاتا۔" ٹھاکر نے انجن اسٹارٹ کرتے ہوئے جواب دیا۔

واپسی پر چار کوس کا فاصلہ جلد ہی طے ہو گیا۔ شہر میں داخل ہوتے ہی ایک نئی صورت حال کا سامنا کرنا پڑا۔ ہر طرف غلغلہ مچا ہوا تھا۔ خوف زدہ لوگ اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے۔

اور یہ انکشاف بڑا سنسنی خیز تھا کہ گنگولی چوہدری کے گروہ نے شہر کے شمالی علاقے پر حملہ کر دیا تھا اور وہاں گیسٹ ہاؤسز اور ہٹس میں ٹھہرے ہوئے سیاحوں کو اغوا کر کے لے گیا تھا۔

ہمارا ہٹ بھی اسی علاقے میں تھا۔ ٹھاکر نے پجارو کی رفتار بڑھا دی اور ہٹ کے سامنے گاڑی روکی تو ہمارے بدترین خدشات درست نکلے۔

ہٹ کے سامنے کئی پولیس والے جمع تھے۔ ہمارے ہٹ کا ملازم زخمی تھا اور روپ متی بری طرح بدحواس ہو رہی تھی۔

ہمیں دیکھ کر روپ متی دوڑتے ہوئے ہمارے قریب پہنچ گئی اور اس نے جو انکشاف کیا' وہ بہت سنسنی خیز تھا۔

گنگولی چوہدری کے آدمی ہمارے قریبی ہٹس سے دوسرے چند سیاحوں کے ساتھ بملا کو بھی اٹھا کر لے گئے تھے۔

سسپنس ڈائجسٹ کا دلچسپ ترین سلسلہ

طالوت

قیمت فی حصہ 50 روپے

آٹھ ضخیم حصے 23 روپے

3 حصوں میں (مکمل)

کتابات پبلی کیشنز

میرے آس پاس کہیں بم کا پھٹنا ہوتا تو اتنا صدمہ نہ ہوتا جتنا اس خبر سے ہوا تھا۔

روپ متی نے یہ خبر روتے ہوئے سنائی تھی۔ اس کی پوری بات میری سمجھ میں نہیں آسکی تھی۔ تاہم اس کے ٹوٹے پھوٹے جملوں سے یہ نتیجہ اخذ کرسکا تھا کہ گنگولی چوہدری نامی کوئی شخص اپنے گروہ کے ساتھ یہاں وارد ہوا تھا۔ انہوں نے پہلے فائرنگ کرکے لوگوں کو بدحواس کیا اور پھر گیسٹ ہاؤس اور قریب قریب واقع ان پارٹ ہٹس کو گھیرے میں لے کر یہاں ٹھہرے ہوئے تمام سیاحوں کو ایک جگہ پر جمع کرلیا تھا اور انہیں بھیڑ بکریوں کی طرح ہانکتے اور مارتے ہوئے جنگل کی طرف لے گئے تھے اور اماتوں کے اس ریوڑ میں ہماری بہلا بھی شامل تھی۔

روپ متی کے حواس بحال ہوئے تو میں نے ایک بار پھر اس سے اس سانحے کی تفصیل پوچھی۔

"تقریباً ڈیڑھ گھنٹا پہلے کی بات ہے۔" وہ بتا رہی تھی "میں کچھ چیزیں لینے کے لیے بازار جارہی تھی۔ میں نے بہلا کو بھی ساتھ چلنے کو کہا مگر اس نے انکار کردیا۔

"میں بازار میں شاپنگ کررہی تھی کہ اچانک گولیاں چلنے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ اس کے دو منٹ بعد بازار میں شور مچ گیا کہ گنگولی چوہدری نے حملہ کردیا ہے۔

"لوگ ادھر ادھر بھاگ کھڑے ہوئے۔ دکانیں دھڑا دھڑ بند ہونے لگیں۔ میں جس دکان میں کھڑی تھی وہاں چند گاہک اور بھی تھے۔ دکان دار نے شٹر گرا دیا۔ اس طرح ہم بھی اندر بند ہوگئے۔

"بازار سنسان ہوچکا تھا۔ آدھے گھنٹے تک کسی طرف سے کوئی آواز سنائی نہیں دی۔ تاہم دور سے وقفے وقفے سے فائرنگ کی آوازیں سنائی دیتی رہیں اور بالآخر یہ آوازیں بھی بند ہوگئیں۔

"بازار میں لوگوں کی آوازیں سن کر دکان دار نے شٹر اٹھا دیا۔ پون گھنٹے تک دکان میں بند رہنے سے میرا دم گھٹ کر رہ گیا تھا۔ میرے کپڑے پسینے میں بھیگ کر میرے بدن سے چپک گئے تھے۔ دوسرے لوگوں کی بھی یہی حالت تھی۔

"میرے حواس بحال ہوئے تو لوگوں کی باتوں سے پتا چلا کہ گنگولی چوہدری نامی ڈاکو کے گروہ نے شہر کے شمالی علاقے میں واقع گیسٹ ہاؤس اور ہٹس پر حملہ کیا تھا اور وہاں مقیم کئی سیاحوں کو اغوا کرکے لے گئے تھے۔

"میں ایک بار پھر حواس باختہ سی ہوگئی اور واپسی کے لیے دوڑ لگا دی۔ مجھے بہلا کی فکر تھی اور جب میں یہاں پہنچی تو بدترین اندیشے درست نکلے۔ بہلا اپنے ہٹ سے غائب تھی۔

"میں اسے ادھر ادھر تلاش کرتی رہی۔ میرا خیال تھا شاید وہ بچنے کے لیے کہیں چھپ گئی ہو۔ ہمارے دائیں طرف والے ہٹ میں ایک سکھ فیملی ٹھہری ہوئی ہے۔ بوڑھے سردار جی نے میرے پوچھنے پر بتایا کہ ڈاکو اس کے بیٹے اور بہو کو لے گئے ہیں۔ اس نے ہماری بہلا کو بھی دیکھا تھا جسے ڈاکو ہٹ سے گھسیٹتے ہوئے باہر لے آئے تھے۔

"ہمارے ملازم پرکاش نے مزاحمت کی کوشش کی تو رائفل کا بٹ مار کر اسے زخمی کردیا۔ تیسرے ہٹ میں بھی ایک آدمی نے مزاحمت کی کوشش کی تھی۔ اسے گولی مار کر ہلاک کردیا گیا۔

"پولیس آدھے گھنٹے بعد پہنچی تھی۔ اس وقت تک ڈاکو لوگوں کو لے کر یہاں سے بہت دور جا چکے تھے۔ اپنی بہلا کا کیا ہوگا؟ وہ لوگ مار ڈالیں گے اسے۔"

"فکر نہ کرو روپ متی۔" میں نے کہا "ہوسکتا ہے پولیس کی کوئی پارٹی ان کے تعاقب میں گئی ہو۔ پکڑلیں گے انہیں۔"

میں نے ٹھاکر کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے جیسے اس خبر نے اسے بھی ہلا کر رکھ دیا ہو۔ وہ چند لمحے میری طرف دیکھتا رہا پھر ان پولیس والوں کی طرف بڑھ گیا جو بوڑھے سردار جی سے کچھ پوچھ رہے تھے۔ وہاں کچھ اور لوگ بھی جمع تھے۔ سردار جی کی بوڑھی بیوی دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھی۔ کچھ اور لوگ بھی رو رو کر انسپکٹر سے بار بار یہ سوال کررہے تھے کہ پولیس نے ان ڈاکوؤں کا پیچھا کیوں نہیں کیا!

ٹھاکر انسپکٹر کو پکڑ کر ایک طرف لے گیا۔ اس نے اپنا تعارف کرایا تو انسپکٹر کچھ مرعوب سا ہوگیا اور پھر انسپکٹر نے جو کچھ بتایا وہ خاصا سنسنی خیز تھا۔

انسپکٹر کے کہنے کے مطابق ڈاکو گنگولی چوہدری کے گروہ نے بہت عرصے سے علاقے میں دہشت پھیلا رکھی ہے۔ اس کی سرگرمیوں کا حلقہ الور اور جنگل کی دوسری طرف کوٹ پتلی تک پھیلا ہوا ہے۔ ان شہروں کے بیچ میں واقع چھوٹی چھوٹی بستیاں اور گاؤں آئے دن اس کی لوٹ مار کا شکار ہوتے رہتے ہیں۔

گنگولی چوہدری بہت بے رحم اور بھیڑیا صفت انسان ہے بلکہ انسان نہیں درندہ ہے۔ وہ بات بعد میں کرتا ہے گولی پہلے چلاتا ہے۔ الور کی طرف چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں اور سارسکا کا میلوں دور تک پھیلا ہوا جنگل اس کا مسکن ہے۔ ہر واردات کے بعد یا تو وہ جنگل میں روپوش ہوجاتا ہے یا ان پہاڑیوں میں پناہ لیتا ہے۔ ان پہاڑیوں میں لاتعداد غار تھے جن میں فوج کی پوری رجمنٹ بھی چھپ جاتی تو اسے تلاش کرنا ممکن نہ ہوتا۔ اس کے علاوہ راستے اتنے دشوار تھے کہ پولیس ان کے تعاقب میں ان پہاڑیوں میں داخل ہونے کی ہمت نہیں کرپاتی تھی اور نہ ہی پولیس کے جوان سارسکا کے جنگلوں میں ان ڈاکوؤں کا پیچھا کرنے کی ہمت کرتے تھے۔ جنگل میں ان ڈاکوؤں کے ساتھ خوں خوار درندوں کا بھی خوف ان کے قدم روک لیتا تھا۔

چند روز پہلے گنگولی چوہدری کا گروہ پولیس کے گھیرے میں آگیا تھا۔ کئی گھنٹوں کے زبردست مقابلے کے بعد ڈاکو پولیس کا گھیرا توڑ کر فرار ہونے میں کامیاب ہوگئے۔ تاہم ایک ڈاکو زخمی ہوکر پولیس کے ہاتھ لگ گیا۔

گرفتار ہونے والا ڈاکو گنگولی چوہدری کا چھوٹا بھائی چترا تھا۔ گنگولی چوہدری نے دھمکی دی تھی کہ اگر چترا کو رہا نہ کیا گیا تو وہ اس شہر کو آگ لگا دے گا۔

اس واردات کے بعد گنگولی چوہدری الور کی پہاڑیوں کی طرف فرار ہوگیا تھا۔ پولیس چند روز تک چوکس رہی لیکن گنگولی کی طرف سے کوئی ری ایکشن نہیں ہوا تو شہر کے اطراف سے پہرا ہٹا لیا گیا۔ پولیس کے اعلیٰ افسران کا خیال تھا کہ شہر کو آگ لگا دینے کی دھمکی محض گیدڑ بھبکی تھی اور گنگولی اب طویل عرصے تک پہاڑیوں سے نکلنے کی ہمت نہیں کرے گا۔

لیکن پولیس افسران کا خیال غلط نکلا۔ گنگولی چوہدری اپنے بھائی کو نہیں بھولا تھا۔ آج اسے موقع مل گیا۔ گنگولی چوہدری نے جس طرح کارروائی کی تھی اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہ سب کچھ باقاعدہ پلاننگ کے تحت ہوا تھا۔ اس کے آدمی بھیس بدل کر کئی روز تک شہر کی صورت حال کا جائزہ لیتے رہے تھے۔

آج اس کے آدمی صبح سے دیہاتیوں کے بھیس میں شہر کے مختلف علاقوں میں موجود تھے اور پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق مقررہ وقت پر شہر کے شمالی علاقے میں اس جگہ جمع ہوگئے جہاں ایک گیسٹ ہاؤس اور یہ چار ہٹس تھے جن میں سے ایک میں ہم موجود تھے۔ چند ہٹس اور بھی تھے لیکن وہ تقریباً دو سو گز کے فاصلے پر تھے۔

گنگولی چوہدری کے آدمیوں نے گیسٹ ہاؤس اور ہٹس کو گھیرے میں لے کر فائرنگ شروع کردی اور یہاں ٹھہرے ہوئے تمام سیاحوں کو باہر نکال کر ایک جگہ جمع کرلیا۔ ہمارے ہٹ کے ملازم نے مزاحمت کی تو اسے رائفل کا بٹ مار کر زخمی کردیا۔ ایک اور آدمی نے مزاحمت کی تو اسے گولی مار کر موت کے گھاٹ اتار دیا۔

گنگولی چوہدری کے آدمی یہاں سے تیرہ سیاحوں کو مارتے پیٹتے اور بھیڑ بکریوں کی طرح ہانکتے ہوئے جنگل کی طرف لے گئے۔ ان میں پانچ عورتیں اور آٹھ مرد تھے۔ دو لڑکیاں غیر شادی شدہ تھیں۔ ان میں ایک ہماری بہلا اور دوسری الٰہ آباد سے آئی ہوئی ایک فیملی کی لڑکی تھی۔ وہ کالج کی اسٹوڈنٹ تھی اور اس کی عمر بیس اکیس سال سے زیادہ نہیں تھی۔

یہ واقعہ اس وقت پیش آیا تھا جب ہم شہر سے چار پانچ میل دور دھول پور نامی اس بستی کے شمشان گھاٹ میں لڑکی کے ستی ہونے کا دلدوز منظر دیکھ رہے تھے اور اب سورج غروب ہوچکا تھا اور اندھیرا بڑھ رہا تھا۔ اس طرح ڈاکوؤں کو وہاں سے گئے ہوئے دو گھنٹے ہوچکے تھے۔

ڈاکو بوڑھوں کو چھوڑ گئے تھے شاید اس لیے کہ وہ بھاگ دوڑ میں ان کا ساتھ نہیں دے سکتے تھے۔ روپ متی کی خوش قسمتی تھی کہ وہ اس وقت بازار گئی ہوئی تھی اور بہلا کی بدقسمتی کہ وہ ہٹ میں موجود تھی۔

گنگولی چوہدری پولیس اور دیگر حکام کے لیے یہ پیغام چھوڑ گیا تھا کہ اگر تین دن کے اندر اندر اس کے بھائی چترا کو نہ چھوڑا گیا تو چوتھے دن وہ تمام مغویوں کو موت کے گھاٹ اتار دے گا اور پولیس کو یہ پیغام مل گیا تھا۔

"لو دیکھو جی۔" بوڑھا سردار جی کہہ رہا تھا "وہ ڈاکو یہاں سے تیرہ بندوں کو مویشیوں کی طرح ہانک کر لے گئے اور پولیس کچھ بھی نہ کرسکی۔ کم از کم ان کا پیچھا ہی کیا ہوتا۔"

"پولیس تو نہتے شہریوں پر لاٹھیاں اور گولیاں برسا سکتی ہے۔ ڈاکوؤں کا سامنا کرتے ہوئے انہیں موت آتی ہے۔" ایک اور شخص نے کہا "اگر ہمارے بندوں کو کچھ ہوگیا تو ہم اس شہر کو آگ لگا دیں گے۔"

انسپکٹر گھور گھور کر سب کو دیکھ رہا تھا مگر ظاہر ہے اس کے پاس بپھرے ہوئے ان لوگوں کی باتوں کا کوئی جواب نہیں تھا۔

"پولیس نے ڈاکوؤں کا پیچھا کیوں نہیں کیا آفیسر؟" یہ سوال ٹھاکر نے کیا تھا۔

"ہمیں بہت دیر سے خبر ہوئی تھی ٹھاکر جی۔" انسپکٹر نے جواب دیا "اس وقت تک ڈاکو یرغمالیوں کو لے کر جنگل میں

داخل ہو چکے تھے۔"

"جنگل میں بھی ان کا پیچھا کیا جا سکتا تھا۔" ٹھاکر نے اسے گھورا۔

"اس طرح یرغمالیوں کی زندگیاں خطرے میں پڑ جاتیں۔" انسپکٹر نے جواب دیا "اعلیٰ حکام اور پولیس افسران کو اطلاع ہو گئی ہے۔ آٹھ بجے سرکٹ ہاؤس میں ان کا گٹھ جوڑ ہو گا جس میں یرغمالیوں کو ڈاکوؤں سے چھڑانے کے لیے حکمت عملی طے کی جائے گی۔"

"گویا بے گناہ یرغمالی ڈاکوؤں کے رحم و کرم پر رہیں گے۔" ایک اور آدمی نے انسپکٹر کو گھورتے ہوئے کہا۔

"وہ تو اب بھی ڈاکوؤں کے رحم و کرم پر ہیں۔" انسپکٹر نے تپ کر جواب دیا "اس وقت ہم کیا کر سکتے ہیں۔ رات کے اندھیرے میں تو اس خطرناک جنگل میں داخل نہیں ہوا جا سکتا جس میں ان ڈاکوؤں کے علاوہ خوفناک درندے بھی ہیں۔"

انسپکٹر کے اس جواب سے وہ شخص بھی تپ گیا اور اس نے انسپکٹر کو گریبان سے پکڑ کر جھنجوڑ ڈالا۔

"اگر ہمارے آدمیوں کو کچھ ہوا تو ہم کسی پولیس والے کو زندہ نہیں چھوڑیں گے۔" وہ شخص غرایا۔

انسپکٹر کسی اور طریقے سے سمجھانے کی کوشش کرتا تو بات لوگوں کی سمجھ میں آجاتی مگر انسپکٹر کی باتوں نے جلتی پر تیل کا کام کیا تھا۔ ایک اور آدمی نے انسپکٹر کو تھپڑ رسید کر دیا۔ دوسرے تین پولیس والوں نے کارکردگی دکھانے کی کوشش کی تو لوگوں نے انہیں بھی پیٹنا شروع کر دیا۔

صورت حال بگڑ رہی تھی۔ میں نے اور ٹھاکر نے بڑی مشکل سے انسپکٹر اور اس کے ماتحتوں کو لوگوں سے چھڑایا اور انہیں وہاں سے رخصت کر دیا۔

لوگ سردار جی والے ہٹ کے سامنے جمع ہو گئے اور ہم اپنے ہٹ کے سامنے لان میں کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ زخمی ملازم کو پولیس والوں کے ساتھ اسپتال بھیج دیا گیا تھا اور تیسرے ہٹ کے سامنے پڑی ہوئی لاش بھی اٹھا لی گئی تھی۔ اس ہٹ کی طرف سے بین کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ صورت حال خاصی گمبھیر ہو گئی تھی۔

ادھر ادھر دیکھتے ہوئے مجھے شنکر اور بھگت کا خیال آگیا۔

"وہ دونوں کہاں ہیں۔ بھگت اور شنکر؟" میں نے روپ متی کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"وہ دونوں ڈاکوؤں کے حملے سے آدھا گھنٹا پہلے جنگل والے ریسٹورنٹ کی طرف گئے تھے۔ ڈاکوؤں کے فرار کے بعد اس طرف سے بھی گولیاں چلنے کی آوازیں سنائی دی تھیں۔ پتا نہیں۔ وہ لوگ کہاں ہیں!" روپ متی نے جواب دیا۔

میں ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"میں دیکھ کر آتا ہوں۔ مجھے اس طرف بھی کچھ گڑبڑ لگتی ہے۔" میں یہ کہتے ہوئے پجارو کی طرف آگیا۔

چابی اگنیشن ہی میں لگی ہوئی تھی۔ میں نے انجن اسٹارٹ کیا اور پجارو کو گھما کر ایک طرف دوڑا دیا۔

تقریباً نصف میل آگے جنگل شروع ہو جاتا تھا۔ جس جگہ سے کوٹ پتلی کی طرف جانے والی سڑک جنگل میں داخل ہوتی تھی وہاں ایک بہت بڑا اوپن ائر ریسٹورنٹ بنا ہوا تھا۔ دبیز گھاس کا بہت لمبا چوڑا پلاٹ تھا جس کے گرد پھولوں کے پودے تھے۔ پلاٹ کے ایک کونے میں ریسٹورنٹ کی مختصر سی عمارت تھی اور سامنے دور دور تک میز کرسیاں بچھی ہوئی تھیں۔ لوگ تفریح کے لیے اس طرف جاتے رہتے تھے۔ چائے کھانا بھی ہوتا اور جنگل کا نظارہ بھی۔ میں دو دن پہلے ٹھاکر کے ساتھ اس طرف جا چکا تھا۔

ریسٹورنٹ کی روشنیاں دور ہی سے نظر آگئیں اور پھر پولیس کی ایک جیپ بھی دکھائی دی۔ کچھ لوگ بھی جمع تھے۔

میں نے پولیس جیپ کے قریب پجارو روک لی اور اتر کر اس طرف دوڑا جہاں پولیس والے اور دوسرے لوگ جمع تھے۔ وہاں کی صورت حال کچھ زیادہ ہی سنگین تھی۔ ریسٹورنٹ کی عمارت کے قریب دو تین جگہوں پر خون بکھرا ہوا تھا۔

اور پھر یہ انکشاف ہوا کہ ڈاکو یرغمالیوں کو لے کر جب اس طرف آئے تھے تو ریسٹورنٹ میں بیٹھے ہوئے چند جیالوں نے انہیں روکنے کی کوشش کی تھی جس کے نتیجے میں ڈاکوؤں نے فائر کھول دیا تھا۔ انہیں روکنے کی کوشش کرنے والوں میں سے ایک آدمی مارا گیا تھا۔ دو زخمی ہوئے تھے۔ یرغمالیوں میں سے بھی ایک آدمی نے بھاگنے کی کوشش کی تھی اسے بھی مار ڈالا گیا تھا۔ ڈاکو ریسٹورنٹ سے ایک اور آدمی کو پکڑ کر لے گئے تھے۔ لاشوں اور زخمیوں کو اسپتال پہنچا دیا گیا تھا۔

میں نے وہاں پر موجود لوگوں سے شنکر اور بھگت کے بارے میں پوچھنے کی کوشش کی مگر کوئی بھی کچھ نہ بتا سکا۔ میں دوبارہ پجارو میں بیٹھ گیا اور اسے شہر کی طرف دوڑا دیا۔

اسپتال پہنچنے میں دس منٹ سے زیادہ نہیں لگے تھے۔ یہاں بھی لوگوں کا بہت بڑا ہجوم تھا۔ میں لوگوں کو دھکیلتا ہوا

جیسے تیسے آگے پہنچ گیا۔

سب سے پہلے میں نے لاشوں کو دیکھا۔ ان میں نہ بھگت تھا اور نہ شنکر۔ ایک نرس نے مجھے اس وارڈ میں پہنچا دیا جہاں زخمی پڑے ہوئے تھے۔ وارڈ میں بھی بہت سے لوگ جمع تھے۔ میں زخمیوں کو دیکھتا ہوا ایک بیڈ کے قریب رک گیا۔

وہ شنکر تھا جس کے سینے پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ میں سمجھا کہ وہ بے ہوش ہے لیکن میں نے ہولے سے پکارا تو اس نے آنکھیں کھول دیں۔

وہ بمشکل بول سکتا تھا۔ بہرحال' اس کی باتوں سے مجھے پتا چل گیا کہ گنگولی چوہدری کے آدمی بھگت کو پکڑ کر لے گئے تھے۔ میں شنکر سے باتیں کر رہا تھا کہ نرس آگئی۔

"مریض تھوڑی دیر پہلے ہی ہوش میں آیا ہے۔ آپ اس سے زیادہ باتیں نہ کریں۔" اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے بڑے مذبانہ لہجے میں کہا۔

"اس کی حالت زیادہ تشویش ناک تو نہیں؟" میں نے نرس سے پوچھا۔

"فکر نہ کریں۔ گولی نکال دی گئی ہے۔ اب خطرے کی کوئی بات نہیں ہے۔ اسے آرام کی ضرورت ہے۔ بولنے سے اسے تکلیف ہو گی۔" نرس نے جواب دیا۔

میں شنکر کی طرف دیکھتا ہوا وارڈ سے باہر آگیا۔ میرے دماغ میں دھماکے سے ہو رہے تھے۔ شنکر شدید زخمی تھا اور بھگت بھی ڈاکوؤں کے ہتھے چڑھ گیا تھا۔

میں پجارو کو طوفان کی طرح دوڑاتا ہوا ہٹ پر پہنچ گیا۔ ہٹ کے سامنے پجارو روک کر میں جس طرح نیچے اترا تھا' سامنے لان میں بیٹھا ہوا ٹھاکر بہت کچھ سمجھ گیا۔ وہ اٹھ کر تیزی سے میری طرف آگیا اور مجھے راستے ہی میں روک لیا۔

"کیا ہوا؟ تم بڑے بدحواس ہو رہے ہو؟" اس نے پوچھا۔

"بات ہی ایسی ہے ٹھاکر۔" میں نے جواب دیا "شنکر زخمی حالت میں اسپتال میں پڑا ہے اور بھگت ڈاکوؤں کے ہتھے چڑھ گیا ہے۔"

ٹھاکر کا چہرہ بھی متغیر ہو گیا۔ ہم چند لمحے وہیں کھڑے باتیں کرتے رہے پھر جانکی اور روپ متی کو بھی سب کچھ بتا دیا۔ ان سے کچھ چھپانا بے کار تھا۔ جلد یا بدیر انہیں پتا چل ہی جاتا۔

تھوڑی ہی دیر بعد ہم سب پجارو میں سوار اسپتال کی طرف جا رہے تھے۔ ہٹ کو تالا لگا دیا گیا تھا۔

ٹھاکر نے ڈاکٹر سے مل کر شنکر کے بارے میں تفصیل سے معلومات حاصل کیں اور اسے وارڈ سے پرائیویٹ روم میں منتقل کروا دیا۔ جانکی اور روپ متی کو شنکر کے پاس چھوڑ کر ہم سرکٹ ہاؤس کی طرف چلے گئے جہاں آٹھ بجے انتظامیہ کے حکام اور پولیس کے اعلیٰ افسران کی میٹنگ ہونے والی تھی۔

سرکٹ ہاؤس کے سامنے بھی لوگوں کا رش لگا ہوا تھا۔ جن لوگوں کے بندوں کو ڈاکو اٹھا کر لے گئے تھے وہ پولیس اور انتظامیہ کے خلاف نعرے لگا رہے تھے۔

گیٹ پر متعین دو پولیس والوں نے ٹھاکر کو روکنے کی کوشش کی تھی مگر وہ انہیں دھکیلتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ میں بھی اس کے ساتھ ہی تھا۔ ہم سرکٹ ہاؤس کے اندر تو آگئے لیکن ہمیں اس کمرے میں نہیں جانے دیا گیا جہاں میٹنگ ہو رہی تھی۔ ہم لابی میں بیٹھ گئے جہاں کچھ اور لوگ بھی بیٹھے ہوئے تھے۔

رات گیارہ بجے میٹنگ ختم ہوئی۔ ٹھاکر نے ڈپٹی کمشنر کو گھیر لیا۔ ڈپٹی کمشنر بھی ٹھاکر کو جانتا تھا۔

"اس وقت تو کچھ نہیں ہو سکتا ٹھاکر جی۔" ڈپٹی کمشنر نے بتایا "رات کے وقت تاریک جنگل میں داخل ہونا ممکن نہیں۔ ہم نے جے پور سے پولیس کی مزید نفری منگوائی ہے۔ امید ہے کہ یہ نفری رات کو کسی وقت پہنچ جائے گی اور صبح جنگل میں داخل ہونے کا پروگرام بنایا جائے گا۔"

"آپ جانتے ہیں صورت حال کتنی نازک ہے۔" ٹھاکر نے کہا "وہ ڈاکو اب تک پانچ آدمیوں کو موت کے گھاٹ اتار چکے ہیں۔ یرغمالی ان کے رحم و کرم پر ہیں۔ ان بے چاروں کا کیا حال ہو گا اور یہاں جو ان کے عزیز و اقارب ہیں ان کی حالت تو دیکھیں۔"

"میں صورت حال سے پوری طرح واقف ہوں۔" ڈپٹی کمشنر نے کہا "لیکن اس وقت کچھ نہیں کیا جا سکتا۔"

ڈپٹی کمشنر باہر نکلا تو لوگوں نے اسے گھیر لیا۔ انہیں بھی یہی کہہ کر تسلی دی گئی کہ صبح ہوتے ہی ڈاکوؤں کے خلاف کارروائی شروع کر دی جائے گی۔

ہم اسپتال پہنچے تو بارہ بج رہے تھے۔ شنکر کی حالت کسی قدر تسلی بخش تھی۔ ٹھاکر نے اس کی دیکھ بھال کے لیے ایک نرس کا بندوبست کر دیا تھا۔ ہم جانکی اور روپ متی کو لے کر واپس آگئے۔

اس وقت رات کا ایک بج رہا تھا۔ آس پاس کے تینوں ہٹس اور گیسٹ ہاؤس میں بھی لوگ جاگ رہے تھے۔ ظاہر ہے اس سانحے کے بعد نیند کس کو آتی۔

اس ہنگامے میں ہم رات کا کھانا بھی بھول گئے تھے۔ کسی کو ہوش ہی کہاں رہا تھا۔ اس وقت جانکی چائے بنا کر لے آئی۔ چائے کی چسکیوں کے ساتھ ہم صورت حال پر تبصرے بھی کرتے رہے۔

یوں تو بھگدڑ اور بلا کے اغوا کا سب ہی نے اثر لیا تھا۔ بلا پچھلے چند روز کے دوران میں جانکی سے کچھ زیادہ مانوس ہوگئی تھی۔ اس کے فراق میں رو رو کر جانکی کی آنکھیں سرخ ہوگئی تھیں۔ روپ متی بھی دیر تک روتی رہی تھی۔ ٹھاکر نے بھی اس کا بہت اثر لیا تھا لیکن میری حالت ان سب سے ابتر تھی لیکن میں نے اپنی اندرونی کیفیت کا زیادہ اظہار نہیں کیا تھا۔

بلا سے میری ملاقات زیادہ پرانی نہیں تھی لیکن نجانے کیا بات تھی کہ میں اس کے لیے اپنے دل میں ایک عجیب سی کسک محسوس کرنے لگا۔ اس کا چہرہ بار بار میری نظروں کے سامنے گھوم رہا تھا۔ پتا نہیں ان ڈاکوؤں نے اس کا کیا حشر کیا ہوگا۔

رات آنکھوں میں بیت گئی۔ صبح کی روشنی پھیلی تو میں قریبی ڈھابے (چھپر ہوٹل) سے ڈبل روٹی لے آیا۔ جانکی نے چائے تیار کرلی۔ ہم نے الٹا سیدھا ناشتا کیا اور سرکٹ ہاؤس جانے کے لیے تیار ہوگئے۔

باہر نکلے تو پڑوس میں رہنے والے بوڑھے سردار جی نے بتایا کہ وہ ابھی سرکٹ ہاؤس سے ہو کر آیا ہے۔ پولیس کی نفری جنگل والے ریسٹورنٹ (جنگل ریسٹورنٹ) کے قریب جمع ہے اور بعض اعلیٰ افسران بھی وہیں موجود ہیں۔

وہ سردار جی بھی وہاں جانا چاہتے تھے۔ ہم نے انہیں بھی پجارو میں بٹھالیا اور دس منٹ بعد جنگل ریسٹورنٹ کے قریب پہنچ گئے۔ وہاں اور بھی بہت سے لوگ جمع تھے۔ جے پور سے رات ہی کو پولیس کی بھاری نفری پہنچ گئی تھی اور پولیس کے مسلح جوان جنگل کے ساتھ ساتھ دور دور تک پھیلے ہوئے تھے۔

اس مشن کا انچارج انسپکٹر ونود پانڈے تھا اور مجھے یہ جان کر بڑی مایوسی ہوئی کہ پولیس کی کوئی پارٹی ابھی تک جنگل میں داخل نہیں ہوئی تھی اور پھر اس کی وجہ بھی سمجھ میں آگئی۔

گنگولی چوہدری نے جنگل کی ایک بستی کے رہنے والے ایک دیہاتی کے ذریعے پولیس کو یہ پیغام بھیجا تھا کہ اگر ان کا پیچھا کرنے کی کوشش کی گئی تو وہ تمام یرغمالیوں کو ہلاک کردیں گے۔ اس نے یہ دھمکی بھی دہرائی تھی کہ اگر تین دن کے اندر اندر اس کے بھائی چترا کو رہا نہ کیا گیا تو یرغمالیوں کے جیون (زندگی) کی ضمانت نہیں دی جائے گی اور اس دھمکی سے مرعوب ہو کر پولیس پارٹی جنگل میں داخل نہیں ہوئی تھی۔

لوگوں نے ابھی وہیں ڈیرے جما دیے۔ جنگل کے کنارے کنارے مسلح کانسٹیبل اس طرح تعینات تھے جیسے حکام کو یقین ہو کہ ڈاکو نکلتے ہوئے جنگل سے باہر آئیں گے تو انہیں پکڑ لیں گے۔

دوپہر کے وقت تک بار بار افسران سے لوگوں کی جھڑپیں ہوتی رہیں اور پھر چھ آدمی رضاکارانہ طور پر جنگل میں داخل ہونے کے لیے تیار ہوگئے۔ پولیس نے انہیں بڑی مشکل سے روکا تھا۔ ڈپٹی کمشنر بھی اطلاع پاکر وہاں پہنچ گیا۔

"آپ لوگ یرغمالیوں کے جیون بھی خطرے میں ڈال رہے ہیں۔" ڈپٹی کمشنر نے ان لوگوں کو سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "گنگولی چوہدری انسان نہیں درندہ ہے۔ اسے جیسے ہی پتا چلے گا کہ کوئی پارٹی اس کے تعاقب میں جنگل میں داخل ہوئی ہے تو وہ یرغمالیوں کو موت کے گھاٹ اتار دے گا۔"

"ہم اپنے آدمیوں کو چھڑانے کے لیے گنگولی چوہدری کو ڈنڈ دینے کو تیار ہیں۔" ایک آدمی نے کہا "ہم دو آدمی جنگل میں جائیں گے اور گنگولی چوہدری کو تلاش کرکے اسے ڈنڈ (تاوان) کی پیشکش کریں گے۔ دولت ہی ان ڈاکوؤں کا دھرم ہوتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ ہماری پیشکش مان لے گا اور ڈنڈ لے کر ہمارے آدمیوں کو چھوڑ دے گا۔"

"یہ آپ لوگوں کی خوش فہمی ہے۔" ڈپٹی کمشنر نے کہا "اس کا صرف ایک ہی مطالبہ ہے۔ وہ اپنے بھائی کو آزاد کرانا چاہتا ہے۔"

"تو پھر اسے چھوڑ کیوں نہیں دیا جاتا۔" ایک اور آدمی بولا "کیا ایک ڈاکو ان تیرہ آدمیوں سے زیادہ قیمتی ہے کہ آپ اسے چھوڑنا نہیں چاہتے؟"

"آپ لوگ بات کو سمجھنے کی کوشش کریں۔" ڈپٹی کمشنر بولا "گنگولی چوہدری کے گروہ نے طویل عرصے سے اس علاقے میں دہشت پھیلا رکھی ہے۔ وہ درجنوں بے گناہوں کو قتل کرچکا ہے۔ بستیوں کی بستیاں اجاڑ دی ہیں اس نے۔ لوگ خوف و ہراس کی زندگی گزار رہے ہیں۔ پچھلی مرتبہ اس کے گروہ کا کوئی آدمی پکڑا گیا ہے اور وہ بھی اس کا بھائی۔ ہم اسے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کردیں گے۔"

"اور اس کے لیے آپ لوگوں نے تیرہ بے گناہوں کی زندگیوں کو داؤ پر لگا دیا ہے۔" اس آدمی نے ترکی بہ ترکی جواب دیا "میری شکشا (مشورہ) ہے کہ آپ خود اپنے چند آدمیوں کے ساتھ اپنے آپ کو ڈاکوؤں کے حوالے کرکے آدمیوں کو چھڑوا دیں اور اس کے بعد آپ لوگ ہمارے آدمیوں کو چھڑانے کی کوشش کرتے رہیں کہ گنگولی چوہدری گھٹنے ٹیکتا ہے یا نہیں۔"

ڈپٹی کمشنر اسے گھور کر رہ گیا۔ بات بڑھتی جارہی تھی۔ بالآخر یہ طے ہوا کہ دو آدمی دو سادہ لباس پولیس والوں کے ساتھ جنگل میں جائیں گے اور گنگولی چوہدری سے رابطہ کرنے کی کوشش کریں گے۔ اگر وہ ڈنڈ لے کر یرغمالیوں کو چھوڑنے پر آمادہ ہوگیا تو ٹھیک۔ بصورت دیگر پولیس کوئی نئی حکمت عملی اپنائے گی۔

وہ لوگ دو بجے کے قریب جنگل میں داخل ہوئے۔ ان کے پاس صرف ایک رائفل تھی۔ وہ بھی صرف اس لیے کہ اگر کوئی درندہ راستہ روکنے کی کوشش کرے تو اس سے نمٹا جاسکے۔ اگر سب کے پاس رائفلیں ہوتیں تو ہوسکتا ہے ڈاکو یہ سمجھتے کہ پولیس انہیں گھیرنے کی کوشش کررہی ہے اور وہ کسی وارننگ کے بغیر ان پر فائر کھول دیں۔

ہم لوگ شام تک وہاں رہے۔ میرا خیال تھا کہ ڈاکوؤں سے رابطہ کرنا مشکل ہوگا۔ یہ جنگل میلوں دور تک پھیلا ہوا تھا۔ ڈاکو کہیں سے کہیں نکل گئے ہوں گے اور ڈاکوؤں سے پہلے اگر کسی درندے سے ان کی ملاقات ہوگئی تو شاید ہی ان میں سے کوئی زندہ بچ کر واپس آسکے۔

شام کا اندھیرا پھیلنے کے بعد ان کی واپسی کے کوئی آثار نظر نہیں آئے تو ہم اپنے ہٹ میں واپس آگئے۔ بعض لوگ وہیں بیٹھے رہ گئے تھے۔ انہوں نے رات وہیں گزارنے کا پروگرام بنایا تھا۔

ٹھاکر ہمیں ہٹ میں چھوڑ کر بازار کی طرف چلا گیا۔ اس کی واپسی تقریباً ایک گھنٹے بعد ہوئی تھی۔ وہ کسی ہوٹل سے کھانا لے کر آیا تھا۔

کھانا کھانے کے بعد ہم لوگ ہٹ کے سامنے لان میں کرسیاں ڈال کر بیٹھ گئے۔ ہمارے قریب والے تینوں ہٹ اور گیسٹ ہاؤس بھی اگرچہ آباد تھے مگر خاموشی ایسی تھی کہ جیسے وہاں زندگی کا وجود ہی نہ رہا ہو۔ کل کے واقعے نے سب کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ بعض لوگ تو شہر کے ہوٹلوں میں منتقل ہوگئے تھے۔ جو لوگ ان ہٹس اور گیسٹ ہاؤس میں رہ گئے تھے ان پر بھی خوف طاری تھا۔

ہم آدھی رات تک لان میں کرسیوں پر ہی بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ ہمارے پاس صرف ایک ہی موضوع تھا۔ گنگولی چوہدری کا گروہ اور یرغمالی۔

مجھے امید نہیں تھی کہ گنگولی چوہدری یرغمالیوں کی رہائی کے لیے نقد تاوان کی پیشکش قبول کرلے گا۔ اس کا بھائی پولیس کی حراست میں تھا اور وہ ہر قیمت پر اسے آزاد کرانا چاہتا تھا۔ میں ایسے ڈاکوؤں اور بدمعاشوں کو بہت اچھی طرح جانتا تھا۔ دوسروں کو تو یہ لوگ گاجر مولی کی طرح کاٹ دیتے تھے۔ کسی کی زندگی کو زندگی نہیں سمجھتے تھے۔ چلتے پھرتے انسان کو موت کے گھاٹ اتار دینا ان کے لیے معمولی بات تھی لیکن جب اپنے آپ پر پڑتی ہے تو انہیں احساس ہوتا ہے کہ زندگی کیا ہوتی ہے۔ یہ اپنے آپ کو یا اپنے کسی بھائی بند کو بچانے کے لیے پورے شہر کو بھی آگ لگا دینے سے گریز نہیں کرتے۔

میں بنکاک میں پیڈرو کو ابھی تک نہیں بھولا تھا۔ اس کا بھائی سامی میرے ہاتھوں مارا گیا تھا۔ اس کی لاش ہم نے بوری میں ڈال کر ایسی کے کلب میں پھینک دی تھی اور پیڈرو نے اپنے بھائی کے قتل کا انتقام لینے کے لیے کیا قیامت مچائی تھی۔ کئی بے گناہوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ لاتعداد عمارتوں کو آگ لگا دی تھی اور سڑکوں پر لاتعداد بسوں اور دوسری گاڑیوں کو نذر آتش کردیا تھا۔

اور اب گنگولی چوہدری..... اس کا بھائی بھی پولیس کی حراست میں تھا جس کے بدلے اس نے تیرہ بے گناہوں کو یرغمالی بنالیا تھا اور دو آدمی ان لوگوں کو چھڑانے کے لیے تاوان کی پیشکش لے کر گئے تھے اور مجھے یقین تھا کہ وہ اس پیشکش کو قبول نہیں کرے گا۔

ہم لوگ کل رات سے نہیں سوئے تھے اور اس وقت بھی رات آدھی سے زیادہ بیت چکی تھی۔ جانکی اور روپ متی بیٹھے بیٹھے اونگھ رہی تھیں۔ ٹھاکر کی آنکھیں سرخ ہورہی تھیں اور چہرہ ستا ہوا تھا۔ میری حالت بھی ان سے مختلف نہیں تھی۔

ایک بجے کے قریب ہم لوگ ہٹ کے اندر آگئے۔ جانکی اور روپ متی ایک کمرے میں چلی گئیں اور میں اور ٹھاکر الگ الگ کمروں میں۔ یہ ہٹ خاصا بڑا تھا۔ چار بیڈ رومز تھے۔ سٹنگ روم اور لاؤنج اس کے علاوہ تھا۔

میں بستر پر لیٹا بلا کے بارے میں سوچتا رہا۔ نجانے کیوں وہ میرے دماغ پر چھا گئی تھی۔ اس کے بارے میں سوچتے ہوئے میری آنکھیں بند ہوگئیں۔ اس رات میں نے ایک بھیانک خواب دیکھا۔

وہ بڑا خوفناک منظر تھا۔

بملا جنگل میں ادھر ادھر دوڑی پھر رہی تھی۔ اس کا لباس پھٹا ہوا تھا۔ چہرے پر خوف و دہشت کے سائے تھے۔ خوں خوار بھیڑیے اس کا پیچھا کر رہے تھے۔ نکیلے دانت، باہر کو لٹکی ہوئی سرخ زبانیں جن سے خون ٹپک رہا تھا۔

بملا بار بار ٹھوکریں کھا کر گر رہی تھی۔ کانٹے دار جھاڑیوں میں الجھ کر اس کا لباس تار تار ہو رہا تھا۔ اس کی ٹانگوں، بانہوں اور چہرے پر لمبی لمبی خراشیں تھیں جن سے خون رس رہا تھا۔

وہ جس طرف بھی جاتی، بھیڑیے اس کا راستہ روک لیتے۔ وہ پلٹ کر دوسری طرف دوڑتی۔ اس طرف بھی خوں خوار بھیڑیے دانت نکوستے ہوئے اس کے بخیے ادھیڑ دینے کو تیار نظر آتے۔

دوڑتے دوڑتے بملا ایک بار پھر کانٹے دار جھاڑیوں میں الجھ کر گری۔ وہ ایک طرف ڈھلان پر لڑھکتی چلی گئی اور جب سنبھل کر اٹھنے کی کوشش کی تو چاروں طرف سے بھیڑیوں کو یلغار کرتے دیکھ کر اس کے منہ سے خوفناک چیخ نکل گئی۔

بملا کی خوفناک چیخ کی آواز میرے کانوں کے پردوں کو چیرتی ہوئی چلی گئی۔ میں ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گیا اور متوحش نظروں سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ اس وقت میرے حواس بھی شاید مختل ہو گئے تھے اور جب میرے حواس بحال ہوئے تو میرے منہ سے گہرا سانس نکل گیا۔

میں اپنے بستر پر بیٹھا ہوا تھا۔ میرا جسم پسینے میں شرابور ہو رہا تھا۔ اس بھیانک خواب نے مجھے بری طرح جھنجوڑ کر رکھ دیا تھا۔ میں چند لمحے بستر پر ہی بیٹھا گہرے گہرے سانس لیتا رہا اور پھر اٹھ کر ہٹ سے باہر آ گیا۔ کرسیاں اب بھی لان میں پڑی تھیں۔ میں ایک کرسی پر ڈھیر ہو گیا اور گہرے گہرے سانس لینے لگا۔ تازہ اور ٹھنڈی ہوا نے نہایت خوشگوار اثر ڈالا اور میں مکمل طور پر ہوش و حواس میں آ گیا۔

اس وقت صبح ہونے والی تھی۔ ہر طرف گہرا سناٹا تھا۔ میں نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی اور آنکھیں بند کر کے بملا کے بارے میں سوچنے لگا۔ وہ واقعی خوں خوار بھیڑیوں کے غول میں گھری ہوئی تھی۔ دو راتیں بیت چکی تھی۔ وہ بھیڑیا صفت ڈاکوؤں کے قبضے میں تھی۔ اس کے ساتھ اب تک کیا کچھ ہو چکا ہو گا؟ یہ کہنا بہت مشکل تھا۔

ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں نے مجھے تھپک کر ایک بار پھر سلا دیا اور دوسری مرتبہ میری آنکھ اس وقت کھلی جب چاروں طرف دھوپ پھیل چکی تھی اور تقریباً پچاس گز کے فاصلے پر سڑک پر سے گزرنے والی گاڑیوں کی آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔

میں کرسی پر بیٹھے بیٹھے سو گیا تھا۔ آنکھ کھلتے ہی ہڑبڑا کر اٹھ گیا۔ میں نے سردار جی والے ہٹ کی طرف دیکھا۔ اسی وقت ہٹ کا دروازہ کھلا اور سردار جی باہر آ کر پہلے ادھر ادھر دیکھتے رہے پھر مجھ پر نظر پڑتے ہی میری طرف آ گئے۔

وہ بہت وضع دار آدمی تھا۔ چوڑی دار پاجامہ، سفید کرتہ جس کا دامن فراک کی طرح پھیلا ہوا تھا۔ گلے میں کرپان اور سر پر نیلے رنگ کی مخصوص انداز میں بندھی ہوئی پگڑی۔ اس کے ہاتھ میں جیبی ڈائری کے سائز کی سرخ جلد والی کتاب تھی۔ وہ قریب آیا تو پتا چلا کہ یہ گرنتھ صاحب (سکھوں کی مذہبی کتاب) کا پاکٹ سائز ایڈیشن تھا۔

"پتر جی۔" وہ میرے قریب آ کر بولا "کچھ پتا لگا ان ڈاکوؤں نے کیا فیصلہ کیا ہے؟"

"نہیں سردار جی۔ کل شام اندھیرا پھیلتے تک تو وہ بندے واپس نہیں آئے تھے جو ان سے مذاکرات کرنے کے لیے جنگل میں گئے تھے۔" میں نے کہا۔

"رب بھلا کرے۔" سردار جی بولے "دو دن پہلے میں بچوں کو کہہ رہا تھا کہ بہت سیر ہو چکی۔ اب واپس چلیں۔ پر وہ دلیر سنگھ کی ماں ہے نا۔ اس نے کہا تھا، ایک دن اور رک جائیں۔ رک گئے ایک دن۔ اور دیکھ لیا نتیجہ۔ اب کمرے میں بیٹھی رو رو کے پاگل ہو رہی ہے۔"

دلیر سنگھ سردار جی کا وہ بیٹا تھا جس کی شادی صرف تین مہینے پہلے ہوئی تھی اور دو دن پہلے ڈاکو دوسرے سیاحوں کے ساتھ ان میاں بیوی کو بھی اٹھا کر لے گئے تھے۔

سردار جی جالندھر کے رہنے والے تھے اور بہت عرصے بعد اپنی فیملی کو لے کر سیر و تفریح کے لیے نکلے تھے اور اب پچھتا رہے تھے کہ دو دن پہلے وہ یہاں سے چلے کیوں نہیں گئے۔

"میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ سیر کے لیے کہیں اور چلتے ہیں۔ اپنے پنجاب میں کیا تھوڑی جگہیں ہیں سیر کرنے کے لیے پر دلیر سنگھ تو راجستھان دیکھنا چاہتا تھا۔ یہاں پرانے راجوں کے محل اور حویلیاں دیکھنا چاہتا تھا۔ دیکھ لیا۔ یہ تو ڈاکوؤں اور لٹیروں کا علاقہ ہے۔ اب جان سولی پر ٹنگی ہوئی ہے۔"

سردار جی بولتے رہے اور میں سنتا رہا۔ سردار جی جنگل ریسٹورنٹ جانا چاہتے تھے تاکہ تازہ ترین صورت حال کا پتا چل سکے۔ یہ سب کچھ تو میں بھی جاننا چاہتا تھا۔

میں ہٹ میں آ گیا۔ دیوار گیر گھڑی کی طرف دیکھا۔ ابھی

صبح کے ساڑھے سات بجے تھے۔ ٹھاکر وغیرہ گہری نیند سو رہے تھے۔ میں نے فریج میں سے بوتل نکال کر ایک گلاس ٹھنڈا پانی پیا اور میز پر سے گاڑی کی چابیوں کا رنگ اٹھا کر باہر آ گیا۔ ہٹ کے دروازے کو میں نے باہر سے کنڈا لگا دیا تھا۔

اس پکنک پوائنٹ پر بہت سے لوگ جمع ہو چکے تھے۔ وہ چاروں آدمی بھی تھوڑی دیر پہلے ہی واپس آئے تھے جو ڈاکوؤں سے مذاکرات کے لیے کل دوپہر کے وقت جنگل میں داخل ہوئے تھے۔

مذاکرات ناکام ہو گئے تھے۔ گنگولی چوہدری اپنے بھائی چڑا کی رہائی سے کم کسی بات پر سودا کرنے کو تیار نہیں تھا۔ اس نے یہ دھمکی ایک بار پھر دہرائی تھی کہ اگر مقررہ مدت تک اس کے بھائی کو رہا نہ کیا گیا تو وہ یرغمالیوں کو ہلاک کر دے گا۔

مایوسی بڑھ گئی۔ لوگوں نے ایک بار پھر اس مشن کے انچارج انسپکٹر نوڈ پانڈے کو گھیر لیا۔

"آپ لوگ جنگل پر چڑھائی کیوں نہیں کرتے۔" ایک آدمی نے چیخ کر کہا "کیا آپ لوگ اس وقت کوئی قدم اٹھائیں گے جب ڈاکو بے گناہ یاتریوں کی لاشیں گرانا شروع کر دیں گے؟"

"جنگل میں دو تین چھوٹی چھوٹی بستیاں ہیں۔" انسپکٹر ونود پانڈے نے جواب دیا "ان بستیوں کے لوگوں اور ڈاکوؤں میں فرق کرنا بہت مشکل ہے۔ ڈاکو تو بچ جائیں گے لیکن دھوکے میں بے گناہ دیہاتی مارے جائیں گے۔ ہمیں جو بھی قدم اٹھانا ہو گا، بہت سوچ سمجھ کر اٹھانا ہو گا۔"

یہ جھگڑا جاری رہا اور میں ان آدمیوں میں سے ایک کے پاس بیٹھ گیا جو جنگل سے واپس آئے تھے۔ وہ دہلی کا رہنے والا نکلا۔ فیملی چوپڑا تھا۔ اس کی عمر پینتالیس کے لگ بھگ رہی ہو گی۔ اس کی بیوی سیتا ڈاکوؤں کے قبضے میں تھی۔ وہ لوگ ہمارے قریبی گیسٹ ہاؤس میں ٹھہرے ہوئے تھے۔

مہیش چوپڑا کے کہنے کے مطابق وہ اس روز کچھ چیزیں خریدنے کے لیے بازار کی طرف گیا ہوا تھا کہ پیچھے یہ واقعہ پیش آیا اور ڈاکو دوسرے لوگوں کے ساتھ سیتا کو بھی اٹھا کر لے گئے۔

سیتا عمر میں مہیش چوپڑا سے تقریباً پندرہ سال چھوٹی تھی۔ تیس سال کی عمر میں بھی وہ نوعمر لڑکیوں کی طرح نظر آتی تھی۔ مہیش چوپڑا نے یہ انکشاف بھی کیا کہ وہ تین مہینے کے حمل سے تھی۔ ان کی شادی کو اگرچہ دس سال ہو چکے تھے لیکن ان کے جیون میں پہلی مرتبہ پھول کھلنے کی امید پیدا ہوئی تھی اور وہ اسی لیے پریشان بھی تھا۔

"ان ظالموں نے مجھے میری پتنی سے ملنے بھی نہیں دیا۔" مہیش چوپڑا کہہ رہا تھا "انہوں نے تمام یرغمالیوں کو ہم سے دور رکھا۔ کسی سے نہیں ملنے دیا گیا۔"

میں پوری توجہ سے اس کی باتیں سن رہا تھا۔ اس کے کہنے کے ..مطابق "جنگل میں داخل ہونے کے تقریباً چار گھنٹوں بعد اچانک ہی دو آدمیوں نے ہمیں رائفلوں کی زد پر لے لیا تھا۔ وہ دونوں آدمی درختوں کی گنجان شاخوں میں چھپے بیٹھے تھے۔ ہمارے پاس ایک رائفل بھی جو انہوں نے ہم سے چھین لی اور ہمیں وہاں سے تقریباً تین میل دور ایک چھوٹی سی بستی میں لے گئے۔

"یہ بستی دس بارہ گھروں پر مشتمل تھی اور جنگل سے گزرنے والی سڑک سے تقریباً نصف میل کے فاصلے پر تھی۔ اس وقت اندھیرا پھیل چکا تھا۔ ہمیں ایک جھونپڑے میں بند کر دیا گیا۔

"آدھی رات کے قریب دو اور آدمی وہاں پہنچ گئے... اور وہ لوگ ہمیں بستی سے تقریباً پانچ میل دور لے گئے۔ اس گنجان جنگل میں تو دن میں بھی اندھیرا ہی رہتا ہے اور رات کے وقت تو ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دے رہا تھا لیکن وہ لوگ اس طرح چل رہے تھے جیسے اس جنگل کا چپا چپا ان کا دیکھا بھالا ہو اور گہری تاریکی میں بھی انہیں چلنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آ رہی تھی جبکہ ہم قدم قدم پر ٹھوکریں کھا رہے تھے۔

"وہ لوگ ایک پہاڑی کے دامن میں بیٹھے ہوئے تھے۔ وہاں دو مشعلیں روشن تھیں جن میں شاید کسی جانور کی چربی استعمال کی جا رہی تھی۔ گنگولی چوہدری کے آدمیوں نے ہمیں گھیر لیا۔ یرغمالی ہم سے دور بیٹھے ہوئے تھے اور تین چار آدمی ان پر رائفلیں تانے کھڑے تھے۔

"ہم صبح چار بجے تک گنگولی چوہدری سے مذاکرات کرتے رہے۔ اسے منہ مانگی رقم کی پیشکش کی لیکن وہ نہیں مانا۔ اسے صرف اپنا بھائی چاہیے۔ اس نے یہ دھمکی بھی دہرائی کہ اگر مقررہ وقت تک اس کے بھائی کو رہا نہ کیا گیا تو وہ یرغمالیوں کو ایک ایک کر کے قتل کرنا شروع کر دے گا۔

"صبح پانچ بجے ہمیں دو آدمیوں کے ساتھ وہاں سے روانہ کر دیا گیا۔ ہم لوگ تقریباً ایک گھنٹا پہلے ہی یہاں پہنچے ہیں۔ ہم نے سب کچھ ان افسروں کو بتا دیا ہے لیکن پتا نہیں یہ لوگ کیا سوچ رہے ہیں۔ کیا چاہتے ہیں یہ لوگ؟"

میں تقریباً ایک گھنٹے تک وہاں گھوم پھر کر معلومات

حاصل کرتا رہا۔ یہ جان کر مجھے بہرحال اطمینان ہوا تھا کہ ان ڈاکوؤں نے یرغمالیوں' خصوصاً خواتین کے ساتھ ابھی تک کوئی زیادتی نہیں کی تھی۔

میں جب واپس پہنچا تو روپ متی' ٹھاکر اور جانکی ابھی تک سو رہی تھیں۔ میں نے ہٹ کا دروازہ اور کھڑکیاں پوری طرح کھول دیں اور کچن میں آکر اپنے لیے چائے بنانے لگا۔

میں باہر لان میں بیٹھا چائے پی رہا تھا کہ ٹھاکر بھی اٹھ کر باہر آگیا۔ میں نے اسے اب تک کی صورت حال سے آگاہ کردیا۔

"مجھے لگتا ہے پولیس افسران اور دوسرے حکام اپنی ضد نہیں چھوڑیں گے اور گنگولی چوہدری بھی اپنی ہٹ سے باز نہیں آئے گا۔" ٹھاکر نے کہا۔ اس کے لہجے میں تشویش تھی "اگر یرغمالیوں میں سے کوئی ایک بھی مارا گیا تو بڑے خوفناک ہنگامے شروع ہوجائیں گے۔"

"ایسی صورت میں یہی ہوسکتا ہے کہ کچھ لوگ اپنے طور پر جنگل میں داخل ہونے کی کوشش کریں لیکن ایسا کرنا خطرناک ہوگا۔" میں نے کہا۔

"پولیس کسی کو جنگل میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دے گی۔" ٹھاکر نے کہا۔

ہم باتیں کررہے تھے کہ جانکی اور روپ متی بھی جاگ گئیں اور پھر ناشتے وغیرہ کی تیاری ہونے لگی۔

بارہ بجے کے قریب ہم ریسٹورنٹ پہنچ گئے۔ یہ ریسٹورنٹ ان دنوں انفارمیشن سینٹر بنا ہوا تھا۔ یہیں سے کچھ معلومات حاصل ہورہی تھیں۔

ٹھاکر انسپکٹر نودو پانڈے سے بات کررہا تھا۔ جانکی اور روپ متی ایک درخت کے سائے میں گھاس پر بیٹھی ہوئی تھیں اور میں ادھر ادھر گھوم رہا تھا اور بالآخر میں اس آدمی کے قریب رک گیا جو ایک طرف کھڑا بیڑی کے کش لگا رہا تھا۔

اس شخص کو میں دو تین دن سے یہاں دیکھ رہا تھا۔ اغوا ہونے والے سیاحوں سے اس کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ وہ گیسٹ ہاؤس یا ہٹ وغیرہ میں بھی نہیں ٹھہرا ہوا تھا۔ شہر سے بہت سے لوگ تماشا دیکھنے یہاں جمع ہوئے تھے۔ ہوسکتا تھا کہ یہ شخص بھی انہی میں سے کوئی ہو۔ نہ جانے کیوں' وہ شخص مجھے مشتبہ سا لگ رہا تھا۔ "کوئی نئی خبر؟" میں نے اس شخص کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ اس کی عمر چالیس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ لمبا قد' سفید کرتہ اور چوڑے پائنچوں کا سفید پاجامہ۔ پیروں میں ہوائی چپل جو خاصی پرانی لگ رہی تھی۔

وہ غالباً باقاعدگی سے شیو بنانے کا عادی تھا۔ مونچھیں ہونٹوں کے کناروں سے چوہے کی دم کی طرح لٹکی ہوئی تھیں۔ سر کے بال بھی چڑیا کے گھونسلے کی طرح بکھرے ہوئے تھے۔ آنکھوں پر پلاسٹک کے کالے فریم والی عینک تھی جو اس کے چہرے پر کچھ عجیب سی لگ رہی تھی۔ اس کی رنگت آبنوس کی لکڑی کی طرح خاصی گہری تھی۔

"کوئی نئی خبر نہیں۔" اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا "میں گنگولی چوہدری کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ سالا حرامی یاتریوں کو زندہ نہیں چھوڑے گا۔ پولیس کو چترا کو چھوڑنا ہوگا۔"

"تم گنگولی چوہدری کو کیسے جانتے ہو؟" میں نے اسے گھورا۔

"سب ہی لوگ جانتے ہیں۔ پر میں اس کے بارے میں کچھ زیادہ جانکاری رکھتا ہوں۔" اس شخص نے جواب دیا "دو تین مرتبہ اس سے ملنے کا اتفاق ہوا ہے۔ وہ سالا بہت خطرناک آدمی ہے۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر میرے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولا "تمہاری ایک مینا (عورت) اس کے قبضے میں ہے۔ تم خود اسے چھڑانے کی کوشش کیوں نہیں کرتے؟"

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ تین دن سے باقاعدگی سے یہاں آرہا تھا۔ وہ سب جانتا تھا کہ یہاں آنے والے کون لوگ تماشائی ہیں اور کون یرغمالیوں کے رشتے دار ہیں۔

"تمہارا خیال ہے کہ ہم میں سے کوئی آدمی کسی ایسی کوشش میں کامیاب ہوسکتا ہے؟" میں نے اسے گھورا۔

"کوشش کی جاسکتی ہے۔" اس نے جواب دیا۔

ہم ابھی باتیں کررہے تھے کہ پولیس کا ایک سب انسپکٹر ہماری طرف آگیا۔ وہ شخص وہاں سے کھسکنے لگا تو سب انسپکٹر نے اسے گردن سے دبوچ لیا۔

"اے نارائن۔" سب انسپکٹر اس کی گردن کو جھٹکا دیتے ہوئے غرایا "سالے حرامی۔ یہاں بھی اپنا دھندا چلا رہا ہے۔ بھاگ جا یہاں سے۔ دوبارہ نظر آیا تو لے جاکر سلاخوں کے پیچھے بند کردوں گا۔"

اس شخص کا نام نارائن تھا۔ وہ انسپکٹر کو گھورتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ میں نے سب انسپکٹر سے نارائن کے بارے میں دریافت کیا تو پتا چلا کہ سارے شہر کی پولیس اسے جانتی ہے۔ وہ شہر میں گھوم پھر کر چرس اور ہیروئن فروخت کرتا ہے۔ سیاحوں کے ہٹس' گیسٹ ہاؤسز اور ہوسٹل اس کی شکار گاہیں

ہیں۔ ان مقامات پر اسے آسانی سے گاہک مل جاتے ہیں۔ وہ سیر و تفریح کے لیے اکیلے آنے والے مرد سیاحوں کو لڑکیاں بھی سپلائی کرتا ہے۔

سب انسپکٹر تو میں نے یہ نہیں بتایا کہ نارائن سے میری کیا بات ہورہی تھی لیکن اب نارائن کسی حد تک میری سمجھ میں آگیا تھا۔ اس نے گنگولی چوہدری کے بارے میں بڑے وثوق سے کچھ باتیں کی تھیں۔ اس نے یہ بھی کہا تھا کہ وہ گنگولی چوہدری کے بارے میں دوسروں سے زیادہ جانکاری رکھتا ہے۔ اس قسم کے لوگ ہی شہروں میں ڈاکوؤں کے ایجنٹ کا کام کرتے ہیں اور انہیں خفیہ طور پر اطلاعات فراہم کرتے رہتے ہیں۔

میں نے نارائن کی تلاش میں ادھر ادھر دیکھا مگر وہ نظر نہیں آیا۔ شاید سب انسپکٹر کی دھمکی نے اسے وہاں سے چلے جانے پر مجبور کردیا تھا۔

میں نے ٹھاکر کو نارائن کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ ہم نے وہ دن وہیں رہ کر گزار دیا۔ آج گنگولی چوہدری کی دی ہوئی مہلت کا تیسرا اور آخری دن تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ لوگوں میں بے چینی بڑھ رہی تھی۔ وہ بار بار پولیس آفیسروں کو گھیر رہے تھے۔ انسپکٹر نودو پانڈے کی باتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ پولیس گنگولی چوہدری کے بھائی چترا کو چھوڑنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی تھی۔

میری تشویش بھی بڑھ رہی تھی۔ ٹھاکر کی آنکھوں میں بھی بے بسی کے تاثرات نمایاں تھے۔ ہر شخص مایوس دکھائی دے رہا تھا لیکن ظاہر ہے کوئی کچھ نہیں کرسکتا تھا۔ پولیس نہ تو چترا کو چھوڑنے کو تیار تھی اور نہ ہی کسی کو جنگل میں داخل ہونے کی اجازت دے رہی تھی۔

شام ہوگئی اور پھر اندھیرا گہرا ہونے لگا۔ آٹھ بجے کے قریب ہم وہاں سے آگئے۔ ہماری وہ رات بھی جاگتے ہوئے ہی گزری۔ یوں تو ہم تمام یرغمالیوں کے لیے پریشان تھے۔ وہ سب بے گناہ تھے لیکن ہمیں بھگت اور بالا کے بارے میں زیادہ تشویش تھی کہ یہ دونوں ہمارے اپنے تھے۔

صبح چھ بجے گیسٹ ہاؤس سے ملی جلی آوازیں سن کر ہم باہر آگئے۔ اس وقت ہم چائے پی رہے تھے۔ ٹھاکر نے چائے کا آخری گھونٹ لے کر خالی کپ قریب کھڑی ہوئی جانکی کی طرف بڑھا دیا اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا گیسٹ ہاؤس کی طرف چلا گیا۔ اس کی واپسی میں دس منٹ سے زیادہ نہیں لگے تھے۔

"کوئی گڑبڑ ہے۔" وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولا "میں ریسٹورنٹ کی طرف جارہا ہوں۔"

"ہم بھی تمہارے ساتھ چل رہے ہیں۔" میں نے جواب دیا۔ چائے کا آخری گھونٹ میرے حلق سے نہیں اترا تھا۔

دس منٹ بعد ہماری پجارو تیز رفتاری سے جنگل کے کنارے ریسٹورنٹ کی طرف دوڑ رہی تھی۔

وہاں بہت سے لوگ جمع تھے۔ مجھے اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ معاملہ کچھ زیادہ ہی سنگین ہے جس کی خبر آناً فاناً پورے شہر میں پھیل گئی تھی اور بہت سے لوگ یہاں جمع ہوگئے تھے۔

ہم لوگوں کو ہٹاتے ہوئے آگے بڑھے تو ٹھٹک کر رک گئے۔ ریسٹورنٹ کی مختصر سی عمارت کے سامنے گھاس پر ایک لاش پڑی تھی۔ ہاں وہ لاش ہی تھی جو چادر سے ڈھکی ہوئی تھی اور چادر پر خون کے دھبے بھی نظر آرہے تھے۔ مسلح پولیس والوں نے لاش کے گرد گھیرا ڈال رکھا تھا۔

انسپکٹر نودو پانڈے بھی موجود تھا۔ اس نے بتایا کہ آج صبح پانچ بجے جنگل میں ایک بستی کے دو آدمیوں نے آکر اطلاع دی کہ گنگولی چوہدری کے آدمی یہاں سے تقریباً نصف میل دور ایک عورت کی لاش پھینک گئے ہیں۔ ہم وہ لاش اٹھا لائے ہیں لیکن ابھی تک اس کی شناخت نہیں ہوسکی۔ یرغمالیوں کے تمام رشتے داروں کو اطلاع بھجوا دی ہے۔ وہ آئیں گے تو اس کی شناخت ہوگی۔

مجھے سینے میں دل ڈوبتا ہوا محسوس ہوا۔ میں نے ٹھاکر کی طرف دیکھا اور ہم دونوں لاش کے قریب آگئے۔ پیٹ کی جگہ پر چادر کچھ اوپر کو اٹھی ہوئی تھی اور چادر کا وہی حصہ خون سے تر ہورہا تھا۔

ٹھاکر نے جھک کر چادر کا کونا پکڑ کر اٹھایا تو اس کی انگلیاں کانپ رہی تھیں۔

لاش کا چہرہ دیکھ کر میرے منہ سے بے اختیار گہرا سانس نکل گیا۔ وہ بالا نہیں تھی۔ ٹھاکر نے بھی چادر برابر کردی اور سیدھا ہوگیا۔

اس میں شبہ نہیں کہ وہ لاش بالا کی نہیں تھی لیکن وہ ایک عورت کی لاش تو تھی جو سارسکا کے سرکاری افسران کی ضد کی بھینٹ چڑھ گئی تھی۔ گنگولی چوہدری نے الٹی میٹم دیا تھا کہ اگر تین دن کے اندر اندر اس کے بھائی کو نہ چھوڑا گیا تو چوتھے دن وہ یرغمالیوں کو مارنا شروع کردے گا۔ اس نے اپنی بات پوری کردی تھی۔ آج اس نے پولیس اور ضلعی حکام کو پہلی لاش کا تحفہ بھیج دیا تھا۔

میں ایک بار پھر لاش کو دیکھنے لگا۔ اس کا پیٹ ابھرا ہوا تھا۔ اچانک میرے ذہن میں ایک اور خیال آیا اور اس کے ساتھ ہی میں کانپ اٹھا۔

ابھی کل ہی تو مہیش چوپڑا سے میری بات ہوئی تھی۔ اس نے بتایا تھا کہ اس کی پتنی سیتا تین مہینوں کے حمل سے تھی۔ میں نے پہلے سیتا کو نہیں دیکھا تھا لیکن اس لاش کو دیکھ کر مجھے یقین ہوگیا کہ یہ سیتا ہی تھی اور اس کے ساتھ ہی اس معصوم روح کو بھی کچل دیا گیا تھا جو دنیا میں آنے کی تیاری کے ابتدائی مرحلے میں تھی۔

لوگ آتے رہے اور چادر ہٹا کر لاش کو دیکھتے رہے۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد مہیش چوپڑا بھی پہنچ گیا اور پھر وہاں جو منظر دیکھنے میں آیا وہ قیامت سے کم نہیں تھا۔

مہیش چوپڑا دیر تک سیتا کی لاش سے لپٹا دھاڑیں مارتا رہا۔ پولیس کے ایک سب انسپکٹر نے اسے بانہوں سے پکڑ کر اٹھانے کی کوشش کی تو وہ اس پر پلٹ پڑا۔

مہیش چوپڑا پر جنون طاری ہوگیا۔ اس نے سب انسپکٹر کی وردی پھاڑ دی اور اسے زمین پر گرا کر اس کے سینے پر سوار ہوگیا اور دونوں ہاتھ اس کے نرخرے پر جما دیے۔ وہ اسے گلا گھونٹ کر مار دینا چاہتا تھا۔

چھ سات پولیس والوں نے بڑی مشکل سے سب انسپکٹر کو اس کے شکنجے سے نجات دلائی تھی۔ آٹھ دس کانسٹیبل مہیش چوپڑا کو قابو میں کرنے کی کوشش کررہے تھے مگر وہ سانڈ کی طرح بپھرا ہوا تھا۔ اسے بے بس کرنے کے لیے پولیس والے اس کی پٹائی بھی کررہے تھے۔ ایک زوردار ضرب لگنے سے اس کے سر سے خون بہہ نکلا۔

یہ زیادتی دیکھ کر میں اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکا اور لپک کر ان پولیس والوں پر پل پڑا جو مہیش چوپڑا کی پٹائی کررہے تھے۔ اس سے پہلے کہ کوئی اور پولیس والا مداخلت کرتا، دو کانسٹیبل میرے ہاتھوں بری طرح پٹ چکے تھے۔ ایک کی ناک اور منہ سے خون بہہ نکلا اور دوسرے کے بازو کی ہڈی ٹوٹ گئی۔

چند پولیس والے مجھے پکڑنے کے لیے لپکے تو وہاں جمع بیسیوں لوگوں نے بجرنگ بلی کا نعرہ لگاتے ہوئے پولیس والوں پر حملہ کردیا اور اس طرح وہاں ایک باقاعدہ محاذ کھل گیا۔

اس صورت حال سے نمٹنے کے لیے پولیس نے ہوائی فائرنگ شروع کردی اور شہر سے بھی پولیس کی بھاری نفری پہنچ گئی۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد یہ ہنگامہ فرو ہوسکا تھا اور لطف کی بات تو یہ تھی کہ پولیس کی ہوائی فائرنگ کے باوجود کوئی بھی شخص وہاں سے بھاگا نہیں تھا۔ جن لوگوں کے رشتے دار ڈاکوؤں کے قبضے میں تھے وہ بری طرح بپھرے ہوئے تھے۔ تماشا دیکھنے کے لیے شہر سے آئے ہوئے لوگ بھی طیش میں آئے ہوئے تھے۔ یہ لوگ پہلے ہی ڈاکوؤں کی چیرہ دستیوں کا شکار تھے اور آج تو پولیس کے رویے کے خلاف سب کے سر پر کا بندھن ٹوٹ گیا تھا۔

مزید آدھے گھنٹے بعد ڈپٹی کمشنر بھی پولیس کی بھاری نفری کے ساتھ وہاں پہنچ گیا۔ مجھے اور چار دوسرے آدمیوں کو پولیس والوں پر حملہ کرنے کے الزام میں حراست میں لے لیا گیا تھا۔ ڈپٹی کمشنر کی آمد کے فوراً ہی بعد چند معززین بھی شہر سے یہاں پہنچ گئے تھے۔

ڈپٹی کمشنر ہمارے خلاف قانونی چارہ جوئی اور ہمیں جیون بھر جیل میں سڑانے کی دھمکیاں دے رہا تھا۔ میرے حق میں سب سے پہلی آواز ٹھاکر نے اٹھائی تھی اور پھر شہر سے آئے ہوئے معززین بھی اس زبانی جنگ میں کود پڑے۔

"آپ لوگوں کو شرم آنی چاہیے۔" رائے پرتاب سنگھ نامی ایک بھاری بھرکم آدمی نے ڈپٹی کمشنر کو آنکھیں دکھاتے ہوئے کہا "آپ لوگوں کی ضد کی وجہ سے ایک بے گناہ عورت ماری گئی۔ اس کے پیٹ میں اس کے بچے کی بھی جان لے لی گئی۔ اور کوئی مثبت قدم اٹھانے کے بجائے آپ لوگوں نے اس عورت کے شوہر کو مار مار کر ادھ موا کردیا۔ کیا کسی کو اپنے ساتھ زیادتی کے خلاف احتجاج کا بھی حق نہیں ہے اور جن لوگوں نے اسے بچانے کی کوشش کی انہیں جیل میں سڑانے کی دھمکیاں دے رہے ہو۔ شرم آنی چاہیے تمہیں۔"

"احتجاج کا یہ طریقہ۔۔۔"

"سن رے ڈپٹی۔" ایک اور شخص نے اس کی بات کاٹ دی۔ اس شخص کی عمر پچاس کے لگ بھگ اور صحت قابل رشک تھی۔ اس نے سفید کرتہ اور سفید دھوتی پہن رکھی تھی۔ سر پر چنری جیسے کپڑے کی بل دار پگڑی تھی۔ ماتھے پر سیندور کا ٹیکا لگا ہوا تھا "ہمار بہت دیکھ لیا ہوں اور سن بھی لیا ہوں۔ بہت ہوچکا یہ کھیل تماشا۔ اب اگر گنگولی چوہدری کی طرف سے کوئی لاش آئی تو ہم تمہارے کو تمہارے بنگلے میں باندھ کر آگ لگا دیویں گے۔ جنم میں جاکر ڈپٹی کمسنری کرتے رہنا۔ بولا کیا بولتا ہے؟"

"رانا جی۔ آپ حالات کو سمجھنے کی کوشش۔۔۔"

"ہم حالات کو سمجھ لیا ہوں۔" رانا جی نے ایک بار پھر اس کی بات کاٹ دی "آج سانجھ (شام) سے پہلا پہلا ان

تمام یاتریوں کو یہاں ہونا چاہیے۔ کسی کو کوئی نقصان پہنچا تو تمہاری چھٹی۔ بول کیا بولتا ہے۔ اور سن۔ ان منشوں کو چھوڑ دے۔" اس نے ہماری طرف اشارہ کیا۔

اس مرتبہ ڈپٹی کمشنر جواب دینے کے بجائے ایک طرف ہٹ کر پولیس اور انتظامیہ کے چند اور آفیسروں کے ساتھ مشورہ کرنے لگا اور دس منٹ بعد ہی اس نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔

"ٹھیک ہے رانا جی۔" وہ بولا "ہم گنگولی کے بھائی چترا کو چھوڑ دیتے ہیں تاکہ وہ دوسرے یاتریوں کو کوئی نقصان نہ پہنچا سکے۔"

"چترا کو ابھی جیل سے نکال کے لاؤ اور جنگل میں دھکا دے دو اس راکشش کو۔" رانا جی نے کہا۔

"ایسا نہیں ہوگا رانا جی۔" ڈپٹی کمشنر نے کہا "ہم گنگولی چوہدری کو پہلے پیغام بھیجیں گے کہ ہمیں اس کی شرط منظور ہے۔ اس کے بعد یاتریوں اور چترا کے تبادلے کا پروگرام بنایا جائے گا۔ آپ فکر نہ کریں۔ تمام یاتری آج شام سے پہلے پہلے یہاں آجائیں گے۔"

اس طرح رانا جی اور شہر کے دوسرے بااثر لوگوں کی مداخلت سے یہ معاملہ طے ہوگیا۔ جن کے رشتے دار ڈاکوؤں کی قید میں تھے وہ خوش ہوگئے مگر مہیش چوپڑا کی بیوی اور اس کے پیٹ میں پلنے والا بچہ سرکار کی ضد کی بھینٹ چڑھ گیا تھا۔ سیتا کی لاش اٹھا دی گئی اور اس کے کریا کرم کی تیاری ہونے لگی۔

وہ دو دیساتی جو سیتا کی لاش لے کر آئے تھے انہیں پیغام دے کر گنگولی چوہدری کے پاس بھیج دیا گیا۔ دوسرے لوگوں کی طرح ہم بھی وہیں ڈیرا جمائے رہے۔ چترا کو بھی جیل سے نکال کر وہاں لے آیا گیا تھا۔ اس کے ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے اور اسے پولیس کی کڑی نگرانی میں ریسٹورنٹ کے برآمدے میں بٹھایا گیا تھا۔ لوگ آگے بڑھ بڑھ کر اس طرح اسے دیکھ رہے تھے جیسے وہ کوئی عجوبہ ہو۔

اور وہ واقعی ایک عجوبہ تھا۔ چترا کی عمر تیس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ ساڑھے پانچ فٹ کے قریب قد، صحت مند جسم، وہ نیلی جینز اور اوپن شرٹ پہنے ہوئے تھا۔ دونوں کپڑے میلے ہو رہے تھے۔ قمیص کے بٹن کھلے ہوئے تھے۔ کئی روز کا شیو بڑھا ہوا تھا۔ مونچھوں کے بال بھی بے ترتیب تھے۔ سر کے بال خاصے لمبے تھے جنہیں ربر بینڈ سے پٹیا کی صورت میں باندھ رکھا تھا۔ آنکھیں انگاروں کی طرح دہک رہی تھیں۔ اس کے دونوں کانوں میں سونے کی بالیاں تھیں۔ وہ صورت ہی سے راکشش لگتا تھا..... وحشی۔ چترا کو دیکھ کر اس کے بھائی گنگولی چوہدری کے بارے میں بھی رائے قائم کی جاسکتی تھی۔ ایسے لوگوں سے کسی رحم کی توقع کرنا دنیا کی سب سے بڑی حماقت ہی کہلا سکتی تھی۔

شام ہوگئی۔ ان دونوں دیساتیوں کے ذریعے پیغام رسانی کا سلسلہ جاری رہا۔ ہماری طرح دوسرے لوگ بھی اپنے پیاروں کی واپسی کی امید لگائے وہاں بیٹھے رہے اور بالآخر شام کے لگ بھگ گنگولی چوہدری کا آخری پیغام ملا کہ صبح چھ بجے دو غیر مسلح پولیس والے چترا کو لے کر وہاں سے تقریباً ایک میل جنگل کے اندر ندی کے کنارے پر اس جگہ پہنچ جائیں جہاں چار درخت تازہ کٹے ہوئے ہیں۔ یہ دونوں دیساتی ان کی رہنمائی کریں گے۔ گنگولی چوہدری نے یہ دھمکی بھی دی تھی کہ اگر وہ دونوں پولیس والے مسلح ہوئے یا انہیں دھوکے سے گھیرنے کی کوشش کی گئی تو ان یاتریوں میں سے کوئی بھی زندہ نہیں بچے گا۔

یہ پیغام ملنے کے بعد وہاں کھڑے رہنا بے کار تھا۔ ہم اپنے ہٹ کی طرف جانے کے بجائے شہر آگئے۔ شہر میں یہی چرچے تھے۔ لوگوں کو سیتا کی موت کا افسوس بھی تھا اور اس بات کی خوشی بھی کہ دوسرے یاتریوں کے جیون بچ جانے کی امید پیدا ہوگئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی لوگوں میں ڈپٹی کمشنر، پولیس اور دیگر افسران کے خلاف غصہ بھی پایا جاتا تھا۔

رات نو بجے کے قریب ہم نے سارسکا پیلس ہوٹل میں کھانا کھایا اور اپنے ہٹ میں واپس آگئے۔ آس پاس کے ہٹوں میں رہنے والے لوگ گیسٹ ہاؤس میں جمع تھے۔ جانکی اور روپ متی کو ہٹ میں چھوڑ کر میں اور ٹھاکر بھی گیسٹ ہاؤس کی طرف چل دیے۔ ہم سیتا کے کریا کرم میں شریک نہیں ہوسکے تھے لیکن مہیش چوپڑا کو پرسہ دینا ہمارا اخلاقی فرض تھا۔

مہیش چوپڑا کی حالت واقعی بہت بری تھی۔ اس کے ساتھ واقعی بہت ظلم ہوا تھا۔ بیوی کے ساتھ اس کے ہونے والے بچے کو بھی موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا۔

ہم گیارہ بجے کے قریب اپنے ہٹ میں واپس آئے تو ہمارا پڑوسی بوڑھا سردار جی اور اس کی بیوی وہاں بیٹھے جانکی اور روپ متی سے باتیں کر رہے تھے۔ ہمارے آنے کے تھوڑی دیر بعد وہ چلے گئے۔

ہماری وہ رات بھی جاگتے ہوئے گزری۔ راتوں جاگ جاگ کر اور بے آرامی سے ہم سب کی حالت غیر ہو رہی تھی۔ سب کی آنکھیں سرخ اور چہرے ستے ہوئے تھے۔ میری

کیفیت ان سے ذرا مختلف تھی۔ میں بملا کے لیے کچھ زیادہ ہی بے چین اور پریشان تھا۔ اس کا چہرہ میری نگاہوں سے اوجھل ہی نہیں ہوتا تھا۔ مجھے وہ صبح یاد آئی جب ٹھاکر کی حویلی میں وہ سوری تھی اور میں اسے پیار کرنے کے لیے غیر اختیاری طور پر اس کے چہرے پر جھکا جا رہا تھا۔

میں نے کسی لڑکی کے لیے اتنی بے چینی اور دل میں اتنی بے کلی کبھی بھی محسوس نہیں کی تھی۔ سینے میں ہلچل سی مچی ہوئی تھی۔

ہم صبح پونے چھ بجے جنگل کے کنارے پہنچ گئے۔ بہت سے لوگ ہم سے پہلے ہی وہاں جمع ہو چکے تھے۔ پولیس بھی پہلے سے زیادہ تعداد میں نظر آرہی تھی۔ ڈپٹی کمشنر بھی پہنچ چکا تھا۔ رانا جی اور کچھ اور معززین بھی پھولوں کے ہار لے کر یاتریوں کے استقبال کے لیے وہاں موجود تھے۔

رانا کا تعلق سارسکا کے سابق مہاراجا کے خاندان سے تھا۔ اسے شہر کی اہم ترین شخصیت کہا جاسکتا تھا اور یہ اسی کی کوشش کا نتیجہ تھا کہ سرکاری حکام گنگولی چوہدری کے بھائی کو واپس کرنے پر تیار ہوئے تھے۔

پولیس کے دو غیر مسلح آدمی چترا کو لے کر جنگل میں جا چکے تھے۔ ان کے ساتھ وہ دونوں دیساتی بھی تھے۔ وہ جگہ یہاں سے ایک میل دور تھی جہاں یاتریوں اور چترا کا تبادلہ عمل میں آنے والا تھا۔

ہم سب کی نظریں جنگل کی طرف سے آنے والے راستے پر جمی ہوئی تھیں۔ وقت بہت دھیمی رفتار سے گزر رہا تھا۔ میرے لیے ایک ایک لمحہ صدیوں پر بھاری محسوس ہو رہا تھا۔

سوا چھ بجے کے قریب جنگل کی طرف سے ایک فائر کی آواز گونجی ہوئی سنائی دی تو سب ہی اچھل پڑے۔ ہر چہرے پر تشویش کی لہر دوڑ گئی۔ سب لوگ سوالیہ نگاہوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ کیا گنگولی چوہدری نے بد عہدی کی تھی؟ یہ سوال میرے ذہن میں بھی اٹھ رہا تھا لیکن اس کا جواب کسی کے پاس نہیں تھا۔

رائفل کے اس ایک فائر کے سوا کوئی اور آواز سنائی نہیں دی تھی۔

اس کے بعد وقت کی رفتار جیسے ایک بار پھر تھم گئی تھی۔ لوگوں کے چہروں پر پریشانی اب بھی مترشح تھی۔ شاید ہر شخص اپنی اپنی جگہ پر سوچ رہا تھا کہ فائر کیوں ہوا تھا؟ گولی کس پر چلائی گئی تھی؟

آدھا گھنٹا اور گزر گیا اور پھر گنجان درختوں میں کچھ لوگوں کی جھلک دیکھ کر وہاں کھڑے ہوئے سب ہی لوگ بیک وقت چیخ اٹھے۔

"آگئے۔ وہ لوگ آگئے۔"

لوگ جنگل سے آنے والوں کا استقبال کرنے کے لیے ان کی طرف لپکے۔ وہ لوگ تقریباً سو گز دور تھے۔ میں بھی ٹھاکر کے ساتھ دو قدم آگے بڑھا پھر ٹھٹک کر رک گیا۔ پیچھے دو آدمیوں نے ایک آدمی کو اٹھایا ہوا تھا۔

وہ لوگ تعداد میں بارہ تھے اور میری نظریں ایک ایک کے چہرے کو ٹٹول رہی تھیں مگر مجھے ان میں وہ چہرہ نظر نہیں آیا جس کی مجھے تلاش تھی۔ تین عورتیں تھیں حالانکہ عورتوں کی تعداد چار ہونی چاہیے تھی مگر وہ تین تھیں اور ان میں بملا نہیں تھی۔ جس شخص کو دو آدمیوں نے اٹھایا ہوا تھا، وہ بھگت تھا۔

ہم سب تیزی سے آگے بڑھے۔ قریب آکر انہوں نے بھگت کو گھاس پر لٹا دیا۔ اس کی ٹانگ سے خون بہہ رہا تھا اور چہرے پر مردنی سی چھائی ہوئی تھی۔

لوگ اپنوں سے گلے مل رہے تھے۔ انہیں پھولوں کے ہار پہنائے جا رہے تھے۔ انہیں زندہ سلامت واپس آجانے پر مبارک باد دی جا رہی تھی مگر میرا دل ڈوبا جا رہا تھا۔ بملا ان لوگوں میں نہیں تھی اور بھگت زخمی تھا۔ میں دوڑ کر بھگت کے قریب پہنچ گیا۔

"کیا ہوا بھگت۔ بملا کہاں ہے؟" میں نے اس پر جھکتے ہوئے پوچھا۔

وہ خاموش رہا۔

"بولتے کیوں نہیں بھگت۔ بملا کہاں ہے؟" یہ سوال ٹھاکر نے کیا تھا جو دوسری طرف بھگت پر جھکا ہوا تھا۔

"ٹھاکر جی۔" بھگت نے مردہ سی آواز میں جواب دیا "گنگولی چوہدری اور اس کے آدمی ہم لوگوں کو لے کر ندی کے پاس آئے تھے۔ عین وقت پر گنگولی چوہدری نے بملا دیوی کو بازو سے پکڑ کر پیچھے کھینچ لیا اور اعلان کیا کہ یہ چھوکری نہیں جائے گی۔ پہلے تو کچھ دیر بحث ہوتی رہی کہ وہ وعدہ خلافی کر رہا ہے مگر گنگولی بملا دیوی کو چھوڑنے کو تیار نہیں تھا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ یہ چھوکری اسے پسند آگئی ہے اور اس کے پاس ہی رہے گی۔ میں نے گنگولی پر حملہ کر دیا۔ اس کے دو آدمیوں نے مجھے دھکا دے کر گرا دیا۔

"گنگولی چوہدری نے میرے اوپر رائفل تان لی اور کہا کہ ہم لوگوں کو زندہ واپس کرنے کا وعدہ نہ کیا ہوتا تو مجھے چھلنی کر دیتا لیکن مجھے میری گستاخی کی سزا دینے کے لیے اس

نے میری ٹانگ پر گولی چلا دی اور ہلا کو کھینچتا ہوا وہاں سے لے گیا۔

"گنگولی کے آدمی ہم پر رائفلیں تانے کھڑے تھے۔ اس کے بھائی چرا کے ہاتھ کھول دیے گئے تھے اور اس کے ہاتھ میں ایک رائفل آگئی تھی۔ اس نے حکم دیا کہ ہم سب وہاں سے چلے جائیں ورنہ وہ فائر کھول دے گا۔"

ڈپٹی کمشنر اور دوسرے لوگوں کو بھی یہ خبر ہوگئی کہ گنگولی چوہدری نے وعدہ خلافی کرتے ہوئے ایک لڑکی کو زبردستی روک لیا ہے۔

ٹھاکر بھانوت سنگھ کا دماغ ہی پلٹ گیا تھا۔ اب ہنگامہ کرنے کی باری اس کی تھی۔ ڈپٹی کمشنر جانتا تھا کہ اس کا تعلق جے پور کے کس خاندان سے ہے۔ رانا جی سے بھی واقفیت نکل آئی تھی۔ اس نے بڑی مشکل سے ٹھاکر کو سنبھالا۔

"فکر مت کر ٹھاکر۔" اس نے ٹھاکر کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "ہم پولیس والن کو یہاں سے جانے نہیں دیں گا جب تک تمہاری چھوکری واپس نا ہی آجاوت ہے۔"

اور پھر رانا نے ڈپٹی کمشنر اور پولیس افسران کو آڑے ہاتھوں لیا۔ ڈپٹی کمشنر کو ایک بار پھر گچھے ٹیک دینے پڑے اور پولیس کی ایک پارٹی ڈاکوؤں کے تعاقب میں بھیج دی گئی۔

بھگت کو اسپتال پہنچا دیا گیا۔ کچھ دیر کے لیے ہم بھی اسپتال گئے تھے۔ وہاں ہٹ کا ملازم اور شنکر پہلے ہی زخمی پڑے ہوئے تھے۔ تیسرا بھگت بھی پہنچ گیا۔

روپ متی اور جانکی کو ہٹ میں چھوڑ کر میں اور ٹھاکر واپس اسی جگہ پر آگئے۔ وہاں پولیس والوں کے علاوہ صرف چند لوگ رہ گئے تھے۔ ایک طرف مجھے نارائن بھی نظر آگیا۔ وہ لان کے آخری سرے پر ریلنگ کے پائپ سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ میں ٹھاکر کو وہیں چھوڑ کر اس کے قریب پہنچ گیا اور ریلنگ پر دونوں بازو ٹکا کر نارائن کی طرف دیکھا۔ وہ سامنے جنگل کی طرف دیکھ رہا تھا جیسے کسی بات کا منتظر ہو یا کسی خاص چیز کی تلاش میں ہو۔ اس کے دائیں کندھے پر کپڑے کا ایک تھیلا لٹکا ہوا تھا۔

"تمہاری چھوکری کو اس نے نہیں چھوڑا۔ وہ بہت حرامی ہے۔" اس نے میری طرف دیکھے بغیر کہا "اسے جو چیز پسند آجاتی ہے وہ واپس نہیں کرتا..... چھیننا پڑے گا..... اور گنگولی چوہدری سے کوئی چیز چھیننا ایسا ہی ہے جیسے شیر کے منہ سے اس کا نوالہ چھیننے کی کوشش کی جائے۔"

"پھر کیا کیا جائے؟" میں نے پوچھا۔

"تمہیں جانا پڑے گا شیروں کی اس کچھار میں۔" نارائن نے جواب دیا "کل میں نے تمہیں پولیس والوں کے ساتھ لڑتے ہوئے دیکھا تھا۔ تم نے جس طرح ان کی ہڈیاں توڑی تھیں اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ تمہارے اندر دم خم ہے اور شیر کے منہ میں ہاتھ ڈالنے کا حوصلہ بھی رکھتے ہو۔ یہ جو پولیس والے گئے ہیں نا....." وہ ایک لمحے کو خاموش ہوا پھر بولا "یہ لوگ بے گناہ اور نہتے لوگوں پر لاٹھیاں اور گولیاں برسا سکتے ہیں۔ گھوس (رشوت) کھا سکتے ہیں لیکن ان میں تو شیر کے سٹرک چھاپ غنڈوں کا مقابلہ کرنے کی ہمت نہیں، گنگولی چوہدری جیسے درندوں کا مقابلہ کرنے کی شکتی (طاقت) کہاں سے لائیں گے۔ یہ لوگ سانجھ (شام) سے پہلے پہلے پٹ پٹا کر واپس آجائیں گے۔ ہو سکتا ہے کندھوں پر اپنے ہی ایک دو ساتھیوں کی لاشیں بھی اٹھائے ہوئے ہوں۔"

"تم نے کہا تھا کہ مجھے جانا پڑے گا۔" میں نے کہا "لیکن میں کیسے جا سکتا ہوں۔ پولیس والے مجھے نہیں جانے دیں گے اور پھر سنا ہے کہ جنگل میلوں دور تک پھیلا ہوا ہے۔ وہ لوگ کہاں ہوں گے؟ میں انہیں کیسے تلاش کروں گا اور پھر سنا ہے اس جنگل میں شیر اور چیتے جیسے درندے بھی ہیں۔"

"گنگولی چوہدری اور اس کے ساتھیوں سے زیادہ خوں خوار درندے اور کون ہو سکتے ہیں۔" نارائن نے کہا "اگر تم اپنی چھوکری کو ان درندوں کی چیر پھاڑ سے بچانا چاہتے ہو تو میں تمہاری مدد کر سکتا ہوں۔"

"کیا.....؟" میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا "تم میری کیا مدد کر سکتے ہو؟"

"میں تمہیں جنگل میں لے جاؤں گا۔" نارائن نے جواب دیا "مجھے معلوم ہے وہ لوگ کہاں ہوں گے۔ میں تمہیں ان کے ٹھکانے تک لے جاؤں گا۔ تمہارے اندر طاقت ہے۔ تم اس چھوکری کو بچا سکتے ہو۔"

"تمہارے اس تھیلے میں کیا ہے؟" میں نے موضوع سے ہٹ کر بالکل مختلف سوال کر ڈالا۔

"کچھ نہیں۔" اس نے جواب دیا "تمہیں اس کی فکر نہیں کرنی چاہیے۔ وہ سب انسپکٹر بکواس کرتا تھا کہ میں نشے کی چیزیں بیچتا ہوں۔"

"کیا تم مجھے یہ تھیلا دکھا سکتے ہو؟" میں نے کہا۔

اس نے کچھ کہے بغیر تھیلا کندھے سے اتار کر میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے تھیلا کھول کر دیکھا۔ پلاسٹک کی ایک تھیلی میں پاپے اور دوسری تھیلی میں دو تنوری روٹیاں تھیں۔ میں نے ان روٹیوں کو بھی کھول کر دیکھا۔ بیچ والی روٹی میں

مرچوں کا اچار رکھا ہوا تھا۔ اس کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ میں نے تھیلا اس کی طرف بڑھا دیا جسے اس نے خاموشی سے کندھے پر لٹکا لیا۔

"تم نے بتایا نہیں۔ بھیڑیوں کے اس بھٹ میں جانے کو تیار ہو یا نہیں؟" اس نے میری طرف دیکھے بغیر پوچھا۔

"اپنی خدمات کا کیا معاوضہ لو گے؟" میں نے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔"

"کیا.....؟" میں اچھل پڑا "بغیر کسی لالچ کے تم اپنی جان کو خطرے میں ڈالنا چاہتے ہو؟"

"ہر کام میں کسی کا کوئی نہ کوئی مفاد ضرور ہوتا ہے۔" نارائن نے جواب دیا "جنگل میں جانا میری بھی ضرورت ہے۔ مجھے تو ہر صورت میں جانا ہی ہے۔ سوچا تمہیں بھی ساتھ لے چلوں لیکن میں صرف تمہاری رہنمائی کروں گا۔ تمہاری حفاظت کا ذمہ نہیں لے سکتا۔ ویسے میں جانتا ہوں۔ تم اپنی حفاظت بہتر طور پر کر سکتے ہو۔ تمہارے پاس اگر کوئی گن وغیرہ ہے تو ٹھیک ہے اگر چاہو تو میں تمہیں ایسی چیزوں سکتا ہوں۔ رشین۔ ایک دم فرسٹ کلاس اور قیمت بھی بہت کم۔"

"اوہ!" میں نے چونکتے ہوئے کہا "تو تمہارا اصلی دھندا یہ ہے۔"

"میں تمہیں گن خریدنے پر مجبور نہیں کروں گا۔ اگر تمہارے پاس ہے تو ٹھیک ہے۔ مجھ سے لینا چاہتے ہو تو واپس آکر لوٹا دینا۔ تمہاری پوری رقم تمہیں مل جائے گی۔"

میرے ذہن میں اچانک ہی ایک اور خیال ابھرا۔ میرے خلاف کوئی سازش تو نہیں ہو رہی۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ نارائن، بلونت سنگھ کا آدمی ہو اور مجھے پھنسا کر جنگل میں لے جانا چاہتا ہو۔ خوں خوار درندوں سے زیادہ خونی ڈاکوؤں کے جنگل میں پھنس کر زندہ لوٹ آنا دیوانے کا خواب ہی کہا جا سکتا ہے۔ کہیں واقعی ایسا تو نہیں کہ بلونت سنگھ نے ہمیں اس شہر میں دیکھ لیا ہو اور کہیں چھپ کر بیٹھ گیا ہو اور اتفاق سے اس دوران میں یہ واقعہ پیش آگیا اور بلونت سنگھ کے عیار دماغ نے یہ سازش تیار کر لی۔ اس کے ساتھ دارا بھی تو تھا۔ وہ اس سے زیادہ عیار تھا۔ وہ مجھے گنگولی چوہدری جیسے خطرناک ڈاکو کے جنگل میں پھنسا کر مجھ سے ہمیشہ کے لیے نجات حاصل کر سکتے تھے۔

"تمہیں ہم سے اتنی ہمدردی کیوں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ہمدردی تم سے نہیں، اس لونڈیا سے ہے۔" نارائن نے جواب دیا "میں نے اس چھوکری کو دیکھا تھا۔ وہ اپسرا سے زیادہ حسین اور پھولوں سے زیادہ نازک ہے۔ وہ راکشش اسے چیر پھاڑ کر رکھ دے گا۔ وہ بھیڑیا ہے..... بھیڑیا۔"

"اوہ!" میں نے اس کی طرف دیکھا "تو تم صرف اسی لیے ہماری مدد کرنا چاہتے ہو؟"

"ہاں۔ یہی سمجھ لو۔" نارائن نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا "بعض چیزیں ایسی ہوتی ہیں جو من کو بہت اچھی لگتی ہیں پر ہم جانتے ہیں انہیں حاصل نہیں کر سکتے مگر ان کی حفاظت تو کر سکتے ہیں۔ انہیں غلط ہاتھوں سے بچانے کی کوشش تو کر سکتے ہیں۔"

میں عجیب سی نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ دیکھنے میں وہ بھی وحشی ہی لگتا تھا لیکن اس کی جمالیاتی حس! اس کے سینے میں بھی دھڑکتا ہوا دل تھا جو ہلا کے حسن کو دیکھ کر مچل اٹھا تھا لیکن وہ یہ بھی جانتا تھا کہ وہ اسے حاصل نہیں کر سکتا اور وہ یہ بھی برداشت نہیں کر سکتا تھا کہ ہلا گنگولی چوہدری جیسے وحشی کے قبضے میں رہے اور اسی لیے وہ ہماری مدد کرنے کو تیار ہو گیا تھا اور مجھے جنگل میں چلنے کی ترغیب دے رہا تھا۔

"گن کتنے کی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"صرف پندرہ سو روپے۔" نارائن نے جواب دیا "دس ہزار کا مال ہے جو صرف پندرہ سو میں دوں گا اور رقم ابھی دینی ہوگی۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے یہ کہتے ہوئے گردن گھما کر ٹھاکر کی طرف دیکھا۔ وہ ہم سے تقریباً تیس گز دور پولیس انسپکٹر کے پاس کھڑا باتیں کر رہا تھا۔ میں نے نارائن کی آڑ لے کر پتلون کی جیب سے نوٹ نکالے اور پندرہ سو روپے اس کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے پوچھا۔

"پروگرام کیا ہے؟"

"صبح پانچ بجے اس طرف آجانا جہاں محکمہ جنگلات کا بورڈ لگا ہوا ہے۔" اس نے آنکھ سے بائیں طرف اشارہ کیا "وقت کا دھیان رکھنا۔ ہم ٹھیک پانچ بجے اندر چلے جائیں گے۔ گن بھی تمہیں صبح مل جائے گی۔ اب میں چلتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔ میں صبح پانچ بجے پہنچ جاؤں گا۔" میں نے جواب دیا۔

نارائن کے جانے کے بعد بھی میں ریلنگ سے ٹیک لگائے کھڑا جنگل کی طرف دیکھتا رہا اور پھر فائرنگ کی آواز سن کر اچھل پڑا۔ فائرنگ کی یہ آوازیں جنگل میں بہت دور سے

آتی ہوئی محسوس ہوئی تھیں۔

یہ آوازیں دوسروں نے بھی سنی تھیں اور وہ سب جنگل کی طرف دیکھ رہے تھے۔

تقریباً بیس منٹ تک سنائی دینے والی فائرنگ کی آوازیں بتدریج دور ہوتی چلی گئی تھیں اور پھر خاموشی چھا گئی۔

میں تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا ٹھاکر کے قریب آگیا اور ہم اس فائرنگ کے بارے میں تبادلہ خیال کرنے لگے۔ صاف ظاہر تھا کہ پولیس اور ڈاکوؤں میں مڈھ بھیڑ ہوگئی تھی۔ ہمیں تشویش اس بات کی تھی کہ ہمارا فائرنگ کی زد میں نہ آگئی ہو۔

میرا خیال تھا کہ پہلی پارٹی کی مدد کے لیے کوئی اور پولیس پارٹی بھیجی جائے گی مگر ایسا نہیں ہوا۔ مزید کمک نہیں بھیجی گئی۔

پانچ بجے کے قریب صبح جنگل میں جانے والی پولیس پارٹی واپس آگئی۔ نارائن کا یہ کہنا سو فی صد درست ثابت ہوا تھا کہ پولیس والے پٹ کر واپس آئیں گے۔ دس آدمیوں میں سے تین زخمی تھے۔ انہوں نے ایک کی لاش شاخوں سے بنے ہوئے اسٹریچر پر اٹھا رکھی تھی اور باقیوں کے چہروں پر بے پناہ دہشت تھی۔

اس دن کی کارروائی بھی اپنے اختتام کو پہنچ گئی۔ پولیس نے جنگل کا محاصرہ اٹھالیا۔ دو تین کانسٹیبلوں کو ریسٹورنٹ کے پاس چھوڑ دیا گیا اور پولیس نے وہاں اپنا کیمپ ختم کردیا اور اس طرح یہ ڈراما ختم ہوگیا۔

یہ ڈراما دوسروں کے لیے ختم ہوا تھا ہمارے لیے نہیں بلکہ ہمارے لیے تو یہ کھیل اب شروع ہوا تھا۔ صرف میرے لیے۔

نارائن نے مجھے بھیڑیوں کے اس بھٹ میں جانے کے لیے اکسایا تھا اور یہ میرے لیے ایک بہت بڑا چیلنج تھا۔ اب تک میں نے لوگوں سے گنگولی چوہدری کے بارے میں جو کچھ سنا تھا اس کے مطابق چوہدری انسان نہیں درندہ تھا۔ اس کا دوسرا نام موت تھا۔ طویل عرصے سے اس نے اس خطے میں دہشت پھیلا رکھی تھی۔ وہ جس طرف نکل جاتا اس طرف موت کے بادل چھا جاتے۔ عام لوگ تو اس کے نام ہی سے تھر تھر کانپتے تھے۔ پولیس بھی اس سے خوف زدہ تھی اور اس کی ایک مثال تو آج میں نے دیکھ ہی لی تھی۔

میں نے اس چیلنج کو قبول کرلیا تھا اور غالباً اس کے پیچھے بہلا سے لگاؤ کا جذبہ شامل تھا۔ اگر بہلا ڈاکوؤں کے قبضے میں نہ ہوتی تو میں اس معاملے میں ٹانگ نہ اڑاتا مگر وہ بہلا ہی تھی جسے دیکھ کر میرے من میں کچھ کچھ ہونے لگا تھا اور میں اسے ہر قیمت پر گنگولی چوہدری سے بچانا چاہتا تھا اور اس کوشش میں میری جان بھی جاسکتی تھی لیکن مجھے اس کی پروا نہیں تھی۔

ہم وہاں سے سیدھے اپنے ہٹ واپس آئے تھے۔ جانکی اور روپ متی ہٹ کے سامنے والے لان میں بیٹھی ہوئی تھیں۔ ہم نے انہیں صورت حال سے آگاہ کیا تو ان دونوں کے چہروں پر تشویش گہری ہوگئی۔

"اب کیا ہوگا؟" جانکی نے پوچھا۔

"انسپکٹر دنو پانڈے کا کہنا ہے کہ ایک دو دن میں کوئی نئی حکمت عملی تیار کی جائے گی اور اس کے بعد بھرپور طریقے سے قدم اٹھایا جائے گا۔" ٹھاکر نے جواب دیا "لیکن مجھے نہیں لگتا کہ تین دن سے پہلے یہ کچھ کریں گے۔"

"تین دن کیوں؟" جانکی نے الجھی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"ارے بھئی سیدھی سی بات ہے۔" ٹھاکر سے پہلے میں بول پڑا "تین دن تک تو یہ پولیس والے اپنے اس ساتھی کا سوگ منائیں گے جو کسی ڈاکو کی گولی کھا کر "شہید" ہوا ہے اور جو ساتھی لولے لنگڑے بن کر واپس آئے ہیں ان کو بہادری کے اعزازات دیے جائیں گے۔ ان کے لیے شان دار تقریب منعقد ہوگی اور میرا خیال ہے اس طرح پولیس کسی اور طرف دھیان نہیں دے گی۔"

"ہاں۔ یہ بات تو ہے۔ ان سرکاری بدمعاشوں کو بہادری کے اعزاز ملنے ہی چاہئیں۔" روپ متی نے کہا۔

پولیس والوں کے لیے "سرکاری بدمعاش" کے خطاب پر میں بے اختیار ہنس پڑا۔ ٹھاکر کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ آگئی۔

باتوں کے دوران میں جانکی کو یہ خیال آہی گیا کہ میں اور ٹھاکر بہت تھکے ہوئے تھے اور یہ تھکن چائے یا کافی سے ہی دور ہوسکتی تھی۔ وہ ہمیں باتیں کرتے چھوڑ کر ہٹ کے اندر چلی گئی اور پندرہ بیس منٹ بعد چائے بنا کر لے آئی۔

چائے پینے کے بعد ہم اسپتال کے لیے روانہ ہوگئے۔ ہٹ کے ملازم شنکر اور بھگت کے بیڈ ایک ہی بڑے کمرے میں لگوا دیے گئے تھے اور ایک نرس ان تینوں کی دیکھ بھال پر مامور کردی گئی تھی۔ بھگت اور ہٹ کے ملازم کی حالت قدرے بہتر تھی مگر شنکر کی حالت بدستور تشویش ناک تھی۔ اس کے سینے میں گولی لگی تھی اور اسے سنبھلنے میں ابھی خاصا وقت لگتا۔

میں بھگت کے پاس بیٹھا گنگولی چوہدری اور اس کے

گروہ کے بارے میں کرید کرید کر پوچھ رہا تھا۔

بھگت کے کہنے کے مطابق اس گروہ میں نو افراد تھے جن میں ایک عورت بھی تھی۔ اس عورت کی عمر تیس کے لگ بھگ تھی۔ وہ گروہ کے لیے کھانا وغیرہ تیار کرتی اور چوہدری کا دل بہلاتی۔ بھگت نے ان ڈاکوؤں کے جو حلیے بتائے تھے ان سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ انسان نہیں جانور ہیں۔

ہم دس بجے کے قریب ہٹ میں واپس آگئے۔ میں نے کسی کو بھی نارائن کے منصوبے کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا لیکن میں سوچ رہا تھا کہ کم از کم جانکی کو آگاہ کردینا چاہیے تاکہ میری اچانک گمشدگی پر یہ لوگ زیادہ پریشان نہ ہوں۔ میں یہ بھی سمجھتا تھا کہ جانکی میرے بعد کی صورت حال کو سنبھال لے گی۔

میری طرح ٹھاکر بھی بہت تھکا ہوا تھا۔ بارہ بجے کے قریب وہ اپنے کمرے میں جاکر سوگیا۔ اس کے آدھے گھنٹے بعد روپ متی بھی اپنے کمرے میں چلی گئی۔ جانکی نے بھی اس کے ساتھ ہی اٹھنا چاہا تھا مگر میں نے آنکھ کے اشارے سے اسے روک لیا۔

"کوئی خاص بات؟" تھوڑی دیر بعد جانکی نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں۔" میں نے اثبات میں سر ہلا دیا "ہوسکتا ہے تم مجھ سے اتفاق نہ کرو لیکن میں نے ایک فیصلہ کرلیا ہے۔"

"کیسا فیصلہ؟" جانکی کی آنکھوں میں الجھن تیر گئی۔

میں چند لمحے خاموش رہا اور پھر جانکی کو اپنے پروگرام سے آگاہ کرنے لگا۔

"تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہوگیا؟" جانکی اچھل پڑی "وہ انسان نہیں درندے ہیں۔ چار پانچ دن کے اندر اندر وہ کئی لوگوں کو بے رحمی سے موت کے گھاٹ اتار چکے ہیں۔ انہیں تو اس معصوم عورت پر بھی رحم نہیں آیا جس کی کوکھ میں ایک نئی زندگی جنم لے رہی تھی۔ ان پولیس والوں کا حشر بھی تم دیکھ چکے ہو جو ان کے تعاقب میں گئے تھے اور تم بڑے سورما ہو؟ اکیلے ان کے مقابلے پر جانا چاہتے ہو۔ اکیلا چنا کیا بھاڑ پھوڑے گا؟ تم خودکشی کرنے کی کوشش کررہے ہو اور میں تمہیں ایسا نہیں کرنے دوں گی۔ تم بالکل نہیں جاؤ گے۔"

"لیکن... وہ بہلا اس وحشی کے قبضے میں ہے۔" میں نے کہا۔

"بہلا ہماری لگی تو نہیں جس کے لیے تم اپنی جان خطرے میں ڈال رہے ہو۔" جانکی نے تڑ سے جواب دیا "اور شاید تم بھول رہے ہو کہ وہ اس بہلا ہی کا باپ تھا جس نے پورے شہر کو تمہاری جان کا دشمن بنا دیا تھا اور لوگ تمہیں قتل کرنے کے لیے ڈھونڈتے پھر رہے تھے۔"

"میری لگی تو تم بھی نہیں ہو جانکی۔" میں نے تپ کر جواب دیا "لیکن کیا کسی ایسی صورت حال میں، میں تمہیں تنہا چھوڑ سکتا ہوں۔ تمہیں کوئی معمولی سی تکلیف بھی ہو تو میں تڑپ اٹھتا ہوں۔ تمہارے بغیر تو مجھے ایک لمحے کو بھی چین نہیں پڑتا۔ تمہارے لیے تو میں آگ کے دریا میں بھی چھلانگ لگا سکتا ہوں۔" یہ الفاظ خود بخود میرے منہ سے نکل رہے تھے۔

میرے شروع کے الفاظ سے جانکی کی تیوری پر بل پڑ گئے تھے لیکن اس کے بعد میں نے جو کچھ بھی کہا اس سے میرے پہلے اور قدرے سخت حملے کا تاثر زائل ہوگیا اور جانکی کی آنکھوں میں عجیب سی چمک ابھر آئی۔ چہرے پر سرخی پھیل گئی۔

"سچ... سچ کہہ رہے ہو تم!" جانکی بولی تو اس کی آواز میں ہلکی سی کپکپاہٹ تھی "تمہاری زبان سے پہلی مرتبہ ایسی باتیں سن رہی ہوں۔ میں تو یہی سمجھتی رہی تھی کہ تم وہ پتھر ہو جس میں جونک نہیں لگ سکتی لیکن... میرے بارے میں تمہارے من کی بات جان کر آج مجھے اس قدر خوشی ہو رہی ہے جس کا تم اندازہ نہیں کرسکتے۔"

اور پھر وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر میرے صوفے پر آگئی اور مجھ سے لپٹ کر والہانہ انداز میں پیار کرنے لگی۔ میری پیشانی، گال، ہونٹ..... وہ چٹاچٹ بوسے ثبت کیے جارہی تھی۔

"بس بس۔ اب زیادہ مت پھیلو۔" میں نے اسے بانہوں سے پکڑ کر اپنے سے الگ کردیا۔ وہ میرے چہرے کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں سرخی بھر گئی تھی۔ وہ ایک بار پھر مجھ سے لپٹ گئی "جانکی۔" میں نے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا "ہمارا ساتھ بہت پرانا ہے۔ تم نے میری خاطر اپنا سب کچھ لٹا دیا۔ جیون برباد کرلیا۔ میرے ساتھ دربدر کی ٹھوکریں کھا رہی ہو۔ قدم قدم پر موت سے آنکھ مچولی کھیل رہی ہو۔ کیا میں یہ ساری باتیں نظرانداز کرسکتا ہوں؟ تھائی کے بعد اگر تم نہ ہوتیں تو میں کب کا مٹ چکا ہوتا۔ میں تمہارے سہارے ہی تو جی رہا ہوں۔ کیا میں تم سے الگ ہونے کا تصور کرسکتا ہوں۔ بولو۔ میری بات کا جواب دو۔"

"تم بولتے رہو۔ میں سن رہی ہوں۔ تمہاری باتیں بہت اچھی لگ رہی ہیں۔" جانکی نے جواب دیا۔

"بیلا معصوم اور بے گناہ ہے۔" میں نے کہا "باپ کے گناہوں کی سزا اسے کیوں ملے اور کیا تمہارے دل میں اس کے لیے کوئی ہمدردی نہیں ہے۔ کیا تم یہ گوارا کرلوگی کہ اسے ان وحشیوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا جائے۔ وہ تو سب سے زیادہ تم سے ہی مانوس ہوگئی ہے۔ ہر وقت تمہارے ہی ساتھ چپکی رہتی تھی۔ کیا اسے بے یار و مددگار چھوڑ دیا جائے؟"

"نہیں۔ اس کے لیے میرا دل بھی ہول رہا ہے۔" جانکی سیدھی ہو کر بیٹھ گئی "لیکن ان ڈاکوؤں کے خلاف پولیس کچھ نہیں کرسکی۔ تم اکیلے کیا کرو گے۔ تم اپنی جان خطرے میں کیوں ڈال رہے ہو۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بولی "یہ خطرناک جنگل میلوں دور تک پھیلا ہوا ہے۔ اس میں خوں خوار درندے بھی ہیں اور پھر تم ان ڈاکوؤں کو کہاں تلاش کرو گے؟"

"نارائن ان کے ٹھکانے سے واقف ہے۔ وہ میری رہنمائی کرے گا۔" میں نے جواب دیا۔

"نارائن کون؟" جانکی نے الجھی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھا۔

"وہی آدمی جو مجھے اپنے ساتھ لے جارہا ہے۔" میں نے کہا "میرا خیال ہے کہ وہ گنگولی چوہدری کا انفارمر ہے۔ جتنے روز یہ ہنگامہ جاری رہا اسے میں نے جنگل کنارے کیمپ کے آس پاس منڈلاتے ہوئے ہی دیکھا۔ ہوسکتا ہے اس کا ساتھ بھی سفارش بن کر کام آجائے۔"

"یہ خیال ذہن سے نکال دو۔" جانکی نے کہا "ان چند دنوں کے دوران میں ہم سب نے گنگولی چوہدری کے بارے میں بہت کچھ سنا ہے۔ وہ بہت خود سر ہے۔ اس نے کبھی اپنے آدمیوں کی بات بھی نہیں مانی۔ جو چاہتا ہے کرتا ہے اور اسے اپنے ارادے پر عمل کرنے سے دنیا کی کوئی طاقت نہیں روک سکتی۔ اس کی ضد کا مظاہرہ تم خود بھی دیکھ چکے ہو۔"

"میں تمہاری کسی بات سے اختلاف نہیں کروں گا مگر مجھے ایک کوشش کرلینے دو۔" میں نے کہا "اگر میں بھی دوسروں کی طرح ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا رہا تو میرا ضمیر زندگی بھر مجھے کچوکے لگاتا رہے گا۔"

"ٹھیک ہے۔" جانکی نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا "جب تک تم واپس نہیں آجاؤ گے، میں انگاروں پر لوٹتی رہوں گی۔"

"شانت رہو۔" میں نے اس کا کندھا تھپتھپایا "میں انشا اللہ ضرور واپس آؤں گا۔"

اور پھر رات کا باقی حصہ باتیں کرتے ہوئے ہی گزرا۔

جانکی میرے گھٹنے پر سر رکھے لیٹی رہی اور میں نے اسے ہٹانے کی کوشش نہیں کی۔

مجھے صبح پانچ بجے جنگل کے کنارے مقررہ جگہ پر پہنچنا تھا۔ میں نے جانکی کو سب کچھ سمجھا دیا تھا۔ ساڑھے چار بجے میں بڑی آہستگی سے ہٹ کا دروازہ کھول کر باہر آگیا۔ جانکی بھی میرے ساتھ ہی باہر آئی تھی۔ ہٹ کے سامنے لان کے آخری سرے پر پہنچ کر میں رک گیا۔ جانکی میرے سامنے کھڑی عجیب سی نظروں سے مجھے دیکھتی رہی پھر اس نے میرا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھام لیا اور اپنے ہونٹ میرے ہونٹوں پر رکھ دیے۔

اس وقت میں نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔ میں جس مہم پر جارہا تھا اس میں زندہ واپس آنے کا امکان ایک فیصد سے بھی کم تھا اور میں ان آخری لمحوں میں جانکی کو مایوس نہیں کرنا چاہتا تھا۔

جب میں رخصت ہوا تو جانکی کی آنکھوں میں آنسو جھلملا رہے تھے۔ میں ہاتھ ہلاتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ وہ اس وقت تک وہاں کھڑی رہی جب تک میں سڑک کا موڑ گھوم کر اس کی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہوگیا۔

ابھی پانچ نہیں بجے تھے۔ بہت سویرا تھا۔ فضا میں ہلکی سی خنکی تھی اور ملگجا سا اجالا تھا۔ سڑک سنسان تھی۔ میں تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا جنگل کی طرف چلتا رہا۔

مقررہ جگہ تک پہنچنے میں مجھے پندرہ منٹ سے زیادہ نہیں لگے۔ اس جگہ ایک بہت بڑا بورڈ لگا ہوا تھا جس پر ہندی اور انگریزی میں سیاحوں کو درندوں کے خطرے سے آگاہ کرتے ہوئے اور بھی بہت سی ہدایات لکھی ہوئی تھیں۔ اس بورڈ کے قریب ہی جھاڑیوں میں ایک تنگ سی پگڈنڈی جنگل کے اندر کی طرف چلی گئی تھی۔

میں بورڈ کے قریب کھڑے ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگا مگر نارائن مجھے نظر نہیں آیا اور پھر بائیں طرف سے دو پولیس والوں کو آتے دیکھ کر میں جلدی سے جھاڑیوں میں چھپ گیا۔

وہ پولیس والے مجھ سے تقریباً دس گز کی دوری سے آگے نکل گئے۔ میں جھاڑیوں سے سر نکالے ادھر ادھر دیکھتا رہا اور پھر تقریباً پانچ منٹ بعد مجھے نارائن کی سرگوشیانہ آواز سنائی دی۔ گزشتہ روز باتوں میں، میں نے اسے اپنا نام ہمت سنگھ بتایا تھا اور وہ اسی نام سے مجھے پکار رہا تھا۔

نارائن مجھ سے تقریباً پندرہ گز کے فاصلے پر جھاڑیوں میں چھپا ہوا تھا۔ میں اٹھ کر جھاڑیوں کی آڑ لیتا ہوا اس کے قریب پہنچ گیا۔

"یہ سالے حرامی جنگل کے ساتھ ساتھ گشت کررہے ہیں۔" اس کا اشارہ پولیس والوں کی طرف تھا "پتا نہیں وہ جنگل کی حفاظت کررہے ہیں یا ڈاکوؤں کو کسی قسم کا تحفظ فراہم کررہے ہیں یا اس شہر کو کسی آفت سے بچانا چاہتے ہیں۔ بہرحال گلو۔ اپنی امانت سنبھالو۔"

اس نے ایک ریوالور جیب سے نکال کر میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے ریوالور کھول کر دیکھا۔ وہ گیارہ چیمبرز کا ریوالور تھا اور تمام چیمبرز بھرے ہوئے تھے۔ میرے پاس پتلون کے پائنچے کے اندر پنڈلی پر اپنا خنجر بھی چمڑے کے فیتے میں بندھا ہوا تھا لیکن ریوالور دور کی لڑائی میں بہت موثر ثابت ہوسکتا تھا۔

اس وقت دن کا ہلکا سا اجالا پھیلنے لگا تھا۔ نارائن کے قریب زمین پر ایک شولڈر بیگ بھی رکھا ہوا تھا۔ جس پر ائر انڈیا کے الفاظ چھپے ہوئے تھے۔ یہ بیگ نہ چھوٹا تھا نہ زیادہ بڑا۔ درمیانے سائز کا تھا اور پھولا ہوا تھا۔ اس نے بیگ اٹھا کر کندھے پر لٹکا لیا۔

"چلیں؟" اس نے میری طرف دیکھا۔

"چلو۔ میں تیار ہوں۔" میں نے جواب دیا۔ اس وقت میرے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی تھی۔ میں موت کے منہ میں چھلانگ لگانے جارہا تھا۔ نارائن نے اوپر اٹھ کر ادھر ادھر دیکھا اور پھر مجھے اشارہ کردیا۔ میں بھی اٹھ کر کھڑا ہوگیا اور پھر ہم دونوں نے جھاڑیوں سے نکل کر پگڈنڈی کی طرف دوڑ لگا دی۔

وہ دونوں پولیس والے واپس آرہے تھے۔ وہ اگرچہ ہم سے کافی دور تھے مگر انہوں نے ہمیں دیکھ لیا۔ پہلے تو انہوں نے "کون ہے۔ رک جاؤ۔" کا شور مچایا اور پھر فائر کھول دیا۔ فضا گولیوں کی تڑتڑاہٹ سے گونج اٹھی لیکن ہم دونوں گنجان درختوں میں پگڈنڈی پر دوڑتے رہے۔

ہمارے پیچھے فائرنگ کی آوازیں گونجتی رہیں اور ہم درختوں کی آڑ لیتے ہوئے جھاڑیوں میں دوڑتے رہے۔

میرا خیال تھا کہ پولیس والے ہمارے پیچھے آنے کی کوشش کریں گے لیکن ایسا نہیں ہوا۔ تقریباً ایک میل تک دوڑتے رہنے کے بعد ہم ایک چھوٹی سی ندی کے قریب رک گئے۔ ندی تین فٹ سے زیادہ چوڑی نہیں تھی۔ پانی گدلا سا تھا۔

نارائن ندی کے کنارے پر بیٹھ کر ہانپنے لگا۔ اس کے منہ سے کف بہہ رہا تھا اور وہ بار بار گردن کی آستین سے ہونٹ پونچھ رہا تھا۔ میں ایک درخت کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑا اپنے بے ربط تنفس پر قابو پانے کی کوشش کرتا رہا۔

میں جب تھائی لینڈ میں تھا تو میلوں دور تک دوڑ لگایا کرتا تھا۔ ایکسرسائز کیا کرتا تھا اور یوگا کی مشق بھی باقاعدگی سے ہوتی تھی۔ ان وجوہ میرے اندر گینڈے جیسی طاقت اور چیتے کی سی پھرتی تھی لیکن جب سے ہندوستان آیا تھا، جسم کو چاق چوبند رکھنے والے سارے کام مجھ سے چھوٹ گئے تھے اور میں کاہل و سست ہوگیا تھا۔ اس کا اندازہ آپ اس سے لگا سکتے ہیں کہ صرف ایک میل دوڑنے سے میرا سانس پھول گیا تھا۔ میں نے کئی مرتبہ سوچا تھا کہ دوبارہ ایکسرسائز شروع کروں مگر چھوٹی چھوٹی الجھنوں کی وجہ سے میں اپنے ارادے پر اب تک عمل نہیں کرسکا تھا۔

نارائن نے شولڈر بیگ ایک طرف رکھ دیا۔ عینک اتار کر اس کے اوپر رکھی اور ندی کے کنارے پر بیٹھ کر منہ پر پانی کے چھینٹے مارنے لگا۔

تقریباً پانچ منٹ رکنے کے بعد ہم آگے چل پڑے۔ نارائن نے بیگ کندھے پر لٹکا رکھا تھا اور دوسرے ہاتھ سے اسے نیچے سے بھی سہارا دیے ہوئے تھے۔ وہ ہر تھوڑی دیر بعد بیگ کو ایک کندھے سے اتار کر دوسرے کندھے پر لٹکا لیتا جس سے مجھے اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ وہ بیگ خاصا وزنی تھا۔ ایک دو مرتبہ میں نے اس سے کہا بھی تھا کہ وہ بیگ تھوڑی دیر کے لیے مجھے دے دے لیکن اس نے ہر مرتبہ ٹال دیا تھا۔

ہم جنگل میں تقریباً تین میل اندر آچکے تھے۔ سورج اگرچہ خاصی بلندی پر آچکا تھا مگر درخت اتنے گنجان تھے کہ دھوپ زمین تک نہیں پہنچ رہی تھی۔ درختوں کے نیچے جھاڑیاں بھی بے حد گنجان اور بعض جگہوں پر ہمارے قد سے بھی اونچی تھیں۔ بعض پودوں کے پتے بالشت بھر چوڑے اور دو دو فٹ لمبے تھے جن میں کوئی چھپ جائے تو تلاش کرنا مشکل ہوجائے۔

ان گنجان درختوں، بڑے بڑے پتوں والے پودوں اور جھاڑیوں کی وجہ سے اچھا خاصا حبس ہورہا تھا۔ میری شرٹ پسینے میں بھیگ کر بدن سے چپک گئی تھی اور گردن پر کیچوؤں کی طرح بننے والی پسینے کی دھاروں سے شدید الجھن ہورہی تھی۔

اس گھٹن اور حبس کی وجہ سے پیاس بھی بڑھتی جارہی تھی۔ حلق خشک ہوگیا اور زبان سوکھ کر کانٹے کی طرح تالو میں چبھنے لگی۔ میں چلتے ہوئے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا کہ شاید کہیں پانی نظر آجائے۔ کوئی ندی، نالا یا کوئی جوہڑ۔۔۔ لیکن کہیں پانی کی موجودگی کے آثار نظر نہیں آرہے تھے۔

"نارائن! یہاں کہیں پانی نہیں ملے گا۔" بالآخر میں نے نارائن سے پوچھ ہی لیا۔

"آدھا میل آگے ایک صاف پانی کی ندی ہے۔" نارائن نے ایک طرف اشارہ کیا "وہاں ہم پانی بھی پئیں گے اور کچھ دیر آرام بھی کریں گے۔"

"لگتا ہے تم پہلے بھی اس جنگل میں آتے رہے ہو۔" میں نے کہا "سنا ہے اس جنگل میں چیتے اور ریچھ وغیرہ بھی ہیں لیکن ابھی تک تو خرگوشوں اور لومڑیوں کے سوا کوئی خطرناک جانور نظر نہیں آیا۔"

"جس ندی کی میں بات کررہا ہوں نا۔ وہاں تک کا علاقہ بڑی حد تک محفوظ ہے۔" نارائن نے جواب دیا "اس سے آگے درندوں سے سامنا ہونے کا اندیشہ ہے۔ یہاں چیتے بھی ہیں' سانبھر بھی اور شیر بھی لیکن کسی درندے کے منہ کو ابھی تک انسانی خون نہیں لگا۔ یہاں لاتعداد ایسے جانور ہیں جو بڑی آسانی سے ان درندوں کا شکار بن جاتے ہیں۔ کئی سال پہلے ایک شیر کے منہ کو انسانی خون کا مزہ لگ گیا تھا۔ دو مہینے کے اندر اس نے تین انسانوں کو شکار کرلیا تھا۔ سرکار کے بھیجے ہوئے درجن بھر شکاریوں نے کئی دن کی کوشش کے بعد اسے گھیر کر مار ڈالا۔ اس کے بعد آدم خوری کا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا۔ اس کے برعکس شکاری یہاں آکر درندوں کے شکار سے اپنا شوق پورا کرتے رہتے ہیں جس وجہ سے اس جنگل میں خوں خوار درندوں کی تعداد کم ہوتی جارہی ہے۔"

"یہاں دو تین بستیاں بھی تو ہیں۔" میں نے کہا "کیا ان لوگوں کو اس خوفناک جنگل میں رہتے ہوئے ڈر نہیں لگتا؟"

"یہ پیٹ بہت پاپی ہے ہمت سنگھ۔" اس نے ایک ہاتھ پیٹ پر مارتے ہوئے جواب دیا "پیٹ کا جہنم بھرنے کے لیے انسان کو پتا نہیں کیا کچھ کرنا پڑتا ہے۔ یہاں جنگل میں ناریل اور کیلے کے علاوہ بہت سے پھل دار درخت ہیں۔ ان بستیوں کے رہنے والے یہی پھل توڑ کر شہر میں فروخت کردیتے ہیں۔ ان کی زندگیوں کو خطرہ تو ہر وقت لاحق رہتا ہے پر پیٹ بھرنے کے لیے ایسے خطرات تو مول لینے ہی پڑتے ہیں۔"

"ابھی تک تو ہمیں کوئی بستی دکھائی نہیں دی۔" میں نے کہا۔

"میں تمہیں ان بستیوں سے بچا کر لے جارہا ہوں۔" نارائن نے جواب دیا "ان بستیوں میں رہنے والے سالے بہت حرامی ہیں۔ کسی نے ہمیں دیکھ لیا تو ہماری خبر ہم سے پہلے گنگولی چوہدری تک پہنچ جائے گی اور وہ ہمیں راستے ہی میں گھیر لیں گے۔"

ہم باتیں کرتے ہوئے چلتے رہے۔ میں نے اپنا ریوالور نکال کر ہاتھ میں لے لیا تھا۔ کسی بھی وقت اس کی ضرورت پڑ سکتی تھی۔

نارائن نے بتایا تھا کہ وہ ندی تقریباً نصف میل کے فاصلے پر ہے لیکن ہم تقریباً ڈیڑھ گھنٹے بعد وہاں پہنچ سکے۔ شروع میں ایک ڈیڑھ میل تک تو جنگل میدانی خطے پر تھا لیکن اس کے بعد پتھریلا علاقہ شروع ہوگیا تھا اور مسلسل بلندی کی طرف چلتے رہے تھے۔

یہ ندی بھی پتھروں میں اوپر سے نیچے کی طرف بہہ رہی تھی۔ پانی شفاف تھا۔ نارائن نے تو کسی چوپائے کی طرح منہ کے بل لیٹ کر منہ پانی میں ڈال دیا تھا جبکہ میں دونوں ہاتھوں کا پیالہ بنا کر پانی پیتا رہا۔

پانی پینے کے بعد نارائن ایک پتھر سے ٹیک لگا کر بیٹھا اور بیڑی سلگا کر لمبے لمبے کش لگانے لگا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے اپنا پستول نکال کر قریب رکھ لیا تھا۔ اس نے مجھے خبردار کردیا تھا کہ اس ندی پر درندے وغیرہ پانی پینے کے لیے آتے رہتے ہیں اسی لیے ہم دس منٹ سے زیادہ یہاں نہیں ٹھہریں گے۔

میں ندی پار کرکے ٹہلتا ہوا کچھ آگے نکل گیا۔ گرد و نواح کی صورت حال سے نمٹنے کے لیے ریوالور میرے ہاتھ میں تھا۔ آگے ڈیڑھ دو سو گز تک جنگل چھدرا تھا اور اس سے آگے چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں پر درخت اور جھاڑیاں اس قدر گنجان تھیں کہ پہاڑیاں بھی چھپ کر رہ گئی تھیں۔

میں ایک طویل چکر کاٹ کر دوسری طرف سے واپس آیا تو ٹھٹک کر رک گیا۔ وہ خوفناک منظر دیکھ کر مجھے جیسے سانس رکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ نارائن لیٹے لیٹے اونگھ گیا تھا اور اس کے پیروں کی طرف بھورے بالوں والا ایک ریچھ پورے قد کے ساتھ کھڑا دانت نکوس رہا تھا۔ اس کے منہ پر سفید بالوں سے انگریزی کے حرف وی (V) کا نشان سا بنا تھا۔ بھورے بالوں والا ریچھ کالے ریچھ سے زیادہ خطرناک ہوتا ہے اور وہ خطرناک بھورے بالوں والا ریچھ نارائن کے پیروں کے قریب کھڑا دانت نکوس رہا تھا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں بڑی خوفناک چمک تھی۔

میں ایک درخت کی آڑ میں کھڑا ریچھ کو دیکھ رہا تھا۔ پھر وہ جیسے ہی جھکائیں نے ریوالور والا ہاتھ آگے بڑھا کر فائر دیا۔ جنگل فائر کی آواز اور ریچھ کی دہاڑ سے گونج اٹھا۔ ریچھ کے بائیں بازو پر کندھے کے قریب لگی تھی۔

نارائن بھی گولی کی آواز سے ہڑبڑا کر اٹھ گیا۔ اس نے اپنے سامنے ریچھ کو دیکھا تو بدحواسی میں لیٹے لیٹے چھلانگ لگا دی اور ندی میں جا گرا۔

ریچھ دہاڑتا ہوا دونوں ہاتھوں سے سینہ کوبی کررہا تھا۔ وہ نارائن کی طرف لپکا۔ نارائن نے چیختے ہوئے ایک بار پھر چھلانگ لگائی۔ اس کا پیر پھسلا اور وہ پھر پانی میں گر گیا۔ ریچھ سینہ کوبی کرتا ہوا اس کی طرف لپکا تو میں نے دوسرا فائر کردیا۔ اتفاق سے یہ گولی بھی اس کے اسی کندھے پر لگی۔ اس بار اس نے نارائن پر حملہ کرنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ مڑ کر لنگڑاتا ہوا جھاڑیوں میں غائب ہوگیا۔

میں نے دوڑ کر نارائن کو ندی سے نکالا۔ وہ بری طرح بدحواس تھا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں سی اڑ رہی تھیں۔ اسے حواس بحال کرنے میں کئی منٹ لگ گئے۔

"آنکھ لگ گئی تھی۔" وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولا "تم نہ ہوتے تو آج میری کہانی ختم ہوچکی ہوتی۔"

"اب کیا ارادہ ہے؟" میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"چلتے ہیں گرو۔ چلتے ہیں۔" اس نے میرے سامنے دونوں ہاتھ جوڑ دیے "یہاں رکنا اب خطرے سے خالی نہیں۔"

اس نے چپل پہنی' بیگ کندھے پر لٹکایا اور پستول ہاتھ میں پکڑ لیا۔ اس کے کپڑوں سے پانی نچڑ رہا تھا۔ گیلی چپل میں پیر پھسل رہے تھے لیکن اب وہ یہاں ایک لمحہ بھی رکنے کو تیار نہیں تھا۔

ہم سامنے والی پہاڑی کی طرف جارہے تھے جو گنجان درختوں اور قد آدم جھاڑیوں سے ڈھکی ہوئی تھی۔

"گولیوں کی آواز جنگل میں بہت دور تک گونجی ہوگی۔" نارائن نے میرے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے کہا "مجھے اندیشہ ہے کہ اگر یہ آواز انہوں نے سن لی ہوگی تو وہ ہوشیار ہوجائیں گے۔"

"اگر میں گولی نہ چلاتا تو تمہارا وہ بڑا بھائی تمہارے بخیے ادھیڑ دیتا۔" میں نے جواب دیا۔

"اب ہمیں راستہ بدلنا پڑے گا۔" اس نے میری بات کو نظرانداز کرتے ہوئے کہا۔

وہ پہاڑی ڈھائی تین سو فٹ سے زیادہ اونچی نہیں تھی لیکن گنجان درختوں اور گھنی جھاڑیوں کی وجہ سے راستہ بڑا دشوار تھا۔ کانٹے دار جھاڑیوں سے میری دونوں بانہوں پر لاتعداد خراشیں آچکی تھیں جن میں شدید جلن ہورہی تھی۔

ہم اس مرتبہ تقریباً تین گھنٹوں تک مسلسل چلتے رہے۔ حبس کی وجہ سے سانس گھٹتا ہوا محسوس ہورہا تھا۔ پسینہ دھاروں کی صورت میں بہہ رہا تھا۔

بالآخر ہم ایک اور چھوٹی سی ندی کے قریب پہنچ گئے۔ ندی کیا تھی ایک ڈیڑھ فٹ چوڑا نالا سا تھا جس میں شفاف پانی بہہ رہا تھا۔ یہاں درخت کسی قدر چھدرے تھے اور کہیں کہیں دھوپ بھی درختوں کی شاخوں سے چھن کر زمین تک پہنچ رہی تھی۔ اس دھوپ سے اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ دوپہر ڈھل رہی تھی۔

نارائن مجھ سے الگ ہٹ گیا اور دوسری طرف رخ کرکے بیگ کھولنے لگا۔ اس نے بیگ میں سے ایک پوٹلی نکال کر زپ دوبارہ بند کردی اور میرے قریب آگیا۔

پوٹلی میں چھ توری روٹیاں تھیں جن پر مرچ کا اچار رکھا ہوا تھا۔

ہم صبح پانچ بجے سے چل رہے تھے۔ دو تین مرتبہ صرف پانی پیا تھا۔ مجھے بھی بڑے زور کی بھوک لگ رہی تھی اور اس وقت مرچ کے اچار کے ساتھ روٹی کھانے میں واقعی مزہ آگیا۔

یہاں آدھا گھنٹا رکنے کے بعد ہم آگے چل پڑے اور مزید دو گھنٹوں تک مسلسل چلتے رہنے کے بعد ہم ایک ایسی جگہ پر نکل آئے جہاں درخت زیادہ گنجان نہیں تھے البتہ چوڑے پتوں والے پودے اور جھاڑیاں بکثرت تھیں۔ سامنے چھوٹی چھوٹی کئی چٹانیں تھیں۔ بعض چٹانوں میں چھوٹے غار بھی نظر آرہے تھے۔

نارائن ان چٹانوں سے دور ہی رک گیا۔ اس کے چہرے پر مایوسی چھائی اور اس مایوسی کی وجہ میں بھی سمجھ گیا تھا۔ چٹانوں کے قریب ایک جگہ پر تین پتھر رکھ کر چولہا سا بنا ہوا تھا۔ راکھ' بجھے ہوئے کوئلے اور جلی ہوئی چند لکڑیاں دور ہی سے نظر آرہی تھیں۔ ادھر ادھر چند ایسی چیزیں بھی دکھائی دیں جن سے اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ یہاں کچھ لوگ پڑاؤ ڈالے ہوئے تھے جو ہمارے آنے سے پہلے ہی کہیں اور جاچکے تھے۔

"بہت برا ہوا۔" نارائن کے لہجے سے بھی مایوسی جھلک رہی تھی "ان کی تلاش میں اب ہمیں کم از کم سات آٹھ گھنٹے اور چلنا پڑے گا۔ ان کا دوسرا ٹھکانا یہاں سے پچھم (مغرب) کی طرف بہت دور ہے۔"

"سورج ڈھل رہا ہے اور ہم رات میں تو سفر جاری نہیں رکھ سکتے۔" میں نے کہا۔

"رات ہمیں یہیں گزارنی پڑے گی۔" نارائن نے

جواب دیا "یہ جگہ محفوظ ہے۔ اس طرف پانی کا چشمہ بھی ہے۔" اس نے درختوں کی طرف اشارہ کیا "آگے ہمیں ایسی محفوظ جگہ نہیں ملے گی۔"

"تو پھر لگا دو یہیں پر ڈیرا۔" میں یہ کہتے ہوئے ایک پتھر سے ٹیک لگا کر نیم دراز ہو گیا۔

نارائن آس پاس کی چٹانوں میں جھانکتا رہا۔ بیگ اس نے بدستور کندھے پر لٹکا رکھا تھا اور اب اس بیگ کے بارے میں میرا تجسس بڑھتا جا رہا تھا۔ بیگ خاصا بھاری تھا اور نارائن صبح پانچ بجے سے اسے کندھے پر لٹکائے ہوئے تھا۔ میں نے کئی مرتبہ کوشش کی تھی کہ تھوڑی دیر کے لیے اس کا یہ بوجھ اٹھالوں لیکن ہر مرتبہ اس نے انکار کر دیا تھا۔

دوپہر کے کھانے کے بعد دو روٹیاں بچی تھیں جو نارائن نے سنبھال کر رکھ لی تھیں۔ شام سے ذرا پہلے ہم نے وہ روٹیاں بھی کھالیں اور چشمے سے پانی پی کر ایک دوسرے کے قریب زمین پر لیٹ گئے۔ نارائن نے بیگ کو تکیے کی طرح سر کے نیچے رکھ لیا تھا۔ میں ایک پتھر سے ٹیک لگائے نیم دراز تھا۔

سورج غروب ہونے کے بعد جلد ہی اندھیرا پھیل گیا۔ میں نے نارائن سے ابھی تک نہیں پوچھا تھا کہ وہ کون ہے۔ کیا دھندا کرتا ہے۔ وہ اس جنگل میں کیوں آیا ہے۔ پولیس گنگولی چوہدری کے جس ٹھکانے کو تلاش کرنے میں ناکام رہی تھی وہ آسانی سے یہاں تک کیسے پہنچ گیا؟ بہت سے سوالات میرے دماغ میں کلبلا رہے تھے۔ اس نے میرے صرف پہلے سوال کا جواب دینا ہی مناسب سمجھا تھا۔

نارائن بنگلور کا رہنے والا تھا۔ وہ اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھا لیکن اکلوتا ہونے کے باوجود نہ تو اسے ماں کی مامتا مل سکی اور نہ ہی باپ کی شفقت۔

نارائن اپنا ماضی نہیں بھولا تھا۔ اسے سب کچھ اچھی طرح یاد تھا۔ دس سال کی عمر تک تو سب ٹھیک ٹھاک چلتا رہا لیکن پھر اچانک ہی سب کچھ بدل گیا۔ اس کے ماں باپ میں کسی بات پر ناچاقی شروع ہو گئی جس نے بڑھتے بڑھتے سنگین صورت اختیار کر لی۔ وہ دونوں ایک دوسرے پر بے وفائی کے الزامات عائد کرتے رہے۔ اس کے باپ نے اس کی ماں کو آوارہ اور بدچلن قرار دے کر نارائن کو اپنا بیٹا تسلیم کرنے سے انکار کر دیا جبکہ نارائن کی ماں اپنے شوہر پر الزام لگاتی رہی کہ وہ آوارہ اور بدکار عورتوں کے ساتھ راتیں گزارتا ہے۔

دونوں میں علیحدگی ہو گئی۔ ماں کے پاس آمدنی کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ وہ بیٹے کی پرورش کیسے کرتی۔ وہ نارائن کو اس کے باپ کے دروازے پر چھوڑ آئی اور نارائن کا باپ اسے دھکے دے کر گھر سے نکال دیتا۔

دونوں میں طلاق ہوئی تو نارائن کی زندگی پر چھائے ہوئے اندھیرے کچھ اور گہرے ہو گئے۔ ماں نے دوسری شادی کر لی اور نئے شوہر کے ساتھ بنگلور چھوڑ کر چلی گئی۔ باپ شراب' جوئے اور آوارہ عورتوں کا رسیا تھا۔ ایک رات شراب خانے میں ایک عورت کی ملکیت پر جھگڑا ہو گیا۔ نارائن کے باپ نے اپنے رقیب کو پیٹ میں چھرا گھونپ کر ہلاک کر دیا۔ اس نے بھاگنے کی کوشش کی مگر لوگوں نے پکڑ کر اسے پولیس کے حوالے کر دیا۔

عدالت میں کیس چلا۔ جرم ثابت ہو گیا اور نارائن کے باپ کو عمر قید کی سزا ہو گئی۔ نارائن اس وقت چودہ سال کا تھا۔ باپ کے جیل جانے کے بعد وہ باپ کے مکان میں آباد جس پر اس کا حق تھا۔ اس موقع پر اس کا ایک ہمدرد بھی پیدا ہو گیا۔ جگو چاچا پہلے بھی اسی شہر میں رہتا تھا لیکن اس نے کبھی نارائن کو منہ نہیں لگایا تھا لیکن اب اسے نارائن سے بڑی محبت ہو گئی تھی۔

جگو شہر کا بدنام ترین آدمی تھا اس نے نو عمر لڑکوں کا ایک گروہ بنا رکھا تھا جن سے وہ چھوٹے موٹے جرائم کرواتا تھا۔ وہ نو عمر لڑکوں کے اس ریوڑ کے ساتھ شہر کے نہایت پس ماندہ علاقے میں واقع ایک کھنڈر نما مکان میں رہتا تھا جسے اس نے اناتھ آشرم (بے سہارا بچوں کی پناہ گاہ) کا نام دے رکھا تھا حالانکہ اس کے آشرم میں کئی ایسے بچے بھی تھے جن کے ماں باپ زندہ تھے لیکن وہ خود عسرت کی زندگی گزار رہے تھے۔ اگر جگو ان کے بچوں کو اناتھ کہہ کر دو وقت کی روٹی کھلا دیتا تھا تو اس میں کیا برائی تھی۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ جگو ان بچوں سے جرائم کا ارتکاب کرواتا ہے لیکن انہیں اس سے بھی کوئی غرض نہیں تھی۔

جگو نے نارائن کو بھی قابو میں کر لیا۔ تمام بچے اس مکان میں منتقل کر دیے گئے اور نارائن کا گھر اچھا خاصا اناتھ آشرم بن کر رہ گیا۔

نارائن اب کوئی بچہ نہیں رہا تھا۔ وہ سب کچھ سمجھ رہا تھا مگر نجانے کیا بات تھی کہ جگو چاچا کے سامنے اس کی زبان نہیں کھلتی تھی۔ جگو چاچا نے اسے بھی جرائم کے راستے پر لگا دیا۔

دو سال گزر گئے۔ نارائن نے چھوٹے موٹے جرائم میں اچھی خاصی مہارت حاصل کر لی تھی اور پھر ایک روز جگو چاچا تمام بچوں کو چھوڑ کر غائب ہو گیا۔ اس کے ایک ہفتے بعد ساہو کار دولت رام اپنے آدمیوں کو لے کر نارائن کے مکان پر پہنچ گیا اور یہ سنسنی خیز انکشاف ہوا کہ جگو نے یہ مکان پچاس ہزار روپے میں اس کے ہاتھ فروخت کر دیا تھا۔ کاغذات پر نارائن ہی کے دستخط تھے۔ نارائن قسمیں کھاتا رہا کہ اس نے مکان فروخت نہیں کیا اور نہ ہی کسی کاغذ پر کبھی دستخط کیے تھے مگر ساہو کار نے اسے اور تمام بچوں کو دھکے دے کر نکال دیا۔

نارائن پولیس کے پاس بھی گیا مگر پولیس نے بھی ساہو کار ہی کا ساتھ دیا۔ ساہو کار دولت رام نے اسے یہ چھوٹ البتہ دے دی کہ اگر وہ پچاس ہزار روپے ادا کر دے تو وہ مکان خالی کر دے گا۔ دوسری صورت میں وہ عدالت کا دروازہ کھٹکھٹا سکتا ہے۔

نارائن کے پاس نہ تو ساہو کار دولت رام کو دینے کے لیے پچاس ہزار روپے تھے اور نہ ہی عدالت سے انصاف حاصل کرنے کے لیے رقم۔ وہ اناتھ (بے سہارا) بچوں کو لے کر شہر سے باہر ایک مندر کے کھنڈر میں منتقل ہو گیا۔ اب وہی ان بچوں کا ان داتا تھا۔

نارائن کی زندگی اناتھ بچوں کی پرورش کرتے ہوئے گزر گئی۔ وہ خود بھی واردا تیں کرتا اور بچوں سے بھی جرائم کرواتا۔ کبھی جیل میں اور کبھی سڑکوں پر۔ نارائن کے شب و روز اسی طرح گزر رہے تھے۔ وہ بچے جیسے جیسے بڑے ہوتے گئے اس کا ساتھ چھوڑتے گئے اور بالآخر نارائن اکیلا رہ گیا۔

کچھ عرصے بعد اس نے بھی بنگلور چھوڑ دیا اور ہندوستان کے مختلف شہروں میں دھکے کھاتا ہوا تین سال پہلے سارکا پہنچ گیا۔ یہ جگہ اسے زیادہ پسند آگئی اور وہ یہیں کا ہو کر رہ گیا۔

نارائن نے یہ نہیں بتایا کہ وہ ڈاکو گنگولی چوہدری کو کس طرح جانتا ہے اور جنگل میں کیوں آیا ہے اور یہ کہ اس بیگ میں کیا ہے؟ میں نے بھی یہ سب کچھ جاننے کے لیے زیادہ اصرار نہیں کیا۔

ہم دیر تک باتیں کرتے رہے۔ رات اگرچہ زیادہ نہیں بیتی تھی لیکن لگتا تھا جیسے رات اپنے آخری پہر میں پہنچ گئی ہو۔ تاریکی میں چاروں طرف سے آنے والی حشرات الارض کی آوازوں نے دلوں پر وحشت سی طاری کر رکھی تھی۔ کبھی کبھار کسی بھیڑیے یا اس قسم کے جانور کی خوفناک آوازیں سنائی دے جاتیں۔

نارائن باتیں کرتے کرتے سو گیا تھا۔ میں اس کے بعد بھی دیر تک آسمان پر چمکتے ہوئے ستاروں کو دیکھتے ہوئے سوچتا رہا کہ ڈاکوؤں کی بھی کیا زندگی ہے۔ وہ ایسے جنگلوں اور پہاڑوں میں کیسے زندہ ہیں پھر مجھے ہما کا خیال آگیا۔ شہر کی رہنے والی نازونعم میں پلی ہوئی وہ لڑکی یہاں کس حال میں ہو گی۔

مجھے جانکی وغیرہ کا بھی خیال آیا۔ میرے بعد وہاں کیا ہنگامہ ہوا ہو گا۔ ہو سکتا ہے ٹھاکر پولیس اور انتظامیہ پر چڑھ دوڑا ہو۔ بہرحال' یہ سب کچھ تو واپس جانے کے بعد ہی معلوم ہو گا۔ بشرطیکہ میں گنگولی چوہدری اور جنگلی درندوں سے زندہ بچ کر واپس جا سکا۔

آسمان پر ایک تارا ٹوٹا اور روشنی کی ایک لکیر چھوڑتا ہوا افق پر غائب ہو گیا۔ آسمان کتنا روشن نظر آرہا تھا۔ ستارے پوری آب و تاب سے چمک رہے تھے۔ شہر کی مصنوعی روشنیوں میں ان ستاروں کی چمک کبھی ماند پڑ جاتی ہے۔

میرا سر بھاری ہو رہا تھا۔ تھکن سے جسم کے تمام اعضا شل ہو رہے تھے اور پھر اس بات کی پروا کیے بغیر کہ رات کو کسی وقت کوئی جنگلی جانور ہمارا نیا پانچ کر سکتا ہے' میں نے بھی آنکھیں بند کر لیں اور نیند کی وادی میں اتر گیا۔

○☆○

ماں کی کوکھ سے جنم لینے والا ہر بچہ بڑا معصوم اور فرشتہ صفت ہوتا ہے۔ وہ ماں کے پیٹ سے جرائم سیکھ کر نہیں آتا۔ دنیا میں آنے کے کئی سال بعد بھی وہ دوسروں کا محتاج رہتا ہے۔ دوسروں کی انگلی پکڑ کر چلتا ہے۔ اسے اچھے برے کی تمیز نہیں ہوتی۔ دنیا کے نشیب و فراز کا شعور نہیں ہوتا۔ وہ بالکل نہیں جانتا کہ اگلا قدم اسے کہاں لے جائے گا۔ وہ قدم قدم پر بڑوں کی رہنمائی کا محتاج ہوتا ہے۔ اب یہ بڑوں پر منحصر ہے کہ وہ اسے کون سا راستہ دکھاتے ہیں۔ وہ اسے باعزت زندگی کی رفعتوں کی طرف لے جائیں یا ذلت کے مہیب کھڈ میں دھکیل دیں اور جب وہ شعور سنبھالتا ہے تو بہت کچھ اس کے ہاتھ سے نکل چکا ہوتا ہے۔ اسے وہی کچھ کرنا ہوتا ہے جس کا اسے درس دیا گیا یا جو وہ اپنے اردگرد دیکھتا ہے۔ اگر اسے اچھی تربیت نہیں ملی' اس کے اردگرد رونما ہونے والے معاملات قابل تعریف نہیں تو وہ تباہی کے راستے کی طرف چل پڑتا ہے بلکہ اس کے لیے اسے مجبور کر دیا جاتا ہے اور وہ معاشرے پر ایک بوجھ بن جاتا ہے۔

میری اپنی زندگی قابل مثال یا قابل تعریف نہیں تھی۔ میں نے جو راستہ اپنایا تھا وہ خود اختیار کردہ نہیں تھا۔ مجھے

اس کانٹوں بھرے راستے پر دھکیلا گیا تھا۔ میں نے بار بار اپنے قدموں میں زنجیر ڈالنے کی کوشش کی تھی مگر ہر مرتبہ مجھے منہ کے بل گرا دیا گیا۔

میرے سینے میں تو انتقام کا جذبہ تھا۔ ممکن ہے کسی موقع پر میں وہ سب کچھ بھول جاتا اور ایک عام آدمی کی طرح نارمل زندگی گزارتا لیکن میری زندگی میں ایسا موقع آنے ہی نہیں دیا گیا۔ قدم قدم پر اور ہر لحظہ میرے سینے میں انتقامی جذبات کی آگ کو بھڑکایا گیا اور میں اس آگ میں جلتا ہوا بہت دور نکل گیا۔

میں جرائم پیشہ نہیں تھا لیکن زندگی کے اس کانٹوں بھرے راستے پر میرا واسطہ زیادہ تر جرائم پیشہ لوگوں ہی سے رہا تھا۔ چور، ڈاکو، قاتل بدمعاش اور جعل ساز۔ ان میں کئی ایسے تھے جو ایک وقت پیٹ بھر روٹی کھانے کے لیے چھوٹے چھوٹے جرائم تک محدود تھے اور کئی ایسے تھے جن کا جرائم کی دنیا میں بڑا نام تھا۔ بڑا دبدبہ تھا۔ بڑی دہشت تھی ان کے نام کی۔

لیکن ان سب میں ایک بات مشترک تھی۔ ان میں کوئی بھی ایسا نہیں تھا جس نے اپنی مرضی سے اس ذلت بھرے راستے پر قدم رکھا ہو۔ انہیں اس راستے پر چلنے کے لیے مجبور کیا گیا تھا۔ ایسے ہر شخص کی زندگی کے پس منظر میں ایک ہی کہانی تھی۔ ایک ہی کتھا تھی۔۔۔ نارائن کی کتھا۔

اور اب میں اسی نارائن کے ساتھ اس خوفناک اور بھیانک جنگل میں چل رہا تھا جہاں کسی جگہ گنگولی چوہدری جیسا درندہ گھات لگائے بیٹھا تھا۔

نارائن، جگو چاچا کے فریب کا شکار ہوا تھا اور میں بڑے اعتماد سے کہہ سکتا تھا کہ گنگولی چوہدری کا پس منظر بھی کچھ ایسا ہی ہوگا۔ وہ بھی کسی جگو چاچا کے فریب کا شکار ہوا ہوگا یا کسی ٹھاکر کے ستم کا شکار ہوا ہوگا۔ یہاں نہ تو جگو دَس اور ٹھاکروں کی کمی تھی اور نہ ہی نارائنوں اور گنگولیوں کا قال تھا۔

میں یہی سب کچھ سوچتا ہوا نارائن کے ساتھ چلتا رہا۔ نارائن نے حسب معمول بیگ کندھے پر لٹکا رکھا تھا۔ میں نے ایک بار پھر یہ پیشکش کی تھی کہ تھوڑی دیر کے لیے میں اس کا یہ بوجھ اٹھالوں مگر اس نے اس مرتبہ بھی ہنس کر ٹال دیا تھا۔

ہمیں وہاں سے روانہ ہوئے دو گھنٹے ہو چکے تھے۔ ناشتے کا تو تصور ہی نہیں تھا البتہ چلنے سے پہلے خوب سیر ہو کر چشمے کا ٹھنڈا اور میٹھا پانی پیا تھا۔ اس کے بعد کہیں پانی بھی نہیں ملا تھا۔ اونچے نیچے راستوں پر چلتے ہوئے پیٹ میں ایندھن ہونے لگی۔ نارائن بیڑی پہ بیڑی پھونکے جا رہا تھا۔ جانے بیڑی کے دھوئیں سے بھوک کے احساس کو مٹانا چاہتا تھا۔

نارائن کی طرح چلتے ہوئے میری نظریں بھی ادھر ادھر بھٹک رہی تھیں۔ شاید کوئی پھل دار درخت نظر آجائے۔ ناریل کے کئی درخت نظر آئے تھے۔ ان پر پھل بھی لگا ہوا تھا مگر چڑھنے اور سیدھے تنے پر چالیس پچاس فٹ کی بلندی پر چڑھنا شاید ہم دونوں میں سے کسی کے بس میں نہیں تھا۔

راستے میں گھرونڈے کی جھاڑیاں بھی بکثرت تھیں۔ خوش نما گلابی پھل سے لدی ہوئی شاخیں جھکی جا رہی تھیں۔ میں نے ایک پودے سے چند گھرونڈے توڑ لیے تھے لیکن ایک دانہ منہ میں رکھتے ہی اسے تھوک دینا پڑا۔ ترشی اس قدر تھی کہ نہ تو میری زبان اسے برداشت کر سکتی تھی اور نہ ہی حلق قبول کر سکتا تھا۔

بالآخر ہم ایک اور جگہ پر رک گئے۔ یہاں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر چند ایسے درخت نظر آئے جن پر پیلے پیلے پھل نظر آئے۔ درختوں کی شاخیں پھل کے بوجھ سے جھکی ہوئی تھیں۔ میں نے اس قسم کا پھل بے شمار جگہ پر میں کھیلتے ہوئے بھی دیکھا تھا۔

نارائن نے بیگ زمین پر رکھ دیا اور پھل سے لدی ہوئی ایک شاخ کو پکڑ کر زور زور سے جھٹکنے لگا۔ پکے ہوئے پھل ٹوٹ کر گرنے لگے۔ یوں لگا جیسے پھلوں کی بارش ہو رہی ہو۔

"یہ پھل تم جتنے بھی چاہو کھالو تمہیں کوئی آفیسر نہیں ہوگی۔" نارائن نے گھاس پر گرے ہوئے پھل سمیٹتے ہوئے کہا۔

میں بھی بیر جیسے پھل جمع کرنے لگا۔ ایک دانہ منہ میں رکھا تو یوں لگا جیسے شہد کا چمچہ منہ میں ڈال لیا ہو۔ شہد کی طرح ہی میٹھا تھا یہ پھل۔ ہم بڑے اطمینان سے بیٹھے ان پھلوں سے پیٹ کی آگ بجھا رہے تھے کہ فضا فائرنگ کی آواز سے گونج اٹھی۔

ہم دونوں اچھل پڑے۔ یکے بعد دیگرے دو فائر ہوئے تھے اور اس کے ساتھ ہی شیر یا چیتے کی دہاڑ جیسی آواز سنائی دی تھی۔ فائر اور دہاڑ کی آوازیں زیادہ دور کی نہیں تھیں۔ میرے اندازے کے مطابق فاصلہ پچاس اور سو گز کے درمیان رہا ہوگا۔

نارائن نے وحشت زدہ سی نظروں سے چاروں طرف دیکھا اور اپنا بیگ اٹھا کر چوڑے پتوں والی گنجان جھاڑیوں کی طرف دوڑ لگا دی۔ میں نے بھی اس کے پیچھے ہی چھلانگ لگا دی تھی۔

ہم چوڑے پتوں والی جھاڑیوں میں اندر تک چلے گئے۔ جھاڑیاں اس قدر گنجان تھیں کہ اگر کوئی شخص چار فٹ کے فاصلے پر ہمارے سامنے سے بھی گزرتا تو ہمیں نہیں دیکھ سکتا تھا۔

صرف دو گولیاں چلی تھیں اور شیر یا چیتے کی دہاڑ سنائی دی تھی۔ گولیوں کی گونج کی آواز تو جلد ہی معدوم ہو گئی لیکن لاتعداد پرندوں کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ اور ان کے چیخنے کی آوازیں دیر تک گونجتی رہیں اور بالآخر جنگل کی فضا معمول پر آگئی۔

"کون ہو سکتا ہے؟" میں نے نارائن کی طرف دیکھتے ہوئے سرگوشی کی "گنگولی چوہدری یا۔۔۔"

"یہ گنگولی چوہدری یا اس کے آدمی نہیں ہو سکتے۔" نارائن نے میری بات کاٹ دی "گنگولی چوہدری ایسی بگھوں پر نہیں رکتا۔ نہ ہی وہ اس طرح جانوروں پر گولیاں ضائع کرتا ہے۔ ہو سکتا ہے شکاریوں کی کوئی پارٹی اس طرف موجود ہو۔ بہرحال، اب ہمیں زیادہ محتاط رہنا پڑے گا۔ اب تم بھگوان سے یہ پرارتھنا (دعا) کرو کہ یہ کم بخت یہاں سے آگے نہ جائیں۔ ورنہ ہو سکتا ہے کہ گنگولی چوہدری اپنا وہ ٹھکانا بھی چھوڑ کر کسی اور طرف نکل جائے۔"

ہم تقریباً آدھے گھنٹے تک ان جھاڑیوں میں دبکے رہے اور جب کوئی مشتبہ آواز سنائی نہیں دی تو ہم آگے چل پڑے۔ میں نے ایک بار پھر اپنا ریوالور جیب سے نکال کر ہاتھ میں لے لیا تھا۔ پیٹ کی آگ بھی بجھ گئی تھی اور ہم تازہ دم ہو کر تیزی سے چل رہے تھے تاہم کسی جگہ بھی ہم نے قد آدم پودوں یا جھاڑیوں سے نکلنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

جنگل بہت گنجان اور راستے اونچے نیچے تھے۔ چلنے میں خاصی دشواری پیش آرہی تھی۔ ہم مسلسل بلندی کی طرف جا رہے تھے۔

دوپہر کے وقت ہم پھر ایک جگہ رک گئے۔ یہاں بھی ہمیں وہ پھل مل گئے اور شفاف پانی کی ندی بھی تھی۔ نارائن نے کہا تھا کہ ہم گنگولی کے ڈیرے پر آٹھ گھنٹوں میں پہنچیں گے۔ ہم صبح منہ اندھیرے ہی چل پڑے تھے۔ ہمیں سفر کرتے ہوئے آٹھ گھنٹوں سے زیادہ وقت گزر چکا تھا مگر گنگولی کے ڈیرے کے کہیں آثار دکھائی نہیں دے رہے تھے۔

ہم مزید آگے چلتے رہے۔ فائرنگ کی اس آواز کے بعد سے نجانے مجھے بار بار یہ احساس کیوں ہو رہا تھا کہ کوئی ہمارا پیچھا کر رہا ہے۔ میں نے کئی مرتبہ مڑ کر دیکھا تھا مگر کوئی دکھائی نہیں دیا تھا۔ نارائن بھی کئی مرتبہ چونکا تھا اور پھر نارائن نے یہ بتا کر مجھے مزید خوف زدہ کر دیا کہ شیر یا چیتا بعض اوقات اپنے شکار کا میلوں دور تک پیچھا کرتا ہے۔ کسی انسان کے اچانک حملے سے بھی بچا جا سکتا ہے لیکن شیر یا چیتا جب گھات لگا کر حملہ آور ہوتا ہے تو اس سے بچ جانا ممکن نہیں ہوتا۔

مزید دو گھنٹے چلنے کے بعد درخت کچھ چھدرے ہونے لگے۔ سامنے بہت دور چھوٹی چھوٹی چٹانیں بھی دکھائی دینے لگیں اور میرا خیال تھا کہ ہم ایک گھنٹے سے پہلے ان چٹانوں تک نہیں پہنچ سکتے تھے۔

پودے اور جھاڑیاں اب بھی گنجان تھیں۔ ایک جگہ ہم جیسے ہی پودوں سے باہر نکلے، اپنے پیچھے "دھب" کی زوردار آواز سن کر ہم دونوں اچھل پڑے۔ میں تیزی سے پیچھے مڑا اور اس کے ساتھ ہی مجھے سینے میں اپنا سانس رکتا ہوا محسوس ہوا۔

وہ انسان ہرگز نہیں کہلا سکتا تھا لیکن بہرحال انسان تھا۔ کئی روز کا بڑھا ہوا شیو، بے تحاشا بڑھے اور بکھرے ہوئے بال، میلی پتلون اور بغیر آستین کی قمیص جس کے بٹن کھلے ہوئے تھے اور سینہ بھی ریچھ کی طرح بالوں سے بھرا ہوا تھا۔ ابھرے ہوئے رخسار، چھوٹی چھوٹی سرخ آنکھیں اور پیلے دانت۔ مجھے وہ ریچھ یاد آگیا جو میری گولیوں سے زخمی ہو کر بھاگ گیا تھا۔ وہ وحشی تھا جس کے ہاتھوں میں آٹومیٹک رائفل بھی تھی۔

اس وقت ریوالور میری جیب میں تھا اور میں نے جیسے ہی جیب کی طرف ہاتھ بڑھایا، اس نے مجھ سے بھی زیادہ پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے رائفل کا ٹریگر دبا دیا۔ گولی میرے پیروں کے قریب لگی۔

"ہی ہی ہی۔۔۔" وہ ہنسا تو اس کے پیلے دانت کچھ اور بھی نمایاں ہو گئے "اوپر۔۔۔" اس نے رائفل سے اشارہ کیا "دونوں ہاتھ سر سے اوپر۔۔۔ ورنہ تم اوپر پہنچ جاؤ گے۔ ہی ہی ہی۔۔۔"

میں نے نارائن کی طرف دیکھا۔ وہ پہلے ہی دونوں ہاتھ گردن پر رکھ چکا تھا۔ میں نے دونوں ہاتھ سر سے اوپر اٹھا لیے اور اس حیوان نما انسان کی طرف دیکھنے لگا جو غلیظ دانت نکالے اب بھی "ہی ہی" کر رہا تھا۔ میرا اور اس کا درمیانی فاصلہ بیس فٹ کے قریب تھا۔ اس پر قابو پانے کا کوئی چانس نہیں تھا اگر میں کوشش بھی کرتا تو وہ مجھے اپنے تک پہنچنے سے پہلے ہی چھلنی کر دیتا۔

اس نے ایک ہاتھ کی دو انگلیاں منہ میں ڈال کر سیٹی

بچائی۔ دو آدمی دائیں بائیں قد آدم پودوں سے نکل کر سامنے آگئے۔ ان دونوں کے ہاتھوں میں بھی آٹومیٹک رائفلیں تھیں اور ان کے حلیے بھی اس سے مختلف نہیں تھے۔

اب تو بچاؤ کی امید بالکل ہی ختم ہوگئی تھی۔ میں نے ایک بار پھر نارائن کی طرف دیکھا۔

"یہ گنگولی چوہدری کے آدمی ہیں۔ کوئی گڑبڑ مت کرنا ورنہ مارے جاؤ گے۔" نارائن نے سرگوشی کی۔

میں اس انکشاف پر اچھل پڑا۔ ڈاکوؤں کے بارے میں' میں نے جو تصور قائم کیا تھا یہ تینوں حیوان نما انسان اس سے بالکل مختلف ثابت ہوئے تھے۔ کئی انڈین فلموں میں بھی ڈاکوؤں کو دیکھا تھا۔ کالے کپڑے' گم بوٹ قسم کے جوتے' سینے پر کراس کرتے ہوئے گولیوں سے بھرے ہوئے بیلٹ۔ کمر پر بھی چوڑے بیلٹ جن میں گولیاں بھری ہوتیں۔ باقاعدگی سے شیو بنانے والے لیکن مونچھیں بڑی خوفناک۔ بعض ڈاکو تو کلین شیو بھی ہوتے تھے لیکن ان کے چہروں پر بھی بڑا رعب ہوتا تھا اور یہ۔۔۔ یہ تو ان سے بالکل مختلف تھے۔ لگتا تھا کسی پاگل خانے سے بھاگ کر آئے ہوں اور پکڑے جانے کے خوف سے عرصے سے اس جنگل میں چھپے حیوانوں جیسی زندگی گزار رہے ہوں۔ وہ حیوان ہی تھے اور ان کے چہرے بڑے خطرناک تھے۔

وہ تینوں ہمارے گرد گھیرا تنگ کرنے لگے پھر تقریباً پانچ قدم کے فاصلے پر رک گئے۔ ان کی رائفلیں ہماری طرف اٹھی ہوئی تھیں۔ وہ پہلا حیوان نما انسان جس نے سب سے پہلے درخت سے چھلانگ لگا کر ہمیں رائفل کی زد پر لیا تھا' اس نے اپنے ایک ساتھی کو اشارہ کیا۔ اس نے آگے بڑھ کر پہلے میرا ریوالور جیب سے نکال لیا اور پھر نارائن کو بھی اس کے پستول سے محروم کرکے اس کا بیگ بھی اپنے قبضے میں لے لیا۔ وہ بیگ کو دونوں ہاتھوں میں تولتے ہوئے "کھی کھی" کرتے ہوئے پہلے اور غلیظ دانتوں کی نمائش کرنے لگا۔

"چوہدری کھس ہوجاوے گا۔" وہ نارائن کی طرف دیکھتے ہوئے بولا "انعام دیوے گا تمارے کو۔ چل آگے لگ۔۔۔ حرامی۔۔۔ سالا۔۔۔"

اس نے نارائن کے کولھے پر زوردار لات رسید کردی۔ نارائن لڑکھڑا گیا۔ وہ گرتے گرتے بچا تھا۔ دوسرا وحشی میری طرف بڑھا۔ وہ شاید مجھے بھی لات رسید کرنا چاہتا تھا لیکن میں اس سے پہلے ہی آگے بڑھ گیا۔

تقریباً چالیس منٹ بعد ہم ان چٹانوں کے قریب پہنچ گئے۔ چٹانوں کی طرف درخت چھدرے تھے جبکہ چند گز کے فاصلے پر درخت بھی گنجان تھے اور جھاڑیاں بھی۔ اس طرف چٹانوں کی طرح بڑے بڑے پتھر نظر آرہے تھے اور ان پتھروں کے بیچ میں ندیاں تھیں جن میں شفاف پانی بہہ رہا تھا۔ ایک طرف قدرے گہرائی میں بہت بڑا تالاب سا تھا۔ دو ندیوں کا پانی اس تالاب میں گر رہا تھا جبکہ ایک کم چوڑی ندی اس کے قریب سے گزرتی ہوئی نشیب کی طرف گئے جنگل میں گم ہوگئی تھی۔

ہم گنجان درختوں سے نکل کر جیسے ہی کھلی جگہ پر آئے مجھے وہ لوگ نظر آگئے جو چٹان کے دامن میں ادھر ادھر بکھرے ہوئے تھے۔ ہر شخص محتاط تھا اور ہر ایک کے ہاتھ میں آٹومیٹک رائفل نظر آرہی تھی۔ ان میں چوہدری کا چمڑا بھی تھا۔

میں متجسس نظروں سے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا اور پھر وہ نظر آگئی۔ بہلا ایک درخت کے تنے سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ اس نے سر گھٹنوں میں دے رکھا تھا۔ میں نے اس کا چہرہ نہیں دیکھا تھا۔ اسے لباس سے پہچانا تھا۔ وحشیوں کے قبیلے میں وہی ایک انسان نظر آرہی تھی۔

ایک آدمی اپنے ساتھیوں سے بالکل الگ تھلگ بیٹھا ہوا تھا۔ اس کا قد چھ فٹ کے لگ بھگ رہا ہوگا۔ کسرتی بدن' مضبوط ہاتھ پیر' چہرہ کسی قدر لمبا' دو تین دن کا شیو بڑھا ہوا تھا۔ ٹوتھ برش ٹائپ کی مونچھیں۔ سر کے بال گردن پر لمبے تھے اور پیشانی پر بھی کچھ بال اس طرح گرے ہوئے تھے کہ اس کی بائیں آنکھ کسی قدر چھپ کر رہ گئی تھی۔ اس نے نیلی جینز اور ڈینم کی بغیر آستین کی جیکٹ پہن رکھی تھی۔ اس کے بٹن کھلے ہوئے تھے۔ اس کے سینے پر بھی ریچھ کی طرح سیاہ بال تھے۔ ایک خنجر اس کی پتلون کے بیلٹ میں اڑسا ہوا تھا اور قریب ہی زمین پر آٹومیٹک رائفل پڑی تھی۔

"یہ گنگولی چوہدری ہے۔" نارائن نے میری طرف جھکتے ہوئے سرگوشی کی۔

نجانے کیا بات تھی کہ گنگولی چوہدری کو دیکھ کر میرا دل کی دھڑکن تیز ہوگئی۔ اگر وہ بہتر حلیے اور ڈھنگ کے کپڑے میں ہوتا تو پروقار اور شان دار شخصیت کا مالک ہوتا لیکن ڈاکو تھا اور ایک ڈاکو کو یہی حلیہ سجتا تھا۔

آوازیں سن کر بہلا نے جھکا ہوا سر اٹھایا۔ اس کے چہرے پر بے پناہ کرب تھا اور یہ کرب دیکھ کر میرا دل ایک دھڑک اٹھا۔ بہلا نے مجھے دیکھ لیا۔ اسے شاید اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔ چہرے پر کرب کے بجائے کچھ عجیب تاثرات پھیل گئے۔ اس نے اپنی ایک انگلی دانتوں میں

دبالی اور جیسے اسے یقین ہوگیا کہ وہ کوئی خواب نہیں دیکھ رہی تو وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر چیختی ہوئی میری طرف دوڑی۔ اس نے دونوں بانہیں آگے کو پھیلا رکھی تھیں لیکن میرے قریب پہنچنے سے پہلے ہی ایک وحشی نے لپک کر اسے پکڑ لیا۔

میں نے اپنی جگہ سے حرکت کرنے کی کوشش کی مگر میرے ساتھ آنے والوں میں سے ایک نے رائفل کی نال میرے سینے پر رکھ دی اور بھیڑیے کی طرح غرایا۔

"اپنی جگہ پر کھڑا رہ مورکھ (احمق)۔ حرکت کی تو تیرے شریر (بدن) میں درجنوں سوراخ بنادوں گا۔"

میں بے حس و حرکت ہوکر رہ گیا۔ اس شخص نے بہلا کو پکڑ رکھا تھا اور بہلا اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش بازو سے کر رہی تھی۔ ایک نازک سی لڑکی کے لیے اپنے آپ کو کسی وحشی سے چھڑانا آسان نہیں تھا۔ اس وحشی نے بہلا کو پوری طرح اپنی بانہوں کی لپیٹ میں لے لیا۔ وہ اس موقع سے کچھ اور فائدہ اٹھانے کی کوشش بھی کر رہا تھا۔ اس نے بہلا کو اپنے سینے کے ساتھ بھینچ رکھا تھا اور اس کے چہرے پر بوسہ دینے کی کوشش کر رہا تھا۔ بہلا اپنے آپ کو چھڑانے کی بھرپور کوشش کر رہی تھی۔

"لونڈیا کو چھوڑ دے رامو۔" گنگولی چوہدری نے اس وحشی کو پکارتے ہوئے کہا۔ اس کی آواز قدرے بلند اور لہجہ پرسکون تھا۔

مگر اس وحشی نے بہلا کو نہیں چھوڑا۔ اسے سینے سے لگائے اٹھا کر اس درخت کے نیچے لے گیا جہاں کچھ دیر پہلے بہلا بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے بہلا کو نیچے گرا دیا اور اس کی قمیص کے گریبان پر ہاتھ ڈال کر زوردار جھٹکا دیا۔ قمیص کے اوپر والے دو بٹن ٹوٹ گئے۔

رامو پر شیطان سوار تھا۔ وہ بھیڑیے کی طرح بہلا کو نوچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ دو آدمی دوڑ کر قریب پہنچ گئے۔ انہوں نے بڑی مشکل سے رامو کو بہلا سے الگ کیا اور اسے چوہدری کے سامنے لے آئے۔

چوہدری چند لمحے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ اس کی آنکھوں میں بڑی وحشیانہ سی چمک ابھر آئی تھی اور پھر اس کے جسم میں اچانک ہی حرکت پیدا ہوئی۔ اس نے بڑی پھرتی سے قریب پڑی ہوئی رائفل اٹھا کر ٹریگر دبا دیا۔

فضا فائر اور رامو کی خوفناک چیخ کی آواز سے گونج اٹھی۔ گولی اس کے سینے میں ٹھک دل کے مقام پر لگی تھی۔ خون کا فوارہ چھوٹا اور رامو زمین پر گر کر تڑپنے لگا۔

رامو کے دائیں بائیں کھڑے ہوئے اس کے دونوں ساتھی وحشت زدہ نظروں سے کبھی چوہدری کو اور کبھی رامو کی لاش کو دیکھ رہے تھے۔ چوہدری نے رائفل پھر اپنے قریب زمین پر رکھ دی تھی۔

چمڑا اور اس کے دوسرے ساتھی بھی وحشت زدہ سے ہوگئے تھے۔ بہلا کی آنکھیں خوف سے پھٹی پڑ رہی تھیں۔ وہ ایک بار پھر بدحواس ہوکر میری طرف دوڑی۔ اس مرتبہ کسی نے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی۔ بہلا دوڑتی ہوئی میرے سینے سے لپٹ گئی۔ اس نے مجھے اپنی بانہوں میں بھینچ لیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ میں ہولے ہولے اس کا کاندھا تھپتھپاتے ہوئے کبھی رامو کی لاش اور کبھی گنگولی چوہدری کی طرف دیکھ رہا تھا جو اب پہلے کی طرح بالکل پرسکون بیٹھا ہوا تھا۔

"یہ کیا کیا تم نے چوہدری!" میرے دائیں طرف کھڑے ہوئے آدمی نے آگے بڑھتے ہوئے کہا "تم نے رامو کو مار دیا۔ اس کی بیتا کردی۔"

"جو ہمارا کہت نہ مانے ہے اس کا یہی انجام ہووے گا۔ اس کی لاش اٹھا کر ادھر دور پھینک دو۔ بھیڑیے کھاویں گے اس کا ماس۔" چوہدری نے ایک طرف اشارہ کیا "سالا حرامی۔ چوہدری کے مال پر ہاتھ ڈالے ہے۔"

کسی نے مزید جرح کرنے کی جرات نہیں کی۔ دو آدمی رامو کی لاش اٹھا کر ڈنڈا ڈولی کرتے ہوئے درختوں کی طرف لے گئے۔

"کروشا۔" چوہدری چٹان کی طرف رخ کرکے چیخا۔

اس کی آواز کی بازگشت ختم نہیں ہوئی تھی کہ چٹان کے غار سے ایک عورت برآمد ہوئی۔ وہ باقاعدہ غار نہیں تھا۔ کھوہ سی بنی ہوئی تھی۔ ایک بہت بڑا چٹانی پتھر سائبان کی طرح آگے کو نکلا ہوا تھا۔ وہ عورت وہاں بیٹھی یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی۔

میں اس عورت کو دیکھ کر پلکیں جھپکنا بھول گیا۔ چھ فٹ کے قریب قد' سڈول جسم' ہرنی جیسی موٹی موٹی سیاہ آنکھیں' چہرے کے نقوش بے حد جاذب نظر' شہد کی رنگت کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ اس نے گھٹنوں سے بہت اوپر تک کی نیکر اور بلاؤز پہن رکھا تھا۔ اسے شاید بلاؤز بھی نہیں کہا جاسکتا تھا۔ کپڑے کا پندرہ انچ چوڑا ٹکڑا تھا جو سینے پر لپٹا ہوا تھا لیکن پوری طرح پردہ پوشی نہیں کر پا رہا تھا۔ اس کے گلے میں سونے کی چین تھی جس میں لگا ہوا لاکٹ سینے کے گداز بھاروں کے عین وسط میں ٹکا ہوا تھا۔ ایک کان میں بُندا تھا اور دوسرے میں چوڑی کی طرح کا طلائی بالا۔

اس کی عمر تیس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ اس کی رنگت پہلے ضرور گوری چٹی رہی ہوگی لیکن دھوپ اور کھلی فضا میں رہنے سے جلد تانبے جیسی رنگت اختیار کرگئی تھی۔ اگر وہ جنگل میں اس حلیے میں نہ ہوتی۔ ڈھنگ کا لباس پہنا ہوتا اور ہلکا سا میک اپ ہوتا تو اسے ملکہ حسن قرار دیا جاسکتا تھا۔

گنگولی چوہدری کو مزید کچھ کہنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ کروشا نے قریب آکر بملا کو زبردستی مجھ سے الگ کیا اور اسے تقریباً کھینچتی ہوئی ایک طرف لے گئی۔ بملا مڑ مڑ کر میری طرف دیکھ رہی تھی۔

میرے ساتھ آنے والے تینوں آدمی اب بھی اپنی جگہوں پر کھڑے تھے۔ دو نے رائفلیں تان رکھی تھیں اور تیسرا ابھی تک نارائن سے چھینا ہوا بیگ اٹھائے کھڑا تھا اور پھر اس نے آگے بڑھ کر وہ بیگ چوہدری کے سامنے رکھ دیا۔ چوہدری نے بیگ کی زپ کھول کر اس میں جھانکا پھر اسے اٹھا کر زمین پر پلٹ دیا۔

میں اچھل پڑا۔ اب یہ بات میری سمجھ میں آگئی تھی کہ نارائن پولیس کے اتنے کڑے پہرے کے باوجود جنگل میں کیوں آنا چاہتا تھا اور راستے بھر اس نے مجھے اس بیگ کو ہاتھ کیوں نہیں لگانے دیا تھا۔ اس میں رائفل کی گولیاں بھری ہوئی تھیں جو اب ایک ڈھیر کی صورت میں چوہدری کے سامنے پڑی تھیں اور میرے اندازے کے مطابق ان گولیوں کی تعداد پانچ سو سے کم نہیں تھی۔

"دوسرا مال کہاں ہے؟" چوہدری نے گولیوں کے ڈھیر سے نظریں ہٹا کر نارائن کی طرف دیکھا۔

"گیسٹ ہاؤس اور ہٹوں سے یاتریوں کے اغوا کی وارداتوں کے بعد شہر میں ہنگامہ مچا ہوا ہے۔ میرے وہ بندے پکڑے جانے کے خوف سے غائب ہوگئے ہیں جن سے میں مال لیا کرتا تھا۔ دوسرا مال نہیں ملا۔ شہر میں اور جنگل کے آس پاس پولیس کا پہرا بھی بہت کڑا ہے۔ بڑی مشکل سے یہی مال لے کر آیا ہوں۔ چند روز بعد دوسرا مال بھی پہنچا دوں گا۔"

"زندہ رہے گا تب نا۔" چوہدری نے کہا پھر میری طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا "کون ہے یہ؟ ساتھ کیوں لایا ہے اسے؟"

"وہ چھوکری اسی کی ہے چوہدری۔" نارائن نے جواب دیا "بڑا بیاکل ہورہا تھا۔ میں اسے ساتھ لے آیا ہوں۔ چھوکری اسے واپس کردو چوہدری۔"

"ابے سالے حرامی۔" چوہدری نے رائفل پر ہاتھ رکھ دیا "تیری یہ ہمت۔ چوہدری کو شکشا (مشورہ) دیتا ہے تو۔۔۔"

"غلطی ہوگئی چوہدری۔ معاف کردو۔" نارائن نے دم ہاتھ جوڑ دیے۔ چہرہ ایک دم دھواں ہوگیا۔ راموکو وہ دیکھ چکا تھا۔

چوہدری نے رائفل سے ہاتھ ہٹالیا اور میری دیکھنے لگا۔ میں نے بھی نظریں اس کے چہرے پر مرکوز کھیں۔

"وہ چھوکری کیا لگتی ہے تیری؟" چوہدری نے کے لہجے میں ہلکی سی غراہٹ تھی "جورو ہے یا بہن تیری؟"

"دیکھو چوہدری۔" میں نے اس کے چہرے سے نظر ہٹائے بغیر پرسکون لہجے میں جواب دیا "وہ لڑکی میری لگتی ہو میں اسے لینے کے لیے آیا ہوں اور لے کر جاؤں میں اس کے لیے ڈنڈ دینے کو تیار ہوں۔ بولو کیا مانگتے ہو؟"

"کیا ہے تیرے پلے۔ کیا دے سکتا ہے تو؟" اس مجھے گھورا۔

"کیا مانگتے ہو؟" میں نے جواب میں پوچھا۔

"میری بات سن!" چوہدری بولا "گنگولی چوہدری کو پسند آجاتی ہے نا وہ اس پر قبضہ کرلیتا ہے اور اس کا سوا کرتا۔ وہ چھوکری اپن کو پسند آگئی ہے۔ اسے یہاں سے نہیں لے جاسکتا۔ میں تیرے کو اتنی چھوٹ دیتا ہوں کہ کی رات یہاں ہمارا مہمان بن کے رہ اور اس چھوکری بات بھی کرلے۔ پر سویرا ہوتے ہی یہاں سے چلے جا پہلے آدمی ہو جسے میں زندہ واپس جانے کی اجازت دے ہوں۔ پر ایک بات یاد رکھنا۔ اگر تم نے رات کو کوئی شرا کرنے کی کوشش کی تو تجھے بھی راموکے پاس پہنچادوں گا۔"

میں کافی دیر تک گنگولی چوہدری سے بحث کرتا رہا وہ کسی طرح بملا سے دستبردار ہونے کو تیار نہیں تھا۔

"باسٹرڈ۔" میرے منہ سے بے اختیار گالی نکل گئی آف اے بچ۔"

"اے!" گنگولی چوہدری ایک دم بھڑک اٹھا۔ اس رائفل اٹھا کر ٹریگر دبا دیا۔ کئی گولیاں میرے پیروں کے پاس زمین پر لگیں پھر دو تین گولیاں میرے سر کے اوپر گزر گئیں۔ میں دہشت زدہ سا ہوگیا۔ میرے دل کی دھڑ خطرناک حد تک تیز ہوگئی تھی۔

"میں اگر چاہتا تو یہ ساری گولیاں تمہارے جسم کے پار ہوسکتی تھیں مگر نجانے کیوں مجھے تم پر ترس آرہا ہے

سمجھ لو کہ اس مرتبہ میں نے تمہیں پنڈت کی اس چھوکری کے صدقے میں زندہ چھوڑ دیا ہے لیکن اب اگر تم نے گالی دی تو تمہارے بدن میں اتنے سوراخ کردوں گا کہ گن بھی نہیں جائیں گے۔"

گنگولی چوہدری نے یہ ساری باتیں انگریزی میں بڑی روانی سے کی تھیں۔

دہشت اپنی جگہ مگر اس وقت تو چوہدری کو اس قدر روانی سے انگریزی بولتے سن کر میری آنکھیں حیرت سے پھٹی جارہی تھیں۔

"انگریزی میں گالی دیتا ہے سالا حرامی۔" وہ رائفل زمین پر رکھتے ہوئے بولا "انگریزی میں ماسٹرز کی ڈگری لی ہے میں نے دلی کی نمبر یونیورسٹی سے۔ چل ہٹ سامنے سے اور اب اپنی زبان پر قابو رکھنا۔"

میرے دماغ میں دھماکے سے ہو رہے تھے۔ وہ ڈاکو تھا۔ میں اسے بھی جے پور کے رامو، جو ٹھاکر کے ہاتھوں مارا گیا تھا، بھگت اور انہی جیسے دوسرے بدمعاشوں کی طرح سمجھا تھا جو غنڈہ گردی کرتے کرتے ڈاکو بن گیا تھا۔ جہالت تو زندگی کو اندھیروں میں دھکیل ہی دیتی ہے لیکن ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ شخص اور اس کا کردار اتنا خوفناک... میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

"ابے میرا فوٹو کیا دیکھ رہا ہے کھڑے کھڑے۔" وہ میری طرف دیکھ کر غرایا "چل ہٹ سامنے سے۔ ادھر جا کے بیٹھ جا ورنہ تیرا فوٹو بگاڑ دوں گا۔"

اس وقت میں نے اڑی (ضد) کرنا مناسب نہیں سمجھا اور اس درخت کی طرف چل پڑا جہاں بملا کروشا کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی۔ فائرنگ کی آواز سن کر وہ بھی دہشت زدہ سی ہوگئی تھی لیکن مجھے زندہ دیکھ کر اس کے چہرے پر طمانیت سی آگئی۔

گنگولی چوہدری کے آدمی حیرت سے کبھی اسے اور کبھی مجھے دیکھ رہے تھے۔ انہیں یقیناً اس بات پر حیرت تھی کہ اس کے ایک وفادار ساتھی نے اس کی حکم عدولی کی تھی تو چوہدری نے اسے موت کے گھاٹ اتار دیا تھا اور میں نے چوہدری کو حرامی اور کتیا کا بچہ کہا تھا مگر اس نے مجھے زندہ چھوڑ دیا تھا۔

میں قریب پہنچا تو بملا اٹھ کر مجھ سے لپٹ گئی۔ کروشا نے ہماری طرف دیکھا۔ میں نے اس کے ہونٹوں پر بہت خفیف سی مسکراہٹ دیکھی اور پھر وہ مڑ کر دوسری طرف چلی گئی۔

بملا دیر تک میرے سینے سے لپٹی سسکیاں بھرتی رہی پھر درخت کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا۔ دو آدمی مختلف جگہوں پر رائفلیں لیے ہماری نگرانی کے لیے کھڑے تھے۔ نارائن چوہدری کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ اس سے باتیں کرتے ہوئے گنگولی چوہدری کے چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے کہ وہ نارائن سے خوش نہیں تھا۔ اب میں نارائن کی اصلیت جان چکا تھا۔ وہ گنگولی چوہدری کا انفارمر تھا اور اسے نہ صرف اطلاعات فراہم کرتا تھا بلکہ انہیں ایمونیشن بھی سپلائی کرتا تھا۔

گنگولی چوہدری کے آدمی ادھر ادھر بکھرے ہوئے تھے۔ ہر شخص اپنی جگہ محتاط نظر آرہا تھا۔

میں بملا سے دھیمے لہجے میں باتیں کرتا رہا۔ وہ ابھی تک گنگولی چوہدری کے شر سے محفوظ تھی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ گنگولی کے کسی آدمی نے اسے اس طرح دبوچا تھا اور گنگولی نے اسے گولی سے اڑا دیا تھا۔

بملا کے کہنے کے مطابق وہ کروشا تھی جس نے اب تک بملا کو چوہدری سے بچائے رکھا تھا۔ کروشا کو اس سے ہمدردی تھی۔ اس ہمدردی کی وجہ عورت ہونا تھی یا کچھ اور۔۔۔ لیکن بہرحال میں بھی بملا کے ساتھ کروشا کا شکر گزار تھا۔

سورج مغرب کی طرف جھک رہا تھا۔ چٹان کے قریب ہی پتھروں سے ایک چولھا بنا ہوا تھا۔ ایک آدمی نے خشک لکڑیاں چولھے کے پاس ڈھیر کردیں اور چند لکڑیاں چولھے میں جھونک کر آگ جلانے لگا۔

کروشا نے رات کے کھانے کی تیاری شروع کردی۔ گنگولی چوہدری کا یہ گروہ خانہ بدوشوں کی طرح ضرورت کا سامان ساتھ لے کر چلتا تھا۔ ان کے پاس کھانے پینے کی ہر چیز موجود تھی۔ کسی چیز کی ضرورت ہوتی تو یہ لوگ بھیس بدل کر کسی نہ کسی آبادی میں چلے جاتے۔ ویسے ان کی سیوا کے لیے نارائن جیسے لوگوں کی کمی نہیں تھی۔ نارائن اس جنگل میں انہیں ایمونیشن سپلائی کرتا تھا تو کوئی اور انہیں راشن کی چیزیں بھی فراہم کرتا ہوگا۔

کروشا نے لکڑیاں لانے والے اسی آدمی سے کچھ کہا۔ اس نے چولھے کے قریب ہی پتھر جما کر ایک اور قدرے چھوٹا چولھا تیار کرکے اس میں بھی آگ جلا دی۔ اس شخص نے ضرورت کی ہر چیز چولھوں کے قریب جمع کردی تھی۔ برتنوں کے علاوہ پانی کا کنستر بھی بھر کر رکھ دیا تھا۔

کروشا ایک بڑی سی سینی میں چاول چن رہی تھی اور پھر تھوڑی ہی دیر بعد اس نے ایک بڑے سے پتیلے میں چاول چولھے پر چڑھا دیے۔ پتیلا باہر سے بے حد کالا ہو رہا تھا۔ دوسرے چولھے پر اس نے ایک پتیلے میں دال چڑھا دی۔

ایک گھنٹے میں کھانا تیار ہوگیا۔ تمام لٹیرے پلیٹوں میں دال چاول لے کر اپنی جگہوں پر بیٹھ گئے۔ میرے اور بلا کے سامنے بھی ایک بڑی پلیٹ رکھ دی گئی تھی۔ دال چاول کھاتے ہوئے واقعی مزہ آگیا۔

سورج غروب ہوتے ہی تین چار مشعلیں جلا کر مختلف جگہوں پر رکھ دی گئیں۔ دو آدمی بدستور رائفلیں تانے میری اور بلا کی نگرانی کررہے تھے۔ نارائن الگ تھلگ بیٹھا ہوا بیڑی کے کش لگا رہا تھا۔ گنگولی چوہدری بھی اپنے مخصوص انداز میں ایک طرف بیٹھا ہوا تھا۔ کروشا ایک آدمی کے ساتھ چشمے پر برتن دھونے گئی ہوئی تھی۔ اس کی واپسی تقریباً بیس منٹ بعد ہوئی تھی۔

ایک آدمی نے ایک راجستھانی گیت گانا شروع کردیا اور دوسرا تھالی کے ڈھکنے پر تال دینے لگا۔ جنگل میں منگل کا سماں تھا۔ اگر حالات معمول پر ہوتے اور ہم پکنک منانے کے لیے آئے ہوتے تو ہم اس صورت حال سے ضرور لطف اندوز ہوتے لیکن یہاں صورت حال مختلف ہی نہیں، سنگین بھی تھی۔

میں خاموش بیٹھا فرار کے امکانات کا جائزہ لے رہا تھا۔ رات میں کسی وقت ایسا کوئی موقع مل تو سکتا تھا۔ میرے پاس اپنی اور بلا کی حفاظت کے لیے وہ خنجر بھی موجود تھا جو پتلون کے پائنچے کے اندر پنڈلی سے بندھا ہوا تھا۔ دوپہر کے وقت جب ڈاکوؤں نے ہمیں حراست میں لیا تھا تو میری جیب سے ریوالور نکال کر ہی وہ مطمئن ہوگئے تھے۔ مزید تلاشی لینے کی ضرورت ہی نہیں سمجھی گئی تھی۔ وہ شاید مطمئن ہوگئے تھے کہ میرے پاس اس ریوالور کے سوا اور کوئی اسلحہ نہیں تھا۔

میں رات کے وقت کسی بھی موقع سے فائدہ اٹھا سکتا تھا لیکن اس میں بھی بے پناہ خطرات تھے۔ اگر ہم ان لٹیروں کے چنگل سے نکلنے میں کامیاب ہو بھی جاتے تو خوں خوار درندوں سے بھرے ہوئے جنگل میں رات کے وقت سفر کرنا خودکشی کے مترادف ہوتا اور مجھے تو اس جنگل سے باہر نکلنے کا راستہ بھی معلوم نہیں تھا۔ کل ہم سارا دن سفر کرتے رہے تھے اور آج بھی بھول بھلیوں کی طرح آٹھ نو گھنٹے گھومنے کے بعد یہاں تک پہنچے تھے۔ اس بات کا بھی امکان تھا کہ رات کو یہاں سے نکلنے کے بعد کسی خطرے سے دوچار ہوئے بغیر رات بھر چلتے رہیں اور جب صبح کی روشنی ہو تو پتا چلے کہ ہم گھوم پھر کر پھر وہیں پہنچ گئے ہیں۔ ان خدشات کے پیش نظر میں نے رات کو کسی موقع سے فائدہ اٹھانے کا خیال ذہن سے نکال دیا۔ البتہ یہ سوچ لیا کہ دن کی روشنی میں ایسا کوئی موقع ملا تو اس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش ضرور کروں گا۔

کروشا اپنی جگہ سے اٹھ کر ہمارے قریب آگئی تھی۔ وہ میرے ساتھ جڑی بیٹھی تھی۔ کروشا کو دیکھ کر وہ الگ ہٹ گئی۔ رامو سے دھینگا مشتی میں بلا کی قمیص کے اوپر کے بٹن ٹوٹ گئے تھے۔ اس نے اپنے سینے کی برہنگی چھپانے کے لیے ایک تنکے سے بکل کا کام لیتے ہوئے گریبان بند کرنے کی کوشش کی تھی مگر کامیاب نہیں ہوسکی تھی۔ کروشا میرے سامنے آکر بیٹھی تو میرا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ ایک مشعل ہمارے ساتھ والے درخت کے تنے کے ساتھ گلی ہوئی تھی اور اس کی روشنی براہ راست بیٹھی ہوئی کروشا پر پڑ رہی تھی۔ وہ اس طرح جھک کر بیٹھی تھی کہ میری نظریں بار بار چنوٹی چوڑے کپڑے کے پیچھے بھٹک رہی تھیں۔

"یہ گنگولی چوہدری بڑا خرانٹ آدمی ہے۔" کروشا نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا "میری وجہ سے وہ ابھی تک تمہارے بلا پر ہاتھ نہیں ڈال سکا۔ میں کوشش کروں گی کہ ایک دو روز میں تم دونوں کو یہاں سے نکال دوں۔"

میں نے اس ہمدردی کے لیے اس کا شکریہ ادا کیا اور بولا۔

"اس نے تو مجھے صرف آج رات کی مہلت دی ہے۔ صبح سویرے مجھے یہاں سے چلے جانا ہوگا۔"

"میں کسی نہ کسی سبب تمہیں روک لوں گی۔" کروشا نے کہا "پر تمہیں ذرا محتاط رہنا پڑے گا۔ اس بیچ اگر چوہدری ملے بھی تو بھاگنے کی کوشش مت کرنا۔ اس کے بھیجے یا صفیہ آدمی تم لوگوں کو زیادہ دور نہیں جانے دیں گے۔"

"لیکن تم ہمیں یہاں سے کیسے نکالو گی؟" میں نے پوچھا۔

"اگر بعد میں اسے پتا چل گیا کہ ہمارے فرار میں تمہارا ہاتھ ہے تو وہ تمہیں زندہ نہیں چھوڑے گا۔"

"میری تم فکر مت کرو۔" کروشا بولی "اب میں بھی ایک فیصلہ کرچکی ہوں اور اس پر عمل کرنے کا وقت آگیا ہے۔"

"مگر تم ہمارے لیے یہ سب کچھ کیوں کررہی ہو؟" میں نے پوچھا۔

"تم لوگوں کے لیے نہیں، اپنے لیے کررہی ہوں۔" کروشا نے جواب دیا "میں کئی روز سے دیکھ رہی ہوں کہ چوہدری کا دل مجھ سے بھر گیا ہے۔ بلا کو دیکھ کر تو وہ اسی سے مجھ سے بے رخی برت رہا ہے۔ بلا کی طرف بڑھتے ہوئے اس کے قدم میں نے روکے ہوئے ہیں۔ میں جانتی ہوں کہ اس نے ایک مرتبہ بلا کو برت لیا تو مجھے ان وحشیوں کے حوالے کردے گا جو عرصے سے میرے بخیے ادھیڑنے کو تیار بیٹھے ہیں۔ لیکن چوہدری کے خوف سے انہوں نے کبھی میری طرف ہاتھ نہیں بڑھایا۔" رامو نے بلا پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی تھی۔ چوہدری تم نے دیکھ لیا۔ چوہدری جس چیز کو اپنی مان لیتا ہے کوئی دوسرا اس کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھ بھی نہیں سکتا۔ اس کا انجام تم اس کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھ بھی نہیں سکتا۔ بلا ایک مرتبہ اس کے تصرف میں آگئی تو مجھے وہ اترن کی طرح پھینک دے گا اور یہ سب بھیڑیوں کی طرح مجھ پر جھپٹ پڑیں گے اور تم دیکھ رہے ہو، یہ انسان نہیں واقعی حیوان ہیں۔ میرا جو حشر کریں گے، تم اس کا اندازہ لگا سکتے ہو۔"

"تم کب سے اس کے ساتھ ہو؟" میں نے پوچھا۔

"دو سال سے۔" کروشا نے جواب دیا "اب اگرچہ میرے اندر کچھ نہیں بچا۔ میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہی۔ ان وحشیوں کے ساتھ رہتے ہوئے میں بھی وحشی بن گئی ہوں۔ مہذب دنیا میں میرے لیے کوئی جگہ نہیں رہی۔ میں اب اس زندگی سے خلاصی چاہتی ہوں۔"

"اگر تم نے ہمیں یہاں سے نکالنے کا کوئی منصوبہ بنایا ہے تو خود بھی ہمارے ساتھ چلو۔ ہم تمہیں تمہارا کھویا ہوا مقام واپس دلانے کی کوشش کریں گے؟" میں نے کہا۔

"کھویا ہوا مقام!" کروشا کے ہونٹوں پر زخمی سی مسکراہٹ آئی "کیا ایک عورت کی کھوئی ہوئی عزت اسے واپس مل سکتی ہے؟ مہذب دنیا میں جانے کے بعد میرے ساتھ جو سلوک ہوگا میں اس کا اندازہ بھی لگا سکتی ہوں۔ مجھے ناپاک سمجھ کر ٹھکرا دیا جائے گا یا میں طوائف بن جاؤں گی۔ کوئی مجھ سے زیادہ ہی ہمدردی کرے گا تو مجھے کسی کوٹھے پر لے جاکر بٹھا دے گا۔ اس جنگل سے نکلنے کے بعد میرا وہی ایک ٹھکانا ہوگا۔"

میں ایک گہرا سانس لے کر رہ گیا۔

"تم دو سال سے گنگولی چوہدری کے ساتھ ہو۔" میں نے کہا "یہ پڑھا لکھا آدمی ہے۔ اس نے ماسٹرز کی ڈگری لے رکھی ہے۔ اسے تو کسی عالی اور معزز مقام پر ہونا چاہیے تھا۔ یہ ڈاکو کیسے بن گیا؟"

"قسمت کا چکر!" کروشا نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔

"قسمت کا چکر۔" میں نے اس کے الفاظ دہرائے "یہ قسمت کا چکر بھی عجیب چکر ہے۔ انسان کا سارا عمل اپنا ہوتا ہے اور الزام قسمت پر۔۔۔ اور کبھی تو سارا چکر واقعی قسمت کا ہوتا ہے اور انسان مورد الزام ٹھہراتا ہے۔ انسان کو اور نہیں کچھ حاصل نہیں ہوتا تو وہ کہتا ہے کہ وہ چیز قسمت میں لکھی ہی نہیں تھی اس لیے نہیں ملی۔

باخبری

لاشعور میں دبے ہوئے خوف،
احساسات اور محرکات کو بے نقاب
کرنے والی عجیب و غریب کتاب

قیمت 25 روپے
ڈاک خرچ 23 روپے

کتاب کی قیمت مع ڈاک خرچ بذریعہ
منی آرڈر ارسال کریں

خط و کتابت کا پتہ
بک نفسیات
[illegible]
kitabiat@hotmail.com
kitabiat1970@yahoo.com

"گنگولی چوہدری چند روز کے لیے گاؤں آیا۔ اس نے بتایا کہ اسے دلی میں بہت بڑی نوکری ملنے والی ہے۔ وہ چند مہینوں میں پنڈت دینا ناتھ کا قرضہ چکا دے گا۔

"پنڈت دینا ناتھ کچھ اور سوچے بیٹھا تھا۔ وہ گاؤں کے کئی چھوٹے کاشتکاروں کو قرضے دے کر سود در سود کے چکر میں جکڑ کر ان کی زمینوں پر قبضہ کرچکا تھا۔ وہ دھرمیش چوہدری کی زمین پر بھی دانت گاڑے بیٹھا تھا۔ اس نے اتنا عرصہ انتظار کیا تھا اور اب اسے خطرہ پیدا ہوگیا کہ اگر دھرمیش کا بیٹا واقعی کسی بڑی نوکری پر لگ گیا تو زمین اس کے ہاتھ سے نکل جائے گی۔

"ان دنوں فصل پک چکی تھی۔ چند روز میں کٹائی ہونے والی تھی۔ اس رات ڈاکوؤں کے ایک گروہ نے گاؤں پر حملہ کردیا۔ دھرمیش چوہدری کے کھیتوں کو آگ لگا دی گئی۔ گاؤں میں اس کے گھر پہ بھی ڈاکوؤں نے حملہ کردیا۔ گنگولی کی جوان بہن، چھوٹا بھائی اور ماں باپ ڈاکوؤں کے ہاتھوں مارے گئے۔

"خبر ملنے پر گنگولی واپس آیا تو اس کا سب کچھ لٹ چکا تھا۔ ماں باپ اور بہن بھائی مارے گئے۔ گھر جل کر بھسم ہوگیا۔ زمین پر پنڈت دینا ناتھ نے اپنے مسلح آدمی بٹھا دیے۔

"زمینوں پر، گنگولی کا پنڈت دینا ناتھ کے آدمیوں سے جھگڑا ہوگیا اور دینا ناتھ کے دو آدمی گنگولی کے ہاتھوں مارے گئے۔ گنگولی پکڑے جانے کے خوف سے مدھیہ پردیش میں چنبل وادی کی طرف بھاگ گیا۔

"وہ چنبل وادی میں ڈاکوؤں کے ایک گروہ میں شامل ہوگیا۔ وہ کئی سال تک اس گروہ کے ساتھ مدھیہ پردیش کے علاقوں میں وارداتیں کرتا رہا۔ ڈاکوؤں کے ساتھ رہ کر وہ وحشی درندہ بن گیا تھا۔ اس میں انسانیت ختم ہوچکی تھی۔ مدھیہ پردیش میں اس کے نام کی دہشت پھیل گئی تھی۔

"اور پھر ایک روز اسے کسی ڈاکو سے یہ پتا چل گیا کہ کئی سال پہلے پنڈت دینا ناتھ نے ڈاکوؤں سے اس کے باپ کے کھیتوں کو آگ لگوائی تھی اور اس کے گھر پر حملہ کرایا تھا اور اس کے گھر والے مارے گئے تھے۔

"گنگولی چوہدری نے پہلے تو چنبل وادی میں ان ڈاکوؤں کو تلاش کرکے موت کے گھاٹ اتارا پھر اس نے اپنے گروہ کے ساتھ صبح سویرے کنگن پور میں پنڈت دینا ناتھ کی حویلی پر حملہ کردیا۔ پنڈت دینا ناتھ اس کے پیروں پر گر کر رحم کی بھیک مانگنے لگا لیکن گنگولی چوہدری کے دل میں رحم نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ اس نے حویلی کو لوٹ لیا۔ اس کی بیٹی نے بھاگ

"انسان کبھی بھی اپنی قسمت پر شاکر نہیں ہوتا۔ انسان ہر کام یہ سوچ کر کرے کہ اسے کوشش کے باوجود کامیابی حاصل کرنی ہے اور فلاں چیز کو ہر قیمت پر قسمت بنانا ہے تو وہ یقیناً اس کو حاصل بھی کرلے گا۔ قسمت کو الزام دینے کی ضرورت بھی نہیں پڑے گی۔

"انسان کا المیہ یہ ہے کہ ہم ہر بات کے منفی پہلو پر رکھے ہوئے ہیں۔ کوئی جدوجہد کی بھی جاتی ہے تو ناکامی میں۔ جس کے نتیجے میں ہم ناکامی کے اندھیروں میں رہتے ہیں اور الزام دیتے ہیں قسمت کو۔ بہرحال..." گہرا سانس لیتے ہوئے کہا "میں گنگولی چوہدری کی کہانی سننا چاہوں گا جسے تم قسمت کا چکر کہہ رہی ہو۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو۔" کروشا میرے چہرے پر... بتاتے ہوئے بولی "گنگولی نے جدوجہد تو کی لیکن تمہارے، غلط سمت میں جس کے نتیجے میں وہ کئی سال اندھیرے میں بھٹک رہا ہے۔"

میں خاموشی سے اس کی... دیکھتا رہا۔ باہر اکڑوں بیٹھے بیٹھے تھک گئی تھی۔ اس نے میرے کندھے ساتھ ٹیک لگالی۔ کروشا نے مسکرا کر ہماری طرف دیکھا۔

"گنگولی راجستھان اور مدھیہ پردیش کی سرحد پر... کنگن پور نامی قصبے کے ایک کاشتکار کا بیٹا ہے۔ یہ قصبہ... سے تھوڑا ہی آگے ہے۔ اس قصبے سے آگے چنبل وادی... جو مدھیہ پردیش میں میلوں دور تک پھیلی ہوئی ہے۔ چنبل... کو ہندوستان میں ڈاکوؤں کی جنت کہا جاتا ہے۔

"گنگولی کا باپ دھرمیش چوہدری بیٹے کو اعلیٰ تعلیم... بہت بڑا افسر بنانا چاہتا تھا۔ گنگولی نے پرائمری تک... میں پڑھا۔ میٹرک جھلوار شہر کے ہائی اسکول سے پاس... پھر کالج میں داخلہ لینے کے لیے اسے دلی بھیج دیا... دھرمیش چوہدری کا بھائی رہائش پذیر تھا۔

"دھرمیش چوہدری کے پاس چند بیگھے زمین تھی... نے کنبے کے دوسرے افراد کو بھی پالنا تھا۔ سخت محنت... باوجود زمین کی آمدنی اتنی زیادہ نہیں تھی۔ وہ قصبے کے... پنڈت دینا ناتھ سے قرضہ لیتا چلا گیا۔ اس کا خیال تھا... پڑھ لکھ کر بڑا آفیسر بنے گا تو پنڈت کی پائی پائی چکا دے...

"گنگولی دلی کی نمبر ون یونیورسٹی سے انگریزی میں ایم... کرچکا تھا۔ اس وقت تک اس کے باپ کا بال بال قرض... جکڑا جا چکا تھا۔ مکان اور زمین بھی پنڈت دینا ناتھ... گروی تھے۔ قرضہ اتنا تھا کہ زمین اور مکان دینے کے... حساب چکتا نہیں ہوتا تھا۔

کراپنے آپ کو بچانے کی کوشش کی تو گنگولی چوہدری نے... طرح اسے جھپٹ لیا۔ اس نے پنڈت دینا ناتھ کو... نہیں اتارا۔ اس کی دونوں ٹانگیں اور بازو... کاٹ کر اسے... چھوڑ دیا۔ حویلی اور گوداموں کو اور کھیتوں... اور کھلیانوں کو آگ لگا دی اور پنڈت دینا ناتھ کی جوان بیٹی کو... لے کر چنبل وادی کی طرف واپس جانے کے بجائے راجستھان... طرف آگیا۔ اس نے دو سال سے اس علاقے میں تباہی... پھیلا رکھی ہے۔ ہر طرف اس کے نام کی دہشت ہے جو تم بھی... دیکھ چکے ہو۔"

"تم نے کہا تھا کہ اس کے تمام گھر والے ڈاکوؤں کے ہاتھوں مارے گئے تھے مگر اس کا چھوٹا بھائی چترا؟" میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"وہ اس کا بھائی نہیں، دوست ہے۔ جو چنبل وادی میں اس کے ہاتھ لگا تھا۔ وہ اسے سگے بھائیوں کی طرح چاہتا ہے۔" کروشا نے جواب دیا۔

"اور پنڈت دینا ناتھ کی وہ لڑکی....." میں نے الجھی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا "تمہیں یقیناً افسوس ہوتا ہوگا کہ باپ کے کرموں کی سزا تم بھگت رہی ہو۔"

"میں نے کہا تھا نا کہ قسمت کے چکر ایسے ہی ہوتے ہیں۔" کروشا نے گہرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔ اس کے من کے کرب کو میں محسوس کرسکتا تھا۔

"تم نے ٹھیک کہا تھا۔" وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولی "قصور ہمارا اپنا ہوتا ہے اور الزام ہم قسمت کو دیتے ہیں۔ ہماری اپنی غلطیاں اور کوتاہیاں زندگی کو مایوسی اور ناکامیوں کے اندھیرے میں دھکیل دیتی ہیں اور یہ زندگی ایک بوجھ بن کر رہ جاتی ہے۔ ایسا ناگوار بوجھ جس سے پیچھا چھڑا لینے کو جی چاہتا ہے۔"

"ہم زندگی کو پتا نہیں کیا سمجھتے ہیں۔ کیا مفہوم لیتے ہیں اس کا۔" میں نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا "زندگی کیا ہے؟ کیا یہ کسی وجود کا نام ہے؟ فکری شعور کے تاثر کا نام ہے؟ زخم و اٹیک کے انمول رشتے کا نام ہے؟ درد و کرب کے ادراک کا نام ہے؟ محض ایک نام ہے یا زندگی صرف زندگی ہے؟

"زندگی تو ایک فلسفہ ہے لیکن ہماری ذات اس سارے فلسفے سے روگردانی کرتی ہے۔ ہمارے خیال میں زندگی میں اگر بے شمار خوب صورت مناظر ہیں تو پہاڑ جیسی مہیب مشکلات کا وجود بھی ہے۔ ہجر کی تمازت ہے تو وصال کے سائے کی انمول ٹھنڈک بھی ہے۔ آہوں کے بعد قہقہے بھی ہیں اور رنجیدگی ہے تو درد کا صحرا بھی ہے لیکن نجانے کیوں انسان سب کچھ جانتے ہوئے بھی اسے تسلیم نہیں کرتا۔ پھل دیکھتا ہے تو اس کے کانٹوں کی چبھن محسوس نہیں کرتا۔ تڑپتا ہے تو قرار کے لمحوں کو یاد نہیں کرتا۔ بس خوش فہمی کے سراب کے پیچھے دوڑ دوڑ کر سکون تلاش کرتا رہتا ہے حتیٰ کہ وقت کا بے رحم چکر اس کے ٹکڑے ٹکڑے کرکے اسے زمین میں دفن کردیتا ہے۔"

میں خاموش ہو کر کروشا کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کی نظریں پہلے ہی میرے چہرے پر مرکوز تھیں اور میں نے محسوس کیا تھا کہ اس کی آنکھوں میں الجھن کے تاثرات بڑھتے جارہے تھے۔

"تم نے بھی آنکھوں میں زندگی کے بہت سے خواب سجائے ہوں گے جو تمہارے باپ کی ہوس کی نذر ہوگئے۔ تم نے اپنے حسین سپنوں کی ایسی بھیانک تعبیر کا تو تصور بھی نہیں کیا ہوگا لیکن یہ تمہارے خوابوں کی تعبیر نہیں ہے۔ تم ابھی زندہ ہو۔ تم میں ابھی زندگی ہے۔ پر تم دیوانہ وار ہی ہو اور مایوسی زندگی کو گھن کی طرح کھا جاتی ہے۔ اگر زندگی کو واقعی مایوسی کی دیمک لگ جائے تو اس کی بنیادیں کھوکھلی ہوجاتی ہیں اور وہ ملبے کا ڈھیر بن جاتی ہے مگر تم... اپنی زندگی کو ملبے کا ڈھیر نہیں بننے دو گی۔ تمہیں یہ فکر تو ہے کہ گنگولی چوہدری بلا کو بھی برباد نہ کر ڈالے لیکن اپنے بارے میں سوچتے ہوئے کیوں ڈرتی ہو؟"

"میرے اندر اب کیا رہ گیا ہے۔" کروشا نے جواب دیا "میں تو پہلے ہی ملبے کا ڈھیر بن چکی ہوں۔ کھنڈر ہوگئی ہوں۔"

"عمارت میں دراڑیں ضرور پڑ گئی ہیں مگر اس کی بنیادیں بہت مضبوط ہیں۔" میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا "وعدہ کرو کہ تم ان بنیادوں پر زندگی کی ایک خوب صورت اور مضبوط عمارت تعمیر کرو گی۔ وعدہ کرو کہ جب ہم اس جنگل سے نکلیں گے تو اکیلے نہیں ہوں گے۔ تم ہمارے ساتھ ہوگی۔" میں نے اس کا ہاتھ سہلاتے ہوئے نظریں اس کے چہرے پر جما دیں۔

"زندگی میں پہلی مرتبہ کسی نے مجھ سے ایسی باتیں کی ہیں۔" وہ میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولی "کیا تم سمجھتے ہو کہ....."

"ہاں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اب بھی کچھ نہیں بگڑا۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی "وحشیوں کے اس غول سے نکلنے کے بعد تم ایک نئی زندگی شروع کرسکتی ہو۔"

میں کروشا کا ہاتھ بدستور سہلا رہا تھا۔ اس پر ایک عجیب سی کیفیت طاری ہورہی تھی۔ آنکھوں میں سرخی پھیل رہی

میں اور بلا دیر تک آہستہ آہستہ باتیں کررہے تھے۔ بلا باتیں کرتے کرتے سوگیا۔ میں کچھ دیر تک اندھیرے میں ادھر ادھر دیکھتا رہا پھر آنکھیں بند کرلیں۔

مجھے اندازہ نہیں کتنی دیر سویا ہوں گا کہ ایک چیختی ہوئی آواز سے میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے ہڑبڑا کر ادھر ادھر دیکھا۔ ایک آدمی جنگل کی طرف سے دوڑتا ہوا آرہا تھا اور وہ چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا۔

"چوہدری۔۔۔ چوہدری۔۔۔ پولیس ہمیں گھیر رہی ہے۔ کرشنا پولیس کے ہتھے چڑھ گیا ہے۔"

کیمپ میں کھلبلی سی مچ گئی۔ گنگولی چوہدری کے اونگھتے ہوئے سارے آدمی جاگ گئے اور رائفلیں سنبھالے ادھر ادھر دوڑنے لگے۔ گنگولی بھی چٹان کی کھوہ سے باہر آگیا۔ اس کے ہاتھ میں بھی رائفل تھی۔ وہ ایک طرف دوڑتے ہوئے اپنے آدمیوں کو احکامات جاری کرنے لگا اور پھر اسی وقت جنگل فائر کی آواز سے گونج اٹھا۔ اس سنگل شاٹ کے ساتھ ایک خوفناک انسانی چیخ بھی سنائی دی۔ وہ گنگولی کے کرشنا نامی اس آدمی کی چیخ تھی جو کیمپ سے تقریباً سو گز آگے پہرے کی ڈیوٹی پر تھا اور پولیس کے ہاتھ لگ گیا تھا اور شاید اس نے بھاگنے کی کوشش کی ہوگی۔ پولیس نے اسے اڑا دیا تھا۔

"گنگولی چوہدری!" میگا فون پر ایک بھاری آواز سنائی دی جسے پہچاننے میں مجھے دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ وہ انسپکٹر ونود پانڈے تھا۔ وہ کہہ رہا تھا "گنگولی چوہدری۔ تم لوگ چاروں طرف سے گھیرے میں آچکے ہو۔ اپنے آپ کو ہمارے حوالے کردو۔ میں تمہیں تین منٹ کی مہلت دیتا ہوں۔ اس کے بعد فائر کھول دیا جائے گا۔"

گنگولی چوہدری نے جواب نہیں دیا۔ اس کے آدمی پوزیشن لینے کے لیے ادھر ادھر دوڑ رہے تھے اور وہ خود ایک بہت بڑے پتھر کی آڑ میں پوزیشن لے چکا تھا۔ اس کی پچھلی طرف ندی تھی اور گنجان درختوں کے ساتھ قد آدم جھاڑیاں اور پودے بھی تھے۔

میں بری طرح گڑبڑایا ہوا تھا۔ بلا بھی جاگ گئی تھی۔ اس کا چہرہ دھواں ہو رہا تھا اور وہ مجھ سے لپٹ گئی تھی۔ خوف کے باعث اس کے بدن میں ہلکی سی کپکپاہٹ تھی۔ میرے پاس صرف خنجر تھا لیکن ظاہر ہے اس موقع پر خنجر کام نہیں دے سکتا تھا۔ میں کسی محفوظ جگہ کی تلاش میں ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ اسی دوران نارائن ایک طرف سے دوڑتا ہوا نظر آیا۔ وہ بے حد خوف زدہ تھا۔ اس نے ایک جگہ رک کر ادھر ادھر دیکھا اور پھر دوڑتا ہوا چوہدری کے قریب پہنچ گیا۔

"مجھے بچالو چوہدری۔" وہ گھگیایا "پولیس نے مجھے یہاں دیکھ لیا تو زندہ نہیں چھوڑیں گے۔"

"ڈرتا ہے۔ بزدل۔ حرامی۔" گنگولی چوہدری دہاڑا "اے حرامی۔ پولیس تیری وجہ سے یہاں آئی ہے۔ اگر تو اس لونڈے کو ساتھ لے کر نہ آتا تو پولیس ادھر کا رخ نہ کرتی مگر ڈرو نہیں۔ میں تمہیں پولیس کے ہاتھ نہیں لگنے دوں گا۔" چوہدری نے رائفل سیدھی کرکے ٹریگر دبادیا۔

گولی نارائن کی کھوپڑی میں لگی اور وہ آواز نکالے بغیر ڈھیر ہوگیا۔

"ارے او چترا۔" چوہدری کی گونجتی ہوئی آواز سنائی دی "اس چھوکری اور لونڈے کا دھیان رکھیو۔ لونڈا بھاگنے کی کوشش کرے تو اڑا دینا سالے کو۔"

چترا دوڑتا ہوا ہمارے قریب پہنچ گیا اور ہم دونوں کو رائفل کی زد پر لے لیا۔ میں درخت سے ٹیک لگائے کھڑا تھا اور بلا مجھ سے لپٹی تھر تھر کانپ رہی تھی۔ میں ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ ہم یہاں بالکل محفوظ نہیں تھے۔ اگر دونوں طرف سے فائرنگ شروع ہوجاتی تو ہم زد میں آسکتے تھے۔

انسپکٹر ونود پانڈے کی دی ہوئی مہلت ختم ہوگئی۔ اس نے میگا فون پر ایک بار پھر وارننگ دی اور اس کے ایک منٹ بعد فائر کھول دیا۔

فائرنگ کی آوازوں سے جنگل گونج اٹھا۔ میں بلا کو اپنے ساتھ لپٹائے درخت کی آڑ میں ہوگیا۔ گنگولی چوہدری کے آدمی بھی جگہ بدل بدل کر فائرنگ کررہے تھے۔ ہم سے چند قدم کے فاصلے پر ایک درخت کی آڑ میں کھڑا چترا بھی فائرنگ کررہا تھا۔ وہ بار بار ہماری طرف بھی دیکھ رہا تھا۔ میں اگر بلا کے ساتھ وہاں سے بھاگنے کی کوشش کرتا تو وہ ہمیں گولیوں سے چھلنی کردیتا۔

اسی وقت کرشنا بھی دوڑتی ہوئی وہاں پہنچ گئی۔ اس کے ہاتھ میں بھی رائفل تھی۔

"چترا۔" وہ چیخی "ان لوگوں کو میں دیکھتی ہوں۔ تم رگھو کی طرف جاؤ۔ اس طرف پولیس والے پودوں میں چھپ کر آگے بڑھ رہے ہیں۔"

چترا دوڑتا ہوا دوسری طرف چلا گیا۔ کرشنا نے سامنے گنجان درختوں کی طرف ایک برسٹ مارا۔ محتاط نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھا اور نیگر کی جیب سے ریوالور نکال کر میری طرف اچھال دیا۔ یہ وہی ریوالور تھا جو مجھ سے چھینا گیا تھا۔

"چٹان کی پچھلی طرف نکل جاؤ۔" کرشنا نے میری طرف دیکھتے ہوئے چیخ کر کہا "وہاں ایسی جگہیں ہیں جہاں تم محفوظ رہ سکو گے۔"

"اور تم۔" میں نے جھک کر ریوالور اٹھاتے ہوئے کہا "تم بھی ہمارے ساتھ چلو۔ یہ بہترین موقع ہے۔ اس سے فائدہ اٹھاؤ۔"

"میری فکر مت کرو۔ تم لوگ نکل جاؤ۔ جلدی کرو۔" کرشنا چیخی۔

"ضد مت کرو کرشنا۔" میں نے بھی چیخ کر کہا "یہ بہترین موقع ہے۔ ہمارے ساتھ چلو۔"

"میں کہتی ہوں، چلے جاؤ یہاں سے۔" کرشنا دہاڑی "بلا کو لے کر نکل جاؤ۔ بحث میں وقت ضائع مت کرو۔"

واقعی بحث بے کار تھی۔ میں نے آخری بار کرشنا کی طرف دیکھا اور بلا کا ہاتھ پکڑ کر چٹان کی طرف دوڑ لگادی۔ چٹان کی دوسری طرف گھومنے سے پہلے میں نے مڑ کر دیکھا۔ کرشنا بھی اپنی جگہ چھوڑ کر دوسری طرف دوڑی جارہی تھی۔

یہ چٹان نہ تو زیادہ اونچی تھی اور نہ ہی زیادہ لمبی چوڑی۔ اس کی پچھلی طرف بڑے بڑے پتھر بکھرے ہوئے تھے اور زمین ہموار نہیں تھی۔ چھوٹے بڑے لاتعداد کھڈے تھے۔

میں بلا کا ہاتھ پکڑے ایک طرف دوڑتا رہا۔ بلا پر دہشت طاری تھی۔ وہ بار بار لڑکھڑا رہی تھی۔ اگر میں نے اس کا ہاتھ نہ پکڑ رکھا ہوتا تو وہ ایک بار گرنے کے بعد دوبارہ نہ اٹھ پاتی۔

ہم چٹان کے اوپر سے گھوم کر دوسری طرف آگئے۔ اس طرف جھاڑیوں اور پودوں کا سلسلہ شروع ہوگیا تھا۔ درختوں کی بھی بہتات تھی۔ بلا کا پیر جھاڑیوں میں الجھا اور وہ لڑکھڑا گئی۔ اس کا ہاتھ میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور وہ چیختی ہوئی جھاڑیوں میں گری۔ میں اسے اٹھانے کے لیے جھکا ہی تھا کہ کئی سنسناتی ہوئی گولیاں ہمارے سروں کے اوپر سے گزر گئیں۔ میں بلا کے اوپر گر گیا اور اسے ساتھ لے کر لوٹ لگاتا ہوا نشیب کی طرف لڑھکتا چلا گیا۔

چند منٹ تک میں بلا کا ہاتھ پکڑے بے حس و حرکت پڑا رہا پھر اسے وہیں رکنے کا اشارہ کرکے جھاڑیوں کی آڑ میں آہستہ آہستہ اوپر چڑھنے لگا۔

وہ رگھو تھا جس نے گزشتہ رات کرشنا کا ہاتھ پکڑنے کی کوشش کی تھی۔ وہ ایک بڑے پتھر کی آڑ میں کھڑا پولیس والوں پر فائر کررہا تھا مگر اس طرف ہمیں دوڑتے دیکھ کر اس نے ہم پر بھی فائر کھول دیا تھا۔

جھاڑیوں کی آواز سن کر وہ ایک بار پھر مڑا۔ اس نے

مجھے دیکھ لیا مگر اس سے پہلے کہ وہ رائفل سیدھی کرتا' میں نے ریوالور کا ٹریگر دبا دیا۔ گولی اس کی ہنسلی کی ہڈی کے قریب لگی۔ وہ چیخ کر لڑکھڑایا تو میں نے دوسرا فائر کر دیا۔ یہ گولی اس کے سینے میں لگی اور وہ گر کر جھاڑیوں میں لڑھکتا ہوا دوسری طرف ندی میں جا گرا۔

میں نے بلا کو اشارہ کیا۔ وہ رینگتی ہوئی میرے قریب آ گئی۔ میں اس کا ہاتھ پکڑے ایک بار پھر جھکتا ہوا دوڑنے لگا۔ میں اس کوشش میں تھا کہ یا تو اوپر سے گھوم کر پولیس پارٹی کی دوسری طرف نکل جاؤں یا کسی اور محفوظ جگہ کی طرف لیکن..... بدقسمتی سے ہم اس وقت پولیس اور گنگولی چوہدری کے آدمیوں کے گھیرے میں تھے۔

پتھروں کی دوسری طرف پہنچتے ہی گنگولی کے ایک اور آدمی سے مڈھ بھیڑ ہو گئی۔ ہم اچانک ہی ایک دوسرے کے سامنے آئے تھے۔ اس کے ہاتھ میں رائفل تھی اور اسے فائر کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ تاہم اس نے رائفل کو لاٹھی کی طرح اٹھا کر مجھ پر حملہ کرنے کی کوشش کی تھی۔

میں نے بلا کا ہاتھ چھوڑ کر بڑی تیزی سے اس کے پیٹ میں سر کی ٹکر رسید کر دی۔ اس کے منہ سے "اوغ" کی آواز نکلی۔ میں اسے دھکیلتا ہوا دور تک لے گیا اور پھر اسے دونوں ٹانگوں سے گرفت میں لے کر اوپر اٹھایا اور اپنے پیچھے اچھال دیا۔

وہ سر کے بل گرا۔ اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ اس نے بڑی پھرتی سے سنبھلنے کی کوشش کی تھی لیکن اس مرتبہ میں نے اسے کوئی موقع نہیں دیا اور ریوالور کا ٹریگر دبا دیا۔ گولی اس کی کھوپڑی میں لگی۔ میں نے بلا کا ہاتھ پکڑ کر ایک بار پھر ایک طرف دوڑ لگا دی۔

دونوں طرف سے زبردست فائرنگ ہو رہی تھی۔ وقفے وقفے سے انسانی چیخوں کی آوازیں بھی گونج جاتیں۔ گنگولی چوہدری کے دو آدمی تو میرے ہاتھوں مارے گئے تھے۔ کم از کم تین آدمی پولیس کے ہاتھوں مارے گئے تھے۔ پولیس کے بھی کچھ آدمی زخمی یا ہلاک ہوئے تھے کیونکہ اس طرف سے بھی چیخوں کی آوازیں سنائی دی تھیں۔

میں بلا کو پکڑے تیزی سے ایک طرف دوڑتا رہا۔ بلا ایک بار پھر ٹھوکر کھا کر گری۔ اس مرتبہ اس کے منہ سے نکلنے والی چیخ کچھ زیادہ ہی خوفناک تھی اور غالباً چیخ کی آواز سن کر ہی ایک درخت کے پیچھے کھڑا ہوا چترا ہماری طرف متوجہ ہوا تھا۔

ہمیں دیکھ کر چترا کی آنکھوں میں وحشت سی بھر گئی۔ اس نے رائفل کا رخ ہماری طرف کر کے ٹریگر دبا دیا۔ اس میں بلا کے ساتھ ایک طرف لوٹ نہ لگا دیتا تو ہم دونوں کے جسم چھلنی ہو جاتے۔

چترا کی رائفل خالی ہو گئی۔ اس نے رائفل ایک طرف پھینک دی اور خنجر نکال کر میری طرف لپکا۔ اس کا خیال تھا کہ میں نہتا تھا۔ میں اس وقت بلا کے قریب پشت کے بل پڑا تھا۔ چترا نے خنجر والا ہاتھ اٹھا کر خوں خوار بھیڑیے کی طرح میرے اوپر چھلانگ لگا دی۔

میں نے بڑی پھرتی سے بلا کو پرے دھکیل دیا اور ریوالور والا ہاتھ اٹھا کر ٹریگر دباتا چلا گیا۔ مجھ تک پہنچنے سے پہلے تین گولیاں چترا کے سینے میں پیوست ہو گئیں اور وہ چیخ ہوا ڈھیر ہو گیا۔ میں نے بھی بڑی پھرتی سے ایک طرف لوٹ لگا دی تھی۔

چترا ختم ہو گیا تھا۔ وہ چترا جسے پولیس سے چھڑانے کے لیے گنگولی چوہدری نے تیرہ بے گناہ سیاحوں کو اغوا کیا تھا اور تین دن میں کم از کم چھ افراد کو بے دردی سے موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ اتفاق سے وہ میرے ہاتھوں اپنے انجام کو پہنچ گیا تھا۔

میں بلا کا ہاتھ پکڑ کر پھر ایک طرف دوڑا۔ بلا بری طرح ہانپ رہی تھی۔ میں اسے گھسیٹتا ہوا دوڑ رہا تھا۔

ایک جگہ پہنچ کر میں رک گیا۔ آگے پتھروں کی دوسری طرف وہ ندی تھی جو کچھ دور جا کر تالاب میں گرتی تھی۔ پتھروں کی دوسری طرف سے گنگولی اور کروشا کے زور زور سے بولنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ میں بلا کو چھوڑ کر آگے بڑھا اور پتھر کی دوسری طرف جھانکنے لگا۔

وہ دونوں تقریباً دس فٹ نشیب میں تھے اور وہ منظر بڑا خوفناک تھا۔ گنگولی چوہدری نے کروشا کو رائفل کی زد پر لے رکھا تھا۔ قریب ہی ایک لاش پڑی تھی۔

"تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے چوہدری۔" کروشا چیخ رہی تھی "اس وقت تمہیں آدمیوں کی ضرورت ہے اور تم اپنے ہی آدمیوں کو موت کے گھاٹ اتار رہے ہو۔"

"تم جانتی ہو غداروں سے مجھے کوئی ہمدردی نہیں۔" چوہدری نے جواب دیا "یہ بھنڈاری بھی پولیس کو رات کے اندھیرے میں یہاں لے کر آیا تھا۔ میں نے اسے غداری کی سزا دی ہے اور تم....." وہ ایک لمحے کو خاموش ہوا پھر بولا "تم بھی غدار ہو۔ تم نے اس چھوکری اور اس کے عاشق کو فرار ہونے کا موقع دیا۔ تمہیں بھی غداری کی سزا ملے گی۔"

"چوہدری!" میں چیخا "رائفل پھینک دو۔ تم میری زد پر ہو۔"

چوہدری تیزی سے میری طرف گھوما۔ میں نے ریوالور کا ٹریگر دبا دیا۔ "ٹک" کی آواز نکل کر رہ گئی۔ ریوالور خالی ہو چکا تھا۔ چوہدری نے رائفل کا برسٹ مارا۔ میں نے بڑی پھرتی سے ایک طرف گر کر اپنے آپ کو بچایا اور پھر دوسرے ہی لمحے کروشا کی بھیانک چیخ اور دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سن کر میں اچھل پڑا۔ میں نے پتھر کی آڑ سے جھانک کر دیکھا تو کروشا منہ کو آتا ہوا محسوس ہوا۔ کروشا گولیوں سے چھلنی ہو چکی تھی۔ وہ خون اور کیچڑ میں لت پت تڑپ رہی تھی۔ گنگولی چوہدری وہاں سے بھاگ چکا تھا۔

میں نے اس ڈھلان پر چھلانگ لگا دی۔ وہ جگہ ایسی تھی کہ دائیں بائیں بڑے بڑے چوڑے پتھر تھے جن کے اندر سے ندی کا پانی رس رہا تھا اور سامنے گنجان درخت تھے۔ فائرنگ سے بچنے کے لیے یہ محفوظ ترین جگہ تھی اور اسی لیے گنگولی چوہدری نے یہاں مورچا لگا رکھا تھا لیکن میری وجہ سے اسے یہاں سے بھاگنا پڑا تھا۔

گنگولی چوہدری واقعی انسان نہیں بھیڑیا تھا۔ میرے سامنے وہ اب تک اپنے ہی تین آدمیوں کو موت کے گھاٹ اتار چکا تھا۔ پہلا، اموجس نے بلا کے ساتھ دست درازی کی کوشش کی تھی۔ دوسرا بھنڈاری جو اس کے کہنے کے مطابق پولیس کو یہاں لایا تھا۔ اس کی لاش بھی میرے سامنے پڑی تھی اور تیسری کروشا جس کا جرم یہ تھا کہ اس نے مجھے اور بلا کو ان کے چنگل سے نکلنے میں مدد دی تھی۔

میں دوڑ کر کروشا کے قریب پہنچ گیا۔ وہ کیچڑ اور خون میں لت پت تھی۔ ساری گولیاں اس کے پیٹ میں لگی تھیں۔ خون کی دھاریں بہہ رہی تھیں' اس کی آنکھیں بند تھیں لیکن سینے کا زیر و بم بتا رہا تھا کہ وہ ابھی زندہ تھی۔

"کروشا..... کروشا..... آنکھیں کھولو۔" میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

اسی لمحے پیچھے آہٹ سن کر میں تیزی سے مڑا۔ وہ بلا تھی جو ڈھلان پر گھسٹتی ہوئی نیچے آ رہی تھی اور پھر کروشا کو دیکھ کر اس کے منہ سے خوفناک چیخ نکل گئی۔

"یہ۔ یہ کیا ہوا؟" وہ بمشکل بول سکی۔

"اسے ہماری مدد کرنے کی سزا بھگتنی پڑی ہے۔" میں نے جواب دیا "چوہدری نے اسے محض اس لیے گولیوں سے چھلنی کر دیا کہ اس نے ہمیں بھاگنے میں مدد دی تھی۔"

"یہ۔ یہ زندہ ہے۔" بلا نے اس کے سینے پر ہاتھ رکھ دیا۔

جاسوسی ڈائجسٹ میں سلسلے وار شائع ہونے والی مقبول ترین کہانی
علی یاور خان کی جنوں کرشمہ
کتابی صورت
(گیارہ حصوں میں)
تیار ہے
بھاشہ
قیمت فی حصہ 60 روپے
ڈاک خرچ فی حصہ 23 روپے
گیارہ حصے ایک ساتھ منگوانے پر رعایتی قیمت صرف 600 روپے ڈاک خرچ معاف
کتابیات پبلی کیشنز
23 ایس ٹی
74200 کراچی
فون 5802551 فون 5802552-5895313
kitabiat1970@yahoo.com

کروشا نے آنکھیں کھول دیں۔ بے پناہ کرب تھا ان آنکھوں میں۔ وہ چند لمحے ہماری طرف دیکھتی رہی۔ شاید اسے پہچاننے میں دشواری پیش آرہی تھی اور پھر اس کے ہونٹوں پر بہت خفیف سی مسکراہٹ آگئی۔ اس نے بڑی مشکل سے اپنا ایک ہاتھ اٹھا کر بلا کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

"جج... جا... ؤ..." اس کے ہونٹ کپکپائے اور پھر وہ خاموش ہوگئی۔ اس نے ایک بار پھر باری باری ہم دونوں کی طرف دیکھا اور آنکھیں بند کرلیں۔ کبھی نہ کھولنے کے لیے۔

میں نے کروشا کا ہاتھ اٹھا کر آہستگی سے اس کے پہلو میں رکھ دیا۔ بلا نے بڑی مشکل سے اس کے سینے پر سے ہاتھ ہٹایا تھا۔ خوف و دہشت سے اس کا چہرہ پیلا پڑ گیا تھا اور آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تھے۔ بلا کئی روز سے کنگولی چوہدری جیسے وحشیوں کے جال میں پھنسی ہوئی تھی اور وہ کروشا ہی تھی جو اب تک اسے بچائے ہوئے تھی اور بلا کو بچانے کے لیے ہی اس نے اپنی جان دے دی تھی۔ مجھے بھی کروشا کے اس طرح مرنے کا بہت افسوس تھا۔ اگر وہ اس وقت ہمارے ساتھ بھاگ نکلتی تو ہم یقیناً اس جنگل سے نکلنے میں بھی کامیاب ہوجاتے اور مجھے یقین تھا کہ کروشا ایک نئی اور خوشگوار زندگی کے راستے پر بھی گامزن ہوجاتی لیکن شاید یہ سب کچھ اس کی قسمت میں نہیں تھا۔ اس نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ قسمت کا چکر بھی بڑا عجیب ہوتا ہے۔

تڑ تڑاہٹ کی آواز سن کر میں اچھل پڑا۔ ہمارے سامنے درختوں میں فائرنگ ہو رہی تھی۔ سامنے سے اس پناہ گاہ سے نکلنا ممکن نہیں تھا۔ ہم کراس فائرنگ کی زد پر آسکتے تھے۔

میں بلا کا ہاتھ پکڑ کر ڈھلان پر چڑھ گیا۔ اوپر پہنچ کر مجھے اچانک ہی خیال آیا کہ میرا ریوالور تو خالی ہوچکا ہے۔ مجھے کروشا کی رائفل اٹھا لینی چاہیے تھی۔

"تم یہیں رکو۔ میں ابھی آتا ہوں۔" میں نے بلا سے کہا اور دوبارہ ڈھلان پر اترنے کے لیے مڑا ہی تھا کہ چوہدری کا ایک آدمی کسی طرف سے دوڑتا ہوا وہاں پہنچ گیا۔ میں نے مڑ کر بلا کا ہاتھ پکڑا اور دوسری طرف دوڑ لگا دی۔

اب میرا وہاں رکنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ میں بلا کا ہاتھ پکڑے دوڑتا رہا اور پھر ہمیں رک جانا پڑا۔ ہمارے راستے میں حائل وہ ندی چار پانچ فٹ سے زیادہ چوڑی نہیں تھی۔ میں تو آسانی سے چھلانگ لگا کر دوسری طرف پہنچ سکتا تھا لیکن بلا کے لیے ایسا کرنا ممکن نہیں تھا۔

"رک جاؤ۔ ایک منٹ رک جاؤ ہمت سنگھ۔" بلا نے کہا۔ وہ بری طرح ہانپ رہی تھی اور اس کے منہ سے جھاگ بہہ رہا تھا۔ اس سے اپنے قدموں پر کھڑا بھی نہیں ہوا جا رہا تھا۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ ہم اس جگہ سے بہت دور نکل آئے تھے۔ پولیس نے کنگولی چوہدری کے کیمپ کو گھیرے میں لے رکھا تھا اور میرے خیال میں کسی کے بھی زندہ بچ نکلنے کا امکان نہیں تھا۔ فائرنگ کی آوازیں خاصی دور تھیں اور میرے خیال میں چند منٹ رک جانے میں کوئی مضائقہ نہیں تھا۔

میں نے بلا کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ وہ "بھد" سے نیچے بیٹھ گئی۔ اس نے دونوں ہاتھ آگے زمین پر ٹکا لیے۔ اس کا سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔ میں اس کے قریب کھڑا محتاط نظروں سے چاروں طرف دیکھتا رہا۔

تقریباً دس منٹ بعد بلا اپنی حالت پر قابو پا سکی تھی۔ اس نے شکم سیر ہو کر ندی سے پانی پیا اور اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ اس کی ٹانگوں میں اب بھی ہلکی سی لپکپاہٹ تھی۔ میں نے بھی پانی کے چند گھونٹ پیے اور آگے روانگی کے لیے تیار ہوگیا۔

ندی کا پانی شفاف تھا۔ اس کی تہ میں پتھر نظر آرہے تھے۔ گہرائی ڈھائی تین فٹ کے قریب تھی۔ پانی کا بہاؤ بھی کسی قدر تیز تھا اور بلا ندی میں اترتے ہوئے ڈر رہی تھی۔

"اگر تم پانی میں نہیں اترنا چاہتیں تو ندی پار کرنے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے۔" میں نے کہا۔

"کیا؟" بلا نے سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔

"یہ... اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں۔" میں نے یہ کہتے ہوئے بڑی پھرتی سے جھک کر بلا کو گود میں اٹھا لیا۔

بلا کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ میرا ایک ہاتھ اس کی ٹانگوں کے نیچے اور دوسرا گردن کے نیچے تھا۔ اس کی شرٹ کے بٹن ٹوٹے ہوئے تھے اور اس کے اندر کی تصویر میرے دماغ میں سنسناہٹ سی پیدا کرنے لگی۔ بلا نے ایک ہاتھ میری گردن پر ڈال دیا اور دوسرے ہاتھ سے قمیص کے گریبان کے دونوں حصے پکڑ کر میری نظروں کے سامنے پردہ ڈال دیا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ بلا کی آنکھوں میں ایک دم سرخی کے ڈورے تیرنے لگے تھے اور چہرے پر سرخی پھیل گئی تھی۔

میں بڑی احتیاط سے ندی میں اتر گیا۔ کنارے کے قریب تو پانی واقعی ڈھائی تین فٹ گہرا تھا لیکن درمیان میں پانی میری کمر تک پہنچ گیا اور بلا بھی بھیگ گئی۔ پانی کی روانی خاصی تیز تھی۔ دو تین مرتبہ میرے قدم لڑکھڑائے تھے۔ ایک مرتبہ تو میں گرتے گرتے بچا تھا۔

دوسرے کنارے کے قریب پہنچ کر میں نے بلا کو کنارے کی گھاس پر ڈال دیا۔ وہ پھرتی سے اٹھ کر کھڑی ہوگئی اور ایک ہاتھ میری طرف بڑھا دیا۔ ندی کا کنارہ عمودی تھا۔ میں اس کا ہاتھ پکڑ کر باہر نکل آیا۔

یہاں بھی ہمیں اس وقت تک کھڑے رہنا پڑا جب تک ہمارے کپڑوں سے پانی ٹپکنا بند نہیں ہوگیا اور پھر ہم تیزی سے ایک طرف چلنے لگے۔ بلا کا اپنے آپ پر اعتماد بحال ہو رہا تھا اور وہ بھی میرے ساتھ تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے چل رہی تھی۔

عقب میں فائرنگ کی آوازیں دور ہوتی جا رہی تھیں۔ یہ معرکہ صبح چھ بجے کے قریب شروع ہوا تھا۔ اب سورج سوا نیزے پر آرہا تھا اور یہ معرکہ ابھی تک جاری تھا۔ کنگولی چوہدری کے آدمیوں کے پاس وافر مقدار میں اسلحہ موجود تھا۔ پانچ سو گولیاں تو کل ہی نارائن نے لاکر دی تھیں اور لگتا تھا کہ پولیس بھی پوری تیاری کے ساتھ آئی تھی۔

اونچے نیچے راستوں پر چلتے، دوڑتے ہوئے ہم وہاں سے بہت دور نکل آئے تھے۔ فائرنگ کی اکا دکا آوازیں اب بھی ہم تک پہنچ رہی تھیں اور وہ بہت دور کی آوازیں تھیں۔

اس جگہ درخت چھدرے تھے لیکن جھاڑیاں اور چوڑے پتوں والے پودے بکثرت تھے۔ کہیں کہیں تو یہ پودے اتنے گنجان تھے کہ ہمیں راستہ بنانے میں بھی خاصی دشواری پیش آرہی تھی۔

دوپہر ہوگئی۔ سورج ہمارے سروں پر چمک رہا تھا۔ بلا تھک گئی تھی۔ وہ ایک بار پھر لڑکھڑانے لگی تھی۔ پیاس کی شدت سے اس کا بھی برا حال ہو رہا تھا اور میرے حلق میں بھی کانٹے چبھنے لگے تھے۔ اس ندی کے بعد سے ہمیں کہیں نہ تو کوئی اور ندی ملی تھی اور نہ ہی کسی جگہ جوہڑیا تالاب کی صورت میں پانی کا ذخیرہ نظر آیا تھا۔ اگرچہ بھوک سے بھی پیٹ میں گرہیں سی پڑنے لگی تھیں مگر پیاس کی شدت نے زیادہ بے چین کر رکھا تھا۔

مزید ایک گھنٹا چلتے رہنے کے بعد بالآخر ہم ایک ایسی جگہ پر پہنچ گئے جہاں درختوں کے جھنڈ کی دوسری طرف ایک لمبا چوڑا گڑھا سے میں پانی نظر آگیا۔ یہ بارش کا پانی تھا جو رہتے تھے جو ہمیں دیکھ کر وہاں سے بھاگ گئے۔

دھوپ میں چلنے کی وجہ سے پانی گرم تھا لیکن بہرحال پیاس تو بجھ سکتی تھی۔ عجیب ستم ظریفی تھی۔ جس جوہڑ سے جنگلی جانور پانی پیتے تھے اسی سے ہم اپنی پیاس بجھا رہے تھے۔

پانی پی کر ہم جوہڑ سے چند گز دور درختوں کے سائے میں آگئے۔ بلا گھاس پر لیٹ گئی۔ گہرے سانس لینے سے اس کے سینے کا زیر و بم بڑا دل فریب منظر پیش کر رہا تھا۔ اس سے دھیان ہٹانے کی کوشش کرتے ہوئے میری نظریں ایک بار پھر جوہڑ کی طرف اٹھ گئیں اور اس مرتبہ میں بری طرح چونک گیا۔

جوہڑ کے دوسرے کنارے پر ایک بھیڑیا پانی پی رہا تھا۔ دراصل زبان سے پانی پینے کی "چپڑ چپڑ" کی آواز نے ہی مجھے اس طرف متوجہ کیا تھا۔ پانی پینے کے بعد بھیڑیے نے تھوتھنی اوپر اٹھائی۔ وہ شاید فضا میں کچھ سونگھ رہا تھا اور پھر اس کے منہ سے ایسی آوازیں نکلنے لگیں جیسے اس کی ماں مر گئی ہو اور وہ بین کر رہا ہو۔

بلا بھیڑیے کی آواز سن کر ہڑبڑا کر اٹھ گئی۔ میں نے اسے پکڑ کر اپنے قریب بٹھا لیا۔ وہ پھٹی پھٹی سی نظروں سے اس بھیڑیے کو دیکھ رہی تھی جو اب بھی تھوتھنی اٹھائے بین کر رہا تھا۔

"بھاگو یہاں سے۔" وہ خوف زدہ سی آواز میں بولی "یہ اپنے دوسرے ساتھیوں کو بلا رہا ہے۔ اگر دو چار بھیڑیے اور یہاں جمع ہوگئے تو ہمیں گھیر کر ہمارے بخیے ادھیڑ ڈالیں گے۔"

"تم کیسے کہہ سکتی ہو کہ یہ اپنے دوسرے ساتھیوں کو بلا رہا ہے؟" میں نے کہا۔

"یہ بھیڑیے کی فطرت ہے۔" بلا بولی "وہ اکیلا ہو تو کسی انسان پر حملہ کرنے کی جرات نہیں کرتا لیکن اگر غول کی صورت میں ہوں تو اکیلے دوکیلے انسان کو زندہ بچ کر جانے نہیں دیتے۔ اس سے پہلے کہ اس کے دو چار ساتھی اور آجائیں ہمیں یہاں سے نکل جانا چاہیے۔"

بلا نے غلط نہیں کہا تھا۔ دو تین منٹ بعد ہی جوہڑ کی دوسری طرف تقریباً سو گز کے فاصلے پر درختوں سے ایک اور بھیڑیا نکل کر جوہڑ کے کنارے پر پہنچ گیا اور وہ بھی پہلے بھیڑیے کے ساتھ تھوتھنی اٹھا کر منہ سے بین جیسی آوازیں نکالنے لگا۔ وہ دونوں بار بار ہماری طرف بھی دیکھ رہے تھے۔

خطرے کا احساس ہوتے ہی میں نے بلا کا ہاتھ پکڑا اور ہم چوپایوں کی طرح چلتے ہوئے گنجان درختوں میں جا گھسے اور پھر اٹھ کر تیزی سے ایک طرف دوڑنے لگے۔ جوہڑ کے پرلے کنارے سے بھیڑیوں کے رونے کی آوازیں اب بھی سنائی دے رہی تھیں مگر ہم لمحہ بہ لمحہ ان سے دور ہٹتے جا رہے تھے۔

ہم وہاں سے بہت دور نکل آئے اور یہ شکر ہے کہ ان بھیڑیوں نے ہمارا پیچھا نہیں کیا تھا۔ مجھے اچانک ہی وہ خواب یاد آگیا جو میں نے تین چار روز پہلے دیکھا تھا۔ بھیڑیوں نے بلا کو چاروں طرف سے گھیر رکھا تھا۔ وہ اس پر حملہ کرنے کے لیے لپک رہے تھے۔ اسے چیر پھاڑ کر اپنی خوراک بنانا چاہتے تھے۔

میں نے اسے انسان نما بھیڑیوں کے چنگل سے تو نکال لیا تھا اور اب اصلی خوں خوار بھیڑیوں کے گھیرے میں آتے آتے رہ گئے تھے۔ میں نے بلا کو اپنا خواب سنایا تو وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑی۔

"تو تم مجھے سپنوں میں بھی دیکھنے لگے ہمت سنگھ!" اس نے میری طرف دیکھا تو اس کی آنکھوں میں بڑی پراسرار سی چمک تھی۔

"کیا کہنا چاہتی ہو؟" میں نے اسے گھورا حالانکہ میں اس کا مطلب سمجھ گیا تھا۔

"سپنوں میں تو اس کو دیکھا جاتا ہے جس کی من میں لگن ہو۔"

"اگر لگن نہ ہوتی تو میں اپنی جان خطرے میں ڈال کر تمہیں بچانے کے لیے بھیڑیوں کے اس بھٹ میں کیوں گھستا۔" یہ الفاظ میرے منہ سے بالکل غیر ارادی طور پر نکلے تھے اور یہ کچھ غلط بھی نہیں تھا۔ بلا کی لگن ہی نے مجھے موت کے اس کنوئیں میں کودنے پر مجبور کردیا تھا۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ میں نے جب سے بلا کو دیکھا تھا' اپنے آپ میں عجیب سی ہلچل اور بے چینی سی محسوس کرنے لگا تھا۔ یہ لڑکی میرے حواس پر بری طرح چھا گئی تھی۔

بلا پچھلی رات سے میرے ساتھ تھی۔ رات تو وہ میری گود میں سر رکھ کر سوئی رہی تھی اور صبح سے میرے ساتھ بھاگ رہی تھی۔ میں نے اسے گود میں اٹھا کر ندی پار کی تھی تو اس کے چہرے پر حیا کی سرخی چھا گئی تھی اور اب اس کی جھجک ختم ہوگئی تھی۔ وہ میرے ساتھ جڑ کر چل رہی تھی اور اپنا ایک ہاتھ بھی میری کمر میں حمائل کر رکھا تھا۔

ہم خطرے سے نکل آئے تھے لیکن میرے خیال میں ہم نے خطرے کی آخری حد ابھی پار نہیں کی تھی۔ گنگولی چوہدری کے کئی آدمی میرے اور پولیس کے ہاتھوں مارے گئے تھے۔ جو بچے تھے انہیں ہم پولیس سے الجھا چھوڑ آئے تھے۔ ان کا خطرہ تو فی الحال ٹل گیا تھا لیکن میلوں دور تک پھیلا ہوا یہ جنگل بھی ہمارے لیے بہت بڑا خطرہ تھا۔ یہاں خوں خوار درندے بھی تھے اور ہمیں کچھ پتا نہیں تھا کہ ہم کس طرف جارہے ہیں اور کبھی اس جنگل سے باہر نکل بھی سکیں گے یا نہیں۔

"مجھے بھوک لگ رہی ہے ہمت سنگھ۔"

بلا کی آواز سن کر میں چونک گیا۔ میں اب تک اس کا احساس کو دبائے ہوئے تھا مگر بلا کی قوت برداشت جواب دے گئی تھی۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا۔

"اس طرف چلو۔ شاید وہاں کوئی پھل دار درخت نظر آجائے۔" میں نے ایک طرف اشارہ کیا جہاں گنجان درخت تھے اور ان میں ناریل کے بھی کئی بلند درخت نظر آرہے تھے۔

وہاں پہنچنے میں ہمیں آدھا گھنٹا لگ گیا۔ دوپہر ڈھل چکی تھی۔ سورج کا جھکاؤ مغرب کی طرف تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ سورج ڈوبنے سے پہلے پہلے ہمیں کوئی ایسی محفوظ جگہ تلاش کرلینی چاہیے جہاں ہم رات گزار سکیں۔

درختوں کے نیچے جھاڑیوں میں چند ناریل مل گئے جو نجانے کب سے درختوں سے ٹوٹ کر وہاں پڑے ہوئے تھے۔ میں نے پتلون کے پائنچے سے خنجر نکال لیا اور ایک ناریل کا چھلکا ادھیڑنے لگا۔

ناریل کھول کر میں نے گری میں خنجر کی نوک سے سوراخ کیا اور اسے بلا کی طرف بڑھا دیا۔ بلا نے ناریل منہ سے لگا کر پانی کا ایک گھونٹ بھرا اور میری طرف بڑھا دیا۔ ناریل میں بچا کھچا پانی میں نے حلق میں انڈیل لیا اور خنجر سے ناریل کے ٹکڑے کرنے لگا۔

میں نے ایک اور ناریل اٹھالیا اور ہم وہاں سے آگے چل پڑے۔ سورج غروب ہونے سے پہلے مجھے ایک ایسی جگہ نظر آہی گئی جہاں ہم آرام سے رات گزار سکتے تھے۔ یہ پہاڑی میں ایک کھوہ سی تھی جس میں تین چار آدمی آرام سے لیٹ سکتے تھے۔ اس کھوہ کے سامنے قد آور پودے اور درخت تھے اور اس طرح یہ چھوٹا سا غار کچھ اور بھی محفوظ ہوگیا تھا۔

ابھی دن کی ہلکی سی روشنی تھی۔ میں نے اس صاف ستھرے غار کا جائزہ لے کر اندازہ لگالیا کہ وہاں ہم سے پہلے بھی کوئی نہ کوئی رہتا رہا ہے۔

جب تک دن کی روشنی رہی' ہم باہر بیٹھے رہے اور پھر اندھیرا پھیلتے ہی غار میں آگئے اور درختوں کے قریب ہی دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے اور باتوں میں وقت گزارنے کی کوشش کرنے لگے۔

بلا کے بارے میں' میں نے جو کچھ بھی سنا تھا' خود

بھانوتی منگھم ہی سے سنا تھا۔ وہ تو خود بھی اپنے بارے میں بہت کچھ بتا چکی تھی لیکن بہت سی باتیں ایسی تھیں جو پہلی ملاقات میں نہیں کہہ سکی تھی۔

باہر رات گہری ہو رہی تھی۔ جھینگروں اور حشرات الارض کی آوازیں دلوں پر عجیب سی وحشت طاری کر رہی تھیں۔ غار میں بھی گہرا اندھیرا تھا کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا تھا۔ بلا میرے ساتھ جڑ کر بیٹھی ہوئی تھی۔ آہستہ آہستہ میرے اوپر اس کا بوجھ بڑھتا جارہا تھا اور پھر اس نے اپنا سر میری گود میں رکھ دیا۔

"مجھے ڈر لگ رہا ہے۔" اس کے منہ سے سرگوشی جیسی آواز نکلی۔

"ڈر۔ کس چیز سے۔" میں نے کہا "اندھیرے سے' مجھ سے یا اس جنگل سے؟"

"تم ایسی چیز تو نہیں ہو کہ تم سے ڈرا جائے لیکن ڈر تو ڈر ہی ہوتا ہے۔ یہاں اندھیرا بھی ہے۔ جنگل بھی ہے۔ خوں خوار درندے بھی ہیں اور....."

"دیکھو بلا۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی "ڈر کی ٹریننگ تو ہمیں بچپن ہی سے ملتی ہے اور شروع ہی سے ہمیں بھوت' چڑیل' اندھیرے اور دوسری بہت سی چیزوں سے ڈرایا جاتا ہے لیکن ایک وقت میں ایک ہی چیز سے ڈرنا چاہیے۔ تم نے تو بہت سی چیزوں کے نام لے دیے۔ اب میری سمجھ میں تو نہیں آرہا کہ تم دراصل کس چیز سے ڈر رہی ہو۔"

"تمہیں مذاق سوجھ رہا ہے اور میں واقعی ڈر رہی ہوں۔ دیکھو میرا دل کس تیزی سے دھڑک رہا ہے۔" بلا نے میرا ہاتھ پکڑ کر اپنے سینے پر رکھ دیا۔

بلا نے ایسا بے اختیاری میں کیا تھا اور میرے خیال میں اس کے ذہن میں کوئی پراگندگی بھی نہیں تھی لیکن اس کی اس معصومانہ حرکت سے میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ کنپٹیاں سلگ اٹھیں اور دماغ میں دھماکے سے ہونے لگے۔

وہ میرا ہاتھ پکڑ کر اپنے سینے پر دبا رہی تھی۔ میری گردن پر چیونٹیاں سی رینگنے لگیں اور جسم کے مسام پسینہ اگلنے لگے۔

"دیکھا۔ دیکھا میرا دل کتنی زور سے دھڑک رہا ہے؟" اس نے میرا ہاتھ دباتے ہوئے کہا۔

بلا کے دل کی دھڑکن تو میں محسوس نہیں کرسکا لیکن میرے دل کی دھڑکن خطرناک حد تک بڑھ گئی تھی۔ لگتا تھا جیسے میرے سینے میں دھڑکتا ہوا گوشت کا لوتھڑا سینے کا پنجرہ توڑ کر باہر نکل آئے گا۔

میں نے اپنا ہاتھ پیچھے ہٹانا چاہا مگر اس نے میرے ہاتھ پر اپنے ہاتھ کا دباؤ مزید بڑھا دیا۔ اسے شاید احساس ہوگیا تھا کہ وہ کیا حرکت کر گزری ہے اور شاید اب وہ اس ڈر اور خوف کے کھیل کو آگے بڑھانا چاہتی تھی۔ اس نے دوسرا ہاتھ میری گردن میں ڈال دیا اور دباؤ ڈالتے ہوئے میرا چہرہ اپنے چہرے کے قریب لانے لگی۔

اس کی گرم گرم بے ربط سانسیں میرے چہرے سے ٹکرا رہی تھیں اور پھر مجھے یوں لگا جیسے میرے ہونٹوں پر انگارے رکھ دیے گئے ہوں۔ ان انگاروں کی تپش میرے اندر تک پھیلتی جارہی تھی۔

اور پھر اچانک میرے دماغ میں جھماکا سا ہوا۔ مجھے گولڈن ٹرائی اینگل کی وہ رات یاد آگئی۔ بالکل ایسی ہی صورت حال تھی۔ میں اور سونیا موت کے ہرکاروں سے بچنے کے لیے ایسے ہی ایک غار میں پناہ گزیں ہوگئے تھے۔ ایسی ہی کالی رات تھی۔ اندھیرا غار۔ ہمارے داؤں پر موت کے ہرکاروں کا خوف طاری تھا لیکن اس تاریک غار میں ایک دوسرے کے قرب میں وہ خوف ہمارے ذہنوں سے نکل گیا تھا۔ گھنگھور اندھیرے میں ہم ایک دوسرے کو دیکھ نہیں سکتے تھے لیکن لمس سے ایک دوسرے کی موجودگی کو محسوس کرسکتے تھے۔

بالکل ایسے ہی ہوا تھا۔ سونیا اس اندھیرے غار میں اسی طرح میرے کندھے پر سر رکھ کر لیٹی تھی۔ میں اس کے بالوں میں انگلیاں پھیر رہا تھا۔ بالکل اسی طرح سونیا نے میری گردن میں بازو ڈال کر میرا چہرہ اپنے چہرے پر جھکایا تھا۔ میں نے اپنے چہرے پر اس کی گرم سانسوں کا لمس محسوس کیا تھا اور پھر اس کے ہونٹوں کی تپش نے میرے سینے میں آگ لگا دی تھی اور میں سب کچھ بھول گیا تھا۔ اپنے کردار کی عظمت کو بھول گیا تھا اور میں بلندیوں سے پستیوں کی طرف گرتا چلا گیا تھا۔

وقت اپنے آپ کو اسی رنگ اور اسی انداز میں دہرا رہا تھا۔

"نہیں!" میرے اندر سے کوئی چیخا۔

میں ایک جھٹکے سے سیدھا ہوگیا۔ اپنے ہاتھ کھینچ لیے۔ بلا تڑپ کر مجھ سے لپٹ گئی۔ میں نے بڑی آہستگی سے اسے اپنے سے الگ کردیا۔

"کیا ہوا ہمت سنگھ۔ ناراض ہوگئے؟" اندھیرے میں بلا کی لرزتی ہوئی آواز سنائی دی۔

"نہیں بلا۔" میں نے اپنی اندرونی کیفیت پر قابو پاتے

ہوئے کہا "جو کچھ ہوا... مجھے چھما (معاف) کردو۔ میں کوئی ایسی حرکت نہیں کرنا چاہتا جس سے میرے اور گنگولی چوہدری کے بیچ فرق مٹ جائے۔ ہمیں یہ سب کچھ شوبھا (زیب) نہیں دیتا۔ بیٹھ جاؤ۔ ہم باتیں کریں گے۔ بہت ساری باتیں۔"

"ہاں۔ باتیں تو تم بہت اچھی کرلیتے ہو۔" بلا نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا "تم نے کل رات یہ بھی کہا تھا ناکہ تمہیں مجھ سے بڑی لگن ہے اور یہ لگن ہی تمہیں اس خطرناک جنگل میں لے آئی تھی جہاں گنگولی چوہدری جیسے لٹیروں نے مجھے اپنے قبضے میں لے رکھا تھا۔"

"ہاں بلا۔ میں اس سے انکار نہیں کروں گا۔" میں نے پرسکون لہجے میں جواب دیا۔ ویسے میں اس کے طنز کو سمجھ گیا تھا "لیکن تم تو پڑھی لکھی لڑکی ہو۔ سمجھ دار ہو لیکن یہ چھوٹی سی بات تمہاری سمجھ میں کیوں نہیں آسکی کہ جس کھلونے سے کھیل لیا جائے اس سے جی بھر جاتا ہے۔ میں نے تمہیں ایک دوست کی طرح اپنے دل میں جگہ دی ہے اور دوستی تو وہ پوتر اور مقدس رشتہ ہے جس کی بنیاد وفا اور اعتماد پر قائم ہوتی ہے اور اگر اعتماد ہی چکنا چور ہوجائے تو اس رشتے کا تقدس بھی ختم ہوجاتا ہے۔"

"مجھے نیند آرہی ہے۔"... نے جواب دیا۔

میں اس کی ناراضگی کو سمجھ گیا "آؤ۔ میری گود میں سر رکھ کر سوجاؤ۔" میں نے کہا اور اسے بازو سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچ لیا۔

وہ واقعی ناراض تھی۔ اس نے کوئی بات نہیں کی۔ میں اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتا رہا اور کچھ دیر بعد وہ واقعی سوگئی۔ میں اسی طرح دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا رہا اور پھر میری آنکھیں بھی بند ہونے لگیں۔

پرندوں کے چہچہانے اور ان کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ کی آواز سے میری آنکھ کھل گئی۔ بلا میرے پاس نہیں تھی۔ وہ غار میں بھی نہیں تھی۔ میں نے باہر دیکھا۔ دن کی روشنی پھیل رہی تھی۔ میں اپنی جگہ سے اٹھ کر تیزی سے باہر آگیا اور پھر میرے منہ سے گہرا سانس نکل گیا۔

بلا غار سے چند گز دور ایک پتھر سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ میں بھی اس کے قریب بیٹھ گیا۔ اس نے آنکھیں کھول کر میری طرف دیکھا مگر بولی کچھ نہیں۔ وہ واقعی ناراض تھی۔

"کتنا اچھا لگ رہا ہے یہاں بیٹھنا۔" میں نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا "پرندوں کے سریلے نغمے، تازہ ہوا، پھولوں کی مہک۔ کتنی خوشگوار فضا ہے۔ ہر قسم کی آلودگی سے پاک۔ تم نے کبھی یوگا کی پریکٹس کی ہے؟"

"کیسے کرتی تھی۔ عرصہ ہوا چھوڑ دی۔" بلا نے جواب دیا۔

"میں نے بھی بہت عرصے سے پریکٹس نہیں کی۔ چلو آج دونوں تھوڑی سی مشق کرلیتے ہیں۔" میں نے کہا اور ذرا آگے جاکر ہموار جگہ پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ میرا ایک پیر دوسرے پیر پر تھا اور کمر بالکل سیدھی تھی۔ بلا بھی یہی پوسچر (آسن، انداز، پوزیشن) بنا کر بیٹھی تھی جس کا مطلب تھا کہ وہ یوگا جانتی تھی۔

"تم تو جانتی ہو۔" میں نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا "یوگا تیاگ یا خوابیدگی کی کوئی علامت نہیں بلکہ یہ ایک ضبط ہے۔ جس میں کامیابی کے بعد ایک نشہ سا طاری ہوجاتا ہے۔ فخر و برتری کا نشہ۔ یہ احساس کہ ہم نے اپنی خارجی اور داخلی کیفیات کو اپنے طابع کرلیا ہے۔ یہ احساس اس مخفی قوت کا سرچشمہ ہے جو یوگا میں کامیابی کے بعد ہمارے اندر انگڑائی لے کر بیدار ہوتی ہے پھر آدمی کسی سے خوف نہیں کھاتا۔"

میں نے خاموش ہو کر اس کی طرف دیکھا۔ اس نے گردن ہلا دی۔

میں نے مزید کچھ نہیں کہا اور آنکھیں بند کرلیں۔

ہماری یہ پریکٹس آدھے گھنٹے سے زیادہ جاری نہیں رہ سکی۔ بلا نے آسن توڑ دیا تھا۔ مجھے بھی مشق ختم کرنی پڑی۔ بلا جیسی لڑکی کے لیے اتنی مشق ہی بہت تھی۔

سورج طلوع ہو رہا تھا۔ میں نے دوسرا ناریل بھی ادھیڑ ڈالا اور اس طرح ناریل کا ناشتا کرتے ہوئے ہم وہاں سے چل پڑے۔ ابھی کچھ ہی دور گئے تھے کہ ایک فائر کی آواز سن کر میں اچھل پڑا۔ یہ آواز اگرچہ بہت دور کی تھی لیکن ہمارے لیے خطرے کی علامت تھی۔ پولیس اور ڈاکوؤں میں ابھی تک آنکھ مچولی کا کھیل جاری تھا۔ میرا خیال تھا کوئی ایک آدھ ڈاکو ہی بچا تھا اور شاید اس کا تعاقب کرنے والا بھی فرد واحد ہی تھا۔ انہوں نے کہیں رات گزاری تھی اور پھر ایک دوسرے کے پیچھے لگ گئے تھے۔

بلا کے چہرے پر ایک بار پھر خوف کے سائے ابھر آئے تھے۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ اور ایک طرف دوڑنا شروع کردیا۔ اس کے بعد اگرچہ فائر کی کوئی آواز سنائی نہیں دی تھی مگر میں اپنے آپ کو محفوظ کرلینا چاہتا تھا۔

ہم رکتے دوڑتے وہاں سے میلوں دور چلے گئے۔ اس وقت ہم ایک پہاڑی پر تھے۔ یہاں بھی درختوں اور جھاڑیوں

کی بہتات تھی۔ بلا چلتے چلتے لڑکھڑا کر گر گئی۔

"اب مجھ سے نہیں چلا جاتا۔" وہ کراہ رہی تھی "پانی۔ مجھے پانی دو۔ میرا گلا خشک ہو رہا ہے۔ سانس رک رہا ہے۔"

میری آنکھوں میں تشویش ابھر آئی۔ میں چند لمحے ادھر ادھر دیکھتا رہا پھر ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

"تم یہیں رکو۔ میں اس طرف دیکھتا ہوں۔ شاید پانی مل جائے۔"

"جلدی آجانا۔ مم... مجھے ڈر لگ رہا ہے۔" بلا نے کراہتے ہوئے کہا۔

میں جواب دیے بغیر دوڑتا ہوا نشیب میں اترتا چلا گیا۔ تقریباً دس منٹ بعد میں ایک چھوٹی سی ندی پر پہنچ گیا اور اتفاق سے ایک ناریل کے گری کے اوپر والے سخت چھلکے کا آدھا حصہ بھی مل گیا جو کسی کٹورے کی طرح تھا۔ شاید ابھی کوئی ادھر سے گزرا تھا جس نے یہ پیالہ نما ناریل کا چھلکا یہاں پھینک دیا تھا۔

میں نے ناریل کے پیالے کو خوب اچھی طرح دھو کر پہلے خود پانی پیا اور پھر پیالہ بھر کر واپس چل پڑا۔ واپسی میں بھی مجھے دس منٹ لگ گئے اور جب میں پودوں سے نکل کر کھلی جگہ پر آیا تو اس درخت کے نیچے بلا کو نہ پاکر پریشان ہوگیا۔

جگہ وہی تھی مگر بلا غائب تھی۔ وہ کہاں جاسکتی ہے؟ میں سوچتے ہوئے آگے بڑھ کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ ہوسکتا ہے کسی جانور کو دیکھ کر بلا ڈر گئی ہو اور اس سے بچنے کے لیے جھاڑیوں میں چھپ گئی ہو۔

"بلا۔ کہاں ہو تم۔ میں آگیا ہوں۔ دیکھو تمہارے لیے پانی لے آیا ہوں۔" میں نے بلا کو پکارا۔

جواب میں خاموشی رہی۔

"بلا۔ کہاں ہو تم؟" میں نے اس مرتبہ زیادہ اونچی آواز میں پکارا۔

اس مرتبہ ایک طرف سے گھٹی گھٹی سی آواز سنائی دی۔ میں اس طرف مڑ گیا۔ اس طرف چوڑے پتوں والے قد آدم پودوں میں حرکت ہو رہی تھی اور چند سیکنڈ بعد میں نے جو منظر دیکھا وہ بہت ہی خوفناک تھا۔

وہ گنگولی چوہدری تھا جس نے ایک ہاتھ بلا کی گردن پر سے گھما کر اس کا منہ بند رکھا تھا اور دوسرے ہاتھ میں پکڑے ہوئے خنجر کی نوک اس کے برہنہ سینے سے لگا رکھی تھی۔

"تر سمجھتے تھے چھوکری کو لے کر بھاگ جاؤ گے۔" گنگولی کے حلق سے بھیڑیے کی سی غراہٹ نکلی "گنگولی شیر

ہزاروں ماہرین طب کی آرا
گارنٹی میں مرتب کردہ کتاب
مٹاپا
اور
اس کا سدباب
قیمت 45 روپے ٭ ڈاک خرچ 23 روپے
مٹاپا..... دل سے دشمنی
مٹاپا..... زندگی کا خاتمہ
کیا آپ چاہتے ہیں کہ یہ دونوں باتیں آپ کے ساتھ نہ ہوں۔
تو پھر جلدی کیجئے.....
ہماری مرتب کردہ کتاب
"مٹاپا اور اس کا سدباب" کا مطالعہ ضرور کیجئے اس کتاب میں وہ سب کچھ ہے جس پر عمل کر کے آپ ایک متناسب اور سڈول جسم کے مالک بن سکتے ہیں۔
کتاب کی قیمت مع ڈاک خرچ بذریعہ پیشگی منی آرڈر/ ڈرافٹ یا کراسڈ چیک ارسال کریں
[redacted]
D.H.A فیز III ایکس ٹینشن C-63 مین کورنگی روڈ کراچی

ہے اور اس کے منہ سے شکار چھیننے کے لیے کوئی مائی کا لال ابھی پیدا نہیں ہوا۔"

میرے دماغ میں سنسناہٹ ہو رہی تھی مگر میں نے فوراً ہی اپنی کیفیت پر قابو پالیا۔ پانی کا پیالہ ابھی تک میرے ہاتھ میں تھا۔ دوسرے ہی لمحے میں نے وہ پیالہ پوری قوت سے چوہدری کی طرف اچھال دیا۔

آدھے سے زیادہ پانی راستے ہی میں گر گیا لیکن ناریل کا پیالہ گنگولی چوہدری کے منہ پر لگا۔ اس کے منہ سے گندی گالی نکلی۔ اس کا خنجر بلا کے سینے سے ہٹ گیا اور یہی میں چاہتا تھا۔ میں نے ایک بھی لمحہ ضائع کیے بغیر چھلانگ لگا دی اور چوہدری کو ساتھ لیتا ہوا زمین پر گرا۔ بلا بھی چیختی ہوئی ایک طرف گر گئی تھی۔

خنجر چوہدری کے ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا۔ میں کچھ دیر چوہدری کو رگیدتا رہا پھر اس کا داؤ چل گیا۔ اس کی چند ٹھوکریں کھانے کے بعد ہم دونوں ایک بار پھر ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو گئے اور ایک دوسرے کو رگیدتے ہوئے پہاڑی کے کنارے کے قریب پہنچ گئے۔ دوسری طرف عمودی ڈھلان تھی اور سیکڑوں فٹ گہرا کھڈ۔

میں نے اپنے آپ کو اس کی گرفت سے چھڑایا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ گنگولی چوہدری مجھ پر ٹھوکریں برسا رہا تھا اور میں اس سے بچنے کے لیے پیچھے ہٹ رہا تھا۔

اور پھر یہ سنسنی خیز انکشاف ہوا کہ وہ اس طرح مجھے کھڈ کے کنارے کی طرف لا رہا تھا۔ کھڈ کا کنارہ صرف چند فٹ دور رہ گیا تھا۔

گنگولی کی ایک ٹھوکر سے بچنے کے لیے میں نے اچھلنا چاہا تو ایک پتھر میرے پیر کے نیچے سے نکل گیا۔ میں لڑکھڑا کر گرا اور کنارے کی طرف لڑھکنے لگا۔

میری ٹانگیں عمودی کنارے سے نیچے لٹک گئی تھیں اور میں نے اپنے آپ کو گرنے سے بچانے کے لیے کنارے پر ایک جھاڑی کی شاخوں کو پکڑ لیا۔ نیچے کی طرف نگاہ ڈالی تو سینے میں سانس رکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ کھڈ سیکڑوں فٹ گہرا تھا اور نیچے بڑے بڑے پتھر تھے۔

میرے جسم کے مسام پسینہ اگلنے لگے۔

گنگولی چوہدری پر جنون طاری تھا۔ وہ جھاڑی پر سے میری گرفت چھڑانے کے لیے میرے ہاتھوں پہ ٹھوکریں برسا رہا تھا۔ موت مجھے آنکھوں کے سامنے نظر آنے لگی اور میں نے آنکھیں بند کر لیں۔

میرے سیدھے ہاتھ پر گنگولی چوہدری کے پیر کی ایک اور ٹھوکر لگی۔ یہ ٹھوکر پہلے سے زیادہ زوردار تھی۔ اس نے جو گرز پہن رکھے تھے اور جوتے کی ٹو نے میری انگلیوں کے جوڑوں کی کھال ادھیڑ دی تھی۔ میں بے اختیار کراہ اٹھا۔ جھاڑی پر میری گرفت بھی ڈھیلی پڑ گئی۔ اب میرا سارا زور بائیں ہاتھ پر تھا جس سے میں نے جھاڑی کی دوسری شاخ کو پکڑ رکھا تھا۔

گنگولی چوہدری کی حالت واقعی اس درندے جیسی تھی جس کے منہ سے اس کا نوالہ چھین لیا گیا ہو۔ وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ اس نے میرے سیدھے ہاتھ پر ایک اور ٹھوکر لگائی۔ اس مرتبہ اسے مایوسی نہیں ہوئی۔ جھاڑی میرے ہاتھ سے نکل گئی۔ مجھے ایک جھٹکا سا لگا۔ اب میں نے صرف بائیں ہاتھ سے جھاڑی کی دوسری شاخ کو گرفت میں لے رکھا تھا اور گنگولی جس طرح میرے ہاتھوں پر وزنی ہتھوڑے کی طرح ٹھوکریں برسا رہا تھا اس سے کسی بھی لمحے میرے دوسرے ہاتھ کی گرفت بھی چھوٹ سکتی تھی۔

میں نے گردن جھکا کر نیچے کی طرف دیکھا۔ مجھے سیکڑوں فٹ نیچے کی زمین گھومتی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ میں نے سر کو دو تین جھٹکے دے کر اپنے حواس پر قابو پالیا۔ اس وقت معمولی سا خوف بھی میرے حوصلے کی مضبوط بنیادوں کو ہلا سکتا تھا اور یہ دراصل حوصلہ ہی تھا کہ میں اب تک زندگی اور موت کے درمیان لٹکا ہوا تھا۔

گنگولی اب میرے دوسرے ہاتھ پر ٹھوکریں برسا رہا تھا۔ میرے سیدھے ہاتھ کی انگلیوں کے جوڑوں کی کھال ادھڑ گئی تھی جس سے بہت ہلکا سا خون رسنے لگا تھا۔ میں نے اپنے آپ کو ہلکا سا جھٹکا دے کر اس ہاتھ سے ایک بار پھر جھاڑی کی ایک شاخ کو پکڑ لیا۔

چٹان کے کنارے پر پتھروں میں وہ جھاڑی اگرچہ خاصی مضبوط تھی لیکن مجھے خدشہ تھا کہ اس کی جڑیں زیادہ دیر تک اپنی جگہ پر جمی نہیں رہ سکیں گی۔ یہ چٹان پتھروں اور سرخ بھربھری مٹی پر مشتمل تھی۔ گنگولی چوہدری کی ہر ٹھوکر کے ساتھ سرخ مٹی بھی اڑ رہی تھی۔ ہر ٹھوکر سے ساتھ میرے جسم کو جھٹکے بھی لگ رہے تھے اور ڈر اس بات کا تھا کہ کسی جھٹکے کے ساتھ جھاڑی کی جڑیں اپنی جگہ نہ چھوڑ دیں۔

کچھ دیر پہلے گنگولی چوہدری نے بلا کو اٹھا کر ایک طرف پھینک دیا تھا۔ گرنے سے اس کے سر پر شاید چوٹ لگی تھی۔ وہ کچھ دیر جھاڑیوں میں بے حس و حرکت پڑی رہی پھر اٹھ کر چیختی ہوئی گنگولی چوہدری کی ٹانگوں سے لپٹ گئی اور اسے وہاں

سے چیخ چیخ کر بھاگنے کی کوشش کرنے لگی۔ اس کے ساتھ ہی وہ چیخ چیخ کر مجھے بھی خبردار کر رہی تھی۔

"ہمت سنگھ! ہمت کرو۔ میں نے اسے پکڑ رکھا ہے۔ تم اوپر آنے کی کوشش کرو۔"

وہ گنگولی چوہدری کو وہاں سے چند فٹ دور لے جانے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ گنگولی چوہدری اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے غلیظ گالیاں بک رہا تھا۔ اس نے اپنی ایک ٹانگ چھڑا لی۔ دوسری ٹانگ اب بھی بلا کی گرفت میں تھی۔ وہ جونک کی طرح اس سے لپٹی ہوئی تھی۔ میں اس نازک بدن لڑکی کی ہمت کی داد دیے بغیر نہ رہ سکا۔ گنگولی چوہدری اپنی آزاد ٹانگ سے اسے ضربیں لگا رہا تھا مگر بلا جس طرح دلیری سے اس صورتِ حال کا مقابلہ کر رہی تھی وہ قابلِ تعریف تھا۔

"ہمت سنگھ۔ اوپر آؤ۔ جلدی کرو۔"

میں نے اب جھاڑی کی شاخوں کو مضبوطی سے دونوں ہاتھوں میں پکڑ رکھا تھا۔ میں نے گرفت کچھ اور مضبوط کر کے دونوں پیر چٹان پر جما دیے۔ اس وقت میری پوزیشن بالکل ایسے تھی جیسے کوئی کوہ پیما رسی سے لٹک کر چٹان پر پیر جمائے اوپر چڑھنے کی کوشش کر رہا ہو۔

میرے دونوں پیر قریب قریب چٹان پر جمے ہوئے تھے پھر میں نے سیدھا پیر اٹھا کر اس جگہ سے تقریباً ایک فٹ اوپر رکھا پھر دوسرا پیر اس سے ایک فٹ اوپر لے گیا۔ ایسا کرتے ہوئے میرا تمام تر بوجھ جھاڑی پر پڑ رہا تھا۔

میں نے سیدھا پیر مزید اوپر بڑھایا تو مجھے ہلکا سا جھٹکا لگا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے اپنا دل سینے کے بجائے کنپٹیوں میں دھڑکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ جھٹکا لگنے سے میں کچھ نیچے آ گیا تھا۔ جھاڑی کی جڑیں ہل گئی تھیں۔ میرے جسم کے مسام ایک بار پھر تیزی سے پسینہ اگلنے لگے۔ میں بے حس و حرکت ہو گیا اور گہرے گہرے سانس لینے لگا۔ اگر میں چٹان پر پیر جما کر اوپر چڑھنے کی کوشش کرتا تو سارا بوجھ جھاڑی پر پڑتا اور جھاڑی کی جڑیں اکھڑنے میں زیادہ دیر نہیں لگتی۔ ویسے بھی میرا بوجھ جھاڑی پر تھا۔ جڑیں ہل چکی تھیں اور جھاڑی کسی بھی لمحے اپنی جگہ چھوڑ سکتی تھی۔ مجھے اپنے چاروں طرف موت کے سائے رقص کرتے ہوئے نظر آ رہے تھے اور بلا کے چیخنے کی آوازیں ان لمحات کو اور بھی سنگین بنا رہی تھیں۔ وہ اب بھی گنگولی چوہدری کو اس جگہ سے دور رکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

اچانک میرے ذہن میں ایک اور خیال ابھرا۔ میرے پاس چی کی وہ پُراسرار قوت موجود تھی جو ایسے موقع پر میری مدد کر سکتی تھی۔ مجھے شاؤلن ٹیمپل میں ٹریننگ کے دوران میں ماسٹر ینگ پائی کی سنائی ہوئی وہ کہانی یاد آ گئی کہ کس طرح زمانۂ قدیم میں بدھ بھکشو پرندوں کی پشت پر بیٹھ کر سفر کر لیا کرتے تھے اور پرندے کو اس کا احساس بھی نہیں ہوتا تھا کہ ان کے اوپر کوئی بوجھ لدا ہوا ہے۔ ان بھکشوؤں کے پاس چی کی قوت تھی اور وہ اس سے کام لینا جانتے تھے۔ چی کی وہ پُراسرار قوت میرے پاس بھی تھی لیکن مجھے یقین نہیں تھا کہ میں اس درجے تک پہنچ سکا ہوں جس پر زمانۂ قدیم کے وہ بھکشو فائز تھے۔ بہرحال میں نے اپنے اندر کی اس پُراسرار قوت کو آزمانے کا فیصلہ کر لیا۔

اس وقت میرے جسم کو ایک اور ہلکا سا جھٹکا لگا۔ جھاڑی کی جڑوں نے چند انچ اور جگہ چھوڑ دی تھی۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ اپنے اندر اس پُراسرار قوت کو آواز دینے کے لیے مراقبہ اور ارتکاز ضروری نہیں تھا اور مجھ جیسے شخص کے لیے بھی یہ ضروری نہیں تھا کہ مراقبے کے لیے کسی جگہ اسٹائس بنا کر بیٹھا جائے۔ میں تو اپنی کسی بھی مصروفیت کے دوران میں چند لمحوں کے لیے بھی مراقبے میں جا سکتا تھا۔

اور اس وقت مجھے مایوسی نہیں ہوئی۔ بہت معمولی سے انداز میں حرکت کرتی ہوئی جھاڑی رک گئی۔ میں اپنے آپ کو بہت ہلکا پھلکا سا محسوس کرنے لگا۔ ایک لمحے کو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرا وزن ختم ہو گیا ہو۔ میں ہلکے پھلکے کاغذ کی طرح لٹکا ہوا ہوں۔ بے وزنی کی یہ کیفیت مجھے بہت عجیب سی لگی۔

گنگولی نے بلا کو ایک بار پھر دور جھاڑیوں میں اچھال دیا تھا اور وہ دوبارہ میرے ہاتھوں پر ٹھوکریں برسانے لگا اور میں اس کی ٹھوکریں برداشت کرتا رہا۔

بلا اٹھ کر چیختی چلاتی ادھر ادھر دوڑ رہی تھی۔ اسے کسی ایسی چیز کی تلاش تھی جس سے گنگولی چوہدری پر حملہ کر سکے۔ وہ ایک بوڑھے کی ڈنڈا نما شاخ کو پکڑ کر زور زور سے جھٹکے دینے لگی لیکن وہ شاخ ٹوٹ کر نہیں دی۔ وہ اس شاخ کو چھوڑ کر پاگلوں کی طرح چیختی ہوئی ایک بار پھر ادھر ادھر دوڑنے لگی اور بالآخر ایک بڑا سا پتھر دونوں ہاتھوں میں اٹھا کر گنگولی چوہدری کی طرف لپکی۔

پتھر خاصا بڑا تھا اور بلا نے عقل مندی یہ کی کہ گنگولی کی طرف آتے ہوئے اس نے چیخنا بند کر دیا تھا لیکن گنگولی چوہدری بھی غافل نہیں تھا۔ آہٹ پا کر وہ تیزی سے پیچھے مڑا۔ اس دوران میں بلا حملہ کر چکی تھی۔ گنگولی چوہدری نے

جھکائی دے کر بچنے کی کوشش کی مگر پتھر اس کے سر پر لگا۔ وہ چیختا ہوا دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ کر دہرا ہو گیا۔ اس کے سر سے خون بہہ نکلا تھا۔ بلا نے اسے زور دار لات رسید کر دی۔ وہ لڑھکڑا کر گرا اور دوسری طرف کی ڈھلان پر پودوں کی طرف لڑھکتا چلا گیا۔

"آؤ... آؤ ہمت سنگھ۔ میرا ہاتھ پکڑ کر اوپر آجاؤ۔" بلا نے جھک کر ہاتھ آگے بڑھا دیا۔

میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ بلا سینے کے بل لیٹ گیا اور مجھے اوپر کھینچنے لگی۔

میرا اوپر کا دھڑ چٹان پر پہنچ گیا تھا۔ میں نے جھاڑی کو کچھ اور پیچھے سے پکڑ لیا اور اوپر آنے کے لیے زور لگانے لگا۔ میری ٹانگیں ابھی تک نیچے لٹکی ہوئی تھیں کہ گنگولی چوہدری وحشی کی طرح چیختا ہوا ہماری طرف لپکا۔ اس نے بلا کو ٹانگوں سے پکڑ لیا اور اسے کھڈ کی طرف دھکیلنے لگا۔ شاید اس نے سوچا ہو کہ ہم دونوں کو کھڈ میں دھکیل کر موت کے گھاٹ اتار دیا جائے۔

"بلا! میرا ہاتھ چھوڑ دو۔" میں نے چیخ کر کہا۔

بلا نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا۔ میں نے جھاڑی کو دونوں ہاتھوں سے مضبوطی سے پکڑ کر اپنے آپ کو جھٹکا دیا۔ دوسرے ہی لمحے میں اوپر آچکا تھا۔ گنگولی چوہدری اب بھی بلا کو ٹانگوں سے پکڑ کر کھڈ کی طرف دھکیلنے کی کوشش کر رہا تھا اور بلا بری طرح چیخ رہی تھی۔

مجھے سنبھلنے میں صرف ایک سیکنڈ لگا تھا۔ اس جھاڑی کو چھوڑتے ہی میں اپنے آپ میں آگیا تھا یا یوں کہئے کہ میری بے وقوفی کی کیفیت ختم ہو گئی تھی۔

گنگولی چوہدری بلا کی ٹانگیں پکڑے کسی قدر آگے کو جھکا ہوا تھا۔ اس کے سر سے بہتے ہوئے خون نے اس کے چہرے کے کچھ حصے کو بھی تر کر دیا تھا جس سے اس کا چہرہ کچھ اور بھی بھیانک ہو گیا تھا۔

میں نے بڑی تیزی سے اپنی جگہ سے حرکت کی اور دبنے کی طرح اس کے پیٹ میں زور دار ٹکر مار دی۔ گنگولی چوہدری ڈکراتا ہوا پیچھے گرا اور لڑھکتا ہوا جھاڑیوں میں جا گرا۔ میں نے بھی چھلانگ لگا دی۔

ہم دونوں ایک بار پھر ایک دوسرے کو رگیدنے لگے۔

گنگولی نے ایک موقع سے فائدہ اٹھایا اور میرے سینے پر سوار ہو کر دونوں ہاتھ میری گردن پر جما دیے۔ اس کے انگوٹھے میرے نرخرے پر تھے۔

"میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔" وہ غرایا۔ اس کے چہرے پر بے پناہ سفاکی تھی "تمہاری وجہ سے میرا سب کچھ تباہ ہو گیا۔ میرے سارے دوست ختم ہو گئے۔ میرا راج ختم ہو گیا۔ سیکڑوں میل تک میری دہشت تھی۔ بڑے بڑے سورما میرا نام سن کر تھر تھر کانپتے تھے لیکن تمہاری وجہ سے سب کچھ ختم ہو گیا۔ میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا اور اس چھوکری کو بھی جہنم میں پہنچا دوں گا۔"

میرے نرخرے پر اس کے انگوٹھوں کا دباؤ بڑھتا جا رہا تھا۔ مجھے سینے میں سانس رکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ گنگولی چوہدری کے چہرے پر درندگی بڑھتی جا رہی تھی اور پھر اس کے پیچھے بلا کو دیکھ کر میں چونک گیا۔ اسے کہیں سے ایک موٹی سی لکڑی مل گئی تھی جسے اس نے دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر سر سے اوپر اٹھا رکھا تھا۔

میری نظروں سے گنگولی چوہدری نے کسی گڑبڑ کا اندازہ لگا لیا۔ اس نے گردن گھمائی۔ بلا اس دوران میں حملہ کر چکی تھی۔ گنگولی کا سر توپ گیا۔ لکڑی کا وار اس کے بائیں کندھے پر پڑا۔

میرے گلے سے اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ میں نے اس کی دونوں کلائیوں کو پکڑ کر زور دار جھٹکا دیا۔ اپنی گردن آزاد ہوتے ہی میں نے اس کی ایک کلائی چھوڑ کر اس کے جبڑے پر زور دار گھونسا مار دیا۔ اس کے ساتھ ہی بلا نے بھی دوسرا وار کر دیا تھا اور یہ وار بھی گنگولی کے بائیں کندھے پر ہی پڑا تھا۔ وہ بلبلا اٹھا۔ میں نے اسے اپنے اوپر سے دھکیل دیا اور بڑی پھرتی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

گنگولی چوہدری نے بھی اٹھنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔ اس وقت بلا اس پر تیسرا حملہ کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ گنگولی نے اپنے سر کی طرف آنے والی لکڑی کو ایک ہاتھ میں روک لیا اور دوسرے ہاتھ سے بلا کے منہ پر زور دار تھپڑ مار دیا۔ بلا چیختی ہوئی گری۔ گنگولی اس کے ہاتھ سے چھینی ہوئی لکڑی سے مجھ پر حملہ آور ہوا لیکن میں نے اسے موقع نہیں دیا۔ میں اپنی جگہ پر کھڑے کھڑے کسی طاقت ور اسپرنگ کی طرح اچھلا۔ میرے دونوں پیر اس کے سینے پر لگے اور وہ چیختا ہوا پشت کے بل گرا۔ میں نے دوبارہ اس پر چھلانگ لگا دی لیکن میرا پیر جھاڑی میں الجھ گیا اور میں لڑکھڑا کر گر گیا۔

"ہمت سنگھ۔ اٹھو۔ یہ خنجر لو اور اس وحشی کے ٹکڑے کر دو۔" بلا کے چیخنے کی آواز سن کر میں نے اس کی طرف دیکھا۔ اسے کہیں سے گنگولی چوہدری والا خنجر مل گیا تھا۔

لیکن مجھ سے پہلے گنگولی چوہدری نے بلا پر چھلانگ لگا دی۔ اس کے پیٹ میں لگنے والی گنگولی کی ٹھوکر بہت زور دار تھی۔ وہ چیختی ہوئی دہری ہو کر گری۔ خنجر بھی اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ گنگولی خنجر کی طرف لپکا۔ میں نے اس پر چھلانگ لگا دی۔

خنجر گنگولی کے ہاتھ میں آچکا تھا۔ اس نے بڑی تیزی سے ایک طرف لوٹ لگا دی۔ میں اپنی ہی جھونک میں منہ کے بل گرا۔ اگر میں دونوں ہاتھ زمین پر نہ ٹکا دیتا تو میرے دانت ٹوٹ جاتے۔ گنگولی نے خنجر سے مجھ پر وار کرنے کی کوشش کی لیکن میں نے بڑی پھرتی سے اپنی ٹانگوں کو حرکت دے کر اس کی گردن کو پیروں کی قینچی میں لے لیا۔ اس کا خنجر والا ہاتھ اٹھے کا اٹھا رہ گیا۔

بلا ایک بار پھر لکڑی اٹھا کر چیختی ہوئی اس کی طرف لپکی لیکن اسی لمحے دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سن کر وہ رک گئی اور مڑ کر اس طرف دیکھنے لگی۔ ان قدموں کی آوازوں سے میں بھی چونک گیا۔ اگر وہ گنگولی چوہدری کا کوئی ساتھی ہوا تو پھر ہماری زندگیوں کی کوئی ضمانت نہیں دی جا سکتی تھی۔

میں نے آواز کی سمت دیکھا اور اسی لمحے فضا فائر کی آواز سے گونج اٹھی۔ میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا لیکن دوسرے ہی لمحے پولیس انسپکٹر نور پانڈے کو جھاڑیوں سے برآمد ہوتے دیکھ کر میرے منہ سے بے اختیار گہرا سانس نکل گیا۔

میں نے گنگولی چوہدری کی گردن اب بھی ٹانگوں کی قینچی میں لے رکھی تھی اور میرے اس رویے کی وجہ سے وہ اب تک خنجر سے مجھ پر حملہ کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔

"گنگولی چوہدری۔" انسپکٹر نور پانڈے کی چیختی ہوئی آواز سنائی دی۔ وہ ہم سے تقریباً دس گز دور رک گیا تھا۔ اس کے پیچھے ایک کانسٹیبل بھی تھا۔ انسپکٹر پانڈے یہی سمجھا تھا کہ گنگولی اس وقت مجھ پر حاوی ہو رہا ہے اور کسی بھی لمحے خنجر کے وار سے میرا خاتمہ کر سکتا ہے۔

"مار دو۔ گولی مار دو اس حرامی کو۔ ختم کر دو اسے!"

بلا چیختی ہوئی انسپکٹر کی طرف دوڑی اور اس کے ہاتھ سے ریوالور چھیننے کی کوشش کرنے لگی۔ شاید وہ خود گنگولی کو گولی مارنا چاہتی تھی۔

انسپکٹر نے اسے دھکا دے کر ایک طرف گرا دیا۔ گنگولی چوہدری گردن چھڑانے کے لیے اپنے آپ کو جھٹکے دینے لگا۔ میں نے اپنی ٹانگوں کو پوری قوت سے بائیں طرف جھکایا۔ گنگولی بھی اس کے ساتھ ہی جھکتا چلا گیا اور پھر میں نے ایک زور دار جھٹکا دے کر اپنی ٹانگیں اس کی گردن سے الگ کر لیں۔ گنگولی کراہتا ہوا الٹ گیا۔ میں اٹھ کر تیزی سے بلا کی طرف آگیا۔ گنگولی نے بھی اٹھنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔

"گنگولی چوہدری!" انسپکٹر پانڈے نے چیخ کر کہا "تمہارے تمام ساتھی ختم ہو چکے ہیں۔ بچنے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ خنجر پھینک دو اور اپنے آپ کو ہمارے حوالے کر دو۔"

"گنگولی چوہدری کوئی کتا نہیں جس کے گلے میں تم پٹہ ڈال سکو۔" گنگولی کے منہ سے بھیڑیے کی سی غراہٹ نکلی "گنگولی چوہدری شیر ہے اور شیر آزاد رہنا جانتا ہے۔ اسے زنجیروں میں نہیں جکڑا جا سکتا۔"

"تمہارے بچنے کے تمام راستے بند ہو چکے ہیں۔ اپنے آپ کو ہمارے حوالے کر دو۔" انسپکٹر نے پھر چیخ کر کہا۔

"مار دو۔ مار دو۔ اسے گولی مار دو انسپکٹر۔" بلا چیخی "یہ انسان نہیں بھیڑیا ہے۔ اس نے ہمارے سامنے کئی آدمیوں کو موت کے گھاٹ اتارا ہے۔ مار دو اسے۔ گولی مار دو۔"

میں نے بڑی مشکل سے بلا کو گرفت میں لے رکھا تھا۔ گنگولی چوہدری کا خون آلود چہرہ بہت بھیانک ہو رہا تھا اور اس کے ہونٹوں پر آنے والی مسکراہٹ اس سے بھی زیادہ خوفناک تھی۔ وہ آہستہ آہستہ پیچھے ہٹ رہا تھا۔

"گنگولی چوہدری نے اپنے فرار کا راستہ ہمیشہ محفوظ رکھا ہے۔" اس نے انسپکٹر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

وہ دو قدم اور پیچھے ہٹ گیا تھا۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ کیا کرنا چاہتا تھا۔ باتیں کرتے ہوئے اس نے خنجر کو نوک کی طرف سے پکڑ لیا تھا اور پھر خلاف توقع اس نے خنجر پوری قوت سے ہماری طرف کھینچ مارا۔ میں بلا کو دھکیلتا ہوا ایک طرف گر گیا۔ خنجر زناٹے کی آواز سے ہمارے سروں کے اوپر سے ہوتا ہوا پیچھے کھڑے ہوئے کانسٹیبل کے حلق میں پیوست ہو گیا۔

بیک وقت دو چیخوں اور ایک فائر کی آواز سنائی دی۔ ایک چیخ اس کانسٹیبل کی تھی جس کے گلے میں خنجر پیوست ہوا تھا۔ گولی انسپکٹر پانڈے نے چلائی تھی اور دوسری چیخ گنگولی چوہدری کی تھی جو انسپکٹر کی گولی لگنے سے یا ویسے ہی لڑکھڑا کر پیچھے کھڈ میں گر گیا تھا۔ اس کی چیخ کی بازگشت اب بھی سنائی دے رہی تھی اور پھر "بھد" کی زوردار آواز سنائی دی۔

میں بلا کو چھوڑ کر چٹان کے کنارے کی طرف لپکا اور جھانک کر نیچے دیکھا تو میری روح تک کانپ اٹھی۔ تقریباً سو فٹ نیچے پتھروں میں گنگولی چوہدری کی خون میں لت پت لاش پڑی تھی۔ وہ لاش ہی تھی۔ اتنی بلندی سے پتھروں پر گرنے

کے بعد کسی کا زندہ بچ رہنا ممکن ہی نہیں تھا۔ اب گنگولی چوہدری کے ان الفاظ کا مطلب بھی سمجھ میں آگیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ گنگولی چوہدری نے اپنے فرار کا راستہ ہمیشہ محفوظ رکھا ہے اور مجھے یقین تھا کہ اس نے انسپکٹر پانڈے کی گولی لگنے سے پہلے ہی کھڈ میں چھلانگ لگا دی تھی۔

میں پیچھے مڑ گیا۔ انسپکٹر پانڈے جھاڑیوں میں پڑے ہوئے کانسٹیبل پر جھکا ہوا تھا۔ خنجر ابھی تک کانسٹیبل کے حلق میں پیوست تھا اور وہ ذبح ہوتے ہوئے بکرے کی طرح تڑپ رہا تھا۔ میں بھی اس کے قریب پہنچ گیا۔

میں نے خنجر کے دستے پر ہاتھ رکھ کر اسے ایک جھٹکے سے کھینچ لیا۔ کانسٹیبل کے جسم کو ایک زوردار جھٹکا لگا اور وہ پہلے سے بھی زیادہ شدت سے تڑپنے لگا۔ اس کے پیروں کی رگڑ سے مٹی اڑ رہی تھی اور کٹے ہوئے حلق سے خرخراہٹ کی عجیب سی آوازیں خارج ہو رہی تھیں۔ بہتا ہوا خون مٹی میں جذب ہو رہا تھا اور بالآخر وہ بے حس و حرکت ہو گیا۔

میں نے خون آلود خنجر کو دیکھا۔ اس کی ایک طرف تیز دھار تھی اور دوسری طرف باریک دندانے تھے جس سے اس کا زخم اکٹ گیا تھا۔

میں نے خنجر لاش کے قریب پھینک دیا اور جیسے ہی سیدھا ہوا بلا چیختی ہوئی مجھ سے لپٹ گئی۔ وہ تھر تھر کانپ رہی تھی اور اس کے منہ سے خوف کی شدت سے عجیب و غریب آوازیں نکل رہی تھیں۔ جب تک یہ خونی ڈراما جاری رہا تھا اس وقت تک اس نے ہمت قائم رکھی تھی۔ گنگولی چوہدری پر بڑھ بڑھ کر حملے کرتی رہی تھی لیکن اب اس کی ہمت نے بھی دم توڑ دیا تھا اور حوصلے نے بھی۔ گزرے ہوئے خوف نے اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔

بلا نے بڑی سختی سے مجھے اپنی بانہوں کی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ اس کے بلاؤز کے بٹن تو پہلے ہی ٹوٹے ہوئے تھے اور اب گنگولی چوہدری سے ہاتھا پائی کے دوران میں بلاؤز پوری طرح پھٹ گیا تھا اور اس کے جسم کے بالائی حصے پر اب مختصر سا زیر جامہ ہی رہ گیا تھا۔

میں کچھ دیر اس کے کندھے تھپتھپاتا رہا پھر اسے اپنے سے الگ کر کے اپنی ٹی شرٹ اتار کر اسے پہنا دی اور انسپکٹر پانڈے کی طرف دیکھنے لگا جو اٹھ کر چٹان کے کنارے کی طرف جا رہا تھا۔ میں بھی اس کے قریب پہنچ گیا۔ بلا بھی میرے ساتھ تھی۔ سوفٹ نیچے پتھروں میں پڑی ہوئی گنگولی چوہدری کی لاش دیکھ کر وہ میرے ساتھ جڑ گئی۔

"ختم ہو گیا۔ راکھش۔ اچھا ہوا۔" وہ بڑبڑائی اور پیچھے ہٹنے لگی۔

میں اور انسپکٹر پانڈے بھی پیچھے ہٹ گئے۔ بلا ہم سے دور ہٹ گئی اور ہم دونوں کانسٹیبل کی لاش کے قریب پہنچ گئے۔

انسپکٹر پانڈے کا بھی بایاں بازو زخمی تھا جس پر میلا سا رومال بندھا ہوا تھا۔

"یہ کیا ہوا؟" میں نے پوچھا۔

"کل رات ان حرامیوں میں سے کسی کی گولی لگی تھی۔" انسپکٹر نے بتایا "گولی کھال کو چھیلتی ہوئی نکل گئی تھی۔ ذرا اور اندر کی طرف لگتی تو میرا بازو بیکار ہو جاتا لیکن اب کیا کیا جائے؟" اس نے کانسٹیبل کی لاش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔

"گنگولی چوہدری کی لاش تو وہاں گہرائی میں پڑی ہے۔ اسے ہم وہاں سے نکال نہیں سکتے اور یہ....." میں نے کانسٹیبل کی لاش کی طرف اشارہ کیا "ہم پتا نہیں کسی آبادی سے کتنی دور ہیں اور اس لاش کو اٹھا کر لے جانا بھی ممکن نہیں۔ تمہارے دوسرے ساتھی کہاں ہیں؟"

"سب ختم ہو گئے۔" انسپکٹر پانڈے نے جواب دیا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولا "لاش کو اٹھا کر لے جانا واقعی ممکن نہیں ہے اور یہاں اس کا کریا کرم بھی نہیں کیا جا سکتا۔ نہ ہمارے پاس ایسی کوئی چیز ہے کہ زمین کھود کر اسے دفن کر سکیں اور نہ ہی ماچس ہے کہ اس کی چتا جلا سکیں۔"

"یہی ہو سکتا ہے کہ اس کو جھاڑیوں سے ڈھک دیا جائے۔ اس کے لیے ہم اس وقت یہی کر سکتے ہیں۔" میں نے کہا۔

انسپکٹر پانڈے نے تائید میں سر ہلا دیا اور اس کے کپڑوں کی تلاشی لینے لگا۔ چند روپوں اور ڈیوٹی کارڈ کے علاوہ اس کی جیبوں میں کچھ نہیں تھا۔ آخر انسپکٹر نے اس کی رائفل بھی اٹھا لی جو خالی ہو چکی تھی۔

ہم آس پاس سے جھاڑیاں جمع کر کے لاش کے اوپر ڈالنے لگے۔ بلا بھی اپنے آپ کو سنبھال چکی تھی اور اس کام میں وہ بھی ہماری مدد کر رہی تھی۔

ہم نے لاش پر جھاڑیوں کا اچھا خاصا ڈھیر لگا دیا تھا لیکن ہمیں یقین تھا کہ ہمارے جانے کے بعد یہ لاش زیادہ دیر تک جنگلی جانوروں سے محفوظ نہیں رہ سکے گی۔

"مم..... مجھے پیاس لگ رہی ہے۔ حلق خشک ہو رہا ہے۔" بلا اپنے گلے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔ اس ہنگامہ آرائی میں وہ اپنی پیاس کو بھولی رہی تھی لیکن اب پھر اسے پیاس لگنے لگی تھی۔

"اس طرف آؤ۔ اس طرف تھوڑی ہی دور ایک ندی ہے۔" انسپکٹر نے ایک طرف اشارہ کیا۔ اس نے اپنا ریوالور ہولسٹر میں ڈال لیا تھا اور کانسٹیبل والی رائفل کندھے پر لٹکا لی تھی۔

انسپکٹر پانڈے ایک طرف پودوں میں ڈھلان اترنے لگا اور میں اور بلا اس کے پیچھے پیچھے چلتے رہے۔ بلا نے میرا ہاتھ پکڑ رکھا تھا۔

"تم ٹھیک تو ہو نا ہمت سنگھ؟" وہ چلتے چلتے میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

"ہاں ہاتھ پر ذرا چوٹ لگی ہے۔ ٹھیک ہو جائے گا۔" میں نے اپنا سیدھا ہاتھ بلا کو دکھایا جس پر گنگولی چوہدری کے پیروں کی ٹھوکروں سے انگلیوں کے جوڑوں کی کھال ادھڑ گئی تھی۔

بلا نے میرا وہ ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ چند لمحے اسے دیکھتی رہی۔ میرا زخمی ہاتھ اپنے چہرے کے قریب لے گئی اور اپنے ہونٹ میرے ہاتھ کی پشت پر ثبت کر دیے۔ اس وقت انسپکٹر پانڈے نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ میں نے جلدی سے بلا سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔

"وہ ندی بس تھوڑی ہی دور ہے۔" انسپکٹر پانڈے نے کہا۔ اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ تھی۔ اس نے شاید بلا کو میرے ہاتھ پر بوسہ دیتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔

ہم تقریباً پندرہ منٹ میں اس ندی پر پہنچ گئے۔ یہ وہی ندی تھی جس سے میں بلا کے لیے پانی لینے آیا تھا لیکن ہم اس جگہ سے کافی دور آگئے تھے۔ یہاں ندی کے کنارے پر سایہ دار درخت بھی تھے۔

بلا ندی کے کنارے پر گر سی گئی۔ اس نے بکری کی طرح منہ لگا کر پانی پیا مگر اس طرح شاید پیاس نہیں بجھی تھی۔ وہ چلو بھر بھر کے پانی پینے لگی۔ انسپکٹر پانڈے اور میں نے بھی شکم سیر ہو کر پانی پیا۔ بلا تو ندی کے کنارے پر نڈھال سی ہو کر لیٹ گئی تھی اور ہم دونوں درختوں سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔

"تم واقعی ہمت سنگھ ہو۔" انسپکٹر پانڈے میری طرف دیکھتے ہوئے بولا "ان درندوں کے چنگل میں پھنس کر زندہ بچ نکلنا واقعی تم جیسے باہمت لوگوں کا کام ہے۔"

میں انسپکٹر کے منہ سے اپنا نام سن کر چونک سا گیا۔

"تمہیں میرا نام کیسے معلوم ہوا انسپکٹر؟" میں نے پوچھا۔

"تمہارے دوست ٹھاکر سے۔" انسپکٹر نے جواب دیا "اسے جب پتا چلا کہ تم بلا کو بچانے کے لیے جنگل میں گھس گئے ہو تو اس نے ہنگامہ مچا دیا تھا۔ اس نے دھمکی دی تھی کہ اگر ہمت سنگھ اور بلا کو کچھ ہو گیا تو وہ کسی کو چین سے نہیں بیٹھنے دے گا۔ اس نے بے پور میں آئی جی کو بھی ٹیلی فون کر دیا اور آئی جی نے حکم دیا کہ پولیس کی ایک پارٹی فوراً جنگل کی طرف روانہ کر دی جائے۔ قرعہ میرے نام نکلا اور میں ایک درجن مسلح پولیس والوں پر مشتمل پارٹی کو لے کر موت کا مقابلہ کرنے کے لیے جنگل میں داخل ہو گیا۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر اپنی اس مہم کے بارے میں بتانے لگا۔

اس نے یہ بھی بتایا کہ راستے میں ایک چیتے نے ان پر حملہ کر دیا تھا جسے گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا۔ مجھے فائر اور کسی درندے کے دہاڑنے کی آوازیں آگئی تھیں۔ اس آواز کو سن کر میں اور نارائن وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے تھے۔

انسپکٹر پانڈے گنگولی چوہدری کے گروہ سے مڈھ بھیڑ کا قصہ سنا رہا تھا۔ اس کا تو میں بھی چشم دید گواہ تھا۔ انسپکٹر کے کہنے کے مطابق اس کے چار آدمی تو کل صبح ہی جھڑپ میں مارے گئے تھے اور دو دن بھر کی لڑائی میں کام آئے تھے اور چار کے بارے میں وہ کچھ نہیں کہہ سکتا تھا کہ شام کا اندھیرا پھیلنے کے بعد وہ کہاں غائب ہو گئے تھے۔ اس نے ایک کانسٹیبل کے ساتھ رات بھر گنگولی چوہدری کا تعاقب جاری رکھا اور بالآخر آج اس تک پہنچنے میں کامیاب ہو ہی گیا۔

"میں تمہاری ہمت کی داد دیتا ہوں ہمت سنگھ۔" اس نے آگے بڑھ کر میرا کندھا تھپتھپایا "جب مجھے پتا چلا کہ تم بلا کو بچانے کے لیے نارائن کے ساتھ جنگل میں گھس گئے ہو تو مجھے تم پر بہت غصہ آیا تھا۔ ایک عورت کے لیے اپنی زندگی کو داؤ پر لگا دینا حماقت ہی کہلا سکتی ہے لیکن اب میں کہہ سکتا ہوں کہ تم نے کوئی غلطی نہیں کی تھی۔ اس جیسی سندر ناری کے لیے تو کئی جیون قربان کیے جا سکتے ہیں۔" اس نے خاموش ہو کر بلا کی طرف دیکھا۔

بلا آنکھیں بند کیے پشت کے بل گھاس پر لیٹی ہماری باتیں سن رہی تھی۔ انسپکٹر کے منہ سے آخری الفاظ سن کر اس نے ایک لمحے کو آنکھیں کھولیں۔ اس کے ہونٹوں پر نہایت خفیف سی مسکراہٹ آگئی تھی۔ اس نے دوبارہ آنکھیں بند کر لیں۔

اب انسپکٹر کو روداد سنانے کی میری باری تھی۔ میں نے اپنی کتھا سنانے کے بعد کہا۔

"اب کیا پروگرام ہے۔ کیا تمہیں معلوم ہے کہ ہم جنگل

میں کس جگہ پر ہیں اور یہاں سے قریب ترین کون سی بستی ہو سکتی ہے؟"

"کچھ پتا نہیں۔" انسپکٹر نے جواب دیا "لیکن میں اتنا جانتا ہوں کہ سارنکا شہر اس جنگل کے ٹھیک پچھم (مغرب) کی طرف ہے۔ ہو سکتا ہے آج صبح کوئی اور پارٹی ہماری تلاش میں بھیجی گئی ہو لیکن ہم ان کا انتظار نہیں کر سکتے۔ یہ جنگل میلوں میں پھیلا ہوا ہے۔ ضروری نہیں کہ وہ اس طرف آئیں۔ اگر وہ دوسری طرف نکل گئے ہوں گے تو زندگی بھر ہمیں تلاش نہیں کر سکیں گے۔ بہتر ہے کہ چند منٹ سستا کر ہم پچھم کی طرف اپنا سفر شروع کر دیں اور مجھے اُمید ہے کہ سورج ڈوبنے سے پہلے پہلے ہم اس جنگل سے نکلنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔"

"تو پھر چل پڑو۔ یہاں بیٹھے بیٹھے وقت ضائع کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

بلا بھی اٹھ کر کھڑی ہو گئی اور انسپکٹر پانڈے رائفل اٹھا کر اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔ اس نے رائفل کندھے پر لٹکائی اور ہمارے آگے آگے چلنے لگا۔ میں اور بلا اس سے تقریباً پانچ گز پیچھے چل رہے تھے۔

اس ندی کا بہاؤ بھی پچھم کی طرف تھا اس لیے ہم ندی کے ساتھ ساتھ چلتے رہے۔ ہم جیسے جیسے آگے بڑھ رہے تھے، درختوں کا سلسلہ گنجان ہوتا جا رہا تھا۔ تقریباً دو میل کا فاصلہ طے ہونے کے بعد ندی ایک دم بائیں طرف مڑ گئی۔ ہم کچھ دیر ستانے کے لیے وہاں رک گئے پھر جی بھر کے پانی پیا اور آگے روانہ ہو گئے۔

سورج ہمارے سروں پر تھا۔ گنجان درختوں کی وجہ سے دھوپ اگرچہ بہت کم زمین تک پہنچ رہی تھی لیکن ہمیں سمت کا اندازہ لگانے میں کوئی دشواری پیش نہیں آ رہی تھی۔ ہمارا رخ مغرب کی طرف تھا۔

بلا چلتے چلتے ایک دم کراہ کر رک گئی اور اس نے اپنا ایک پیر اوپر اٹھا لیا۔ وہ ننگے پیر تھی اور اس کے پیر میں کانٹا چبھ گیا تھا۔ اس نے بیٹھ کر دونوں ہاتھوں میں پیر کو پکڑ لیا اور منہ بسورنے لگی۔ میں بھی اس کے قریب بیٹھ گیا اور کانٹا نکالنے کے لیے جیسے ہی اس کے پیر کی طرف ہاتھ بڑھایا، وہ چیخ اٹھی۔

"نہیں نہیں۔ ہاتھ مت لگاؤ۔ تکلیف ہو رہی ہے۔"

"کچھ نہیں ہو گا۔ تم آنکھیں بند کر لو۔ میں کانٹا نکالتا ہوں۔ تمہیں پتا بھی نہیں چلے گا۔" میں نے کہا۔

انسپکٹر پانڈے بھی ہم سے چند گز آگے رک گیا تھا۔ بلا نے زور سے آنکھیں میچ لیں۔ میں نے کانٹے کو ناخنوں سے پکڑ کر کھینچا تو اس کے منہ سے کراہ سی نکل گئی۔ میرے ہاتھ میں جو گز تھے، وہ میں نے اتار کر بلا کی طرف بڑھا دیے۔

"لو۔ یہ پہن لو۔" میں نے کہا۔

"اور تم۔ کیا تمہیں کانٹے نہیں چبھیں گے ہمت سنگھ نہیں، میں جوتے نہیں پہنوں گی۔ تم پہن لو۔" اس نے کہا۔

"نہیں۔ تم پہن لو۔" میں نے کہا "جلدی کرو۔ دیر ہو رہی ہے۔"

انسپکٹر پانڈے دور کھڑا دلچسپ نظروں سے ہماری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے ضد کر کے بلا کو جوگز پہنا دیے اور ہمارا سفر ایک بار پھر شروع ہو گیا۔

میرے جسم پر صرف جینز تھی۔ پیر بھی ننگے تھے اور جسم کا بالائی حصہ بھی کیونکہ میں اپنی ٹی شرٹ پہلے ہی بلا کو پہنا چکا تھا۔ بلا سے تو مجھے کچھ عجیب سا لگاؤ ہو گیا تھا۔ اس کی جگہ کوئی اور لڑکی ہوتی تو اس کے ساتھ بھی میں یہی طرزِ عمل اختیار کرتا۔

انسپکٹر پانڈے نے اپنی رفتار کم کر دی تھی۔ اب وہ ہمارے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ اس نے ایک نظر بلا کو دیکھا اور پھر میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"لگتا ہے تم اسے بہت چاہتے ہو اس لیے تو پہلے اسے اپنی شرٹ اتار کر پہنائی اور اب اپنے جوتے بھی اسے پہنا دیے۔ دوسروں کے لیے تکلیف اٹھانا واقعی بڑے ظرف کی بات ہے۔"

"تم یہ مت سمجھنا کہ مجھے چونکہ بلا سے لگاؤ ہے اس لیے میں نے اپنی شرٹ اور جوتے اسے پہنا دیے ہیں۔ اس کی جگہ کوئی دوسری عورت ہوتی تو بھی میں یہی کچھ کرتا۔" میں نے جواب دیا "کبھی کبھی تو میرا دل چاہتا ہے کہ میں اس دنیا میں بکھرے تمام لوگوں کے دکھ اپنے اندر سمیٹ لوں۔ کسی کی پلکوں پر تیرتے ہوئے آنسوؤں کو قطرہ قطرہ کر کے اپنے دل میں اتار لوں اور میری ذات دوسروں کے لیے وقف ہو جائے۔"

"بہت شاعرانہ باتیں کرتے ہو۔" انسپکٹر نے میری طرف جھکتے ہوئے سرگوشی میں کہا "کیا رشتہ ہے تمہارا اس سے جس کے لیے تم نے اپنی جان کی بھی بازی لگا دی تھی؟"

"رشتہ!" میرے منہ سے بے اختیار گہرا سانس نکل گیا "بعض لوگ رشتوں کو بدن پر پہنے ہوئے کپڑوں کی طرح ہوتے ہیں جنہیں کسی بھی وقت بدن سے اتارا جا سکتا ہے لیکن میرے خیال میں رشتے شرانوں میں بننے والے لوگوں کی طرح ہوتے ہیں جن کے بغیر انسان زندہ نہیں رہ سکتا اور جیون سے تعلق بھی دل سے جڑا ہوتا ہے تو کبھی روح سے اور رابطہ یہ تعلق بھی ان ہی رشتوں میں ایک رشتہ ہے دوستی کا۔ میرا اور بلا کا رشتہ دوستی کا رشتہ ہے۔"

"بہت خوب۔" انسپکٹر پانڈے بولا "کاش! میں بھی تمہارے دوستوں میں سے ہوتا۔ اس دیوی کو تو تمہاری دوستی پر گھمنڈ کرنا چاہیے۔"

اس کا خیال تھا کہ بلا کچھ کہے گی لیکن اس نے صرف مسکرانے پر ہی اکتفا کیا تھا۔

ہماری گفتگو کا موضوع بدل گیا۔ ہم ایک بار پھر گنگولی چوہدری اور اس کے ساتھیوں کے بارے میں باتیں کرنے لگے۔ انسپکٹر پانڈے نے اس وقت یہ انکشاف کیا کہ گنگولی چوہدری کا ایک ساتھی زخمی ہو کر فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا تھا اور ہو سکتا ہے اسے دوسری طرف کسی بستی میں پناہ مل گئی ہو۔

ہم تقریباً تین گھنٹوں سے مسلسل چل رہے تھے۔ بلا بری طرح تھک گئی تھی۔ ہم ایک بار پھر ایک ندی پر رک گئے۔ اس وقت تین بج رہے تھے۔ بلا نے پانی کے چند گھونٹ بھرے اور ندی کے کنارے پر ڈھیر ہو گئی۔

"مجھے بھوک لگ رہی ہے۔" وہ رونی سی صورت بناتے ہوئے بولی۔

انسپکٹر پانڈے نے اس کی طرف دیکھا اور کچھ کہے بغیر اٹھ کر ایک طرف چلا گیا۔ اس کی واپسی تقریباً بیس منٹ بعد ہوئی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھوں میں ناریل اٹھا رکھے تھے۔

انسپکٹر نے جیب سے چاقو نکال کر ایک ناریل کا چھلکا ادھیڑ کر اسے ایک پتھر پر دے مارا۔ ناریل دو ٹکڑے ہو گیا۔ اس نے چاقو کی نوک ہی سے گری نکال کر ہمارے حوالے کر دی اور دوسرا ناریل ادھیڑنے لگا۔

چند منٹ بعد ہم ناریل کھاتے ہوئے آگے چل پڑے۔

سورج مغرب کی طرف جھک رہا تھا لیکن جنگل میں کسی بستی کے آثار دکھائی نہیں دیے تھے۔ درختوں میں تاریکی بڑھ گئی تھی۔ انسپکٹر پانڈے کے چہرے پر بھی اب تشویش کے سائے ابھر آئے تھے۔

"ہمیں رات گزارنے کے لیے کوئی محفوظ جگہ تلاش کرنی چاہیے۔" انسپکٹر نے کہا "کچھ دیر میں سورج ڈوب جائے گا اور ہمیں چند قدم چلنے کا راستہ بھی نہیں ملے گا۔"

ہم تیز تیز چلنے لگے۔ بلا تھکن سے نڈھال ہو رہی تھی۔ وہ بار بار لڑکھڑا رہی تھی اور میں اس کا ہاتھ پکڑے اسے تقریباً گھسیٹتے ہوئے لے جا رہا تھا۔ آدھے گھنٹے بعد ہم کھلی جگہ پر نکل آئے۔ اس سے بہتر ہمیں اور کوئی جگہ نہیں مل سکتی تھی۔ یہ پتھر کا ٹیلا سا تھا۔ ہم اوپر چڑھ گئے۔ بلا تو فوراً ہی لیٹ گئی۔ میں اور پانڈے بیٹھے باتیں کرتے رہے۔

وقت گزارنا مشکل ہو رہا تھا۔ بلا سو چکی تھی۔ کبھی میں اونگھنے لگتا اور کبھی پانڈے۔ اور رات کے آخری پہر ہم دونوں کے اعصاب جواب دے گئے۔ نیند اور تھکن نے ہمیں زیر کر لیا تھا۔

اور پھر بلا کی چیخ کی آواز سن کر میری آنکھ کھل گئی۔ انسپکٹر پانڈے بھی جاگ گیا۔ انسپکٹر پانڈے کی آنکھوں میں وحشت تھی اور بلا کے چہرے پر بے پناہ خوف۔ وہ دونوں میری طرف دیکھ رہے تھے اور پھر ان کے خوف اور وحشت کی وجہ بھی میری سمجھ میں آ گئی۔

میں اس وقت پتھریلی سائیں کروٹ لیٹا ہوا تھا۔ ایک ہاتھ تکیے کی طرح سر کے نیچے تھا اور دوسرا ہاتھ بالکل سیدھا پہلو پر رکھا ہوا تھا اور مجھے یوں لگا تھا جیسے کوئی چیز میرے جسم پر رینگ رہی ہو۔

"ہمت سنگھ! اپنی جگہ سے حرکت مت کرنا۔ سانس روکے بالکل بے حس و حرکت پڑے رہو۔" انسپکٹر پانڈے نے سرگوشی میں کہا۔

اور پھر واقعی میرا سانس رک گیا۔ وہ سیاہ کوبرا تھا جو میری کمر اور پشت پر رینگتا ہوا آگے سینے کی طرف آ رہا تھا۔ مجھے سینے میں دل ڈوبتا ہوا محسوس ہونے لگا۔

کوبرا میرے برہنہ بدن پر رینگتا ہوا آگے آ گیا اور پھر اچانک ہی اس نے پھن پھیلا لیا۔ میں اس پوزیشن میں نہیں تھا کہ وہاں سے ہٹ سکتا اور اس سے پہلے کہ میں کچھ سوچ سکتا، پہلو پر رکھے ہوئے میرے ہاتھ میں غیر ارادی طور پر معمولی سی حرکت پیدا ہوئی اور اسی لمحے کوبرا نے میرے بازو پر ڈس لیا۔

میرے بازو میں سوئی جیسی چبھن ہوئی اور میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ سانپ کا خوف ہی بڑا ہیبت ناک ہوتا ہے اور مجھے تو اس زہریلے کوبرا نے میری نظروں کے سامنے ڈس لیا تھا۔ میں اچھل کر اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔ بلا اس قدر زور سے اچھلی تھی جیسے سانپ نے مجھے نہیں بلکہ اسے ڈسا ہو۔ انسپکٹر دونو پانڈے بھی ایک جھٹکے سے اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔ میں نے اسے اپنے ہولسٹر کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے دیکھا تھا۔

انسپکٹر پانڈے کا ہاتھ ہولسٹر میں اڑسے ہوئے ریوالور کے دستے پر پہنچ گیا تھا لیکن اس نے ریوالور نکالا نہیں۔ اس

کا ہاتھ جیسے ہولسٹر سے چپک کر رہ گیا تھا۔ میری نظریں اس کے چہرے کی طرف اٹھ گئیں۔ وہ پھٹی پھٹی نظروں سے میرے پیروں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ بلا کی حالت بھی اس سے کچھ مختلف نہیں تھی۔ اس کی آنکھوں میں بھی بے پناہ وحشت تھی اور وہ بھی میرے پیروں کی طرف دیکھ رہی تھی اور پھر وہ چیختے ہوئے اپنی جگہ سے اچھلی اور میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے کھینچتے ہوئے دور لے گئی۔

مجھ پر بھی سانپ کے ڈسنے کی وحشت سی طاری تھی لیکن حیرت کی بات تھی کہ مجھے ابھی تک کچھ نہیں ہوا تھا۔ سوائے اس کے کہ سوئی کی چبھن اب بھی محسوس ہو رہی تھی۔

"وہ... وہ... سانپ..." بلا کے منہ سے خوف زدہ سی آواز نکلی۔

میں نے نیچے دیکھا۔ میرا خیال تھا کہ میرے زوردار جھٹکے سے اٹھنے اور بلا کے چیخنے سے وہ کوبرا بھاگ گیا ہوگا لیکن اس بلیک کوبرا کو اپنے پیروں کے قریب دیکھ کر مجھے پھریری سی آگئی۔

وہ بلیک کوبرا زمین پر پڑا اس طرح اینٹھ رہا تھا جیسے اس پر تشنج کی سی کیفیت طاری ہو۔ وہ کبھی بل کھا کر بالکل کچھوا سا بن جاتا اور کبھی لٹھ کی طرح بالکل سیدھا ہو کر اکڑ جاتا اور پھر چند سیکنڈ بعد ہی وہ بالکل بے حس و حرکت ہوگیا۔ وہ ختم ہوگیا تھا۔

بلا اور انسپکٹر پانڈے اب بھی وحشت زدہ سی نظروں سے دو ڈھائی فٹ لمبے سیاہ کوبرا کو دیکھ رہے تھے۔ انسپکٹر پر تو اس قدر وحشت طاری تھی کہ وہ ہولسٹر پر سے ہاتھ اٹھانا بھی بھول گیا تھا۔ وہ کبھی مردہ سانپ کو دیکھ رہا تھا اور کبھی مجھے۔

بلا کی حالت اس سے بھی زیادہ ابتر تھی۔ اس کی آنکھیں خوف کی دہشت سے پھٹی پڑ رہی تھیں۔ اس نے ایک مرتبہ مردہ سانپ کی طرف دیکھا اور پھر مجھے پکڑ کر جھنجوڑ دیا۔

"تم ٹھیک ہو۔ ہمت سنگھ تم ٹھیک ہو نا؟" وہ چیخی۔

"اوہ!" میرے منہ سے گہرا سانس نکل گیا "میں ٹھیک ہوں۔ مجھے کچھ نہیں ہوا۔"

انسپکٹر پانڈے بھی دوڑ کر قریب پہنچ گیا اور میرا بازو پکڑ کر دیکھنے لگا۔ میں نے بھی اپنے بازو کو دیکھا۔ جس جگہ سانپ نے ڈسا تھا وہاں خون کا ایک ننھا سا قطرہ چمک رہا تھا۔

میں بالکل اپنے حواس میں تھا۔ مجھے کوئی تکلیف نہیں تھی۔ سوائے سوئی کی چبھن کے احساس کے۔ بلا میرے بازو کو ٹٹول کر دیکھ رہی تھی پھر وہ میرے پورے جسم کو ٹٹولنے لگی جیسے اسے میرے زندہ ہونے کا یقین نہ آ رہا ہو۔ انسپکٹر پانڈے نے بھی میرے بازو کو ٹٹول کر دیکھا پھر پڑے ہوئے سانپ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

"سس... سانپ مرگیا۔"

"اس کی زندگی ہی اتنی تھی۔" میں نے اطمینان سے جواب دیا۔ اس وقت تک میں اپنی کیفیت پر قابو پا چکا تھا۔ جاندار کو ایک نہ ایک دن تو مرنا ہی ہے۔ یہ قدرت کا قانون ہے۔ کوئی بھی جاندار اپنی زندگی سے نہ تو ایک لمحہ بڑھ سکتا ہے اور نہ ایک لمحے پہلے مر سکتا ہے۔ اس سانپ کی عمر پوری ہوگئی تھی اس لیے یہ مرگیا۔"

"مگر یہ سیاہ کوبرا بہت زہریلا ہوتا ہے۔" انسپکٹر بولا "اس کا ڈسا تو پانی بھی نہیں مانگتا اور اس نے تمہیں ڈسا تھا مگر یہ خود مرگیا۔"

"اوہ..." میں نے مسکراتے ہوئے کہا "تو گویا سانپ کو نہیں مجھے مرنا چاہیے تھا۔"

"ہاں۔ ہاں۔" انسپکٹر نے سر ہلا دیا۔ اس کے منہ سے الفاظ غالباً غیر ارادی طور پر نکل گئے تھے پھر جلدی سے "مم... میرا مطلب ہے' یہ سانپ بہت زہریلا ہوتا ہے۔"

"دونوں میں سے ایک کو تو مرنا تھا۔" میں نے "سانپ مرگیا اور میں بچ گیا۔ کیا تمہیں میرے زندہ رہنے کی خوشی نہیں ہوئی؟"

"ہوئی۔ بہت ہوئی۔" انسپکٹر نے پھر سر ہلا دیا "میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ یہ زہریلا کوبرا تمہیں ڈسنے کے بعد خود کیسے مرگیا۔"

"شاید میرے خون میں اس سے زیادہ زہر ہے۔" میں نے مسکرا کر کہا۔

"ہاں۔ ایسا ہی لگتا ہے لیکن مجھے یقین نہیں آ رہا۔" انسپکٹر نے کہا اور ایک جھاڑی کی سوکھی ہوئی شاخ توڑ کر اس سے سانپ کو اٹھا کر کچھ دیر الٹ پلٹ کر دیکھتا رہا پھر اسے اچھال دیا۔

بلا اب بھی میرے جسم کے مختلف حصوں کو ٹٹول رہی تھی۔ وہ میرے بازو کو دباتے ہوئے بولی۔

"تمہیں کوئی تکلیف تو نہیں ہو رہی ہمت سنگھ۔ تم تو ہو نا؟"

"ہاں۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ تم کیوں پریشان ہو۔" میں نے اس کا کندھا تھپتھپایا اور اپنے بازو کو دیکھا۔ خون کا قطرہ جم رہا تھا۔ اس کے علاوہ بھی میرے جسم پر کہیں کوئی زخم نہیں تھا اور مجھے یقین تھا کہ میرے خون کا ذائقہ بھی سانپ کو پسند نہیں آیا تھا اور اس نے مجھے ڈسنے کے بعد فوراً ہی چھوڑ دیا تھا۔ اب اس کے منہ میں کوئی بھی چیز نہیں تھی جو مجھے ڈسنے والا سانپ اب بھی غیر یقینی نظروں سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ انہیں اب بھی حیرت تھی کہ مجھے ڈسنے والا زہریلا کوبرا خود کیسے مرگیا اور میں زندہ کیسے بچ گیا اور میں واقعی زہریلا تھا یا نہیں۔

اپنے ماضی میں جھانک رہا تھا۔

شاولن کمپل میں تربیت کے دوران میں وہ منظر میری آنکھوں کے سامنے گھوم گیا جب ماسٹر ہنگ پائی مجھے اور جانگی کو صبح سویرے پہاڑی پر یوگا کی مشق کروایا کرتا تھا اور ایک روز لیکچر کے بعد اس نے ایک تھیلے میں سے سانپ نکال کر ہمیں دیے جسے ایک جانور کو ڈسوایا تھا اور وہ جانور تین سیکنڈ سے بھی کم وقت میں تڑپ تڑپ کر ختم ہوگیا۔ ماسٹر ہنگ پائی کے کہنے کے مطابق وہ سانپ اس قدر زہریلا تھا کہ انسان کو ڈس لے تو وہ بھی دو تین سیکنڈ میں ختم ہو جائے گا اور پھر ماسٹر نے اس سانپ سے اپنے آپ کو ڈسوایا تھا اور وہ زہریلا سانپ دو سیکنڈ سے بھی کم وقت میں اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا جس کا مطلب تھا کہ ماسٹر ہنگ پائی کے خون میں اس سانپ سے بھی زیادہ خطرناک اور سریع الاثر زہر موجود تھا جس نے اس زہریلے سانپ کو بھی آناً فاناً ختم کر دیا تھا۔

مجھے ماسٹر ہنگ پائی کی باتیں بھی یاد آ رہی تھیں۔ اس نے بتایا تھا کہ بعض جڑی بوٹیوں میں ایسی تاثیر پائی جاتی ہے جن کے کھانے سے دنیا کا کوئی زہر اثر نہیں کرتا لیکن یہ جڑی بوٹیاں بھی ایک خاص طریقے سے خوراک میں شامل کر کے استعمال کی جاتی ہیں۔ ان کا غلط استعمال زہر سے زیادہ خطرناک ثابت ہوتا ہے۔

اس واقعے کے دو چار دن بعد ہی میں نے اپنی خوراک میں کچھ تبدیلی محسوس کی تھی۔ ذائقہ بدلا ہوا تھا لیکن چند روز بعد میں اس ذائقے کا عادی ہوگیا تھا۔ ان دنوں میں نے یہ بات بھی خاص طور پر نوٹ کی تھی کہ ہر کھانے کے بعد ماسٹر لیشی یا ان کم از کم دو گھنٹے میرے آس پاس ضرور موجود رہتا تھا اور بار بار میری طرف دیکھتا رہتا تھا۔ ان دنوں میں نے ایک اور بات بھی نوٹ کی تھی۔ میں اور جانگی اگرچہ اکٹھے ہی بیٹھ کر کھانا کھایا کرتے تھے لیکن کھانے میں ایک آدھ چیز ایسی ضرور ہوتی تھی جو صرف میرے لیے ہوتی اور جانگی کو وہ چیز کھانے سے منع کر دیا جاتا اور میرے خیال میں یہ بھی کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ باڈی بلڈنگ' باکسنگ اور مارشل

آرٹس کی کٹھن پریکٹس کرنے والے لڑکے عام طور پر توانائی حاصل کرنے کے لیے کوئی نہ کوئی مخصوص اور اضافی خوراک کھاتے رہتے تھے۔ لڑکیاں چونکہ زیادہ ریاضت اور مشقت نہیں کرتی تھیں۔ اسی لیے جانکی کو میرے حصے کی وہ خوراک استعمال کرنے سے منع کردیا گیا تھا اور اب اس زہریلے سانپ کے ڈسنے اور اس کی موت کے بعد مجھے یقین ہوگیا تھا کہ مجھے خوراک میں وہی مخصوص جڑی بوٹیاں کھلائی جاتی رہی تھیں اور جانکی کو شاید اس لیے منع کردیا گیا تھا کہ وہ اسے برداشت نہیں کرپائے گی اور آج میرے خون میں شامل ماسٹر ہینگ پائی کے اس تحفظ نے مجھے مرنے سے بچالیا تھا۔ اگر مجھے وہ جڑی بوٹیاں استعمال نہ کرائی گئی ہوتیں تو اس سیاہ کوبرا کے بجائے میری لاش یہاں پڑی ہوتی۔

اس وقت صبح کے سات بجے تھے۔ سورج طلوع ہوچکا تھا۔ یہ چونکہ کھلی جگہ تھی اس لیے صبح کی نرم اور کومل دھوپ یہاں بھی پہنچ رہی تھی۔ بلا اور انسپکٹر پانڈے اب بھی غیر یقینی سی نظروں سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ بلا تو میرے جسم کے مختلف حصوں کو ٹٹولتے ہوئے بار بار پوچھ رہی تھی کہ مجھے کوئی تکلیف تو نہیں ہورہی۔

"کیا خیال ہے انسپکٹر؟" میں نے انسپکٹر پانڈے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ میں مزید کچھ کہنا چاہتا تھا مگر وہ بیچ میں بول پڑا۔

"مجھے وشواش (یقین) نہیں ہورہا۔ یہ تو چمتکار ہوگیا۔"

"میں اس چمتکار کی بات نہیں کررہا۔" میں نے مسکرا کر کہا "میں نے تو پوچھا تھا کہ آگے چلنا ہے یا یہیں بیٹھے رہنے کا ارادہ ہے؟"

"اوہ!" انسپکٹر پانڈے جز بز سا ہوگیا "دیوی جی تیار ہوں تو ہم چل پڑیں۔"

"دیوی جی کو کون سا سنگار کرنا ہے۔" میں نے جواب دیا "کوئی درندہ اس کا گوشت کھاتے ہوئے یہ نہیں دیکھے گا کہ اس نے چہرے پر لیپا پوتی کر رکھی ہے یا نہیں۔"

انسپکٹر پانڈے نے ہلکا سا قہقہہ لگایا اور بلا میرے سینے پر ہلکے گھونسے مارنے لگی۔ انسپکٹر نے جھک کر زمین پر پڑی ہوئی رائفل اٹھائی۔

میں نے بلا کو اپنے سے الگ کیا اور ہم ٹیلا نما اس پتھر پر مزید اوپر چڑھنے لگے اور پھر بلا ایک دم چیخ اٹھی۔

"وہ... وہ دیکھو ادھر... وہاں..."

انسپکٹر پانڈے اور میں نے بیک وقت اس طرف دیکھا۔ درختوں میں بہت دور سرمئی دھوئیں کی لکیر سی اٹھتی ہوئی نظر آرہی تھی۔

"جنگل میں کہیں آگ لگ گئی ہے شاید۔" پانڈے بولا۔

"یہ جنگل میں لگی ہوئی آگ نہیں ہے۔"

"اگر درختوں میں آگ لگی ہوتی تو دھواں سیاہ ہوتا۔ یہ سرمئی دھواں لکیر کی صورت میں اوپر اٹھ رہا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ اس طرف ان درختوں میں کوئی ہے یا ہوسکتا ہے وہ کوئی شکاری ہوں جنہوں نے دھواں جلائی ہو۔"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو ہمت سنگھ۔" انسپکٹر بولا "وہاں کوئی بستی ہو یا شکاریوں کی کسی پارٹی نے ڈیرا ڈالا ہو، ہمیں ان سے رہنمائی مل سکتی ہے یا کم از کم یہ پتا چل جائے گا کہ ہم کہاں پر ہیں اور ہمیں کس آبادی تک پہنچنے کے لیے کس طرف جانا چاہیے۔"

ہم ٹیلے کی دوسری طرف اتر کر درختوں میں داخل ہونے چلنے لگے جہاں سے دھواں اٹھتے ہوئے دیکھا تھا۔ ہم پھر گنجان درختوں میں داخل ہوگئے تھے اور بار بار رہے تھے مگر ان درختوں کی وجہ سے دھواں نظر نہیں لیکن ہم اندازے کی بنا پر اس سمت میں چلتے رہے۔

تقریباً پون گھنٹے بعد ہم کھلی جگہ پر پہنچ گئے۔ وہ بارہ جھونپڑوں پر مشتمل تھی۔ گھاس پھونس سے بنے یہ جھونپڑے ایک دائرے کی صورت میں تھے۔ درمیان چھوٹا سا میدان تھا جہاں تین چار ننگ دھڑنگ بچے کھیل رہے تھے۔ کوئی مرد یا عورت دکھائی نہیں دی۔ جھونپڑوں کے بیچ میں اس میدان میں ایک جگہ سے نظر آرہا تھا۔

ایک لمحے کو رکے اور پھر ہم ایک جھونپڑے سے گھومتے ہوئے سامنے آگئے۔ بلا نے میرا ہاتھ پکڑ میرے ساتھ جڑ کر چلنے لگی۔ انسپکٹر پانڈے ہم سے آگے تھا۔

جھونپڑے کی دوسری طرف پہنچ کر ہم رک گئے جھونپڑے کے سامنے پتھروں سے بنے ہوئے دو چولہے آگ روشن تھی اور دو عورتیں بیٹھی روٹیاں پکا رہی ایک عورت ادھیڑ عمر تھی اور دوسری جوان۔ دونوں چولیاں اور گھاگھرے پہن رکھے تھے۔ دونوں کی کلائیوں سے لے کر بازو کے اوپر تک پلاسٹک کی پیلے رنگ کی چوڑیاں بھری ہوئی تھیں۔

جوان عورت نے ہمیں دیکھا تو اپنی ساتھی سے

ہوئے اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ اس کا گھاگھرا تو پنڈلیوں تک تھا لیکن چولی بہت مختصر تھی۔ دوسری ادھیڑ عمر عورت بھی اٹھ کر کھڑی ہوگئی اور ایک جھونپڑے کی طرف دیکھ کر اونچی آواز میں کچھ کہا۔

دو آدمی ایک جھونپڑے سے نکل آئے۔ دونوں جوان تھے اور دونوں نے دھوتیاں پہن رکھی تھیں۔ ایک کے جسم پر میلا سا کرتہ تھا لیکن دوسرے کا بالائی جسم بالکل برہنہ تھا۔ عورتوں کی رنگت تو قدرے صاف تھی لیکن مرد توے کی طرح کالے تھے۔

انسپکٹر پانڈے آگے بڑھ کر ان سے باتیں کرنے لگا اور میں بلا کے ساتھ کھڑا ادھر ادھر دیکھتا رہا۔ دو جھونپڑوں کی پچھلی طرف کھلی جگہ پر ناریل کا بہت بڑا ڈھیر لگا ہوا تھا۔

آوازیں سن کر کچھ اور لوگ بھی جھونپڑوں سے نکل آئے۔ ان میں مرد بھی تھے اور عورتیں بھی۔ ان میں سے بعض کو دیکھ کر اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ وہ آوازیں سن کر نیند سے بیدار ہوئے تھے۔

اس دوران میں ایک بوڑھا آدمی بھی ایک جھونپڑے سے نکل کر انسپکٹر پانڈے اور دوسرے آدمیوں کی گفتگو میں شامل ہوگیا اور پھر تھوڑی ہی دیر بعد ہمارے لیے ایک جھونپڑا خالی کردیا گیا۔

جھونپڑے میں چٹائیاں اور ان پر میلے کچیلے سے گدے بچھے ہوئے تھے جن میں ناریل کے چھلکے بھرے گئے تھے۔ تقریباً تین فٹ تک اونچی گارے کی دیوار تھی اور اس کے اوپر لکڑی کی بلیوں کے ساتھ درختوں کی شاخوں اور جھاڑیوں کو ملا کر جھونپڑے کو اوپر تک مکمل کیا گیا تھا۔

بلا ایک گدے پر لیٹ گئی اور انسپکٹر پانڈے بتانے لگا کہ یہ مچھیل قبیلے کے لوگ ہیں جو برسوں سے اس جنگل میں آباد ہیں۔ بستی کے اطراف میں دور دور تک ناریل کے درختوں کی بہتات تھی اور یہ لوگ ناریل جمع کرکے شہر میں فروخت کرتے تھے۔ یہی ان کا ذریعۂ معاش تھا۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد ہمیں ناشتا یا کھانا دیا گیا۔ موٹی موٹی روٹیاں اور بغیر دودھ کی چائے۔ ناشتے کے دوران میں اس بستی کا بوڑھا سردار بھی ہمارے پاس آکر بیٹھ گیا تھا۔

سردار کے کہنے کے مطابق سارسکا شہر کی طرف جانے والی سڑک یہاں سے کم از کم چار گھنٹوں کے فاصلے پر تھی۔ اس نے کہا تھا کہ ایک آدمی کو ہمارے ساتھ بھیج دیا جائے گا تاکہ ہم جنگل میں بھٹک نہ جائیں۔

کھانا کھانے کے تھوڑی ہی دیر بعد بلا گدے پر لیٹ کر سوگئی۔ انسپکٹر پانڈے اٹھ کر باہر چلا گیا اور میں بھی ایک طرف لیٹ گیا۔ اب اطمینان ہوگیا تھا اس لیے میں بھی کچھ دیر آرام کرلینا چاہتا تھا۔

دوپہر ایک بجے کے قریب ہمیں جگایا گیا تھا۔ ہمارے لیے دوپہر کا کھانا بھی تیار تھا۔ ہم نے جھونپڑوں کے پیچھے بہنے والی ندی سے منہ ہاتھ دھویا اور کھانا کھا کر اپنے سفر پر روانہ ہوگئے۔ بستی کا ایک آدمی ہمارے ساتھ تھا جو تقریباً دس گز آگے چل رہا تھا۔

سردار نے ٹھیک کہا تھا۔ ہم واقعی چار گھنٹوں بعد جنگل سے نکل کر پختہ سڑک پر پہنچ گئے۔ یہ سارسکا سے جے پور کی طرف جانے والی ہائی وے تھی۔ ہمارے گائیڈ نے بتایا کہ سارسکا شہر وہاں سے بائیں طرف تقریباً دس میل کے فاصلے پر ہے۔ میرے منہ سے ایک گہرا سانس نکل گیا۔ ہم شہر کی دوسری طرف تقریباً ایک میل آگے جنگل میں داخل ہوئے تھے اور اب دس میل ادھر جنگل سے باہر نکلے تھے۔

اس وقت سہ پہر کے پانچ بج رہے تھے اور اس گائیڈ کو ہمارے ساتھ ہی شہر جانا تھا۔ اس نے دوسری صبح اپنی بستی واپس جانے کا فیصلہ کیا تھا۔

ہم جنگل میں چار دن تک بھٹکتے رہے تھے۔ اس دوران میں میلوں کا فاصلہ طے کیا تھا لیکن اب پختہ سڑک پر دس میل کا فاصلہ طے کرنے کی ہمت نہیں تھی۔ بلا سڑک کے کنارے ایک پتھر سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔

"جے پور کی طرف سے بسیں آتی رہتی ہیں۔" انسپکٹر نے کہا "کوئی نہ کوئی بس اس طرف آنے والی ہوگی۔"

اور پھر ہمیں تقریباً آدھا گھنٹا انتظار کرنا پڑا۔ جے پور کی طرف سے ایک بس کو آتے دیکھ کر انسپکٹر سڑک کے بیچ میں کھڑا ہوگیا۔ بس اس کے قریب آکر رک گئی۔ یہ محکمۂ سیاحت کی بس تھی جو جے پور سے الور کی طرف جارہی تھی۔ اس بس کو رات بھر کے لیے سارسکا ہی میں رکنا تھا۔

بس بہت شان دار تھی۔ تمام سیٹیں بھری ہوئی تھیں۔ اس میں غیر ملکی سیاح بھی تھے اور ہندوستانی بھی۔ وہ لوگ عجیب سی نظروں سے ہماری طرف دیکھ رہے تھے۔ شاید وہ یہ سمجھ رہے ہوں کہ پولیس انسپکٹر ہمیں گرفتار کرکے لے جارہا ہے۔ بلا کو تو دو یورپین عورتوں نے اپنے ساتھ سیٹ پر بٹھالیا اور ہمیں کھڑے ہی رہنا پڑا تھا۔ دس میل کا فاصلہ دس منٹ سے بھی کم وقت میں طے ہوگیا۔

بس کوتوالی کے سامنے سے گزری تو انسپکٹر نے اسے روک لیا اور ہم نیچے اتر آئے۔ کوتوالی میں قدم رکھتے ہی مجھے

اندازہ ہوگیا کہ ہمارے بعد شہر میں کیا صورتِ حال رہی ہوگی۔

میں اور بلا زیادہ دیر وہاں نہیں رکے۔ انسپکٹر پانڈے نے ہمیں جیپ پر ہمارے گیسٹ ہاؤس کی طرف بھجوا دیا۔

جانکی، روپ متی اور ٹھاکر بھانوت سنگھ ہٹ کے باہر لان میں بیٹھے ہوئے تھے۔ جیپ ان سے چند گز کے فاصلے پر رکی اور مجھے اور بلا کو جیپ سے اترتے دیکھ کر وہ تینوں اچھل پڑے اور کرسیوں سے اٹھ کر ہماری طرف لپکے۔

ہمارے ملاپ کا وہ منظر بڑا ہی سنسنی خیز تھا۔ روپ متی اور جانکی، بلا کو گلے لگا لگا کر رو رہی تھیں۔ جانکی مجھ سے لپٹ کر رونے لگی تھی۔ ہم تقریباً پانچ منٹ تک وہاں کھڑے رہے اور پھر ہٹ کے اندر آگئے۔

"یہ کیا حلیے بنا رکھے ہیں تم دونوں نے۔" روپ متی نے باری باری ہم دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "تمہاری شرٹ اور جوتے بلا۔۔۔"

"لمبی کہانی ہے۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی "فرصت میں سناؤں گا۔ اس وقت تو کوئی ہمیں چائے پلا دے تو بڑی مہربانی ہوگی۔"

"میں چائے بنا کر لاتی ہوں۔" جانکی اٹھ کر کچن کی طرف دوڑ گئی۔

بلا نے صوفے پر لیٹ کر آنکھیں بند کرلی تھیں۔ وہ بہت تھک گئی تھی۔

پندرہ بیس منٹ بعد جانکی سب کے لیے چائے بنا کر لے آئی۔ بلا بھی اٹھ کر بیٹھ گئی۔

اور پھر چائے کے دوران میں، میں انہیں اپنی رام کہانی سناتا رہا۔

"یہاں کی کیا صورتِ حال رہی؟" میں نے خاموش ہو کر سوالیہ نگاہوں سے ٹھاکر کی طرف دیکھا۔

"تمہارے جانے کے بعد تو یہاں بھونچال آگیا تھا۔" ٹھاکر نے کہا "ڈپٹی کمشنر پولیس پارٹی کو جنگل میں بھیجنے کو تیار نہیں تھا۔ میں نے جے پور آئی جی کو فون کردیا اور پھر اس کے حکم پر ایک پولیس پارٹی انسپکٹر نودو پانڈے کی قیادت میں جنگل کی طرف بھیج دی گئی۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا "پرسوں شام تین پولیس والے زخمی حالت میں جنگل سے باہر آئے تو شہر میں کھلبلی سی مچ گئی۔ اسی شام بیس اہلکاروں پر مشتمل ایک اور پولیس پارٹی کو جنگل میں بھیج دیا گیا۔ اسلحے سے لیس ہونے کے علاوہ ان کے پاس ٹارچیں بھی تھیں۔ وہ لوگ کل تقریباً اسی وقت چند لاشیں لے کر واپس آگئے۔ ان میں چار لاشیں ان [illegible] والوں کی تھیں جو انسپکٹر پانڈے کی ٹیم میں شامل تھے۔ لاشیں گنگولی چوہدری کے ساتھیوں کی تھیں جن میں [illegible] عورت اور چترا کی لاش بھی تھی۔ آج صبح سویرے ایک [illegible] پارٹی بھیجی گئی ہے۔ شام تک ہی اس کے بارے میں [illegible] چلے گا۔"

"یہاں کی صورتِ حال کا کچھ پتا چلا۔ میرا مطلب [illegible] جس کام سے ہم یہاں آئے تھے اس میں کوئی پیش رفت [illegible] یا نہیں؟" میں نے ٹھاکر کے خاموش ہونے پر سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ ہم یہاں بھونت سنگھ اور [illegible] تلاش میں آئے تھے مگر ڈیڑھ ہفتہ گنگولی چوہدری کے چنگل سے نکل گیا تھا۔ گنگولی چوہدری کی کہانی ختم ہوگئی تھی لیکن [illegible] لگتا تھا کہ ہم ابھی وہیں کھڑے تھے جہاں سے چلے تھے۔

"ہم جب سے یہاں آئے ہیں اسی بنگلے میں [illegible] ہوئے ہیں۔ دوسری طرف توجہ ہی نہیں دی جا سکی لیکن [illegible] ٹھاکر کہتے کہتے رک گیا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد [illegible] "اڑتی اڑتی یہ خبر سننے میں آئی تھی کہ ایک عورت کو [illegible] کروانے کے سلسلے میں تحقیقات کے لیے پولیس جب [illegible] پور پہنچی تو گاؤں کے لوگوں نے پولیس پارٹی پر حملہ کر [illegible] جس سے دو پولیس والے زخمی ہوگئے تھے۔ اس طرح [illegible] پارٹی کو واپس آنا پڑا اور سننے میں آیا ہے کہ چار دن پہلے [illegible] جس روز تم نارائن کے ساتھ جنگل میں گئے تھے اسی روز [illegible] پنڈت اپنے دو چیلوں کے ساتھ دھول پور پہنچ گیا تھا۔ اس [illegible] گاؤں کے لوگوں کو پولیس کے خلاف بھڑکایا تھا اور لوگوں [illegible] دلوں میں یہ بات بٹھا دی تھی کہ عورت کو ستی کرنا ان کی [illegible] رسم ہے اور کسی کو مذہبی رسومات پر پابندی لگانے کا [illegible] نہیں ہے اور وہ اس پابندی کو قبول نہیں کریں گے۔ یہ [illegible] بھی سننے میں آئی کہ وہ پنڈت اپنے آپ کو بدیشی (غیر ملکی) سادھو کہلاتا ہے۔"

"بدیشی سادھو؟" میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"آگے کوئی سوال مت کرنا۔" ٹھاکر بولا "اس [illegible] میں اس کے بارے میں کچھ معلوم نہیں کرسکا۔ موقع ہی نہیں ملا۔ اب کل سب سے پہلے یہی کام کریں گے۔"

"اب کوئی اور موضوع شروع کرنے سے بہتر ہے [illegible] دونوں جا کر اپنے حلیے درست کرو۔" روپ متی نے [illegible] میری طرف دیکھتے ہوئے بولی "لگتا ہے جنگل میں پھول [illegible] تمہارے خون پر خوب دعوتیں اڑائی ہیں۔ تمہارا پورا [illegible] سرخ دانوں سے بھرا ہوا ہے۔"

"ایک اور بات بتاؤں دیدی۔" بلا ایک دم سیدھی ہو [illegible]

[illegible] نے غور کر دیکھا تو بلا آگے کچھ نہ بول سکی۔ اس کا [illegible] کر رہ گیا۔

"تم شاید کوئی خاص بات بتا رہی تھیں۔ چپ کیوں [illegible]؟" روپ متی نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"بہت سنگھ نے ایک سانپ بھی مارا تھا۔ اسے ہاتھ سے پکڑ کر زمین پر پٹخ دیا تھا۔ میں تو ڈر گئی تھی۔" بلا نے بات ادھوری اور فوراً ہی وہاں سے اٹھ گئی "میں تو نہانے جا رہی ہوں۔ کئی روز ان وحشیوں میں رہی ہوں۔ گھن آرہی ہے مجھے اپنے آپ سے۔" وہ روپ متی والے کمرے میں چلی گئی۔

"تم بھی اپنا حلیہ بدل لو سادھو مہاراج۔" جانکی نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

میں بھی اٹھ کر اپنے کمرے میں آگیا اور دروازہ بند کرکے پہلے بیگ میں سے کپڑے نکالے اور پھر باتھ روم میں گھس گیا۔ آئینے میں اپنے آپ کو دیکھتے ہی میں اچھل پڑا۔ جانکی نے مجھے سادھو کہہ کر کوئی غلطی نہیں کی تھی۔ میرا حلیہ واقعی آوارہ گرد سادھوؤں جیسا تھا۔ بکھرے ہوئے گرد آلود بال جن میں چند تنکے بھی پھنسے ہوئے تھے۔ تین چار دن کا بڑھا ہوا شیو اور سرخ آنکھیں۔ میں اپنی یہ حالت دیکھ کر مسکرائے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔

میں تقریباً آدھے گھنٹے تک شاور کے نیچے کھڑا رہا اور جب کپڑے بدل کر باہر آیا تو ہال میں کوئی بھی نہیں تھا۔ میں ہٹ سے باہر آگیا۔ جانکی لان میں اکیلی بیٹھی ہوئی تھی۔ میں بھی اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔

"کہاں چلے گئے یہ لوگ؟" میں نے پوچھا۔

"روپ متی اور ٹھاکر بازار گئے ہیں۔ اسپتال سے ہوتے ہوئے کھانا لے کر آئیں گے اور بلا ابھی تک باتھ روم میں ہی گھسی ہوئی ہے۔" جانکی نے جواب دیا "اب تم "بندے کے پتر" لگ رہے ہو مگر شیو کیوں نہیں بنایا؟"

"موڈ نہیں ہو رہا تھا۔" میں نے جواب دیا "کیا تم ایک کپ چائے پلانا پسند کرو گی؟"

"میرا خیال ہے جنگل میں گزرے والے ایک ہفتے کی کسر تم ایک ہی دن میں نکال لینا چاہتے ہو۔" جانکی نے کہا اور اٹھ کر اندر چلی گئی۔

تقریباً پندرہ منٹ بعد وہ ٹرے اٹھائے باہر نکلی تو اس کے ساتھ بلا بھی تھی۔ اس نے فلیپر اور سلیولیس سرخ بلاؤز پہن رکھا تھا۔ وہ میرے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی اور میں پلک جھپکے بغیر اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ اس وقت وہ بے پناہ حسین لگ رہی تھی۔

"کہاں کھو گئے سادھو مہاراج۔ میں آپ کے لیے کافی بنا کر لائی ہوں۔ اس کے بعد آپ چائے کی طلب محسوس نہیں کریں گے۔" جانکی نے ٹرے میز پر رکھتے ہوئے کہا "اور ویسے دھیان دو تو ہم بھی پڑے ہیں راہوں میں۔"

جانکی کی آواز نے مجھے چونکا دیا اور میں سنبھل کر بیٹھ گیا۔ اس کے الفاظ اور لہجے میں ہلکا سا طنز تھا جسے میں نے بھی محسوس کیا تھا اور بلا نے بھی لیکن نہ تو بلا نے اور نہ ہی میں نے اس کا جواب دینا مناسب سمجھا۔

میں نے ایک مگ اٹھا لیا۔ پہلی چسکی لیتے ہی میں اچھل پڑا۔ کافی تیز اور خوش ذائقہ تھی۔

کافی کی چسکیاں لیتے ہوئے ہم جنگل میں پیش آنے والے خونی واقعات کے بارے میں بھی باتیں کر رہے تھے۔

"سنا ہے ڈاکوؤں کے ساتھ ایک عورت کی لاش بھی ملی ہے۔ وہ کون تھی؟" جانکی نے پوچھا۔

"گنگولی چوہدری کی رکھیل کروشا۔" میں نے جواب دیا "گنگولی چوہدری نے دو سال پہلے اسے ایک گاؤں سے اغوا کیا تھا اور اب غالباً کروشا سے اس کا جی بھر گیا تھا اسی لیے اس نے بلا کو روک لیا تھا اور یہ کروشا ہی تھی جس نے بلا کو اس وحشی کی دست برد سے بچائے رکھا تھا۔"

"حیرت ہے۔ ڈاکوؤں کی ساتھی کو کسی دوسرے سے اتنی ہمدردی؟" جانکی بولی۔

"وہ ڈاکوؤں کی ساتھی نہیں تھی۔ وہ تو ان کے چنگل میں پھنسی ہوئی تھی۔" میں نے کہا اور کروشا کے پس منظر کے بارے میں بتانے لگا "اگر کروشا ہمارا ساتھ نہ دیتی تو ہم ان وحشیوں کے چنگل سے نہیں نکل سکتے تھے۔ یا تو انہی کے ہاتھوں مارے جاتے یا کراس فائرنگ میں پولیس کی گولیوں کا نشانہ بن جاتے۔ ہم نے کوشش تو کی تھی کہ کروشا کو وہاں سے نکال لاتے لیکن اسے ہماری فکر تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ ہم کسی طرح وہاں سے نکل جائیں۔ وہ بے چاری بھی چوہدری کے ہاتھوں ماری گئی اور مجھے اس کی موت کا افسوس رہے گا۔"

"چوہدری کے ہاتھوں!" جانکی نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔

"گنگولی چوہدری انسان نہیں وحشی تھا۔ درندہ۔۔۔" میں

نے کہا "اس نے اپنے کم از کم تین آدمیوں کو تو میرے سامنے موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ ان میں ایک کا تصور یہ تھا کہ اس نے بلا کا بوسہ لینے کی کوشش کی تھی جبکہ وہ بلا کو اپنی ملکیت سمجھ چکا تھا اور کروشا کو اس نے محض اس لیے چٹخنی کردیا تھا کہ اس نے ہمیں وہاں سے بھاگنے میں ہماری مدد کی تھی اور مجھے افسوس یہ ہوا کہ میں اس وقت کروشا کی کوئی مدد نہیں کرسکا تھا لیکن بہرحال' میں نے گنگولی سے اس کی موت کا بدلہ لے لیا۔"

"اور دیدی۔ وہ تو راکھشس تھا راکھشس۔" بلا نے کہا "مجھے تو اس کی شکل دیکھ کر ہی خوف آنے لگتا تھا۔"

"عجیب زندگی ہے ان ڈاکوؤں کی بھی۔" جانکی نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔ وہ کچھ اور بھی کہنا چاہتی تھی مگر ایک گاڑی کو سڑک سے اس طرف مڑتے دیکھ کر خاموش ہوگئی۔

میں بھی اس گاڑی کی طرف دیکھنے لگا جو چند سیکنڈ بعد ہی ہٹ کے سامنے آکر رک گئی۔ وہ پولیس کی جیپ تھی۔ انسپکٹر پانڈے کے ساتھ دو اور پولیس آفیسر جیپ سے اتر کر ہماری طرف آگئے۔ ان میں ایک انسپکٹر تھا اور دوسرا اے سی پی۔ (اسسٹنٹ کمشنر پولیس) وہ دونوں وردی میں تھے جبکہ انسپکٹر پانڈے سادہ لباس میں تھا۔ اس نے سفاری سوٹ پہن رکھا تھا اور زخمی بازو پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔

وہ لوگ قریب آئے تو ہم اٹھ کر کھڑے ہوگئے۔ ان تینوں نے مجھ سے ہاتھ ملایا اور بلا اور جانکی کو ہاتھ جوڑ کر پرنام کیا۔ یہاں صرف چار کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔ میں برآمدے سے دو اور کرسیاں اٹھا لایا۔

"یہ ہمارے اے سی پی مسٹر بھنڈاری ہیں۔" انسپکٹر پانڈے نے تعارف کرایا اور یہ انسپکٹر جارمنی داس۔ ہم آپ دونوں کا بیان ریکارڈ پر لانا چاہتے ہیں۔ اس کے علاوہ۔۔۔"

"اس کے علاوہ کیا۔۔۔؟" میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"سرکار نے گنگولی چوہدری کی زندہ یا مردہ گرفتاری پر پھر پانچ لاکھ روپے کا انعام مقرر کر رکھا تھا۔ آپ دونوں نے' خاص طور پر آپ نے ہمت سنگھ!" اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے بات جاری رکھی "گنگولی چوہدری کے گروہ کے خاتمے اور گنگولی چوہدری کو انجام تک پہنچانے میں سب سے زیادہ اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس لیے سرکار نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ انعام کی رقم آپ دونوں کی خدمت میں پیش کردی جائے۔"

میں نے بلا اور جانکی کی طرف دیکھا۔ ان دونوں کی آنکھوں میں چمک ابھر آئی تھی اور بلا کا تو چہرہ تمتما اٹھا تھا۔

اس لیے نہیں کہ پانچ لاکھ کا انعام مل رہا تھا بلکہ اس سرکار نے ہماری خدمت کا اعتراف کیا تھا۔

"پانڈے جی۔" میں نے کہا "آپ اس بات کے دید گواہ ہیں کہ گنگولی چوہدری کس طرح اپنے انجام تھا۔ اس میں شبہ نہیں کہ ہم نے اپنی زندگیاں داؤ تھیں لیکن گنگولی چوہدری کے گروہ کے خاتمے میں کردار ان پولیس اہلکاروں نے ادا کیا ہے جنہوں نے میں حصہ لیا اور جنہوں نے اپنی جانوں کے نذرانے کرکے اس گروہ کا قلعہ قمع کیا اور آئندہ کے لیے اس کی دہشت سے نجات دلائی۔ انعام کے حق دار میں وہی ہیں اس لیے میری اور بلا کی یہ خواہش انعامی رقم ایسے معرکے میں جاں گنوانے والے اہلکاروں میں تقسیم کردی جائے۔"

"میں آپ کے جذبات کی قدر کرتا ہوں ہمت جی۔" اے سی پی بھنڈاری نے کہا "یہ ایک بڑی اور۔۔۔"

"اور اس پر انہی کا حق ہے۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی "اور بیان دینے کے لیے بھی ہم تیار ہیں۔"

"شکریہ مسٹر ہمت سنگھ!" اے سی پی نے کہا "اگر تو ہم آپ سے صرف بات کرنے آئے تھے۔ بیان لینے کے لیے آپ کو کوتوالی تک آنے کی زحمت کرنی پڑے گی۔ نو اور گیارہ کے درمیان تشریف لے آئیے۔ اس وقت بھی وہاں موجود ہوں گا۔"

"ہم پہنچ جائیں گے۔" میں نے کہا۔

وہ لوگ اٹھ کر اپنی جیپ کی طرف بڑھے ہی تھے کہ روپ متی اور ٹھاکر بھی آگئے۔ ٹھاکر نے پجارو پولیس جیپ سے ذرا ہٹا کر روکی تھی۔ ٹھاکر کے آنے کے بعد وہ منٹ اور رک گئے۔ اس وقت مجھے ایک اور بات یاد آئی۔

"انسپکٹر پانڈے۔" میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "اس کانسٹیبل اور گنگولی چوہدری کی لاشوں کو اٹھانے کا کوئی بندوبست کیا یا نہیں؟"

"شام سے پہلے پولیس کی ایک پارٹی بستی کے راستے کے ساتھ روانہ کردی گئی تھی۔" انسپکٹر پانڈے نے کہا "رات وہ لوگ بھیل قبیلے کی بستی میں رہیں گے۔ سویرے وہاں سے آگے روانہ ہوجائیں گے۔ گنگولی چوہدری کو انچارج کو لوکیشن سمجھا دی گئی ہے۔ اگر جنگلی جانوروں کی چیرہ دستی سے بچ گئی تو اسے چوراہے پر رکھ دیا جائے گا تاکہ لوگ اپنی آنکھوں

کیا۔

"جی مہاراج۔" ان میں سے ایک نے باری باری ہم دونوں کی طرف دیکھا۔

"وہ پنڈت کہاں ملے گا؟" ٹھاکر نے پوچھا۔

"وہ پنڈت جی تو اس سے اگلے ہی روز یہاں سے چلے گئے تھے جب پچھلی بار آپ یہاں آئے تھے۔ آپ کے ساتھ ایک دیوی جی بھی تھیں۔" اس شخص نے جواب دیا۔ وہ دبلا پتلا سا آدمی تھا اور اس کی عمر تیس بتیس سال سے زیادہ نہیں تھی۔

میں دل میں مسکرائے بغیر نہیں رہ سکا۔ اسے یہ بھی یاد تھا کہ اس روز ہمارے ساتھ کوئی عورت بھی تھی۔

"میں اس پنڈت کی بات نہیں کررہا۔" ٹھاکر نے کہا "میں بدیشی سادھو کے بارے میں پوچھ رہا ہوں۔ اس کے ساتھ دو چیلے بھی ہیں۔"

"اچھا وہ بدیشی سادھو۔" وہ شخص گہرا سانس لیتے ہوئے بولا "کل شام تک تو وہ پنڈت سوبھراج جی کا مہمان تھا اور پھر وہ اپنے چیلوں کے ساتھ رات ہی کو کہیں چلا گیا تھا۔"

"پنڈت سوبھراج کہاں ملے گا؟" ٹھاکر نے پوچھا۔

"وہ سامنے والی گلی میں جاکر سیدھے ہاتھ مڑ جاؤ۔ وہاں مندر کے ساتھ ہی پنڈت سوبھراج کا مکان ہے۔ وہ اس وقت گھر پر ہی ہوگا۔" اس شخص نے سامنے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"دھنے باد۔" ٹھاکر نے ہاتھ جوڑ کر اس کا شکریہ ادا کیا اور انجن اسٹارٹ کردیا۔

گاڑی چوراہے سے گھوم کر سامنے والی گلی میں داخل ہوگئی اور پھر وہاں سے دائیں طرف موڑنے کے بجائے ٹھاکر نے گاڑی روک لی اور انجن بند کرکے نیچے اتر آیا۔

گلی زیادہ چوڑی نہیں تھی۔ بائیں طرف شروع ہی میں ایک مکان کے رقبے کے برابر مندر تھا اور اس سے آگے پنڈت سوبھراج کا مکان۔

ہمیں دروازے پر دستک دینے یا پنڈت سوبھراج کو تلاش کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی کیونکہ ہم جیسے ہی مندر کے سامنے سے گزرے' ایک آدمی ملحقہ مکان کے دروازے سے برآمد ہوا۔ وہ لباس اور صورت ہی سے کوئی پنڈت یا پجاری لگتا تھا۔ پیر میں لکڑی کی کھڑاؤں' مخصوص انداز میں پہنی ہوئی دھوتی جبکہ جسم کے بالائی حصے پر زرد رنگ کی چادر بھی مخصوص انداز میں لپٹی ہوئی تھی۔ اس چادر پر جا بجا "اوم" چھپا ہوا تھا۔ ایسی چادریں بازار میں عام طور پر

اس شخص نے کئی ورشوں (سالوں) سے ان کا جینا حرام کر رکھا تھا اس کا انجام بالآخر کیا ہوا۔"

میں جھرجھری لے کر رہ گیا۔ یہ انجام واقعی بہت عبرت انگیز تھا۔

ان کے جانے کے بعد ہم ہٹ کے اندر آگئے۔ ٹھاکر ہوٹل سے کھانا لے آیا تھا۔ روپ متی نے پجارو سے باسکٹ نکال کر جانکی کے حوالے کردی اور پھر تقریباً پندرہ منٹ بعد ہم سب بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔

○☆○

بدیشی سادھو کا سراغ بڑی مشکل سے ملا تھا۔

اگلے روز پولیس سے فارغ ہونے کے بعد میں اور ٹھاکر پجارو پر دھول پور کی طرف روانہ ہوگئے تھے۔ اس روز صبح سویرے ہلکی سی بارش ہوئی تھی جس سے کچا راستہ دلدل بن گیا تھا۔ دھول پور کا فاصلہ اگرچہ زیادہ نہیں تھا لیکن وہاں پہنچنے میں تقریباً ایک گھنٹا لگ گیا۔ ٹھاکر نے پجارو بستی کے مرکزی چوراہے پر ایک طرف روک لی۔

یہ چوراہا خاصا بڑا تھا جس کے عین وسط میں پیپل کے دو تین درخت تھے۔ ان کے گرد تقریباً دو فٹ اونچا وسیع و عریض چبوترہ بنا ہوا تھا۔ درختوں کی جڑوں کے قریب سوکھے ہوئے پھول' کچی دال اور چاول وغیرہ بکھرے ہوئے تھے اور وہاں چیونٹیوں کی بھرمار تھی۔ یہ ہندو بھی عجیب ہیں۔ کوئی چیز ایسی نہیں جسے بھگوان مان کر یہ اس کی پوجا نہ کرتے ہوں۔ پیپل کے درخت کو بھی مقدس سمجھا جاتا ہے اور تلسی کے پودے کی تو باقاعدہ پوجا کی جاتی ہے۔ گھروں میں تلسی کا پودا لگانا باعث برکت سمجھا جاتا ہے۔

دو تین آدمی چبوترے کی منڈیر پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ہم نے گلی کے موڑ پر بنے کی دکان کے سامنے گاڑی روکی تھی۔ دکان کے سامنے بھی تین چار آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ ہمیں دیکھ کر وہ آپس میں سرگوشیاں کرنے لگے۔ جس روز اس عورت کو ستی کیا گیا تھا اس دن بھی ہم یہاں موجود تھے۔ اس روز ہمیں بستی کے زیادہ لوگوں نے نہیں دیکھا تھا لیکن دکان کے سامنے بیٹھے ہوئے آدمیوں میں سے ایک چہرہ ایسا تھا جسے میں نے پہچان لیا تھا۔ اس آدمی کو میں نے اس روز بھی دیکھا تھا بلکہ میرا خیال تھا کہ اسی سے ہم نے اس پنڈت کے بارے میں دریافت کیا تھا۔

ٹھاکر نے انجن بند کردیا اور ایک آدمی کو بلانے کے لیے انگلی سے اشارہ کیا۔ ایک کے بجائے دو آدمی اٹھ کر گاڑی کے قریب آگئے۔ ان دونوں نے ہاتھ اٹھا کر پرنام (سلام)

سستے داموں مل جاتی تھیں۔ اس شخص کا سر گنجا تھا۔ ماتھے پر سفید قشقہ' اس سے ذرا اوپر درمیان میں سرخ تلک اور دونوں رخساروں پر بھی اوپر سے نیچے سیندور سے لکیریں سی کھنچی ہوئی تھیں۔ اس کی آنکھیں چھوٹی اور دونوں کانوں میں چاندی کی بالیاں تھیں۔ صورت ہی سے وہ کٹر' متعصب اور کینہ پرور ہندو لگتا تھا۔ اس کی بٹن جیسی آنکھوں میں عیاری کی چمک نمایاں تھی۔

ٹھاکر نے دونوں ہاتھ اٹھا کر پرنام کیا تو وہ رک کر کینہ توز نظروں سے باری باری ہم دونوں کی طرف دیکھنے لگا اور پھر بادلِ ناخواستہ اس نے بھی دونوں ہاتھ اٹھا کر جوڑ دیے۔

"کون ہو تم لوگ۔ کہاں سے آئے ہو؟" اس نے پوچھا۔ اس کے لہجے میں بھی کینہ توزی کی جھلک نمایاں تھی۔ لگتا تھا جیسے وہ سب کو اپنے آپ سے کم تر سمجھتا ہو۔

"ہون (آگ میں گھی پھینکنے کی ہندوانہ رسم۔ اسے ہوم بھی کہتے ہیں) کرانا ہے پنڈت جی۔ ہم آپ کو لینے آئے ہیں۔" ٹھاکر نے سو روپے کا ایک نوٹ نکال کر اس کی مٹھی میں دبا دیا۔

"کہاں سے آئے ہو تم لوگ۔ اس بستی کے تو نہیں ہو۔ میں تو اس بستی کے ایک ایک چہرے کو پہچانتا ہوں۔" پنڈت نے کہا۔ اس نے نوٹ مٹھی میں دبا لیا تھا۔

"ہم سارسکا سے آئے ہیں پنڈت جی۔ آپ کو واپس یہاں چھوڑ دیں گے۔" ٹھاکر نے کہا۔

"سارسکا۔ کیا شہر میں کوئی پنڈت نہیں رہ گیا جو...؟"

"بات یہ ہے پنڈت جی۔" ٹھاکر نے کہا "پنڈت تو شہر میں بہت ہیں لیکن ہم ذرا پرانے خیالات کے لوگ ہیں۔ آج کل کے پنڈت اور پجاری تو دھرم کی پرانی رسموں کو بھول چکے ہیں۔ مجھے تو شک ہے کہ وہ اشلوک بھی ٹھیک پڑھتے ہیں یا نہیں۔ آپ کے بارے میں سنا تو ہم یہاں آ گئے اور آپ کو دیکھا تو وشواس (یقین) ہو گیا کہ آپ کا ہون ٹھیک رہے گا۔ آپ انکار نہ کیجئے پنڈت جی۔"

"کتنی دیر لگے گی؟" پنڈت نے پوچھا اور آسمان پر چھائے ہوئے بادلوں کو دیکھنے لگا۔

"سب تیاری مکمل ہے پنڈت جی۔" ٹھاکر نے جواب دیا "زیادہ دیر نہیں لگے گی۔ ہمارے پاس گاڑی ہے۔ ہم آپ کو واپس یہاں چھوڑ جائیں گے۔"

پنڈت سوبھراج چند لمحے خاموش رہا پھر ہمیں وہیں رکنے کا اشارہ کر کے دوبارہ گھر میں گھس گیا۔ اس کی واپسی میں دس منٹ لگے تھے۔ اس مرتبہ اس نے کندھے پر ایک تھیلا لٹکا رکھا تھا۔

ہم اس کے ساتھ باہر والی گلی میں آ گئے۔ ارد گرد کئی بچے جمع تھے اور ایک بچہ تو بونٹ پر چڑھا بیٹھا تھا۔ ہمیں دیکھ کر وہ سب بھاگ گئے۔

ٹھاکر نے دروازہ کھول کر پہلے پنڈت سوبھراج کو سیٹ پر بٹھایا اور پھر خود بھی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ پسنجرز سیٹ پر برا جمان ہو گیا تھا۔

ٹھاکر گاڑی کو اس چوک کی طرف سے نہیں ایک گلی سے نکال کر لے گیا تھا۔ پچھلی سیٹ پر بیٹھا ہوا پنڈت لب کچھ بدبدا رہا تھا۔

بستی سے تقریباً دو میل دور آنے کے بعد ٹھاکر گاڑی کو اصل راستے سے ہٹا کر بائیں طرف موڑ دیا۔

"ادھر کہاں جا رہے ہو مورکھ۔ (احمق) شہر کا راستہ سامنے ہے۔" پنڈت سوبھراج فوراً ہی بول پڑا۔

"صبح بارش کی وجہ سے وہ کچا راستہ دلدل بن گیا پنڈت جی۔ گاڑی کیچڑ میں پھنس جائے گی اس لیے ذرا پکا کر جانا پڑے گا۔" ٹھاکر نے کہا۔

اس طرف کوئی باقاعدہ راستہ نہیں تھا۔ اک پودے اور ببول کی جھاڑیوں کی بہتات تھی۔ ٹھاکر انہی جھاڑیوں میں گاڑی چلاتا رہا۔ تقریباً نصف میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد ٹھاکر نے گاڑی روک کر انجن بند کر دیا۔

"کیا ہوا۔ تم نے موٹر کیوں روک لی؟" پنڈت نے کہتے ہوئے الجھی ہوئی نظروں سے ٹھاکر کی طرف دیکھا۔

"مجھے ایک اور بات یاد آ گئی ہے پنڈت جی۔" ٹھاکر نے کہا "میں سوچ رہا ہوں کہ کسی اور پنڈت کو بھی ساتھ لے جائے۔ پوجا میں ذرا رونق ہو جائے گی۔ اگر تمہیں کوئی اعتراض نہ ہو تو ہم بدیشی سادھو اور اس کے دو چیلوں کو بھی ساتھ لے لیں۔"

"بدیشی سادھو!" پنڈت سوبھراج اچھل پڑا۔

"ہاں۔ بدیشی سادھو اور اس کے دو چیلے۔" ٹھاکر نے کہا۔

"اب تم ہمیں بتاؤ گے کہ وہ دونوں کہاں ہیں؟"

"مم۔ میں ان کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔" پنڈت نے ہکلایا۔

اب یہ بات میری سمجھ میں آ گئی تھی کہ ٹھاکر اس پنڈت کو پوجا یا ہون کا بہانہ کر کے اپنے ساتھ کیوں لایا تھا۔ راستے میں شاید پنڈت سے وہ سب کچھ پوچھنا آسان نہ ہو جو وہ جاننا چاہتے تھے۔ آبادی سے دور اس ویرانے میں ماحول بدلے ہوئے تیور دیکھ کر یہ پنڈت نفسیاتی دباؤ میں آسکتا

اور پنڈت پر شاید اس کا اثر بھی ہونا شروع ہو گیا تھا۔

"تم سب کچھ جانتے ہو۔" ٹھاکر نے اس کے چہرے پر نظریں جما دیں "کل رات وہ تمہارے گھر پر تھے اور تم جانتے ہو وہ اس وقت کہاں ہیں۔"

"میں کسی بدیشی سادھو کو نہیں جانتا۔" پنڈت نے جواب دیا۔

"تم ایسے نہیں مانو گے۔" میں نے یہ کہتے ہوئے پتلون کے پائنچے میں سے خنجر نکال لیا۔

"تم لوگ کون ہو۔ اور کیا چاہتے ہو۔" پنڈت ہکلا کر رہ گیا۔ اس کے چہرے پر ایک دم خوف کے سائے ابھر آئے تھے۔

"صرف یہ جاننا چاہتے ہیں کہ وہ بدیشی سادھو اور اس کے چیلے کون ہیں اور کہاں چھپے ہوئے ہیں۔" میں نے خنجر کی نوک اس کے چہرے کے سامنے کر دی "تم انہیں بہت اچھی طرح جانتے ہو اس لیے کہ کل رات وہ تمہارے مہمان تھے اور تم نے ان کی خوب ٹہل سیوا کی تھی۔"

"مم۔ میں کچھ نہیں جانتا۔" پنڈت بولا "اس گاؤں میں ایک ہی مندر ہے اور میں اس کا پنڈت ہوں اس لیے وہ لوگ میرے گھر پر آ گئے تھے اور بھوجن (کھانا) کر کے چلے گئے تھے۔"

"یہ ایسے نہیں مانے گا۔" ٹھاکر یہ کہتے ہوئے نیچے اتر گیا۔ دوسری طرف آ کر اس نے دروازہ کھولا اور پنڈت کو بازو سے پکڑ کر نیچے کھینچ لیا اور اس کے منہ پر زوردار گھونسا رسید کر دیا۔

پنڈت سوبھراج چیختا ہوا لڑکھڑا کر پیچھے جھاڑیوں میں گرا۔ جھاڑیوں کے کانٹے چبھے تو وہ ایک بار پھر چیخ اٹھا اور جلدی سے اٹھ گیا۔

"دیکھو پنڈت۔" وہ اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولا "تم سے ہماری کوئی دشمنی نہیں ہے۔ ہم صرف اس بدیشی سادھو کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں۔ اگر تم شرافت سے اس کے بارے میں بتا دو تو ہم تمہیں کچھ نہیں کہیں گے لیکن اگر تم نے ضد کی تو میں تمہارے شریر (بدن) کا جوڑ جوڑ الگ کر دوں گا۔ اب جلدی سے زبان کھول دو۔ ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔"

"میں کچھ نہیں جانتا اور کچھ نہیں بتاؤں گا۔" پنڈت سوبھراج نے جواب دیا۔

اس مرتبہ اس کا لہجہ ٹھوس تھا۔ نہ ہکلاہٹ تھی اور نہ خوف کا شائبہ اور وہ ٹھاکر کے سامنے تن کر کھڑا ہو گیا تھا۔ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ پہلے سے زیادہ کرخت ہو گیا تھا۔ پنڈت سوبھراج کی عمر چالیس اور پینتالیس کے درمیان رہی ہو گی۔ وہ درمیانے قد اور گٹھے ہوئے جسم کا مالک تھا۔ اس وقت وہ مجھے عام پنڈتوں اور پجاریوں سے مختلف نظر آ رہا تھا۔

ٹھاکر چند لمحے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر اس نے اچانک ہی پنڈت پر ہاتھ اٹھا دیا لیکن وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔ پنڈت سوبھراج نے اس کا ہاتھ اوپر ہی روک لیا تھا۔

میں اپنی جگہ پر بیٹھے بیٹھے اچھل پڑا۔ ٹھاکر کی آنکھوں میں بھی الجھن کے تاثرات ابھر آئے تھے اور پھر جو کچھ ہوا وہ میرے لیے حیرت انگیز تھا۔ پنڈت نے ٹھاکر کی کلائی کو زور دار جھٹکا دیا اور ساتھ ہی اس کی ٹانگ پر ٹھوکر رسید کر دی۔ ٹھاکر کراہتا ہوا جھاڑیوں میں گرا۔

مجھے حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ ٹھاکر جیسا لحیم شحیم آدمی ایک ہی وار سے ڈھیر ہو گیا تھا۔ میں چھلانگ لگا کر گاڑی سے نیچے اتر آیا اور پنڈت کو للکارتا ہوا خنجر اٹھائے اس کی طرف لپکا۔ میں نے خنجر سے حملہ کرنے کی کوشش کی تو پنڈت نے بڑی مہارت سے میرے خنجر والے ہاتھ کی کلائی تھام کر میرا حملہ ناکام بنا دیا۔

پنڈت کی گرفت بڑی مضبوط تھی۔ لگتا تھا جیسے میری کلائی آہنی شکنجے میں جکڑی گئی ہو۔ میں کلائی چھڑانے کی کوشش کرنے لگا لیکن نہ تو گرفت ڈھیلی ہوئی اور نہ ہی پنڈت سوبھراج نے اپنی جگہ سے حرکت کی۔ وہ چٹان کی طرح جما ہوا تھا اور اس کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ تھی۔

ٹھاکر اٹھ کر پنڈت کی طرف لپکا تو میں چیخ اٹھا۔

"نہیں ٹھاکر۔ تم اس پر حملہ نہیں کرو گے۔ اسے اپنی طاقت آزما لینے دو۔"

ٹھاکر تین چار قدم دور رک گیا۔

"نہیں نہیں۔ اپنے متر (دوست) کو بھی اپنی شکتی (طاقت) آزما لینے دو۔" پنڈت نے طنزیہ لہجے میں کہا "تم دونوں کو بڑا گھمنڈ تھا اپنے آپ پر۔ میرے اندر اتنی شکتی ہے کہ میں تم دونوں کو خون تھوکنے پر مجبور کر دوں گا۔"

پنڈت نے میری کلائی کو جھٹکا دیا۔ میری مٹھی کھل گئی اور خنجر نیچے گر گیا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا کہ جیسے میری کلائی کی ہڈی چیخ رہی ہو۔ اس میں شبہ نہیں کہ پنڈت سوبھراج کسرتی بدن کا مالک تھا اور اس میں طاقت ہونی چاہیے تھی لیکن اس کی گرفت میں آہنی شکنجے جیسی سختی! مجھے بڑی حیرت ہو رہی تھی۔ اچانک میرے ذہن میں ایک اور خیال ابھرا۔

ہندوستان کے پنڈت اور پجاری بڑی پُراسرار قوتوں کے مالک ہوتے ہیں۔ یہ لوگ ایسی شکتی حاصل کرنے کے لیے بڑے کٹھن جاپ کرتے ہیں۔ ان میں ایسی پُراسرار شکتی آجاتی ہے کہ کوئی عام آدمی انہیں شکست نہیں دے سکتا۔

میں نے اس خیال کو ذہن سے جھٹک دیا۔ ایسی باتیں سوچ کر میں کسی نفسیاتی دباؤ میں نہیں آنا چاہتا تھا۔

میں نے پنڈت کی قوت کو آزمانے کے لیے کلائی کو ہلکا سا جھٹکا دیا۔ پنڈت نے میری کلائی پر گرفت اور مضبوط کرلی۔ میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی اور میں پنڈت کی آنکھوں میں جھانکنے لگا۔ پنڈت بھی پلک جھپکے بغیر میری آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔

میں اپنی جگہ پر کھڑے کھڑے ذرا سا اچھلا اور اپنا بوجھ پیچھے کی طرف ڈال کر دونوں ٹانگیں دہری کرکے اوپر کی طرف نکال لیں۔ پنڈت جھٹکا لگنے سے ذرا سا آگے کو جھکا تھا اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھ سکتا' میری دونوں ٹانگیں اس کی گردن سے لپٹ گئیں۔ میں نے اپنے آپ کو بائیں طرف گرا دیا۔

ہم دونوں کانٹے دار جھاڑیوں میں گرے۔ کئی کانٹے میرے جسم میں چبھے تھے لیکن میں اس کی پروا کیے بغیر ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ پنڈت نے بھی اٹھنے میں بڑی پھرتی دکھائی تھی۔

پنڈت سوبھراج نے مجھ پر حملہ کردیا۔ میں کھڑے کھڑے اپنی جگہ سے اچھلا اور اس سے پہلے کہ پنڈت میرے قریب پہنچتا' میری سائیڈ کک اس کے کندھے سے ذرا نیچے بازو پر لگی۔ وہ بلبلا کر نیچے گرا لیکن اس مرتبہ بھی اس نے اٹھنے میں بڑی تیزی دکھائی تھی۔ میں نے سنبھلنے کا موقع دیے بغیر اسے ایک اور کک لگانے کی کوشش کی لیکن اس نے بڑی پھرتی سے میری کک بلاک کردی اور پھر وہ میری ہر کک کو بلاک کرتا رہا۔

میں سنبھل گیا۔ مجھے حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ پنڈت اور مارشل آرٹسٹ؟ میں نے سر جھٹکتے ہوئے اپنے حریف سوبھراج کے لیے پنڈت کا لفظ ذہن سے نکال دیا۔ بدھ بھکشو مارشل آرٹسٹ ہوسکتے تھے تو ایک پنڈت کیوں نہیں۔ میرے سامنے ایک پنڈت نہیں' مارشل آرٹسٹ کھڑا تھا جس نے میری کئی کمزور بلاک کی تھیں۔

اور پھر سوبھراج نے بھی جوابی کارروائی شروع کردی۔ میں نے اس کی ایک سائیڈ کک روکنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہیں ہوسکا۔ مجھے یوں لگا جیسے میرے پہلو میں وزنی ہتھوڑے سے زوردار ضرب لگائی گئی ہو۔ میں تڑپ گیا۔ پنڈت کی دوسری کک میری اسی ٹانگ کی پنڈلی کی طرف لگی۔ اگر میں اچھل کر پیچھے ہٹنے کی کوشش نہ کرتا اس زوردار ضرب میں پنڈلی کا گوشت پھٹ جاتا۔ میں اپنے پیروں پر بھی کھڑا نہیں رہ سکا تھا۔

پنڈت نے آگے بڑھ کر ایک اور کک مارنے کی کوشش کی تھی مگر میں بڑی تیزی سے لوٹ لگا کر اپنی جگہ سے ہٹا اور تیزی سے اٹھ گیا۔ پنڈت مجھے سنبھلنے کا موقع دیے بغیر اپنی جگہ سے اچھلا۔ اس مرتبہ اس نے ڈبل فلائنگ کک لگانے کی کوشش کی تھی۔ میں نے اس کے دونوں پیر پکڑ کر اسے ہوا میں اچھال دیا۔ وہ الٹی قلابازی کھاتا ہوا پیٹھ کے بل گرا اور فوراً ہی سنبھل گیا۔

میں نے رائٹ کک کا جھانسا دے کر لیفٹ کک لگائی۔ اس مرتبہ پنڈت اپنا دفاع کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکا۔ وہ لڑکھڑا گیا اور سنبھلنے کی کوشش کررہا تھا کہ میں نے اچھل کر اس کی گردن پر راؤنڈ ہاؤس کک لگائی۔ وہ بلبلاتا ہوا گرا۔ پھر میں نے اسے سنبھلنے کا موقع نہیں دیا۔ اس میں شبہ نہیں کہ وہ بہت اچھا مارشل آرٹسٹ تھا لیکن میں نے بھی کچھ کم نہیں کمائی تھی۔ بنکاک میں مہاراج وانگ ونگ بائے اور کے نامور شاگردوں کی مار کھائی تھی اور پھر شاولن ٹیمپل ریاضت اور تربیت کی سختیاں جھیلی تھیں۔ یہ سب کچھ میں نے اس لیے برداشت نہیں کی تھیں کہ پنڈت سوبھراج جیسے مارشل آرٹسٹ سے مار کھا جاؤں۔

میں نے آخری مرتبہ فلائنگ کک لگائی۔ پنڈت نے اسے کی کوشش کی مگر میرا پیر اس کی پیشانی پر لگا۔ میں نے زور پہن رکھے تھے جس کے کھردرے سول سے اس کی پیشانی کھال چھل گئی۔ وہ چیختا ہوا پشت کے بل جھاڑیوں میں گرا میں چھلانگ لگا کر کھڑا ہوگیا اور ایک پیر اس کے سینے پر دیا۔

"تم تو ہم دونوں کو مچھروں کی طرح چٹکی میں مسل جارہے تھے مہاراج۔" میں نے پیر کا دباؤ ڈالتے ہوئے "لیکن تم تو خود ڈھیر ہوگئے۔ میں اگر چاہوں تو تمہاری پسلیاں توڑ سکتا ہوں۔" میں نے پیر کا دباؤ بڑھا دیا۔

اس کے سینے پر میرے پیر کا دباؤ کچھ زیادہ ہی پڑ گیا اس کا سانس گھٹنے لگا۔ چہرہ سرخ ہوگیا اور آنکھیں حلقوں سے ابلنے لگیں۔

"لیکن تم سے ہماری کوئی دشمنی نہیں ہے۔ تم نے سادھو کے بارے میں بتا دو تو ہم تمہیں چھوڑ دیں

بھورت دیگا۔"

"بب۔۔۔ بتاتا ہوں۔" اس کے حلق سے پھنسی پھنسی سی آواز نکلی۔

میں نے پیر ہٹالیا۔ وہ چند لمحے اسی حالت میں پڑا گہرے گہرے سانس لیتا رہا پھر اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ اس نے ایک ہاتھ سے پیشانی کو سہلایا اور پھر ہاتھ پر خون دیکھ کر اس کا چہرہ دھواں ہوگیا۔

ٹھاکر بھانوت سنگھ اتنی دیر تک دور کھڑا تماشا دیکھتا رہا تھا۔ میرا خنجر بھی اس کے ہاتھ میں تھا۔ وہ آگے آگیا۔

"وہ بدیشی سادھو اور اس کے چیلے کہاں ہیں؟ وہ تمہارے پاس کیوں آئے تھے؟" ٹھاکر نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے سوال کیا۔

"یہ سب کچھ حرامی بلونت سنگھ کی وجہ سے ہوا ہے۔ میں اس کی بات نہ مانتا تو مجھے یہ سب (وقت) نہ دیکھنا پڑتا۔" پنڈت سوبھراج نے کہا۔

بلونت سنگھ کے نام پر ہم دونوں چونک گئے۔ میں نے ٹھاکر کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں بھی چمک ابھر آئی تھی۔

"بلونت سنگھ کو کیسے جانتے ہو؟" ٹھاکر نے پوچھا۔

"میں اس حرامی کے خوف سے کئی سال سے یہاں اس بستی میں چھپا بیٹھا تھا لیکن پچھلے سال اس نے مجھے کھوج نکالا۔" پنڈت سوبھراج نے جواب دیا اور پھر اس نے جو کہانی سنائی وہ خاصی دلچسپ تھی۔

پنڈت سوبھراج بھی چتوڑ گڑھ کا رہنے والا تھا۔ اس کا تعلق بھی ایک کھاتے پیتے گھرانے سے تھا۔ بلونت سنگھ اس کا دوست تھا۔ یہ لوگ چند اور لڑکوں کے ساتھ مل کر "حرکتیں" کرتے رہتے تھے۔ بلونت سنگھ اس گروہ کا سرغنہ تھا۔ یہ لوگ آئے دن کسی نہ کسی لڑکی کو اٹھا کرلے جاتے رات بھر بھوکے بھیڑیوں کی طرح اسے بھنبوڑتے رہتے اور صبح ذرا دھمکا کر چھوڑ دیتے۔ یہ لوگ ہمیشہ چھوٹے اور نیچ گھرانوں کی لڑکیوں پر ہاتھ ڈالتے تھے اور وہ لوگ ان کے خلاف کچھ نہیں کرسکتے تھے۔ بعض لوگوں نے ان کی زیادتیوں کے خلاف پولیس سے بھی رابطہ کیا تھا لیکن معزز اور دولت مند گھرانوں کے سامنے سچ لوگوں کی کیا حیثیت تھی۔ پولیس الٹا انہی لوگوں کو سلاخوں کے پیچھے بند کردینے کی دھمکیاں دے کر بھگا دیتی۔

ایک رات ایک باعزت گھرانے کی لڑکی بلونت سنگھ اور سوبھراج کے ہاتھ لگ گئی۔ سوبھراج کے کہنے کے مطابق وہ لڑکی تیرہ سال کے لگ بھگ رہی ہوگی لیکن اس کے جسم کی اٹھان بڑے غضب کی تھی۔ یہ دونوں اسے بہلا پھسلا کر شہر سے باہر ایک ویران مندر میں لے گئے اور رات بھر اسے ہوس کا نشانہ بناتے رہے۔ وہ لڑکی زیادتیوں کو برداشت نہ کرسکی اور اس نے دم توڑ دیا۔

رات کے پچھلے پہر وہ دونوں اس لڑکی کی لاش ویران مندر میں چھوڑ کر بھاگ نکلے۔ سوبھراج اس قدر خوف زدہ ہوا کہ صبح ہونے سے پہلے ہی شہر سے بھی بھاگ نکلا۔ سب سے پہلے اس نے جودھ پور کے ایک مندر میں پناہ لی۔ یہاں پنڈتوں اور پجاریوں کی سیوا کے بدلے اسے کھانے کو بھی مل جاتا اور سر چھپانے کو جگہ بھی مل گئی۔

تقریباً دو مہینوں بعد وہ مندر میں دو پولیس والوں کو دیکھ کر وہاں سے بھی بھاگ نکلا۔ ہوسکتا ہے پولیس والے کسی اور کام سے مندر میں آئے ہوں۔ لیکن وہ نہیں سمجھا کہ شاید وہ اس کی تلاش میں آئے ہیں اور اسے بھاگتے ہی میں عافیت نظر آئی تھی۔

وہ دو سال تک مختلف مندروں میں گھومتا رہا۔ اس کے خیال میں مندر ہی اس کے لیے سب سے محفوظ ٹھکانے تھے۔ یہاں اسے کام بھی نہیں کرنا پڑتا تھا اور مزے مزے کے کھانے بھی ملتے تھے۔ وہ باقاعدہ پجاری بن گیا۔ اس نے دھرم کے حوالے سے وہ سب کچھ سیکھ لیا تھا جو ایک پجاری اور پنڈت کے لیے جاننا ضروری ہوتا ہے۔

تین سال پہلے وہ سارسکا آیا تھا۔ اس نے سارسکا کے جس مندر کو ٹھکانا بنایا تھا وہاں کا پنڈت اس کی سیوا سے بہت خوش ہوا۔ اس دوران میں اس بستی کے چھوٹے سے پنڈت کا دیہانت (انتقال) ہوگیا۔ شہر والے مندر کے پنڈت نے بستی کا یہ مندر سوبھراج کے حوالے کردیا۔ سوبھراج بہت خوش تھا۔ اس چھوٹی سی بستی میں وہ اپنے آپ کو بہت محفوظ سمجھ رہا تھا۔

وہ پچھلے چند برسوں کے دوران میں جن مندروں میں بھی گیا تھا وہ کالی کے استھان تھے۔ ان مندروں کے پجاری اور پنڈت نہایت کٹر اور انتہا پسند تھے۔ یہ صفت سوبھراج میں بھی آگئی۔ اسے دھرم میں تبدیلیاں پسند نہیں تھیں۔ اس کے خیال میں کالی کے مندروں میں انسانوں کی بھینٹ بھی ہونی چاہیے اور بیوہ ہونے والی عورت کو اپنے پتی کی لاش کے ساتھ چتا میں جل مرنا چاہیے۔ یہ سوبھراج کے پرچار (تبلیغ) کا نتیجہ تھا کہ اس روز گاؤں والوں نے ایک عورت کو اس کے پتی کی لاش کے ساتھ جلا ڈالا تھا۔ پولیس کو اس کی

اطلاع مل گئی تھی۔ لڑکی کے سسر اور بعض دوسرے لوگوں کو اگرچہ پکڑلیا گیا تھا لیکن گنگولی چوہدری والے چکر میں یہ معاملہ کھٹائی میں پڑگیا تھا۔

"پچھلے سال۔" پنڈت سوبھراج کہہ رہا تھا "سارسکا شہر میں بلونت سنگھ سے مڈھ بھیڑ ہوگئی۔ وہ اپنے دوستوں کے ساتھ جنگل میں شکار کھیلنے کے لیے آیا ہوا تھا۔ ایک گھنٹے بعد میں نے اس سے اپنا پیچھا چھڑالیا اور پھر اسی رات اسے یہاں بستی میں اپنے مکان کے دروازے پر دیکھ کر میرا ماتھا ٹھنکا تھا۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا۔

"بلونت سنگھ نے بتایا کہ چتوڑگڑھ میں اس کم سن لڑکی کے قتل کے سلسلے میں میرا نام سامنے آیا تھا اور پولیس کو اب بھی میری تلاش ہے۔ بلونت سنگھ بہت چالاک آدمی ہے۔ پتا نہیں اس نے اپنے آپ کو قتل کے اس معاملے سے کس طرح الگ کرلیا تھا اور سارا الزام مجھ پر آگیا تھا۔ بہرحال' اس نے مجھے تسلی دی کہ وہ میرے بارے میں کسی کو کچھ نہیں بتائے گا اور چار دن پہلے۔۔۔"

سوبھراج ایک بار پھر خاموش ہوگیا پھر بولا "چار دن پہلے وہ اپنے گرو اور ایک چیلے کے ساتھ میرے پاس آیا تھا۔ وہ خود بھی پجاری کے بھیس میں تھا۔ اس کا حلیہ بھی بدلا ہوا تھا اور اس کے گرو کا دوسرا چیلا کوئی مرد نہیں عورت تھی۔ بہت سندر ناری۔"

میں ایک بار پھر چونک گیا۔ ٹھاکر بھی گہری نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"بلونت سنگھ نے بتایا کہ اس کا گرو بدیشی سادھو ہے اور بہت پہنچا ہوا ہے۔" پنڈت سوبھراج کہہ رہا تھا "اس نے بتایا کہ ان کے بعض دشمن ان کے پیچھے لگے ہوئے ہیں جو انہیں جان سے مار دینا چاہتے ہیں۔ وہ چند روز یہاں رہیں گے اور پھر چلے جائیں گے۔ اس نے مجھے دھمکی دی تھی کہ اگر میں نے کسی کو اس کی اصلیت بتائی تو وہ مجھے چتوڑگڑھ میں لڑکی کے قتل کے الزام میں پکڑوادے گا۔ وہ کل رات یہاں سے چلے گئے ہیں۔"

"کہاں گئے ہیں؟" میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"اگر انہیں پتا چل گیا کہ میں نے کسی کو ان کے بارے میں کچھ بتایا ہے تو وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔" سوبھراج نے جواب دیا۔

"دیکھو پنڈت جی۔" میں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا "میں نہیں جانتا کہ ان کے ساتھ دوا... ہے لیکن ان کا گرو دنیا کا سب سے خطرناک آدمی... بے گناہ لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار چکا ہے۔ بلو... کے ہاتھ بھی کئی بے گناہوں کے خون سے رنگے ہوئے... ایک طرف پولیس ان کی تلاش میں ہے اور دوسری... ہم۔ اگر تم ہمیں ان کے بارے میں بتا دو تو بڑی اچھی... ہوگی۔ ورنہ تم مجھے دیکھ چکے ہو۔ میں تمہاری ہڈیوں کا... بنا سکتا ہوں۔ ویسے تم نے مارشل آرٹ کہاں سے... تھا؟"

"چتوڑگڑھ میں' کالج کی تعلیم کے دوران۔" سوبھراج نے جواب دیا۔

"تم بہت اچھے مارشل آرٹسٹ ہو۔" میں نے کہا... اگر تم ان صلاحیتوں کو مثبت کاموں میں استعمال کرو... تمہاری عزت ہوتی اور نام بھی۔ بہرحال' کہاں ہیں... لوگ؟"

"میں نہیں بتاؤں گا۔" سوبھراج نے جواب دیا۔

"تم پھر اڑ گئے۔" میں نے اسے گھورا "ایک اور... بتاؤں تمہیں۔" میں نے اس کے چہرے پر نظریں جما... "بلونت سنگھ کا گرو وہ بدیشی سادھو ہندو نہیں مسلمان ہے... تمہارے دھرم کو نشٹ کررہا ہے اور بلونت سنگھ کو بھی... سے کوئی دلچسپی نہیں۔ ان کے ساتھ وہ خوب صورت لڑکی... کی رکھیل ہے۔ کیا تم اپنے دھرم کی یہ توہین برداشت کر... ہو؟"

میرا یہ حربہ کارگر ثابت ہوا۔ اس کا چہرہ ایک دم... ہوگیا۔ میں اس کے چہرے کے تاثرات سے اندازہ لگا... کہ اس کے دماغ میں ہلچل سی مچ گئی تھی۔

"ٹھیک ہے۔" وہ اپنی کیفیت پر قابو پاتے ہوئے شکست خوردہ سے لہجے میں بولا "میں بتادوں گا کہ وہ لوگ کہاں ہیں۔"

"بتاؤ۔ جلدی کرو۔" میں نے کہا اور اسی وقت میرے ہاتھ پر پانی کا چھینٹا پڑا۔ میں نے سر اٹھا کر اوپر دیکھا۔ آسمان گہرے بادل تھے اور ہلکی ہلکی بوندا باندی شروع ہوگئی تھی۔

"چلو۔ گاڑی میں بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔" ٹھاکر نے اور میرا خنجر میری طرف بڑھادیا۔

میں نے جھک کر جینز کا پائنچہ اٹھایا اور خنجر کو پنڈلی سے بندھے ہوئے چمڑے کے ہولسٹر میں ڈال دیا۔ پنڈت سوبھراج کی پیشانی سے اگرچہ خون رسنا بند ہوگیا تھا مگر پیشانی پر سوجن ہورہی تھی۔ اس کے بدن پر بھی کانٹوں سے کئی خراشیں تھیں۔ اس نے پہلے زمین پر پڑا ہوا اپنا تھیلا اٹھا کر کندھے پر لٹکایا اور پھر جھاڑیوں میں پڑی ہوئی چادر اٹھا کر بدن پر ڈال لی۔

بارش کی بوندیں اب تیزی سے گر رہی تھیں۔ ہم دوڑ کر گاڑی میں بیٹھ گئے اور دروازے بند کرکے شیشے چڑھا دیے۔ ٹھاکر نے انجن اسٹارٹ کرکے اے سی چلا دیا اور گاڑی کو حرکت میں لے آیا۔ گاڑی کا رخ شہر کی طرف تھا۔

"گاڑی کہاں جارہے ہو تم لوگ؟" پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے پنڈت نے پوچھا۔ اس کے لہجے میں ہلکا سا خوف تھا۔

"شہر۔" ٹھاکر نے جواب دیا "بارش میں یہاں ویرانے میں کھڑے رہنا مناسب نہیں ہے لیکن اطمینان رکھو۔ ہم تمہیں واپس بستی میں چھوڑ دیں گے۔"

گاڑی مناسب رفتار سے چلتی رہی۔ اس کے ساتھ ہم نے پنڈت سوبھراج سے سوال جواب کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ اس کے کہنے کے مطابق سارسکا سے تقریباً بیس بائیس میل آگے سلرتھ نام کا ایک قصبہ ہے اور اس سے مزید پندرہ میل آگے الور نامی قصبہ ہے۔ یہ دونوں قصبے تاریخی عمارات کی وجہ سے خاصی اہمیت اور شہرت رکھتے ہیں۔ سلرتھ اور الور کا درمیانی علاقہ چھوٹے چھوٹے ٹیلوں اور پہاڑیوں پر مشتمل ہے۔ ان دونوں شہروں کے بیچ میں ایک راستہ دائیں طرف کو نکلتا ہے۔ اس راستے پر تین میل آگے جاکر ٹیلوں کا سلسلہ ختم ہوجاتا ہے اور اس سے آگے ریگستان ہے لیکن ایک میل مزید آگے جانے کے بعد سرخ پہاڑیوں کا ایک سلسلہ شروع ہوجاتا ہے۔ ان پہاڑیوں میں بے شمار چھوٹے چھوٹے غار ہیں لیکن پہاڑی سلسلے کے وسط میں ایک بہت بڑا غار ایسا بھی ہے جہاں کالی کا مندر بنا ہوا ہے۔ سال بھر یہ راستہ' مندر اور غار ویران رہتے ہیں۔ کبھی کبھار کوئی یاتری اس طرف چلا جاتا ہے لیکن سال میں ایک مرتبہ وہ مندر اور اس کے آس پاس کے غار آباد ہوجاتے ہیں۔ ان دنوں یہاں میلے کا سا سماں ہوتا ہے۔ ان دنوں کالی کے ماننے والے یاتری ہندوستان کے کونے کونے سے بلکہ دوسرے ملکوں سے بھی یہاں آتے ہیں۔ یہ میلہ سات دن جاری رہتا ہے اور ان سات دنوں میں تین غار والے مندر میں کالی کے چرنوں پر تین انسانی جانوں کی بھینٹ چڑھائی جاتی ہے۔"

"لیکن میں نے تو سنا ہے کہ انسانی جانوں کی بھینٹ پر پابندی ہے اور رسم ختم کی جاچکی ہے۔" میں نے اس کے خاموش ہونے پر کہا۔

"پابندی تو سختی کی رسم پر بھی ہے لیکن چند روز پہلے ہم نے اپنے گاؤں میں وہ رسم ادا کی۔" پنڈت سوبھراج نے اس لہجے میں جواب دیا جیسے ایک زندہ عورت کو چتا میں جلا کر انہوں نے بہت بڑا کارنامہ انجام دیا ہو "الور کی پہاڑیوں میں ہر سال میلہ لگتا ہے اور کالی کے چرنوں پر تین انسانوں کی بھینٹ دی جاتی ہے۔ یہ سلسلہ جاری ہے اور اس میں کبھی ناغہ نہیں ہوا۔"

"کیا تم بھی کبھی وہاں گئے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"ایک مرتبہ گیا تھا۔" پنڈت نے اثبات میں سر ہلایا "پھر مجھے مندر میں کالی کی مورتی کے قریب جانے کا موقع نہیں ملا تھا۔ بہت رش ہوتا ہے وہاں۔"

"کیا سرکار کو معلوم نہیں کہ۔۔۔؟"

"سرکار سب جانتی ہے۔" اس نے میری بات کاٹ دی "لیکن وہاں کوئی کارروائی نہیں ہوسکتی۔ ہزاروں لوگ ہوتے ہیں۔ گاؤں دیہاتوں کے عام میلوں ٹھیلوں میں پولیس بھی ہوتی ہے تاکہ کوئی ہنگامہ نہ ہو۔ کوئی گڑبڑ نہ ہو لیکن پہاڑیوں میں کالی کے اس میلے میں کوئی پولیس والا نہیں ہوتا۔ پولیس ادھر کا رخ ہی نہیں کرتی۔"

"تو تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ بلونت سنگھ اپنے گرو یعنی بدیشی سادھو کے ساتھ وہیں گیا ہے؟" میں نے اصل موضوع کی طرف آتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔ وہ لوگ وہیں گئے ہیں۔" پنڈت نے جواب دیا "میلہ اگرچہ پندرہ دن بعد شروع ہونے والا ہے۔ اس سے ایک ہفتہ پہلے لوگ اس طرف جانا شروع ہوجاتے ہیں۔ اگر کوئی اس سے بھی پہلے وہاں جانا چاہے تو کسی کو کیا اعتراض ہوسکتا ہے۔"

بارش تیز ہوگئی تھی۔ کچا راستہ پہلے ہی خراب تھا۔ بارش کی وجہ سے اور گڑبڑ ہوگئی تھی۔ اندیشہ اس بات کا تھا کہ پہیے دلدل میں نہ دھنس جائیں۔ ٹھاکر بہت محتاط انداز میں ڈرائیو کررہا تھا اور بالآخر ہم کچے کے علاقے سے نکل کر سارسکا شہر کے نواح میں پختہ سڑک پر پہنچ گئے۔ اس کے ساتھ ہی ٹھاکر نے گاڑی کی رفتار بڑھادی اور شہر کی مختلف سڑکوں سے ہوتے ہوئے ہم اپنے ہٹ کی طرف نکل آئے۔

بلا' روپ متی اور جانکی برآمدے میں بیٹھی بارش سے لطف اندوز ہورہی تھیں۔ ہمارے ساتھ ایک پنڈت کو گاڑی سے اترتے دیکھ کر وہ تینوں چونکے بغیر نہیں رہ سکی تھیں۔

وہ تینوں ہمارے ساتھ ہی اندر آگئی تھیں۔ پنڈت سوبھراج پلکیں جھپک جھپک کر ان تینوں کو دیکھ رہا تھا۔ ٹھاکر نے اسے ایک صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور روپ متی کو

چائے بنانے کو کہہ کر اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔

"تم لوگ مجھے یہاں لے آئے ہو؟" پنڈت سوبھراج نے میری طرف دیکھا۔

"راجا اندر کے اکھاڑے میں۔" میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "یہ دیکھو۔ کتنی حسین دیویاں ہیں یہاں۔ آرام سے بیٹھے آنکھیں سینکتے رہو۔ ابھی تھوڑی دیر میں چائے بن جائے گی تو کلیجے کی سکائی بھی ہو جائے گی۔"

پنڈت کی آنکھوں میں الجھن سی تیر گئی۔

"یہ کون ہے؟" جانکی نے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"پنڈت سوبھراج۔ بہت پہنچے ہوئے مہا پرش (عظیم انسان) ہیں" میں نے جواب دیا "یہ اوم کا لبادہ اوڑھنے سے پہلے بڑے رنگیلے آدمی ہوا کرتے تھے۔ اپنے دوستوں کے ساتھ ہر رات کسی نہ کسی لڑکی کو لے اڑتے تھے۔ آخری لڑکی ان کی زیادتیوں کو برداشت نہ کرتے ہوئے جاں سے گزر گئی اور یہ چتوڑ گڑھ سے ایسے بھاگے کہ آج تک پیچھے پلٹ کر نہیں دیکھا اور کون کہہ سکتا ہے کہ وہ ان مہاشے کے لیے آخری لڑکی تھی۔ چتوڑ گڑھ سے بھاگنے کے بعد انہوں نے جو راستہ اختیار کیا ہے وہاں لڑکیوں کی تو کمی نہیں۔ انہوں نے داسیوں سے خوب خوب سیوا کروائی ہوگی۔ ان مہاشے (صاحب) کے بارے میں ایک اور اہم بات یہ کہ یہ دارا اور بلونت سنگھ کے بارے میں جانتے ہیں۔"

"کیا۔۔۔؟" جانکی اچھل پڑی۔ کچن میں کھڑی ہوئی روپ متی نے بھی یہ بات سن لی تھی اور وہ بھی کھڑکی سے جھانک کر دیکھ رہی تھی۔

"ہاں۔" میں نے کہا "یہ بہت اچھے آدمی ہیں۔ انہوں نے ہمیں بتا دیا ہے کہ دارا اور بلونت سنگھ سے کہاں ملاقات ہو سکتی ہے اور ان کا ایک اور کارنامہ یہ بھی ہے کہ چند روز پہلے دھول پور میں اس عورت کو ستی کرنے میں انہوں نے سب سے اہم رول ادا کیا تھا۔"

"کیا۔۔۔؟" جانکی ایک بار پھر اچھل پڑی۔

"ہاں۔ یہ لکیر کے فقیر ہیں۔ انہیں دھرم میں تبدیلیاں پسند نہیں۔" میں نے کہا "انہی کے پرچار سے متاثر ہو کر دھول پور کے سیدھے سادے اور معصوم دیہاتی اس عورت کو چتا میں زندہ جلانے پر تیار ہو گئے تھے۔"

بلا اور جانکی متوحش نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ انہیں میری باتوں پر کوئی شبہ نہیں تھا۔ ہندوستان میں ایسے کٹر، جنونی اور انتہا پسند ہندوؤں کی کمی نہیں تھی۔

پنڈت اور پجاری دھرم کو اپنے گھناؤنے مقاصد کے لیے طرح استعمال کرتے تھے اس سے سب ہی لوگ واقف تھے۔ سامنے بیٹھے ہوئے پنڈت سوبھراج کی خاموشی میری باتوں کی تصدیق کر رہی تھی۔

روپ متی نے چائے کے کپ میز پر رکھ دیے۔

"چائے پیو پنڈت جی۔" میں نے ایک کپ اٹھا کر اس کی طرف بڑھا دیا۔

اس نے پرچ پکڑی تو اس میں رکھا ہوا کپ تھرتھرانے لگا۔ پنڈت سوبھراج کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔

"گھبراؤ نہیں پنڈت جی۔ یہاں ہم تمہیں کچھ نہیں کہیں گے۔ بلا، پنڈت جی کو پانی پلاؤ۔" میں نے کہا۔

بلا دوڑ کر پانی لے آئی۔ گلاس بھی پنڈت جی کے ہاتھوں میں تھرتھرا رہا تھا۔ پانی پینے کے بعد اس نے کسی حد تک اپنے آپ پر قابو پا لیا۔ وہ یقیناً سوچتا رہا ہوگا کہ اپنے ماضی کے بارے میں ہمیں کیوں بتایا لیکن اس وقت اس سوال میں کر رہا تھا اور میں نے اس کے ماضی کی ایک ایسی بات اس کے حلق سے اگلوا لی تھی۔

چائے پینے کے دوران میں ہی ٹھاکر بھی آ گیا۔ بلا اور جانکی بھی ہمارے قریب بیٹھی ہوئی تھیں۔ وہ بھی پنڈت سے باتیں کرنے لگیں۔ پنڈت سوبھراج کو کچھ حوصلہ ملا اور اس نے اپنے حواس پر قابو پا لیا۔

"میرے ماتھے پر کچھ لگا دو مہاراج۔ بہت کشٹ (تکلیف) ہو رہا ہے۔" اس نے ٹھاکر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"تھوڑی دیر رک جاؤ۔ تمہارے سارے کشٹ دور ہو جائیں گے۔" ٹھاکر نے کہا۔

ٹھاکر کی بات پر میں چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ میں نے پنڈت کی طرف دیکھا لیکن اس نے شاید اس بات پر زیادہ توجہ نہیں دی تھی۔

ہم باتیں کر رہے تھے کہ باہر کوئی گاڑی رکنے کی آواز سنائی دی اور صرف ایک منٹ بعد انسپکٹر پانڈے دو سپاہیوں کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ انہیں دیکھ کر پنڈت سوبھراج چیخ اٹھا۔ اس نے صوفے سے اٹھ کر پچھلی طرف چھلانگ لگانے کی کوشش کی مگر ٹھاکر نے اس کی ٹانگ پکڑ لی اور وہ صوفے سمیت پیچھے الٹ گیا اور پھر پولیس والوں کو اسے ہلنے کا موقع نہیں دیا۔

"بڑا انیائے (ظلم) کیا آپ نے مہاراج۔" پنڈت سوبھراج ٹھاکر کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"اور تم نے زندگی میں اب تک جو کچھ کیا ہے وہ نیائے (انصاف) تھا۔" ٹھاکر نے جواب دیا اور انسپکٹر کی طرف دیکھتے ہوئے بولا "اسے لے جائیے انسپکٹر پانڈے۔ اس سے آپ اور بھی بہت کچھ پوچھ سکتے ہیں اور یہ آپ کو بہت کچھ بتائے گا۔"

انسپکٹر نے شکریہ ادا کیا اور وہ لوگ پنڈت سوبھراج کو لے کر چلے گئے۔ میں ابھی ہوئی نظروں سے ٹھاکر کی طرف دیکھنے لگا۔

"میں پچھلے دروازے سے باہر نکل گیا تھا۔" وہ میری نگاہوں کا مطلب سمجھتے ہوئے بولا "باہر جا کر میں نے گیسٹ ہاؤس کے ٹیلی فون سے انسپکٹر پانڈے کو اطلاع دے دی۔"

"اوہ۔۔۔!" میرے منہ سے گہرا سانس نکل گیا "میں بھی حیران تھا کہ پولیس اچانک یہاں کیسے پہنچ گئی۔"

ہم دیر تک پنڈت سوبھراج کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔

"کیا تمہارے خیال میں پنڈت نے دارا اور بلونت سنگھ کے بارے میں غلط بیانی سے کام نہیں لیا ہوگا۔ اپنے آپ کو بچانے کے لیے اس نے ہمیں غلط راستے پر ڈالنے کی کوشش کی ہو۔" ٹھاکر نے کہا۔

"میرے خیال میں ایسا نہیں ہے۔" میں نے جواب دیا "وہ جس صورت حال سے دوچار تھا اس کے تحت وہ جھوٹ نہیں بول سکتا تھا اور پھر دارا اور بلونت کو کسی ایسی ہی جگہ پر پناہ مل سکتی ہے جس کے بارے میں ہم سوچ بھی نہیں سکتے اور واقعی ہم نے ایسا سوچا بھی نہیں تھا۔ ہمیں تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ ان پہاڑیوں میں کالی کا کوئی مندر ہے جہاں انسانی جانوں کی بھینٹ دی جاتی ہے۔"

"انسانی جانوں کی بھینٹ!" روپ متی اچھل پڑی۔

"ہاں۔ پنڈت سوبھراج نے بتایا تھا کہ الور کے قریب پہاڑیوں میں کالی کا کوئی مندر ہے جہاں ہر سال میلہ لگتا ہے اور ایک ہفتے کے دوران میں کم از کم تین انسانوں کو کالی کے چرنوں پر قربان کیا جاتا ہے اور پنڈت کے کہنے کے مطابق دارا اور بلونت سنگھ اسی طرف گئے ہیں۔ ان کے ساتھ کوئی لڑکی بھی ہے۔"

"تو پھر ہمیں کل صبح ہی ان کے تعاقب میں روانہ ہو جانا چاہیے۔" جانکی بولی۔

"ابھی نہیں۔" ٹھاکر نے جواب دیا "ابھی وہ جگہ دیران ہے۔ انہیں ہماری آمد کا پتا چل جائے گا۔ دو چار دن بعد جب یاتریوں کی آمد شروع ہوگی تو ہم بھی پہنچ جائیں گے۔"

بارش رک گئی تھی۔ ہم ہٹ سے نکل کر لان میں آ گئے۔ دھلے اور نکھرے ہوئے پودے بڑے بھلے لگ رہے تھے۔ بارش سے موسم بھی خاصا خوشگوار ہو گیا تھا۔

شام سات بجے کے قریب ٹھاکر اور روپ متی کھانا لینے کے لیے شہر کی طرف چلے گئے۔ اگرچہ کچن میں پورا راشن اور ضرورت کی ہر چیز موجود تھی اور تین عورتیں بھی تھیں لیکن یہ تینوں صرف چائے اور کافی بنانے کی حد تک ہی رہی تھیں۔ ہٹ کا ملازم ابھی تک اسپتال میں پڑا تھا۔ اگر وہ ہوتا تو ہمیں کھانے کی بھی پریشانی نہ ہوتی۔

جانکی، بلا اور میں لان ہی میں بیٹھے رہے۔ ساڑھے آٹھ بج گئے۔

روپ متی اور ٹھاکر ابھی تک واپس نہیں آئے تھے۔ میرا خیال تھا کہ وہ شنکر اور بھگت وغیرہ کو دیکھنے اسپتال چلے گئے ہوں گے۔

نو بجے کے قریب پولیس کی ایک جیپ ہٹ کے سامنے آ کر رکی تو میں چونکے بغیر نہیں رہ سکا۔ جیپ میں صرف ڈرائیور تھا۔ وہ اتر کر تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا ہماری طرف آ گیا۔

"ٹھاکر جی کی موٹر کا۔۔۔ ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔ انسپکٹر پانڈے نے آپ کو اسپتال بلایا ہے۔" ڈرائیور نے قریب پہنچ کر کہا۔

میں ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ جانکی اور بلا بھی اچھل پڑی تھیں۔ ان دونوں کے چہرے ایک دم دھواں ہو گئے تھے۔

"اوہ!" میں بولا "کیسے ہیں وہ دونوں؟"

"آپ اسپتال چل کر دیکھ لیجیے۔" ڈرائیور نے جواب دیا۔

میرا دماغ گھوم رہا تھا۔ دل میں طرح طرح کے وسوسے آنے لگے۔ اگر کوئی معمولی حادثہ ہوتا تو پولیس کے ڈرائیور کو بھیج کر ہمیں نہ بلوایا جاتا۔ اس کا مطلب تھا کہ حادثے کی نوعیت کچھ زیادہ ہی سنگین تھی۔

جانکی نے ہٹ کا دروازہ بند کر کے تالا لگا دیا اور ہم دوڑ کر جیپ پر سوار ہو گئے۔ ڈرائیور ہم سے پہلے ہی اپنی سیٹ پر بیٹھ چکا تھا۔

اسپتال کے راستے میں سڑک کا ایک موڑ گھومتے ہوئے مجھے ٹھاکر کی پجارو نظر آ گئی۔ وہ بالکل پچکی ہوئی تھی۔ اس سے مجھے حادثے کی سنگینی کا اندازہ ہو گیا۔

اسپتال میں ٹھاکر ایک بیڈ پر لیٹا ہوا تھا۔ اس کے سر اور

بازو پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں اور وہ ہوش میں ہی تھا۔ ہمیں دیکھتے ہی وہ اٹھ گیا۔ قریب کھڑی ہوئی نرس نے اسے دوبارہ لٹانے کی کوشش کی مگر ٹھاکر نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ ٹھاکر کو دیکھ کر مجھے قدرے اطمینان ہوا۔ اس کی حالت زیادہ تشویش ناک نہیں تھی۔

"یہ سب کیسے ہوا ٹھاکر۔ روپ متی کہاں ہے۔ کیسی ہے وہ؟" میں نے جلدی سے آگے بڑھ کر پوچھا۔

"وہ آپریشن تھیٹر میں ہے۔ اس کی حالت اچھی نہیں ہے۔ اس کا بہت خون ضائع ہو چکا ہے۔ اگر اسے خون نہ ملا تو وہ مر جائے گی۔" ٹھاکر نے کہا۔

میں آپریشن تھیٹر کی طرف بھاگ کھڑا ہوا۔ ڈاکٹر تھیٹر کے سامنے والی راہداری میں مل گیا۔ اس نے بتایا کہ روپ متی کو خون کی اشد ضرورت ہے۔ یہ کوئی بڑا اسپتال نہیں ہے۔ یہاں بلڈ بینک نہیں ہے اور نہ ہی شہر میں کوئی بلڈ بینک ہے جہاں سے خون حاصل کیا جا سکے۔

"میرا خون لے لو ڈاکٹر۔" میں نے بازو آگے کر دیا "میرے جسم سے خون کا ایک ایک قطرہ نچوڑ لو اور روپ متی کی زندگی بچا لو۔"

"پہلے گروپ ٹیسٹ کرنا ہوگا۔" ڈاکٹر بولا "میرے ساتھ آیئے۔"

بلا، جانکی اور ٹھاکر بھی وہاں پہنچ گئے اور ہمارے ساتھ وہ بھی لیبارٹری میں آ گئے۔ پہلے جانکی اور بلا نے اپنا بلڈ گروپ ٹیسٹ کروایا۔ ان کے گروپ مختلف تھے اور خوش قسمتی سے میرا بلڈ گروپ روپ متی کے خون سے مل گیا۔

مجھے بیڈ پر لٹا دیا گیا اور تمام انتظامات مکمل ہونے کے بعد نیڈل میری نس میں لگائی گئی تو اچانک ہی میرے دماغ میں دھماکا سا ہوا۔ میں نے بازو میں لگی ہوئی سوئی کھینچ دی اور ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"نہیں۔ میں روپ متی کو اپنا خون نہیں دوں گا۔"

"کیا...؟" ٹھاکر میری طرف دیکھ کر چیخا۔ اسے شاید میری بات کا یقین نہیں آیا تھا۔

"میں روپ متی کو اپنا خون نہیں دے سکتا ٹھاکر۔ اس کی زندگی بچانے کے لیے کوئی اور بندوبست کرو۔" میں نے کہا۔

"یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟" ٹھاکر بولا "تم روپ متی کو خون دینے سے انکار کر رہے ہو۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ تم اس کی زندگی بچا سکتے ہو۔"

"نہیں ٹھاکر۔ میں اپنا خون نہیں دے سکتا۔" میں نے جواب دیا۔

"مجھے یقین نہیں آ رہا کہ تم ایسے موقع پر روپ متی کی مدد کرنے سے انکار کر دو گے۔" ٹھاکر نے میرے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا "وہ روپ متی ہے۔ اس نے تمہارے لیے کیا کچھ نہیں کیا۔ کیا کیا مصیبتیں نہیں جھیلیں اس نے تمہارے لیے اور اب جبکہ وہ زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا ہے تو تم پیچھے ہٹ رہے ہو۔ میں تمہیں ایسا احسان فراموش نہیں سمجھتا تھا۔" ٹھاکر جذبات میں آ رہا تھا "اگر روپ متی کو کچھ ہو گیا تو میں بھی زندہ نہیں رہ سکوں گا۔ روپ متی کو بچا لو وجدان۔ تمہیں تمہارے خدا کا واسطہ۔ بچا لو اسے۔" وہ میرے دونوں بازو پکڑ کر جھنجوڑنے لگا۔

"میں روپ متی کو اپنا خون نہیں دے سکتا ٹھاکر۔" میں نے جواب دیا اور یہ بات کہتے ہوئے مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے کسی نے میرا دل مٹھی میں لے رکھا ہو "بلا۔ بتاؤ۔ ٹھاکر کو بتاؤ کہ میں روپ متی کو اپنا خون کیوں نہیں دے سکتا۔"

بلا بھی چونک گئی اور پھر شاید بات اس کی سمجھ میں آ گئی۔ وہ ٹھاکر کو ہاتھ سے پکڑ کر کھینچتے ہوئے ایک طرف لے گئی۔

چند منٹ بعد ٹھاکر واپس مڑا تو میری آنکھوں سے بہتے ہوئے آنسو دیکھ کر مجھ سے لپٹ گیا۔ میں بڑی مشکل سے اپنی ہچکی ضبط کر سکا تھا۔

"میں احسان فراموش اور نمک حرام نہیں ہوں ٹھاکر۔" میں نے بھی اسے اپنی بانہوں میں لپیٹ لیا "تم لوگوں کے احسانات تو میں مرتے دم تک نہیں بھول سکوں گا۔ تم لوگوں کے لیے تو میں اپنی جان تک دینے کو تیار ہوں لیکن میں روپ متی کو اپنا خون نہیں دے سکتا۔ میرے خون کا ہلا قطرہ اس کے خون میں شامل ہوتے ہی وہ ختم ہو جائے گی۔ میں کتنا بدقسمت ہوں کہ زندگی کے ان نازک ترین لمحات میں اپنی محسنہ کے کام نہیں آ سکتا۔"

"میں سمجھ گیا ہوں۔" ٹھاکر نے میری پیشانی پر بوسہ دیتے ہوئے کہا "بلا نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے۔ میں نے تمہیں غلط سمجھا اور کچھ سخت شبد (الفاظ) کہہ دیے تھے۔ مجھے معاف کر دینا میرے دوست۔"

"معافی تلافی بعد میں ہوتی رہے گی۔" میں نے اپنے آپ کو اس سے الگ کرتے ہوئے کہا "پہلے ہمیں روپ متی کی زندگی کی فکر کرنی چاہیے۔ ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ ایک ایک لمحہ قیمتی ہے۔"

"سمجھ میں نہیں آتا کیا کریں۔" ٹھاکر بولا "یہاں کوئی

بلڈ بینک نہیں ہے۔ جے پور کے کسی بلڈ بینک سے خون منگوایا جائے تو اس میں کئی گھنٹے لگ جائیں گے اور اس وقت تک روپ متی۔"

"نہیں۔ ہم روپ متی کو مرنے نہیں دیں گے۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی "یہ اتنا بڑا شہر ہے، ہزاروں لوگ آباد ہیں یہاں۔ کسی ایک آدمی کے خون کا گروپ تو مل جائے گا۔ تم یہیں رکو۔ میں ابھی آتا ہوں۔"

میں تقریباً دوڑتا ہوا اسپتال کے برآمدے میں آ گیا۔ برآمدے کے سامنے وسیع و عریض کمپاؤنڈ تھا جس میں چند سایہ دار درخت بھی تھے جن کے نیچے لوگوں کے بیٹھنے کے لیے کنکریٹ کی بینچیں رکھی ہوئی تھیں۔ ان بینچوں پر بھی لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ برآمدے میں اور اس کے آس پاس بھی بہت سے لوگ موجود تھے۔ چھ سات آدمی ایک جگہ پر جھنڈ کی صورت میں کھڑے تھے اور اس جھنڈ میں انسپکٹر پانڈے بھی نظر آ گیا۔ وہ اس حادثے کے دو چشم دید گواہوں کے بیان نوٹ کر رہا تھا۔

"بھائیو! ذرا میری بات غور سے سنو۔" میں نے پھیپھڑوں کی پوری قوت استعمال کرتے ہوئے کہا۔ لوگ فوراً ہی میری طرف متوجہ ہو گئے۔ انسپکٹر پانڈے بھی مڑ کر میری طرف دیکھنے لگا "ایک انسان موت و زندگی کی کشمکش میں مبتلا ہے۔ حادثے میں زخمی ہونے والی دیوی کو خون کی ضرورت ہے۔ آپ میں بہت سے لوگ ایسے ہوں گے جن کا بلڈ گروپ اس سے مل جائے گا۔ ہم خون کی ایک بوتل کے لیے منہ مانگی قیمت دینے کو تیار ہیں۔ قیمتاً نہیں تو انسانی ہمدردی کے ناتے۔ خون کی صرف ایک بوتل، ایک سچے اور کھرے انسان کی زندگی بچا سکتی ہے۔"

انسپکٹر پانڈے میرے قریب آ گیا اور لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔

"یہ وہ عظیم انسان ہے جس نے اس شہر کو اور دور دراز کے قصبوں اور دیہاتوں میں رہنے والے لوگوں کو گنگولی چوہدری جیسے عفریت سے نجات دلائی ہے۔ یہی ہے وہ مہان (عظیم) آدمی جو گنگولی جیسے راکھشس کا مقابلہ کرنے کے لیے اکیلا جنگل میں گھس گیا تھا۔ اس نے گنگولی چوہدری اور اس کے گروہ کا خاتمہ کرنے کے لیے اپنی جان کی بازی لگا دی تھی۔ میں اس کا چشم دید گواہ ہوں اور آج..." وہ ایک لمحے کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا "اور آج اپنی جنہ اس مہان آدمی پر ثابت کرو کہ ہم بھی احسان فراموش نہیں ہیں۔ میں اپنے آپ کو پہلے ہی پیش کر چکا ہوں لیکن بدقسمتی سے میرا بلڈ گروپ اس دیوی کے خون سے نہیں ملتا۔ تم لوگوں میں کون ہے جو اس دیوی کی جان بچانے کے لیے اپنا خون دان (تحفہ) کرے۔"

تقریباً ایک درجن آدمی ہمارے سامنے آ گئے تھے۔ وہ کسی قیمت کے بغیر خون دینے کو تیار ہو گئے تھے۔ بہت سے لوگ ان کے گروہ جمع ہو گئے۔ انہوں نے صرف سنا تھا کہ ہمت سنگھ نامی کسی سورما نے گنگولی چوہدری کو ٹھکانے لگایا تھا اور اب وہ سورما ان کے سامنے کھڑا تھا۔ لوگ آگے بڑھ بڑھ کر مجھ سے ہاتھ ملا رہے تھے۔ میرے ہاتھوں اور میری پیشانی پر بوسے دے رہے تھے اور پھر یہ دلچسپ انکشاف ہوا کہ اسپتال کے کمپاؤنڈ میں موجود ہر شخص روپ متی کی زندگی بچانے کے لیے خون دینے کو تیار تھا۔

"یہ تو چمتکار ہو گیا ہمت سنگھ۔" ٹھاکر مجھے پکڑ کر ایک طرف لے گیا "میں نے بہت سے لوگوں کے سامنے ہاتھ جوڑے تھے مگر کوئی خون کا ایک قطرہ بھی دینے کو تیار نہیں تھا۔"

"یہ انسپکٹر پانڈے کا چمتکار ہے۔" میں نے جواب دیا "اگر وہ میرے نام کے ساتھ گنگولی چوہدری کا حوالہ نہ دیتا تو شاید کوئی بھی آگے نہ آتا۔ اب تم اپنے بھگوان سے پرارتھنا (دعا) کرو اور میں اپنے خدا سے دعا کرتا ہوں کہ روپ متی بچ جائے۔"

"میں بھی خدا ہی سے دعا مانگتا ہوں اور مجھے یقین ہے خدا ہمیں مایوس نہیں کرے گا۔" ٹھاکر نے جواب دیا۔

ایک گھنٹے بعد روپ متی کو خون کی پہلی بوتل لگ چکی تھی۔ چھ آدمیوں کا بلڈ گروپ مل گیا تھا۔ جن میں سے چار کو روک لیا گیا اور باقی سب کو رخصت کر دیا گیا۔ جن دو سرے دو آدمیوں کو رخصت کیا گیا تھا انہوں نے اپنے گھروں کے پتے دے دیے تاکہ ضرورت پڑنے پر انہیں کسی بھی وقت بلایا جا سکے۔

ہمیں آپریشن تھیٹر میں فی الحال جانے کی اجازت نہیں دی گئی۔ ایک ڈاکٹر کو شاید ٹھاکر کا خیال آ گیا اور وہ اسے پکڑ کر ایک کمرے میں لے گیا اور نرس کو سختی سے ہدایت کی کہ اسے کمرے سے باہر نہ نکلنے دیا جائے۔ نرس نے ٹھاکر کو بیڈ پر لٹا دیا۔

"میں بالکل ٹھیک ہوں بھئی۔ میری چنتا (فکر) مت کرو۔" ٹھاکر نے کہا۔

"آپ نے بہت ہنگامہ کر لیا ٹھاکر جی۔ اب آپ کو آرام

کی ضرورت ہے۔" نرس نے مسکراتے ہوئے کہا "دیوی جی کی چنتا آپ بالکل نہ کریں۔ بلڈ کا بندوبست ہوگیا ہے۔ آدھا خطرہ ٹل گیا ہے۔ وہ ٹھیک ہوجائیں گی اور آپ لوگ۔۔۔" اس نے باری باری ہماری طرف دیکھا "آپ لوگ انہیں بیڈ سے نہ اترنے دیں۔"

نرس باہر نکلی تو جانکی مجھے بھی ہاتھ سے پکڑ کر باہر لے آئی۔

"تم نے روپ متی کو اپنا خون دینے سے انکار کیوں کیا تھا؟" وہ راہداری میں ایک جگہ رک کر بولی "تم تو خون دینے کے لیے لیٹ گئے تھے پھر اچانک کیوں بھاگ کھڑے ہوئے؟"

"بات یہ ہے جانکی۔" میں نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا "تمہیں یاد ہے شاؤلن ٹیمپل میں ٹریننگ کے دوران میں جب ہم صبح سویرے ماسٹر ہنگ پائی کے ساتھ پہاڑی پر یوگا کی مشق کیا کرتے تھے اور ایک روز ماسٹر ہنگ پائی نے اپنے آپ کو سانپ سے ڈسوایا تھا اور۔۔۔"

"اور وہ سانپ مرگیا تھا۔" جانکی نے میرا جملہ مکمل کردیا۔

"ہاں۔" میں نے کہا "بعض خاص جڑی بوٹیوں کے استعمال سے ماسٹر ہنگ پائی کے خون میں اتنا زہر بھر گیا تھا کہ نہایت زہریلا سانپ بھی اسے ڈستے ہی مرگیا تھا۔"

"مگر تم۔۔۔ کیا تم بھی۔۔۔" جانکی کی آنکھیں دہشت سے پھیلتی چلی گئیں۔

"ہاں۔" میں نے اثبات میں سر ہلایا "تمہیں یاد ہوگا کہ کچھ عرصے تک کھانے میں صبح کوئی ایسی چیز بھی دی جاتی تھی جس کے لیے تمہیں منع کردیا جاتا تھا۔ اس خوراک میں مجھے وہ جڑی بوٹیاں استعمال کرائی گئی تھیں جن سے میرے خون میں زہر شامل ہوگیا۔"

"تم نے مجھ سے کبھی اس کا تذکرہ نہیں کیا تھا اور غالباً بلا کو بتا رکھا تھا اور اس نے ٹھاکر کو الگ لے جاکر بتایا ہوگا۔" وہ مجھے کھا جانے والی نظروں سے گھور رہی تھی۔

"ہمیں شاؤلن ٹیمپل سے آئے ہوئے عرصہ ہوچکا ہے لیکن مجھ سے اس سلسلے میں کبھی بات نہیں کی اور بلا سے چار دن کی دوستی میں تم نے اسے اپنے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔ آخر اس چھوکری میں ایسے کیا سرخاب کے پر لگے ہیں کہ تم نے اس کے لیے اپنی زندگی بھی داؤ پر لگا دی تھی۔"

"تم پھر پٹڑی سے اتر رہی ہو۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "مجھ پر بھی یہ انکشاف صرف تین دن پہلے ہوا تھا جب انسپکٹر پانڈے اور بلا کی موجودگی میں جنگل میں ایک بلیک کوبرا نے مجھے ڈس لیا تھا اور وہ بے چارہ خود ہی اپنے ہاتھ سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا۔"

● "اوہ۔۔۔!" جانکی چونک سی گئی۔

"اگر میں خود اپنی زبان سے کہتا کہ میرے خون میں زہر ملا ہوا ہے تو ٹھاکر میری بات پر یقین نہ کرتا اس لیے میں نے بلا سے کہا تھا کہ وہ ٹھاکر کو بتا دے۔" میں نے کہا۔

"یہ تو بڑی سنگین صورتِ حال ہے۔" جانکی بولی "اگر کبھی مجھے تمہارے خون کی ضرورت پڑ گئی تو۔۔۔"

"تمہیں ایسی کوئی امید نہیں رکھنی چاہیے۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی "چلو۔ اب اندر چلیں۔ میں نے ٹھاکر سے تو کچھ پوچھا ہی نہیں۔"

ہم کمرے میں آگئے۔ کمرے میں ایک اسٹول اور دو کرسیاں تھیں۔ ایک کرسی پر بلا بیٹھی ہوئی تھی۔ ہمیں دیکھ کر وہ کرسی سے اٹھ کر اسٹول پر بیٹھ گئی۔

"ہاں میرے دوست۔ اب بتاؤ یہ سب کچھ کیسے ہوا؟" میں نے ٹھاکر کے سامنے کرسی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا "اس طرف آتے ہوئے میں نے تمہاری گاڑی دیکھی تھی۔ اس کا اگلا حصہ تو بالکل پچکا ہوا ہے۔ مجھے حیرت ہے کہ اس قدر خوفناک حادثے کے بعد۔۔۔"

"ہم زندہ کیسے بچ گئے۔" ٹھاکر نے مسکراتے ہوئے میری بات پوری کردی اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولا "بارش کی وجہ سے سڑکیں بھیگی ہوئی تھیں مگر میری گاڑی کی رفتار زیادہ تیز نہیں تھی۔ ایک موڑ پر میں نے جیسے ہی گاڑی گھمائی، مخالف سمت سے ایک تیز رفتار ٹرک کو آتے دیکھ کر میں نے پورے زور سے بریک لگا دیے۔ میری طرف کا دروازہ شاید لاک نہیں تھا۔ جھٹکا لگنے سے دروازہ کھل گیا اور میں نیچے گر کر سڑک پر لڑھکتا چلا گیا۔ پیچھے سے آنے والی ایک کار مجھ سے ٹکرا کر رک گئی اور وہ ٹرک زوردار ٹکر سے پچارو کو گھسیٹتا ہوا دور تک لے گیا اور پھر اس کے بعد مجھے ہوش نہیں رہا۔ سر پر لگنے والی چوٹ نے مجھے بے ہوش کردیا تھا۔ یہاں اسپتال میں ہوش آیا تو مجھے بتایا گیا کہ میرے ساتھ پچارو میں سوار عورت کی حالت بہت نازک ہے۔ خون بہت زیادہ ضائع ہوجانے سے اس کی جان خطرے میں پڑ گئی ہے۔ انسپکٹر پانڈے۔۔۔"

"اس دوران میں پولیس بھی پہنچ گئی۔ انسپکٹر پانڈے مجھے دیکھ کر بدحواس سا ہوگیا۔ اس نے اپنے ایک آدمی کو تمہیں اطلاع دینے کے لیے دوڑا دیا۔ مجھے روپ متی کی فکر تھی۔ اس کے لیے خون کا بندوبست نہیں ہو رہا تھا۔ انسپکٹر پانڈے خون دینے کو تیار تھا مگر اس کا بلڈ گروپ نہیں ملا۔۔۔

تین اور آدمی بھی تیار ہوگئے تھے مگر ہر ایک کا بلڈ گروپ مختلف تھا۔ میں اسپتال میں موجود دوسرے لوگوں کی منتیں کرتا رہا مگر کوئی بھی تیار نہیں ہوا اور پھر تم لوگ آگئے۔ تمہارا بلڈ گروپ مل گیا تھا مگر جب تمہیں بیڈ پر لٹایا گیا تو عین وقت پر تم نے انکار کردیا اور۔۔۔"

"مجھے افسوس ہے ٹھاکر۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی "میں اپنی روپ متی کے کسی کام نہ آسکا۔ اس کے لیے جان لٹا دینے کا دعویٰ کرنے والا اس کی زندگی بچانے کے لیے خون کا ایک قطرہ نہیں دے سکا۔"

"ایسا نہ کہو وجدان۔" ٹھاکر نے میرا ہاتھ پکڑ کر اپنے ہونٹوں سے لگا لیا "صرف اور صرف تمہاری وجہ سے روپ متی کی زندگی بچنے کی اُمید پیدا ہوئی ہے۔ تم واقعی مہان ہو وجدان۔ میں بہت شرمندہ ہوں۔ میں نے غصے میں تمہیں جو کچھ کہا اس پر مجھے ہمیشہ شرمندگی رہے گی۔"

"ایسی کوئی بات نہیں ہے۔" میں نے اس کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا "غصے اور جذبات میں آکر تم نے ایک اور دلچسپ انکشاف کیا تھا جس پر میں بے حد خوش ہوں۔"

"کیا انکشاف؟" وہ الجھی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔

"روپ متی کے بارے میں۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "تم اس کے لیے جس طرح پاگل ہو رہے تھے اس سے مجھے اندازہ ہوگیا ہے کہ تم روپ متی کو کتنا چاہتے ہو۔"

ٹھاکر کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ اس نے کن انکھیوں سے بالا اور جانکی کی طرف دیکھا اور پھر اس کی آنکھوں میں نمی تیر گئی۔ اس کے جذبات آنسو بن کر امڈ پڑے۔

"گھبراؤ نہیں میرے دوست۔" میں اس کا ہاتھ تھپتھپانے لگا "روپ متی ٹھیک ہوجائے گی۔ تم نے نرس کی بات نہیں سنی تھی۔ خون کا بندوبست ہوجانے سے آدھا خطرہ ٹل گیا ہے۔ خدا نے چاہا تو وہ بہت جلد ٹھیک ہوجائے گی۔"

جانکی اور بالا بھی اسے تسلیاں دینے لگیں۔

تھوڑی دیر بعد میں کمرے سے نکل کر آپریشن تھیٹر کی طرف آگیا۔ اس وقت اگرچہ رات کے گیارہ بج چکے تھے لیکن آپریشن تھیٹر کے سامنے والی راہداری اور برآمدے میں اب بھی بہت سے لوگ موجود تھے۔

روپ متی کو خون کی دوسری بوتل لگائی جاچکی تھی۔ اس طرح خون دینے والے دو آدمی رخصت ہوگئے تھے۔ اس اسپتال میں چند گھنٹوں کے لیے بھی خون محفوظ رکھنے کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ اس لیے باقی دو آدمی اپنی باری کے انتظار میں بیٹھے ہوئے تھے۔ میں بھی آپریشن تھیٹر کے سامنے ٹہلنے لگا۔

تھوڑی دیر بعد ایک ڈاکٹر آپریشن تھیٹر سے باہر آیا۔ میں اسے روک کر روپ متی کے بارے میں دریافت کرنے لگا۔

"وہ ابھی بے ہوش ہے اور اگلے چوبیس گھنٹے اس کے لیے بہت اہم ہیں۔" ڈاکٹر نے جواب دیا۔

"خطرے کی کوئی بات۔۔۔؟" میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"فی الحال کچھ نہیں کہا جاسکتا لیکن بہرحال ہمیں اچھی اُمید رکھنی چاہیے۔" ڈاکٹر میرا کندھا تھپتھپاتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔

میں اس کمرے میں آگیا جہاں بھگت وغیرہ پڑے ہوئے تھے۔ انہیں بھی اس حادثے کا پتا چل گیا تھا اور وہ بھی جاگ رہے تھے۔ ان کے چہروں پر افسردگی تھی۔ میں کچھ دیر ان کے پاس بیٹھا اور پھر ٹھاکر والے کمرے میں آگیا۔

"کیا یہ عجیب بات نہیں کہ ہماری فیملی کے افراد اس اسپتال کے پانچ بستروں پر قبضہ کر رکھا ہے۔" میں نے کہا۔

ٹھاکر کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی۔ ہم ابھی باتیں کر رہے تھے کہ انسپکٹر پانڈے آگیا۔ وہ ٹھاکر کا بیان لینا چاہتا تھا اور ٹھاکر اس قابل تھا کہ اپنا بیان دے سکتا تھا۔

انسپکٹر پانڈے نے یہ بھی بتایا کہ اس حادثے کے بعد ٹرک وہاں سے فرار ہوگیا تھا۔ سارسکا کے دونوں طرف شاہراہ پر واقع شہروں کی پولیس کو فون پر اطلاع دی جاچکی ہے۔ وہ ٹرک بچ کر نہیں جاسکے گا۔ اسے کہیں نہ کہیں پکڑ لیا جائے گا۔

انسپکٹر پانڈے کافی دیر ہمارے پاس بیٹھا رہا۔ اس دوران میں وہ بار بار میری طرف دیکھتا رہا اور میری ہمت و جرأت کی داد دیتا رہا۔ اس نے ٹھاکر کو جنگل میں مجھے سانپ کے ڈسنے کا واقعہ بھی سنایا۔

"میں تو حیران رہ گیا تھا۔" وہ کہہ رہا تھا "کوبرا جیسے زہریلا سانپ ان شریمان جی کو ڈسنے کے بعد خود ہی مر گیا تھا۔"

"ہاں۔" ٹھاکر بولا "بعض لوگوں کا خون قدرتی طور پر ایسا ہوتا ہے کہ زہریلے کیڑے مکوڑے اور سانپ کا زہر ان پر اثر نہیں کرتا اور یہ اپنا خون کسی کو دے بھی نہیں سکتے۔"

"ہاں۔ یہ واقعی حیرت کی بات ہے۔" انسپکٹر پانڈے بولا۔

انسپکٹر پانڈے کے جانے کے بعد ٹھاکر نے اس سلسلے میں مجھ پر سوالات کی بوچھار کردی اور مجھے مجبوراً اسے سب کچھ بتانا پڑا کہ میرا خون اس قدر زہریلا کیوں ہوا تھا۔

رات کے دو بج چکے تھے۔ میں ہر تھوڑی دیر بعد آپریشن تھیٹر کی طرف کا ایک چکر لگا آتا۔ ڈاکٹر روپ متی کو آبزرویشن میں رکھے ہوئے تھے لیکن فی الحال وہ کوئی بات یقینی طور پر نہیں کہہ سکتے تھے۔

روپ متی کو خون کی تیسری بوتل لگی ہوئی تھی۔ خون بڑی تیزی سے اس کے جسم میں منتقل کیا جارہا تھا۔ چوتھا آدمی اس وقت بھی راہداری میں بیٹھا ہوا تھا۔ میں بھی کچھ دیر اس کے قریب بیٹھا رہا۔ میں واقعی ان لوگوں کا احسان مند تھا۔ انہیں صرف یہ بتایا گیا تھا کہ میں نے گنگولی چوہدری اور اس کے گروہ کے خاتمے میں اہم کردار ادا کیا تھا اور وہ میری خاطر روپ متی کو خون دینے کو تیار ہوگئے تھے اور چوتھا آدمی اس وقت بھی اسپتال میں بیٹھا ہوا تھا کہ نجانے کب اس کی ضرورت پڑجائے۔ میں نے اس سے کھانے چائے کا دریافت کیا تو پتا چلا کہ وہ اسپتال کے ایک ملازم سے کھانا منگوا کر کھا چکا ہے۔ اس نے یہ پیشکش بھی کی کہ ہمیں کسی چیز کی ضرورت ہو تو وہ لادے گا۔

ہم نے بھی ابھی تک کچھ نہیں کھایا تھا۔ روپ متی اور ٹھاکر بازار سے کھانا لانے کے لیے ہی نکلے تھے کہ یہ خوفناک حادثہ پیش آگیا۔ پہلے تو ہمیں کھانے پینے کا ہوش تک نہیں رہا تھا لیکن صورتِ حال اب کچھ اطمینان بخش ہوئی تھی تو بھوک کا احساس بھی ہونے لگا تھا۔

راجو نامی اس شخص نے بتایا کہ شہر میں ایک ایسی جگہ ہے جہاں رات بھر رونق رہتی ہے اور ریسٹورنٹ وغیرہ کھلے ہوتے ہیں۔ میں نے اسے دو سو روپے نکال کر دیے کہ پہلے خود کسی ریسٹورنٹ میں بیٹھ کر کچھ کھا پی لے اور پھر ہمارے لیے کچھ لے آئے۔ وہ فوراً ہی وہاں سے روانہ ہوگیا اور میں ٹھاکر والے کمرے میں آگیا۔

○☆○

روپ متی کو خون کی چار بوتلیں لگ چکی تھیں۔

دوپہر بارہ بجے کے قریب اسے ہوش آیا تو ڈاکٹر نے یہ نوید سنائی کہ اب اس کی زندگی کو کوئی خطرہ نہیں۔ ہم فوری طور پر اسے دیکھنا چاہتے تھے لیکن ڈاکٹر نے منع کردیا کہ ہم شام سے پہلے اسے نہیں دیکھ سکتے۔

وہ پورا دن ہم نے اسپتال میں گزارا۔ رات آٹھ بجے کے قریب روپ متی کو بھی ٹھاکر والے کمرے میں منتقل کردیا گیا۔ یہ اسپتال زیادہ بڑا نہیں تھا۔ پرائیویٹ روم زیادہ تھے اس لیے روپ متی کے لیے بھی اس کمرے میں بیڈ لگا دیا گیا تھا اور ایک کوچ اٹینڈنٹ کے لیے بھی ڈال دیا گیا تھا۔

روپ متی کی حالت خاصی ابتر تھی۔ اس کی ایک ٹانگ اور ایک بازو پر پلستر چڑھا ہوا تھا۔ سینے، سر اور دوسری ٹانگ پر بھی پٹیاں لپٹی ہوئی تھیں۔ میں نے راستے میں پجارو دیکھی تھی۔ ٹھاکر کی خوش قسمتی تھی کہ اپنی طرف کا دروازہ کھل جانے سے وہ اچھل کر باہر گر گیا تھا اور اسے معمولی چوٹیں آئی تھیں۔ وہ حادثہ اس قدر خوفناک تھا کہ روپ متی کا زندہ بچ جانا ہی ایک معجزہ تھا اور میرا خیال تھا کہ اسے مکمل طور پر صحت یاب ہونے میں کم از کم تین مہینے ضرور لگیں گے۔ ٹانگ اور بازو کے پلستر کے لیے ڈاکٹر نے چھ ہفتوں کا وقت دیا تھا۔

وہ رات بھی ہم نے جاگتے ہوئے گزاری تھی۔ روپ متی کو بولنے کی اجازت بالکل نہیں تھی۔ اسے آرام کی ضرورت تھی۔ ہم آپس میں بھی سرگوشیوں میں باتیں کرتے تھے تاکہ وہ ڈسٹرب نہ ہو۔

ٹھاکر نے اگلے ہی روز ڈسچارج لے لیا اور اس کے ساتھ ڈاکٹر نے ہم سب کو بھی اسپتال سے بھگا دیا۔ صرف ایک اٹینڈنٹ کو رہنے کی اجازت تھی اور یہ ذمے داری جانکی اور بالا نے سنبھال لی تھی۔ ان میں سے ایک دن کے وقت اسپتال میں رہتی اور دوسری رات کو۔ میں اور ٹھاکر بھی دن میں ایک دو مرتبہ چکر لگا لیتے تھے۔

ایک ہفتہ گزر گیا۔ حادثے کے تیسرے روز وہ ٹرک تو شہر سے بیس میل دور جے پور کی طرف جانے والی سڑک پر کھڑا مل گیا تھا البتہ ڈرائیور فرار ہوگیا تھا اور پولیس اس کی تلاش میں تھی۔

ٹھاکر اب ٹھیک ہوچکا تھا۔ وہ اپنے ہاتھوں پیروں کو آزادی سے حرکت دے سکتا تھا۔ ہمیں دارا اور بلونت سنگھ کی بھی فکر تھی جو الور کی پہاڑیوں میں کالی کے مندر کے آس پاس کہیں پناہ لیے ہوئے تھے۔ اگلا ہفتہ شروع ہوتے ہی شہر میں ٹریفک بڑھ گیا تھا۔

پہاڑیوں میں کالی کے مندر پر ہر سال لگنے والا میلہ ایک ایسا راز تھا جس سے ساری دنیا تو واقف تھی لیکن سرکار اور پولیس بے خبر تھی۔ جے پور کی طرف سے آنے والے یاتریوں کے جتھے کے جتھے الور کی پہاڑیوں کی طرف جارہے تھے۔ دوسری طرف بھرت پور اور دہلی وغیرہ سے بھی یاتری

اس طرف آرہے تھے لیکن پولیس بالکل "بے خبر" تھی کہ اس طرف میلہ لگنے والا ہے اور پہاڑیوں کے غار میں واقع کالی کے چرنوں میں انسانی جانوں کی بھینٹ دی جانے والی ہے۔

میں بھی پریشان تھا اور ٹھاکر بھی۔ دارا اور بلونت سنگھ کو گھیرنے کا یہ ایک اچھا موقع تھا لیکن روپ متی کی وجہ سے معاملہ گڑبڑ ہوگیا تھا۔

روپ متی اب بات کرنے کے قابل ہوگئی تھی۔ اس روز شام کو اس نے کہہ دیا کہ ہم اس کی فکر نہ کریں۔ اسپتال میں اس کی مناسب دیکھ بھال ہورہی ہے۔ بلا اور جانکی بھی موجود ہیں لیکن جانکی ہمارے ساتھ جانے پر بضد تھی لیکن ظاہر ہے ہم بلا کو ہٹ میں اکیلے نہیں چھوڑ سکتے تھے۔

اور بالآخر یہ طے ہوا کہ بلا، روپ متی کے پاس اسپتال میں رہے اور ہم تینوں اپنے مشن پر روانہ ہوجائیں۔

بھگت سنگھ بھی اب پہلے سے بہت بہتر تھا۔ دیکھ بھال کی کچھ ذمے داری اس نے قبول کرلی اور یہ بندوبست ہونے پر میں بھی کسی قدر مطمئن ہوگیا تھا۔

اگلے روز بلا اپنے کپڑے اور ضرورت کی دوسری چند چیزیں بیگ میں ڈال کر اسپتال لے آئی۔ میں، ٹھاکر اور جانکی اس روز زیادہ تر شہر کے مختلف بازاروں میں گھومتے رہے۔ اس مرتبہ ہم اندھا دھند چڑھائی نہیں کرنا چاہتے تھے بلکہ ہم تینوں نے پوری رات بیٹھ کر پلاننگ کی تھی اور یہ فیصلہ کیا تھا کہ ہم تینوں بھی سادھوؤں کے بھیس میں جائیں گے کہ اس طرح ہم کسی شک کی زد سے بچے رہیں گے۔

وہ رات ہم نے اپنے ہٹ میں گزاری۔ اگلا دن بھی کچھ تیاریوں میں گزرا۔ دوپہر کو ہم نے اسپتال کا چکر لگایا اور ہٹ میں گئے۔ تھوڑی دیر آرام کرنے کے بعد ٹھاکر نے مجھے اپنے سامنے بٹھالیا اور سب سے پہلے میرے سر کے بال قینچی سے کاٹ دیے اور پھر دوسرے کام میں مصروف ہوگیا۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد میں نے آئینے میں اپنا جائزہ لیا تو اچھل پڑا۔ میرا سر ایسا تھا جیسے کسی کھیت میں تازہ تازہ ہل چلایا گیا ہو۔ قینچی سے بال کاٹتے ہوئے ٹھاکر نے نفاست کا خیال بالکل نہیں رکھا تھا۔ کسی آوارہ گرد سادھو کا حلیہ ایسا ہی ہونا چاہئے تھا۔ ماتھے پر اوپر نیچے تین سفید افقی ایک انگلی چوڑی لکیریں۔ درمیان والی لکیر عین وسط میں سرخ ٹیکا، دونوں کانوں میں بندے۔ بندوں کے لیے کان چھدوانے کی ضرورت نہیں پڑی تھی۔ بازار میں کلپ والے بندے مل گئے تھے جنہیں کانوں کی لو سے چپکا لیا گیا تھا۔ ٹھاکر نے میرے دونوں رخساروں پر بھی سفیدے سے ایک ایک دھاری بنادی تھی۔ اس طرح میرا حلیہ بڑی حد تک بدل گیا تھا۔ مجھے مختلف انداز میں دھوتی بھی باندھنی آگئی تھی۔ دھوتی کا بچا ہوا پلو کندھے پر ڈال کر اس کے دونوں کناروں کی گردن کے پیچھے گرہ لگانی ہوتی تھی جب کہ میری پشت برہنہ تھی۔ اب میں واقعی سادھو لگ رہا تھا اور کوئی مجھے وجدان کی حیثیت سے آسانی سے نہیں پہچان سکتا تھا۔

کمرے سے باہر آکر میں نے دونوں کلائیوں میں رودرا کی آہنی کڑے بھی پہن لیے۔ ایک ہاتھ میں پیتل کا چھوٹا کمنڈل اور دوسرے ہاتھ میں تقریباً ایک انچ موٹا اور ڈیڑھ فٹ لمبا گول ڈنڈا پکڑ لیا۔ ڈنڈے کو میں نے اس طرح پکڑا کہ اس کا ایک سرا ہتھیلی کو چھوتا ہوا انگلیوں کی گرفت میں تھا اور ڈنڈے کا باقی حصہ بازو کے ساتھ کہنی تک چلا گیا تھا۔ انگلیوں کی حرکت سے ڈنڈا آہستہ آہستہ بازو میں پہنے ہوئے آہنی کڑوں پر بجنے لگا۔ اکثر سادھو اس طرح ڈنڈے سے کڑوں کو بجا کر لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کیا کرتے تھے۔

ٹھاکر جانکی کے بال بھی کاٹنا چاہتا تھا مگر وہ نہیں مانی۔ شاولن ٹیمپل کی طرف جاتے ہوئے چین کے خطے میں سفر کے دوران میں بھی جانکی گنجی ہوئی تھی اور بہت عرصے بعد اس کے بال اتنے لمبے ہوئے تھے۔

جانکی کے بال بکھرا کر چڑیا کے گھونسلے کی طرح بھی بنا دیے گئے۔ ٹھاکر نے اس کا حلیہ بھی بگاڑ دیا تھا اور جب وہ بھی ساڑی اوٹ پٹانگ انداز میں لپیٹ کر کمرے سے نکلی تو وہ بھی کسی مندر کی داسی ہی لگتی تھی۔ ایک گھنٹا ٹھاکر نے اپنے آپ پر لگا دیا۔

چھ بجے کے قریب ہم ہٹ سے باہر آگئے۔ دروازے کو تالا لگا کر چابی ایک ایسی جگہ پر رکھ دی گئی جس کے بارے میں بلا کو بھی بتا دیا گیا تھا۔

ہم تینوں کسی کی نظر میں آئے بغیر ہٹ سے نکل کر سڑک کی طرف چلنے لگے۔ راستے میں ہمیں جو بھی ملتا، ہاتھ جوڑ کر پرنام (سلام) کرتا کہ ہم سادھو تھے اور عام لوگوں کا فرض تھا کہ ہمیں پرنام کریں۔

ہم تینوں کے کندھوں پر ایک ایک تھیلا لٹکا ہوا تھا۔ جس میں ہماری ضرورت کی چیزوں کے علاوہ بھنے ہوئے چنے اور گڑ کی ڈلیاں بھی تھیں کہ سادھو لوگ ایسی ہی چیزوں پر گزارا کرتے تھے۔

سڑک پر ہمیں زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ سورج غروب ہو رہا تھا۔ فضا میں سرخی سی پھیلی ہوئی تھی۔ ہم نے ہاتھ

تینوں یک اپ ٹرک سے اتر کر ادھر ادھر گھومتے رہے۔ ہم کسی ایسی جگہ کی تلاش میں تھے جہاں سے آسانی سے مندر کے اندر پہنچا جاسکے کیونکہ ہمیں یقین تھا کہ دارا اور بلونت سنگھ سے مندر کے اندر یا اس کے آس پاس ہی ملاقات ہوسکے گی۔

ہر طرف سے ڈھول تاشوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ جگہ جگہ رقص و سرود کی محفلیں جمی ہوئی تھیں۔ کئی لوگ اپنے ساتھ طوائفوں کو لے کر آئے تھے۔ بعض طوائفیں کسی کی دعوت کے بغیر آئی ہوئی تھیں اور انہوں نے اپنی محفلیں جما رکھی تھیں۔

ہم بالآخر ایک چھوٹی سی پہاڑی کے دامن میں رک گئے۔ یہاں بھی ایک زور دار محفل جمی ہوئی تھی۔ بیسیوں لوگ دائرے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ دو آدمی ڈھول بجا رہے تھے۔ ایک چمٹا بجا رہا تھا۔ دو ادھیڑ عمر عورتیں کھڑتال بجا رہی تھیں۔ دو جوان اور خوبصورت لڑکیاں نیم عریاں لباس میں رقص کے نام پر اچھل کود کر رہی تھیں۔ ایک سادھو بھی جوش میں آکر میدان میں کود پڑا اور ان لڑکیوں کے ساتھ بے معنی اچھل کود کرنے لگا۔ ایک اور سادھو اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ اس نے چند لمحے ادھر ادھر دیکھا اور پھر میرے ساتھ کھڑی ہوئی جانکی کا ہاتھ پکڑ کر اسے کھینچتا ہوا وسط میں لے گیا۔ جانکی پہلے تو ہچکچائی لیکن پھر وہ بھی ان سادھوؤں کے ساتھ اچھل کود کرنے لگی۔ جانکی بہت اچھی رقاصہ تھی لیکن یہ رقص کے مظاہرے کا موقع نہیں تھا۔ بے معنی اچھل کود پر ہی داد مل رہی تھی۔ آس پاس بیٹھے ہوئے کچھ لوگ ان پر نوٹ نچھاور کررہے تھے۔

اب باقاعدہ ہڑبونگ شروع ہوگئی تھی۔ ٹھاکر نے آگے بڑھ کر جانکی کا ہاتھ پکڑ لیا اور اسے کھینچتا ہوا وہاں سے دور لے گیا۔ وہاں سے تقریباً بیس گز دور جاکر ہم بڑے بڑے پتھروں کے قریب بیٹھ گئے۔ اچھل کود سے جانکی کا سانس پھول گیا تھا۔

ہم سے تقریباً سو گز آگے وہ پہاڑی تھی جہاں کالی کے مندر والا غار تھا۔ اس طرف سے بھجن گانے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

"اس وقت تو ان لوگوں کو تلاش کرنا ممکن نہیں۔" ٹھاکر نے کہا۔ "رات اسی جگہ گزار لو۔ صبح ہوتے ہی ہم ان کی تلاش شروع کردیں گے۔"

ہم پتھروں سے ٹیک لگائے باتیں کرتے رہے۔ کسی طرف سے بھجن کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں، کسی طرف کے لیے خاص طور پر اس وقت کا انتخاب کیا تھا کہ الور کی پہاڑیوں میں پہنچیں تو اندھیرا ہوچکا ہو۔

ایک گاڑی کو آتے دیکھ کر ٹھاکر سڑک کے وسط میں کھڑا ہوگیا اور اس نے دونوں ہاتھ اٹھا دیے۔ وہ سرخ رنگ کا فورڈ کا یک اپ ٹرک تھا جو ٹھاکر سے چند فٹ کے فاصلے پر رک گیا۔ ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ پر ایک بھاری بھرکم آدمی بیٹھا ہوا تھا جس نے گود میں چھ سات سال کی عمر کے ایک بچے کو بھی سنبھال رکھا تھا۔ یک اپ کے پچھلے حصے میں دو عورتیں اور تین مرد بیٹھے ہوئے تھے۔ یہ سب لوگ ایک ہی فیملی کے ممبر تھے جو پورے کالی کے مندر کی طرف جارہے تھے۔

ٹھاکر چند منٹ ڈرائیور سے بات کرتا رہا پھر ہمیں اشارہ کیا اور ہم پیچھے آکر یک اپ پر سوار ہوگئے۔ جانکی عورتوں کے ساتھ جڑ کر بیٹھ گئی۔ میں اور ٹھاکر پیچھے کی طرف آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئے اور یک اپ ٹرک حرکت میں آگیا۔

ٹرک کی رفتار خاصی تیز تھی۔ پہاڑی کی طرف جانے والے موڑ تک پہنچنے میں چالیس منٹ سے زیادہ نہیں لگے لیکن پہاڑیوں میں داخل ہوتے ہی رفتار کم ہوگئی۔ ان چھوٹی پہاڑیوں کے بعد ایک میل تک ریگ زار اور اس کے بعد پھر پہاڑیاں۔ ان پہاڑیوں میں داخل ہونے کے تھوڑی ہی دیر بعد ہم پہاڑیوں کے درمیان اس وسیع و عریض میدان میں پہنچ گئے جہاں جا بجا مشعلیں جل رہی تھیں۔ کئی جگہوں پر چھولداریاں اور چھوٹے خیمے نصب تھے جن کے سامنے پٹرومیکس روشن تھے۔ آس پاس کی پہاڑیوں پر بھی جگہ جگہ مشعلوں کی روشنیاں نظر آرہی تھیں۔

اس میدان میں جگہ جگہ گاڑیاں بھی کھڑی تھیں جن کے قریب چھولداریاں یا خیمے نصب تھے۔ یک اپ والوں نے اپنے لیے ایک ٹھکانا تلاش کرکے یک اپ ٹرک روک لیا اور ہم ان کا شکریہ ادا کرکے وہاں سے رخصت ہوگئے۔

عجیب منظر تھا۔ ہزاروں لوگ جمع تھے۔ ہر طرف مشعلیں جلتی ہوئی نظر آرہی تھیں۔ یہ سب کچھ بہت پُراسرار لگ رہا تھا جیسے ہم کسی اور دنیا میں آگئے ہوں۔

میرے ذہن میں میلے کا تصور کچھ اور تھا۔ جھولے، سرکس، کھیل تماشے مگر یہاں ایسی کوئی چیز دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ یہ پوجا میلہ تھا۔ یہاں ایسی تفریحات کی ضرورت نہیں تھی تاہم رقص و سرود کی محفلیں ہر طرف جمی ہوئی تھیں۔

صبح سویرے پوجا شروع ہونے والی تھی۔ راجستھان کے مختلف شہروں میں کئی مذہبی تہوار اور میلے ہوتے تھے۔ ہم

ڈھول پیٹے جارہے تھے اور کسی طرف سے گھنگروؤں کی جھنکار سنائی دے رہی تھی۔ یہ ہنگامے رات کے پچھلے پہر تک جاری رہے۔ میں کبھی اونگھنے لگتا اور کبھی چونک کر متوحش نظروں سے چاروں طرف دیکھنے لگتا۔ ٹھاکر بھی ایسی ہی صورتِ حال سے دوچار تھا البتہ جانکی ہم دونوں کے درمیان زمین پر پڑی گہری نیند سو رہی تھی۔ میں نے ایک بار پھر آنکھیں بند کرلیں۔

اور پھر شور کی آواز سے میری آنکھ کھل گئی۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ گیا اور متوحش نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ رات کا اندھیرا رخصت ہوچکا تھا اور دن کا اجالا پھیلنا شروع ہوگیا۔ "جے کالی" اور "بجرنگ بلی" کے فلک شگاف نظروں سے فضا گونج رہی تھی۔

جانکی اور ٹھاکر بھی جاگ گئے۔ چند لمحے بعد حواس بحال ہونے لگے اور پھر ہم اٹھ کر مندر والی پہاڑی کی طرف دوڑ پڑے۔ مندر والے غار کے سامنے ہزاروں لوگ جمع تھے۔ کوئی بھجن گا رہا تھا۔ کوئی دونوں ہاتھ ماتھے کے قریب جوڑے آنکھیں بند کیے بے حس و حرکت کھڑا تھا اور کوئی والہانہ انداز میں رقص کررہا تھا۔

ہم لوگوں کو دھکیلتے ہوئے آگے بڑھتے رہے۔ ہم ابھی غار سے دور ہی تھے کہ ڈھول تاشے بجنے لگے۔ لگتا تھا جیسے ڈھول بجانے والوں پر جنون طاری ہوگیا ہو۔ غالباً سیکڑوں ڈھول تھے جو پوری قوت سے پیٹے جارہے تھے۔ اس کے ساتھ ہی جے کالی اور بجرنگ بلی کے فلک شگاف نعرے گونج رہے تھے۔

ہم غار کے سامنے پہنچ گئے مگر اندر جانے کا موقع نہ مل سکا۔ بے پناہ رش تھا۔ ہم تینوں سمٹ کر چٹان کے ساتھ کھڑے ہوگئے۔ لوگ ایک دوسرے کو دھکے دیتے ہوئے اندر جارہے تھے۔ کچھ لوگ باہر آرہے تھے۔ ایک پنڈت لوگوں کو دھکیلتا ہوا باہر نکلا تو اس کے خون آلود ہاتھ دیکھ کر میں اچھل پڑا۔ اس کے ماتھے پر بھی خون سے ٹیکا لگا ہوا تھا۔ مجھے اپنا دل سینے میں ڈوبتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ کسی بے گناہ کو کالی کے چرنوں میں ذبح کیا جاچکا تھا۔

ہم نے اندر داخل ہونے کی کوشش ترک کردی اور وہاں سے کچھ دور پیچھے ہٹ گئے۔ اب غار سے برآمد ہونے والے ہر شخص کے ماتھے پر خون کا سرخ ٹیکا نظر آرہا تھا۔

ہم ایک چٹان کے سائے میں بیٹھ گئے اور لوگوں کو آتے جاتے ہوئے دیکھتے رہے۔ عجیب کیفیت تھی۔ لوگوں پر جنون سا طاری تھا۔ عجیب ظالمانہ رسم تھی۔ ایک انسان کو چند مورتی کے سامنے ذبح کرکے رقص کیا جارہا تھا۔ خوشیاں منائی جارہی تھیں۔ اس سے پہلے میں نے ڈھول پور میں ستی کی رسم دیکھی تھی جب ایک بیوہ ہونے والی حسین لڑکی کو اس کے پتی کی لاش کے ساتھ زندہ جلادیا گیا تھا۔

ان ظالمانہ رسموں پر اگرچہ پابندی لگی ہوئی تھی لیکن چوری چھپے کسی نہ کسی صورت میں یہ رسمیں اب بھی جاری تھیں۔ نہایت کٹر اور انتہا پسند پنڈت سیدھے سادے لوگوں کو بھڑکاتے تھے کہ اگر انہوں نے ان قدیم رسموں کو ترک کردیا تو دیوتا ان پر عذاب نازل کردیں گے اور وہ تباہ ہوجائیں گے۔

انسان چاند پر پہنچ گیا تھا اور مریخ پر کمندیں ڈالنے کی کوشش کی جارہی تھی۔ سائنس اتنی زیادہ ترقی کرچکی تھی کہ ہر چیز کو دیکھ کر حیرت ہوتی تھی لیکن..... مذہب کے حوالے سے لوگوں کے بعض طبقے جنونی کیفیت میں مبتلا ہورہے تھے۔ وہ اپنے مذہب کے خلاف کچھ سننے کو تیار نہیں تھے۔ صرف ہندو ہی نہیں، دوسرے مذاہب سے تعلق رکھنے والے بعض طبقے بھی نہایت انتہا پسند واقع ہوئے تھے۔ وہ لکیر کے فقیر ہوئے تھے۔ صدیوں پرانی ڈگر سے ایک انچ اِدھر اُدھر ہونے کو تیار نہیں تھے۔ سائنسی ترقی کو وہ خرافات سمجھتے تھے۔ انہیں دیکھ کر لگتا تھا جیسے وہ دنیا کو ایک بار پھر پتھر کے زمانے کی طرف لے جانے کی کوشش کررہے ہوں۔

دھوپ تیز ہورہی تھی لیکن غار کے سامنے لوگوں کے جوش و خروش میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ میدان میں بھی ہر طرف لوگ ٹولیوں کی صورت میں جمع تھے۔ ڈھول بج رہے تھے۔ رقص ہورہا تھا۔ "جے کالی" کے نعرے لگ رہے تھے۔

ہم اِدھر اُدھر گھومتے رہے۔ جہاں بھی ہمیں پیلے کپڑوں والا کوئی سادھو نظر آتا، ہم اس طرف چل پڑتے لیکن ہر مرتبہ مایوسی کا سامنا کرنا پڑتا۔

دوپہر کے بعد تین بجے کے قریب ہمیں غار کے اندر داخل ہونے کا موقع مل گیا۔ باہر شدید گرمی تھی لیکن غار کے اندر ٹھنڈک کا احساس تھا۔

غار بہت بڑا تھا۔ اس میں بیک وقت کم از کم دو ہزار افراد سما سکتے تھے اور اس وقت بھی بڑی تعداد میں لوگ موجود تھے۔

ہم لوگوں کو دھکیلتے ہوئے آگے بڑھتے رہے۔ غار کی دیواریں ناہموار تھیں۔ کہیں پتھر باہر کو ابھرے ہوئے تھے اور کہیں اندر کی طرف کوئی گپھا سا بنا ہوا تھا۔ چھت اور

دیواریں مشعلوں کے دھوئیں سے سیاہ ہورہی تھیں۔

غار کے آخر میں ایک بہت بڑے چبوترے پر کالی کا بہت بڑا مجسمہ نصب تھا۔ اس کے سامنے چبوترے پر ناریل، مٹھائی، پھول اور ایسی بہت سی چیزوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ اس ڈھیر میں سونے کے لاتعداد زیورات بھی نظر آرہے تھے۔ عورتیں اپنے زیورات اتار اتار کر بھینٹ چڑھا رہی تھیں اور تین چار پنڈت بار بار ان چیزوں کو سمیٹ کر چبوترے کے پیچھے کسی جگہ لے جارہے تھے۔ لوگ مورتی کے سامنے چبوترے پر ہاتھ پھیر پھیر کر اپنے چہروں پر مل رہے تھے۔ اس جگہ کالی کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے ایک انسان کو ذبح کیا گیا تھا۔ لاش وہاں سے ہٹادی گئی تھی۔ چبوترے پر کہیں کہیں خون کا کوئی دھبا لگا ہوا تھا۔ صبح سے آنے جانے والے لوگوں نے اپنے ہاتھوں پر ٹیکے لگانے کے لیے ہاتھ رگڑ رگڑ کر سارا خون صاف کردیا تھا۔

میں نے کالی کی مورتیاں پہلے بھی دیکھی تھیں لیکن اس مورتی کو دیکھ کر دل پر عجیب سی ہیبت طاری ہورہی تھی۔ یہ مورتی تقریباً چار فٹ اونچی تھی۔ یہ مورتی تیار کرنے والے نے واقعی بڑی مہارت کا ثبوت دیا تھا۔

کالی کی آنکھیں دہشت زدہ انداز میں حلقوں سے ابلی پڑ رہی تھیں۔ اس کی سرخ زبان باہر کو نکلی ہوئی تھی۔ دونوں ہاتھ کندھوں سے اوپر اٹھے ہوئے تھے۔ ایک ہاتھ میں ڈوری سے منسلک دو تھالیاں لٹکی ہوئی تھیں۔ دوسرے ہاتھ میں تیغہ تھا۔ یہ تیغہ اور کالی کے دونوں ہاتھ خون آلود تھے۔ مورتی کی چھاتیاں برہنہ تھیں اور گلے میں سونے اور موتیوں کی مالائیں تھیں۔ ایک مالا سب سے مختلف تھی اور یہ مالا انسانی کھوپڑیوں سے تیار کی گئی تھی۔ دو کھوپڑیاں ایک طرف، دوسری طرف اور ایک درمیان میں تھی جو سینے سے نیچے پیٹ پر ٹکی ہوئی تھی۔ اس مالا میں کھوپڑیوں کے ساتھ پیپل کے سوکھے ہوئے پتے بھی تھے۔ مورتی کے بدن کا زیریں حصہ بھی برہنہ تھا۔

لوگ مورتی کے سامنے ہاتھ جوڑ کر پرنام کرتے، کوئی نہ کوئی چیز اس کے قدموں میں ڈالتے، چبوترے کو چھو کر انگوٹھے سے پیشانی پر ٹیکا لگاتے اور آگے بڑھ جاتے۔

اس صورتِ حال سے میں اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ کالی پنڈت اور پجاری یقیناً بہت خوشحال تھے۔ کالی صرف انہی پر مہربان تھی۔ وہ دونوں ہاتھوں سے دولت سمیٹ رہے تھے۔

ہمیں یہاں بھی مایوسی ہوئی۔ سادھو، پنڈت اور پجاری تو بہت نظر آئے تھے مگر دارا یا بلونت سنگھ سے ملتا جلتا کوئی چہرہ دکھائی نہیں دیا تھا۔

ہم غار سے باہر آگئے۔ دو دن پہلے بارش ہوئی تھی اور اب پھر مغرب کی طرف سے بادل اٹھتے ہوئے نظر آرہے تھے۔ ہم اپنے شکار کی تلاش میں اِدھر اُدھر گھومتے رہے اور بالآخر ایک چٹان کے سائے میں بیٹھ گئے۔

"مجھے پیاس لگ رہی ہے۔ حلق خشک ہورہا ہے۔" جانکی نے کہا۔

میدان میں جگہ جگہ پانی کے ٹینکر بھی کھڑے تھے۔ یاتریوں کی سہولت کے لیے یہ پانی الور سے لایا گیا تھا۔ کوئی ٹینکر خالی ہوتا تو اس کی جگہ دوسرا آجاتا۔

"وہ اس طرف ایک ٹینکر کھڑا ہے۔ میں پانی لے کر آتا ہوں۔" میں نے کندھے پر لٹکا ہوا تھیلا اتار کر زمین پر رکھ دیا اور ڈول اٹھا کر تقریباً سو گز دور ٹینکر کی طرف چل پڑا۔

وہاں آٹھ دس افراد کھڑے تھے۔ اپنی باری آنے پر میں ٹینکر کے پائپ سے ڈول بھرنے لگا تو ایک اور سادھو بھی اپنا ڈول لے کر آگے جھک گیا۔ وہ میرے بالکل ساتھ جڑا ہوا تھا اور چہرہ میرے چہرے کے قریب تھا اور پھر دوسرے ہی لمحے میں ایک سرگوشی سن کر چونک گیا۔

"شام کا اندھیرا پھیلنے کے بعد مندر والی چٹان کی پچھلی طرف مجھ سے ملنا ہت سنگھ۔"

آواز نسوانی تھی۔ میں نے گردن گھما کر اس کی طرف دیکھا۔ جسے میں سادھو سمجھا تھا وہ عورت تھی۔ اس نے لباس سادھوؤں والا ہی پہن رکھا تھا۔ میرے دماغ میں دھماکے سے ہونے لگے تھے۔ اس نے مجھے ہمت سنگھ کے نام سے پکارا تھا جس کا مطلب تھا کہ وہ مجھے جانتی تھی لیکن اس کا چہرہ میرے لیے اجنبی تھا۔

اچانک میرے دماغ میں روشنی کا جھماکا سا ہوا۔ پنڈت سوبھراج نے بتایا تھا کہ دارا اور بلونت سنگھ کے ساتھ سادھو کے بھیس میں ایک خوبصورت لڑکی بھی تھی۔

"مجھے اس طرح گھور کر مت دیکھو۔" اس نے ایک بار پھر سرگوشی کی۔ "پانی بھرو اور یہاں سے چلے جاؤ۔ میرا پیچھا کرنے کی کوشش مت کرنا اور شام کا اندھیرا پھیلنے کے بعد مندر والی چٹان کی پچھلی طرف پہنچ جانا۔"

میں نے اپنا ڈول بھرلیا اور اس کی طرف دیکھے بغیر اپنے راستے پر چل دیا۔ تھوڑی دیر بعد پیچھے مڑ کر دیکھا تو وہ لڑکی وہاں نہیں تھی۔

میرا ذہن بری طرح الجھا ہوا تھا۔ اس لڑکی نے مجھے

ہمت سنگھ کی حیثیت سے پہچان لیا تھا جس کا مطلب تھا کہ میرا میک اپ اتنا اچھا نہیں تھا اور اگر یہ لڑکی دارا اور بلونت سنگھ کی ساتھی تھی تو اس کا مطلب یہ تھا کہ ہم ان کی نظروں میں آچکے تھے اور اب دو ہی باتیں ہوسکتی تھیں۔ یا تو وہ چھپ کر ہم پر حملہ کرتے یا چوری چھپے یہاں سے بھی بھاگ جاتے۔

لیکن اس لڑکی نے مجھے مندر والی چٹان کی پچھلی طرف کیوں بلایا تھا۔ کیا ہمیں دیکھ لینے کے بعد انہوں نے کوئی منصوبہ بنالیا تھا اور اس لڑکی کے ذریعے مجھے چٹان کی پچھلی طرف بلا کر مجھے موت کے گھاٹ اتارنا چاہتے تھے۔

میں نے چلتے چلتے پانی کا ایک گھونٹ بھرا اور ڈول کو جلدی سے پیچھے ہٹادیا۔ وہ ٹینکر دھوپ میں کھڑا تھا اور پانی بھی گرم تھا۔ میں ٹھاکر اور جانکی کے قریب بیٹھ گیا اور ڈول جانکی کی طرف بڑھادیا۔ پانی گرم سہی لیکن بہرحال ہم تینوں کے حلق تر ہوگئے تھے۔

میں نے جانکی اور ٹھاکر کو اس لڑکی کے بارے میں بتایا تو وہ دونوں اچھل پڑے۔

"یہ تو ہمیں معلوم ہے کہ ان دونوں کے ساتھ ایک لڑکی بھی ہے۔" ٹھاکر نے کہا "اور اگر یہ وہی لڑکی ہے تو تمہیں کیسے جانتی ہے۔ وہ کون ہوسکتی ہے؟"

"یہ معلوم کرنے کے لیے شام کا اندھیرا پھیلنے کا انتظار کرنا پڑے گا۔" میں نے جواب دیا۔

"لیکن تم اکیلے نہیں جاؤ گے۔ ہم بھی تمہارے ساتھ ہوں گے۔" ٹھاکر بولا۔

"اندھیرا ہونے دو ٹھاکر پھر دیکھتے ہیں کیا ہوتا ہے۔" میں نے جواب دیا اور اپنے تھیلے میں سے بھنے ہوئے چنے اور گڑ نکال کر کھانے لگا۔

دھوپ میں دن بھر پھرتے رہنے سے ہم تھک گئے تھے۔ گرم ہوا کے تھپیڑے ہمارے چہروں سے ٹکرا رہے تھے۔ جانکی اور ٹھاکر کی آنکھیں سرخ ہورہی تھیں اور ظاہر ہے' میری آنکھوں میں بھی سرخی ضرور ہوگی۔ اس لڑکی سے ملاقات کے بعد کہیں گھومنے پھرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ اب جو کچھ بھی ہونا تھا' شام کا اندھیرا پھیلنے کے بعد ہی ہونا تھا اس لیے دھوپ میں پھرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ ہم نے شام تک وہیں ٹکے رہنے کا فیصلہ کرلیا۔ میدان میں اب بھی ہلا گلا جاری تھا۔ میں زمین پر نیم دراز پڑا اِدھر اُدھر دیکھتا رہا پھر میری آنکھیں بند ہونے لگیں۔

○☆○

گہرے بادلوں نے پورے آسمان کو ڈھک لیا تھا۔ مندر کے اندر کالی کی پوجا ہورہی تھی اور باہر لوگ اپنے ہی جنون میں مبتلا تھے اور میں سوچ رہا تھا کہ اگر بارش شروع ہوگئی تو کیا ہوگا لیکن پھر اس خیال کو ذہن سے نکال دیا۔ ان پہاڑیوں میں لاتعداد چھوٹے بڑے غار تھے جو بارش میں لوگوں کو پناہ دے سکتے تھے۔

شام ہوچکی تھی۔ جگہ جگہ مشعلیں روشن ہورہی تھیں۔ ہم اپنی جگہ سے اٹھ کر مندر والی چٹان کی طرف آگئے۔ ہم نے طے ہوا تھا کہ میں اس لڑکی کی بتائی ہوئی جگہ کی طرف اکیلا جاؤں گا۔ جانکی اور ٹھاکر الگ الگ کچھ فاصلے پر میرے پیچھے آئیں گے۔ ٹھاکر نے کسی ہنگامی صورت حال سے نمٹنے کا بندوبست پہلے ہی کررکھا تھا۔ ان دونوں کے پاس پستول موجود تھے جو انہوں نے اپنے اپنے لباس میں چھپا رکھے تھے اور میرے پاس خنجر تھا جو میں نے پنڈلی پر باندھ رکھا تھا۔

چٹان کی پچھلی طرف پہنچنے سے پہلے ہی ہم الگ الگ ہوگئے۔ میں پے تلے قدم اٹھاتا ہوا آگے بڑھتا رہا۔ اس طرف اندھیرا تھا۔ اس چٹان کی پچھلی طرف تقریباً سو گز کے فاصلے پر ایک اور پہاڑی تھی۔ اس طرح یہ ایک درّہ سا بن گیا تھا لیکن اس طرف ان چٹانوں میں کوئی غار وغیرہ نہیں تھا اس لیے اس طرف یاتریوں کی آبادی نہیں تھی۔ زیادہ تر لوگوں نے مندر والی چٹان کے سامنے کے رخ پر ڈیرے جمارکھے تھے۔ اس درّے کے آخر میں ایک جگہ دو تین مشعلیں جلتی ہوئی نظر آرہی تھیں۔

میں اندھیرے میں سنبھل کر چلتا رہا اور پھر اچانک رک گیا۔ وہ ہلکی سی سرگوشی دائیں طرف سے ابھری تھی۔ میں نے محتاط انداز میں اِدھر اُدھر دیکھا۔ پنڈلی کے فیتے سے خنجر نکال کر ہاتھ میں لے لیا اور آواز کی طرف بڑھنے لگا۔

"اس طرف ہمت سنگھ۔ میں یہاں ہوں۔" وہ سرگوشی ایک بار پھر سنائی دی۔ یہ اسی لڑکی کی آواز تھی۔

میں اس طرف مڑ گیا۔ ایک انسانی ہیولا چٹان کے ساتھ لگا کھڑا تھا۔ میں جیسے ہی آگے بڑھا' اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور مجھے کھینچتے ہوئے ایک کھوہ میں داخل ہوگئی۔ یہ دراصل ایک کشادہ دراڑ تھی جو پانچ چھ فٹ آگے جاکر بائیں طرف مڑ گئی تھی۔ وہ لڑکی میرا ہاتھ کھینچتے ہوئے وہیں بیٹھ گئی۔

آگے راستہ بند تھا اور یہ جگہ میرے لیے چوہے دان بن گئی تھی۔ اگر باہر سے دو آدمی بھی آجاتے تو میں آسانی سے مارا جاسکتا تھا۔ نیچے بیٹھتے ہوئے اس لڑکی کا ہاتھ میرے سے ٹکرا گیا۔ اس نے ٹٹول کر خنجر کو دیکھا پھر سرگوشی میں بولی۔

"اس خنجر کو میان میں رکھ دو۔ یہاں تمہیں کوئی خطرہ نہیں ہے۔"

"تم کون ہو اور مجھے یہاں کیوں بلایا ہے؟" میں نے بھی سرگوشی میں کہا "اگر میرے ساتھ دھوکا ہوا تو اس خنجر سے تمہارا گلا کاٹ دوں گا۔"

"کوئی دھوکا نہیں ہوگا۔ مجھ پر وشواس (یقین) کرو۔" اس نے جواب دیا "میں تمہاری ہمدرد ہوں۔ میرا نام امبر ہے اور میں تمہاری مدد کرنا چاہتی ہوں۔"

"کیا تم ان دونوں کے ساتھ ہو؟" میں نے نام لیے بغیر پوچھا۔

"ہاں۔" وہ میرا مطلب سمجھ گئی۔ "وہ دونوں مجھے بلیک میل کررہے ہیں اور دھمکیاں دے کر مجھے اپنے ساتھ رکھا ہوا ہے۔ وہ لوگ یہاں بھی ایک خاص مقصد کے تحت آئے ہیں۔"

"کیا انہیں معلوم ہے کہ میں یہاں ہوں؟" میں نے پوچھا۔ اس سے یہ دریافت کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی کہ اسے کس سلسلے میں بلیک میل کیا جارہا تھا۔

"نہیں۔" اس نے جواب دیا "یہ اتفاق ہے کہ آج دن میں' میں نے تم لوگوں کو مندر میں دیکھ لیا تھا۔ میں نے تمہیں پہچان لیا۔ دوسرے کون ہیں' یہ میں نہیں جانتی۔"

"مجھے کیسے پہچانا؟" میں نے پوچھا۔

"تمہارے دائیں کان کی لو کے پیچھے سیاہ تل ہے۔ مسور کے برابر۔" امبر نے جواب دیا "جب تم تینوں مندر کے اندر گھوم رہے تھے تو ہم تینوں بھی تم لوگوں کے پیچھے ہی تھے۔ ہمارے اور تمہارے درمیان تین چار گز کا فاصلہ تھا اور بیچ میں بہت سے لوگ تھے۔ اتفاق سے میری نظر تمہارے کان پر پڑ گئی۔ ان دونوں میں سے کسی نے تمہیں نہیں دیکھا تھا۔ اگر دیکھ لیتے تو شاید اب تک تمہارا قصہ پاک ہوچکا ہوتا۔ بہرحال۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگی "وہ اپنے دھیان میں تھے۔ ان کے سازشی ذہن کوئی اور ہی منصوبہ بنا رہے تھے۔ میں ان سے الگ ہوکر تم لوگوں کے پیچھے لگ گئی اور بالآخر جب تم ٹینکر سے پانی لینے آئے تو میں بھی تمہارے قریب پہنچ گئی۔"

"مندر سے نکلنے کے بعد تو ہم دیر تک اِدھر اُدھر گھومتے رہے تھے۔" میں نے کہا۔

"میں تم لوگوں کے پیچھے تھی۔" اس نے جواب دیا "تم تینوں چٹان کے سائے میں بیٹھے تھے تو میں اس وقت بھی تم سے رابطہ کرسکتی تھی لیکن مجھے شبہ تھا کہ میری نگرانی نہ ہورہی ہو۔"

"وہ تمہارے آس پاس نہیں تھے تو نگرانی کرنے والا کون ہوتا؟" میں نے پوچھا۔

"وہ یہاں اکیلے نہیں ہیں۔" امبر نے جواب دیا "یہاں آنے کے بعد انہوں نے کم سے کم تین آدمیوں کو اپنے ساتھ ملالیا ہے۔ ہوسکتا ہے' ان میں سے کوئی میری نگرانی بھی کررہا ہو۔ بلونت سنگھ کو مجھ پر پوری طرح اعتماد نہیں ہے لیکن مجھے انہوں نے اپنے منصوبے میں شامل رکھا ہے۔ بڑی گھناؤنی سازش کررہے ہیں وہ لوگ۔"

"سازش کے بارے میں بعد میں پوچھوں گا لیکن پہلے اپنے بارے میں بتاؤ۔ تم کون ہو اور مجھے کیسے جانتی ہو۔ میرا نام کیسے جانتی ہو لیکن ایک منٹ!" میں نے یہ کہتے ہوئے اس کا ہاتھ پکڑ لیا "اس دراڑ میں بیٹھے رہنا مناسب نہیں ہے۔ میری دوست اور ٹھاکر باہر کہیں کھڑے پریشان ہورہے ہوں گے۔ ہم یہاں سے نکل کر کسی اور جگہ پر بیٹھ کر بات کریں گے۔"

"اگر ان میں سے کسی نے دیکھ لیا تو تمہارے ساتھ مجھے بھی ختم کردیں گے۔" امبر نے جواب دیا۔

"ہم روشنی کی طرف نہیں جائیں گے۔" میں نے کہا "ان چٹانوں میں تو دن کے وقت بھی کسی کو تلاش نہیں کیا جاسکتا' رات کے اندھیرے میں کون دیکھ سکے گا۔ آؤ میرے ساتھ آؤ۔"

میں اسے بازو سے پکڑ کر باہر کی طرف چلنے لگا۔ ہم اندر داخل ہوئے تھے تو آگے پیچھے تھے اور اب ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ امبر میرے ساتھ جڑی ہوئی تھی۔ اس کے گداز بدن کے لمس نے ایک لمحے کو میرے اوپر سنسنی سی طاری کردی لیکن میں نے فوراً ہی اپنے آپ پر قابو پالیا اور اسے ساتھ لیتا ہوا اس کھوہ سے باہر آگیا۔

اس وقت ہوا میں کسی قدر خنکی تھی۔ میں گہرے گہرے سانس لیتے ہوئے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ درّے کے دائیں طرف جہاں مشعلیں جل رہی تھیں وہاں کچھ لوگوں کے سائے حرکت کرتے ہوئے نظر آرہے تھے۔ بائیں طرف ایک پتھر لڑھکنے کی آواز سن کر میں نے اس طرف دیکھا۔ میرا خیال تھا' اس پتھر کو جان بوجھ کر ٹھوکر ماری گئی تھی۔ میں نے ہونٹ سکیڑ کر ہولے سے سیٹی بجائی۔ چند سیکنڈ بعد ہی دو ہیولے ایک بڑے پتھر کی آڑ سے نکل کر ہماری طرف آنے لگے۔

وہ جانکی اور ٹھاکر تھے۔

"ہمیں کسی محفوظ جگہ کی ضرورت ہے ٹھاکر! جہاں ہم بیٹھ کر اطمینان سے باتیں کرسکیں۔" میں نے سرگوشی میں کہا۔

"کسی جگہ کی تلاش کی ضرورت نہیں۔ میرے ساتھ چلو۔" امبر نے دوبارہ کہا۔

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا لیکن ظاہر ہے میں اندھیرے میں اس کے چہرے کے تاثرات کو نہیں دیکھ سکتا تھا۔

"میرے ساتھ آؤ۔" امبر نے کہا "میں نے مشکل وقت کے لیے ایک پناہ گاہ تلاش کر رکھی ہے۔ ہم وہیں چلتے ہیں۔"

ہم اس کے ساتھ چلتے ہوئے ایک اور تنگ سے درے میں سے ہوتے ہوئے دوسری پہاڑی کی پچھلی طرف آگئے۔ اس پہاڑی میں بھی کئی چھوٹے چھوٹے غار تھے اور کسی کسی غار میں مشعل یا پیٹرومیکس کی روشنی بھی دکھائی دے رہی تھی۔ ہمارے تھیلوں میں اگرچہ ٹارچیں موجود تھیں مگر ہم نے ٹارچ روشن کرنے کے بجائے اندھیرے ہی میں رہنا مناسب سمجھا تھا۔ ہم امبر کے پیچھے پیچھے ایک تنگ سے راستے پر، پہاڑی کے اوپر چڑھتے رہے۔ تقریباً پچاس فٹ اوپر جاکر وہ پگڈنڈی ایک بہت بڑے چٹانی پتھر کے پیچھے مڑ گئی تھی۔ یہاں پہنچ کر ٹھاکر نے تھیلے میں سے ٹارچ نکال کر روشن کرلی۔ امبر نے اس کے ہاتھ سے ٹارچ لے لی اور آگے چلتے ہوئے ہمیں راستہ دکھاتی رہی۔

بیس فٹ مزید اوپر جاکر ہم ایک غار میں داخل ہوگئے۔ امبر نے ٹارچ کی روشنی میں غار کے دہانے کے قریب ہی اندر کی طرف ایک پتھر پر رکھی ہوئی ماچس اٹھالی۔ ٹارچ ٹھاکر کے حوالے کردی اور دیا سلائی جلا کر دیوار میں لگی ہوئی ایک مشعل روشن کردی۔

غار صاف ستھرا تھا مگر زیادہ بڑا نہیں تھا۔ پانچ چھ افراد آسانی سے اس میں رہ سکتے تھے اور غالباً پہلے بھی کچھ لوگ یہاں رہتے رہے تھے۔

روشنی ہونے کے بعد میں نے پہلی مرتبہ غور سے امبر کی طرف دیکھا۔ اس کی عمر پچیس چھبیس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ لانبا قد، چھریرا بدن، موٹی موٹی سیاہ آنکھیں، چہرے کے نقوش بڑے نظر فریب تھے۔ اس نے پیلے رنگ کی ساڑی پہن رکھی تھی لیکن بلاؤز اس قدر مختصر تھا کہ نظریں اس کی طرف اٹھتے ہوئے شرماتی تھیں۔

اور جانکی تو اسے دیکھتے ہی اچھل پڑی تھی۔ وہ اس طرح امبر کو دیکھ رہی تھی جیسے اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آرہا ہو لیکن امبر کی نظروں میں کوئی حیرت نہیں تھی۔

وہ روپ متی کی دوست ڈاکٹر رادھا کی بھانجی تھی۔ ہوسکتا ہے میں نے بھی اسے کبھی دیکھا ہو لیکن مجھے اس کا چہرہ یاد نہیں تھا البتہ امبر نے مجھے یاد رکھا تھا اور میرے کان کی لو کے پیچھے تل سے اس نے مجھے پہچان لیا تھا۔

"ہاں۔ اب بتاؤ کیا قصہ ہے۔ وہ لوگ ہمارے خلاف کون سی نئی سازش تیار کررہے ہیں؟" میں نے سوالیہ نگاہوں سے امبر کی طرف دیکھا۔ اس وقت ہم سب غار کے فرش پر بیٹھ چکے تھے۔ یہ غار واقعی ہر لحاظ سے محفوظ تھا۔ سامنے چٹانی پتھر ہونے کی وجہ سے اسے نیچے سے نہیں دیکھا جاسکتا تھا۔

"وہ سازش تم لوگوں کے خلاف نہیں ہے۔" امبر نے جواب دیا "انہیں یہ تو معلوم ہے کہ تم لوگ سارسکا میں موجود ہو۔ جب گنگولی چوہدری تمہاری ایک ساتھی کو اٹھا کر لے گیا تھا اور بعد میں تم بھی جنگل میں گھس گئے تھے تو وہ دونوں بہت خوش ہوئے تھے کہ بھیڑیوں کے بھٹ میں گھس کر تمہارا زندہ واپس آنا ممکن نہیں تھا لیکن جب تم بہلا کوے کر واپس آگئے تو انہیں بڑی مایوسی ہوئی تھی۔ تم لوگ جس ہٹ میں ٹھہرے ہوئے تھے اس پر حملہ کرنا بہت آسان تھا۔ وہ اس موقع سے فائدہ اٹھانے کی کوشش بھی کرسکتے تھے لیکن وہ اپنے آپ کو تم لوگوں کے سامنے ایکسپوز نہیں کرنا چاہتے تھے کیونکہ وہ ایک اور سازش تیار کررہے تھے۔"

"ہم اسی سازش کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"یہ جو کالی کے مندر پر میلہ لگا ہوا ہے نا یہاں ہفتہ بھر ہزاروں لوگوں کی آمد و رفت جاری رہتی ہے۔ تم نے میدان میں لاتعداد چم چماتی گاڑیاں دیکھ کر اندازہ لگالیا ہوگا کہ یہاں کیسے کیسے دھن وان (دولت مند) لوگ آتے ہیں۔ یہ لوگ نقدی کے علاوہ بہت قیمتی چیزیں کالی کے چرنوں میں بھینٹ کرتے ہیں۔ ہیرے جواہرات، خالص سونے کے زیورات، سونے کی مورتیاں اور بہت کچھ۔ اس ایک ہفتے کے دوران میں یہاں لاکھوں روپے نقد اور کروڑوں روپے کے تحائف جمع ہوجاتے ہیں۔ ان کا منصوبہ یہ ہے کہ کل رات وہ سب کچھ اڑا کر یہاں سے رفوچکر ہوجائیں۔ ان کے ساتھ سارسکا شہر کا غنڈا ریو دھن بھی شامل ہے۔ دو اور آدمیوں کا اس نے بندوبست کیا ہے۔"

"اوہ!" میرے اور ٹھاکر کے منہ سے بیک وقت نکلا "پنڈت سوبھراج کا اس میں کیا کردار ہے؟" میں نے پوچھا۔

قریب پہنچ چکی تھی اور پھر کچھ ہی دیر بعد میں نے جانکی کو اس آدمی کے ساتھ چھولداریوں اور گاڑیوں کی دوسری طرف پہاڑی کے دامن کی طرف جاتے ہوئے دیکھا۔

میں بڑی تیزی سے گاڑیوں کی آڑ لیتا ہوا اسٹیشن ویگن کے قریب پہنچ گیا اور اگلے پہیے کا والو دبا کر اس میں تنکا پھنسا دیا۔ ہلکی سی آواز کے ساتھ ٹائر کی ہوا خارج ہونے لگی۔ میں اس طرف کے پچھلے پہیے کے قریب چلا گیا اور اس ٹائر کے والو میں بھی تنکا پھنسا دیا۔

میں اسٹیشن ویگن کے چاروں پہیوں کی ہوا نکالنا چاہتا تھا مگر دوسری طرف کچھ فاصلے پر لوگ موجود تھے اس لیے باقی دو پہیوں کا خیال ذہن سے نکال کر وہاں سے کچھ فاصلے پر کھڑا ہوگیا۔

تقریباً دس منٹ بعد جانکی واپس آگئی۔ وہ آدمی اس کے ساتھ نہیں تھا۔

"کیا ہوا۔ اسے مار تو نہیں دیا؟" میں نے جانکی کے قریب آنے پر سرگوشی میں پوچھا۔

"ٹیٹوا دبا دیا ہے حرامی کا۔ آدھے گھنٹے تک ہوش میں آجائے گا۔" جانکی نے جواب دیا "بڑا حرامی ہے۔ ایک دم پھنسنے لگا تھا۔"

ہم اپنے ٹھکانے پر واپس آگئے۔ انسپکٹر پانڈے ہمیں اس جگہ نظر نہیں آیا تھا جہاں جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ میں نے ٹھاکر کو اس کے بارے میں بتایا تو وہ بھی چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔

ہم وہاں سے اٹھ کر مندر والے غار کے قریب آکر بیٹھ گئے۔ ہماری نظریں مندر میں آنے جانے والے لوگوں پر لگی ہوئی تھیں۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد میں نے انسپکٹر پانڈے کو دو آدمیوں کے ساتھ مندر میں جاتے دیکھا۔ اس کے تقریباً آدھے گھنٹے بعد انسپکٹر پانڈے ایک آدمی کے ساتھ واپس آگیا۔ ان کا تیسرا ساتھی مندر کے اندر ہی رہ گیا تھا۔

مندر میں لوگوں کی آمد و رفت بدستور جاری تھی۔ رات ایک بجے کے قریب دو اور آدمی مندر میں داخل ہوئے۔ وہ دونوں صورتوں ہی سے چھٹے ہوئے بدمعاش لگتے تھے۔ اس آئے اور ان تین سادھوؤں کے اندر داخل ہوتے ہوئے نظر میں ایک امبر تھی۔

ہم نے صرف دو تین منٹ انتظار کیا اور پھر ٹھاکر مجھے اشارہ کرتا ہوا اٹھ کر مندر میں چلا گیا۔ اس کے ایک منٹ بعد جانکی اور مزید ایک منٹ بعد میں بھی مندر میں پہنچ گیا۔

مشعلوں کی کپکپاتی ہوئی روشنی میں کالی کی مورتی بہت ہی ہیبت ناک منظر پیش کررہی تھی۔ میں ایک جگہ رک کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ مندر میں کئی لوگ موجود تھے۔ کوئی دونوں ہاتھ جوڑے آنکھیں بند کیے کھڑا تھا۔ کوئی آلتی پالتی مارے بیٹھا ہوا تھا اور کوئی یوگا کے اسٹائلس میں بیٹھا پوجا کررہا تھا۔ میں جس آدمی کے قریب رکا تھا وہ ایک ٹانگ پر کھڑا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور دونوں ہاتھ چہرے کے سامنے جڑے ہوئے تھے۔

میں متجسس نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا لیکن امبر یا اس کے ساتھیوں میں سے کوئی نظر نہیں آیا۔ ٹھاکر کالی کی مورتی والے چبوترے کے قریب کھڑا تھا اور جانکی اس سے چند قدم کے فاصلے پر تھی۔ مورتی کے قریب اس وقت کوئی پنڈت یا پجاری نہیں تھا البتہ پوجا کرنے والے چند لوگ کھڑے تھے۔

ٹھاکر نے اشارہ کیا تو میں فرش پر بیٹھے ہوئے لوگوں میں راستہ بناتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ ٹھاکر اور جانکی مورتی والے چبوترے کے پیچھے جاچکے تھے۔ میں نے تلے قدم اٹھاتا ہوا چبوترے کے قریب پہنچ گیا۔ وہاں جو بھی تھا، اپنے دھیان میں مگن تھا۔ میں نے محتاط نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھا اور چبوترے کے پیچھے رینگ گیا۔

چبوترے کی پچھلی طرف چٹان میں ایک تنگ سی دراڑ تھی۔ دو آدمی آسانی سے اس میں داخل ہوسکتے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی جانکی اور ٹھاکر اس دراڑ میں داخل ہوگئے۔ میں بھی اندر گھس گیا۔

تقریباً دس قدم آگے جاکر دراڑ دائیں طرف مڑ گئی تھی اور اس طرف ذرا سی روشنی نظر آرہی تھی۔ جانکی کے پیچھے میں جیسے ہی اس طرف مڑا، ٹھک کر رک گیا۔ تین چار قدم آگے ایک پجاری فرش پر پڑا ہوا تھا اور ٹھاکر اس پر جھکا ہوا تھا۔ میں جانکی کو ایک طرف ہٹا کر آگے بڑھ گیا۔ پجاری کا ایک ہاتھ ٹھاکر کے ہاتھ میں تھا۔ وہ اس کی نبض دیکھ رہا تھا۔ میں نے پجاری کے سینے پر ہاتھ رکھ دیا پھر اس کی گردن پر ایک مخصوص نس کو ٹٹول کر دیکھا اور مجھے فوراً ہی اندازہ ہوگیا کہ اس کے جسم اور روح کا ناتا ٹوٹ چکا تھا۔ میں نے ٹھاکر کی طرف دیکھا۔ اس نے بھی نفی میں سر ہلاتے ہوئے پجاری کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

مجھے صورتِ حال کا اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی۔ دارا اور اس کے ساتھی اس غار میں پہنچ چکے تھے۔ ان دراڑوں سے آگے غالباً کوئی ایسی جگہ تھی جہاں مندر کے پروہتوں نے خزانہ جمع کر رکھا تھا اور دارا وغیرہ اس

سلسلے میں غالباً پہلے ہی بہت سی معلومات حاصل کر چکے تھے اس لیے سیدھے اندر تک پہنچ گئے تھے۔

ٹھاکر جب سیدھا ہوا تو اس کا پستول لباس سے نکل کر اس کے ہاتھ میں منتقل ہو چکا تھا۔ جانکی نے بھی پستول نکال لیا تھا اور میں نے بھی پنڈلی پر بندھا ہوا خنجر نکال کر ہاتھ میں لے لیا۔

چند گز آگے جا کر یہ دراڑ ایک بار پھر بائیں طرف مڑ گئی تھی۔ آگے کشادہ جگہ تھی اور بائیں طرف کی چٹان میں ایک اور راستہ نظر آ رہا تھا جس کی دوسری طرف روشنی جھلک رہی تھی۔

یہ غار قدرتی تھے۔ ان کی بناوٹ میں کہیں بھی انسانی ہاتھوں کا دخل نظر نہیں آ رہا تھا۔ سوائے اس کے کہ وہ ان غاروں سے فائدہ اٹھا رہے تھے۔

اس راستے کی دوسری طرف کچھ آوازیں سن کر ہم محتاط ہو گئے۔ میں نے دیوار کی آڑ سے جھانک کر دیکھا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے سینے میں اپنا سانس رکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔

دوسری طرف ایک کشادہ غار تھا جہاں چار مشعلیں روشن تھیں۔ غار کے عین وسط میں ایک پنڈت کی لاش پڑی تھی۔ اس کے جسم کا بالائی حصہ برہنہ تھا۔ پیٹ کٹا ہوا تھا اور اس کی آنتیں باہر نکلی ہوئی تھیں۔ اس کی شہ رگ بھی کٹی ہوئی تھی۔ اس کے آس پاس خون بکھرا ہوا تھا۔ اسے بڑی بے دردی سے موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ اس سے چند قدم کے فاصلے پر ایک اور پنڈت زمین پر پڑا تھا۔ وہ زندہ تھا اور اس کے ہاتھ پیر بندھے ہوئے تھے۔

غار میں پانچ افراد تھے۔ ایک امبر جو راستے کے قریب ہی قدرے بائیں طرف کھڑی تھی۔ بلونت سنگھ اور دارا۔ ان کے علاوہ دو آدمی اور تھے۔ یہ وہی غنڈے تھے جنہیں میں نے دارا وغیرہ سے پہلے مندر میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا تھا۔ ان دونوں نے ایک بوری کا منہ کھول رکھا تھا اور بلونت سنگھ قریب ہی انبار سے سونے کے زیورات اور سونے کی مورتیاں اٹھا اٹھا کر بوری میں ڈال رہا تھا۔ میرے خیال میں وہ کروڑوں کی دولت تھی۔ ایک طرف کرنسی نوٹوں کا ڈھیر بھی لگا ہوا تھا۔

دارا ان کے قریب کھڑا انہیں دیکھ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں خون آلود خنجر تھا۔ مجھے اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ اس نے موت کو اس نے گھاٹ اتارا تھا۔

میں نے دارا کی طرف دیکھا۔ وہ پہلے سے بہت بدلا ہوا نظر آ رہا تھا۔ وہ باقاعدگی سے سر گنجا کروانے کا عادی تھا لیکن اب اس کے بال کندھوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ بے ترتیب داڑھی اور مونچھیں بھی تھیں۔ اگر مجھے پہلے سے اس کے بارے میں پتا نہ ہوتا تو میں اس جلیے میں اسے نہیں پہچان سکتا تھا۔ وہ پہلے سے کچھ فربہ بھی ہو گیا تھا۔ مجرب چہرہ، سرخ آنکھیں اور سادھوؤں والے لباس میں وہ سادھو ہی لگ رہا تھا۔

میں نے گردن گھما کر ٹھاکر کی طرف دیکھا۔ اس نے اشارہ کیا اور ہم دونوں آگے بڑھ گئے۔

"یہ سب کچھ یہیں چھوڑ دو اور ہاتھ اٹھا کر کھڑے ہو جاؤ۔" ٹھاکر کی کڑکتی ہوئی آواز غار میں گونجی۔

وہ سب اچھل پڑے لیکن ہاتھ کسی نے اوپر نہیں اٹھائے تھے۔

"اوہ۔۔۔ تو تم لوگ بھی ہو۔" دارا ہماری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ وہ آہنی اعصاب کا مالک تھا۔ اس نے اپنے حواس قابو میں رکھے تھے جبکہ بلونت سنگھ وغیرہ کے چہرے دھواں ہو گئے تھے "کوئی بات نہیں۔" دارا نے بات جاری رکھی "یہاں بہت کچھ ہے۔ حصہ بانٹ لیں گے۔ تم لوگوں کے حصے میں اتنی دولت آئے گی کہ نہال ہو جاؤ گے۔"

دارا یہی سمجھا تھا کہ ہم بھی اس دولت کے چکر میں یہاں آئے تھے۔ اس کی باتوں سے یہ بھی اندازہ ہوا تھا کہ وہ ہمیں پہچان نہیں سکا تھا۔

"تمہارا کھیل اب ختم ہو چکا دارا۔" میں نے کہا "نکل کے مندر کا یہ غار اب تمہارا مقبرہ بنے گا۔ بہتر ہے کہ اب تم اپنے آپ کو ہمارے حوالے کر دو۔"

دارا اچھل پڑا۔

"اوہ۔۔۔ تم ہو۔" اس کے منہ سے حیرت زدہ سی آواز نکلی "اپنے بارے میں کیا خیال ہے۔ یہ غار تمہارا مقبرہ بھی بن سکتا ہے۔ ذرا پیچھے مڑ کر دیکھو۔ تمہیں پتا چل جائے گا کہ کہاں پھنس گئے ہو۔"

میں نے تو نہیں البتہ ٹھاکر نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور خنجر کی اس بدحواسی سے دارا نے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ دارا نے اپنا خنجر پوری قوت سے ہماری طرف کھینچ مارا۔ میں خنجر کو جھکیلتا ہوا ایک طرف لے گیا۔ خنجر ہمارے اوپر سے ہوا چٹان سے ٹکرا کر زمین پر گرا۔

ٹھاکر نے فوراً ہی اپنے حواس پر قابو پا لیا تھا۔ اس نے فائر کر دیا۔ گولی کئی گز اوپر دیوار پر لگی۔ وہ دونوں بدحواس اور بلونت سنگھ سب کچھ چھوڑ کر غار کی پچھلی طرف بھاگے۔ ان

"تم اسے جانتے ہو؟" امبر کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

"ہم نے بھی تھوڑا بہت ہوم ورک کیا ہے۔" میں نے کہا۔

"یہاں سے لوٹ مار کرنے کے بعد یہ لوگ دھول پور میں پنڈت سوبھراج کے ہاں پناہ لیں گے۔ چند روز وہاں گزارنے کے بعد کسی اور طرف نکل جائیں گے۔" امبر نے کہا۔

"اب انہیں پنڈت سوبھراج کے ہاں بھی پناہ نہیں ملے گی لیکن بہرحال، یہ اپنے منصوبے پر کب عمل کریں گے؟"

"کل رات۔" امبر نے جواب دیا۔

"کل رات کیوں؟ ابھی تو میلہ ختم ہونے میں کئی روز باقی ہیں۔" میں نے کہا۔

"کل کالی کے چرنوں پر دوسرا بلیدان (قربانی) کیا جائے گا۔" امبر نے جواب دیا "دوسرے بلیدان کے بعد لوگوں کی دلچسپی بتدریج کم ہوتی چلی جاتی ہے۔ دوسری بھینٹ پر سب سے زیادہ چڑھاوے چڑھائے جاتے ہیں اور ان کا منصوبہ ہے کہ کل رات ہلا بول دیا جائے۔ انہوں نے اپنی گاڑی بھی تیار رکھی ہوئی ہے۔"

"اور وہ گاڑی کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ایسے بتانے سے پتا نہیں چلے گا۔ وہاں جا کر دکھائی پڑے گی گاڑی۔" امبر نے جواب دیا "ان کا ایک آدمی گاڑی کے آس پاس موجود رہتا ہے۔"

"اور اب یہ بتاؤ کہ یہ لوگ تمہیں کس سلسلے میں بلیک میل کر رہے ہیں؟" میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

وہ کچھ جھینپ سی جنہیں سی ہو گئی "یہ بتانا ضروری نہیں لیکن معاملہ ایسا ہے کہ اگر پولیس جان لے تو میری باقی زندگی جیل میں گزرے گی۔"

"اب تمہارا کیا پروگرام ہے؟"

"میں واپس جاؤں گی۔" امبر نے جواب دیا "وہ لوگ مجھے تلاش کر رہے ہوں گے۔ اگر انہیں شبہ ہو گیا تو گڑبڑ ہو جائے گی۔"

"انہوں نے کہاں ڈیرا جمار کھا ہے؟" میں نے ایک اور سوال کیا۔

"مندر کے سامنے والی پہاڑی پر، میدان کی دوسری طرف۔" امبر نے جواب دیا "تم لوگ اگر چاہو تو یہاں رہ سکتے ہو۔ یہ جگہ محفوظ ہے۔ اب میں چلتی ہوں۔"

"چلو۔ ہم بھی تھوڑی دور تک تمہارے ساتھ چلتے ہیں۔" میں نے کہا اور ہم بھی اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

مشعل بجھا دی گئی اور ہم تاریخ کی روشنی میں پہاڑی سے نیچے اتر آئے۔ پہاڑی کی دوسری طرف ہم نے اپنی رفتار کم کر لی جبکہ امبر تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے آگے چلتی رہی اور کچھ ہی دیر بعد وہ ہماری نگاہوں سے اوجھل ہو گئی۔

ہم اِدھر اُدھر گھومتے رہے۔ جنگل میں منگل کا سماں تھا۔ ہر طرف رقص و سرور کی محفلیں جمی ہوئی تھیں۔ کئی جگہوں پر نیم برہنہ رقص ہو رہے تھے۔ شراب پانی کی طرح اڑائی جا رہی تھی۔ بعض لوگ شراب کے نشے میں دھت ہو کر آپے سے باہر ہو رہے تھے۔ ابھی تو رات شروع ہوئی تھی۔ میلوں ٹھیلوں میں بے ہودگیاں تو ہوتی ہیں مگر کالی کی پوجا کا یہ میلہ کھلی عیاشی کا اڈا بھی تھا۔ یہاں کوئی روک ٹوک نہیں تھی۔ کسی قسم کا خوف نہیں تھا۔ سب ایک ہی رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔

اور پھر وہی بات ہوئی جس کا اندیشہ تھا۔ اچانک ہی موٹی موٹی بوندیں پڑنے لگی تھیں۔ ہم نے ایک ٹینکر سے پانی کے تینوں ڈول بھر لیے اور غار کی طرف واپس چل پڑے۔ آسمان سے برسنے والی موٹی موٹی بوندیں اب باقاعدہ بارش کی صورت اختیار کرنے لگی تھیں اور جب ہم غار میں داخل ہوئے تو بارش میں اچھی خاصی تیزی آ چکی تھی۔

اگر امبر سے ملاقات نہ ہوتی تو ہم بھی اس وقت تیز بارش میں بھیگ رہے ہوتے لیکن بہرحال، ہم اپنے دشمنوں سے بھی محفوظ تھے اور بارش سے بھی۔

○☆○

میری آنکھ "جے کالی" اور "بجرنگ بلی" کے فلک شگاف نعروں کی آواز سے کھلی تھی۔ اس میدان اور ہمارے درمیان اگرچہ تین سو فٹ اونچی پہاڑی حائل تھی لیکن نعروں کی آوازیں یہاں تک صاف سنائی دے رہی تھیں۔

میرے دل پر ایک دم اداسی چھا گئی تھی۔ میں صبح سویرے بلند ہونے والے ان نعروں کا مطلب سمجھ گیا تھا۔ ایک اور بے گناہ کو پتھر کی مورتی کے سامنے ذبح کر دیا گیا تھا۔

جانکی اور ٹھاکر بھی جاگ گئے تھے۔ ان کے چہروں پر بھی افسردگی کے تاثرات نمایاں تھے۔ ٹھاکر اپنا پانی کا ڈول اٹھا کر غار کے دہانے پر چلا گیا۔ اس نے پہلے کلی کی اور پھر منہ پر پانی کے چھینٹے دینے لگا۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد پتھروں کے لڑھکنے کی آواز سن کر میں چونک گیا اور آڑ سے جھانک کر دیکھا تو امبر اوپر آ رہی تھی۔ جب وہ غار میں داخل ہوئی تو اس کا سانس پھولا ہوا تھا۔

"اس وقت تم نے یہاں آکر غلطی نہیں کی؟" میں نے امبر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "اگر انہیں پتا چل گیا تو۔۔۔؟"

"انہیں پتا نہیں چلے گا۔" امبر نے میری بات کاٹ دی "وہ دونوں مندر میں کھڑے یہ دیکھ رہے ہیں کہ آج کالی کے چرنوں پر دولت کا کتنا بڑا انبار لگتا ہے۔ آج دوسرا بلیدان ہے اور دوسرے بلیدان پر سب سے زیادہ بھینٹ دی جاتی ہے۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بولی "میں اس لیے آئی ہوں کہ تم لوگوں میں سے کسی کو ان کی گاڑی دکھا سکوں۔"

"چلو۔ میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔" میں فوراً ہی تیار ہوگیا۔

امبر کے ساتھ باہر نکل کر میں نے اوپر دیکھا۔ بارش رات ہی کو کسی وقت رک گئی تھی۔ آسمان پر اب بھی بادلوں کے ٹکڑے تیر رہے تھے اور بارش کا کوئی بھروسا نہیں تھا۔

امبر مجھ سے تقریباً بیس گز آگے چل رہی تھی۔ اس کا رخ اس طرف تھا جہاں ایک پہاڑی کے دامن میں لاتعداد گاڑیاں کھڑی تھیں۔ ان گاڑیوں کے آس پاس پھولدار یاں اور جیپیں بھی لگے ہوئے تھے اور ان کی حالت دیکھ کر لگتا تھا جیسے رات کی بارش نے سب کچھ تلپٹ کردیا ہو۔

امبر سرخ رنگ کی ایک اسٹیشن ویگن کے قریب رک گئی۔ فوراً ہی ایک آدمی کسی طرف سے نکل کر اس کے قریب آگیا۔ اس آدمی نے ویگن کا دروازہ کھولا اور وہ دونوں اندر بیٹھ گئے۔ میں ایک گاڑی کی آڑ میں کھڑا اس طرف دیکھتا رہا۔ وہ دونوں کچھ دیر باتیں کرتے رہے اور پھر وہ آدمی امبر کو بانہوں سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچنے لگا۔ امبر نے جھٹکا دے کر اپنا ہاتھ چھڑایا اور دروازہ کھول کر نیچے اتر گئی اور اس کی طرف ہاتھ ہلا کر قہقہہ لگاتی ہوئی ایک طرف چل پڑی۔

میں نے اسٹیشن ویگن دیکھ لی اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا امبر کی طرف چلنے لگا۔ لوگ ہجوم در ہجوم مختلف جگہوں پر کھڑے تھے۔ ڈھول تاشوں کے شور میں کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ میں امبر کے قریب پہنچ کر اس کے ساتھ چلنے لگا۔

"ان کے پروگرام کے بارے میں تم نے نہیں بتایا؟" میں نے اس کے ساتھ چلتے ہوئے پوچھا۔ ہم دونوں سادھو تھے اور کسی کو ہم پر شبہ نہیں ہوسکتا تھا۔

"سورج ڈوبنے کے تھوڑی دیر بعد پانی کے اس نیلے ٹینکر کے قریب ملوں گی۔ ان کا ارادہ رات کے پچھلے پہر کارروائی کرنے کا ہے۔ ان کا جو بھی فائنل پروگرام ہوگا' تمہیں بتادوں گی۔"

"ٹھیک ہے۔ میں تمہیں ٹینکر کے قریب ملوں گا۔" میں نے کہا۔

امبر مندر کی طرف چلی گئی اور میں لوگوں کے ہجوم سے راستہ بناتا ہوا اپنے ٹھکانے کی طرف چل پڑا۔

اور پھر دن کا باقی حصہ ہم نے اسی غار میں آرام کرتے ہوئے گزارا۔

○☆○

سب کچھ طے ہوگیا تھا۔ امبر نے ہمیں بتا دیا تھا کہ لوگ کیا کرنا چاہتے تھے۔ امبر کے علاوہ ان کی تعداد اپنے سردار' بلونت سنگھ' دریودھن اور اس کے دو ساتھیوں کے مطابق ان کے ایک آدمی کو اسٹیشن ویگن کے قریب تھا جبکہ دوسروں کو باقی کارروائی مکمل کرنی تھی۔

آدھی رات کے وقت مندر کے اندر لوگوں کی تعداد ہوتی تھی اور وہ بھی پوجا پاٹھ میں مگن رہتے تھے جبکہ میدان میں جگہ جگہ عیش و نشاط کی محفلیں جمائی جاتی تھیں۔ ڈھول تاشے بجتے تھے جن کے شور میں کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی اور مندر کے اندر کسی قسم کی کارروائی کرنے کے لیے آدھی رات کے بعد کا وقت مناسب تھا۔

اس وقت غالباً رات کے دس بجے تھے۔ ہم اس کے دامن میں بیٹھے ہوئے تھے جہاں دو روز پہلے دوپہر کے وقت آرام کیا تھا۔ میں نے ٹھاکر کو وہیں بیٹھے رہنے کو کہا اور جانکی کو ساتھ لے کر اس طرف چل پڑا جہاں اسٹیشن ویگن اور دوسری گاڑیاں کھڑی تھیں۔

راستے میں ایک جگہ جانکی نے مجھے ہاتھ سے روک لیا اور ایک طرف اشارہ کرنے لگی۔ ہم سے بیس گز کے فاصلے پر رقص کی محفل جمی ہوئی تھی۔ رنگین لباس میں دو لڑکیاں اچھل کود کر اپنے جسموں کی نمائش کررہی تھیں۔ شراب لنڈھائی جارہی تھی اور لوگ لڑکیوں پر نوٹ نچھاور کررہے تھے اور عین سامنے اسٹیج کے پانڈے کھڑا تھا۔ وہ سادہ لباس میں تھا۔ وہ بھی کالی کے پجاریوں میں سے تھا اور ظاہر ہے وہ بھی پوجا کے لیے آیا تھا۔ میں نے اس کے سامنے جانا مناسب نہیں سمجھا۔ جانکی کے ساتھ ایک طرف ہٹتا چلا گیا۔

اسٹیشن ویگن کا دروازہ پوری طرح کھلا ہوا تھا۔ بلونت کا آدمی سیٹ پر نیم دراز بیڑی کے کش لگا رہا تھا۔ جانکی کو چھوڑ کر ایک طرف ہٹتا چلا گیا اور ایک گاڑی میں رک کر اس طرف دیکھنے لگا۔ جانکی اسٹیشن ویگن

نگرانی شروع کردی تھی اور جب تم لوگوں نے پنڈت سوبھراج کو میرے حوالے کیا تو اس نے بتایا کہ تم لوگوں کو تین سادھوؤں کی تلاش ہے۔ اس دوران میں ٹھاکر اور اس کی دوست کو حادثہ پیش آگیا اور پھر چند روز بعد میرے ایک آدمی نے اطلاع دی کہ تم سادھوؤں کے لباس اور ایسی چیزیں خریدتے پھر رہے ہو جو صرف پنڈتوں اور سادھوؤں ہی کے کام آسکتی ہیں۔ مجھے شبہ ہوا اور میں نے اپنا ایک آدمی تم لوگوں کے پیچھے بھی لگا دیا جس نے رپورٹ دی کہ تم لوگ بھی اس طرف آچکے ہو۔

"میں اپنے آدمیوں کو لے کر کل یہاں پہنچ گیا تھا اور اتفاق سے کل ہی میں نے تم لوگوں کو دیکھ لیا تھا مگر جان بوجھ کر قریب نہیں آیا۔ وریودھن اور اس کے ساتھیوں کی موجودگی سے میں سمجھ گیا تھا کہ وہ کیا واردات کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے ان پنڈت جی کو اعتماد میں لے کر اپنے خدشے کا اظہار کیا اور مندر کو اندر سے بھی دیکھ لیا۔ پچھلے غار کے اندر وہ خفیہ راستہ بھی میری نظروں میں آگیا۔

"جس وقت وریودھن اور اس کے ساتھی مندر میں داخل ہوئے' میرا ایک آدمی وہاں موجود تھا۔ میں اس وقت یہاں سے.... کچھ دور اپنی گاڑی میں بیٹھا ہوا تھا۔ اسے مجھ تک پہنچنے میں کچھ وقت لگ گیا اور جب میں اپنے آدمیوں کو لے کر یہاں پہنچا تو اندرونی غار میں فائرنگ شروع ہو چکی تھی لیکن جب میں وہاں پہنچا تو وہاں ایک لڑکی اور ایک پنڈت کی لاش اور یہ پنڈت جی بندھے پڑے ملے۔

"میں نے فوراً ہی اپنے کچھ آدمیوں کو باہر پہاڑی کی طرف دوڑا دیا تاکہ وہ اوپر جاکر ان کا راستہ روک سکیں مگر میرے آدمی غلط راستے پر نکل گئے۔ وہ پہاڑی پر اس راستے سے تقریباً سو گز دور نکلے تھے لیکن انہوں نے دو آدمیوں کو ایک طرف دوڑتے ہوئے دیکھ لیا۔ میرے آدمیوں نے پیچھا کیا تو انہوں نے فائرنگ شروع کردی اور اس کے بعد جو کچھ بھی ہوا' تم لوگ دیکھ چکے ہو۔" انسپکٹر پانڈے چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بولا "مجھے نہیں معلوم تم لوگ ان سادھوؤں کا پیچھا کیوں کررہے تھے۔ ان کی ساتھی لڑکی کی لاش غار میں پڑی ہے۔ ایک سادھو کی لاش اس طرف ملی ہے۔ تیسرا سادھو کہاں ہے؟"

"وہ فرار ہوگیا۔" میں جلدی سے بول پڑا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ ٹھاکر دارا کے بارے میں اسے بتادے۔ دارا بہت عرصے بعد میرے ہاتھ لگا تھا اور میں اس سے دستبردار نہیں ہونا چاہتا تھا۔ اس کا اور میرا حساب تو بہت لمبا تھا۔

"آؤ۔ ذرا میرے ساتھ اندر آؤ۔ آپ بھی آیئے جی۔" انسپکٹر پانڈے نے اس پنڈت سے کہا جسے دارا نے باندھ کر ڈالا تھا۔

مندر کے سامنے تو ہجوم لگا ہوا تھا لیکن اندر صرف سادہ لباس پولیس والے تھے۔ تمام لوگوں کو باہر نکال دیا گیا تھا۔ ویران غار میں کالی کی مورتی کچھ اور بھی ہیبت ناک لگ رہی تھی۔

چبوترے کے پیچھے پہنچتے ہی انسپکٹر پانڈے نے ٹارچ روشن کرلی اور جیسے ہی ہم دوسرے غار میں مڑے' دوسرا گیا۔ وہاں اس پجاری کی لاش پڑی ہوئی تھی جسے غار میں داخل ہوتے ہوئے ہم بھی دیکھ چکے تھے۔

"اس پجاری کو یہاں نگرانی کے لیے کھڑا کیا گیا تھا۔ کوئی غیر متعلق آدمی اندر تک نہ جاسکے۔" انسپکٹر پانڈے لاش پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا "وریودھن اور اس کے ساتھیوں نے اندر داخل ہونے کے لیے پہلے اسے گلا گھونٹ کر موت کے گھاٹ اتارا تھا۔"

ہم غار کے اندر آگئے۔

"ان پنڈت جی کے کہنے کے مطابق پنڈت اوم پرکاش نے ان ڈاکوؤں کے خلاف مزاحمت کی کوشش کی تھی۔ ایک سادھو نے بے دردی سے اسے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ ان پنڈت جی نے خاموش رہنے کا وعدہ کیا تو انہیں بھی کرڈال دیا گیا اور سادھو کے لباس میں یہ لڑکی۔"

"یہ اپنے ہی ایک ساتھی کی گولی کا نشانہ بنی تھی۔" میں نے کہا اور قریب کھڑے ہوئے پنڈت جی نے میری تائید میں سرہلا دیا۔

"پنڈت جی تم لوگوں کے بے حد شکر گزار ہیں۔" انسپکٹر پانڈے بولا "تم لوگوں کی مداخلت سے بھینٹ میں ملا ہوا خزانہ لٹنے سے بچ گیا۔"

پنڈت جی نے بھی ہاتھ جوڑ دیے۔

"ایک بات اور انسپکٹر۔" میں نے کہا "تم اس معاملے کی تحقیقات کرنا چاہتے ہو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں لیکن کسی الجھن میں نہیں پھنسنا چاہتے۔"

"کیسی تحقیقات؟" انسپکٹر پانڈے بولا "سرکار کو معلوم ہی نہیں کہ یہاں کوئی میلہ لگا ہے اور کالی کے چرنوں میں انسانوں کی بھینٹ دی جاتی ہے۔ یہاں نہ کوئی میلہ ہے نہ کوئی قتل ہوئے ہیں۔ پولیس اور سرکار اس سلسلے میں بالکل لاعلم ہے۔"

میرے منہ سے بے اختیار گہرا سانس نکل گیا۔ تحقیقات کا مطلب یہ ہوتا کہ کالی کے چرنوں پر دی جانے والی انسانی بھینٹ کو بھی سامنے لایا جاتا۔ اب تک دو انسانوں کی بھینٹ دی جاچکی تھی اور قانون کی نظروں میں یہ بھی قتل تھا۔ یہ بات سامنے آنے سے ہوسکتا تھا کسی قسم کے ہنگامے شروع ہوجاتے اس لیے قانون کا ان واقعات سے لاعلم رہنا ہی بہتر تھا۔

"تو پھر ان لاشوں کا کیا کروگے؟" میں نے پوچھا۔

"میلوں ٹھیلوں میں ایسی باتیں ہوتی رہتی ہیں۔" انسپکٹر پانڈے نے کہا "کوئی بیمار ہوکر مرجاتا ہے۔ کوئی کسی کی دشمنی کا نشانہ بن جاتا ہے۔ لوگ کسی معمولی بات پر آپس میں بھی لڑ پڑتے ہیں جس کا نتیجہ کسی ایک کی موت کی صورت میں نکلتا ہے۔ ادھر ان پہاڑیوں کے پیچھے ایک شمشان گھاٹ بھی ہے۔" اس نے ایک طرف اشارہ کیا "ایسی لاشوں کو اس شمشان گھاٹ میں لے جاکر ان کا کریا کرم کردیا جاتا ہے۔ جن لوگوں کے اپنے بندے یہاں گزر جاتے ہیں وہ لاشوں کو ساتھ نہیں لے جاتے۔ یہیں پر ان کا کریا کرم کردیتے ہیں اور ان کے نام کی پوجا بھی ہوجاتی ہے اور یہ لوگ تو ویسے بھی لاوارث تھے۔ ڈنڈ پاڑی حاصل کرنے کا دعوے دار کوئی نہیں ہے۔"

"لیکن یہ پنڈت؟" میں نے پنڈت کی لاش کی طرف اشارہ کیا۔

"پنڈت جی کے وارث ہم ہیں نا۔ ان کا کریا کرم ہم کریں گے۔" انسپکٹر نے جواب دیا۔

میں سمجھ گیا کہ انسپکٹر پانڈے یہ نہیں چاہتا تھا کہ یہاں جو پانچ چھ قتل ہوئے تھے ان کی ہوا بھی ان پہاڑیوں سے باہر پہنچ سکے اور میں یہ بھی جانتا تھا کہ اس میلے میں شریک کوئی شخص ان پہاڑیوں سے باہر جاکر کسی سے اس واقعے کا ذکر نہیں کرے گا۔

انسپکٹر پانڈے نے اپنے کچھ آدمی اندر بلالیے جو لاشیں اٹھا کر باہر لے گئے۔

"ہاں پنڈت جی۔" انسپکٹر پانڈے اب پنڈت کی طرف متوجہ ہوگیا "آپ کے حساب میں یہ سارا مال کتنے کا ہوگا؟"

"ان لوگوں کے آنے سے پہلے ہم یہی حساب لگا رہے تھے۔" پنڈت نے جواب دیا "شام تک ہم نے جو نقد رقم گنی وہ ساڑھے بارہ لاکھ کے قریب تھی۔ اس کے بعد بھی نقد رقم آئی تھی جو ہم نے گنی نہیں تھی اور یہ زیور اور سونے کی مورتیاں۔ میرا خیال ہے یہ سونا پندرہ کلو سے زیادہ ہوگا۔ مارکیٹ میں جو سونے کا بھاؤ ہے' اس سے اس کی قیمت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔"

"بہت قیمتی خزانہ ہے یہ اور آپ لوگوں نے اس کی حفاظت کا کوئی معقول بندوبست نہیں کیا۔" انسپکٹر نے کہا "اسی لیے ان لوگوں کو اندر آنے کا موقع مل گیا مگر بھگوان کی کرپا (مہربانی) اور کالی ماں کے چمتکار (معجزہ۔ کرشمہ) سے سب کچھ بچ گیا لیکن اب کسی اور کو ایسا موقع نہیں ملنا چاہیے۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بولا "میرے دو آدمی یہاں رہیں گے اس غار کے اندر۔ دو کالی ماں کی مورتی والے چبوترے کے پیچھے اس غار کے داخلی راستے پر اور دو پہاڑی کے اوپر جہاں باہر نکلنے کا راستہ ہے اور باقی چار آدمی مندر کے سامنے رہیں گے۔"

"دھنے باد۔ (شکریہ)" پنڈت نے ہاتھ جوڑ دیے "بڑی کرپا ہے آپ کی مہاراج۔ میں صبح سارے پنڈتوں کو جمع کرکے اس کی سرکشا (دیکھ بھال۔ حفاظت) کا بندوبست کرا دوں گا۔"

"جب تک آپ کا بندوبست نہ ہو یہ سیوک (خدمت گار) یہاں موجود رہیں گے۔" انسپکٹر نے پولیس اہل کاروں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

پنڈت نے ایک بار پھر اس کا شکریہ ادا کیا اور ہم لوگ مندر سے باہر آگئے۔

انسپکٹر پانڈے تو اپنے کام میں مصروف ہوگیا اور ہم اپنے ٹھکانے کی طرف چل پڑے۔

ہمیں اس غار تک پہنچنے میں مزید آدھا گھنٹا لگ گیا۔ غار میں جلنے والی مشعل کی روشنی دور ہی سے نظر آرہی تھی۔ ٹھاکر آگے تھا اور میں چند قدم پیچھے۔ ٹھاکر اوپر پہنچ چکا تھا اور پھر اس کی چیخ سن کر مجھے اپنا دل کنپٹیوں میں دھڑکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔

میں تقریباً دوڑتا ہوا اوپر پہنچ گیا۔ غار کے دہانے کے سامنے پہنچ کر میں اس طرح رک گیا جیسے زمین نے میرے پیر پکڑ لیے ہوں۔

دارا غائب تھا اور جانکی غار کے فرش پر بے حس و حرکت پڑی تھی۔ مشعل کی روشنی میں اس کے سر کے پاس زمین پر خون بھی نظر آرہا تھا۔

مجھے سینے میں اپنا دل ڈوبتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ میں غار کے دہانے پر کھڑا غار کے فرش پر بے حس و حرکت پڑی ہوئی جانکی کو دیکھتا رہ گیا۔

اس صورتِ حال نے مجھے حقیقتاً بدحواس کردیا تھا۔

میں غار کے دہانے پر کھڑا پھٹی پھٹی سی نظروں سے فرش پر پڑی ہوئی بے حس و حرکت جانکی کو دیکھ رہا تھا۔ مشعل کی کپکپاتی زرد روشنی میں یہ منظر بڑا خوفناک تاثر دے رہا تھا۔ قریب کھڑے ہوئے ٹھاکر نے میرے بازو کو چھوا تو میں جیسے ہوش میں آگیا۔ میں نے ٹھاکر کی طرف دیکھا اور دوسرے ہی لمحے چھلانگ لگا کر جانکی کے قریب پہنچ گیا۔

جانکی کے سر کے قریب زمین پر خون کا ایک چھوٹا سا تالاب بن گیا تھا۔ اس کے بال، ایک کان اور گردن بھی خون آلود تھی۔ آنکھیں بند تھیں اور خون زیادہ بہہ جانے کی وجہ سے چہرے پر زردی کھنڈ رہی تھی۔ میں ایک گھٹنا زمین پر ٹکا کر اس کے قریب بیٹھ گیا اور ایک ہاتھ اس کے سینے پر رکھ دیا۔ زیرو بم بتا رہا تھا کہ وہ زندہ تھی۔

"ٹھاکر!" میں یہ کہتے ہوئے ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہوگیا "تم اسے دیکھو، ہوش میں لانے کی کوشش کرو۔ میں اس مردود کو دیکھتا ہوں۔ وہ زیادہ دور نہیں گیا ہوگا۔"

میں نے ایک طرف پڑے ہوئے تھیلے میں سے ٹارچ نکال لی اور غار سے باہر نکل آیا۔ میں ٹارچ کی روشنی میں تقریباً دوڑتے ہوئے اس تنگ سے راستے سے نیچے آگیا جس سے ہم اوپر گئے تھے۔

پہاڑی کے دامن میں پہنچ کر میں رک گیا اور اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے سوچنے لگا کہ ایک لنگڑا آدمی اپنی جان بچانے کے لیے کتنی دور اور کس طرف جاسکتا ہے۔

میدان کی طرف جانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس طرف لوگوں کی اچھل مچی ہوئی تھی۔ اگر وہ لنگڑاتا ہوا اس طرف جاتا تو دوسروں کی نظروں میں آسکتا تھا۔ اس میں شبہ نہیں کہ اسے کسی کی مدد کی ضرورت تھی لیکن زخمی حالت میں مدد کے لیے کسی کے پاس جانے کا مطلب یہ ہوتا کہ وہ خود پھنس جاتا۔ وہ اس طرف نہیں جاسکتا تھا۔ اسے ان پہاڑیوں کے کسی غار ہی میں پناہ مل سکتی تھی۔

میں میدان کی طرف جانے کے بجائے مخالف سمت میں دوڑ پڑا اور ٹارچ کی روشنی میں اِدھر اُدھر دیکھتا رہا۔ دارا اور جانکی کو اس غار میں چھوڑ کر جانے کے بعد ہمیں واپسی میں دو گھنٹے لگے تھے لیکن یہ واقعہ ہمارے جانے کے فوراً ہی بعد پیش نہیں آیا ہوگا۔ جانکی کے سر کے قریب زمین پر جمع خون تازہ تھا۔ اگر اس کے سر پر دو گھنٹے پہلے ضرب لگائی گئی ہوتی تو خون جم چکا ہوتا۔ زیادہ سے زیادہ بیس پچیس منٹ، اور میں اندازہ لگانے کی کوشش کررہا تھا کہ بیس پچیس منٹ میں دارا کتنی دور جاسکتا ہے۔

میں تقریباً آدھے گھنٹے تک آس پاس کی پہاڑیوں پر اسے تلاش کرتا رہا لیکن اس سے کچھ پتا نہیں چلا۔ رات کے اندھیرے میں ان پہاڑیوں میں کسی کو تلاش کرنا آسان نہیں تھا۔ دوسری طرف مجھے جانکی کا بھی خیال تھا۔ میں نے تلاش ترک کرکے اس غار میں واپس آگیا۔

جانکی ہوش میں آچکی تھی اور ٹھاکر نے ایک تھیلے سے کپڑا نکال کر اس کے سر پر پٹی باندھ دی تھی۔ جانکی دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور گہرے گہرے سانس لے رہی تھی۔ آواز سن کر اس نے آنکھیں کھول دیں۔ ٹھاکر بھی سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھنے لگا۔

"رات کے اندھیرے میں ان پہاڑیوں میں اسے تلاش کرنا ممکن نہیں" میں نے ٹھاکر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"لعنت بھیجو اس پر" ٹھاکر بولا "جانکی کے سر پر شدید ہے۔ خون بہنا اگرچہ بند ہوگیا ہے لیکن اسے فوری امداد کی ضرورت ہے۔ میدان میں دو تین جگہوں پر میڈیکل کیمپ بھی ہیں۔ اسے وہاں لے کر چلو۔"

"اپنا سامان سمیٹو اور یہ ٹارچ سنبھالو۔ میں جانکی کو لاتا ہوں" میں نے یہ کہتے ہوئے ٹارچ ٹھاکر کی طرف بڑھادی۔

ٹھاکر تھیلا سمیٹنے لگا۔ میں نے جھک کر جانکی کو اٹھایا۔ اس پر غنودگی سی طاری ہورہی تھی اور اس کا جسم ایک دم ڈھیلا پڑ گیا تھا۔

میں ٹھاکر کے پیچھے ٹارچ کی روشنی میں تنگ سے پتھریلے راستے پر پیر رپٹ جانے سے دو مرتبہ گرتے گرتے بچا۔ ہموار جگہ پر آتے ہی میں نے دوڑنا شروع کردیا۔

میدان میں اب بھی جگہ جگہ مشعلیں روشن تھیں۔ مختلف سمتوں سے موسیقی کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ لوگ بھول گئے تھے کہ چند گھنٹے پہلے یہاں چھ قتل ہوچکے ہیں۔

"تم یہاں رکو۔ میں اس طرف دیکھتا ہوں" ٹھاکر نے مجھے رکنے کا اشارہ کیا۔ "اس طرف میں نے صبح ایک ڈاکٹر دیکھا تھا۔ میں جاکر معلوم کرتا ہوں۔"

"رکنے کی ضرورت نہیں۔ ہم بھی تمہارے ساتھ چلتے ہیں۔ کسی سے معلوم کرلیں گے" میں نے جواب دیا۔ ٹھاکر کے پیچھے پیچھے چلتا رہا۔

بالآخر ہم اس چھولداری کے پاس پہنچ گئے جس کے باہر ایک بانس پر ایک دوسرے کو کراس کرتی ہوئی سرخ اور سفید جھنڈا لگا ہوا تھا۔ چھولداری کافی کشادہ تھی۔ اس میں اسپرنگ والے چار سنگل بیڈ بچھے ہوئے تھے۔ ایک بیڈ پر ایک سادھو قسم کا آدمی کروٹ کے بل لیٹا بیڑی کے کش لگا رہا تھا۔ باقی تین بیڈ خالی تھے۔ چھولداری کے اندر کی طرف تھا۔ باقی تین بیڈ خالی تھے۔ چھولداری کے اندر کی طرف دو آدمی تاش کھیل رہے تھے۔ میز کی دوسری طرف لکڑی کا ایک صندوق رکھا ہوا تھا۔

میں نے جانکی کو ایک بیڈ پر ڈال دیا۔ ان دونوں آدمیوں نے ہماری طرف دیکھا مگر دونوں میں سے کسی نے بھی تاش کے پتے ہاتھ سے نہیں چھوڑے تھے۔ ویسے شکل صورت سے ان دونوں میں سے کوئی بھی ڈاکٹر نہیں لگتا تھا۔

"تم میں ڈاکٹر کون ہے؟" ٹھاکر نے انہیں گھورتے ہوئے کہا۔

"ڈاکٹر تو ادھر مجرا دیکھ رہا ہے۔ ہم تو ٹائم پاس کرنے کے لیے ادھر بیٹھ گئے تھے۔ ویسے چھوکری کو کیا ہوا ہے؟" ان میں سے ایک نے پوچھا۔

"پہاڑی سے گر گئی تھی۔ سر میں چوٹ لگی ہے" ٹھاکر نے جواب دیا۔

"دری ہم کو چریا بناتا ہے" دوسرا آدمی بولا "ایسا کیوں نہیں بولتا کہ چھوکری کو پٹا کرلے گیا تھا اور۔۔۔"

اس کا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی ٹھاکر کا زوردار گھونسا اس کے جبڑے پر لگا اور وہ چیختا ہوا کرسی سمیت پیچھے الٹ گیا۔ میرا خیال تھا کہ یہاں ایک نیا ہنگامہ شروع ہوجائے گا اور میں نے فوراً ہی اپنے آپ کو اس ہنگامے سے نبرد آزما ہونے کے لیے تیار کرلیا تھا لیکن میرا خیال غلط نکلا۔ گھونسا کھانے والا اٹھ کر وہاں سے اس طرح بھاگا تھا جیسے ایک لمحے کی بھی تاخیر ہوئی تو اس پر قیامت ٹوٹ پڑے گی۔

دوسرا آدمی بھی بدحواس ہوکر اٹھ گیا تھا۔ اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے تاش کے پتے بھی نیچے پھینک دیے۔

"شانتی۔۔۔ شانتی مہاشے جی!" وہ فوراً ہی بول پڑا "وہ واقعی چریا ہے۔ اچھا ہوا آپ نے اسے ایک ہاتھ جڑ دیا۔ آپ ادھر بیٹھو۔ میں ڈاکٹر کو بلا کر لاتا ہوں۔" اس نے جلدی سے الٹی ہوئی کرسی بھی سیدھی کردی۔

"جلدی سے بلا کر لاؤ۔ کہاں ہے ڈاکٹر؟" ٹھاکر کے حلق سے غراہٹ سی نکلی۔

وہ آدمی فوراً ہی چھولداری سے نکل کر ایک طرف دوڑ گیا۔ اس کی واپسی میں دس منٹ سے زیادہ نہیں لگے تھے۔ وہ اکیلا نہیں تھا۔ اس کے ساتھ درمیانے قد کا ایک ادھیڑ عمر آدمی بھی تھا جس نے سفید دھوتی اور زرد رنگ کا کرتہ پہن رکھا تھا۔ گلے میں رنگ برنگے موتیوں کی ایک مالا بھی تھی۔ ماتھے پر سرخ ٹیکا بھی لگا ہوا تھا اور اگرچہ کلین شیو تھا لیکن غالباً دو دن سے شیو نہیں بنایا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھ اٹھا کر ہمیں پرنام کیا اور فوراً ہی جانکی کی طرف متوجہ ہوگیا۔

اس نے کرتے کی جیب سے چابیوں کا گچھا نکال کر ایک چابی منتخب کرکے لکڑی کے صندوق کا تالا کھولا اور صندوق میں سے کچھ چیزیں نکال کر میز پر رکھنے لگا۔

سب سے پہلے اس نے قینچی اٹھا کر جانکی کے کچھ بال کاٹ دیے۔ بائیں کان سے تقریباً دو انچ اوپر ڈیڑھ انچ لمبا زخم لگا تھا۔

"لگتا ہے کسی تیز دھار چیز سے ضرب لگائی گئی ہے۔ بالوں نے بچالیا لیکن پھر بھی گھاؤ خاصا گہرا ہے" ڈاکٹر زخم کا معائنہ کرتے ہوئے بول رہا تھا۔ "یہاں تو میں صرف فرسٹ ایڈ ہی دے سکتا ہوں۔ گھاؤ پر ٹانکے لگیں گے اور اسے فوری طور پر شہر کے اسپتال لے جانا ہوگا۔"

میں نے ٹھاکر کی طرف دیکھا۔ وہ پریشان تو پہلے ہی تھا۔ آنکھوں میں مزید تشویش ابھر آئی۔ شہر جانے کے لیے ہمارے پاس کوئی سواری نہیں تھی۔ اچانک میرے ذہن میں انسپکٹر دنو پانڈے کا خیال ابھر آیا۔

"ٹھیک ہے ڈاکٹر۔ تم اس وقت ہماری جو بھی مدد کرسکتے ہو، ضرور کرو" میں نے کہا "اور ٹھاکر، تم یہیں رکو۔ میں ابھی آتا ہوں۔"

میں چھولداری سے نکل کر اندر کی طرف بھاگنے لگا۔ مجھے یقین تھا کہ انسپکٹر پانڈے مندر ہی میں ہوگا اور وہ ہماری مدد ضرور کرے گا۔

مندر میں یاتریوں کا رش تھا۔ موسیقی کی آوازوں کے ساتھ کالی کے بھجن گانے کی آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔ یاتریوں کے اس ہجوم میں انسپکٹر پانڈے کو تلاش کرنے میں مجھے خاصی دشواری پیش آئی تھی۔

"میری دوست پہاڑی سے گر گئی تھی، اسے سر پر شدید چوٹ آئی ہے" میں نے اس کا سامنا ہوتے ہی کہا "ہمیں اس وقت تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔"

"مجھ سے جو ہوسکے گا کروں گا۔ کہو، میں تمہاری کیا سیوا کرسکتا ہوں۔" انسپکٹر پانڈے نے کہا۔

"جانکی کو شہر لے جانے کے لیے گاڑی کی ضرورت ہے" میں نے کہا۔ "اگر اسے فوری طور پر اسپتال نہ لے جایا گیا تو اس کی حالت بگڑ جائے گی۔"

"کہاں ہے وہ' چلو میرے ساتھ!" انسپکٹر پانڈے نے کہا اور قریب کھڑے ہوئے اپنے ایک آدمی کو بھی ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔

جب ہم میڈیکل کیمپ والی چھولداری میں پہنچے تو ڈاکٹر' جانکی کے زخم کی ڈریسنگ کرچکا تھا۔ انسپکٹر پانڈے نے ڈاکٹر سے ایک دو باتیں کیں اور پھر اپنے آدمی کو گاڑی لینے کے لیے بھیج دیا۔

پانچ منٹ بعد پولیس کی جیپ چھولداری کے پاس آکر رکی۔

"تم لوگ اس کے ساتھ چلے جاؤ۔ میں مندر میں جاکر پرارتھنا کرتا ہوں کہ دیوی جی جلدی اچھی ہوجائیں" انسپکٹر پانڈے نے کہا۔

جانکی اس وقت ہوش میں تھی۔ اس نے بھی ہاتھ جوڑ کر انسپکٹر پانڈے کا شکریہ ادا کیا۔ میں نے جانکی کو گود میں اٹھاکر جیپ کی پچھلی سیٹ پر لٹادیا اور خود اس کے سامنے والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ ٹھاکر ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گیا تھا۔ اس وقت تیز ہوا چل رہی تھی اور ہر طرف ریت اڑ رہی تھی۔ دوسروں کا حلیہ دیکھ کر میں اپنے بارے میں بھی اندازہ لگا سکتا تھا۔

میدان سے نکل کر پہاڑی کی دوسری طرف آتے ہی جیپ کی رفتار تیز ہوگئی۔ جیپ کو لگنے والے جھٹکوں سے جانکی کراہ اٹھی۔ اس کے لیے سیٹ پر سر رکھنا ممکن نہیں تھا۔ میں جانکی کی سیٹ پر آگیا اور اس کا سر اپنی گود میں..... رکھ لیا تاکہ اسے کم سے کم جھٹکے لگ سکیں۔

پہاڑیوں سے نکل کر پختہ سڑک پر آتے ہی جیپ طوفانی رفتار سے سارسکا کی طرف دوڑنے لگی۔ وہ پولیس کا ڈرائیور تھا اور اس قسم کی ہنگامی صورتِ حال سے نمٹنا جانتا تھا۔ ویسے بھی اس وقت سڑک سنسان تھی اور اسے تیز رفتاری میں کوئی دشواری پیش نہیں آرہی تھی۔

ہم آدھے وقت میں سارسکا پہنچ گئے۔ جیپ اسپتال کے سامنے پہنچ کر ہی رکی تھی۔ رات آدھی سے زیادہ بیت چکی تھی۔ ڈاکٹر کو بھی گھر سے بلانا پڑا تھا۔ ٹھاکر' روپ متی اور بملا کو بھی اس صورتِ حال سے آگاہ کرنا چاہتا تھا لیکن میں نے اسے منع کردیا کیونکہ وہ اس وقت سو رہی تھیں اور انہیں ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں تھا۔

ایک گھنٹے میں ڈاکٹر اپنے کام سے فارغ ہوا۔ جانکی کے زخم پر سات ٹانکے لگے تھے۔ اسے انجکشن بھی لگادیا گیا تھا اور وہ نیند میں چلی گئی تھی۔ میں اور ٹھاکر ایمرجنسی روم کے باہر راہداری میں پڑی ہوئی بینچوں پر لیٹ گئے۔ مجھے [illegible] کے اس مذاق پر ہنسی آرہی تھی۔ ہمارے پریوار کے پانچ [illegible] اس اسپتال میں داخل تھے۔ ہم دارا اور بلونت سنگھ [illegible] میں یہاں آئے تھے اور یہ مہم ہمارے لیے بڑی مہنگی ہوئی تھی۔

ٹھاکر تو بینچ پر لیٹنے کے تھوڑی ہی دیر بعد سوگیا تھا اور جانکی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ میں دارا کو سمجھنے میں ایک بار پھر غلطی کرگیا تھا۔ میں نے اس کی ایک ٹانگ توڑ دی اور میرا خیال تھا کہ جانکی اسے کوئی حرکت نہیں کرنے دے گی لیکن معاملہ اس کے بالکل برعکس نکلا تھا۔ اگر ہم میں واپس پہنچنے میں مزید دیر ہوجاتی تو جانکی ختم ہوچکی تھی۔ یہ تو جانکی کے ہوش میں آنے کے بعد ہی معلوم ہوسکتا تھا کہ دارا نے اسے کس طرح زخمی کیا تھا اور وہ کس طرح اس سے بھاگا تھا؟ میں یہی سب کچھ سوچتے ہوئے سوگیا۔

صبح ساڑھے چھ بجے کے قریب اسپتال میں لوگوں کی آمدورفت شروع ہوگئی۔ ہمیں بھی اٹھ جانا پڑا۔ میں ایمرجنسی روم میں جاکر دیکھا' جانکی بھی جاگ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر زردی کھنڈ رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر بہت خفیف سی مسکراہٹ آگئی۔

"کیسی ہو؟" میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے پوچھا۔

جانکی پلکیں جھپک کر رہ گئی۔ اسی وقت ایک نرس کمرے میں داخل ہوئی اور ٹمپریچر لینے کے لیے اس نے تھرمامیٹر جانکی کے منہ میں ڈال دیا۔ چند منٹ بعد نرس جانے لگی تو میں نے پوچھ لیا۔

"اب مریضہ کی کیفیت کیا ہے؟"

"زیادہ تشویش کی بات تو نہیں ہے۔ گھاؤ ٹھیک ہونے میں چند روز تو لگیں گے۔" نرس نے جواب دیا۔

"ڈاکٹر کس وقت آئے گا؟" میں نے دریافت کیا۔

"آٹھ بجے!" نرس نے جواب دیا۔

"کیا یہ یہیں رہے گی؟" میں نے جانکی کی طرف اشارہ کیا۔

"کوئی کمرا خالی نہیں ہے۔ انہیں تھوڑی دیر بعد [illegible] میں منتقل کردیا جائے گا" نرس نے جواب دیا۔

وارڈ کی حالت میں چند روز پہلے دیکھ چکا تھا۔ اسپتال کا ماحول تو ویسے ہی وحشت ناک ہوتا ہے لیکن سرجری میں تو داخل ہوتے ہی کراہیت سی محسوس ہونے لگتی ہے۔

"ہماری ایک اور مریضہ بھی اس اسپتال میں [illegible]

[illegible] نے نرس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "کیا یہ مناسب [illegible] ہوگا کہ اسے بھی وارڈ کے بجائے اسی کمرے میں منتقل [illegible] جائے۔"

نرس میری طرف دیکھ کر مسکرادی "ایک نہیں۔ آپ تو کئی مریض ہیں اس اسپتال میں۔ میں سسٹر سے بات کرتی ہوں۔ انہوں نے کہا تو انہیں اسی کمرے میں منتقل کردیا جائے گا۔"

نرس کے ساتھ ہی ایمرجنسی روم سے باہر آگیا۔ باہر کی راہداری میں نظر نہیں آیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ روپ متی والے کمرے میں چلا گیا ہوگا۔ میں اس طرف [illegible] کے لیے دوسری راہداری میں مڑا تو سامنے سے آتی ہوئی بملا مجھے دیکھ کر چونک گئی۔ اس کے ہاتھ میں کچھ برتن [illegible] اور وہ چائے بنانے کے لیے کچن کی طرف جارہی تھی۔

"ارے ہمت سنگھ" اس کے لہجے میں حیرت تھی "یہ کیا [illegible] بنا رکھا ہے۔ واپس کب آئے' جانکی اور ٹھاکر کہاں [illegible]؟"

"جانکی تو ادھر ہی ہے اور میں ٹھاکر کے بارے میں تم [illegible] دریافت کرنے والا تھا۔ کیا وہ تمہارے کمرے میں نہیں [illegible]؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں۔ ٹھاکر جی' ادھر تو نہیں ہیں اور جانکی دیدی کہاں [illegible]؟" اس نے پوچھا۔

"وہ بات دراصل یہ ہے کہ..." میں اسے بتاتے ہوئے [illegible] رہا تھا "جانکی زخمی ہے اور ایمرجنسی روم میں پڑی ہے۔ [illegible] لوگ رات کو یہاں آگئے تھے۔"

"کیا ہوا جانکی دیدی کو؟" بملا کا چہرہ ایک دم دھواں [illegible] ہوگیا۔

"سر پر چوٹ لگ گئی تھی۔ اب کچھ بہتر ہے اور روپ [illegible] کیسی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"پہلے سے بہت اچھی ہیں۔ جانکی دیدی کو کیا ہوا' کیسے [illegible] ہوئی وہ؟"

"پریشانی کی بات نہیں ہے۔ تھوڑی دیر میں اسے روپ [illegible] والے کمرے میں منتقل کردیا جائے گا۔ میں اسی طرف [illegible] تھا۔ آؤ' میرے ساتھ آؤ۔" میں نے کہا۔

بملا بھی میرے ساتھ کمرے میں آگئی۔ روپ متی جاگ [illegible] تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ مسکرادی۔

"ارے ہمت سنگھ!" وہ دھیمے لہجے میں بولی "یہ کیا حلیہ [illegible] بنا رکھا ہے تم نے؟"

"کیا ہوا؟" میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"کچھ نہیں ہوا' بس یوں لگتا ہے جیسے تم کسی کھدائی سے برآمد ہوئے ہو۔" یہ جملہ روپ متی کے بجائے بملا نے کہا تھا۔

ہم تین دن ریگستانی پہاڑیوں میں رہے تھے جہاں ہر وقت ریت اڑتی رہتی تھی اور ان تین دنوں میں ہمیں نہانے کا تو کیا' منہ دھونے کا موقع بھی نہیں ملا تھا۔ اپنے کپڑوں کو دیکھ کر میں اپنی حالت کا اندازہ لگا سکتا تھا اور پھر میں نے ٹھاکر اور دوسرے لوگوں کو بھی دیکھا تھا۔ بملا نے غلط نہیں کہا تھا۔ میں یقیناً ایسا لگ رہا ہوں گا جیسے کسی کھدائی سے برآمد ہوا ہوں۔

میں نے روپ متی کو جانکی کے بارے میں بتایا تو اس کے چہرے پر بھی افسردگی سی چھاگئی۔ بملا تو بہت مضطرب ہورہی تھی۔ وہ جانکی سے بہت زیادہ اٹیچ تھی۔ اس کی بے کلی دیکھ کر میں اندازہ لگا سکتا تھا کہ وہ جلد سے جلد جانکی کے پاس جانا چاہتی تھی۔

میں روپ متی سے باتیں کررہا تھا۔ اس دوران میں ٹھاکر بھی آگیا اور اسے دیکھ کر میں چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ اور اب یہ بات بھی میری سمجھ میں آگئی کہ صبح ہوتے ہی ٹھاکر کہاں غائب ہوگیا تھا۔ وہ صبح اٹھتے ہی ہٹ پر چلا گیا تھا۔ بملا کو ہٹ سے اسپتال منتقل کرنے کے بعد اس روز جب ہم ملبے کے لیے روانہ ہونے لگے تھے تو ہٹ کی چابیاں ایسی جگہ پر رکھ دی گئی تھیں کہ بعد میں اگر بملا کو بھی وہاں جانا ہوتا تو اسے پریشانی نہ ہوتی اور ٹھاکر صبح اٹھتے ہی وہاں چلا گیا تھا اور نہادھوکر بالکل فریش ہوکر آیا تھا۔

ہم باتیں کررہے تھے اور بملا چپکے سے کمرے سے نکل گئی تھی اور پھر پندرہ بیس منٹ بعد باہر سے کسی نے کمرے کا دروازہ پوری طرح کھول دیا اور دو وارڈ بوائز اسٹریچر کو دھکیلتے ہوئے اندر لے آئے۔ باہر کھڑی ہوئی بملا تیزی سے آگے آگئی اور نرس کے ساتھ مل کر جانکی کو خالی بیڈ پر منتقل کردیا۔ وارڈ بوائز خالی اسٹریچر کو دھکیلتے ہوئے باہر لے گئے۔

"اب میں چائے بنا کر لاتی ہوں" بملا نے ایک طرف میز پر رکھے ہوئے برتن اٹھالیے اور مسکراتے ہوئے باہر چلی گئی۔ جب تک اس نے جانکی کو نہیں دیکھا تھا' بہت بے چین رہی تھی اور اب وہ قدرے مطمئن دکھائی دے رہی تھی۔

آدھے گھنٹے بعد وہ چائے بنا کر لے آئی۔ روپ متی اور جانکی کو اس نے سہارا دے کر بٹھادیا اور چائے کے کپ ان کے ہاتھوں میں تھماکر خود بھی جانکی کے بیڈ پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ

گئی۔

"کیا اب تم بات کرسکتی ہو۔ تمہیں بولنے میں تکلیف تو نہیں ہورہی؟" میں نے سوالیہ نگاہوں سے جانکی کی طرف دیکھا۔

"ہاں' زیادہ تکلیف نہیں ہورہی" جانکی نے چائے کی چسکی لیتے ہوئے جواب دیا۔

"تو پھر شروع ہوجاؤ" میں نے کہا "دارا تو بے ہوش تھا اور میں نے اس کی ایک ٹانگ بھی توڑدی تھی۔ وہ تمہیں زخمی کرکے کیسے فرار ہوگیا؟"

"میں غار کے دہانے پر بیٹھی ہوئی تھی۔ میرا رخ باہر کی طرف تھا" جانکی نے کہنا شروع کیا۔ "اس دوران میں' میں نے کئی بار مزکر دارا کی طرف دیکھا تھا۔ ڈیڑھ گھنٹا گزر گیا۔ وہ مسلسل بے ہوش پڑا ہوا تھا۔ مجھے شبہ ہوا کہ کہیں وہ ختم ہی تو نہیں ہوگیا۔ یہی سوچ کر میں اسے دیکھنے کے لیے اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے قریب آگئی۔ میں نے اس کے دل کی دھڑکن محسوس کرنے کے لیے جیسے ہی اس کے سینے پر ہاتھ رکھا' اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر زور سے جھٹکا دیا۔ میں اس کے اوپر سے قلابازی کھاتے ہوئے دوسری طرف گری۔ میرے سنبھلنے سے پہلے ہی وہ بڑی پھرتی سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ تمہارا دیا ہوا پستول ابھی تک میرے ہاتھ میں تھا۔ میں نے فائر کردیا۔ گولی اس کے سر کے قریب سے گزر گئی۔ دارا نے مجھے دوسرا فائر کرنے کا موقع نہیں دیا۔ اس نے میری کلائی پر کھڑی ہتھیلی کا وار کیا۔ پستول میرے ہاتھ سے نکل کر گر گیا۔

"دارا نے پستول اٹھانے کی کوشش کی تو میں نے پستول کو ٹھوکر مار کر اسے دارا کی پہنچ سے دور کردیا۔ دارا نے میرا گلا دبوچ لیا۔ میں نے بڑی مشکل سے اپنے آپ کو اس کی گرفت سے چھڑالیا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو رگیدتے ہوئے غار کے دہانے کے قریب آگئے۔ اس دوران میں' میں نے اندازہ لگالیا کہ وہ ایک ٹانگ کو زیادہ حرکت دے رہا تھا۔ میں نے اس کی مضروب ٹانگ پکڑ کر زور دار جھٹکا دیا۔ دارا چیخ اٹھا۔ اس نے دوسری ٹانگ سے مجھے پیچھے دھکیل دیا۔ میں سنبھلنے کی کوشش کررہی تھی کہ دارا ایک پتھر اٹھا کر حملہ آور ہوا۔ میں نے بچنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہوسکی۔ پتھر میرے سر پر لگا۔ میں لڑکھڑا کر پشت کے بل گری۔ میری آنکھوں کے سامنے پہلے تو نیلی پیلی چنگاریاں ناچتی رہیں اور پھر چھا گیا ذہن تاریکی میں ڈوبتا چلا گیا" وہ خاموش ہوکر میری طرف دیکھنے لگی پھر بولی "کہاں گیا وہ۔۔۔ کچھ پتا چلا اس کا؟"

"نہیں" میں نے نفی میں سرہلادیا "اسے سمجھنے میں ایک بار پھر مجھ سے غلطی ہوگئی تھی۔ لنگڑا ہونے کے باوجود رات کی تاریکی سے فائدہ اٹھا کر پہاڑیوں میں غائب ہوگیا۔ بہرحال' ہم وقت پر واپس پہنچ گئے تھے اور تمہیں انسپکٹر پانڈے ہمارے کام آگیا۔ اگر اس کی دسترس تمہیں یہاں لانے میں بڑی مشکل ہوتی۔"

"انسپکٹر پانڈے سے ملاقات ہوگی تو میں اس کا شکریہ ادا کروں گی۔ بہت اچھا آدمی ہے وہ" جانکی نے کہا۔

"آج وہاں کالی کی پوجا کا آخری دن ہے۔ میرا خیال ہے کہ دوپہر تک وہ بھی واپس آجائے گا" میں نے جواب دیا۔

چائے پینے کے بعد میں ہٹ کی طرف جانے کو تیار ہوگئی۔ وہ بھی تین دن سے یہیں رہ رہی تھی۔ اسے اپنے کپڑے وغیرہ لینے تھے اور کام بھی تھے۔ اس نے میلے کپڑے اور فالتو چیزیں تھیلے میں ڈال لیں اور ہم دونوں اسپتال سے باہر آگئے۔

اسپتال کے گیٹ سے نکلتے ہی ہمیں آٹو رکشا مل گیا۔ اس نے چند منٹ میں ہمیں ہماری منزل پر پہنچادیا۔

چابیوں کا گچھا ہٹ کے برآمدے میں ایک کھونٹی پر رکھا ہوا تھا۔ میں نے چابیاں اٹھا کر دروازہ کھولا اور اندر داخل ہوگئے۔ میں نے فوراً ہی اپنے کمرے میں جاکر دروازہ بند کرلیا۔ باتھ روم میں آکر آئینے میں اپنے چہرے کا جائزہ لیا تو میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ واقعی میں رہا تھا جیسے میں کسی کھدائی سے برآمد ہوا ہوں۔

میں تقریباً ایک گھنٹے بعد ہی اپنے کمرے سے نکلی۔ اس وقت میں اپنے آپ کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کررہی تھی۔ میں نے بلا والے کمرے میں جھانک کر دیکھا۔ وہ باتھ روم میں تھی۔ دروازہ چند انچ کے قریب کھلا ہوا تھا اور اندر سے پانی گرنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

میں لاؤنج میں آکر صوفے پر بیٹھ گیا اور ایک بار پھر صورتِ حال کا جائزہ لینے لگا۔ اب تک باتیں سامنے آئی تھیں۔ دارا ایک بار پھر ہاتھ آکر نکل گیا تھا۔ اس کے آنے کا یہ فائدہ ضرور ہوا تھا کہ روپ متی کو اس کے بلونت سنگھ سے نجات مل گئی تھی لیکن میرا دشمن ایک بچ نکلا تھا۔ ہندوستان میں اسے بلونت سنگھ جیسے لوگ ملتے تھے اور میرا خیال تھا کہ ایک بلونت سنگھ کے ختم ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ہندوستان میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں تھی۔ دارا بہت چالاک اور عیار آدمی تھا۔ اس کی میں ٹائیگر اور پیڈرو جیسے بدمعاشوں کو اپنا مطیع بنا رکھا اور چی فانگ جیسے گینگسٹر اس کے اشاروں پر ناچتے تھے۔ ہندوستان کے پنڈت اور غنڈے تو ان کے سامنے کچھ بھی نہیں تھے۔ دارا ان سے کام لینے کا گر جانتا تھا۔ ایک بھی نہیں مرگیا تو کیا ہوا۔ اسے تو قدم قدم پر بلونت سنگھ جیسے چیلے سنگھ مل سکتے تھے۔

میں ابھی یہ سب کچھ سوچ ہی رہا تھا کہ آہٹ سن کر میرے خیالات منتشر ہوگئے۔ میں نے گردن گھما کر دیکھا تو میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا اور میں اپنے آپ کو بکھرتا ہوا محسوس کرنے لگا۔

وہ بلا تھی' اسے دیکھ کر میرا دل دھڑکنا بھول گیا تھا۔ بلا کو میں نے پہلے بھی کئی مرتبہ نیم عریاں لباس میں دیکھا تھا' اس وقت اس نے جو نہایت مختصر سا لباس پہن رکھا تھا وہ میری سمجھ میں نہیں آسکا تھا البتہ اسے دیکھ کر میں کچھ دیر کے لیے تو سانس لینا ہی بھول گیا تھا۔

وہ بہت حسین تھی۔ نرم و نازک کومل سی' قدرت کے ہاتھوں بہت احتیاط سے تراشا ہوا بدن اور رنگت ایسی جیسے میدے میں گلابی رنگ گھول دیا گیا ہو۔ اس کی آنکھوں میں ستاروں جیسی چمک اور ہونٹوں پر بڑی دلفریب سی مسکراہٹ تھی۔

اس کے ایک ہاتھ میں پلاسٹک کی بالٹی تھی جس میں دھلے ہوئے کپڑے بھرے ہوئے تھے۔ میرے قریب پہنچ کر اس نے بالٹی نیچے رکھ دی۔

"ہمت سنگھ جی!" وہ مسکراتے ہوئے بولی "تھوڑی سی ہمت کرو اور یہ کپڑے باہر دھوپ میں ڈال دو۔"

میں جیسے خواب دیکھ رہا تھا۔ اس کی آواز سن کر ایکدم اچھل پڑا اور اس کی طرف سے نظریں چرانے کی کوشش کرتے ہوئے بالٹی اٹھا کر باہر نکل گیا۔

باہر کپڑے سکھانے کے لیے کوئی رسی وغیرہ نہیں تھی۔ میں نے تمام کپڑے لان میں گھاس پر پھیلادیے۔ ان میں بلا کے اپنے کپڑے بھی تھے اور روپ متی کے بھی۔ میں خالی بالٹی لے کر اندر آیا تو بلا اپنے کمرے میں جاچکی۔ اس کے کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں نے بالٹی دروازے کے اندر کی طرف رکھ دی اور واپس آکر صوفے پر لیٹ گیا۔

مجھے بنگلے کی وہ رات یاد تھی جو ہم نے ایک غار میں گزاری تھی۔ بلا نے اس رات آپے سے باہر ہونے کی کوشش کی تھی۔ شاید میں بھی بہک جاتا لیکن میں نے بڑی مشکل سے نہ صرف اپنے آپ کو بلکہ اسے بھی دلدل میں گرنے سے بچالیا تھا۔ اس کے بعد گھر میں جانکی اور روپ متی کی موجودگی میں بلا کو کبھی ایسی کوئی حرکت کرنے کا موقع نہیں ملا تھا اور آج اسے کچھ آزادی مل گئی تھی۔

بلا بہت معصوم لڑکی تھی۔ جسمانی طور پر تو وہ ایک بھرپور جوان لڑکی تھی لیکن ابھی اسے اتنا شعور حاصل نہیں ہوا تھا کہ اچھائی اور برائی میں تمیز کرسکتی۔ وہ زندگی کو ایک کھیل سمجھ کر اس سے کھیلنا چاہتی تھی اور وہ بالکل نہیں جانتی تھی کہ ایسا کھیل شروع ہوجائے تو اسے روکنا ممکن نہیں ہوتا۔

لیٹے لیٹے میری آنکھیں بند ہونے لگیں۔ پچھلی رات بھاگ دوڑ میں گزری تھی اور میں ایک منٹ کو بھی نہیں سوسکا تھا اور پھر صبح پتا نہیں چلا کہ میں کب نیند کی آغوش میں پہنچ گیا۔

میری آنکھ کھلی تو نظر سامنے دیوار پر لگی ہوئی گھڑی کی طرف اٹھ گئی۔ سہ پہر کے چار بج رہے تھے۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ گیا۔ پورا دن سوتے میں گزر گیا تھا۔

ہم ہٹ سے نکلے تو ساڑھے پانچ بج رہے تھے۔ سڑک پر آتے ہی ہمیں آٹو رکشا مل گیا اور ہم چند منٹ میں اسپتال پہنچ گئے' کمرے میں قدم رکھتے ہی میں ٹھٹک گیا۔ انسپکٹر جارمنی واس اور اے سی پی بھنڈاری کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ دونوں سادہ لباس میں تھے لیکن تھے تو بہرحال پولیس آفیسر۔ انہیں دیکھتے ہی میرا ماتھا ٹھنکا تھا اور میرے ذہن میں اچانک ہی یہ خیال آیا کہ ہو نہ ہو یہ لوگ جانکی کے سلسلے میں یہاں آئے ہیں۔ کالی کے مندر والی پہاڑیوں میں ہم نے انسپکٹر پانڈے کو یہی بتایا تھا کہ جانکی پہاڑی سے گر گئی تھی اور پتھر لگنے سے سر پر چوٹ لگی تھی اور یہاں اسپتال میں بھی یہی کہانی سنائی تھی۔ پولیس کا ایک آدمی ہی ہمیں اسپتال چھوڑ کر گیا تھا۔ میں تو صبح نو بجے کے قریب بلا کو لے کر چلا گیا تھا اور ممکن ہے بعد میں اسپتال کی انتظامیہ ہی نے پولیس کو اس سلسلے میں اطلاع دی ہو اور شاید یہ دونوں آفیسر اسی سلسلے میں

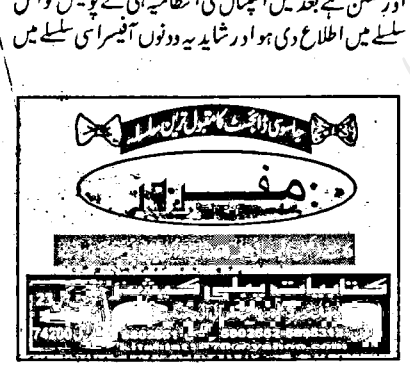

پوچھ گچھ کے لیے یہاں آئے تھے۔

لیکن میرا یہ خدشہ بے بنیاد ثابت ہوا۔ یہاں تو معاملہ ہی کچھ اور نکلا تھا۔

"بھنڈاری صاحب ایک بہت دلچسپ خبر لے کر آئے ہیں۔" ٹھاکر نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"اور میرا خیال ہے وہ خبر گنگولی چوہدری والے کیس کے سلسلے میں ہوگی" میرے منہ سے بے اختیار نکلا اور مجھے اپنی بات پر خود بھی حیرت ہو رہی تھی۔ ان دونوں پولیس آفیسروں کو دیکھ کر میں نے گنگولی چوہدری کے بارے میں تو کچھ سوچا بھی نہیں تھا لیکن لاشعور میں دبی ہوئی یہ بات اچانک ہی ابھر کر سامنے آگئی تھی۔

"گنگولی چوہدری سے بھی زیادہ دلچسپ!" ٹھاکر بولا۔

"گنگولی چوہدری کے حوالے سے بھی ایک خبر ہے" بھنڈاری نے کہا "آپ کو یاد ہوگا کہ گنگولی چوہدری کا ایک ساتھی زخمی ہو کر جنگل میں فرار ہونے میں کامیاب ہوگیا تھا۔ اب ہماری تازہ ترین اطلاع کے مطابق چند روز جنگل میں ایک بھیل قبیلے میں چھپے رہنے کے بعد وہ کوٹ تپلی کی طرف نکل جانے میں کامیاب ہوگیا ہے اور اطلاع یہ ہے کہ وہ اس علاقے کے نامی گرامی ڈاکو چورن سنگھ سے رابطہ کرنے کی کوشش کر رہا ہے تاکہ پولیس سے گنگولی چوہدری اور اپنے دوسرے ساتھیوں کے قتل کا بدلہ لے سکے۔ پولیس کے علاوہ تمہارا نام بھی اس کے ذہن میں محفوظ ہے۔"

"کیا یہی وہ دلچسپ خبر ہے جسے سنانے کے لیے آپ لوگوں نے یہاں آنے کی زحمت کی؟" میں نے سوالیہ نگاہوں سے بھنڈاری اور انسپکٹر جارمنی داس کی طرف دیکھا۔

"نہیں، وہ دوسری خبر ہے" ان دونوں کے بجائے ٹھاکر بولا۔

"شاید آپ لوگ مجھے تجسس میں رکھنا چاہتے ہیں" میں نے کہا۔ میں ان کے "سہیلی بوجھ پہیلی" والے اس انداز سے کچھ الجھن سی محسوس کرنے لگا تھا۔

"انسپکٹر پانڈے کالی کے مندر سے کروڑوں روپے کا مال اور نقدی لے کر فرار ہوگیا ہے۔" ٹھاکر نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"کیا!" میں اس طرح اچھل پڑا جیسے میرے پیروں کے قریب بم پھٹ پڑا ہو "تم شاید مذاق کر رہے ہو۔"

"یہ اطلاع مجھے ان پولیس آفیسروں نے دی ہے اور یہ حضرات اس سلسلے میں ہم سے کچھ معلومات حاصل کرنے آئے ہیں۔" ٹھاکر نے جواب دیا۔

یہ واقعی مذاق نہیں تھا لیکن مجھے یقین نہیں انسپکٹر پانڈے ایک ذمے دار، فرض شناس اور آفیسر تھا۔ کئی روز پہلے جب گنگولی چوہدری کی یاتریوں کو اٹھا کر جنگل میں لے گئے تھے تو انسپکٹر پولیس کی کارروائی میں پیش پیش رہا تھا اور پھر پولیس پارٹی بھی وہی لے کر جنگل میں گیا تھا۔ ڈاکوؤں کے اس گروہ کا قلع قمع کرنے میں اس نے کردار ادا کیا تھا۔ آخری دن جب گنگولی چوہدری فیصلہ کن جنگ ہو رہی تھی تو وہ انسپکٹر پانڈے ہی تھا عین وقت پر وہاں پہنچ کر میری جان بچائی تھی۔ میں زندگی کے نازک اور سنگین ترین لمحات سے دوچار تھا پانڈے ہی نے میری مدد کی تھی ورنہ شاید گنگولی چوہدری بجائے میری لاش جنگل میں پڑی سڑ رہی ہوتی۔

انسپکٹر پانڈے جنگل میں دو دن ہمارے ساتھ جنگل میں گزارے گئے ان دو دنوں کے دوران میں نیم عریاں لباس میں رہی تھی مگر انسپکٹر پانڈے کی شرا انتہا یہ بھی کہ اس نے کبھی نظر بھر کر بھی بالا کی طرف دیکھا تھا۔ اور پھر چند روز پہلے جب ٹھاکر اور رو کا ایکسیڈنٹ ہوا تھا تو میں سمجھتا ہوں کہ روپ متی بچانے میں بھی اس نے اہم رول ادا کیا تھا۔ ٹھاکر رو کی جان بچانے کے لیے اسپتال میں لوگوں سے خون قطرہ حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔ لوگ سامنے میری اپیل بھی بے اثر ثابت ہوئی تھی اور پھر پانڈے ہی تھا جس نے میرا ہاتھ اٹھا کر لوگوں کو بتایا تھا میں ہوں جس نے ان لوگوں کو گنگولی چوہدری سے نجات دلائی تھی۔ میں اگر یہی بات کہتا تو شاید اتنا اثر نہ ہوتا یا لوگ یقین ہی نہ کرتے لیکن انسپکٹر کے الفاظ نے انہیں جھنجوڑ کر رکھ دیا تھا اور لوگ خون کے لیے لائن میں لگ گئے تھے اور کل رات ہی کی تو بات کہ اس نے جانکی کی حالت دیکھ کر ہمیں آدھی رات وقت اپنی جیپ پر شہر بھیجنے کا بندوبست کیا تھا۔ اگر وہ نہ کرتا تو جانکی کی حالت بگڑ جاتی۔

ایک فرض شناس، ذمے دار اور شریف پولیس یہ اس قسم کا دوسرا آدمی تھا جو میری نظروں سنگاپور میں انسپکٹر چیانگ شو مجھے اب بھی یاد تھا اور ہے کہ انسپکٹر پانڈے سے مل کر مجھے انسپکٹر چیانگ شو تھا۔ اگر انسپکٹر چیانگ شو کے بارے میں جاتی تو میں کبھی یقین نہ کرتا۔ ہندوستان کی پولیس

پانڈے بھی تو ایسا ہی تھا جو مثالی کردار کا مالک تھا اور اس وقت اس کے بارے میں جو بات کہی جا رہی تھی اس پر مجھے یقین نہیں آرہا تھا۔

"یہ مذاق نہیں حقیقت ہے" اے سی پی بھنڈاری کی آواز سن کر میں اپنے خیالات سے چونک گیا، وہ کہہ رہا تھا۔ "انسپکٹر پانڈے پہاڑیوں میں واقع کالی کے مندر میں دو پنڈتوں کو موت کے گھاٹ اتار کر وہاں سے کروڑوں روپے مالیت کے زیورات، سونے کی مورتیاں، بھینٹ میں دی جانے والی دوسری چیزیں اور لاکھوں روپے کی نقدی لے کر فرار ہوگیا ہے۔ اس کے ساتھ پولیس کے تین آدمی اور بھی ہیں اور وہ اس جرم میں برابر کے شریک ہیں۔"

"یقین نہیں آرہا" میرے دماغ میں اب بھی سنسناہٹ ہو رہی تھی "آپ کو کیسے پتا چلا اور یہ اطلاع کب ملی؟"

"آج دوپہر دو بجے کے قریب" بھنڈاری نے جواب دیا "جو کانسٹیبل گزشتہ رات آپ لوگوں کو یہاں لے کر آیا تھا اسے صبح واپس جانا تھا لیکن صبح اس کی جیپ خراب ہوگئی۔ کوئی بڑا ہی نقص تھا۔ جیپ کا انجن کھولنا پڑا تھا اور اس کانسٹیبل کی قسمت بھی اچھی تھی کہ وہ واپس نہیں جا سکا تھا۔"

"پھر آپ کو انسپکٹر پانڈے کے بارے میں اطلاع کیسے ملی؟" میں نے الجھی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

انسپکٹر پانڈے چھ آدمیوں کو لے کر یہاں سے گیا تھا ایک سب انسپکٹر، ایک حوالدار اور چار کانسٹیبل۔ آج دوپہر دو بجے کے قریب دو کانسٹیبل بڑی خستہ حالت میں یہاں پہنچے تھے۔ ساری بات انہوں نے ہی بتائی تھی۔"

اے سی پی بھنڈاری چند لمحے خاموش رہا پھر ان کانسٹیبلوں سے سنی ہوئی باتوں کی تفصیل بتانے لگا۔ اس کے کہنے کے مطابق کل پہاڑیوں والے مندر میں کالی کی پوجا کا آخری دن تھا۔ انسپکٹر پانڈے نے کسی ناخوشگوار صورت حال سے نمٹنے کے لیے اپنے آدمی مندر میں تعینات کر رکھے تھے۔ وہ خود دس بجے کے قریب سب انسپکٹر کے ساتھ مندر کی پچھلی طرف غار میں چلا گیا جہاں سب کچھ جمع کیا جاتا ہے۔ دو آدمیوں کو اس نے پہاڑی پر اس جگہ بھیج دیا تھا جہاں مندر سے پیچھے غار کا خفیہ راستہ نکلتا ہے۔ ایک آدمی کو اس نے مندر کے گیٹ پر اور دوسرے کو مورتی والے چبوترے کے پیچھے اندرونی غار کی طرف جانے والے راستے پر متعین کر دیا تھا اور اسے سختی سے ہدایت کر دی تھی کہ اس کی اجازت کے بغیر کسی کو بھی اندرونی غار کی طرف نہ آنے دیا جائے۔

اس وقت اندرونی غار میں دو پنڈت بھی تھے جو وہاں جمع شدہ دولت کا حساب لگا رہے تھے۔ پانڈے اور سب انسپکٹر کو اندرونی غار میں گئے ہوئے ایک گھنٹا گزر گیا تھا۔

گیارہ بجے کے قریب کلکتہ والے کالی کے مندر سے آئے ہوئے ایک پنڈت نے اندر جانے کی کوشش کی تو چبوترے کے پیچھے کھڑے ہوئے کانسٹیبل نے اسے روک لیا جبکہ وہ پنڈت اندر جانے کے لیے ہضد تھا۔

پنڈت کی ضد سے مجبور ہو کر کانسٹیبل بھی اس کے ساتھ غار کے اندر چلا گیا۔ غار کے پچھلے حصے میں قدم رکھتے ہی وہ دونوں بدحواس ہوگئے۔ دو پنڈت غار میں اس طرح پڑے ہوئے تھے کہ ان کے گلے کٹے ہوئے تھے اور ہر طرف خون ہی خون بکھرا ہوا تھا جبکہ انسپکٹر پانڈے اور سب انسپکٹر غائب تھے اور غار میں جمع کیا جانے والا مال وزر اور نقد رقم بھی غائب تھی۔ کہیں ایک تنکا تک نظر نہیں آرہا تھا جبکہ کلکتہ (موجودہ کول کتا) سے آیا ہوا وہ پنڈت ایک دن پہلے جب مندر کو لوٹنے کی ایک ناکام کوشش ہو چکی تھی، اپنی آنکھوں سے وہاں دولت کے انبار دیکھ چکا تھا۔

پنڈت اور اس کانسٹیبل کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ انسپکٹر پانڈے اور اس کا ساتھی سب انسپکٹر غار کے اندر پنڈتوں کو قتل کر کے مال وزر اور نقدی لوٹ کر خفیہ راستے سے فرار ہو چکے ہیں۔

پنڈت چیختا ہوا باہر آگیا۔ وہ کانسٹیبل بھی اس کے ساتھ ہی تھا۔ وہ خوف سے تھر تھر کانپ رہا تھا کہ لوگوں کو جب پتا چلے گا کہ یہ واردات پولیس والوں نے کی ہے تو وہ انہیں بھی زندہ نہیں چھوڑیں گے۔

پنڈت کی چیخ پکار سے کھلبلی سی مچ گئی تھی۔ ہر شخص غار میں داخل ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ کانسٹیبل کسی طرح مندر سے باہر آگیا اور مندر کے گیٹ پر متعین اپنے ساتھی کو لے کر وہاں سے بھاگ نکلا۔ وہ دو بجے کے قریب یہاں پہنچے اور صورت حال سے آگاہ کیا۔

"ہماری اطلاع کے مطابق انسپکٹر پانڈے کو سب انسپکٹر جگدیش، حوالدار منگل سنگھ اور ایک کانسٹیبل کے ساتھ نیلے رنگ کی ایک کار میں الور سے دہلی کی طرف جاتے ہوئے دیکھا گیا ہے۔"

"کیا انسپکٹر پانڈے اور اس کے ساتھی وہاں سرکاری ڈیوٹی پر تھے؟" میں نے بھنڈاری کے خاموش ہونے پر پوچھا۔

"ہم سرکاری طور پر وہاں کسی کی ڈیوٹی نہیں لگا سکتے کیونکہ۔"

"کیونکہ یہ بات ریکارڈ پر نہیں ہے کہ ان پہاڑیوں میں ہر سال ایک بہت بڑا میلا لگتا ہے اور اس کالی کے چرنوں پر انسانی جانوں کی بھینٹ دی جاتی ہے۔" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"آپ جانتے ہیں لوگ دھرم کے معاملات میں کتنے حساس ہوتے ہیں" مسٹر بھنڈاری نے کہا "دیوی کے چرنوں پر انسانی جان کی بھینٹ صریح قتل ہے لیکن وہ کیا ہے کہ ان پنڈتوں کو کچھ نیتاؤں کی حمایت حاصل ہے۔ تین سال پہلے ان کے خلاف کیس بنانے کی کوشش کی گئی تھی لیکن سرکار پر اس قدر دباؤ ڈالا گیا کہ یہ کیس واپس لینا پڑا اور ویسے بھی یہ لوگ بھینٹ کے لیے ان لوگوں کو پکڑ کر لاتے ہیں جن کا کروار نہایت گھناؤنا ہوتا ہے۔ چور، ڈاکو، غنڈے، بدمعاش اور وہ قاتل جو قانون کو چکر دے کر سزا سے بچ جاتے ہیں۔ وہ لوگ جو دوسروں کی زندگیاں برباد کرویتے ہیں لیکن خود ہر سزا سے بچے رہتے ہیں۔ ایسے ہی لوگ ان پنڈتوں کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں اور قانون کو بھی ان لوگوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔"

"عجیب منطق ہے" میں نے کہا "گویا قانون نے اجازت دے رکھی ہے کہ دھرم کے نام پر جس کو چاہو پکڑ کر ذبح کر ڈالو؟"

"یہ بات نہیں ہے ہمت سنگھ جی!" مسٹر بھنڈاری نے کہا "بعض معاملات میں قانون کو چشم پوشی کرنی پڑتی ہے۔ بہرحال، یہ ایک لمبی بحث ہے۔ آپ ہماری مجبوریوں کو نہیں سمجھ سکیں گے۔ ہم تو کٹھ پتلیاں ہیں۔ دوسروں کی انگلیوں کے اشاروں پر ناچنے والے۔ ہمارے پاس تو اتنے اختیارات بھی نہیں ہیں کہ میلے میں آنے والوں کو پہاڑیوں میں داخل ہونے سے روک سکیں۔"

"حیرت ہے، آپ اختیارات کی بات کررہے ہیں۔ مجبوریوں کا رونا رو رہے ہیں" میں نے چڑ کر کہا "ہندوستان دنیا کا واحد ملک ہے جہاں پولیس والوں کے پاس لامحدود اختیارات ہیں۔ ایک معمولی سا کانسٹیبل بھی کسی راجا کو سڑک پر ننگا کرسکتا ہے اور۔"

"آپ اس بحث میں مت پڑیں ہمت سنگھ جی!" بھنڈاری نے مجھے ٹوک دیا۔

"ٹھیک ہے۔ یہ آپ کا مسئلہ ہے" میں نے کہا "ابھی ٹھاکر جی نے بتایا تھا کہ آپ ہم سے کچھ پوچھنا چاہتے ہیں۔"

"جی ہاں!" بھنڈاری سنبھل کر بیٹھ گیا "آپ لوگ بھی وہاں موجود تھے اور آپ لوگوں نے مندر میں ڈکیتی کی واردات کو ناکام بنایا تھا جس میں دو سادھو ہمارے کانسٹیبل ایک مرد اور ایک عورت۔ ان کے علاوہ بھی تین چار لوگ ہلاک ہوئے تھے۔"

"ہمارا ان ہلاکتوں سے کوئی تعلق نہیں ہے" میں نے کہا۔

"میں ان ہلاکتوں سے آپ کا کوئی تعلق ثابت کرنے کی کوشش نہیں کروں گا" بھنڈاری مسکرایا "لیکن مجھے کچھ اطلاعات پہنچی ہیں ان کے مطابق آپ کو معلوم تھا کہ وہاں اس قسم کی کوئی واردات ہونے والی ہے اور اس سے کئی دن پہلے آپ نے دھول پور کے پنڈت سوبھراج نامی ایک شخص کو انسپکٹر پانڈے کے حوالے کیا تھا۔ اس کا اس معاملے سے کیا تعلق تھا؟"

"یہ بات آپ اس سے کیوں نہیں پوچھ لیتے؟" میں نے چبھتی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"ضرور پوچھ لیتا" بھنڈاری بولا "بشرطیکہ وہ یہاں ہوتا۔"

"کیا مطلب؟" میں چونک گیا۔

"آج صبح سویرے ایک سنتری کو قتل کرکے وہ حوالات سے فرار ہوگیا ہے" بھنڈاری نے جواب دیا۔

"اوہ!" میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد میں نے کہا "بات دراصل یہ ہے مسٹر بھنڈاری" میں نے اس کے چہرے پر نظریں جمادیں "ہمیں دارا نامی ایک ایسے آدمی کی تلاش تھی جو ہمارے ساتھ فراڈ کرچکا ہے۔ اس نے جے پور میں ٹھاکر جی کے ریسٹورنٹ کو بھی آگ لگوا کر تباہ کردیا تھا۔ ہم اس کی تلاش میں تھے۔ ہمیں پتا چلا کہ وہ اپنے دو گرگوں کے ساتھ سادھوؤں کے بھیس میں سارسکا آیا ہوا ہے۔ ہم اس کی تلاش میں یہاں آئے تھے کہ بیچ میں گنگولی چوہدری والا واقعہ پیش آگیا۔ ہماری ایک دوست بھی اس لپیٹ میں آگئی جسے چھڑانے کے لیے ہمیں بہت کشٹ اٹھانا پڑا۔ بہرحال اس واقعے سے نمٹنے کے بعد ہم نے اپنے اصل کام کی طرف توجہ دی تو ہمیں پتا چلا کہ وہ سادھو دھول پور کے مندر میں چھپے ہوئے ہیں۔

"وہ تینوں سادھو ہمارے پہنچنے سے پہلے دھول پور پہنچ چکے تھے۔ ہمارا سامنا پنڈت سوبھراج سے ہوگیا جس نے انکشاف کیا کہ ان تین سادھوؤں میں ایک عورت بھی ہے۔ میں نے ذرا کھوج کی تو پنڈت سوبھراج کھل گیا۔ اس نے اس کے بارے میں کچھ ایسے سنسنی خیز انکشافات کیے کہ میں اس

چھوڑ نہیں سکتا تھا۔" میں چند لمحے خاموش رہنے کے بعد چتوڑگڑھ کی اس نوعمر لڑکی کے بارے میں بتانے لگا جو سوبھراج اور بلونت سنگھ کی ہوس کی بھینٹ چڑھ گئی تھی۔ اس تفصیل کے بعد میں نے واقعات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ "ان تین سادھوؤں میں ایک تو وہ خوبصورت دراز قامت لڑکی تھی جس کا نام امبر تھا۔ وہ ہماری ایک عزیزہ ڈاکٹر رادھا کی بھانجی تھی۔ دارا اور بلونت سنگھ نے اسے زبردستی اپنے ساتھ رکھا ہوا تھا۔ وہ ان دونوں کے ہاتھوں بلیک میل ہورہی تھی بالآخر بلونت سنگھ کے ہاتھوں ماری گئی۔ دوسرا ہمارا مطلوبہ آدمی دارا اور تیسرا بلونت سنگھ تھا۔ بلونت سنگھ خود نوعمر لڑکی کے قتل میں ملوث ہونے کے باوجود پنڈت سوبھراج کو بلیک میل کررہا تھا۔ پنڈت سوبھراج ہی نے ہمیں بتایا تھا کہ وہ تینوں سادھو پہاڑیوں میں کالی کے میلے میں گئے ہیں۔ وہاں ان کا کوئی بڑی واردات کرنے کا ارادہ ہے اور اس کے بعد وہ دھول پور واپس آکر چند روز اس کے ہاں پناہ لیں گے۔

"میں نے پنڈت سوبھراج کو انسپکٹر پانڈے کے حوالے کردیا کہ چتوڑگڑھ میں اس لڑکی کے قتل کے بارے میں تحقیقات کرے۔ اس سے اگلے ہی روز ٹھاکر جی اور ان کی دوست روپ متی کو حادثہ پیش آگیا اور ہم کئی روز تک کسی اور طرف توجہ نہیں دے سکے اور پھر ہم بھی سادھوؤں کے بھیس میں میلے میں پہنچ گئے۔ ہمارا بھیس بدلنے کا مقصد یہ تھا کہ دارا اور اس کے ساتھی ہمیں پہچان کر بھاگ نہ جائیں۔ اسی دوران میں وہاں انسپکٹر پانڈے سے ملاقات ہوگئی اور وہاں جو کچھ بھی ہوا وہ آپ کے آدمی آپ کو بتا چکے ہیں۔"

"کیا انسپکٹر پانڈے نے یہ بتایا تھا کہ وہ سرکاری ڈیوٹی پر ہے؟" میرے خاموش ہونے پر بھنڈاری نے پوچھا۔ انسپکٹر جارنی داس اس دوران میں خاموش ہی بیٹھا رہا تھا اور ٹھاکر نے بھی ہم دونوں کی گفتگو میں کوئی مداخلت نہیں کی تھی۔

"نہیں" میں نے جواب دیا "میں نے اس سے یہ سوال کیا تھا اور اس نے بتایا کہ وہ پوجا کے لیے آیا ہوا ہے۔ مندر کے پیچھے والے غار میں جو کچھ بھی ہوا تھا، اس کے بعد انسپکٹر پانڈے نے اس خزانے کی حفاظت کی ذمے داری لے لی تھی اور مجھے اطمینان بھی ہوگیا تھا کہ اب وہاں ایسی کوئی گڑبڑ نہیں ہوسکے گی۔ اسی دوران میں رات کو ہماری یہ دوست" میں نے جاگنی کی طرف اشارہ کیا "پہاڑی سے گر کر زخمی ہوگئی اور انسپکٹر پانڈے نے بڑی مہربانی کی کہ ہمیں اپنی جیپ میں یہاں بھیج دیا۔"

میری اس کہانی میں تھوڑا سا جھوٹ بھی شامل تھا، دارا اور بلونت سنگھ کے بارے میں۔ کیونکہ ان دونوں کے بارے میں اگر اصل بات بتادی جاتی تو ہمارے لیے کچھ پیچیدگیاں پیدا ہوسکتی تھیں۔ بلونت سنگھ اگرچہ ٹھاکر کے ہاتھوں اپنے انجام کو پہنچ چکا تھا لیکن میں نے اس کی ہلاکت بھی پولیس کے کھاتے میں ڈال دی تھی۔ وہاں قانون بھی بے بس ہوگیا تھا تو ہمیں اپنے آپ کو اس معاملے میں ملوث کرنے کی کیا ضرورت تھی۔

اے سی پی بھنڈاری اور انسپکٹر جارنی داس کافی دیر تک مجھ سے اور ٹھاکر سے سوالات کرتے رہے۔ شاید ان کا خیال تھا کہ ہم بھی انسپکٹر پانڈے کے ساتھ اس ڈکیتی میں ملوث ہوسکتے ہیں۔

"مسٹر بھنڈاری!" میں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا "پہاڑیوں میں لگنے والا یہ میلا کسی سرکاری ریکارڈ میں نہیں ہے۔ آپ کا قانون بھی اس سے قطعی لاعلم ہے۔ تین دنوں کے دوران میں ان پہاڑیوں میں کم از کم دس افراد ہلاک ہوچکے ہیں۔ تین کو تو کالی کے قدموں میں ذبح کیا گیا اور باقی پولیس یا انسپکٹر پانڈے اور اس کے آدمیوں کے ہاتھوں مارے گئے۔ قانون ان دس ہلاکتوں کو نظرانداز کررہا ہے تو مندر میں ڈکیتی کی واردات کو اتنی زیادہ اہمیت کیوں دی جارہی ہے۔ کیا لوٹی جانے والی وہ دولت دس گیارہ انسانی جانوں سے زیادہ قیمتی ہے؟"

"میلا ریکارڈ پر نہیں ہے لیکن کالی کا مندر اپنا وجود رکھتا ہے" بھنڈاری نے جواب دیا "ہم میلے کے حوالے سے ان ہلاکتوں کو سرکاری کاغذات پر نہیں لاسکتے لیکن مندر میں ہونے والی ڈکیتی کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ اس کی تحقیقات تو ہمیں کرنی پڑے گی۔ چار پانچ پنڈت اس وقت بھی میرے دفتر کے سامنے دھرنا دے کر بیٹھے ہوئے ہیں۔ آپ ان پنڈتوں اور پجاریوں کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ انسانی زندگی ان کے نزدیک کوئی معنی نہیں رکھتی۔ دولت کو ان کے دھرم میں سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ یہ اس کی پوجا کرتے ہیں۔ کالی کے اس مندر میں تین پنڈتوں کو موت کے گھاٹ اتارا جاچکا ہے۔ ان کے خلاف کوئی احتجاج نہیں کیا گیا لیکن دولت لٹ جانے سے ان کی مایا مری جارہی ہے۔"

"ہم اس سلسلے میں آپ کی کیا خدمت کرسکتے ہیں" ٹھاکر نے پہلی مرتبہ زبان کھولی "ہم جو کچھ جانتے تھے وہ آپ کو بتادیا۔ ہم کسی کے دل کا حال تو نہیں جانتے۔ ہمیں کیا معلوم تھا کہ انسپکٹر پانڈے نے پہلے ہی سے ایسا کوئی منصوبہ

بنا رکھا ہے۔"

"ٹھیک ہے ٹھاکر جی!" بھنڈاری گہرا سانس لیتے ہوئے بولا "آپ لوگوں کو زحمت دی۔ اس کے لیے معذرت چاہتا ہوں" وہ اٹھ کر کھڑا ہوگیا اور مجھ سے ہاتھ ملاتے ہوئے بولا "اپنا خیال رکھنا ہمت سنگھ جی۔ گنگولی چوہدری کا زندہ بچ جانے والا آدمی انوپم تمہارے لیے کسی وقت خطرناک ثابت ہوسکتا ہے۔"

"شکریہ! میں خیال رکھوں گا" میں نے جواب دیا۔

ان کے جانے کے بعد بھی ہم دیر تک انسپکٹر پانڈے کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ مجھے واقعی بڑی شدید حیرت ہورہی تھی۔ پانڈے جیسا فرض شناس اور ذمے دار آفیسر۔ لیکن پھر دولت ایسی چیز ہے۔ جس کی چمک آنکھوں میں چکاچوند پیدا کردیتی ہے۔ بڑے بڑے نیک اور دیانت دار لوگ اس سنہری جال میں پھنستے ہیں تو نکل نہیں پاتے۔

پانڈے انسپکٹر تھا۔ اس کی تنخواہ بھی محدود ہوگی اور وہ رشوت بھی نہیں کھاتا تھا۔ اس کا بھی دل چاہتا ہوگا کہ اس کے پاس سب کچھ ہو۔ وہ چاہتا تو رشوت لے کر اپنی خواہشات پوری کرسکتا تھا لیکن اس نے یہ راستہ اختیار نہیں کیا اور پھر مندر میں زروجواہر کے انبار دیکھ کر شاید اس کی نیت بدل گئی تھی۔

ہوسکتا ہے اس نے پہلے سے مندر کو لوٹنے کا منصوبہ بنا رکھا ہو اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ دولت کا ڈھیر دیکھ کر اچانک ہی اس کے دل میں اسے حاصل کرنے کا خیال پیدا ہوا ہو۔ اس نے اپنے بھروسے کے آدمیوں سے بات کی اور وہ بھی آمادہ ہوگئے۔ آسانی سے ہاتھ آنے والی دولت سے کون انکار کرسکتا ہے۔

بہرحال جو کچھ بھی ہوا تھا' میرے خیال میں بہت برا ہوا تھا۔ انسپکٹر پانڈے کو دیکھ کر میرے ذہن میں ایک مثالی پولیس آفیسر کا جو خوبصورت تصور قائم ہوا تھا وہ ایک ہی جھٹکے میں چکناچور ہوگیا تھا۔

ہم تقریباً ایک ہفتہ مزید سارسکا میں رہے۔ ٹھاکر کی تباہ شدہ پجارو پہلے ہی جے پور بھیج دی گئی تھی۔ جانگی اور روپ متی اب بڑی حد تک ٹھیک ہوچکی تھیں۔ ان کے زخم مندمل ہورہے تھے اور اب انہیں صرف آرام کی ضرورت تھی اور یہ آرام گھر جاکر بھی ہوسکتا تھا۔

اور پھر ایک روز صبح سویرے ہم سب لوگ بس پر سوار جے پور جارہے تھے۔

○☆○

زندگی میں جیسے ٹھہراؤ آگیا تھا۔ کوئی ہلچل نہیں تھی کوئی ہنگامہ نہیں تھا۔ وہی معمول کے شب وروز۔ وہی بیزار کن یکسانیت۔ لگتا تھا جیسے زندگی کی ساری دلچسپیاں ختم ہوگئی ہوں۔

جے پور آنے کے بعد جو ہنگامے شروع ہوئے تھے وہ ختم ہوگئے تھے۔ روپ متی کی زندگی میں جو بھونچال آیا تھا وہ گزر گیا تھا۔ اس کا دشمن ختم ہوگیا تھا لیکن میرا دشمن ایک بار پھر مجھے نچا دے گیا تھا۔

ہم پھر ٹھاکر کی اس ٹیلے والی حویلی میں ٹھہرے ہوئے تھے اور اس مرتبہ تو بلا بھی ہمارے ساتھ تھی۔ ہماری عدم موجودگی میں روپ متی کی ملازمہ مندری یہیں رہ رہی تھی۔ واپس آئے تو روپ متی اور جانگی کو زخمی دیکھ کر وہ پریشان ہوگئی۔ سارسکا میں بلا نے ان دونوں کی بڑی خدمت کی تھی اور اب یہ ذمے داری مندری نے سنبھال لی تھی۔ ٹھاکر کا ایک دوست ڈاکٹر بھی ہر دوسرے دن انہیں دیکھ لیتا تھا۔

میں دن بھر یا تو گھر میں ہی پڑا رہتا یا... ٹھاکر کے ریسٹورنٹ یا ہوٹل میں جاکر بیٹھ جاتا۔ ٹھاکر نے کہا تھا کہ میں ان دونوں میں سے ایک جگہ سنبھال لوں اور مستقل یہیں رہوں لیکن میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ میں تو صرف چند روز اور یہاں رہنا چاہتا تھا۔ مجھے ایک ایسے آدمی کی ضرورت تھی جو اس سلسلے میں میری مدد کرسکے۔ مجھے یقین تھا کہ دارا مندروں کے حصار سے باہر نہیں نکلا تھا۔ اسے کسی مندر ہی میں پناہ مل سکتی تھی اور کسی ایسے آدمی کی تلاش میں' میں نے جے پور کے مندروں کے چکر لگانا شروع کردیے۔ کبھی بلا میرے ساتھ ہوتی اور کبھی میں اکیلا ہی مندروں میں گھومتا رہتا۔

ہمیں سارسکا سے واپس آئے ہوئے شاید دسواں دن تھا۔ اس وقت رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ میں اس وقت ٹھاکر کے ریسٹورنٹ میں بیٹھا ہوا تھا۔ ریسٹورنٹ میں اس وقت زیادہ رش نہیں تھا۔ اِکّا دُکّا میزوں پر ہی گاہک بیٹھے ہوئے تھے۔

کچن کی طرف سے شور کی آواز سنائی دی تو میں کاؤنٹر سے اٹھ کر کچن میں چلا گیا۔ کک اور اس کا اسسٹنٹ آپس میں کسی بات پر جھگڑ پڑے تھے۔ مجھے دیکھ کر وہ دونوں ایک دوسرے کے خلاف شکایت کرنے لگے تھے۔ اسسٹنٹ ایک نوعمر لڑکا سا تھا۔ داڑھی مونچھ ابھی نہیں آئی تھی۔ گوری رنگت اور گول مٹول سا چہرہ' کک نے اس کے گال پر چٹکی بھری تھی جس پر وہ لڑکا ہتھے سے اکھڑ گیا تھا۔ میں نے ڈانٹ ڈپٹ کر دونوں کا غصہ ٹھنڈا کیا۔ کچن سے باہر آتے ہوئے بائیں طرف کی ایک میز پر ایک جوڑے کو بیٹھے دیکھ کر میں ٹھٹک گیا۔ جب میں کچن میں گیا تھا تو یہ میز خالی تھی۔ یہ گاہک میرے بعد یہاں آکر بیٹھے تھے اور وہ دونوں آمنے سامنے کی کرسیوں پر بیٹھنے کے بجائے ایک دوسرے کے برابر کرسیوں پر بیٹھے تھے اور مرد نے اپنا ایک ہاتھ عورت کی پشت پر رکھا ہوا تھا۔

اس عورت کی عمر تیس اور پینتیس کے درمیان رہی ہوگی۔ گوری رنگت پر نیلے رنگ کی ساڑی جچ رہی تھی۔ وہ سڈول جسم کی مالک ایک حسین عورت تھی۔ ڈارک براؤن لمبے دراز بال شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔

اس کے ساتھ بیٹھے ہوئے مرد کی عمر بھی پینتیس اور چالیس کے درمیان رہی ہوگی اور میں ٹھٹکا اسی کو دیکھ کر تھا۔ اس کے سر کے بال چھوٹے تھے جو سلیقے سے بنے ہوئے تھے۔ اس کی رنگت گندمی اور آنکھیں نیلی تھیں۔ اس نے پینٹ شرٹ پہن رکھی تھی۔ قمیص کے بٹن کھلے ہوئے تھے اور سونے کی ایک چین گلے میں پڑی ہوئی تھی۔ لاکٹ کی جگہ تقریباً ایک انچ لمبی اور نصف انچ چوڑی سونے کی پلیٹ تھی جس پر کچھ کندہ تھا۔ اس کی گردن پر ذرا دائیں طرف ایک انچ لمبے زخم کا نشان تھا۔

اس شخص نے بھی میری طرف سرسری سے انداز میں دیکھا۔ عورت کی پشت سے ہاتھ ہٹالیا اور ویٹر کو اشارہ کیا جو اسی طرف آرہا تھا۔

میں کاؤنٹر کے پیچھے اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا اور بار بار اس شخص کی طرف دیکھنے لگا۔ یہاں سے اس کا چہرہ اگرچہ صاف دکھائی نہیں دے رہا تھا لیکن نہ جانے کیوں میرے دل میں ایک الجھن سی پیدا ہوگئی تھی۔ مجھے لگ رہا تھا جیسے میں نے اس شخص کو پہلے بھی کہیں دیکھا ہو لیکن کچھ یاد نہیں آرہا تھا۔

میں اپنی سیٹ پر بیٹھا اس کے بارے میں سوچتا رہا۔ اس کی گردن پر زخم کا وہ نشان میرے ذہن میں الجھن سی پیدا کررہا تھا اور میں اس نشان کے حوالے سے کچھ یاد کرنے کی کوشش کررہا تھا۔

اور پھر میرے دماغ میں روشنی کا ایک جھماکا سا ہوا۔ مجھے یاد آگیا کہ زخم کا وہ نشان میں نے کس کی گردن پر دیکھا تھا۔ اس کے ساتھ ہی میرے ذہن میں پنڈت سوبھراج کا نام ابھرا تھا۔

میں آنکھیں بند کرکے چشمِ تصور سے پنڈت سوبھراج کو دیکھنے لگا۔ بات زیادہ پرانی تو نہیں تھی۔ چند روز پہلے ہی تو دھول پور میں پنڈت سوبھراج سے ملاقات ہوئی تھی اور میں بھلا اس ملاقات کو کیسے بھلا سکتا تھا۔ پنڈت سوبھراج کا پیکر میری نظروں کے سامنے گھوم گیا۔ مخصوص انداز میں بندھی ہوئی دھوتی' جسم کے بالائی حصے پر پیلے رنگ کی چادر جس پر جابجا لفظ "اوم" چھپا ہوا تھا۔ پیروں میں لکڑی کی کھڑاؤں' گنجا سر' ماتھے پر سفید قشقہ' اس سے ذرا اوپر درمیان سرخ ٹیکا اور دونوں رخساروں پر بھی اوپر سے نیچے سیندور سے لکیریں کھنچی ہوئی تھیں۔ اس کی آنکھیں سیاہ اور قدرے چھوٹی تھیں۔ دونوں کانوں میں چاندی کی بالیاں تھیں۔ وہ صورت ہی سے کٹر' متعصب اور کینہ پرور ہندو لگتا تھا۔ اس کی گردن پر ذرا دائیں طرف تقریباً ایک انچ لمبا پرانے زخم کا نشان بھی تھا۔

ویٹر کی آواز سن کر میں نے آنکھیں کھول دیں۔ وہ سمجھا تھا شاید مجھے نیند آرہی ہے۔ وہ کسی گاہک کا بل لے کر آیا تھا۔ سو کے نوٹ میں سے بل کی رقم کاٹ کر میں نے باقی پیسے پلیٹ میں رکھ دیے اور کاؤنٹر کے پیچھے سے نکل کر کچن کی طرف چل پڑا۔

ویٹر نے ان دونوں کی میز پر کافی سرو کردی تھی۔ میں ان کی طرف دیکھے بغیر کچن میں چلا گیا اور ایک ایسی جگہ پر کھڑا ہوگیا جہاں سے میں اس شخص کو دیکھ سکتا تھا لیکن میں اس کی نظروں میں نہیں آسکتا تھا۔

اس رخ سے روشنی اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ میں چند لمحے اس کی طرف دیکھتا رہا اور پھر میں اپنے آپ میں سنسنی کی لہریں سی دوڑتے ہوئے محسوس کرنے لگا۔ اب اس میں شبے کی کوئی گنجائش نہیں رہی تھی۔ وہ پنڈت سوبھراج ہی تھا لیکن اب اسے پنڈت نہیں کہا جاسکتا تھا۔ اس نے بڑی مہارت سے اپنا حلیہ تبدیل کیا تھا۔ بے ترتیب داڑھی مونچھیں صاف کردینے سے ہی اس کے چہرے پر بڑی تبدیلی آگئی تھی اور باقی کمی دوسری چیزوں نے پوری کردی تھی۔ اس کی بٹن جیسی آنکھیں اگرچہ کالی تھیں لیکن آج کل تو آنکھوں کی رنگت تبدیل کرنا بھی کچھ مشکل نہیں رہا تھا۔ نیلے رنگ کے کونٹیکٹ لینسز نے اس کی آنکھوں کی رنگت بھی بدل دی تھی۔ اس نے گنجے سر پر یقیناً وگ لگا رکھی تھی۔ چند روز میں بال اتنے بڑے نہیں ہوسکتے۔ اس کے کانوں میں اگرچہ بالیاں نہیں تھیں لیکن سوراخوں کے نشان صاف نظر آرہے تھے۔

وہ سوبھراج ہی تھا اور مجھے اس کی ہمت کی داد دینی

پڑی۔ ہم نے اسے سارسکا میں انسپکٹر پانڈے کے حوالے کیا تھا تاکہ کئی سال پہلے چتوڑ گڑھ میں سوبھراج اور اس کے ساتھیوں کے ہاتھوں ہلاک ہونے والی معصوم لڑکی کی ہلاکت کی تحقیقات کی جاسکے لیکن چند روز پہلے وہ سارسکا کے پولیس اسٹیشن میں ایک سنتری کو قتل کرکے حوالات سے بھاگ نکلا تھا۔ اسے تو اتنی دور چلے جانا چاہیے تھا کہ پولیس اس کی گرد کو بھی نہ پاسکے لیکن وہ جے پور میں عیش کررہا تھا جبکہ سارسکا یہاں سے صرف دو ڈھائی گھنٹوں کے فاصلے پر تھا۔ وہ واقعی حوصلہ مند آدمی تھا اور پھر یہ بات بھی تھی کہ پنڈتوں والا بھیس ختم کردینے سے اس کے حلیے میں زمین آسمان کا فرق آگیا تھا۔ اسے پنڈت سوبھراج کی حیثیت سے کوئی بھی نہیں پہچان سکتا تھا اور میری نظروں میں بھی وہ محض اتفاق سے آگیا تھا۔ اگر اس کی گردن پر زخم کا وہ نشان دکھائی نہ دیتا تو شاید میں بھی اسے نہ پہچان سکتا۔ زخم کا وہ پرانا نشان ہی میرے تجسس کا باعث بنا تھا اور میں نے اسے پہچان لیا تھا لیکن اب سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ میں بھی دو مرتبہ اس کے سامنے سے گزرا تھا۔ کہیں اس نے بھی تو مجھے نہیں پہچان لیا؟

میرے خیال میں اس نے میری طرف زیادہ توجہ نہیں دی تھی۔ دھول پور میں جب ہمارا آمنا سامنا ہوا تھا تو میں بھی سادھو کے بھیس میں تھا اور اب میرا حلیہ بھی اس سادھو سے بہت مختلف تھا۔ اس نے یقیناً مجھے نہیں پہچانا تھا۔ اگر پہچان لیا ہوتا تو وہ اس عورت کے ساتھ اس طرح اطمینان سے بیٹھا کافی کی چسکیاں نہ لے رہا ہوتا۔

میں ایسے لوگوں کے بارے میں خوب اچھی طرح جانتا تھا۔ جو لوگ کسی جرم میں پولیس کو مطلوب ہوں یا کسی اور وجہ سے پکڑے جانے کا خوف ہو یا کسی دشمن کی طرف سے وار کا اندیشہ ہو' ایسے لوگ لاکھ حلیہ بدل لینے کے باوجود چوکنا اور چوکس رہتے ہیں اور کسی مشتبہ شخص کو دیکھ کر وہاں ٹکنے کے بجائے فرار کا راستہ اختیار کرنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ میں خود بھی کئی مرتبہ ایسی صورتِ حال سے دوچار ہوچکا تھا۔

"کیا چاہیے سر' آپ کو کسی چیز کی تلاش ہے؟"

شیف کی آواز سن کر میں چونک گیا اور مڑ کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔

"اوہ' کچھ نہیں" میں نے بات بنائی "یونہی' ذرا تمہاری اس راج دھانی کا معائنہ کررہا تھا۔"

میری اس بات پر شیف بھی مسکرا دیا۔ کچن میں اور بھی کئی خانساماں اور دوسرے ملازم موجود تھے اور غالباً کسی کو یہ شبہ نہیں ہوا تھا کہ میں کچن میں کیوں آیا تھا۔ میں چند لمحے وہاں کھڑا اِدھر اُدھر دیکھتا رہا جیسے واقعی کچن کا معائنہ کررہا ہوں۔ پھر سامنے والے دروازے سے ہال میں آنے کے بجائے پہلو کے دروازے سے نکل گیا۔

اس طرف ایک تنگ سی راہداری تھی جو آگے چار کشادہ راہداری سے مل جاتی تھی جہاں اوپر ہوٹل میں آنے کے لیے زینہ تھا اور اس زینے کے نیچے ریسٹورنٹ میں جانے کے لیے بھی ایک چھوٹا دروازہ تھا۔

اس دروازے سے اندر داخل ہوا تو کاؤنٹر کے قریب ٹھاکر کو کھڑے دیکھ کر میں نے اطمینان کا سانس لیا۔

"اچھا ہوا تم آگئے۔ ورنہ آج ایک شکار ہاتھ سے نکل جاتا" میں نے اس کے قریب پہنچ کر سرگوشی کی۔

"کیا مطلب؟ کیا تم نے شکار کھیلنا بھی شروع کردیا ہے" ٹھاکر مسکرایا۔ "لیکن میں زیادہ دیر یہاں نہیں رکوں گا۔ باہر گاڑی میں بلا بیٹھی ہوئی ہے۔ اسے کچھ شاپنگ کرنی تھی۔ تین گھنٹے سے مجھے پورے شہر میں گھمارہی ہے۔ ایک چیز گھاٹ دروازے سے خریدی جارہی ہے تو دوسری چیز بھوانی سنگھ مارگ سے اور تیسری چیز کے لیے سوائے ڈیوڑھی کی طرف دوڑ لگائی جارہی ہے۔ اس لڑکی نے تو مجھے بری طرح تھکا دیا ہے۔ میں تو تمہیں یہ کہنے آیا تھا کہ بارہ بجے یہاں کے معاملات پرکاش کے حوالے کرکے گھر آجانا۔ ویسے تم کس شکار کی بات کررہے ہو۔ کسی لونڈیا سے تو تمہیں کوئی دلچسپی نہیں ہوسکتی۔ کون ہے وہ؟"

"پنڈت سوبھراج!" میں نے سرگوشی میں جواب دیا۔

"کیا؟" وہ اچھل پڑا۔

"چونکو نہیں" میں نے کہا "دائیں طرف سیکنڈ لاسٹ ٹیبل پر ایک کپل بیٹھا ہوا ہے۔ اس عورت کو تو میں نہیں جانتا کہ کون ہے مگر وہ آدمی پنڈت سوبھراج ہے۔ اس کا حلیہ بہت بدلا ہوا ہے۔ اسے پہچاننا آسان نہیں۔ میں نے تسلی کرلی ہے۔ وہ سوبھراج ہی ہے۔"

ٹھاکر نے بالکل غیر محسوس انداز میں اس طرف دیکھا اور پھر سرگوشی میں بولا۔

"تمہیں کوئی غلط فہمی تو نہیں ہوئی؟"

"نہیں' یہ وہی ہے" میں نے جواب دیا "تم یہاں کاؤنٹر پر بیٹھو اور گاڑی کی چابی مجھے دو۔"

"بلا گاڑی میں بیٹھی ہوئی ہے اور چابی بھی اسی کے لگی ہوئی ہے" ٹھاکر نے جواب دیا "لیکن اب اس سے ہمارا کیا واسطہ۔ وہ پولیس کی حراست سے بھاگا ہے۔ پولیس جانے

اور وہ جانے۔ بلونت سنگھ بھی اب ختم ہوچکا ہے اور۔"

"دارا ابھی زندہ ہے" میں نے اس کی بات کاٹ دی "ہوسکتا ہے یہ دارا کے بارے میں کچھ جانتا ہو۔ ایسے لوگ ایک دوسرے سے دور رہ کر بھی ایک دوسرے کے بارے میں بہت کچھ جانتے ہیں۔"

"سوچ لو۔ کسی نئی مصیبت میں مت پھنس جانا" ٹھاکر بولا۔

"مصیبتوں سے گزر کر ہی تو سکھ اور شانتی کا راستہ ملتا ہے" میں نے جواب دیا اور مزید وقت ضائع کیے بغیر دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔

پارکنگ ایریا کی بائیں طرف فٹ پاتھ کے ساتھ ٹھاکر کی نیلی کار کھڑی تھی۔ میں تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا اس طرف بڑھ گیا۔ بلا پسنجرز سیٹ پر بیٹھی ہوئی تھی۔ میں دروازہ کھول کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا تو وہ میری طرف دیکھ کر مسکرادی اور جب میں نے غور سے بلا کی طرف دیکھا تو میرے ہوش اڑ گئے۔

وہ ایک مختصر سا بلاؤز اور منی اسکرٹ پہنے ہوئے تھی۔ سیٹ پر بیٹھنے سے اس کا اسکرٹ سمٹ کر کچھ اور اوپر ہوگیا تھا۔ ایک براہمن پنڈت کی اس بیٹی کو دیکھ کر مجھے واقعی حیرت ہوتی تھی۔ اس کا بس چلتا تو کپڑوں کے یہ چیتھڑے بھی بدن پر سجانے کا تکلف نہ کرتی لیکن یہ غنیمت تھا کہ یہ گھر سے نکل کر کسی طرح ٹھاکر جیسے شریف انسان کے پاس پہنچ گئی تھی۔ اگر کسی اور کے ہتھے چڑھ جاتی تو اس کا حشر ہوچکا ہوتا۔

"تم گاڑی چلا لیتی ہو نا؟" میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"بہت اچھی طرح۔ بلکہ تم سے زیادہ اچھی طرح" بلا نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"تو ٹھیک ہے۔ تم اسٹیئرنگ سنبھالو۔ میں پچھلی سیٹ پر بیٹھتا ہوں" میں ڈرائیونگ سائڈ کا دروازہ کھول کر نیچے اترا' گھوم کر اور پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

"پچھلی سیٹ پر کیوں ہمت سنگھ جی۔ میرے قریب بیٹھنے کی ہمت نہیں ہے کیا؟" اس نے شوخ لہجے میں کہا اور اپنی سیٹ سے کھسک کر ڈرائیونگ سیٹ پر آگئی اور انجن اسٹارٹ کردیا۔

"انجن بند کردو اور اندر کی بتی بھی بجھادو۔" میں نے کہا۔

"کیا بات ہے ہمت سنگھ جی۔ روشنی سے ڈر لگ رہا ہے" بلا نے کہا۔ اس کے لہجے کی شوخی برقرار تھی "اور یہاں سے جانے کا ارادہ نہیں ہے کیا؟"

"فی الحال نہیں" میں نے جواب دیا۔

"تو پھر میں بھی پیچھے آجاؤں؟" اس نے کہا۔

"اس سیٹ پر کانٹے چبھ رہے ہیں کیا؟ آرام سے بیٹھی رہو" میں نے اسے ڈانٹ دیا۔

"ڈانٹنا بھی جانتے ہو" بلا ڈھٹائی سے مسکرائی پھر بولی "کیا بات ہے' ٹھاکر جی کا انتظار ہے کیا؟"

"نہیں" میں نے جواب دیا "ابھی تھوڑی دیر میں ایک عورت اور ایک مرد ریسٹورنٹ سے نکلیں گے۔ اگر وہ کسی ٹیکسی یا رکشا وغیرہ میں بیٹھے تو ان کا تعاقب کرنا ہے مگر بڑی ہوشیاری سے۔ انہیں شبہ نہ ہونے پائے۔"

"تمہیں دلچسپی کس سے ہے' عورت سے یا مرد سے؟" بلا نے کہا۔ پھر جلدی سے بولی "لیکن شاید میرا یہ سوال ہی غلط ہے۔ تمہیں کسی عورت سے دلچسپی کیوں ہونے لگی البتہ میں یہ ضرور پوچھوں گی کہ وہ مرد کون ہے؟"

"پنڈت سوبھراج" میں نے جواب دیا۔

"یہ کون صاحب ہیں؟" بلا نے پوچھا۔

"سارسکا میں ٹھاکر اور روپ متی کا ایکسی ڈنٹ ہونے سے ایک روز پہلے ہم' دارا اور بلونت سنگھ کی تلاش میں دھول پور گئے تھے۔ بلونت سنگھ وغیرہ تو ہمارے پہنچنے سے پہلے ہی وہاں سے نکل چکے تھے البتہ پنڈت سوبھراج سے ایک یادگار ملاقات ہوگئی تھی اس نے کچھ ایسے انکشافات کیے تھے کہ ہمیں اسے پولیس کے حوالے کرنا پڑا اور اس روز اسپتال میں اے سی پی بھنڈاری نے تمہارے سامنے ہی بتایا تھا کہ پنڈت سوبھراج ایک سنتری کو قتل کرکے حوالات سے فرار ہوگیا تھا اور یہی پنڈت سوبھراج اس وقت ایک حسین عورت کے ساتھ ریسٹورنٹ میں بیٹھا کافی پی رہا ہے۔"

"میری ایک بات مانو ہمت سنگھ جی!" بلا میری طرف دیکھتے ہوئے بولی "اپنا جیون بلاوجہ جوکھوں میں مت ڈالو۔ یہ معاملہ پولیس کے لیے چھوڑ دو۔ وہ خود ہی اسے تلاش کرلیں گے۔ تم کیوں کشٹ اٹھاتے ہو؟"

"وہ چاہے چھ قتل اور بھی کردے تو مجھے پروا نہیں ہوگی لیکن یہ واحد شخص ہے جس سے دارا کے بارے میں کچھ معلوم کیا جاسکتا ہے" میں نے جواب دیا۔

"اوہ!" بلا نے کہا "پھر تو میں جہنم تک اس کا پیچھا کرنے کو تیار۔"

"جہنم میں نہیں۔ ہمیں اس دنیا ہی میں اس کو پکڑنا ہے" میں نے اس کی بات کاٹ دی۔

بلا سے باتیں کرتے ہوئے میں باربار ریسٹورنٹ کے دروازے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ شاید بلا نے سوچا ہو کہ میں اس کے لباس کی وجہ سے اسے نظرانداز کرنے کے لیے پچھلی سیٹ پر آیا ہوں لیکن میرے پچھلی سیٹ پر آنے کی دو وجوہات تھیں۔ سوبھراج اتنا بے پروا بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ اپنے تعاقب پر توجہ نہ دیتا۔ مجھے ڈرائیونگ سیٹ پر دیکھ کر اسے کسی قسم کا شبہ ہو سکتا تھا۔ اگر ایک خوبصورت لڑکی پچھلی آرہی ہو تو اس پر زیادہ شبہ نہیں ہوتا۔ پچھلی سیٹ پر بیٹھنے کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ وہ مجھے نہ دیکھ پائے اس لیے میں نے کار کی اندر کی بتی بھی آف کروادی تھی۔

بیس منٹ گزر گئے۔ اس دوران میں دو تین گاہک ریسٹورنٹ میں داخل ہوئے تھے اور ایک جوڑا باہر بھی نکلا تھا۔ پانچ منٹ اور گزر گئے۔ ریسٹورنٹ کا دروازہ ایک بار پھر کھلا اور اس مرتبہ سوبھراج کو اس عورت کے ساتھ برآمد ہوتے دیکھ کر میں سنبھل کر بیٹھ گیا۔

"یہی ہیں وہ" میں نے دھیمے لہجے میں بلا کو بتایا "لیکن ابھی انجن اسٹارٹ مت کرنا۔ انہیں کچھ دور نکل جانے دو۔"

بلا بھی سنبھل کر بیٹھ گئی۔ میرا خیال تھا کہ وہ عورت اور سوبھراج سڑک پر آکر یا تو وہیں رک کر کسی ٹیکسی وغیرہ کا انتظار کریں گے یا مخالف سمت میں تقریباً ڈیڑھ سو گز آگے ٹیکسی اسٹینڈ کی طرف جائیں گے لیکن وہ ہال سے نکلنے کے بعد پارکنگ ایریا کی طرف مڑ گئے اور سرخ رنگ کی ایک فیاٹ کار کے قریب رک گئے۔ عورت نے اپنے کندھے پر لٹکے ہوئے پرس میں سے چابیوں کا گچھا نکال کر سوبھراج کی طرف بڑھادیا۔ سوبھراج ڈرائیونگ سائڈ کا دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گیا اور جھک کر پسنجرز سیٹ کے دروازے کی لاک ناب اٹھادی۔ وہ عورت بھی دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گئی۔

دو منٹ بعد سرخ فیاٹ پارکنگ ایریا سے نکل کر سڑک پر آگئی اور ہماری گاڑی کے قریب سے گزر گئی۔ میں جھک کر نیچے ہو گیا تھا لیکن ان دونوں میں سے کسی نے ہماری کار کی طرف نہیں دیکھا تھا۔

بلا نے کار کا انجن اسٹارٹ کر کے اسے ہلکے سے جھٹکے سے آگے بڑھادیا۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ ٹھاکر ریسٹورنٹ کے دروازے میں کھڑا تھا۔

اس وقت پونے بارہ کا وقت تھا۔ اسٹیشن روڈ پر اچھا خاصا ٹریفک تھا اور بلا بڑی ہوشیاری سے ڈرائیونگ کر رہی تھی۔ اس نے سرخ فیاٹ اور اپنے درمیان تقریباً ڈیڑھ سو گز کا فاصلہ رکھا تھا اور میں سمجھتا تھا کہ کسی کے تعاقب کے لیے یہ بہت مناسب فاصلہ تھا۔

سوبھراج کی کار ایک اور سڑک پر گھوم کر ہوٹل سنہ اشوک کی طرف جانے والی سڑک پر مڑ گئی۔ اس سڑک پر کچھ ٹریفک تھا اس لیے تعاقب کا شبہ نہیں ہو سکتا تھا۔ اشوک ہوٹل سے آگے سوائے جے سنگھ ہائی وے سے واٹرورکس روڈ کی طرف مڑتے ہی بلا سنبھل کر بیٹھ گئی۔ اس نے درمیانی فاصلہ کچھ اور بڑھادیا۔ اس سڑک پر ٹریفک برائے نام ہی تھا اور اندیشہ تھا کہ سوبھراج کو تعاقب کا شبہ ہو جائے۔

واٹرورکس روڈ آگے جا کر نروان مارگ سے مل جاتی تھی لیکن وہاں تک جانے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ سوبھراج کی فیاٹ دائیں طرف ایک ذیلی سڑک پر مڑ گئی۔ اس طرف رہائشی بنگلے تھے اور کئی گلیاں تھیں۔

بلا نے کار اس طرف موڑنے سے پہلے ہی ہیڈلائٹس بجھادیں۔ اگلی کار ہم سے تقریباً دو سو گز آگے تھی اور پھر وہ کار ایک گلی میں مڑ گئی۔ بلا نے عقلمندی یہ کی کہ کار گلی میں گھمانے کے بجائے موڑ پر روک لی اور انجن بند کر دیا۔

میں کار سے اتر کر تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے کار والے بنگلے کی دیوار کی آڑ سے دوسری طرف جھانکنے لگا۔ تقریباً پچاس گز آگے وہ کار ایک بنگلے کے سامنے رکی ہوئی تھی۔ اس کی ہیڈلائٹس روشن تھیں اور وہ عورت کار سے اتر کر بنگلے کا گیٹ کھول رہی تھی۔

سرخ فیاٹ بنگلے میں داخل ہو گئی اور گیٹ بند ہو گیا۔ میں گلی میں چلتے ہوئے اس بنگلے کے سامنے سے گزرا اور تھوڑی دور آگے جانے کے بعد واپس آگیا۔ بنگلے کے گیٹ اور برآمدے کی بتی نہیں جلائی گئی تھی لیکن برآمدے کے ساتھ دائیں طرف والی ایک کھڑکی میں روشنی نظر آرہی تھی۔

وہ گلی کے موڑ سے چوتھا بنگلا تھا۔ واپس آکر میں گاڑی میں بیٹھ گیا۔ بلا نے میرے بیٹھتے ہی انجن اسٹارٹ کر دیا تھا۔

"آگے والی گلی میں موڑ لو" میں نے اشارہ کیا۔

کار اس گلی سے آگے نکل کر بنگلے کی پچھلی والی گلی میں مڑ گئی۔ گلی کے اختتام پر دائیں بائیں سڑک تھی اور سامنے پارک تھا۔ میرے اشارے پر بلا نے کار دائیں طرف موڑ کر پارک کے جنگلے کے ساتھ ایک درخت کے نیچے روک کر انجن بند کر دیا۔

"تم کار ہی میں بیٹھی رہو۔ ڈرو گی تو نہیں؟" میں نے اپنی

طرف کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

"اب مجھے ڈر نہیں لگتا اور اس وقت تو۔" اس نے ڈیش بورڈ کا خانہ کھول کر اس میں رکھا ہوا پستول نکال لیا اور پر اعتماد لہجے میں بولی "اور اس وقت اگر کسی نے میرے قریب آنے کی کوشش کی تو گولی سے اڑادوں گی۔"

"یہ پستول تمہارے پاس کہاں سے آیا؟" میں چونک گیا۔

"ٹھاکر جی نے رکھا تھا اور مجھے بھی بتادیا تھا" بلا نے مسکرا کر جواب دیا۔

میں کار سے اتر آیا۔ بلا نے دروازہ اندر سے لاک کر کے کار کی پارکنگ لائٹ بجھادی اور سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا کر نیم دراز ہو گئی۔ پستول اس نے گود میں رکھ لیا تھا۔ اس کے پاس پستول کی موجودگی سے مجھے بھی اطمینان ہو گیا تھا۔

میں گلی میں چلتے ہوئے اس بنگلے کی پشت پر آگیا۔ سوبھراج اور اس عورت کے بارے میں، میں اب بھی الجھن کا شکار تھا۔ میرے لیے یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ ان دونوں کا آپس میں کیا تعلق ہے۔ ریسٹورنٹ میں ان دونوں کو دیکھ کر میں یہی سمجھا تھا کہ وہ کوئی شکاری عورت ہے لیکن کار میں بیٹھنے سے پہلے اس عورت نے پرس میں سے کار کی چابی نکال کر جس طرح سوبھراج کے حوالے کی تھی اس سے اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ ان کے تعلقات نئے نہیں ہیں۔ وہ پہلے سے ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔ سوبھراج تو دھول پور میں رہتا تھا۔ یہاں کسی عورت سے اس کا کیا تعلق؟ میں جیسے جیسے سوچتا رہا، میرا ذہن الجھتا گیا۔

بنگلے کی عقبی دیوار زیادہ اونچی نہیں تھی۔ اندر کی طرف ناریل کے دو چار درخت بھی نظر آرہے تھے۔ میں دیوار کے قریب رک کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ سامنے والی قطار کے بنگلوں کی پشت بھی اسی طرف تھی۔ یوں بھی رات کے ساڑھے بارہ بج رہے تھے۔ گلی میں سناٹا تھا اور تاریکی بھی۔

میں نے جھک کر پنڈلی پر بندھے ہوئے خنجر کی موجودگی کو محسوس کیا۔ میرا پرانا خنجر تو کالی کے مندر والی پہاڑیوں ہی میں کہیں گر گیا تھا اور جے پور آنے کے بعد مجھے ایک نیا خنجر خریدنا پڑا تھا۔

دیوار پر چڑھنے اور دوسری طرف کودنے میں مجھے زیادہ دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ یہاں کافی کھلی جگہ تھی اور جا بجا گارڈینیا کے پودے لگے ہوئے تھے جن کی شاخیں اوپر سے کاٹ کر چھتریوں جیسی شکل دے دی گئی تھی۔ زمین پر خشک پتے بکھرے ہوئے تھے۔

بنگلے کے دونوں طرف کشادہ گلیارے سے تھے اور وہاں بھی دیواروں کے ساتھ ساتھ پودے لگے ہوئے تھے۔ پچھلی طرف غالباً تین کمرے تھے لیکن تمام کھڑکیاں تاریک تھیں جس کا مطلب تھا کہ وہ دونوں سامنے والے رخ پر کسی کمرے میں تھے۔

اس طرف ایک دروازہ بھی تھا جو بند تھا۔ میں دبے قدموں اس دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔ خشک پتے میرے پیروں کے نیچے آکر چرمرا رہے تھے۔ میں بہت محتاط ہو کر آگے چلتا رہا۔

دروازہ اندر سے لاک تھا۔ میں دیوار کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا بائیں طرف والے گلیارے میں آگیا۔ اس طرف ایک کھڑکی میں روشنی تھی۔ اندر کی طرف اگرچہ نیلے رنگ کا پردہ پڑا ہوا تھا لیکن ایک طرف چند انچ کے قریب پردہ ہٹا ہوا تھا۔ میں نے شیشے سے آنکھ لگادی۔

یہ بیڈ روم تھا۔ وہ عورت ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے اسٹول پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کی پشت میری طرف تھی لیکن آئینے میں اس کا سامنے کا رخ نظر آرہا تھا۔

سوبھراج بیڈ کی پٹی پر ٹکا ہوا تھا۔ وہ دونوں آپس میں کچھ باتیں کر رہے تھے لیکن ان میں کسی کی آواز زیادہ اونچی نہیں تھی اس لیے الفاظ سمجھ میں نہیں آرہے تھے۔

وہ عورت اپنے بدن پر سجے ہوئے زیور اتار رہی تھی۔ پہلے اس نے کانوں کے جھمکے اتار کر اپنے سامنے ڈریسنگ ٹیبل پر رکھے پھر نیکلیس اتارا اور آخر میں چوڑیاں اور انگوٹھیاں اتار کر رکھ دیں۔ سر کو مخصوص انداز میں حرکت دے کر بالوں کو ہلکا سا جھٹکا دیا اور برش پھیرنے لگی۔

"تم کپڑے بدل لو۔ میں کچن میں جارہا ہوں۔ چائے کا موڈ ہو رہا ہے۔" سوبھراج یہ کہتے ہوئے اٹھ گیا۔ اس مرتبہ اس کی آواز بلند تھی اور الفاظ میری سمجھ میں آگئے تھے۔

سوبھراج کمرے سے نکل گیا۔ وہ عورت بھی برش ڈریسنگ ٹیبل پر رکھ کر کھڑی ہو گئی اور ساڑی کے بل کھولنے لگی۔ اس نے ساڑی اتار کر پھینک دی اور پھر بلاؤز بھی اتار دیا۔ میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ گردن پر چیونٹیاں سی رینگتے ہوئے محسوس ہونے لگیں۔ وہ آئینے کے سامنے قدرے آگے جھک کر دائیں کندھے پر انگلی سے ٹٹول کر کچھ دیکھنے لگی پھر سیدھی ہوئی تو اس کا ہاتھ پٹی کوٹ پر پہنچ گیا۔

اور پھر ٹھیک اسی لمحے اپنے عقب میں خشک پتوں کے چرمرانے کی آواز سن کر میں تیزی سے پیچھے مڑا لیکن مجھے دیر

ہو چکی تھی۔ سوبھراج نے ڈنڈے سے میرے سر کو نشانہ بنانے کی کوشش کی تھی لیکن وار میرے بائیں کندھے پر پڑا اور میں بے اختیار کراہ اٹھا۔

اب بات میری سمجھ میں آگئی تھی۔ انہوں نے شاید کھڑکی کے قریب میری موجودگی کو محسوس کرلیا تھا اور سوبھراج نے بڑی ذہانت کا ثبوت دیتے ہوئے مجھے پھانسنے کی کوشش کی تھی۔ وہ عورت جانتی تھی کہ میں کھڑکی سے جھانک رہا ہوں۔ اس نے محض اس لیے کپڑے اتارنا شروع کردیے تھے کہ میں اس کی طرف متوجہ رہوں اور سوبھراج اپنا کام کرگزرے۔

سوبھراج نے دو سرا وار کرنے کے لیے ڈنڈا سر سے اوپر اٹھایا۔ میرے کندھے پر اگرچہ زوردار ضرب لگی تھی لیکن میں نے فوراً ہی اپنے آپ کو سنبھال لیا۔ اس نے جیسے ہی حملہ کیا، میں نے اس کا وار بائیں کلائی پر روکا اور دائیں ہاتھ سے اس کی بغل میں زوردار گھونسا رسید کردیا۔

سوبھراج اپنی جگہ سے تقریباً ایک فٹ اوپر اچھلا۔ ڈنڈا اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر گیا تھا۔ میں نے اس کی کلائی پکڑلی اور دوسرا گھونسا اس کی کہنی کے نیچے مارا۔ اس مرتبہ وہ کراہ اٹھا لیکن دوسرے ہی لمحے اس نے سنبھل کر میری پنڈلی پر ٹھوکر ماردی۔ وہ لیدر شوز پہنے ہوئے تھا۔ جوتے کی سخت ٹو ہتھوڑے کی طرح ہڈی پر لگی اور میں ناچ کر رہ گیا۔ سوبھراج نے اس موقع سے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور اچھل کر سائیڈ کک رسید کردی۔ میں نے کک روکنے کی کوشش کی تھی مگر کامیاب نہیں ہوسکا۔ ہتھوڑے جیسی ضرب میرے پہلو میں لگی اور میں لڑکھڑاتا ہوا دیوار سے ٹکرا گیا۔

یہ کک کھاتے ہی میرے دماغ میں جھماکا سا ہوا اور مجھے یاد آگیا کہ میرا مقابلہ کسی سڑک چھاپ غنڈے سے نہیں ایک ماہر مارشل آرٹسٹ سے تھا۔ دھول پور میں اس سے دو دو ہاتھ ہو چکے تھے۔

سوبھراج نے دوسری کک لگائی جسے میں نے بڑی پھرتی سے بلاک کیا۔ دوسرے ہی لمحے اس نے اچھل کر ایک اور کک لگائی لیکن میں نے اس کا یہ حملہ بھی ناکام بنادیا اور پھر وہ پے در پے کک پر کک لگاتا رہا اور میں اس کی ہر کک بلاک کرتا رہا اور بالآخر مجھے بھی جوابی کارروائی کا موقع مل گیا۔ میری پہلی راؤنڈ ہاؤس کک اس کے بائیں بازو پر کہنی اور کندھے کے درمیان لگی۔ وہ بری طرح بلبلا اٹھا۔ میں نے اسے سنبھلنے کا موقع نہیں دیا اور پے در پے اس پر حملے کرتا رہا۔ اس نے میری ایک دو کک بلاک کی تھیں لیکن اس کے باوجود اسے جوابی کارروائی کا موقع نہیں مل سکا۔

ہم دونوں ایک دوسرے پر حملے کرتے ہوئے بنگلے کے عقبی حصے میں آگئے تھے جہاں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر گارڈینیا کے تراشے ہوئے پودے لگے ہوئے تھے۔ یہاں پہنچتے ہی وہ فلائنگ کک لگانے کے لیے ہوا میں اچھلا لیکن میں نے اس کے دونوں پیر پکڑ کر ہوا میں ہی اچھال دیا۔ وہ قلابازی کھاتے ہوئے ایک پودے کے اوپر گرا اور شاخیں دبنے سے وہ دوسری طرف لڑھک گیا۔

میں سنبھل کر اس کے اوپر جا گرا اور اسے گھونسوں کی باڑھ پر رکھ لیا۔ سوبھراج کی پٹائی کرتے ہوئے میں اپنے استادوں کا دیا ہوا سبق بھول گیا تھا کہ ـــــ حریف کا مقابلہ کرتے ہوئے اپنا دماغ ٹھنڈا رکھو۔ اس کی پٹائی کے جوش میں مجھے اس وقت یہ بھی یاد نہیں رہا تھا کہ سوبھراج یہاں اکیلا نہیں ہے۔ اس کے ساتھ ایک عورت بھی تھی۔

میں سوبھراج کے سینے پر سوار تھا۔ ادھر میں نے اس کے جبڑے پر گھونسا مارا، ادھر میرے سر پر دھماکا ہوا۔ میرے چودہ طبق روشن ہوگئے۔ آنکھوں کے سامنے پہلے بجلی کا کوندا سا لپکا پھر رنگ برنگے ذرات ناچنے لگے۔ میں نے سر کو زور دار جھٹکا دیا۔ اس کے ساتھ ہی میرے نیچے دبے ہوئے سوبھراج نے مجھے ایک طرف اچھال دیا۔

میں اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کررہا تھا۔ اسی لمحے میں نے ایک ہیولے کو اپنی طرف لپکتے ہوئے دیکھا۔ وہ عورت دونوں ہاتھوں میں ڈنڈا اٹھائے مجھ پر حملہ آور ہورہی تھی۔ میرے سر پر بھی اسی نے ڈنڈے سے حملہ کیا تھا۔

اس مرتبہ میں نے ہاتھ اٹھا کر اس کا حملہ روکنے کی کوشش کی۔ ڈنڈا میرے ہاتھ پر لگتے ہوئے سر پر لگا اور اس مرتبہ میں اپنے حواس برقرار نہیں رکھ سکا اور میرا ذہن تاریکی میں ڈوبتا چلا گیا۔

میں شاید زیادہ دیر تک بے ہوش بھی نہیں رہ سکا تھا۔ ہوش میں آیا تو میں ایک کمرے میں قالین پر پڑا ہوا تھا۔ یہ غالباً ڈرائنگ روم تھا۔ کمرا خاصا بڑا تھا۔ صوفوں کے درمیان کھلی جگہ تھی۔ سامنے ایک صوفے پر سوبھراج کے ساتھ وہ عورت بھی بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے جسم پر پٹی کوٹ اور اوپر بلیک رنگ کا مختصر سا اِزویئر تھا۔ وہ اگرچہ خود بھی نہایت خطرناک شے تھی لیکن اس وقت سب سے زیادہ خطرناک چیز سیاہ رنگ کا وہ پستول تھا جو اس کے ہاتھ میں نظر آرہا تھا۔

مجھے ہوش میں آتے دیکھ کر سوبھراج ایک جھٹکے سے اٹھ

گیا اور میرے کولہے پر زوردار ٹھوکر رسید کردی۔

"میں نے تمہیں اس وقت دیکھ لیا تھا جب تم بنگلے کی عقبی دیوار سے اندر کودے تھے۔" اس کے لہجے میں ہلکی سی غراہٹ تھی "سب سے پہلے میں یہ جاننا چاہوں گا کہ تم کون ہو۔ ویسے شکل سے تم پولیس والے تو نہیں لگتے۔"

"پولیس کا خوف تو اسے ہوتا ہے جس نے کوئی جرم کیا ہو۔" میں نے جواب دیا "تمہارے اس جملے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ تم کسی معاملے میں پولیس کو مطلوب ہو اور میں یہ بھی بتا سکتا ہوں کہ تم پولیس سے کیوں خوف زدہ ہو پنڈت سوبھراج!"

"کیا؟" وہ اچھل پڑا۔ اس نے عورت کی طرف دیکھا اور پھر میرے جسم پر ٹھوکروں کی بارش کردی "تم میری اصلیت جانتے ہو۔ میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا لیکن اس سے پہلے میں یہ ضرور جاننا چاہوں گا کہ تم کون ہو؟"

"بہت جلد بھول گئے۔" میں نے جواب دیا "چند روز پہلے ہی تو دھول پور میں ہماری دھواں دھار ملاقات ہوئی تھی۔ میں نے تمہیں پولیس کے حوالے کیا تھا لیکن تم ایک سنتری کو قتل کرکے حوالات سے بھاگ نکلے۔ اس بدلے ہوئے حلیے میں تم پولیس کو تو دھوکا دے سکتے ہو، میری نظروں کو نہیں۔ میں نے تو تمہیں دیکھتے ہی پہچان لیا تھا۔"

"اوہ!" سوبھراج کا چہرہ دھواں ہوگیا۔ وہ چند لمحے گہری نظروں سے میری طرف دیکھتا رہا اور پھر دوسرے ہی لمحے وہ مجھ پر پل پڑا۔ اس مرتبہ اس کی ٹھوکریں زیادہ زوردار تھیں۔ ایک مرتبہ مجھے موقع مل گیا۔ میں نے اس کا پیر پکڑ کر زوردار جھٹکا دیا۔ وہ لڑکھڑا کر گرا۔ میں نے اس پر چھلانگ لگا کر اسے دبوچ لیا۔ اسی لمحے وہ عورت صوفے سے اٹھ کر میری طرف لپکی۔ اس نے پستول کے دستے سے میرے سر پر ضرب لگانے کی کوشش کی لیکن وار میرے کندھے پر پڑا۔ میں کراہ اٹھا اور سوبھراج کو میری گرفت سے نکلنے کا موقع مل گیا۔ اب وہ دونوں میری ٹھکائی کررہے تھے۔

"بس بس۔ بہت ہوچکی۔ اب چھوڑ دو اسے۔"

یہ آواز سن کر ان دونوں کے ہاتھ پیر مشینی انداز میں رک گئے اور اس آواز نے تو مجھے بھی چونکا دیا تھا لیکن اسی لمحے غالباً غیر ارادی طور پر سوبھراج کی ٹانگ حرکت میں آئی تھی۔ اس کی ٹھوکر میرے پہلو پر پڑی اور میں کراہ اٹھا۔

"میں نے کہا نا، بس کرو۔ بچے کی جان لوگے کیا؟" دروازے میں کھڑی ہوئی بملا نے کہا اور پھر اس عورت کو مخاطب کرکے بولی "اے۔ خچمک چھلو۔ اپنے ہاتھ سے پستول پھینک دو۔"

اس عورت نے پستول نال کی طرف سے پکڑ رکھا تھا اور وہ دستے سے میرے جسم پر ضربیں لگاتی رہی تھی۔ وہ بملا کو دیکھ کر یقیناً بدحواس سی ہوگئی تھی۔ جب کوئی ایسی صورتِ حال ہوتی ہے تو آدمی یقیناً کنفیوز ہوجاتا ہے اور کوئی سیدھی سادی بات بھی فوری طور پر اس کی سمجھ میں نہیں آتی اور وہ عورت بھی کچھ ایسی ہی صورت حال سے دوچار تھی کیونکہ پستول ابھی تک اسی انداز میں پکڑا ہوا تھا اور وہ اسے استعمال کرنے کا ارادہ بھی نہیں رکھتی تھی۔

اچانک فضا فائر کی آواز سے گونج اٹھی۔ اس کے ساتھ ہی کمرے میں اس عورت کی چیخ بھی ابھری تھی۔ بملا کی چلائی ہوئی گولی اس کے پیر سے تقریباً ایک فٹ دور قالین پر لگی تھی اور وہ عورت چیختے ہوئے اچھل کر وہاں سے دو قدم دور ہٹ گئی۔ اس کے ہاتھ سے پستول بھی چھوٹ کر گر گیا تھا۔

"چھی چھی۔" بملا اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی "کتنی بے شرم ہو تم۔ ایسے کپڑے پہن کر غیر مردوں سے کبڈی کھیلتی ہو۔ جاؤ۔ ڈھنگ کے کپڑے پہن کر آؤ۔" اس نے پستول سے سامنے والے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ اس عورت کے چہرے پر خوف کے ساتھ آنکھوں میں شدید الجھن کے تاثرات بھی تھے لیکن یہ بات اس کی سمجھ میں آگئی تھی کہ اسے جانے کو کہا گیا تھا۔ اس نے جیسے ہی قدم اٹھایا، بملا چیخ اٹھی "ارے نہیں۔ یہیں رک جاؤ۔ باہر جاکر کہیں تم کوئی گڑبڑ نہ کردو۔ اس صوفے پر بیٹھ جاؤ۔ بیٹھو۔"

بملا نے آخری لفظ اس قدر زور سے چیخ کر کہا تھا کہ وہ عورت بری طرح گڑبڑا گئی۔ اس نے صوفے پر بیٹھنے میں دیر نہیں لگائی تھی بلکہ وہ صوفے پر گر گئی تھی۔ اس کا چہرہ خوف کی شدت سے پیلا پڑ گیا تھا اور وہ ہولے ہولے کانپ رہی تھی۔

میں حیرت سے بملا کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ بہت کم گو لڑکی تھی اور بہت سنجیدہ گفتگو کرتی تھی۔ اس سے باتیں کرتے ہوئے مجھے حیرت ہوتی تھی کہ ایسی کم عمر لڑکی اس قدر سنجیدہ کیسے ہوسکتی ہے اور اس وقت تو وہ بالکل بدلی ہوئی لگ رہی تھی لیکن بہرحال، وہ جیسی بھی تھی اس وقت اس نے بازی پلٹ دی تھی۔

"اب تمہاری باری ہے ہمت سنگھ۔" وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولی "اس جعلی پنڈت کو اتنی مار لگاؤ کہ اپنا نام بھول جائے اور اس حرافہ کی اب تم فکر مت کرنا۔ یہ اپنی جگہ سے نہیں اٹھے گی۔"

میں اچانک ہی کھڑے کھڑے اپنی جگہ سے اچھلا اور ہوا میں گھوم گیا۔ اچھلتے ہی میں نے اپنی ایک ٹانگ سمیٹ لی تھی اور دوسری ٹانگ پھیلا کر زور دار کک لگائی۔ میرے پنجے کا نچلا حصہ سوبھراج کی گردن پر لگا اور وہ الٹ کر صوفے کے قریب گرا۔ میں اپنے آپ کو سنبھال کر دوبارہ اس کی طرف لپکا تو اس نے چیختے ہوئے دونوں ہاتھ اٹھا دیے۔

"ٹھہرو۔۔۔ ٹھہرو۔۔۔"

میں میکانکی انداز میں رک گیا۔

"میں نہیں جانتا تم کون ہو اور میرے پیچھے کیوں لگ گئے ہو۔" سوبھراج بولا "تم اپنے دوست کے ساتھ بلونت سنگھ کے بارے میں پوچھنے دھول پور میرے پاس آئے تھے اور اس وقت بھی تم نے میری پٹائی کردی تھی۔ اگر بلونت سنگھ سے تمہاری کوئی دشمنی ہے تو اس کا بدلہ مجھ سے کیوں لے رہے ہو۔ میں تو خود اس کا ڈسا ہوا ہوں۔"

"میں تو تمہیں بہت بہادر سمجھتا تھا۔" میں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا "اس روز دھول پور میں تم نے مارشل آرٹ کے بہت شان دار ہاتھ دکھائے تھے لیکن تم تو بالکل پھسپھسے نکلے۔ ایک ہی کک میں ناک آؤٹ ہوگئے۔"

"میں بلاوجہ کسی سے دشمنی نہیں چاہتا اور تمہیں تو میں جانتا بھی نہیں۔" سوبھراج نے جواب دیا "اگر تمہیں بلونت سنگھ سے کسی بات کا بدلہ لینا ہے تو وہ میرا بھی دشمن ہے۔ میری بربادی کا ذمے دار بھی وہی ہے۔ اگر تم چاہو تو ہم دونوں اس کے خلاف گٹھ جوڑ کرسکتے ہیں۔"

میری نظریں سوبھراج کے چہرے پر مرکوز تھیں۔ وہ اگرچہ نہایت کمینہ خصلت تھا لیکن میرے خیال میں اس وقت وہ مجھے دھوکا دینے کی کوشش نہیں کررہا تھا اور اس بات میں بھی کوئی شبہ نہیں تھا کہ اس کی بربادی کا ذمے دار بھی بلونت سنگھ ہی تھا۔ اس روز دھول پور میں سوبھراج نے اپنے بارے میں جو کچھ بتا دیا تھا اس سے یہ اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ ایک شریف انسان تھا لیکن بلونت سنگھ کی دوستی اسے غلط راستے پر لے گئی تھی اور وہ ایک سنگین جرم میں ملوث ہوگیا تھا۔ پولیس تو اس لڑکی کے قاتلوں کا سراغ نہیں لگا سکی تھی لیکن بلونت سنگھ اسے بلیک میل کرتا رہا تھا اور سوبھراج کو اس سے بچنے کے لیے پنڈت کا روپ دھارنا پڑا تھا لیکن بلونت سنگھ نے اسے دور دراز دھول پور جیسے گاؤں میں بھی تلاش کرلیا تھا۔

سوبھراج سے میری بھی کوئی دشمنی نہیں تھی۔ میں تو اس سے دارا کے بارے میں معلوم کرنا چاہتا تھا۔ کالا کے مندر والی پہاڑیوں کی طرف جانے سے پہلے دارا اور بلونت سنگھ تین چار روز سوبھراج کے پاس رہے تھے۔ ہوسکتا ہے بلونت یا دارا نے اس کے ساتھ کوئی پروگرام بنایا ہو۔ سوبھراج کی باتوں سے میں نے یہ اندازہ بھی لگالیا تھا کہ اسے ابھی تک بلونت سنگھ کی موت کا پتا نہیں چل سکا تھا۔

"ٹھیک ہے۔" میں نے کہا "میری بھی تم سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔ میں تو تم سے چند باتیں پوچھنا چاہتا تھا اور یہ باتیں خوشگوار ماحول میں بھی ہوسکتی ہیں۔ اٹھو۔ آرام سے بیٹھ جاؤ اور یہ بات ذہن میں رکھنا کہ اگر تم میں سے کسی نے کوئی گڑبڑ کرنے کی کوشش کی تو اس لڑکی کو گولیاں چلانے کا بہت زیادہ شوق ہے۔"

"کوئی گڑبڑ نہیں ہوگی۔" سوبھراج نے اٹھتے ہوئے میری طرف ہاتھ بڑھا دیا "سوبھراج دوستی کا بھوکا ہے۔ سچی اور کھری دوستی۔ دوست بن کر دکھاؤں گا اور تمہارے لیے اپنا جیون بھی قربان کردوں گا۔"

میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ بڑی گرم جوشی تھی اس کے انداز میں۔ میں نے اس کا ہاتھ چھوڑا تو وہ گردن سہلاتے ہوئے بولا۔

"بڑے کڑے ہاتھ ہیں تمہارے۔ میری تو ہڈیاں تک۔۔۔ کڑکڑا اٹھی ہیں۔ کہاں سے سیکھا؟"

"یہ فن سیکھنے کی ابتدا بنکاک سے ہوئی اور آخری سبق شاؤلن ٹیمپل سے حاصل کیا لیکن ابھی بہت کچھ سیکھنا چاہتا ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

"شاؤلن ٹیمپل!" وہ اچھل پڑا "میں بھی شاؤلن ٹیمپل جانا چاہتا تھا لیکن بیڑا غرق ہو بلونت سنگھ کا۔ اس نے مجھے دلدل میں دھکیل دیا۔ پتا نہیں کیسے کیسے سپنے دیکھے تھے۔ سب چکنا چور ہوگئے۔"

"ایسا ہوتا ہے۔" میں نے کہا "آدمی جو سوچتا ہے، ہمیشہ پورا نہیں ہوتا۔"

"ایک منٹ۔" وہ بولا "اگر تم اجازت دو تو لاجونتی کچن میں جاکر چائے بنالائے۔"

"جب میں تمہارے بیڈ روم کی کھڑکی کے باہر کھڑا تھا تو اس وقت تم بھی اس سے چائے بنانے کے لیے کہہ کر کچن کی طرف گئے تھے۔" میں نے کہا۔

"اوہ! تو تم نے سن لیا تھا۔" وہ مسکرایا "لیکن اس کے باوجود تم مار کھا گئے۔"

"تمہاری اس لاجونتی نے حربہ ہی ایسا استعمال کیا تھا کہ

میری جگہ کوئی اور ہوتا تو وہ بھی مار کھا جاتا۔ بہرحال، اب یہ چائے بنانے کے لیے کچن میں جانا چاہتی ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔" میں نے جواب دیا۔

بلا ابھی تک پستول بدست دروازے میں کھڑی تھی۔ لاجونتی اس کے قریب سے گزری تو بلا مسکراتے ہوئے راستے سے ایک طرف ہٹ گئی اور لاجونتی کے کمرے سے نکلنے کے بعد وہ بھی اس کے پیچھے ہی چل پڑی تھی۔

"یہ لاجونتی کون ہے اور تمہارا اس سے کیا تعلق ہے؟" میں نے سوالیہ نگاہوں سے سوبھراج کی طرف دیکھا۔

"تین سال پہلے میں ٹھوکریں کھاتا ہوا جے پور آیا تھا تو لاجونتی ہی نے مجھے سہارا دیا تھا۔" سوبھراج نے جواب دیا "اس روز میں جین مندر میں چلا گیا تھا جہاں ایک پنڈت سے میرا جھگڑا ہوگیا۔ کئی پنڈتوں نے مل کر مجھے بری طرح پیٹ ڈالا اور اٹھا کر باہر پھینک دیا۔ میں زخمی تھا۔ لوگ میرے قریب سے گزرتے رہے لیکن کسی کو مجھ پر رحم نہیں آیا۔ لاجونتی بھی اس وقت مندر میں موجود تھی۔ یہ مجھے اٹھا کر یہاں اپنے گھر لے آئی۔ ڈاکٹر کو بلا کر میرا علاج کروایا اور میری بڑی خدمت کی۔

"ان دنوں بھی میں پجاری ہی کا روپ دھارے ہوئے تھا اور پولیس سے بچنے کے لیے مندروں ہی میں پناہ ڈھونڈنے کی کوشش کررہا تھا۔ لاجونتی کو نجانے کس طرح میری باتوں سے اندازہ ہوگیا کہ میں پولیس سے چھپنے کی کوشش کررہا ہوں اور پھر مجھے اپنے بارے میں سب کچھ بتانا پڑا۔

"لاجونتی نے مجھے اپنا حلیہ بدلنے پر مجبور کردیا۔ مجھے اپنی داڑھی وغیرہ منڈوانی پڑی۔ پتا نہیں لاجونتی کو میرے اندر ایسی کیا بات نظر آئی تھی کہ وہ مجھے اٹھا کر اپنے گھر لے آئی تھی۔ وہ شاید ہمدردی کا جذبہ تھا لیکن اس میں بتدریج تبدیلی آتی گئی۔ ہمدردی کے بجائے کوئی اور جذبہ اس کے سینے میں جنم لے رہا تھا۔

"میں تین مہینے لاجونتی کے ساتھ اس بنگلے میں رہا۔ میں بہت کم باہر نکلتا اور وہ بھی رات کے وقت۔۔۔ اور پھر ایک رات میں لاجونتی کے ساتھ ایک نائٹ کلب چلا گیا تھا۔ وہاں میں نے بلونت سنگھ کو دیکھ لیا۔

"اور پھر اس کے بعد میں گھر سے نہیں نکلا۔ میں نے ایک بار پھر داڑھی مونچھیں بڑھانا شروع کردیں۔ مزید دو مہینے بعد میں نے سر بھی گنجا کروا دیا۔ میرا حلیہ اگرچہ بڑی حد تک بدل چکا تھا لیکن میرے لیے جے پور میں رہنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ میں نے ایک بار پھر پنڈتوں والا روپ دھارا اور سارسکا چلا گیا۔ وہاں مجھے ایک مندر میں پناہ مل گئی اور ایک سال بعد مجھے دھول پور والا مندر مل گیا۔ میں اس دوران میں پنڈت ہی کے بھیس میں یہاں بھی آتا رہا۔ میں دھول پور کے مندر کو اپنے لیے محفوظ ترین جگہ سمجھتا تھا لیکن ایک روز سارسکا کے بازار میں بلونت سنگھ سے آمنا سامنا ہوگیا۔ پتا نہیں اس کم بخت نے کس طرح مجھے پہچان لیا تھا۔

"اس کے ساتھ ایک لونڈیا اور ایک سادھو بھی تھا۔ انہیں چند روز کے لیے پناہ چاہیے تھی۔ اس نے مجھے دھمکی دی کہ اگر میں نے انکار کیا تو وہ پولیس کو میرے بارے میں بتادے گا حالانکہ وہ بھی اس جرم میں اتنا ہی ملوث تھا جتنا میں ہوسکتا تھا۔ میں اپنا سکون برباد نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں نے انہیں پناہ دینے کا وعدہ کرلیا لیکن میں نے یہ بھی فیصلہ کرلیا تھا کہ ان کے واپس آنے سے پہلے مندر چھوڑ کر یہاں آجاؤں گا کیونکہ یہی میرے لیے ایک جائے پناہ تھی لیکن بیچ میں تم لوگ ٹپک پڑے اور تم نے مجھے پولیس کے حوالے کردیا اور وہاں سے بھاگنے کے لیے مجھے ایک پولیس والے کی جان لینا پڑی۔ یہ میری زندگی کا پہلا جرم ہے جو میں نے دانستہ طور پر کیا تھا۔

"پولیس کو اس پنڈت کی تلاش ہوگی جو ایک سنتری کو قتل کرکے بھاگا ہے۔ یہاں آتے ہی میں نے اپنا حلیہ بدل لیا۔ آنکھوں میں کونٹیکٹ لینسز لگانے سے میری آنکھوں کی رنگت بھی بدل گئی لیکن حیرت ہے تم نے مجھے کیسے پہچان لیا؟"

"تمہارے زخم کے اس نشان سے۔" میں نے اس کی گردن کی طرف اشارہ کیا "جب تم لاجونتی کے ساتھ ریسٹورنٹ میں کافی پینے گئے تھے تو میں بھی وہاں موجود تھا۔ تمہارا یہ نشان دیکھ کر ہی مجھے شبہ ہوا تھا۔" میں نے اسے یہ نہیں بتایا کہ اس ریسٹورنٹ سے میرا بھی کوئی تعلق ہے "تم نے بتایا کہ بلونت اور اس کے ساتھی تمہارے پاس واپس آنے والے تھے؟"

"ہاں۔ ان کا پروگرام یہی تھا۔" سوبھراج نے جواب دیا "بلونت سنگھ کا ساتھی، وہ بدیشی سادھو بہت حرامی تھا۔ مجھے شبہ تھا کہ انہوں نے کوئی خاص منصوبہ بنا رکھا تھا اور اس نے یہ بھی کہا تھا کہ اگر انہیں اس طرف آنے کا موقع نہ ملا تو وہ ہردوار کی طرف نکل جائیں گے۔"

"ہردوار۔ یہ کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔ میں نے یہ تو سن رکھا تھا کہ ہر دوار ہندوؤں کا کوئی مقدس مقام ہے لیکن آج تک اس کے بارے میں جاننے کی کوشش نہیں کی تھی۔

"یوپی میں ہے اور بہت دور ہے۔" سوبھراج نے جواب دیا۔

"لیکن کیا تمہیں معلوم ہے کہ بلونت سنگھ کہاں ہے؟" میں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے پوچھا۔

"کہاں؟" وہ سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھنے لگا۔

"جہنم میں۔" میں نے مختصر سا جواب دیا۔

"کیا۔۔۔؟" وہ اچھل پڑا۔

"جہنم اس جیسے لوگوں کے لیے ہی بنایا گیا ہے۔" میں نے کہا اور پھر اسے کالی کے مندر والی پہاڑیوں میں پیش آنے والے واقعے کے بارے میں بتانے لگا۔

اس کے منہ سے گہرا سانس نکل گیا "گویا اب مجھے اس سے نجات مل گئی۔"

میں کوئی جواب دینا چاہتا تھا کہ بملا اور لاجونتی کمرے میں آگئیں۔ لاجونتی نے کپڑے بدل لیے تھے اور اس نے چائے کی ٹرے اٹھا رکھی تھی۔ اب اس کے چہرے پر خوف نہیں تھا لیکن آنکھوں میں الجھن بدستور تھی۔ اس نے ٹرے میز پر رکھ دی اور ایک کپ اٹھا کر پہلے میری طرف بڑھایا اور دوسرا سوبھراج کو دے دیا۔ وہ تیسرا کپ بملا کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔

"بیٹھ جاؤ دیدی۔ تم کھڑی کیوں ہو؟"

"دیدی!" بملا نے زوردار قہقہہ لگایا "میں تو آپ سے بہت چھوٹی ہوں۔ آپ مجھے دیدی کیوں کہہ رہی ہیں۔ بملا کہہ کر پکاریے نا۔"

"اچھا۔ بملا رانی، بیٹھ جاؤ اور چائے پیو۔" لاجونتی بولی۔

ان کی گفتگو سے اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ ان میں بھی مفاہمت ہو چکی تھی۔ میز پر سے چائے کا کپ اٹھاتے ہوئے میری نظریں سامنے دیوار پر لگی ہوئی گھڑی کی طرف اٹھ گئیں جس کی سوئیاں ایک بجے کا وقت بتا رہی تھیں۔ وقت دیکھتے ہی مجھے ٹھاکر اور جانکی وغیرہ کا خیال آگیا۔ وہ یقیناً پریشان ہو رہے ہوں گے۔

میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ ایک دیوار کے ساتھ کھڑکی کے قریب اسٹینڈ پر ٹیلی فون بھی رکھا ہوا تھا جس کے قریب ایک کرسی بھی پڑی تھی۔ میں اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کرسی پر جا بیٹھا اور فون کا ریسیور اٹھا کر ٹھاکر کے ہوٹل کا نمبر ملانے لگا۔ ٹھاکر ابھی تک ہوٹل ہی میں تھا اور ہمارے لیے پریشان تھا۔ میں نے اسے بتا دیا کہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ ہم ایک ڈیڑھ گھنٹے بعد گھر پہنچ جائیں گے۔ کریڈل ٹیپ کر کے میں نے حویلی کا نمبر ملایا اور جانکی کو بھی اپنی خیریت کی اطلاع دے کر اپنی جگہ پر آگیا۔

میں سوبھراج سے بہت کچھ معلوم کرنا چاہتا تھا اور مجھے معلوم تھا کہ ایسی باتوں میں گھنٹا ڈیڑھ گھنٹا ضرور لگ جائے گا۔

"تم بلونت سنگھ کو کیسے جانتے ہو اور اس سے تمہاری کیا دشمنی تھی؟" سوبھراج نے چائے کی چسکی لیتے ہوئے پوچھا۔

"بلونت سنگھ دراصل راج کماری روپ متی کا دوست تھا اور۔۔۔"

"راج کماری روپ متی کا دوست!" سوبھراج کے لہجے میں حیرت تھی۔

"ہاں، یہ واقعی حیرت کی بات ہے۔" میں نے کہا "میں سمجھتا ہوں کہ بلونت کے باپ کے پاس بھی دولت کی کمی نہیں۔ وہ زندگی بھر اپنے باپ کی دولت پر عیش کر سکتا تھا لیکن وہ فطرتاً کمینہ آدمی تھا۔ اس کی نظریں ہمیشہ دوسروں کے مال پر رہتی تھیں۔ اس نے راج کماری روپ متی سے دوستی بھی اسی لیے کی تھی کہ اس کی دولت پر عیش کر سکے اور۔۔۔"

"اور راج کماری کے حسن و شباب سے بھی لطف اندوز ہو سکے۔" سوبھراج نے ایک بار پھر میری بات کاٹ دی۔ اس کی باتوں سے میں نے اندازہ لگا لیا کہ وہ روپ متی کے بارے میں بہت کچھ جانتا تھا۔

"روپ متی ایک آزاد منش عورت تھی۔" میں نے کہا "اور اس کی یہ روش ہی اسے غلط راستے پر لے گئی تھی۔ اسے لوٹ کا مال سمجھ لیا گیا تھا۔ گویا وہ بہتی گنگا تھی جس میں ہر شخص ہاتھ دھونے کا خواہش مند تھا اور جب میں راج کماری روپ متی کے حلقۂ احباب میں داخل ہوا تو اس کے بہت سے دوست مجھ سے ناراض ہو گئے کیونکہ میں روپ متی کو اس دلدل سے نکالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ روپ متی کے دو ذاتی ملازم اور بلونت سنگھ میری ان کوششوں سے سب سے زیادہ متاثر ہوئے تھے۔" میں چند لمحوں کو خاموش ہو گیا۔ میں نے اسے یہ نہیں بتایا کہ بلونت سنگھ سے دشمنی کی اصل وجہ کیا تھی "ان تینوں نے آپس میں گٹھ جوڑ کر لیا۔" میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا "روپ متی کے ذاتی ملازم دونوں سگے بھائی تھے۔ دھرمیش اور تیج سنگھ۔ وہ دونوں روپ متی کے کزن بھی تھے لیکن ان دونوں نے روپ متی کو اپنی جائداد سمجھ لیا تھا۔ مجھ سے پنگے بازی کے نتیجے میں وہ دونوں اپنے انجام کو پہنچ گئے اور۔۔۔"

"ایک منٹ!" اس مرتبہ لاجونتی نے مجھے ٹوک دیا "تم ہمت سنگھ تو نہیں؟"

"ہاں۔ میرا نام ہمت سنگھ ہے۔" میں نے کہا "اور تم میرے نام سے واقف ہو تو اور بھی بہت کچھ جانتی ہوگی۔"

"جی ہمت سنگھ جی۔ بہت کچھ۔" لاجونتی نے دونوں ہاتھ جوڑ دیے "اور میرا خیال ہے اب ہمیں تم سے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمیں تو خوشی ہے کہ آج تم جیسے آدمی کے درشن ہوگئے۔ آپ تو بڑے مہان ہیں۔ مہاپرش۔"

"شکریہ۔" میں نے بھی ہاتھ جوڑ کر اس کا شکریہ ادا کیا پھر اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا "بلونت سنگھ ہم سے انتقام لینے کے لیے ایک ایسے شخص سے مل گیا جو میرا ازلی دشمن تھا۔ میں اس کی تلاش میں تھا اور اتفاق سے وہ بھی یہاں جے پور میں موجود تھا۔ ان دونوں نے ہمارے خلاف کیا کیا سازشیں نہیں کیں اور کہاں کہاں محاذ نہیں کھولے۔ ہم انہی کی تلاش میں سارسکا گئے تھے۔ وہاں سے مندر والی پہاڑیوں میں پہنچ گئے۔ وہاں بلونت سنگھ تو مارا گیا اور دارا بھی میرے ہاتھ آگیا تھا لیکن وہ میری دوست کو زخمی کرکے فرار ہوگیا۔"

"اب ساری بات میری سمجھ میں آگئی ہے۔" میرے خاموش ہونے پر سوبھراج نے کہا "جب وہ دھول پور میں میرے پاس ٹھہرے ہوئے تھے تو پرگھیا راج نام کے کسی رشی (نیک' پرہیز گار۔ عابد۔ زاہد) کے بارے میں بات کررہے تھے جو پہلے جے پور میں تھا لیکن کچھ عرصے پہلے ہردوار چلا گیا تھا۔ بلونت سنگھ نے کہا تھا کہ اگر وہ لوگ دھول پور واپس نہ آسکے تو ہردوار چلے جائیں گے۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بولا "بلونت سنگھ مارا گیا اور مجھے یقین ہے کہ دارا اس لونڈیا کو لے کر... ہردوار چلا گیا ہوگا۔ میرے خیال میں... ہردوار جیسی دور دراز جگہ ہی اس کے لیے محفوظ ہوسکتی ہے۔"

"ان کے ساتھ جو لونڈیا تھی وہ بھی ماری گئی بلکہ اسے تو دارا ہی نے گولی ماری تھی۔" میں نے کہا۔

"اوہ!" سوبھراج کے منہ سے بے اختیار نکلا "تو پھر یقین کرو کہ وہ ہردوار ہی گیا ہوگا۔"

"لیکن میرا خیال ہے کہ فی الحال تو سل سرتھ' الوریا قرب و جوار میں کسی جگہ چھپا ہوگا۔ میں نے اس کی ایک ٹانگ توڑ دی تھی اور وہ لنگڑی ٹانگ کے ساتھ اتنا طویل سفر نہیں کرسکتا۔"

کچھ دیر تک خاموشی رہی اور پھر ہم دارا اور ہردوار کے بارے ہی میں باتیں کرتے رہے۔ ہم میں دوستی کی بنیاد پڑ گئی تھی۔ میں ان دونوں کے بارے میں بہت کچھ جان گیا تھا اور وہ میرے بارے میں بہت کچھ جانتے تھے۔

دوبارہ ملنے کا وعدہ کرکے ہم وہاں سے رخصت ہوئے تو ڈھائی بج رہے تھے۔ میں نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی اور بلا پسنجرز سیٹ پر بیٹھ کر اونگھنے لگی۔

○☆○

میرے اندر ایک نئی بے چینی جنم لے چکی تھی۔

میں نے ٹھاکر سے ہردوار کے بارے میں پوچھا لیکن وہ کچھ نہیں جانتا تھا سوائے اس کے کہ ہردوار ہندوؤں کا ایک مقدس مقام ہے اور ہر ہندو زندگی میں کم از کم ایک مرتبہ وہاں جانا ضروری سمجھتا ہے۔

میں اِدھر اُدھر سے بھی لوگوں سے ہردوار کے بارے میں پوچھتا رہا۔ مجھے مایوسی نہیں ہوئی اور میں نے بہت ہی معلومات حاصل کرلیں۔

سوبھراج اور لاجونتی سے بھی میرے اچھے دوستانہ تعلقات استوار ہوچکے تھے اور پچھلے ایک مہینے کے دوران میں کئی مرتبہ ان سے مل چکا تھا۔ کبھی بلا میرے ساتھ ہوتی اور کبھی میں اکیلا ہی چلا آتا۔ ہم گھنٹوں بیٹھے باتیں کرتے رہتے۔

ایک روز میں نے سوبھراج سے ہردوار کے بارے میں بات کی تو وہ فوراً ہی میرا ساتھ دینے کو تیار ہوگیا۔ وہ بدلے ہوئے حلیے میں یہاں اگرچہ بڑی حد تک محفوظ تھا لیکن دل کو ایک دھڑکا تو لگا ہوا تھا۔ سر پر خوف کی ایک تلوار تو لٹک رہی تھی اس لیے وہ بھی یہاں سے دور چلے جانا چاہتا تھا۔

"لیکن ایک بات ہے۔" سوبھراج نے ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے سرگوشی میں کہا "ہمیں کسی کو بتائے بغیر یہاں سے جانا ہوگا۔ نہایت خاموشی سے۔"

"تو کیا تم سمجھتے ہو کہ ہم بینڈ باجے کے ساتھ رخصت ہوں گے؟" میں نے کہا۔

"تم میرا مطلب نہیں سمجھے۔" سوبھراج نے کہا "یہ لاجونتی ہے نا۔ اگر اسے پتا چل گیا تو یہ بھی ہمارے ساتھ جانے کو تیار ہوجائے گی اور میں اسے ساتھ نہیں لے جانا چاہتا۔ نجانے وہاں ہمیں کس قسم کے حالات کا سامنا کرنا پڑے۔"

"یہی صورتِ حال میرے ساتھ بھی ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "دو بلائیں میرے ساتھ بھی لپٹی ہوئی ہیں۔ بلا اور جانکی کو پتا چل گیا تو وہ کسی بھی حالت میں مجھے نہیں جانے دیں گی۔ جانکی کو تم نہیں جانتے۔ وہ مجھے ایک قدم نہیں ہلنے دیتی۔ میری وجہ سے کئی مرتبہ اپنا جیون خطرے میں ڈال چکی ہے۔"

"یہ ناریاں بھی بڑی عجیب مخلوق ہیں۔" سوبھراج مسکرایا "یہ جس مرد کو اپنا مان لیتی ہیں اس کے لیے سب کچھ چھوڑ دینے کو تیار ہوجاتی ہیں۔ اپنی جان خطرے میں ڈال دیتی ہیں۔"

لاجونتی کے آجانے سے ہماری گفتگو کا موضوع بدل گیا۔ اس نے ہمارے سامنے چائے کے کپ رکھ دیے اور باری باری ہمارے چہروں کو تکتے ہوئے بولی۔

"کوئی خاص بات ہورہی تھی؟"

"نہیں۔" سوبھراج بولا "ہم یہ بات کررہے تھے کہ مادھوری ڈکشٹ زیادہ حسین ہے یا ہیما مالنی۔ اب یہ فیصلہ تم ہی کروگی کہ ان دونوں میں زیادہ حسین کون ہے؟"

"یہ تو میں نہیں کہہ سکتی کہ ان دونوں میں زیادہ حسین کون ہے البتہ یہ ضرور بتا سکتی ہوں کہ ان دونوں سے زیادہ حسین تو میں ہوں۔" لاجونتی نے جواب دیا۔

"اور یہ فیصلہ ہی صحیح ہے۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ ہم نے اگرچہ ہیما مالنی اور مادھوری ڈکشٹ کے ناموں کی آڑ لے کر بات کو ٹالنے کی کوشش کی تھی لیکن میرے خیال میں لاجونتی اتنی بے وقوف نہیں تھی۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ ہم کسی خاص موضوع پر بات کررہے تھے اور وہ بات اس سے چھپانا چاہتے تھے لیکن اس نے اصل بات جاننے کے لیے اصرار بھی نہیں کیا تھا۔

اس سے اگلے روز ریسٹورنٹ میں ایک بدھ بھکشو سے ملاقات ہوگئی۔ وہ ایک اور آدمی کے ساتھ کافی پینے آیا تھا اور وہ دونوں کاؤنٹر کے قریب ہی ایک میز پر بیٹھے تھے۔ ان کی باتیں سن کر میں بھی متوجہ ہوگیا۔ بھکشو اس آدمی کو یوگا کے بارے میں کچھ بتا رہا تھا۔ گفتگو کے دوران میں وہ کبھی تن کر بیٹھ جاتا اور اشاروں سے کچھ سمجھانے کی کوشش کرتا۔

میں بھی اپنی جگہ سے اٹھ کر ان کی میز پر آگیا۔ کہیں پر بات یوگا یا مارشل آرٹس کی ہورہی ہو اور میں اس میں دلچسپی نہ لوں یہ ممکن ہی نہیں تھا۔ زندگی بھر کے تجربے سے یہ بات سامنے آئی تھی کہ بدھ بھکشو اور ہندو یوگی' یوگا میں جتنی مہارت رکھتے ہیں ان کا مقابلہ کوئی نہیں کرسکتا۔ میں نے بھی یوگا سیکھا ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یوگا تن کر بیٹھ جانے اور مخصوص انداز میں سانس لینے ہی کا نام نہیں ہے۔ یوگا تو ایک اپنا پُراسرار علم ہے جسے سیکھنے کے لیے ایک عمر چاہیے۔

اس بدھ بھکشو نے بھی یوگا کے بارے میں کچھ ایسی باتیں بتائیں اور چند باتیں اس حوالے سے میں نے کیں تو وہ مجھے قریب رشی کیش کو دنیا بھر میں یوگا کا سب سے بڑا اور اہم ترین مرکز سمجھا جاتا ہے۔ پہاڑیوں اور جنگلوں میں گھرے ہوئے اس چھوٹے سے قصبے کو YOGA CAPITAL OF THE WORLD بھی کہا جاتا ہے۔ دنیا بھر سے لوگ یوگا کا پُراسرار علم سیکھنے کے لیے یہاں آتے ہیں۔

اس بدھ بھکشو کی باتوں سے میرے جذبات کچھ اور بھی بھڑک اٹھے۔ اب مجھ سے وقت گزارے نہیں گزرتا تھا۔

میں نے اور سوبھراج نے چپکے ہی چپکے تیاری شروع کردی اور پھر اپنی روانگی سے ایک روز پہلے میں نے ٹھاکر کو اعتماد میں لے کر بتا دیا کہ میں ہردوار جارہا ہوں۔

"ہردوار۔" ٹھاکر چونک گیا "مگر تم تو ہندو نہیں ہو۔ کیا کروگے وہاں جاکر۔ وہاں تو ہر طرف مندر ہی مندر ہیں۔"

"اور انہی مندروں میں مجھے دارا کے ملنے کی توقع ہے۔" میں نے کہا "اس کے علاوہ سنا ہے ہردوار سے چند میل کی دوری پر رشی کیش میں یوگا کا بہت بڑا مرکز ہے۔ میں وہاں بھی جانا چاہتا ہوں۔"

"اور تمہاری وہ جو چہیتی ہے جانکی؟" ٹھاکر بولا "وہ تو میری جان کھا جائے گی۔ بوٹیاں نوچ لے گی میری اور میں دیکھ رہا ہوں کہ بلا بھی تمہارے بغیر سانس نہیں لے سکتی اور وہ جو ہے راج کماری روپ متی جی! وہ بھی تم پر جان چھڑکتی ہے۔ بہت پریم کرتی ہے تم سے۔ میں ان تینوں آفتوں سے کیسے نمٹوں گا۔ وہ تو مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گی۔"

"روپ متی تو تم سے پریم کرتی ہے ٹھاکر جی۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "بہت چاہتی ہے وہ تمہیں اور میں جانتا ہوں' تم بھی اس کے بغیر نہیں رہ سکتے۔ میری مانو تو اب تم دونوں ایک ہو ہی جاؤ۔"

ٹھاکر کا چہرہ اس طرح سرخ ہوگیا جیسے وہ کوئی لڑکی ہو اور میں نے اس کے پریتم کا نام لے کر اسے چھیڑ دیا ہو۔

"ٹھیک ہے۔" وہ گہرا سانس لیتے ہوئے بولا "تم ہردوار سے واپس آجاؤ تو اس سلسلے میں سوچوں گا۔ ویسے تم کب جارہے ہو؟"

"کل سویر۔" میں نے جواب دیا "سوبھراج نے پنک سٹی ایکسپریس پر دہلی کے لیے سیٹیں بک کروالی ہیں۔"

"اوہ!" ٹھاکر چونک گیا "سوبھراج بھی تمہارے ساتھ جارہا ہے؟"

"ہاں۔ صرف سوبھراج۔ وہ قابلِ اعتماد آدمی ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے۔" ٹھاکر نے گہرا سانس لیا "تمہارے بعد جو کچھ بھی ہوگا' بھگت لوں گا اور تمہیں میرے یہ بال بہت اچھے لگتے ہیں نا۔" اس نے اپنے سر پر ہاتھ پھیرا "واپس آکر اگر تمہیں میرے سر پر کوئی بال نظر نہ آئے تو افسوس مت

کرنا۔"

"میں اتنی لمبی مدت کے لیے تو نہیں جارہا کہ۔۔۔"

"بات لمبی مدت کی نہیں۔" ٹھاکر نے میری بات کاٹ دی "تم مجھے تین بلاؤں کے رحم و کرم پر چھوڑ کر جارہے ہو۔ میرے بال نوچنے میں تو انہیں چند منٹ سے زیادہ نہیں لگیں گے۔"

میں اس بات پر قہقہہ لگائے بغیر نہیں رہ سکا تھا اور یہ تو میں بھی جانتا تھا کہ میرے بعد وہ تینوں واقعی ٹھاکر کی بوٹیاں نوچ لیں گی۔

"اور دیکھو۔" ٹھاکر نے کہا "اگر وہاں کوئی گڑبڑ ہو تو مجھے ٹیلی فون پر اطلاع دینے میں دیر مت کرنا۔ میں فوراً پہنچ جاؤں گا۔"

"اگر کوئی ایسی بات ہوئی تو میں تمہیں ضرور اطلاع دوں گا۔" میں نے جواب دیا۔

میں نے اور سوبھراج نے اپنے الگ الگ بیگ تیار کرلیے تھے۔ ان میں ہر وہ چیز موجود تھی جس کی ہمیں ضرورت پڑسکتی تھی اور یہ دونوں بیگ ہم نے ٹھاکر کے ہوٹل ہی میں رکھے ہوئے تھے۔

پنک سٹی ایکسپریس اپنی نوعیت کی ایک منفرد ٹرین تھی۔ راجستھان میں ہر سال سات آٹھ لاکھ غیر ملکی سیاح آتے تھے اور یہ ٹرین صبح چھ بجے دہلی سے روانہ ہو کر دوپہر کے وقت جے پور پہنچتی تھی۔ سہ پہر چار بجے جے پور سے روانہ ہو کر رات کو دہلی واپس آجاتی۔ موسم کے مطابق اس ٹرین کے ٹائم ٹیبل میں ردّوبدل بھی ہوتا رہتا تھا۔ دو سو ستر کلو میٹر کا فاصلہ طے کرنے میں پانچ گھنٹے لگتے تھے۔

رات نو بجے کے قریب ہم دہلی ریلوے اسٹیشن سے باہر نکلے تو میرے دل کی دھڑکن بے ربط ہورہی تھی۔ میں کاغذات کے بغیر غیر قانونی طور پر ہندوستان میں مقیم تھا۔ طیارے کے حادثے کے بعد اگر میں پولیس سے رابطہ کرلیتا تو ہمیں پاکستان بھیجنے کا بندوبست ہوسکتا تھا لیکن ریگستان میں جہاز کے حادثے کے بعد حالات نے اس طرح پلٹا کھایا تھا کہ ہم ہندوستان کے قیدی بن کر رہ گئے تھے۔ جے پور میں اجنبی لوگوں سے ہماری دشمنیاں بھی چلیں اور کچھ مخلص دوست بھی ملے اور ان دوستوں ہی کی وجہ سے ہم قانونی الجھنوں سے بچے رہے تھے لیکن اب میرے وہ دوست بہت پیچھے رہ گئے تھے۔ سوبھراج میرے ساتھ تھا لیکن وہ بھی اس شہر میں اجنبی تھا اور ظاہر ہے کسی اجنبی جگہ پر دل میں انجانے سے وسوسے ضرور جنم لیتے ہیں۔

ہم ریلوے اسٹیشن سے زیادہ دور نہیں گئے۔ دلی کی سیر کا ہمارا کوئی پروگرام نہیں تھا۔ ہمیں تو یہاں صرف رات گزارنی تھی۔ صبح ہمیں دہرا دون چلے جانا تھا جہاں سے ہم میسوری کے لیے روانہ ہوجاتے۔

دہلی سے ستر کلو میٹر کے فاصلے پر میرٹھ شہر آباد ہے۔ یہ وہ شہر ہے جہاں سے ۱۸۵۷ء میں ہندوستان میں انگریزوں کے خلاف جنگِ آزادی کا آغاز ہوا تھا۔ میرٹھ سے تقریباً سو میل آگے سہارنپور میں ٹرین رکی تو آدھے گھنٹے بعد پتا چلا کہ وہ اسٹیشن آگے ایک مال گاڑی پٹری سے اتر جانے سے اس لائن پر ریلوے ٹریفک معطل ہوچکا ہے اور ٹرین کم از کم چھ گھنٹے بعد روانہ ہوگی۔

ہم چھ گھنٹے انتظار نہیں کرسکتے تھے۔ ہماری طرح اور بھی بہت سے مسافر ٹرین سے اتر کر لاری اڈے کا رخ کرنے لگے۔

دو ہزار میٹر بلند اور ہمالیہ کے قدموں میں آباد دہرا دون ایک بڑا اور بارونق شہر ہے۔ اس سے صرف پینتیس کلو میٹر کے فاصلے پر خوب صورت ہل اسٹیشن میسوری واقع ہے۔ ہم نے دہرا دون میں رکنا مناسب نہیں سمجھا اور لاری اڈے پر ایک بس سے اتر کر دوسری بس پر سوار ہوگئے۔

پینتیس چھتیس کلو میٹر کا فاصلہ تین گھنٹوں میں طے ہوا تھا۔ پہاڑی راستے نہایت دشوار گزار اور سنبرے سے ڈھکے ہوئے تھے۔ دہرا دون سے کچھ فاصلے پر نینی تال جانے والی سڑک سے تھوڑا ہی آگے ہندوستان کی سرحدیں ایک طرف نیپال اور دوسری طرف چین میں تبت سے ملتی ہیں۔ نینی تال سے دہرا دون تک ایک دبلی پھیلی ہوئی ہے جہاں دنیا کے خوفناک ترین درندے پائے جاتے ہیں۔

دہرا دون شمال میں ہندوستان کا آخری ریلوے اسٹیشن ہے اور یہاں ایک بہت بڑی ملٹری اکیڈمی بھی ہے۔ ایک بس سے اتر کر دوسری بس پر سوار ہونے کے درمیان تقریباً ڈیڑھ گھنٹا ہم چائے وغیرہ پینے کے لیے یہاں رکے تھے۔

میسوری پہنچتے ہوئے شام ہوگئی۔

یہاں کئی اچھے ہوٹل تھے لیکن ہمیں کہیں بھی جگہ نہیں ملی۔ تقریباً دو گھنٹے ایک ایجنٹ کے ساتھ گھومنے کے بعد ایک پرائیویٹ گیسٹ ہاؤس میں کمرا مل گیا۔ یہ گیسٹ ہاؤس شہر کے مرکز سے دور ایک سرسبز پہاڑی کے دامن میں واقع تھا۔ یہاں کچھ غیر ملکی سیاح بھی ٹھہرے ہوئے تھے۔

دن بھر کے سفر نے مجھے بُری طرح تھکا دیا تھا۔ کھانے کے بعد میں بستر پر لیٹتے ہی ہوگیا اور پھر مجھے کچھ ہوش نہیں رہا۔

○☆○

ہم دوپہر تک میسوری میں رہے اور پھر ایک بس پر سوار ہو کر ہردوار کے لیے روانہ ہوگئے۔ بس مسافروں سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ ہندوستان کے کونے کونے سے آئے ہوئے لوگ گنگوتری کی یاترا کے لیے جارہے تھے۔ ہر بس کا یہی حال تھا۔ ہماری بس میں تین چار پنڈت اور پجاری بھی سوار تھے جو اونچی اور بھاری آوازوں میں بھجن اور اشلوک گارہے تھے۔

چوبیس کلو میٹر کا یہ فاصلہ بھی ڈیڑھ گھنٹے میں طے ہوا۔ ہمالیہ کے قدموں میں بکھرا ہوا یہ شہر دور دور تک پھیلا ہوا تھا۔ پہاڑوں پر اور پہاڑیوں کے دامن میں رنگ برنگی چھتوں والی چھوٹی چھوٹی عمارتیں بہت اچھی لگ رہی تھیں۔ ان پہاڑیوں کے پس منظر میں ہمالیہ کی وہ برف پوش چوٹیاں تھیں جہاں سے ندی نالوں کی صورت میں بہنے والا پانی ہردوار کے دامن میں گنگوتری کے مقام پر ایک باقاعدہ دریا کی شکل اختیار کرلیتا تھا۔ یہی گنگا تھا جس کے پانی کو ہندو دھرم میں مقدس اور متبرک سمجھا جاتا ہے۔ ہندوؤں کا عقیدہ ہے کہ گنگا کے پاک پانی میں غسل کرلینے سے سارے گناہ دُھل جاتے ہیں۔

میرے خیال میں ہردوار اور گنگوتری کو ہندوؤں کا مکہ کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا۔ ہندوؤں میں گنگا جل کو اس طرح مقدس اور متبرک مانا جاتا ہے جیسے ہم آبِ زم زم کو متبرک سمجھتے ہیں۔

میرے خیال میں اس دریا کا نام "گنگا" بھی شاید اس لیے پڑا تھا کہ پہاڑوں سے ندی نالوں کی صورت میں بہنے والا پانی گنگوتری نامی گاؤں کے قریب ایک باقاعدہ دریا کی شکل اختیار کرتا ہے۔ یہاں اس دریا کا پاٹ کہیں تو بہت چوڑا ہے اور کہیں ایک تنگ پہاڑی نالے کی صورت اختیار کرلیتا ہے لیکن جیسے جیسے یہ نشیب کی طرف بہتا ہے' اس کا پاٹ باقاعدہ دریا کی شکل اختیار کرلیتا ہے۔

ٹھاکر نے ٹھیک کہا تھا۔ ہردوار مندروں کا شہر تھا۔ یہاں لاتعداد چھوٹے بڑے مندر تھے اور اگر وارا یہاں آیا تھا تو انہی مندروں میں کہیں چھپا ہوا ہوگا۔

لیکن سب سے پہلے ہمیں اپنا ٹھکانا بنانے کی فکر تھی اور مجھے کوئی ٹھکانا تلاش کرلینا مشکل ہی لگ رہا تھا۔ یہاں اگرچہ لاتعداد رہائشی ہوٹل' سرائے اور گیسٹ ہاؤسز بھی تھے لیکن یاتری بھی ہزاروں کی تعداد میں نظر آرہے تھے۔

تقریباً وہ تقریباً چھ بجے کا وقت تھا۔ سورج غروب ہونے میں گھنٹا بھر باقی تھا۔ موسم اگرچہ بہار کا تھا مگر شمال میں ہمالیہ کی برفانی چوٹیوں سے اترنے والی ہوا میں خنکی بڑھتی جارہی تھی اور مجھے لگتا تھا کہ اگر کہیں سر چھپانے کی جگہ نہ ملی تو ہمیں رات کی سردی میں ٹھٹھر کر رہ جانا پڑے گا۔ سوبھراج نے کہا۔

"وہ سامنے ایک دھرم شالا کا بورڈ لگا ہوا ہے۔ میں دیکھ کر آتا ہوں۔ اگر وہاں رات گزارنے کی جگہ مل جائے تو۔۔۔"

"جاؤ۔ وہاں بھی قسمت آزمالو۔" میں نے گہرا سانس لیتے ہوئے اس کی بات کاٹ دی۔

سوبھراج سڑک پار کرکے دوسری طرف چلا گیا۔ یہاں یاتریوں کے لیے کئی دھرم شالے بھی تھے۔ یہ دھرم شالے دراصل ان غریبوں کے لیے تھے جن کے پاس سر چھپانے کی جگہ نہ ہو لیکن یہاں بھی دور دراز کے علاقوں سے آئے ہوئے دولت مند ہندو یاتریوں نے قبضہ جمار کھا تھا۔ ان دھرم شالوں کے پنڈتوں کی بھی پانچوں گھی میں اور سر کڑاہی میں تھے۔ ہم نے کئی جگہ قسمت آزمائی کی تھی لیکن ہر جگہ ہمیں ہری جھنڈی دکھادی گئی تھی۔

سوبھراج دھرم شالا کے گیٹ میں غائب ہوچکا تھا اور میں موڑ پر کھڑا اِدھر اُدھر آتے جاتے لوگوں کو دیکھ رہا تھا کہ اپنے کندھے پر ہلکا سا بوجھ محسوس کرکے چونک گیا۔ میں آہستہ آہستہ پیچھے گھوم گیا اور اس کے ساتھ ہی میرے منہ سے گہرا سانس نکل گیا۔

وہ ایک ادھیڑ عمر عورت تھی۔ قد لمبا اور بالوں میں سفیدی کا رنگ غالب تھا۔ رنگت گوری اور چہرے کے نقوش اب بھی جاذبِ نظر تھے۔ جوانی میں وہ یقیناً بہت حسین رہی ہوگی۔ اس نے پھولدار کپڑے کا گھاگھرا پہن رکھا تھا اور اوپر آتشی گلابی رنگ کی ایک چادر اس طرح لپیٹ رکھی تھی کہ اس کے بدن کا سامنے کا حصہ تو چھپ گیا تھا مگر پشت برہنہ تھی۔ اس کی پیشانی پر سرخ ٹیکا لگا ہوا تھا اور گلے میں کئی مالائیں تھیں۔ کانوں میں چوڑیوں جتنی بڑی چاندی کی بالیاں تھیں اور ایک کلائی میں بھی چاندی کا کڑا نظر آرہا تھا۔

اس شہر میں بھکاریوں کی بھی کمی نہیں تھی اور میں اسے بھی کوئی بھکارن ہی سمجھا تھا۔ میں نے جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک سکہ نکالا اور اس کی طرف بڑھادیا۔

"میں بھکارن نہیں ہوں شریمان جی؟" اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"تو پھر کون ہو تم شریمتی جی۔" میں نے اسے گھورا۔

"میں بہت دیر سے دیکھ رہی ہوں کہ تم دونوں سر چھپانے کی کسی جگہ کی تلاش میں اِدھر اُدھر مارے مارے پھر رہے ہو۔" اس عورت نے جواب دیا "تمہارا وہ متر سامنے والے دھرم شالا میں یہی معلوم کرنے گیا ہے۔ ابھی دیکھنا وہ منہ لٹکائے واپس آجائے گا۔"

"گویا تم دیر سے ہمارا پیچھا کررہی ہو؟" میں نے ایک بار پھر اسے گھورا۔

"یہی سمجھ لو۔" وہ بولی "ان دھرم شالوں پر تو دھن والوں کا قبضہ ہوتا ہے اور یہ سالے پنڈت بھی بہت حرامی ہیں۔ خوب دھن کماتے ہیں یہ۔"

"کیا تم یہی بتانے کے لیے ہمارا پیچھا کر رہی تھیں؟" میں نے کہا۔

"ہاں... اور میں تمہارا مسئلہ حل کر سکتی ہوں۔" اس نے جواب دیا۔

"اوہ!" میں اچھل پڑا۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ کسی رہائشی ہوٹل، سرائے یا گیسٹ ہاؤس کی ایجنٹ تھی "کوئی ہوٹل، سرائے یا گیسٹ ہاؤس؟" میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"ایک چھوٹی سی کٹیا ہے جہاں تم لوگوں کو رات گزارنے کی جگہ مل سکتی ہے۔ باہر رہو گے تو ٹھٹھر جاؤ گے۔" اس نے جواب دیا۔

"اور اس کٹیا میں رہنے کا ایک رات کا کرایہ کیا لوگی؟" میں نے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔ کچھ بھی نہیں۔" اس نے کہا "ویسے جو تمہارے من میں آئے صبح مندا دیوی کے مندر میں بھینٹ چڑھا دینا۔"

میں حیرت سے اس کی صورت تکنے لگا۔ مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ یہاں تو بڑے بڑے دین دھرم والے پیسے کی ہوس میں مرے جا رہے تھے۔ مندر جیسے مقامات پر بھی دیوی دیوتاؤں کے بجائے پیسے ہی کی پوجا کی جاتی تھی اور یہ سادھو قسم کی عورت ہمیں کسی لالچ کے بغیر اپنی کٹیا میں رات گزارنے کی اجازت دے رہی تھی۔

میرے ذہن میں اچانک ہی ایک اور خیال ابھرا۔ ہو سکتا ہے دارا یہاں پہنچ گیا ہو۔ ہم دو پہر سے یہاں گھوم رہے تھے۔ میں اپنی اصل شکل صورت میں تھا۔ ممکن ہے دارا نے مجھے دیکھ لیا ہو اور مجھے پھانسنے کے لیے اس سادھو عورت کے بھیس میں ایک نیا جال تیار کیا ہو۔

"اگر تم ہمیں اپنی کٹیا میں جگہ دے دو گی تو خود کہاں رہو گی؟" میں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے پوچھا۔

"میری کٹیا میں بہت جگہ ہے اور من میں بھی۔" اس نے جواب دیا۔

باتیں کرتے ہوئے میری نظریں آشرم کی طرف اٹھ گئیں۔ اس عورت نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ سوبھراج دھرم شالا کے دروازے سے باہر نکلا تو اس کا چہرہ واقعی لٹکا ہوا تھا جس کا مطلب تھا کہ اسے وہاں سے بھی ہری جھنڈی دکھا دی گئی تھی۔

"دیکھا۔ میں نے کہا تھا نا کہ تم لوگوں کو کہیں جگہ نہیں ملے گی۔" اس عورت نے کہا۔ اس نے بھی سوبھراج کو آشرم سے باہر آتے ہوئے دیکھ لیا تھا "میرے ساتھ چلو، میری کٹیا میں۔"

"کہاں ہے تمہاری کٹیا؟" میں نے پوچھا۔

"اس طرف۔" اس نے ایک طرف اشارہ کیا "... سے گنگوتری بھی زیادہ دور نہیں ہے۔"

سوبھراج سڑک پار کر کے ہمارے قریب پہنچا تو وہ عورت "میرے پیچھے آ جاؤ۔" کہتے ہوئے ایک طرف چل پڑی۔ سوبھراج نے الجھی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے اسے اشارہ کرتے ہوئے اس عورت کے پیچھے چلنے لگا۔ وہ ہم سے تقریباً دس قدم آگے نکل چکی تھی۔

"کون ہے یہ اور ہمیں کہاں لے جا رہی ہے؟" سوبھراج نے سرگوشی میں پوچھا۔

"اپنی کٹیا میں۔" میں نے جواب دیا "وہاں چل کر پوچھیں گے کہ یہ کون ہے اور ہم پر اتنی مہربان کیوں ہے؟"

"ایسی جگہوں پر دھوکے بازوں اور لٹیروں کی بھی بھرمار ہوتی ہے۔ ایسا نہ ہو کہ یہ عورت ہمیں پھانس کر کسی ایسی جگہ لے جا رہی ہو جہاں سے ہمارے لیے واپسی کا کوئی راستہ نہ رہے۔"

"مجھے لوٹے جانے کا نہیں بلکہ ایک اور شبہ ہے۔" میں نے کہا اور پھر دارا کے بارے میں اپنے اندیشے کا اظہار کرنے لگا اور پھر آخر میں کہا "اب تو چلتے رہو۔ جو ہوگا دیکھا جائے گا۔"

ہم اس عورت کے پیچھے چلتے رہے۔ اس نے ایک بار بھی پیچھے مڑ کر دیکھنے کی کوشش نہیں کی تھی کہ ہم اس کے ساتھ آ رہے ہیں یا نہیں۔

شہر کی آبادی بکھری ہوئی تھی۔ ہم گلیوں سے نکل کر ایک طرف آ گئے جہاں عمارتیں ایک دوسرے سے فاصلے پر تھیں۔ کسی پہاڑی پر کوئی مندر تھا اور کسی پہاڑی کے دامن میں کوئی پرائیویٹ گیسٹ ہاؤس یا مکان۔

سورج اب مغرب کی طرف جھک رہا تھا۔ کچھ ہی دیر میں وہ پہاڑیوں کے پیچھے چھپ جانے والا تھا۔ وہ عورت ہمیں ایک ایسی جگہ پر لے آئی جہاں مکان وغیرہ ایک دوسرے سے بہت دور دور تھے۔

وہ عورت لکڑی کے تختوں سے بنے ہوئے ایک مکان کے سامنے رک گئی جو دیکھنے میں زیادہ بڑا نہیں لگتا تھا۔ اس کے پاس چیڑ کے چند درخت تھے اور پندرہ بیس گز آگے ایک کشادہ پہاڑی نالا تھا۔ اس کا شفاف پانی ڈوبتے ہوئے سورج کی روپہلی کرنوں میں چمک رہا تھا۔ ایک طرف کچھ لوگ

تھے۔ وہ غالباً ایک ہی فیملی تھی۔ مرد بھی تھے، عورتیں بھی اور بچے بھی۔ دو عورتیں کپڑوں سمیت پانی میں بیٹھی ہوئی تھیں اور ہاتھوں سے اپنے سروں پر پانی ڈال رہی تھیں۔ ان کے قریب ہی دس گیارہ سال کی عمر کا ایک لڑکا اور ایک ادھیڑ عمر آدمی بھی غسل کر رہے تھے۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ یہ نالا بھی اسی دریا ہی کا حصہ ہے جس کے پانی کو مقدس سمجھا جاتا ہے اور یہ سب لوگ اس پاک پانی میں اپنے گناہ دھو رہے تھے۔

ہمارے ساتھ آنے والی عورت نے چادر کے اندر ہاتھ ڈال کر ایک چابی نکالی اور مکان کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئی۔ ہم دونوں باہر کھڑے اِدھر اُدھر دیکھتے رہے۔ اس مکان کے اطراف میں سو سو گز کے فاصلے تک کوئی اور مکان وغیرہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں یہ سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ اگر ہمیں اوپر پہنچانے کا کوئی منصوبہ بنایا گیا تھا تو اس کے لیے بہترین جگہ کا انتخاب کیا گیا تھا۔ پہاڑی نالے پر غسل کرنے والے لوگ اب واپس جانے کی تیاری کر رہے تھے۔

"ارے! تم باہر کیوں کھڑے ہو۔ اندر آ جاؤ نا۔"

اس عورت کی آواز سن کر میں چونک گیا۔ میں نے سوبھراج کی طرف دیکھا اور پھر ہم دونوں اندر داخل ہو گئے اور اس کے ساتھ ہی میری آنکھوں میں حیرت سی ابھر آئی۔ اس عورت نے جسے کٹیا کہا تھا وہ لکڑی کے تختوں سے بنا ہوا ایک مکان تھا جو اندر سے تین کمروں پر مشتمل تھا۔ ایک کمرا تو وہی تھا جس میں ہم کھڑے تھے اور یہاں اس نے کیروسین کا لیمپ جلا لیا تھا اور دیگر ساتھ ساتھ ملے ہوئے دو کمروں کے دروازے بھی اس کمرے میں کھلتے تھے۔

یہ کمرا بڑا تھا۔ اس کے ایک حصے میں آتش دان بنا ہوا تھا جس کے آس پاس کچھ برتن وغیرہ سلیقے سے رکھے ہوئے تھے۔ دائیں طرف ایک کھرا بھی تھا جس میں پانی سے بھری ہوئی ایک بالٹی رکھی ہوئی تھی اور کھرے کے باہر ایک مٹکا تھا جس کے ڈھکنے پر ایک گلاس بھی اوندھا پڑا تھا۔

کمرے میں بھیڑ کے بالوں سے بنا ہوا ایک نمدہ بچھا ہوا تھا جس پر تین چار آدمی آرام سے سو سکتے تھے۔

"بیٹھو تم لوگ۔ میں چائے بناتی ہوں۔" عورت نے کہا اور آتش دان کے قریب بیٹھ گئی۔

ہم نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ کندھوں پر لٹکے ہوئے بیگ اتار کر نیچے رکھ دیے اور دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔ میں نے ٹانگیں آگے کو پھیلا لی تھیں۔ وہ عورت خاموشی سے اپنے کام میں اس طرح مصروف تھی جیسے ہماری موجودگی کو بھول گئی ہو۔

تقریباً بیس منٹ بعد چائے تیار ہو گئی تو اس نے ایک ایک پیالی ہمارے سامنے رکھ دی اور خود بھی ہمارے سامنے آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی۔ اس نے ایک پیالی اپنے قریب رکھ لی تھی۔

"یہ کٹیا تمہاری ہے؟" میں نے لفظ کٹیا پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔" اس کے ہونٹوں پر پہلی مرتبہ خفیف سی مسکراہٹ آ گئی "پہلے میں اس کا بھاڑا دیتی تھی پھر میں نے اسے خرید لیا۔"

"تم کون ہو؟" میں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے پوچھا "اور ہمیں یہاں کس لیے لائی ہو؟"

"تم لوگوں کو رات گزارنے کے لیے جگہ کی تلاش تھی اس لیے یہاں لے آئی ہوں۔" اس نے جواب دیا "اور یہاں کیوں لائی ہوں، یہ بھی بتا دوں گی۔ پہلے اطمینان سے چائے پیو۔"

میں نے مزید کوئی سوال نہیں کیا البتہ بار بار کن انکھیوں سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ وہ جوانی میں یقیناً بہت حسین رہی ہو گی لیکن اب تو اس کا حسن مرجھایا ہوا سا لگ رہا تھا۔

میں اپنی پیالی اٹھا کر چائے کی ہلکی ہلکی چسکیاں لینے لگا۔ وہ عورت ہمارے سامنے بالکل یوگا کے انداز میں آلتی پالتی مارے بیٹھی تھی۔ اس کی کمر تنی ہوئی تھی۔ لگتا تھا جیسے وہ ہمیشہ اسی انداز میں بیٹھنے کی عادی ہو۔

سوبھراج چائے ختم کر کے باہر چلا گیا۔ وہ عورت اب بھی خاموش بیٹھی تھی۔ اس کے چہرے کا اطمینان دیکھ کر میں کچھ الجھن میں مبتلا ہو گیا۔ اگر وہ ہمارے خلاف کسی سازش میں ملوث ہوتی تو اس طرح مطمئن اور پرسکون نہ ہوتی۔ اس پر کچھ نہ کچھ گھبراہٹ ضرور طاری ہوتی لیکن وہ بالکل پرسکون تھی۔

"تم کون ہو؟" میں نے ایک بار پھر سوال کیا۔ اس وقت میرے ذہن میں ایک اور سوال بھی آیا۔ کہیں یہ کوئی شکاری عورت تو نہیں؟ لیکن پھر فوراً ہی میں نے اس خیال کو ذہن سے جھٹک دیا۔ شکاری عورتوں کا حلیہ اس طرح اجڑا ہوا نہیں ہوتا۔ وہ تو مردوں کو متوجہ کرنے کے لیے اپنے آپ میں زیادہ سے زیادہ حسن پیدا کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ ستر سال کی بڑھیا بھی ہو گی تو وہ میک اپ کے سہارے جوان بننے کی بھرپور کوشش کرے گی لیکن اس میں ایسی کوئی بات نظر نہیں آ رہی تھی۔

"تم نے مجھے پہچانا نہیں وجدان!"

اس کی زبان سے اپنا نام سن کر میں اچھل پڑا۔ مجھے اپنی گردن پر چیونٹیاں سی رینگتے ہوئے محسوس ہونے لگی اور سنسنی کی ایک لہر پورے جسم میں دوڑ گئی۔ ہندوستان کے اس

دور دراز خطے میں میرا شناسا کون ہو سکتا تھا۔ جے پور میں سب لوگ مجھے ہمت سنگھ کے نام سے جانتے تھے۔ میرے اصل نام سے ٹھاکر اور راج کماری روپ متی سمیت صرف چار پانچ افراد ہی واقف تھے یا پھر وارانا تھا جس کی تلاش میں' میں یہاں آیا تھا۔ یہ عورت کون تھی جس نے مجھے اصل نام سے مخاطب کیا تھا۔

"کک۔۔۔ کون ہو تم؟" میں اپنی ہکلاہٹ پر قابو نہیں پا سکا۔

"میں تمہاری دوست ہوں۔ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔" اس نے میرے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے جواب دیا۔

"میں نے تمہیں پہچانا نہیں اور میرا خیال ہے اس سے پہلے میں نے کبھی تمہیں دیکھا بھی نہیں۔" میں نے اپنی اندرونی کیفیت پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"دیکھا ہے۔ تم نے مجھے دیکھا ہے لیکن یہ اس وقت کی بات ہے جب تم نو عمر تھے۔" اس عورت نے جواب دیا۔

نو عمری کے حوالے سے میں ایک بار پھر چونک گیا۔ وہ شاید مجھے سنگاپور یاد دلانے کی کوشش کر رہی تھی جہاں میرا بچپن گزرا تھا۔ ایک ایک چہرہ میری نظروں کے سامنے گھومنے لگا۔ میری والدہ کی بہت سی عورتوں سے دوستی تھی۔ ان میں ہندو عورتیں بھی تھیں لیکن یہ چہرہ مجھے یاد نہیں آ رہا تھا۔

"میرا نام چترا پریتم ہے۔" اس نے کہا "سنگاپور میں تم خشونت سنگھ جی کو تو نہیں بھولے ہو گے!"

"انہیں میں کیسے بھول سکتا ہوں۔" میں نے جواب دیا۔ خشونت سنگھ کے نام سے کچھ اور چہرے میری نظروں کے سامنے گھوم گئے۔ چاچی رجنی' ان کی بیٹی اُرملا کور اور بہت سے لوگ لیکن یہ چہرہ اب بھی مجھے یاد نہیں آ رہا تھا البتہ یہ نام کچھ جانا پہچانا سا لگ رہا تھا۔

"میں خشونت سنگھ جی کی بڑی بیٹی ہوں۔ چترا پریتم۔" اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا "جن دنوں تم باپو کے گھر میں رہ رہے تھے' میں وہاں نہیں تھی۔ ایک دو مرتبہ باپو سے چوری چھپے وہاں آئی تھی۔ تم نے بھی مجھے دیکھا تھا لیکن شاید تمہیں یاد نہیں رہا۔"

"باپو کے گھر میں چوری چھپے آنا۔ کیا مطلب؟" میں نے کہا۔

"گھر والوں کو بتائے بغیر میں نے ایک ہندو لڑکے سے شادی کر لی تھی اور اپنا دھرم بھی تبدیل کر لیا تھا جس پر باپو مجھ سے ناراض ہو گئے اور قطع تعلق کر لیا۔" چترا پریتم نے کہا "انہی دنوں تم وہاں آ کر رہے۔ میں نے تمہیں دیکھا تھا اور تم نے بھی۔۔۔"

"وہ میرا بچپن تھا۔" میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔

"اس وقت سے اب تک میرے اندر بہت سی تبدیلیاں آ چکی ہیں۔ بچپن سے جوانی تک سفر کرتے ہوئے چہرے کے نقوش بھی بدل جاتے ہیں۔ تم نے مجھے کیسے پہچان لیا؟"

"کچھ عرصے پہلے' کئی سال بعد تم دوبارہ سنگاپور آئے تھے۔" چترا پریتم نے جواب دیا "اس وقت تمہارے ساتھ عورتیں بھی تھیں جن میں سے ایک کو تمہارے گھر کے سامنے قتل کر دیا گیا تھا بالکل اسی طرح جس طرح بچپن میں تمہاری آنکھوں کے سامنے تمہارے ماں باپ کو قتل کیا گیا تھا۔"

مجھے یوں لگا جیسے کسی نے میرا دل مٹھی میں پکڑ کر بھینچ دیا ہو۔ میں چشم تصور سے اپنے ماں باپ اور پھر تھائی کو دیکھنے لگا جسے میرے گھر کے سامنے ٹھیک اسی جگہ قتل کیا گیا تھا جہاں میری ماں کو خنجر کے پے در پے وار کر کے موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ چترا پریتم نے پرانی باتیں یاد دلا کر میرے زخم تازہ کر دیے تھے۔

"میں اس وقت تم سے ملنا چاہتی تھی۔" چترا پریتم کی آواز سن کر میرے خیالات منتشر ہو گئے۔ وہ کہہ رہی تھی "میں تمہارے گھر پر بھی آئی تھی مگر تم موجود نہیں تھے۔ اس کے بعد بھی دو تین مرتبہ ملنے کی کوشش کی مگر ہر مرتبہ اتفاق ہوا کہ تمہیں دور سے تو دیکھا مگر ملاقات نہیں ہو سکی پھر تم سنگاپور سے چلے گئے۔"

"تم مجھ سے کیوں ملنا چاہتی تھیں؟" میں نے پوچھا۔

"بات اب پرانی ہو چکی ہے اس لیے اسے دہرانے کی ضرورت نہیں۔" چترا پریتم نے جواب دیا۔

میں چاچا خشونت سنگھ اور اس کے گھر والوں کے بارے میں کرید کرید کر پوچھتا رہا۔ وہ ٹھیک ٹھیک جواب دیتی رہی۔ اس نے چاچا پرتاب سنگھ کے بارے میں بھی کچھ باتیں بتائیں جس سے مجھے اطمینان ہو گیا کہ میں کسی فریب کا شکار نہیں ہو رہا اور نہ ہی میرے گرد کسی نئی سازش کا جال بُنا جا رہا ہے۔

اس کی باتوں سے یہ تو مجھے یاد آ گیا کہ چاچا خشونت سنگھ کی بڑی بیٹی نے اپنی مرضی سے کسی ہندو لڑکے سے شادی کر کے دھرم بھی تبدیل کر لیا تھا اور خشونت سنگھ نے اس سے ملنا جلنا چھوڑ دیا تھا لیکن مجھے اس سلسلے میں زیادہ تفصیلات معلوم نہیں تھیں۔

"مگر تم یہاں اور تمہارا یہ حلیہ؟" میں نے الجھی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"لمبی کہانی ہے۔" چترا پریتم نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔ اس وقت سوبھراج بھی واپس آ کر خاموشی سے ہمارے قریب بیٹھ گیا۔ چترا پریتم کہہ رہی تھی "میرا شوہر کندن لال کاروباری آدمی تھا۔ اسے دھرم سے بھی بہت لگاؤ تھا۔ وہ ہر صبح باقاعدگی سے مندر جاتا تھا۔ اس نے گھر کے ایک کمرے میں بھی ایک چھوٹا سا مندر بنا رکھا تھا۔ چند مہینے پہلے۔۔۔"

چترا پریتم کرتے کرتے اس کی آواز بھرا گئی۔ وہ کچھ دیر کو خاموش ہوئی اور آگے کی کہانی سنانے لگی۔

چترا پریتم کے کہنے کے مطابق اس کے شوہر کندن لال کی زندگی کی سب سے بڑی خواہش تھی کہ ایک مرتبہ ہردوار جا کر گنگوتری میں غسل کر لے مگر کاروباری مصروفیات سنگاپور سے نکلنے کا موقع ہی نہیں دے رہی تھیں۔ بالآخر چند مہینے پہلے وہ اپنا بزنس اپنے بھائی کی نگرانی میں دے کر ہردوار جانے کی تیاری کرنے لگا۔ چترا پریتم اور ان کی پندرہ سالہ بیٹی پلوی بھی بڑے زور و شور سے تیاریاں کر رہی تھیں۔

کندن لال کے پاس پیسے کی کمی نہیں تھی۔ یہاں آتے ہی اس نے یہ کاٹیج کرائے پر لے لیا۔ ان کا پروگرام تھا کہ کم از کم ایک مہینہ یہاں ضرور رہیں گے۔ پہلا ایک ہفتہ مختلف مندروں کی یاترا میں بیت گیا اور پھر ایک روز وہ گنگوتری سے تقریباً تین میل دور پہاڑیوں میں ایک چھوٹے مگر بہت قدیم مندر کی یاترا کے لیے گئے ہوئے تھے کہ اچانک ہی بارش شروع ہو گئی۔ وہ شام کا جھٹ پٹا تھا۔ بارش بڑی قیامت خیز تھی۔ آس پاس کی پہاڑیوں سے پانی سیلابی ریلوں کی طرح بہہ رہا تھا۔

شام گزر گئی اور پھر رات ہو گئی۔ بارش کی شدت میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ مندر میں ان کے سوا کوئی اور یاتری بھی نہیں تھا۔ صرف تین پنڈت تھے اور تینوں ہٹے کٹے۔ وہ تینوں شاید نشہ کرنے کے عادی تھے۔ ان کی آنکھیں سرخ اور چہروں پر پھٹکار برستی تھی۔ چترا پریتم کے دل میں انجانا سا خوف تھا۔ اس نے جوان بیٹی کو اپنے ساتھ لپٹا رکھا تھا مگر کندن لال مطمئن تھا کہ مندر جیسے پاک مقام پر کوئی ان کے ساتھ زیادتی کی کوشش نہیں کرے گا۔ وہ سنگاپور میں پلا بڑھا تھا۔ ہندوستان کے مندروں اور پنڈتوں کے بارے میں وہ کچھ نہیں جانتا تھا۔

رات گیارہ بجے کے قریب بارش رک گئی۔ وہ لوگ شہر واپس آنا چاہتے تھے مگر پنڈتوں نے انہیں روک لیا۔ رات کے اندھیرے میں شہر کا رخ کرنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ راستے بہت دشوار تھے اور پانی اب بھی سیلابی ریلوں کی طرح بہہ رہا تھا۔

آدھے گھنٹے بعد ہلکی بارش پھر شروع ہو گئی اور پھر یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہا کہ کبھی آسمان سے پانی برسنے لگتا اور کبھی رک جاتا۔

وہ آدھی رات کے بعد کا وقت تھا۔ کندن لال فرش پر لیٹ کر سو گیا تھا مگر پریتم جاگ رہی تھی۔ اس نے دیوار سے ٹیک لگا کر ٹانگیں سامنے کو پھیلا رکھی تھیں اور اس کی جوان بیٹی پلوی بھی اس کی گود میں سر رکھے سو گئی تھی اور بالآخر چترا پریتم بھی اونگھنے لگی۔

چیخ کی آواز سن کر اس کی آنکھ کھل گئی اور پھر وہ خود بھی چیخنے لگی۔ ایک پنڈت پلوی کو بازو سے پکڑے کھینچ رہا تھا اور پلوی چیختے ہوئے اپنے آپ کو اس کی گرفت سے چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی۔

وہ تینوں پنڈت نشے میں تھے۔ ایک کے ہاتھ میں شراب کی بوتل بھی تھی۔ کندل لال اٹھ کر بیٹی کو چھڑانے کے لیے لپکا تو تیسرے پجاری نے خنجر سے اس پر حملہ کر دیا۔ پہلا وار کندن لال کے سینے پر لگا۔ وہ چیخ اٹھا۔ خون بہہ نکلا لیکن وہ بیٹی کو بچانے کے لیے پھر لپکا۔ پجاری نے خنجر سے ایک اور وار کیا۔ کندن لال زمین پر گر گیا اور پجاری اس پر خنجر کے پے در پے وار کرتا رہا۔

چترا پریتم چیختی ہوئی کبھی شوہر کو بچانے کے لیے دوڑتی کبھی بیٹی کو چھڑانے کے لیے لیکن وہ تین ہٹے کٹے وحشی درندے تھے۔ ان پر جنون طاری تھا۔ پریتم بیٹی کو پکڑ کر اپنی طرف کھینچنے لگی۔ دوسرے پجاری نے شراب کی بوتل سے اس پر حملہ کیا۔ شراب کی بوتل اس کے سر پر ٹوٹ گئی۔ چترا پریتم چیخ اٹھی۔ اس کے سر سے خون بہہ نکلا لیکن وہ پھر بیٹی کو بچانے کے لیے لپکی تو پجاری نے پھر اس پر حملہ کیا۔ ٹوٹی ہوئی بوتل کی نوکیں اس کے پیٹ میں گھس گئیں۔ وہ چیختے ہوئے ڈھیر ہو گئی۔ اس کا ذہن تاریکی میں ڈوبتا چلا گیا۔ پلوی کی چیخیں اس کے ذہن میں گونجتی رہیں اور پھر سناٹا چھا گیا۔

چترا پریتم کو جب ہوش آیا تو اس کا سب کچھ ختم ہو چکا تھا۔ ایک طرف اس کے شوہر کی لاش پڑی تھی۔ وہ زخموں سے چور تھا۔ اس کی آنتیں باہر نکلی ہوئی تھیں اور چند گز کے فاصلے پر اس کی جوان بیٹی پلوی بھی خون میں لت پت پڑی تھی۔ اس کے بدن پر لباس نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ اس کی آنکھیں حلقوں سے ابلی ہوئی تھیں۔ اس کے سینے اور پیٹ پر بھی گہرے زخم تھے۔ خون چاروں طرف پھیلا ہوا تھا۔

دن کی روشنی پھیل رہی تھی اور ہلکی بارش اب بھی ہو رہی تھی۔ مندر ویران تھا۔ وہ تینوں پنڈت غائب تھے۔ چترا پریتم مندر کے دروازے پر کھڑی مدد کے لیے چیختی رہی لیکن ویرانے میں اس کی چیخ و پکار سننے والا کوئی نہیں تھا۔ ابھی تو دن کی روشنی پھیلنا شروع ہوئی تھی اور یہ مندر شہر سے تین میل دور پہاڑیوں میں تھا۔ راستہ ویسے بھی کٹھن اور دشوار گزار تھا اور پھر سیلابی پانی کے ریلے بہہ رہے تھے۔ ایسی

صورت حال میں کوئی یاتری شہر سے اس طرف آنے کی جرأت کیسے کرسکتا تھا۔

چترا پریتم کبھی بیٹی کی لاش سے لپٹ کر چیختی، کبھی شوہر کی لاش سے اور بالآخر وہ مندر سے نکل کر کسی نہ کسی طرح شہر پہنچ گئی۔ پولیس کو اس واقعے کی اطلاع دی۔ وہ خود بھی شدید زخمی تھی اور پولیس والوں کو شدید حیرت تھی کہ وہ اس حالت میں یہاں تک پہنچی کس طرح تھی۔ چترا پریتم کو اسپتال بھجوا کر پولیس کی ایک پارٹی مندر کی طرف روانہ ہوگئی۔

دونوں لاشوں کی آخری رسومات ادا کردی گئیں۔ پولیس نے رپورٹ درج کرلی تھی مگر کوئی گرفتاری عمل میں نہیں آئی تھی۔ چترا پریتم اسپتال میں پڑی تھی۔ اس کے سر کا زخم تو زیادہ تکلیف دہ نہیں تھا لیکن پیٹ میں لگنے والے گھاؤ کی وجہ سے وہ بیس بائیس روز تک بستر سے نہیں اٹھ سکی تھی۔

پولیس کا خیال تھا کہ وہ تینوں پنڈت پکڑے جانے کے خوف سے ہردوار سے بھاگ گئے تھے اور اگر وہ ہردوار میں موجود تھے بھی تو کسی مندر میں چھپے ہوئے ہوں گے۔ یہاں چھوٹے بڑے بیسیوں مندر تھے اور مندر میں کسی پنڈت پر ہاتھ ڈالنا آسان نہیں تھا۔

چترا پریتم چلنے پھرنے کے قابل ہوئی تو۔۔۔ اس نے اپنے طور پر ان پنڈتوں کی تلاش شروع کردی۔ وہ صبح سے رات تک مندروں میں گھومتی رہتی اور بالآخر ایک روز اس نے گنگوتری مندر میں اس پنڈت کو دیکھ لیا جو اس طوفانی رات میں، ویران مندر میں اس کی بیٹی پلوی کو بازو سے پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے لے جارہا تھا۔

وہ پوجا کا وقت تھا۔ گنگوتری مندر میں بھیڑ بہت زیادہ تھی۔ چترا پریتم دھکے کھاتے ہوئے آگے تک پہنچی تھی۔ اس پنڈت کو دیکھ کر وہ لوگوں کو دھکیلتے ہوئے آگے بڑھی اور جب اس جگہ پر پہنچی تو وہ پنڈت وہاں موجود نہیں تھا۔ وہ اندر کی طرف کسی دروازے میں غائب ہوگیا تھا۔ چترا پریتم اسے تلاش کرتی رہی لیکن وہ دوبارہ نظر نہیں آیا۔

پولیس کو اطلاع دینے سے پہلے اپنے اطمینان کے لیے وہ مسلسل تین دن تک اس مندر میں جاتی رہی۔ اس دوران میں اس نے ایک مرتبہ اور اس پنڈت کو دیکھا مگر اس مرتبہ بھی وہ پہلے کی طرح غائب ہوگیا تھا۔ چترا کو بہرحال یقین ہوگیا کہ وہ پنڈت اس مندر میں پناہ لیے ہوئے ہے۔ اس کے دوسرے ساتھی یا تو ہردوار سے بھاگ گئے تھے یا دوسرے مندروں میں پناہ لیے ہوئے تھے۔

چترا پریتم نے پولیس کو گنگوتری مندر میں اس پنڈت کی موجودگی کی اطلاع دے دی۔

گنگوتری کو ہندوستان کی چار اہم ترین ہمالیائی یاتراؤں میں ایک اہم اور مقدس ترین مقام حاصل ہے۔ دوسری اہم اور دھارمک یاتراؤں بدری ناتھ، کیدار ناتھ اور یمنوتری ہیں۔ ان چاروں کے مجموعے کو ہندو دھرم میں "چار دھام" کہا جاتا ہے۔

گنگوتری مندر کے تقدس کے پیش نظر یہ ممکن نہیں تھا کہ چترا پریتم کی نشان دہی پر پولیس مندر پر دھاوا بول کر اس پنڈت کو گرفتار کرلیتی لیکن چترا پریتم بھی آرام سے بیٹھنے والی نہیں تھی۔ اس نے پولیس کے اعلیٰ ترین افسروں سے رابطہ کیے اور بالآخر اس کی نشان دہی پر پنڈت کو مندر سے باہر نکال کر حراست میں لے لیا گیا لیکن وہ پنڈت زیادہ دیر تک پولیس کی حراست میں نہیں رہ سکا تھا۔ گنگوتری مندر کا پروہت درجنوں پنڈتوں کو لے کر پولیس اسٹیشن پہنچ گیا۔ اس کے تھوڑی ہی دیر بعد سیکڑوں پجاریوں اور پنڈتوں سے پولیس اسٹیشن کا محاصرہ کرلیا۔

گنگوتری مندر کے پروہت اور وہاں کے دوسرے پنڈتوں اور پجاریوں نے یہ بیان دیا کہ یہ ناری جس طوفانی رات کا ذکر کررہی ہے اس رات وہ پنڈت گنگوتری مندر میں موجود تھا بلکہ۔۔۔ اس سے کئی روز پہلے بھی وہ مندر سے باہر نہیں گیا تھا اور اس طوفانی رات کے کئی روز بعد بھی گنگوتری مندر سے باہر نہیں نکلا۔ اس سارے عرصے میں وہ ایک جاپ میں مصروف رہا تھا۔

پولیس اس پنڈت کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کرسکتی تھی۔ اگر محض چترا پریتم کے بیان پر اسے حراست میں رکھا جاتا تو سیکڑوں پنڈت اور پجاری ہنگامہ شروع کردیتے جس پر قابو پانا مشکل ہوجاتا۔

اس پنڈت کو چھوڑ دیا گیا۔ چترا پریتم تلملا کر رہ گئی۔ اس کی بیٹی اور شوہر کا قاتل اس کے سامنے تھا۔ اس نے پولیس کو اس کی نشان دہی کردی تھی لیکن اس کے خلاف کوئی کارروائی نہیں ہوئی تھی اور وہ آزادی سے دندنا رہا تھا۔

"میرا دیور بھی اس واردات کی اطلاع ملنے پر سنگاپور سے یہاں آگیا۔" چترا پریتم کہہ رہی تھی "وہ دلی سے دیر کی چٹھی بھی لے کر آیا تھا لیکن اس پر بھی پولیس نے قاتلوں کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی۔ میرا دیور مجھے اپنے ساتھ سنگاپور واپس لے جانا چاہتا تھا لیکن میں نے قسم کھائی تھی کہ جب تک گنگا کے اُجلے پانی کو اپنی معصوم بیٹی اور شوہر کے قاتلوں کے خون سے آلودہ نہ کردوں، یہاں سے نہیں جاؤں گی۔ میرے پاس دولت کی کمی نہیں۔ یہاں ایسے بہت سے لوگ موجود ہیں جو دس بیس ہزار روپے لے کر کسی کو بھی موت کے گھاٹ اتار سکتے ہیں لیکن میں ان قاتلوں کو اپنے ہاتھوں سے ان کے انجام تک پہنچانا چاہتی ہوں۔ میں اس وقت تک یہاں سے نہیں جاؤں گی جب تک اپنی بیٹی اور شوہر کے خون کا بدلہ نہ لے لوں۔"

میں خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ اس کا چہرہ [illegible] کا تصویر بنا ہوا تھا۔ اس کی کہانی سن کر مجھے واقعی [illegible] ہوا تھا۔

"آج تمہیں دیکھا تو مجھے کچھ عجیب سا لگا۔" چترا پریتم کہہ رہی تھی "پہلے تو مجھے شبہ ہوا کہ شاید میں تمہیں پہچاننے میں غلطی کررہی ہوں لیکن میرا من کہہ رہا تھا کہ تم وہی ہو۔ میں نے تمہارا پیچھا شروع کردیا۔ میں سمجھ گئی کہ تم لوگوں کو رہائش کی تلاش ہے اور میں یہ بھی جانتی تھی کہ تمہیں کہیں رہائش نہیں ملے گی۔ دو ڈھائی گھنٹوں تک تمہارا پیچھا کرنے کے بعد بالآخر میں نے تم سے رابطہ کرلیا۔ تمہاری باتیں سن کر مجھے یقین کرلینا پڑا کہ میں نے تمہیں پہچاننے میں غلطی نہیں کی اور نجانے کیا بات ہے کہ اب میں اپنے آپ کو وہ نہیں سمجھتی جو چند گھنٹے پہلے تھی۔ تنہا تنہا اور بے یارو مددگار۔ اب مجھے لگتا ہے کہ میرے اندر ایک نئی طاقت آگئی ہے لیکن تمہیں یہاں دیکھ کر مجھے بڑی حیرت ہورہی ہے۔ ایک مسلمان کا گنگوتری میں کیا کام!"

چترا پریتم کا یہ آخری جملہ سن کر سوبھراج بھی چونک گیا۔ وہ مجھے ہمت سنگھ کے نام سے جانتا تھا۔ اس نے مجھے سادھو کے بھیس میں بھی دیکھا تھا اور یہ بھی جان گیا تھا کہ میں ہمت سنگھ کے ٹھاکر بھانوت سنگھ اور روپ متی کے ساتھ رہ رہا ہوں۔ وہ مجھے ہندو ہی سمجھتا تھا لیکن اس وقت میرے مسلمان ہونے کے انکشاف پر اس کی بٹن جیسی چھوٹی آنکھیں کچھ اور سکڑ گئی تھیں۔

"عبادت گاہ کا تعلق کسی بھی دھرم سے ہو، سب کے لیے قابلِ احترام ہوتی ہے۔" میں نے چترا پریتم کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

"تمہاری عبادت گاہیں! یہ مقدس مقام۔ انہیں تو [illegible] پنڈتوں نے عیاشی کے اڈے بنا رکھا ہے۔" چترا پریتم [illegible] "میرے ساتھ جو کچھ ہوا وہ میں کیسے بھول سکتی ہوں۔ [illegible] معصوم اور بے گناہ بچی کو جس طرح ایک مندر میں بے [illegible] کرکے موت کے گھاٹ اتارا گیا، میں اسے کیسے ایک [illegible] مقام سمجھ لوں۔ میرے شوہر کا خون بہایا گیا۔ میں کیسے [illegible] کہ یہ مندر بھگوان کا گھر ہے، ایک مقدس مقام ہے۔ [illegible] اور بدمعاش یہ حرکت کرتے تو شاید مجھے زیادہ دکھ [illegible] مگر یہ سب کچھ تو ان پنڈتوں نے کیا ہے جنہیں ہم [illegible] کا اوتار سمجھتے ہیں۔ دیوتا سمان مانتے ہیں۔۔۔ میں [illegible] کیسے بھول سکتی ہوں؟"

"یہ سب کچھ واقعی افسوس ناک ہے۔"

میں نے اس کے خاموش ہونے پر کہا اور اس کے ساتھ ہی موضوع بدل کر چاچا خشونت سنگھ کے بارے میں بات کرنے لگا۔ جب میں تھائی لینڈ سے سنگاپور واپس آیا تھا تو مجھے پتا چل گیا تھا کہ چاچا خشونت سنگھ اور رجنی چاچی کا انتقال ہوچکا ہے۔ ان کی چھوٹی بیٹی اُرملا کی بھی شادی ہوگئی تھی۔ اُرملا ہی سے مجھے پتا چلا تھا کہ چاچا خشونت سنگھ نے میرے ڈیڈی کی ڈائری لاہور میں اپنے کسی دوست کو بھیج دی تھی۔ اُرملا نے مجھے اس کا نام اور پتا بھی سمجھا دیا تھا کہ میں جب لاہور جاؤں تو وہ ڈائری اس سے لے لوں۔ میں جانکی کے ساتھ سنگاپور سے لاہور جانے کے لیے ہی روانہ ہوا تھا لیکن راجستھان کے ریگزار میں ہوائی جہاز کے حادثے نے میرا راستہ بدل دیا اور میں دارا کا تعاقب کرتے ہوئے یہاں تک پہنچ گیا اور مجھے کچھ اندازہ نہیں تھا کہ یہ بے راہ قدم مجھے کہاں لے جائیں گے اور اب چترا پریتم کی کہانی بھی میری کہانی میں شامل ہورہی تھی۔

"میں کھانا تیار کروں۔ تم لوگوں کو بھوک لگ رہی ہوگی۔" چترا پریتم نے کہا "سامنے ندی بہہ رہی ہے۔ تم لوگ چاہو تو منہ ہاتھ دھو آؤ۔"

وہ ایک کنستر سے ٹرے میں چاول نکال کر چننے لگی۔ میں اور سوبھراج ہٹ سے نکل کر ندی پر آگئے۔

"تم نے پہلے تو نہیں بتایا تھا کہ تم مسلمان ہو؟" سوبھراج نے کہا۔ اس وقت ہم دونوں ندی کے کنارے پر بیٹھے ہوئے تھے۔ اس کا بدلا ہوا لہجہ میں نے فوراً ہی محسوس کرلیا تھا۔

"میں نے اپنے بارے میں سب کچھ تمہیں بتا دیا تھا سوائے نام کے۔" میں نے جواب دیا "اور اس رات جب بلونت سنگھ اور دارا کے بارے میں بات ہورہی تھی تو میں نے تمہیں بتایا تھا کہ ان دونوں نے جے پور کے پنڈتوں اور پجاریوں کو میرے اور روپ متی کے خلاف بھڑکا کر ہندو مسلم فساد کروانے کی کوشش کی تھی۔ ان ہنگاموں کی ساری تفصیل تو تمہیں لاجونتی نے بھی بتائی تھی۔"

"ہاں۔ مجھے کچھ یاد پڑتا ہے۔" سوبھراج نے جواب دیا "بہرحال اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ میں نے تمہاری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا ہے اور دوستی کسی دین دھرم کی پابند نہیں ہوتی۔"

ہم تقریباً ایک گھنٹا وہاں بیٹھے رہے۔ سردی بھی اچھی خاصی تھی اور پھر چترا پریتم کی آواز سن کر ہم اندر آگئے۔ اس نے فرش پر بچھے ہوئے نمدے پر ہی دسترخوان بچھا دیا تھا۔ پلیٹوں کے ساتھ اس نے دال اور چاولوں والی دونوں

پتیلیاں بھی دسترخوان پر ہی رکھ دی تھیں۔

کھانے کے دوران میں زیادہ تر خاموشی ہی رہی۔ اس کے بعد ہم اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ سوبھراج اونگھنے لگا تھا۔ اس وقت اگرچہ صرف نو ہی بجے تھے لیکن لگتا تھا' رات آدھی سے زیادہ بیت چکی ہو۔

"تمہیں نیند آرہی ہے سوبھراج جی۔" چترا پریتم نے پوچھا "اس کمرے میں بستر لگا ہوا ہے۔ اندر جاکر سوجاؤ۔"

اس نے اٹھ کر دائیں طرف والے کمرے کا دروازہ کھول دیا۔

لیمپ کی روشنی اس کمرے کے اندر تک پہنچ رہی تھی۔ وہاں بھی نمدہ بچھا ہوا تھا اور دو تین کمبل پڑے ہوئے تھے۔ سوبھراج اس کمرے میں جاکر لیٹ گیا اور کمبل اوڑھ لیا۔

"آؤ۔ ہم اس کمرے میں بیٹھتے ہیں۔ مجھے تم سے بہت ساری باتیں کرنی ہیں۔ بہت دنوں بعد تو کوئی اپنا ملا ہے۔ تمہارے سامنے باتیں کرکے دل کا بوجھ ہلکا کروں گی۔" چترا پریتم نے اٹھ کر باہر والا دروازہ بند کردیا اور دوسرے کمرے کا دروازہ کھول دیا۔

لیمپ ایسی جگہ رکھا ہوا تھا کہ تینوں کمروں میں روشنی کی ضرورت کو پورا کررہا تھا۔ اس کمرے میں بھی نمدہ بچھا ہوا تھا اور اس پر ایک کمبل پڑا ہوا تھا۔

میں دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اور دونوں پیر آگے کو پھیلا لیے۔ چترا میرے سامنے آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی۔ اس کی کمر بالکل سیدھی تھی اور سینہ تنا ہوا تھا۔

"لگتا ہے تمہیں یوگا سے بہت دلچسپی ہے۔ تمہاری بیٹھک کا یہ آسن۔۔۔"

"یوگا سے مجھے شروع ہی سے دلچسپی رہی ہے۔" اس نے میری بات پوری نہیں ہونے دی "میں سنگاپور میں شادی سے پہلے اور بعد میں بھی مشقیں کیا کرتی تھی۔ کئی سال تک یوگا کی مشقیں کرنے والا کہہ سکتا ہے کہ اس نے اس فن میں مہارت حاصل کرلی ہے لیکن میں ایسا نہیں کہوں گی۔ یوگا تو ایک پُراسرار علم ہے جسے سیکھنے کے لیے پورا جیون بھی کم ہے۔ چند آسن سیکھ لینے سے اپنے آپ کو یوگا کا ماہر نہیں کہا جاسکتا۔ میں نے ابھی کچھ نہیں سیکھا۔ بہت کچھ سیکھنا چاہتی ہوں۔"

"آبادی سے دور ویرانے میں اس کانچ میں اکیلے رہتے ہوئے تمہیں ڈر نہیں لگتا جبکہ تمہارے دشمن بھی شاید آس پاس منڈلا رہے ہیں؟" میں نے کہا۔

"میں اکیلی کب ہوتی ہوں۔" چترا پریتم نے جواب دیا "یہاں کے رہنے والے میرے بارے میں سب کچھ جانتے ہیں۔ وہ مجھے پاگل سمجھتے ہیں۔ میں دن بھر مندروں اور بازاروں میں گھومتی رہتی ہوں اور شام ہونے سے پہلے کسی یاتری فیملی کو لے کر آجاتی ہیں۔ دور دراز کے شہر سے آنے والے یاتری رہائش کے لیے پریشان ہوتے ہیں۔ میں جب کسی فیملی کو یہاں لے کر آتی ہوں تو وہ بہت خوش ہوتے ہیں اور آج تو اتفاق سے تم مل گئے۔ میرے اندر نئی طاقت پیدا ہوگئی ہے۔ مجھے ایک نیا حوصلہ ملا ہے۔ لگتا ہے جیسے میرا کوئی اپنا مجھے مل گیا ہو۔"

چترا پریتم سے میری کبھی ایسی ملاقات نہیں ہوئی جسے یاد رکھا جاسکتا۔ اس کے کہنے کے مطابق جن دنوں چاچا خشونت سنگھ کے ہاں پناہ گزیں تھا انہی دنوں وہ تین مرتبہ وہاں آئی تھی مگر مجھے یاد نہیں تھا۔ اس نے کہا تھا۔ چاچا خشونت سنگھ اور اس کے گھر والوں کے جانے سے میں بھی اس سے کچھ اپنائیت سی محسوس کرنے لگا تھا۔

"تم نے بتایا نہیں۔ تم یہاں کیسے آئے ہو اور تمہارے ساتھ یہ سوبھراج کون ہے؟" چترا نے پوچھا۔

پہلے میں نے اسے سوبھراج کے بارے میں بتایا پھر ہوائی جہاز کے حادثے کے بعد کے واقعات بتانے لگا اور میں بولا۔

"میری اطلاع کے مطابق دارا یہاں آچکا ہے یا آنے والا ہے۔ وہ بھی مندروں ہی میں چھپتا پھر رہا ہے۔ میں بھی تمہاری طرح قسم کھا رکھی ہے کہ جب تک اس اپنے ماں باپ کے قتل کا بدلہ نہیں لے لوں گا اس وقت چین سے نہیں بیٹھوں گا اور دنیا کے آخری کونے تک اس پیچھا کروں گا۔"

"تم نے یہاں کے مندروں اور پنڈتوں کو دیکھا ہے اور پھر بھی کہتے ہو کہ یہ مقدس عبادت گاہیں ہیں۔" وہ خاموش ہونے پر بولی۔

"عبادت گاہوں کا تو اس میں کوئی تصور نہیں ہے۔" میں نے کہا "یہ مندر واقعی مقدس مقامات ہیں۔ تصور دھرم چاریوں کا ہے جنہوں نے ان کے تقدس کا خیال رکھا اور ان عبادت گاہوں کو اپنے گھناؤنے مقاصد استعمال کررہے ہیں۔ بہرحال۔" میں ایک لمحے کو خاموش پھر بولا "تم کئی مہینوں سے یہاں ہو۔ مندروں میں رہتی ہو۔ بہت سے پنڈتوں اور پجاریوں کے بارے جان چکی ہوگی۔ پرگھیا راج نامی کسی پنڈت کے بارے جانتی ہو؟"

"کیا کہا۔ پرگھیا راج۔۔۔! یہی نام لیا نا تم نے؟" اچھل پڑی۔ اس کے چہرے پر سنسنی کے تاثرات آئے تھے۔

"ہاں۔ پرگھیا راج۔" میں نے جواب دیا "میں نے اسے دیکھا نہیں۔ صرف نام سنا ہے اور یہ پنڈت پرگھیا راج ہی دارا کا دوست ہے۔ دارا اس کے پاس یا تو آچکا ہے یا آنے والا ہے لیکن تم اس نام پر کیوں چونک گئیں؟" میں سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

"یہاں وہ وحشی ہے جس نے میری معصوم بچی کو پامال کرکے موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔" بات کرتے ہوئے اس کا چہرہ سرخ ہوگیا "یہی درندہ میرے شوہر کا قاتل ہے جو آج تک آزادی سے دندناتا رہا ہے۔"

"اوہ!" اس مرتبہ میں اچھل پڑا "اگر یہ وہی پنڈت ہے تو اطمینان رکھو۔ اس سے تمہاری بیٹی اور شوہر کے خون کا بدلہ ضرور لیا جائے گا۔ قانون اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکا تو کوئی بات نہیں۔ ہم اپنی عدالت لگائیں گے۔"

"مجھے۔ مجھے یقین تھا کہ تم ہی میری مدد کروگے۔" چترا کا لہجہ جذباتی ہوگیا "تمہیں دیکھتے ہی مجھے اپنے آپ میں نئی طاقت محسوس ہونے لگی تھی۔ میں جانتی ہوں۔۔۔ میری بیٹی اور میرے شوہر کا خون رائگاں نہیں جائے گا۔ ان روحوں کو سکون ضرور ملے گا۔"

چترا پریتم کی بات پر مجھے پہلے بھی یقین تھا اور اب یہ یقین اور زیادہ مضبوط ہوگیا تھا کہ اس کی بیٹی اور شوہر کو پنڈت پرگھیا راج اور اس کے دوسرے ساتھیوں ہی نے قتل کیا تھا اور جب کئی روز بعد چترا نے اسے شناخت کرلیا تو پورے گھر کے پنڈت اور پجاری اس کی حمایت میں اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ اپنے ایک ساتھی کو بچانے کے لیے وہ دھرم کو بیچ میں لے آئے تھے اور دھرم کے نام پر شروع ہونے والی کسی کارروائی سے آسانی سے قابو نہیں پایا جاسکتا اور اسی لیے پولیس کو پنڈت پرگھیا راج کو چھوڑنا پڑا تھا اور میں یہ بھی جانتا تھا کہ قانون اب اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گی اور وہ اپنی گھناؤنی کارروائیاں جاری رکھے گا۔

دارا کے دوست ایسے ہی لوگ ہوسکتے تھے جنہیں انسانیت چھو کر نہ گزری ہو۔ دارا مجھ سے بچنے کے لیے پورے بھاگ کر ہندوستان آگیا تھا اور اتفاق سے جہاز کے حادثے نے مجھے بھی ہندوستان پہنچا دیا اور یہاں بھی سے دارا ابھی میری نظروں میں آگیا۔ وہ مجھ سے بچ رہا تھا۔ مجھ سے نجات حاصل کرنے کے لیے اس نے میرے خلاف کیا کچھ نہیں کیا تھا۔ اس نے تو پورا ملک ہی میرے خلاف کھڑا کردیا تھا۔ اس نے مجھے پنڈتوں اور پجاریوں سے مروانے کی کوشش کی تھی لیکن وہ اپنی کسی کوشش میں کامیاب نہیں ہوسکا تھا۔ اس کی ہر سازش اس پر الٹتی رہی تھی۔ کالی ناگ والی بیماریوں میں وہ میرے ہاتھ آتے آتے رہ گیا تھا لیکن ایک مرتبہ پھر بھاگ نکلنے میں کامیاب ہوگیا تھا۔

اور یہ میری خوش قسمتی تھی کہ جے پور میں دوبارہ پنڈت سوبھراج سے ملاقات ہوگئی اور اس سے ایک معرکے کے بعد اس نے میری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھا دیا۔ پنڈت پرگھیا راج کے بارے میں انکشاف سوبھراج ہی نے کیا تھا اور میں اس امید پر یہاں چلا آیا تھا کہ دارا پناہ لینے کے لیے پنڈت پرگھیا راج ہی کے پاس آئے گا اور اتفاق سے یہاں آتے ہی یہ انکشاف ہوا تھا کہ پرگھیا راج دارا سے بھی زیادہ خوفناک درندہ ہے۔

میں پنڈت پرگھیا راج کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا لیکن چترا پریتم نے جو کچھ بتایا تھا اس سے میں بہت کچھ سمجھ گیا تھا۔ وہ دارا کی طرح انسان کے قالب میں خوں خوار بھیڑیا تھا۔

میں اور چترا پریتم دیر تک باتیں کرتے رہے۔ سردی بڑھتی جارہی تھی اور چترا پریتم اسی طرح تن کر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے ایک گھاگھرا اور ایک چادر جسم پر ڈال رکھی تھی اور اس چادر کے نیچے کوئی لباس نہیں تھا۔ میں نے قریب پڑا ہوا کمبل اٹھا کر اس کی طرف بڑھا دیا۔

"لو یہ کمبل اوڑھ لو۔ تمہیں سردی لگ رہی ہوگی۔"

"سردی تو تمہیں بھی لگ رہی ہوگی۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا "یہ کمبل تم اوڑھ لو اور میں چائے بنا کر لاتی ہوں۔ آج میں تمہیں رات بھر نہیں سونے دوں گی۔ بہت دنوں بعد اپنا کوئی ملا ہے۔ میں رات بھر تم سے باتیں کرتی رہوں گی۔" وہ اٹھ کر سامنے والے کمرے میں چلی گئی اور آتش دان میں آگ جلا کر چائے بنانے لگی۔

میں نے کمبل اپنے اوپر ڈال لیا اور اسے کام کرتے ہوئے دیکھتا رہا۔ پندرہ بیس منٹ بعد وہ چائے بنا کر لے آئی۔ ایک پیالی میری طرف بڑھا دی اور دوسری اپنے قریب رکھ لی۔

"تم بھی کمبل اوڑھ لو۔ سردی لگ جائے گی۔" میں نے یہ کہتے ہوئے کمبل کا ایک کونا پکڑ کر اس کی طرف بڑھا دیا۔

اس نے گھور کر میری طرف دیکھا تو مجھے فوراً ہی اپنی غلطی کا احساس ہوگیا۔ وہ نیم عریاں تھی اور میں اسے اپنے کمبل میں لپیٹنے کی دعوت دے رہا تھا لیکن دوسرے ہی لمحے اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر میرے قریب دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی اور کمبل کو کھول کر دونوں پر پھیلا دیا۔ وہ میرے ساتھ جڑ کر بیٹھی تھی۔ میں اس کے بدن کی حرارت محسوس کررہا تھا لیکن نہ تو میرے دل کی دھڑکن بے ربط ہوئی اور نہ ہی سینے میں کوئی ہلچل پیدا ہوئی۔

رات دھیرے دھیرے بیتتی رہی اور ہم باتیں کرتے رہے۔ میں بار بار پنڈت پرگھیا راج کا ذکر کرکے اس کے زخموں کو نہیں کریدنا چاہتا تھا اس لیے میں جان بوجھ کر اس موضوع سے دور ہی رہا اور زیادہ تر سنگاپور کے بارے میں باتیں کرتا رہا۔ سنگاپور کی یادوں سے میرے زخم ہرے ہورہے تھے اور سینے میں پیدا ہونے والی کسک بہت اچھی لگ رہی تھی۔ یہ کسک ہمیشہ سے تھی اور میرے زخم بھی کبھی مندمل نہیں ہوئے تھے۔ میں ان باتوں کو کبھی نہیں بھولا تھا۔ وہ گھر اور اس میں ہنستے مسکراتے چہرے۔ کتنا سکون تھا ہماری زندگیوں میں۔ باپ کی شفقت' ماں کی ممتا..... لیکن وارانے مجھ سے سب کچھ چھین لیا تھا۔ اس نے میری زندگی میں انگارے بھردیے تھے اور اب وہ کئی برسوں سے مجھ سے بچنے کے لیے بھاگتا پھر رہا تھا اور میں موت کا سایہ بن کر اس کے پیچھے لگا ہوا تھا۔ وارا شاید اب تھک گیا تھا۔ میں چڑھتا سورج تھا اور وہ ڈھلتا سایہ۔ اسے پناہ کی ضرورت تھی اور ہندوستان کے اس دور دراز کونے میں' ہمالہ کی ترائیوں میں وہ پناہ کی تلاش میں ہی آرہا تھا یا آچکا تھا لیکن میں نے بھی طے کرلیا تھا کہ ہمالیہ کی یہ گود اس کی آخری پناہ گاہ ثابت ہوگی۔

سنگاپور کی یادوں نے مجھے اداس کردیا۔ چترا پریتم بھی شاید سمجھ گئی تھی۔ اس نے موضوع بدل دیا اور یوگا کے بارے میں باتیں کرنے لگی۔

"یہ ہر دوار ہے۔۔۔ جسے WAY TO GOD GATE بھی کہا جاتا ہے۔ گنگوتری سے گنگا جنم لیتا ہے۔ گنگوتری ہندوؤں کا سب سے اہم اور مقدس ترین مقام مانا جاتا ہے۔ جس طرح مسلمان حج کے لیے مکہ جاتے ہیں اسی طرح ہندو بھی زندگی میں کم از کم ایک بار گنگوتری یاترا کو اپنا دھرم سمجھتے ہیں۔ یہاں سے صرف چوبیس کلومیٹر کے فاصلے پر رشی کیش ہے۔ وہ جگہ میسوری اور نینی تال سے بھی زیادہ خوب صورت ہے۔ رشی کیش کو یوگا کا گھر کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔

"دنیا کے کونے کونے سے لوگ یوگا سیکھنے کے لیے وہاں آتے ہیں۔ وہاں تمہیں لاتعداد مندر بھی ملیں گے اور بدھوں کے اسٹوپے بھی۔ ہندو یوگی اور بدھ بھکشو یوگا کے استاد سمجھے جاتے ہیں۔ انہیں اس پُراسرار علم پر عبور حاصل ہے۔ انہیں دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ وہ لوگ ایسے کارنامے کس طرح انجام دے لیتے ہیں کہ جن کا عام آدمی تصور بھی نہیں کرسکتا۔"

"تم رشی کیش گئی ہو؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں۔" اس نے اثبات میں سرہلایا "پلوی اور اپنے شوہر کندن لال کے قتل کے بعد جب مجھے اسپتال سے ملی تھی تو میں نے پرگھیا راج اور اس کے ساتھیوں کی شروع کردی تھی۔ میں لوگوں کو ان کے حلیے بتا کر پوچھ تھی۔ مجھے پتا چلا کہ ان میں سے ایک کے حلیے سے ایک پنڈت رشی کیش کے ایک مندر میں موجود رشی کیش پہنچ گئی اور تقریباً ایک ہفتے تک اس تلاش کرتی رہی۔ وہ پنڈت تو مجھے نہیں ملا البتہ بھکشو سے ملاقات ہوگئی تھی۔ میں اس سے کچھ تھی لیکن میرا دھیان نہیں اگا۔ تاہم اس کی باتوں نے جان لیا تھا کہ وہ اس پُراسرار علم کے بارے میں معلومات رکھتا ہے۔"

"کون ہے وہ۔۔۔؟" میں نے پوچھا۔ "وقت ملا تو سے ضرور ملوں گا۔"

"اس کا نام گوتم بھوش ہے۔" چترا پریتم نے کچھ عرصے پہلے ہی تبت سے آیا تھا۔ تبت ان پُراسرار کے لیے دنیا بھر میں شہرت رکھتا ہے لیکن راستے اور خطرناک ہیں کہ کوئی اس جانب جانے کی ہمت کرپاتا۔"

"اگر من میں کچھ پالینے کی لگن ہو تو راستے کٹھنائیاں اور خطرات کوئی معنی نہیں رکھتے۔" میں جواب دیا۔

چترا پریتم کی باتوں سے میں نے اندازہ لگالیا کے بارے میں وہ مجھ سے زیادہ معلومات رکھتی ہے۔ مارشل آرٹس کی تربیت حاصل کی تھی اور اس کے سخت ریاضت کرنی پڑی تھی۔ میں نے اپنے اندر پُراسرار قوت پر قابو پایا تھا۔ یوگا مجھے اس حد تک جس کی ضرورت تھی اور اب چترا کی باتیں سن کر میری دلچسپی بڑھتی جارہی تھی اور میں نے طے کرلیا ملا تو اس میدان میں بھی کچھ حاصل کرنے کی کو گا۔ میں نے تبت سے آنے والے بدھ بھکشو کو نام ذہن نشین کرلیا تھا۔

رات اپنے آخری پہر میں داخل ہوچکی تھی۔ نیچے کی طرف پھسلتے پھسلتے بالکل لیٹ چکی تھی۔ کہ مجھے رات بھر جگائے گی اور مجھ سے باتیں لیکن اب وہ اونگھنے لگی تھی۔

میں بڑی آہستگی سے اپنی جگہ سے اٹھ طرح اسے اوڑھا دیا اور دوسرے کمرے میں سوبھراج دونوں کمبل اوڑھے گہری نیند کمبل میں گھس گیا اور کچھ دیر بعد میری ہونے لگیں۔

پنڈت پرگھیا راج کو انسان سمجھنا انسان کی بہت بڑی غلطی تھی۔ وہ شکل و صورت ہی سے درندہ لگتا تھا۔ لمبا قد' بھاری بھرکم جسم' سر کے بال بے تحاشا بڑھے ہوئے تھے جنہیں تین چار چٹیوں میں سمیٹنے کی کوشش کی گئی تھی۔ داڑھی اور مونچھوں کے بال اس طرح ملے ہوئے تھے کہ منہ کا دہانہ تلاش کرنا مشکل تھا۔ ناک سوسے کی طرح پھیلی ہوئی تھی اور آنکھیں سرخ جن سے صاف لگتا تھا کہ وہ نشہ کرنے کا عادی ہے۔ اس کا سینہ بھی ریچھ کی طرح سیاہ بالوں سے بھرا ہوا تھا۔ اس نے دھوتی باندھ رکھی تھی اور جسم کے بالائی حصے پر پیلی چادر اوڑھی ہوئی تھی جو ایک کندھے سے بار بار پھسل رہی تھی۔

میں اور سوبھراج' چترا پریتم کے ساتھ اس مندر میں آئے تھے۔ ہمیں تقریباً دو گھنٹے انتظار کرنا پڑا تھا اور پھر وہ اچانک ہی مندر کے پچھلے حصے میں سے کسی طرف سے نکل کر سامنے آگیا تھا۔ چترا پریتم اس کی نشان دہی کرکے فوراً ہی واپس چلی گئی تھی۔

مندر میں یاتریوں کا ہجوم تھا۔ لوگ ایک دوسرے کو دھکے دیتے ہوئے آجارہے تھے۔ میں اور سوبھراج ایک طرف کھڑے پنڈت پرگھیا راج کو دیکھتے رہے۔ میں نے سوبھراج کو بتا دیا تھا کہ یہی وہ پنڈت ہے جس نے اپنے دو دوسرے پنڈتوں کے ساتھ مل کر چترا پریتم کی معصوم بیٹی کو بے آبرو کرکے موت کے گھاٹ اتارا تھا اور اس کے شوہر کندن لال کو بھی خنجروں کے پے درپے وار کرکے ہلاک کردیا تھا اور یہی وہ پنڈت پرگھیا راج ہے جس کی ہمیں تلاش ہے۔

سوبھراج کو مندر میں پرگھیا راج کی نگرانی پر چھوڑ کر میں ہردوار کی سڑکوں پر گھومنے لگا۔ یہاں کئی مندر تھے۔ میں ہر مندر میں جھانکتا اور وارا کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرتا رہا اور میرے خیال میں یہ حماقت ہی تھی۔ وارا حلیہ تبدیل کرنے کا ماہر تھا اور محض حلیے کی بنا پر اسے تلاش کرلینا ممکن نہیں تھا۔

دو دن گزر گئے اور پھر اچانک ہی ہردوار کی آبادی میں اضافہ ہونے لگا۔ یوں تو ہزاروں کی تعداد میں یاتری روزانہ یہاں آتے جاتے تھے لیکن اس روز اچانک ہی یاتریوں کی آمد میں اضافہ ہوگیا تھا۔

سرائے' ہوٹلز اور گیسٹ ہاؤسز۔۔۔ کہیں جگہ نہیں رہی تھی۔ لوگ کھلی جگہوں پر پڑے تھے۔ متمول یاتری اپنے ساتھ چھوٹے خیمے اور چھولداریاں لے کر آئے تھے۔ پنڈت' سادھو اور پجاری بھی سیکڑوں کی تعداد میں چلے آرہے تھے اور پھر یہ دلچسپ انکشاف ہوا کہ اگلے اتوار کو سورج گرہن ہونے والا ہے۔ چاند گرہن اور سورج گرہن ہندو دھرم میں بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ ایسے موقعوں پر خاص پوجا کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ جوتشی اور پنڈت اپنے حساب کتاب میں مصروف ہوجاتے ہیں اور پجاری جاپ پر بیٹھ جاتے ہیں۔

اس روز صبح گیارہ بجے کے قریب میں اور چترا پریتم گنگوتری کی طرف چلے گئے۔ یوں تو دریا کے دونوں کناروں پر دور دور تک ایسے گھاٹ بنے ہوئے تھے جہاں گنگا جل میں غسل کرنے والوں کا رش لگا رہتا تھا لیکن گنگوتری کا وہ مقام جہاں مختلف سمتوں سے پہاڑی ندی نالوں کا پانی آکر گرتا ہے وہاں بہت زیادہ بھیڑ تھی۔ کھوے سے کھوا چھل رہا تھا۔ اس جگہ چٹانوں کے ساتھ ایک بہت لمبا چوڑا پختہ تالاب بنا ہوا تھا جس میں نیچے اترنے کے لیے پختہ سیڑھیاں بھی بنی ہوئی تھیں۔ اس طرف پہاڑوں سے آنے والا پانی اس وسیع و عریض تالاب میں گرتا اور دوسری طرف بہہ کر دوسرے پانی میں مل جاتا۔ اس طرف بھی پہاڑوں سے مختلف سمتوں سے آنے والا پانی جمع ہوکر نشیب کی طرف بہتا تھا اور ذرا آگے جاکر اس کا پاٹ ایک باقاعدہ دریا کی صورت اختیار کرلیتا تھا۔ یہی وہ جگہ ہے جسے گنگا کی جنم بھومی بھی کہا جاسکتا ہے۔

اس تالاب کے ساتھ ہموار اور کشادہ جگہ تھی اور اس سے آگے عمودی چٹانیں تھیں جن میں لاتعداد گپھائیں بنی ہوئی تھیں۔ یہ سب گپھائیں اور غار قدرتی تھے جو صدیوں میں پانی کے کٹاؤ سے معرضِ وجود میں آئے تھے۔ کئی غار اور گپھائیں ایسی تھیں جن میں پانی نہیں تھا اور وہاں یاتریوں نے قبضہ جما رکھا تھا۔ تاہم لاتعداد گپھائیں ایسی تھیں جن میں پہاڑوں کے اندر ہی اندر سے آنے والا تیز رفتار پانی پُرشور آواز سے بہہ رہا تھا۔ یہ غار اور سرنگیں پہاڑوں میں بہت اندر تک چلی گئی تھیں۔

اس وسیع و عریض تالاب پر بہت رش تھا۔ تالاب کے اندر بھی لوگ بھرے ہوئے تھے اور کشادہ سیڑھیوں پر بھی لوگ ایک دوسرے پر گویا چڑھے ہوئے تھے۔ بچے' مرد اور عورتیں سب ایک ہی جگہ غسل کررہے تھے۔ بعض عورتیں نیم عریاں تھیں بعض نے اگرچہ لباس پہن رکھے تھے لیکن بھیگے ہوئے لباس جسم سے چپک کر انہیں برہنہ کررہے تھے مگر کسی کو ہوش نہیں تھا۔ تالاب کے کنارے پر بھی لوگ ہجوم در ہجوم جمع تھے۔

ٹھیک بارہ بجے سورج گرہن شروع ہونے والا تھا۔ یہ جزوی سورج گرہن تھا جو تقریباً ایک گھنٹے تک جاری رہتا اور ہر ہندو کی خواہش تھی کہ وہ اس وقت پوجا میں مصروف ہو یا گنگا جل میں غسل کررہا ہو تاکہ اس کے سارے گناہ دھل جائیں۔

میں چترا پریتم کے ساتھ ایک طرف کھڑا افراتفری کا یہ

منظر دیکھ رہا تھا کہ ایک ہٹا کٹا آدمی لوگوں کو دھکے دیتے ہوئے تالاب کی طرف بڑھتے ہوئے نظر آیا۔ اس نے سفید دھوتی باندھ رکھی تھی۔ جسم کے بالائی حصے پر کوئی کرتہ وغیرہ نہیں تھا البتہ ایک سفید کپڑا دوپٹے کی طرح بند کر کے گلے میں لٹکا رکھا تھا۔ اس کی عمر تیس بتیس کے لگ بھگ ہوگی۔ لمبا قد، توانا جسم، مضبوط ہاتھ پاؤں، گٹھا سرا اور ماتھے پر قشقہ۔ وہ کوئی پنڈت یا پجاری نہیں تھا لیکن اس کے حلیے اور انداز و اطوار سے لگتا تھا کہ وہ دھرم کے معاملے میں بہت کٹر ہے۔ وہ لوگوں کو ادھر اُدھر دھکے دیتا راستہ بناتے ہوئے تالاب میں اتر گیا اور تقریباً وسط میں پہنچ کر رک گیا اور دونوں ہاتھ جوڑ کر زیر لب کچھ بدبدانے لگا پھر چلو میں پانی بھر بھر کر اپنے اوپر ڈالتا رہا۔ اس دوران میں وہ بار بار سورج کی طرف دیکھتا رہا تھا۔

ٹھیک بارہ بجے سورج پر نچلی طرف سیاہ دھبا پڑنا شروع ہوگیا۔ اس کے ساتھ ہی فضا میں اشلوک اور بھجن وغیرہ کی آوازیں گونجنے لگیں۔

تالاب کے وسط میں کھڑا وہ آدمی کچھ زیادہ ہی پُرجوش نظر آرہا تھا۔ وہ کبھی ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو جاتا اور کبھی اپنے گنجے سر پر پانی کے چھینٹے ڈالنے لگتا اور کبھی دونوں ہاتھ اوپر پھیلا کر چیخنے والے انداز میں کوئی بھجن گانے لگتا یا اشلوک پڑھنے لگتا۔

نجانے کیا بات تھی کہ اتنے بڑے ہجوم میں میری توجہ اسی ایک شخص پر مرکوز ہو کر رہ گئی تھی۔ یوں تو ہر شخص اپنے اپنے انداز میں پوجا کر رہا تھا لیکن اس شخص کی حرکتیں کچھ زیادہ ہی دلچسپ لگ رہی تھیں۔

سورج پر سیاہ دھبا بڑھ گیا تھا۔ روشنی کم ہوگئی تھی۔ لوگوں کے اشلوک پڑھنے اور بھجن گانے کی آوازیں بلند ہوتی گئیں اور پھر آدھے گھنٹے بعد گرہن لوٹنا شروع ہوا۔

میری نظریں تالاب کے دوسرے کنارے پر تین باوردی پولیس والوں کی طرف اٹھ گئیں۔ وہ ابھی ابھی وہاں نمودار ہوئے تھے۔ ان میں ایک سب انسپکٹر تھا جس کے ہاتھ میں ریوالور تھا۔ باقی دو کانسٹیبل رائفلیں سنبھالے ہوئے تھے۔ وہ تینوں متجسس نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھ رہے تھے اور پھر ایک کانسٹیبل نے چیختے ہوئے تالاب کے وسط میں اس شخص کی طرف اشارہ کیا جو میری توجہ کا مرکز بنا ہوا تھا۔ سب انسپکٹر نے بھی اسے دیکھ لیا اور پھیپھڑوں کی پوری قوت سے چیخا۔

"آشوتوش! اپنے آپ کو ہمارے حوالے کردو۔ تم گھیرے میں آچکے ہو۔ بچ کر نہیں جاسکو گے۔"

تالاب کے وسط میں کھڑے ہوئے آشوتوش نامی اس شخص نے چونک کر پولیس والوں کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر وحشت سی ابھر آئی۔ دوسرے ہی لمحے وہ چیختے ہوئے تالاب کے اس کنارے کی طرف آنے کی کوشش کرنے لگا جہاں ہم کھڑے تھے۔ سب انسپکٹر نے ریوالور والا ہاتھ اوپر اٹھا کر ہوائی فائر کردیا۔ پہلے فائر پر شاید لوگوں نے توجہ نہیں دی تھی۔ دوسرے فائر پر کھلبلی سی مچ گئی۔

تالاب میں بھی لاتعداد لوگ تھے۔ پانی آشوتوش کے سینے تک تھا۔ وہ اپنے سامنے آنے والے ہر فرد کو ہاتھ مار کر دھکا دے کر ہٹا کر آگے بڑھتا رہا۔ اس کے منہ سے عجیب سی آوازیں نکل رہی تھیں جنہیں کوئی معنی نہیں پہنائے جاسکتے تھے۔ پولیس والے تالاب کے کنارے پر دوڑنے لگے۔ کنارے اگرچہ فٹ پاتھ کی طرح کشادہ تھے لیکن لوگوں کی بھیڑ لگی ہوئی تھی۔

"آشوتوش رک جاؤ ورنہ گولی مار دوں گا۔" سب انسپکٹر لوگوں کو دھکے دے کر راستہ بناتے ہوئے چیخا۔

لیکن آشوتوش جانتا تھا کہ پولیس والے اس پر گولی نہیں چلا سکتے تھے۔ وہاں سیکڑوں لوگ موجود تھے۔ بھگدڑ سی مچی ہوئی تھی۔ گولی کسی اور کو بھی لگ سکتی تھی۔

آشوتوش تالاب کے کنارے پر آگیا۔ اس کی دھوتی اور گلے میں دوپٹے کی طرح پڑے کپڑے سے بھی پانی نچڑ رہا تھا۔ وہ ایک جگہ پر رک گیا اور پھر اس نے ایک عجیب حرکت کی۔ ایک ٹانگ کتے کی طرح اٹھائی۔ ایک ہاتھ بھونپو کی طرح منہ پر رکھا اور چیختے ہوئے منہ سے عجیب آوازیں نکالنے لگا۔ یہ حرکت عام طور پر بچے کسی کو چڑانے اور طیش دلانے کے لیے کرتے ہیں۔

آشوتوش کی اس حرکت پر مجھے اس کے ذہنی توازن پر بھی شبہ ہونے لگا۔ اس نے دو تین مرتبہ یہ حرکت دہرائی اور ایک ہاتھ میں دھوتی پکڑ کر ایک طرف بھاگ کھڑا ہوا۔

وہ بالکل وحشی بن گیا تھا۔ اس نے نو دس سال کی عمر کے ایک بچے کو ٹھوکر مار کر دور گرا دیا۔ اس کا رخ ہماری طرف تھا۔ میں نہیں سمجھ سکا تھا کیا معاملہ ہے اور پولیس اسے کیوں پکڑنا چاہتی ہے۔

میں آشوتوش کے راستے سے ہٹ گیا مگر چترا پر تم اس کی زد میں آگئی۔ اس نے چترا کو دونوں ہاتھوں میں اٹھا کر میری طرف اچھال دیا۔ چترا چیختے ہوئے میرے اوپر آئی اور ہم دونوں زمین پر گر گئے۔ آشوتوش وحشیانہ انداز میں چیختے ہوئے چٹان کے ایک غار میں گھس گیا۔ اس دوران میں پولیس والے بھی وہاں پہنچ گئے۔ قریب کھڑے ہوئے ایک آدمی نے چترا کو سہارا دے کر اٹھا دیا تھا اور میں بھی اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔

"کیا بات ہے آفیسر۔ یہ پاگل کون ہے؟" میں نے سب

انسپکٹر سے پوچھا۔

"یہ پاگل نہیں قاتل ہے۔ دو جوان لڑکیوں کا مرڈر کرچکا ہے۔ ایک تیسری لڑکی اس کے قبضے میں ہے جسے یہ قتل کرنا چاہتا ہے۔" انسپکٹر نے جواب دیا اور پھر جلدی جلدی میں جو تفصیل بتائی وہ بڑی خوفناک تھی۔

سب انسپکٹر کے کہنے کے مطابق آشوتوش کا تعلق راجستھان کے شمر انوپ گڑھ سے تھا۔ وہ پُراسرار قوتوں کو تسخیر کرنے کے لیے مختلف قسم کے جاپ کرتا رہتا تھا۔ کچھ عرصے پہلے وہ ایک پنڈت کے ہتھے چڑھ گیا تھا جس نے اسے ایک ایسا جاپ بتایا جس پر عمل کر کے ابدی حیات حاصل کی جاسکتی ہے۔ اس جاپ پر عمل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ تین سورج گرہن پر چودہ سالہ تین کنواری ناریوں کی بھینٹ دی جائے۔ ناغہ ہونے کی صورت میں سب کچھ ختم ہو جائے گا۔ آشوتوش اب تک دو لڑکیوں کو موت کے گھاٹ اتار چکا تھا۔ یہ تیسرا سورج گرہن تھا۔ اس نے ایک چودہ سالہ کنواری لڑکی کو اپنے قبضے میں کر رکھا تھا۔ جسے وہ عین اس وقت ہلاک کرتا جب گرہن ختم ہونے کے آخری لمحات میں ہوتا۔

"ہم اس کی تلاش میں تھے۔" سب انسپکٹر کہہ رہا تھا "لیکن وہ بھاگ گیا اگر اسے نہیں پکڑا گیا تو وہ اس لڑکی کو ہلاک کردے گا۔"

"ارے روکو اسے۔" چترا پریتم چیخی "وہ میری بچی کو مار ڈالے گا۔ روکو اسے۔"

میں نے چونک کر چترا پریتم کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں سی اڑ رہی تھیں۔ وہ اپنی جوان بیٹی کھو چکی تھی۔ اسے بے آبرو کر کے ہلاک کیا گیا تھا اور اب کسی اور کی بیٹی کو ذبح کیا جانے والا تھا۔

سب انسپکٹر اپنے آدمیوں کو اشارہ کرتے ہوئے اس غار میں گھس گیا۔ میں بھی اس کے پیچھے دوڑ پڑا اور چترا نے بھی میرے پیچھے دوڑ لگا دی۔ یہ چٹان زیادہ لمبی چوڑی نہیں تھی۔ تقریباً سو گز آگے ہم کھلی جگہ پر نکل آئے۔ یہ کھلی جگہ بھی پچاس ساٹھ فٹ سے زیادہ نہیں تھی۔ اس سے آگے بلند چٹانیں تھیں۔ ان میں بھی کئی سرنگیں تھیں۔ ایک سرنگ میں داخل ہونے والا پانی ندی کی صورت میں چٹان کے ساتھ ساتھ بہتا ہوا آگے جاکر تالاب کی دوسری طرف کسی جگہ سے گزرتا تھا۔ میں نے پولیس والوں کو ایک سرنگ میں گھستے دیکھا تو میں دوسری سرنگ کی طرف دوڑا۔ چترا بھی میرے پیچھے پیچھے دوڑی چلی آرہی تھی۔

سرنگ خاصی طویل تھی جو آگے جاکر ایک اور سرنگ سے مل گئی تھی جس میں پانی بہہ رہا تھا۔ یہ سرنگ بہت کشادہ تھی۔ پانی بیچ میں تھا اور اطراف میں خشک جگہ تھی۔ میں اور چترا دیوار کے ساتھ ساتھ آگے چلتے رہے۔

آگے تنگ اور کشادہ سرنگوں کا جال سا بنا ہوا تھا۔ ہمالیہ کی برفانی چوٹیوں سے بہنے والے پانی نے ان چٹانوں کو اندر سے کھوکھلا کر رکھا تھا اور یہ عمل دو چار سال میں نہیں، صدیوں میں اس حد تک پہنچا تھا اور میں سمجھتا ہوں کہ ان چٹانوں کو اندر ہی اندر کاٹنے کا، پانی کا عمل اب بھی جاری تھا جس کا نتیجہ مزید کئی صدیاں گزرنے کے بعد سامنے آئے گا۔

ان سرنگوں میں اندھیرا نہیں تھا۔ کہیں کہیں چٹانیں ٹوٹی ہوئی تھیں اور مدھم روشنی سرنگوں کے اندر بھی پہنچ رہی تھی۔ پانی بڑی تیزی سے ان سرنگوں میں بہہ رہا تھا۔ پانی کی رفتار اور اس کا شور اعصاب پر دہشت سی طاری کر رہا تھا۔ بعض سرنگوں میں تو پانی اس قدر زیادہ تھا کہ ان میں داخل ہونا اپنے آپ کو موت کے حوالے کردینے کے مترادف تھا۔ ایسی جگہوں پر ہمیں راستہ بدل کر کسی اور سرنگ میں داخل ہونا پڑتا۔

پولیس والوں کے بارے میں بھی کچھ پتا نہیں تھا کہ وہ کس طرف چلے گئے تھے اور میں یہی سوچ رہا تھا کہ آشوتوش کے پیچھے آکر میں نے کوئی غلطی تو نہیں کی؟ لیکن میں نے اس خیال کو ذہن سے جھٹک دیا۔ ایک لڑکی کی زندگی خطرے میں تھی۔ وہ ایک جنونی کے جنون کی بھینٹ چڑھنے والی تھی اور شاید اس کی زندگی کے چند ہی منٹ باقی رہ گئے تھے۔

میں جلد سے جلد آشوتوش کو تلاش کرلینا چاہتا تھا لیکن ہم ان سرنگوں کی بھول بھلیوں میں پھنس کر رہ گئے تھے۔ میں ایک اور سرنگ میں داخل ہوگیا۔ سرنگ کے کنارے پر کچھ جگہ اونچی تھی اور نیچے طوفانی رفتار سے پانی بہہ رہا تھا۔ میں چٹانی دیوار کے ابھرے ہوئے پتھروں کے سہارے آہستہ آہستہ آگے بڑھتا رہا۔ چترا مجھ سے دو تین قدم پیچھے تھی۔ اگر ہم میں سے کسی کا پیر پھسل جاتا تو تیز رفتار پانی تنکے کی طرح ہمیں بہا کر لے جاتا۔ چترا بھی اس خطرے سے پوری طرح آگاہ تھی اور بہت سنبھل سنبھل کر چل رہی تھی۔ اگلے موڑ پر پہنچ کر ہم رک گئے۔

"یہ... یہ آواز سنی تم نے...؟"

چترا کی کپکپاتی ہوئی سی آواز سنائی دی۔ میں ہمہ تن گوش ہوگیا اور پھر وہ آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ بالکل ایسے لگ رہا تھا جیسے کوئی شخص ایک انگلی منہ میں ڈال کر اسے حرکت دیتے ہوئے چیخ رہا ہو۔ بالکل بچوں جیسی حرکت۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ آشوتوش تھا۔ تالاب سے بھاگتے ہوئے بھی اس نے ایسی ہی حرکت کی تھی۔ اس آواز کا مطلب تھا کہ ہم آشوتوش کے قریب پہنچ گئے تھے۔ ہم

دوسری سُرنگ میں مڑ گئے۔ یہ سُرنگ زیادہ طویل نہیں تھی۔ دوسری طرف روشنی دکھائی دے رہی تھی اور پھر ڈھول کی آواز سن کر میں چونک گیا۔ وہ جو کوئی بھی تھا جنونی انداز میں پوری طاقت سے ڈھول بجا رہا تھا اور ظاہر ہے وہ آشوتوش کے علاوہ اور کون ہو سکتا تھا۔

غار کے دہانے پر پہنچ کر میں رک گیا۔ سامنے کھلی جگہ تھی اور دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ ڈھول کی آواز بائیں طرف سے آ رہی تھی۔ میں نے بڑی احتیاط سے جھانک کر اس طرف دیکھا اور دوسرے ہی لمحے مجھے سینے میں اپنا سانس رکتا محسوس ہونے لگا۔

وہ بہت کھلی جگہ تھی۔ اس کے چاروں طرف سنگلاخ چٹانیں کنوئیں کی دیواروں کی طرح اوپر کو اٹھی ہوئی تھیں۔ بائیں طرف پتھر پر ایک جوان لڑکی رسیوں سے بندھی پڑی تھی۔ اس کے بدن پر لباس نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ اس کا سر گنجا تھا اور منہ میں کپڑا ٹھنسا ہوا تھا اور آشوتوش گلے میں ڈھول لٹکائے اسے پوری طاقت سے پیٹتے ہوئے اس پتھر کے چاروں طرف ناچ رہا تھا۔ کبھی کبھی وہ منہ سے چیخوں جیسی آوازیں نکالتا اور بار بار سر اٹھا کر اوپر دیکھتا۔

میں نے ذرا اور آگے بڑھ کر اوپر دیکھا۔ سورج سر پر تھا۔ گرہن سے سورج ر جو سیاہ دھبا پڑ گیا تھا وہ آدھے سے زیادہ ختم ہو گیا تھا۔ گرہن پوری طرح ختم ہونے میں دس بارہ منٹ باقی تھے اور اس لڑکی کی زندگی کی مہلت بھی اتنی ہی رہ گئی تھی۔ گرہن مکمل ہونے کے آخری لمحات میں اسے بے دردی سے موت کے گھاٹ اتار دیا جانے والا تھا۔

چترا پریتم نے بھی آگے جھک کر وہ خوفناک منظر دیکھا۔ اگر میں جلدی سے اس کے منہ پر ہاتھ نہ رکھ دیتا تو اس کی چیخ آشوتوش کو ہماری موجودگی سے آگاہ کر دیتی۔

میں محتاط نگاہوں سے ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔ سامنے والی بعض سُرنگوں میں تیز رفتار پانی کے بہنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ لگتا تھا، کسی سُرنگ کے اندر پانی بلندی سے گر رہا تھا۔ اس کھلی جگہ میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر چند بڑے پتھر پڑے ہوئے تھے۔ سامنے کسی سُرنگ سے ایک فٹ چوڑی نالی کی صورت میں پانی باہر بھی بہہ رہا تھا جو کھلی جگہ پر پڑے ہوئے ایک پتھر کے قریب جمع ہو کر زمین کے اندر کہیں غائب ہو رہا تھا۔

صورتِ حال کا جائزہ لینے کے بعد میں نے چترا پریتم کو سرگوشی میں کچھ ہدایات دیں اور آشوتوش ڈھول بجاتے ہوئے جیسے ہی دوسری طرف مڑا، میں سُرنگ سے نکل کر تیزی سے دوڑتے ہوئے ایک بڑے پتھر کے پیچھے پہنچ گیا اور پھر مجھے اس سے آگے والے پتھر کے پیچھے پہنچنے کا موقع مل گیا۔

اب میں اس تیسرے پتھر کے پیچھے پہنچ چکا تھا جس کے قریب سرنگ سے آنے والا پانی زمین میں جذب ہو رہا تھا۔ آشوتوش سے میرا فاصلہ اب دس گز سے زیادہ نہیں تھا۔

جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا، آشوتوش کا جوش بڑھتا جا رہا تھا۔ پتھر پر بندھی ہوئی لڑکی کے چاروں طرف ڈھول بجاتے اور ناچتے ہوئے وہ بار بار اوپر دیکھ رہا تھا۔ اب میں اس لڑکی کو بھی پوری طرح دیکھ سکتا تھا۔ اس کا چہرہ خوف سے پیلا ہو رہا تھا اور آنکھوں میں بے پناہ دہشت تھی۔ آشوتوش جس طرف جاتا، اس کی نظریں بھی گھوم جاتیں۔ وہ ہاتھوں اور پیروں کو حرکت دینے کے قابل نہیں تھی البتہ سر کو زور زور سے جھٹک رہی تھی۔

میں اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ اگر مجھے اگلے پتھر تک جانے کا موقع مل جائے تو میں آشوتوش پر حملہ کر کے اسے گرفت میں لے سکتا تھا اور پھر میں نے جیسے ہی اس پتھر کی طرف چھلانگ لگائی، آشوتوش نے مجھے دیکھ لیا۔

اس نے بڑی پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ڈھول گلے سے اتار کر پھینک دیا اور ایک ڈنڈا اٹھا کر وحشیانہ انداز میں چیختے ہوئے میری طرف لپکا۔

میں اس کا مقابلہ کرنے کے لیے بالکل تیار تھا۔ اس نے جیسے ہی حملہ کیا، میں نے ڈنڈے کو دونوں ہاتھوں پر روکا اور اسے گرفت میں لے کر پوری قوت سے آگے کی طرف جھٹکا دیا۔ آشوتوش کو شاید اس کی توقع نہیں تھی۔ وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور آگے کو قلابازی کھاتا ہوا گرا لیکن اس نے اٹھنے میں بھی بڑی پھرتی کا مظاہرہ کیا۔

وہ ارنا بھینسے کی طرح ڈکراتا ہوا میری طرف لپکا۔ اس کے سر کی ٹکر میرے پیٹ پر لگی۔ وہ مجھے دھکیلتے ہوئے لے گیا۔ میں پیچھے پتھر سے ٹکرایا تو زوردار جھٹکے سے مجھے یوں لگا جیسے میرے اندر کا سارا سسٹم ہل کر رہ گیا ہو۔ آشوتوش پیچھے ہٹ گیا اور پیٹ پر سر سے ایک اور ٹکر ماری۔ وہ تیسری ٹکر مارنے کے لیے پیچھے ہٹا تو میں نے اپنے آپ کو سنبھال کر پوری قوت سے اس پر حملہ آور ہوا۔ میرا گھونسا اس کے سینے پر لگا تو وہ ایک جھٹکے سے تن کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے مجھے گھونسا مارنا چاہا تو میں..... اس کا وار روک کر کلائی دونوں ہاتھوں کی گرفت میں لے کر اسے موڑتا چلا گیا۔ آشوتوش دہرا ہو گیا۔ میں نے اس کی کلائی کو ایک ہاتھ میں پکڑے رکھا اور اس کی گردن پر زوردار گھونسا مار دیا۔ وہ منہ کے بل نیچے گرا لیکن اس کے ساتھ ہی اس نے ٹانگ چلا دی۔ اس کا پیر میرے گھٹنے کے پیچھے لگا۔ میں اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور لڑکھڑاتے ہوئے اس کے اوپر گرا۔ اس دوران میں نے چترا پریتم کو سُرنگ سے نکل کر اس پتھر کی طرف دوڑتے ہوئے دیکھ

لیا تھا جس پر وہ لڑکی بندھی ہوئی تھی۔

آشوتوش نے بھی اسے دیکھ لیا تھا۔ اس نے مجھے اٹھا کر دور اچھال دیا۔ میں پشت کے بل پتھروں پر گرا، میرا دماغ جھنجھنا اٹھا۔ آشوتوش دہاڑتے ہوئے چترا کی طرف لپکا۔ اس نے چترا کو اٹھا کر دور پھینک دیا۔ چترا بھی چیخ اٹھی۔

آشوتوش نے آسمان کی طرف دیکھا۔ میری نظریں بھی اوپر اٹھ گئیں۔ سورج کے نچلے کنارے پر سیاہی کی بہت معمولی سی لکیر رہ گئی تھی۔ آشوتوش دونوں ہاتھ سینے پر مار کر وحشیوں کی طرح چیخا اور پتھر کی دوسری طرف جا کر نیچے جھک گیا اور جب وہ سیدھا ہوا تو اس کے ہاتھ میں چوڑے پھل والی تلوار دیکھ کر میں کانپ اٹھا۔ وہ پتھر کی اس طرف آ گیا جہاں سے پتھر پڑی ہوئی لڑکی پر وار کیا جا سکتا تھا۔ میں نے اپنی جگہ سے اٹھنا چاہا مگر جلد بازی میں میرا پیر چھوٹے چھوٹے پتھروں پر پڑا اور میں پھر گر گیا۔

آشوتوش نے ایک بار پھر سورج کی طرف دیکھا اور تلوار کو دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر سر سے بلند کر لیا۔ میں اٹھ کر آشوتوش کی طرف لپکا لیکن چترا پریتم مجھ سے زیادہ تیز ثابت ہوئی۔ وہ بھی زمین پر پڑا ہوا ڈنڈا اٹھا کر آشوتوش کی طرف لپکی تھی۔ آشوتوش کے منہ سے عجیب سی زوردار آواز نکلی اور اس سے پہلے کہ وہ لڑکی کی گردن پر تلوار کا وار کرنے کے لیے ہاتھوں کو حرکت دیتا، چترا نے اس پر حملہ کر دیا۔ ڈنڈا بڑے زور سے آشوتوش کے سر پر لگا۔ اس کا سر پھٹ گیا اور خون بہہ نکلا۔

آشوتوش زخمی شیر کی طرح دہاڑتے ہوئے پیچھے مڑا۔ میں نے اپنی جگہ سے چھلانگ لگا دی اور چترا کو ساتھ لیتا ہوا دور جا گرا۔ آشوتوش نے گھومتے ہوئے بڑی قوت سے تلوار چلائی تھی۔ اگر ہمیں ایک لمحے کی بھی تاخیر ہو جاتی تو چترا کی گردن اڑ جاتی یا تلوار کی زد میں آ کر میرا بازو کٹ جاتا۔

آشوتوش کے سر پر لگنے والی ضرب خاصی زوردار تھی۔ خون اس کی گردن کو تر کرتا ہوا کندھے پر بہہ رہا تھا۔ اس پر جنون طاری تھا اور اس کا چہرہ کچھ اور بھیانک ہو گیا تھا۔ وہ ایک بار پھر تلوار کو اوپر اٹھا کر لڑکی کی طرف بڑھا۔ میرے ہاتھ میں پتھر دیکھ کر اس نے چترا کے ہاتھ سے ڈنڈا بھی چھوٹ گیا تھا جو ہمارے قریب ہی پڑا تھا۔ میں نے ڈنڈا اٹھا کر لیٹے ہی لیٹے پوری قوت سے آشوتوش کی ٹانگوں پر وار کیا۔

میرا یہ حربہ کارگر رہا۔ آشوتوش چیختا ہوا نیچے گرا۔ پنڈلی کی ہڈی پر لگنے والی ضرب خاصی زوردار تھی۔ اس مرتبہ آشوتوش بھی اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی تھی۔ میں پھرتی سے لڑکھڑا کر اٹھا اور آشوتوش پر ٹھوکریں برسانے لگا۔

ایک موقع پر اس نے میرا پیر پکڑ کر زوردار جھٹکا دیا۔ میں لڑکھڑا کر پشت کے بل گرا۔ آشوتوش اٹھ کر تلوار کی طرف لپکا لیکن میں نے اسے ٹانگ سے پکڑ کر گھسیٹ لیا۔

اب ہم ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو گئے تھے۔ آشوتوش کے حلق سے بھیڑیے جیسی غراہٹیں نکل رہی تھیں۔ اس میں بے پناہ طاقت بھری ہوئی تھی۔ وہ مجھے رگیدتا ہوا دور لے گیا اور میرا سر ایک پتھر سے ٹکرانے لگا۔ میرا دماغ ہل کر رہ گیا۔

میں نے اپنی پوری طاقت مجتمع کر کے اسے اپنے اوپر سے دھکیل دیا اور پھرتی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ آشوتوش نے بھی اٹھنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔ وہ ایک بار پھر ارنا بھینسے کی طرح ڈکراتے ہوئے میری طرف بڑھا لیکن اس مرتبہ میں اسے کوئی موقع نہیں دینا چاہتا تھا۔ میں اپنی جگہ پر کھڑے کھڑے، طاقتور اسپرنگ کی طرح اچھلا۔ میں نے اچھلتے ہی ایک ٹانگ اندر کی طرف سمیٹ لی اور دوسرے پیر کی کک اس کے سر پر لگائی۔ میں نے موٹے سول کے جوگرز پہن رکھے تھے۔ کک اس کی پیشانی پر لگی۔ کھال پھٹ گئی اور خون بہہ نکلا لیکن میں نے اسے سنبھلنے کا موقع نہیں دیا اور اس پر پے در پے ٹھوکریں برساتا رہا۔ وہ بہت سخت جان تھا یا یہ اس کا جنون تھا کہ میری ہر کک کھانے کے بعد بھی وہ ڈکراتے ہوئے مجھ پر حملہ آور ہونے کی کوشش کرتا رہا۔

ایک مرتبہ اسے میرے قریب آنے کا موقع مل گیا۔ میں نے کھلی ہتھیلی سے اس کے چہرے پر وار کیا۔ اس کی ناک سے خون بہہ نکلا۔ وہ بڑے زور سے چیخا تھا مگر اس کے جنون کی شدت میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔

خون میں تر اس کا چہرہ بہت بھیانک ہو گیا تھا۔ اس نے ایک بار پھر میری طرف لپکنے کی کوشش کی۔ اس مرتبہ میں نے ہوا میں اچھل کر پیروں سے اس کی گردن پر نیک لاک لگا دیا اور اپنے آپ کو جھٹکے سے ایک طرف گرایا۔ وہ بھی میرے ساتھ ہی گرا۔

میں نیچے گرتے ہوئے اپنے آپ کو سنبھال نہیں سکا تھا۔ میرا سر ایک پتھر سے ٹکرا گیا تھا۔ میری آنکھوں کے سامنے نیلی پیلی چنگاریاں سی رقص کرنے لگیں۔ آشوتوش اٹھ کر ایک بار پھر میری طرف لپکا۔ اور اسی وقت فضا ایک فائر کی آواز سے گونج اٹھی۔ اس کے ساتھ ہی آشوتوش کی بھیانک چیخ بھی چٹانوں میں گونج اٹھی۔ گولی اس کے سینے میں لگی تھی اور وہ لڑکھڑا رہا تھا۔ میں نے سر کو دو تین جھٹکے دیے اور پھرتی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہی سب انسپکٹر اور پولیس والے چند گز کے فاصلے پر کھڑے تھے۔ سب انسپکٹر کے ہاتھ میں ریوالور تھا۔

آشوتوش گولی کھانے کے بعد بھی نہیں گرا تھا۔ وہ بری

طرح دہاڑ رہا تھا۔ پھر وہ مڑ کر اس پتھر کی طرف بڑھنے لگا جہاں چترا اس لڑکی کے ہاتھوں کی رسیاں کھولنے کی کوشش کر رہی تھی۔ چترا نے اس کے منہ میں ٹھنسا ہوا کپڑا نکال دیا تھا اور وہ لڑکی بھی بری طرح چیخ رہی تھی۔

آشوتوش کے لیے شاید ایک گولی کافی ثابت نہیں ہوئی تھی۔ سب انسپکٹر نے دو سرا فائر کیا۔ اس مرتبہ گولی آشوتوش کے سر کے پچھلے حصے میں لگی اور وہ کٹے ہوئے درخت کی طرح لہراتے ہوئے گر گیا۔

آشوتوش کے جسم کو بار بار ہلکے ہلکے جھٹکے لگتے رہے اور پھر وہ بے حس و حرکت ہو گیا۔ وہ ختم ہو چکا تھا مگر اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں جیسے وہ سورج کو دیکھ رہا ہو۔

سب انسپکٹر دونوں پولیس والے دوڑ کر اس کے قریب پہنچ گئے جب کہ میں دوڑ کر اس پتھر پر چڑھ گیا اور اس لڑکی کے پیروں کی رسیاں کھولنے لگا۔ چترا اس کے ہاتھ کھول چکی تھی۔ اس نے اپنی چادر اتار کر لڑکی پر ڈال دی۔ لڑکی اس کے ساتھ لپٹ کر سسکیاں بھرنے لگی۔ اس کا جسم کانپ رہا تھا۔

میں پتھر سے اترا تو مجھے وہ کپڑا نظر آ گیا جو آشوتوش نے لمبائی کے رخ پر تہ کر کے گردن میں ڈال رکھا تھا۔ میں نے وہ کپڑا اٹھا کر اس کی تہیں کھول دیں۔ وہ ایک پوری چادر تھی جو میں نے چترا پر ڈال دی اور آشوتوش کی لاش کے قریب آ گیا۔

"شکریہ شریمان جی۔" سب انسپکٹر میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "اگر آپ اس کا پیچھا کرتے ہوئے بروقت یہاں نہ پہنچ جاتے تو یہ درندہ اس لڑکی کو ختم کر دیتا۔"

"یہ لڑکی کون ہے۔ اس کے وارثوں کے بارے میں کچھ جانتے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"یہ ایک ہفتے پہلے اپنی فیملی کے ساتھ یہاں آئی تھی۔" انسپکٹر نے بتایا۔ "اس کے دوسرے ہی روز لاپتا ہو گئی۔ اس کے باپ نے تھانے میں رپورٹ لکھوا دی تھی اور پھر ہمارے ایس پی صاحب نے آشوتوش کا فائل نکال کر میرے حوالے کر دیا۔ یہ پچھلے دو سورج گرہن کے موقعوں پر بھی ایسی وارداتیں کر چکا ہے اور ایس پی صاحب کو یقین تھا کہ اس لڑکی کو بھی اسی نے اغوا کر کے پہاڑوں میں کہیں چھپا رکھا ہو گا۔ ہم اس کی تلاش میں تھے اور آج صبح دس بجے ہمیں اطلاع ملی کہ اسے گنگوتری میں دیکھا گیا ہے۔ فوراً ہی اس کی تلاش شروع کر دی گئی اور پھر یہ میری نظروں میں آ گیا لیکن یہ وہاں سے بھاگ نکلا۔ ہم ان پہاڑیوں میں سرنگوں کے اندر کھو کر رہ گئے اور اگر آپ یہاں نہ پہنچ جاتے تو بے چاری لڑکی ماری جاتی۔ آپ کا بھی بہت شکریہ دیوی جی۔" آخری الفاظ اس نے چترا کی طرف دیکھ کر کہے تھے جو اپنی ساتھ لپٹائے بیٹھی تھی۔

"میری ایک مدد اور۔۔۔ شریمان جی۔" سب انسپکٹر کی طرف دیکھتے ہوئے بولا "میں ایک کانسٹیبل کو آپ کر دیتا ہوں۔ آپ اس لڑکی کو ہردوار تھانے تک تھانے کے سب لوگ دیوی جی کو جانتے ہیں۔ رکنے کی ضرورت نہیں اور اگر ضرورت پڑی تو ہم آپ سے اور ان دیوی جی سے رابطہ کر لیں گے۔"

"ٹھیک ہے۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔" جواب دیا۔

میں نے اپنی ٹی شرٹ اتار کر چترا کی طرف اچھال وہ لڑکی کو لے کر پتھر کی دوسری طرف اتر گئی۔ چند جب وہ گھوم کر ہمارے سامنے آئیں تو اس لڑکی شرٹ پہن رکھی تھی اور چترا والی چادر دھوتی کی طر رکھی تھی۔ آشوتوش والی سفید چادر چترا نے لپیٹ

ہم آدھے گھنٹے بعد سرنگوں سے نکل کر باہر صورتِ حال ویسی کی ویسی تھی۔ ہزاروں یاتری گنگوتری غسل اور پوجا میں مصروف تھے۔ کسی کو پتا نہیں چل ہمالیہ کی گود میں کھیلا جانے والا ایک خونی ڈراما اپنے پہنچ چکا تھا۔

کانسٹیبل ہمارے ساتھ تھا۔ ہم گنگوتری سے ہردوار تھانے آ گئے۔ ہمیں تقریباً آدھا گھنٹا تو وہاں رکنا اور پھر ہم اس لڑکی کو پولیس کی تحویل میں دے کر چترا کے کاتیج میں آ گئے جسے وہ کٹیا کہتی تھی۔

میری حالت بہت خستہ ہو رہی تھی۔ کم بخت آشو میں بے پناہ طاقت بھری ہوئی تھی۔ اس نے جس طر رگیدا تھا اسے میں عرصے تک یاد رکھوں گا۔

میں کاتیج میں آتے ہی بستر پر گر گیا تھا۔ میرا ہو گیا تھا اور سینے میں ہلکا ہلکا درد بھی ہو رہا تھا۔ چترا سے کچھ فاصلے پر دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی تھی۔ کمرا اندر چلی گئی۔ چند منٹ بعد باہر نکلی تو اس نے دوسری چادر اوڑھ رکھی تھی۔

"میں چائے بناتی ہوں۔ کھایا تو ہم نے کچھ نہیں بھی نہیں چاہ رہا۔ سر دکھ رہا ہے بہت شدت پر تم آشتدان کے سامنے پیڑھی پر بیٹھ گئی۔

اس وقت تین بج رہے تھے۔ بھوک واقعی نہ رہی تھی البتہ چائے کی طلب ہو رہی تھی۔ میں چترا کی طرف دیکھتا رہا۔ گنگوتری میں سب تھا کہ آشوتوش ۲۰ سال کی ایک کنواری لڑکی کو والا ہے تو وہ کس طرح تڑپ اٹھی تھی۔ کس طرح

روکو۔ وہ میری بچی کو مار ڈالے گا۔" چترا اپنی جوان بیٹی کی ہلاکت کر گئی تھی اور وہ نہیں چاہتی تھی کہ کسی اور کے ساتھ بھی ایسا ہو اور پھر اس نے لڑکی کو رسیوں سے کھول کی طرح اپنے ساتھ لپٹایا تھا وہ منظر بھی میں کبھی نہیں بھلا سکتا تھا۔

چترا چائے بنا کر لے آئی تو میں دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ چترا میرے سامنے بیٹھی ہوئی تھی۔ پہلے ہم اس لڑکی کے بارے میں باتیں کرتے رہے پھر آشوتوش کے بارے میں باتیں کرنے لگے۔

"اگر ہم اس لڑکی کو نہ بچا لیتے اور آشوتوش اس کی ہلاکت کر دیتا تو کیا واقعی اسے حیاتِ ابدی مل جاتی۔ وہ موت سے نجات دے دیتا؟" میں نے چائے کی چسکی لیتے ہوئے پوچھا۔

"کچھ نہیں کہا جا سکتا۔" چترا نے جواب دیا "لیکن اتنا جانتی ہوں کہ ہمارے یہ ہندو پنڈت اور پجاری پُراسرار قوتیں حاصل کرنے کے لیے جاپ کرتے رہتے ہیں۔ یہ سفلی علوم کے ماہر ہوتے ہیں۔ کوئی قوت حاصل کرنے کے لیے جاپ کرنا پڑتا ہے اور اس کے لیے کوئی نہ کوئی بھینٹ بھی دینی پڑتی ہے۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی۔ چائے کی ایک دو چسکیاں لیں اور پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگی "جاپ کے بھی مختلف درجے ہوتے ہیں۔ جتنی بڑی قوت کو حاصل کرنا ہو جاپ اتنا ہی کٹھن ہو گا اور انسانی خون کی بھینٹ اس کا لازمی حصہ ہو گی۔ اس کے بغیر جاپ مکمل نہیں ہو گا۔ بعض اوقات تو ایسی پُراسرار قوتیں حاصل کر بھی لیتے ہیں اور بعض جاپ ہونے کے بعد دوبارہ جاپ شروع کر دیتے ہیں۔ میں نہیں کہہ سکتی کہ تیسری لڑکی کی بھینٹ دینے کے بعد آشوتوش اپنے گھناؤنے مقصد میں کامیابی ہوتی یا نہیں لیکن اتنا ضرور کہہ سکتی ہوں کہ ناکام ہونے کے بعد وہ اپنا جاپ دوبارہ شروع کر دیتا۔"

"اسے کیسے پتا چلتا کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا یا نہیں؟" میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف

یہ تو تم علم ہے پُراسرار اور کٹھن ہیں۔ یقین سے کوئی نہیں کہی جا سکتی لیکن ہر جاپ کا کوئی نہ کوئی ردِ عمل ضرور ہوتا ہے کوئی نہ کوئی ایسی نشانی ضرور ہوتی ہے جس سے پتا چلتا ہے کہ جاپ مکمل ہوا ہے یا نہیں۔ پُراسرار قوتیں حاصل کرنا اگرچہ ناممکن نہیں لیکن میں اتنا جانتی ہوں کہ ہم انہیں شکست نہیں دی جا سکتی۔"

ہم ابھی یہی باتیں کر رہے تھے کہ باہر کچھ لوگوں کی آوازیں سنائی دیں۔ میں یہی سمجھا کہ شاید کچھ لوگ اس ندی کے لیے آئے ہیں لیکن قدموں کی آوازیں ہمارے کاتیج کے قریب رک گئیں۔ دروازہ کھلا ہوا ہی تھا اور پھر وہ کانسٹیبل دروازے کے سامنے نمودار ہوا جو گنگوتری سے ہمارے ساتھ آیا تھا۔

"چترا دیوی جی۔ کچھ لوگ آپ سے ملنے آئے ہیں۔" اس نے اندر جھانکتے ہوئے کہا۔

اور پھر چار افراد اندر آ گئے۔ ان میں دو عورتیں تھیں اور دو مرد۔ تین چہرے تو ہمارے لیے اجنبی تھے لیکن چوتھے چہرے کو شناخت کرنے میں ہمیں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ وہ وہی لڑکی تھی جسے ہم نے آشوتوش سے بچایا تھا۔ ادھیڑ عمر کے مرد اور عورت لڑکی کے ماں باپ تھے اور تیسرا جوان آدمی لڑکی کا بڑا بھائی تھا۔

انہیں دیکھ کر ہم دونوں اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ ان چاروں نے ہمارے پیر چھوئے اور عاجزانہ انداز میں ہاتھ جوڑ کر ہمارے سامنے کھڑے ہو گئے۔

"ہماری سیتا کی جان بچا کر آپ نے ہم پر جو احسان کیا ہے اسے ہم جیون بھر نہیں بھول سکتے۔" لڑکی سیتا کے باپ نے ہماری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اس کی آواز بھرائی ہوئی اور آنکھیں بھیگ رہی تھیں۔

"ہم نے اگر سیتا کو کسی راون سے بچایا ہے تو کسی پر احسان نہیں کیا۔ نہ سیتا پر اور نہ آپ پر۔" میں نے جواب دیا "ایک انسان ہونے کے ناتے یہ ہمارا فرض تھا جسے ہم نے پورا کیا۔"

"آپ بہت مہان ہیں۔" سیتا کے باپ نے کہا "ہمیں شریمتی جی کے بارے میں پتا چلا ہے۔ ان کے ساتھ بڑا ظلم ہوا ہے۔ بھگوان ان کے من کو شانتی دے۔"

"مجھے سکون مل گیا۔" چترا نے آگے بڑھ کر سیتا کو اپنے ساتھ لپٹا لیا اور اس کی پیشانی اور گالوں پر بوسے دینے لگی "مجھے راحت مل گئی۔ میری بیٹی مجھے مل گئی" وہ جذباتی ہو رہی تھی۔ اس کی آنکھیں بھی نم ہو گئیں۔

میں نے پہلی مرتبہ سیتا کو غور سے دیکھا۔ وہ بے حد حسین تھی اور چہرے پر بڑی معصومیت تھی۔ اسے دیکھتے ہوئے میں سوچ رہا تھا کہ اگر ہم بروقت اس کی مدد کو نہ پہنچتے تو اس کا یہ حسین وجود خاک و خون میں لوٹ چکا ہوتا۔

کانسٹیبل انہیں چھوڑ کر واپس جا چکا تھا۔ وہ لوگ بھی بیٹھ گئے، چترا نے ان کے لیے بھی چائے بنالی تھی۔ باتوں میں پتا چلا کہ وہ لوگ مراد آباد کے رہنے والے تھے جہاں ان کا برتنوں کا کاروبار تھا۔ سیتا کے باپ بدری ناتھ نے بتایا کہ کوئی پُراسرار آدمی پچھلے تین مہینوں سے سیتا کا پیچھا کر رہا تھا۔ سیتا نے گھر والوں سے شکایت بھی کی تھی اور ایک مرتبہ آشوتوش کو سیتا کا پیچھا کرتے ہوئے پکڑا بھی گیا تھا۔ آشوتوش اس

وقت پنڈت کے بہروپ میں تھا۔ اس نے کچھ ایسی باتیں کیں کہ اسے تنبیہہ کرکے چھوڑ دیا گیا۔ اس کے بعد وہ نظر نہیں آیا۔

ایک ہفتہ پہلے بدری ناتھ اپنے گھر والوں کے ساتھ ہر دوار آگیا۔ اس کا خیال تھا کہ دو دن یہاں پوجا پاٹھ کے بعد وہ لوگ واپس چلے جائیں گے۔ اگلے ہی روز بدری ناتھ نے پنڈت آشوتوش کو بھی ہردوار میں دیکھا تو زیادہ توجہ نہیں دی۔ یہ گنگا کی جنم بھومی تھی۔ مقدس مقام تھا۔ پنڈتوں اور سادھو سنتوں کے لیے تو اس جگہ میں ایک خاص کشش تھی۔ پنڈت آشوتوش بھی گھومتا پھرتا یہاں آگیا ہوگا لیکن اگلے ہی روز سیتا غائب ہوگئی۔ پہلے اسے اپنے طور پر تلاش کیا گیا اور پھر پولیس میں رپورٹ درج کرادی گئی۔ بدری ناتھ نے پولیس کو پنڈت آشوتوش کے بارے میں بھی سب کچھ بتادیا تھا۔

"اب کیا خیالات ہیں آپ کے؟" چترا نے اس کی طرف دیکھا۔

"ہم کل صبح پوجا کے لیے گنگوتری مندر جائیں گے اور اس کے فوراً بعد واپس چلے جائیں گے.... مراد آباد۔" بدری ناتھ نے جواب دیا اور جیب سے وزیٹنگ کارڈ نکال کر میری طرف بڑھادیا "اگر کبھی مراد آباد آنا ہو تو سیدھے ہمارے غریب خانے پر آجایئے" اور پھر اس نے جیب سے نوٹوں کی ایک موٹی سی گڈی نکال کر ہمارے سامنے رکھ دی۔ "ہم آپ کے احسان کا بدلہ تو نہیں چکا سکتے۔ یہ ایک چھوٹی سی بھینٹ قبول کیجئے۔"

میں نے چترا کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر کرب کے تاثرات ابھر آئے تھے جیسے اسے بہت دکھ پہنچا ہو۔ میں نے نوٹوں کی گڈی اٹھا کر بدری ناتھ کے ہاتھ میں تھمادی۔

"ہم نے کسی لالچ میں آپ کی بیٹی کی جان نہیں بچائی تھی۔ آپ یہ رقم اپنے پاس رکھئے اور گھر پہنچ کر اسے غریبوں میں بانٹ دیجئے۔"

اور پھر شام چھ بجے کے قریب جب وہ رخصت ہونے لگے تو چترا نے ایک بار پھر سیتا کو اپنے سینے سے لگالیا اور دیر تک اسے پیار کرتی رہی۔ پھر سیتا مجھ سے لپٹ گئی۔ میں نے اس کی پیشانی پر بوسہ دیا۔

"آپ ہمارے گھر ضرور آیئے بھیا!" اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اس ایک لفظ "بھیا" نے مجھے جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ میں اپنے ماں باپ کا اکلوتا تھا۔ میری کوئی بہن نہیں تھی۔ کسی لڑکی نے مجھے کبھی بھائی نہیں کہا تھا اور اب سیتا نے بھیا کہہ کر مخاطب کیا تو میرے انگ انگ میں کیف و سرور کی ایک لہر سی دوڑتی چلی گئی۔ میں نے پھر سیتا کو اپنے ساتھ لپٹالیا اور اس کی پیشانی پر بوسے دیتے ہوئے بولا۔

"ضرور آؤں گا۔ میں تم سے ملنے کے لیے ضرور آؤں گا۔"

وہ لوگ چلے گئے اور میں دیر تک سیتا کے بارے میں سوچتا رہا۔ شام کا اندھیرا پھیل گیا اور پھر رات اپنے پھیلانے لگی۔

کھانا کھانے کے تھوڑی ہی دیر بعد چترا پر غنودگی قریب ہی لیٹ کر سوگئی۔

میں بھی اٹھ کر باہر آجاتا اور کبھی کمرے میں آجاتا۔ مجھ پر عجیب سی بے چینی طاری ہو رہی تھی۔ سویرے صبح سے گنگوتری مندر گیا ہوا تھا۔ اسے شام تک واپس آجانا چاہئے تھا لیکن وہ ابھی تک نہیں آیا تھا۔

سردی بڑھ گئی تھی۔ میں نے ایک کمبل چترا پر ڈال دیا اور دوسرا خود اوڑھ لیا۔ وقت دھیرے دھیرے گزر رہا تھا۔

آدھی رات کے بعد کسی وقت میری آنکھ لگ گئی۔

صبح سویرے میری آنکھ کھل گئی۔ چترا بھی جاگ چکی تھی۔ سوبھراج نہیں آیا تھا۔ میں نے تھوڑی دیر اور انتظار کیا۔ پھر سوبھراج کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ میرا رخ گنگوتری مندر کی طرف تھا۔

ابھی سورج طلوع نہیں ہوا تھا۔ جگہ جگہ ہندو یاتری پوجا میں مصروف تھے۔ گنگوتری مندر سے تقریباً پانچ سو گز کے فاصلے پر ایک جگہ چند لوگوں کا جمگھٹا لگا ہوا تھا۔ میں غیر ارادی طور پر لوگوں کو ادھر ادھر ہٹاتے ہوئے آگے بڑھ گیا اور پھر دوسرے ہی لمحے میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔

زمین پر سوبھراج کی لاش پڑی تھی۔ اس کا سر غائب تھا۔ پیٹ بھی چرا ہوا تھا اور آنتیں باہر نکلی ہوئی تھیں۔ جسم کے دوسرے حصوں پر بھی لاتعداد زخم تھے۔

لاش کے آس پاس کہیں بھی خون کا ایک قطرہ تک نہیں آرہا تھا جس کا مطلب تھا کہ اسے کہیں اور قتل کرکے لاش یہاں پھینک دی گئی تھی۔

"ہری اوم.... ہری اوم۔" ایک آدمی بڑبڑایا۔ اس کے ہاتھ میں پیتل کی گڑوی تھی جس میں پانی بھرا ہوا تھا۔ اس نے گڑوی میں انگلیاں بھگو کر سوبھراج کی لاش پر پانی کے چھینٹے ڈالے اور "ہری اوم ہری اوم" کی گردان کرتا ایک طرف چلا گیا۔

ہجوم بڑھ رہا تھا۔ میں سوبھراج کی لاش سے ظاہر کیے بغیر پیچھے ہٹ گیا بالکل اجنبیوں کی طرح۔

سوبھراج کا یہ بہیمانہ قتل میرے لیے پیغام تھا۔ شروع ہوجانے کا اور میں اس کھیل کو انجام تک پہنچانے کے لیے پوری طرح تیار تھا۔

پنڈت سوبھراج کے اس بہیمانہ قتل نے مجھے جھنجوڑ کر رکھ دیا تھا اور میں جانتا تھا اسے اس طرح بے رحمی سے موت کے گھاٹ اتارنے والا بھی ایک پنڈت تھا.... دھرم چاری۔ یہ لوگ ایسے ہی کردار کے مالک تھے۔ مندروں کے سنگھاسن پر بیٹھ کر نیکی اور بھلائی کا پرچار کرتے تھے اور انہی مندروں کو انہوں نے قتل گاہیں اور عیاشی کے اڈے بنا رکھا تھا۔ وہ اپنی ان سرگرمیوں میں کسی کی مداخلت برداشت نہیں کرسکتے تھے۔ اس کا تجربہ مجھے پہلے بھی ہوچکا تھا اور اب بھی میں بڑے وثوق سے کہہ سکتا تھا کہ سوبھراج ان کی نظروں میں آگیا ہوگا اور یہ بات بھی میں پورے وثوق سے کہہ سکتا تھا کہ سوبھراج کو مندر میں کسی جگہ قتل کرکے اس کی لاش ویران سڑک پر پھینک دی گئی تھی۔ اس کا ایک مطلب یہ بھی تھا کہ پنڈت پرگھیا راج اکیلا نہیں تھا۔ اس گھناؤنے فعل میں اس کے ساتھ کوئی اور بھی شریک تھا۔ ممکن ہے وہی دو پنڈت یا ان میں سے کوئی ایک جنہوں نے چترا پر تیم کی بیٹی اور شوہر کو قتل کیا تھا' اس کے ساتھ ہو۔

واپس جاتے ہوئے میں یہ اندازہ لگانے کی کوشش کررہا تھا کہ یہ واقعہ کس طرح پیش آیا ہوگا۔ انہیں سوبھراج پر کسی قسم کا شبہ ہوا ہوگا اور وہ کسی طرح اسے مندر کے تہ خانے میں یا کسی اور جگہ لے گئے ہوں گے۔ اسے موت کے گھاٹ اتارنے سے پہلے اس سے پوچھ گچھ بھی کی ہوگی۔ اس پر تشدد بھی کیا ہوگا۔ سوبھراج اگرچہ خاصا سخت جان واقع ہوا تھا لیکن میں جانتا تھا کہ وہ زیادہ دیر تک تشدد برداشت نہیں کرسکتا تھا۔ مجھے یاد تھا جب میں اور ٹھاکر اسے دھول پور سے لے گئے تھے اور ببول کے جنگل میں اس سے دارا اور بلونت سنگھ کے بارے میں پوچھنا چاہا تھا تو پہلے تو وہ مقابلے پر اتر آیا تھا لیکن میرے دو چار ہاتھ کھانے کے بعد اس نے اگل دیا تھا کہ دارا وغیرہ پہاڑیوں میں کالی کے مندر کی طرف گئے ہیں اور چند ہفتے پہلے جب میں بملا کے ساتھ اس کا پیچھا کرتے ہوئے اس کے بنگلے پر پہنچ گیا تھا تو اس روز بھی اس نے بہت جلد ہتھیار ڈال دیے تھے اور گزشتہ رات وہ پنڈتوں کے ہتے چڑھ گیا تھا جنہوں نے اسے ادھیڑ کر رکھ دیا تھا۔ پنڈت پرگھیا راج نے اس سے ضرور پوچھا ہوگا کہ وہ کس کے کہنے پر اس کی نگرانی کررہا ہے۔ زیادہ تشدد سے بچنے کے لئے اس نے میرے بارے میں بتادیا ہوگا جس کا مطلب تھا کہ اب میں بھی محفوظ نہیں تھا اور مجھے بھی اپنا بندوبست کرلینا چاہئے تھا۔

یہی سب کچھ سوچتے ہوئے میں چترا کی کٹیا پر پہنچ گیا۔ شاید میرے چہرے پر کچھ ایسے تاثرات تھے جس سے چترا نے صورتِ حال کو بھانپ لیا تھا۔

"تمہاری صورت پر بارہ کیوں بج رہے ہیں؟" وہ میرے چہرے کو تکتے ہوئے بولی "سوبھراج کا کچھ پتا نہیں چلا؟"

"سوبھراج کو مار دیا گیا ہے۔ میں اس کی ادھڑی ہوئی لاش دیکھ کر آرہا ہوں" میں نے دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"اوہ! یہ سب کیسے ہوا؟" وہ بھی میرے سامنے بیٹھ گئی۔

"یہ تو میں نہیں جانتا کہ یہ سب کیسے ہوا لیکن اس کا قصہ بہرحال ختم ہوچکا ہے اور...."

"تم فوراً پولیس کو اطلاع دے دو" وہ میری بات کاٹتے ہوئے بولی "پرگھیا راج کے ساتھ اب کسی قسم کی رعایت نہیں ہونی چاہئے۔"

"ٹھیک کہتی ہو' ایسے درندوں کے ساتھ کوئی رعایت نہیں ہونی چاہئے لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس پر ہاتھ کون ڈالے گا" میں نے کہا "اس کا تجربہ تو تمہیں خود بھی ہوچکا ہے۔ تم نے اسے شناخت کرلیا تھا۔ پولیس کو اس کی نشاندہی کی تھی لیکن کیا ہوا؟ پولیس نے ان دھرم چاریوں کے سامنے گھٹنے ٹیک دیے اور یہاں تو ہمارے پاس ان کے خلاف کوئی ثبوت بھی نہیں ہے۔ ہم کیسے کہہ سکتے ہیں کہ سوبھراج کو پنڈت پرگھیا راج یا اس کے ساتھیوں میں سے کسی نے قتل کیا ہے۔ تم اپنی بیٹی اور پتی کے قتل کی چشم دید گواہ تھیں مگر تمہیں جھٹلا دیا گیا اور یہاں محض شک اور مفروضے کی بنیاد پر ان کے خلاف کوئی کارروائی کیسے ہوسکتی ہے۔"

"ٹھیک کہتے ہو" چترا گہرا سانس لیتے ہوئے بولی "اس کا مطلب ہے کہ ہمیں خود ہی کوئی کارروائی کرنی ہوگی۔"

"ہاں ... لیکن اس سے پہلے ہمیں اپنی حفاظت کا بندوبست کرنا ہوگا" میں نے جواب دیا "ممکن ہے سوبھراج نے میرے یا ہم دونوں کے بارے میں انہیں بتادیا ہو اور وہ لوگ...."

"ایک منٹ!" چترا نے میری بات کاٹ دی "تم نے بتایا تھا کہ سڑک پر جہاں لاش پڑی ہوئی تھی وہاں یا اس جگہ کے آس پاس خون نہیں تھا۔"

"ہاں ... اور میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اسے کسی اور جگہ قتل کیا گیا تھا اور لاش سڑک پر پھینک دی گئی تھی۔"

"اس کا مطلب ہے کہ اسے کئی گھنٹے پہلے قتل کیا گیا تھا" چترا نے کہا "ہوسکتا ہے وہ رات کے ابتدائی حصے میں ان کے ہاتھ لگ گیا ہو اور آدھی رات کے قریب اسے قتل کرکے لاش ویران سڑک پر ڈال دی گئی۔ جب لاش سڑک پر پھینکی گئی تو اس کا خون جم چکا تھا اور..." وہ خاموش ہوگئی۔ اس کی پیشانی پر لکیریں سی ابھر آئی تھیں۔

"کیا کہنا چاہتی ہو؟" میں نے الجھی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"اگر اسے آدھی رات کے لگ بھگ بھی قتل کیا گیا تھا تو اس سے پوچھ گچھ تو اس سے بھی بہت پہلے کی گئی ہوگی" چترا نے جواب دیا "میرا مطلب سمجھ رہے ہو نا؟" اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے بات جاری رکھی "اگر انہیں تمہارے بارے میں معلوم ہو بھی گیا تھا تو ان کے پاس اتنا وقت تھا کہ وہ رات ہی کو کسی وقت اس کٹیا پر حملہ کرکے ہمیں موت کے گھاٹ اتار دیتے لیکن ایسا نہیں ہوا۔"

"میں تمہارا مطلب سمجھ رہا ہوں" میں نے کہا "لیکن ہوسکتا ہے ہماری ایکشن جاننے کے لئے انہوں نے فوری طور پر کوئی کارروائی نہ کی ہو۔ ایسے لوگ بڑے خطرناک ہوتے ہیں۔ ہوسکتا ہے ہمیں خاموش پاکر ایک دو دن بعد وہ کوئی کارروائی کریں۔ بہرحال' ہمیں اب محتاط رہنا پڑے گا۔"

"ہوسکتا ہے تمہارا خیال درست ہو" چترا نے کہا اور اٹھ کر آتش دان کے پاس چلی گئی۔

تھوڑی دیر بعد چائے بنا کر وہ دوبارہ اسی جگہ پر آگئی۔ چائے پینے کے دوران میں بھی ہم اس موضوع پر باتیں کرتے رہے۔

نو بج گئے تھے۔ کچھ آوازیں سن کر میں دروازے سے باہر آگیا۔ وہ آٹھ دس افراد تھے جن میں مرد' عورتیں اور بچے بھی شامل تھے۔ وہ ہمارے سامنے والی ندی کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے تقریباً سو گز آگے جاکر رک گئے۔ میں کچھ دیر وہاں کھڑا ادھر ادھر دیکھتا رہا اور پھر اندر آگیا۔

مزید آدھے گھنٹے بعد چترا معلومات حاصل کرنے کے لئے شہر کی طرف چلی گئی۔ اس نے کٹیا کی ایک چابی مجھے دے دی تھی لیکن میں اندر بیٹھے رہنے کے بجائے باہر گھومنے لگا۔ بہت سے لوگ اشنان (غسل) کے لئے اس ندی پر بھی آرہے تھے۔ یہ ندی تقریباً نصف میل آگے جاکر چٹان نما بڑے بڑے پتھروں میں گھومتے ہوئے دریا کے دہانے پر جاملتی تھی۔

میں آس پاس کی چٹانوں پر گھومتا رہا۔ یہاں درختوں کی بہتات تھی اور خودرو جھاڑیوں کی بھی۔ بعض جھاڑیوں میں رنگ برنگ پھول بھی کھلے ہوئے تھے۔ ایک جگہ چٹانوں میں ایک چھپر سا بنا ہوا تھا۔ چار آڑی ترچھی لکڑیاں کھڑی کرکے ان پر شاخوں اور جھاڑیوں کا سائبان بنا ہوا تھا۔ اس کے نیچے جھاڑیوں ہی کا بستر بچھا ہوا تھا۔ آس پاس کوئی ایسی چیز نہیں تھی جس سے ظاہر ہوتا کہ یہاں کسی کی رہائش ہوگی۔ سادھو اور پنڈت آبادی سے دور پُرسکون جگہوں پر جاپ وغیرہ کرتے رہتے تھے۔ ممکن ہے کسی نے اسی مقصد کے لئے یہ سائبان بنا رکھا ہو لیکن اس وقت وہاں کوئی نہیں تھا۔

اس وقت دوپہر کے دو بجنے والے تھے۔ میں پہاڑیوں میں گھومتے گھومتے تھک سا گیا تھا۔ کچھ دیر آرام کی غرض سے سائبان کے نیچے لیٹ گیا۔

وہ مچان پہاڑیوں کے اوپر ایسی جگہ پر تھا جہاں سے اس ندی کا کچھ حصہ اور چترا پر تیم کی کٹیا بھی نظر آرہی تھی۔ میں جھاڑیوں کے بستر پر کروٹ کے بل لیٹا اس طرف دیکھتا رہا اور پھر ایک آدمی کو اس کٹیا کے اردگرد منڈلاتے ہوئے دیکھ کر میں چونک سا گیا۔ اگرچہ سامنے والی ندی کی طرف اور بھی بہت سے لوگوں کی آمدورفت تھی مگر گیروے لباس کی وجہ سے وہ آدمی دوسروں سے بالکل مختلف لگ رہا تھا۔ ہوسکتا ہے وہ یاتریوں ہی میں سے کوئی ہو اور محض تجسس کی بنا پر اس کٹیا کے اردگرد منڈلا رہا ہو لیکن پھر اچانک ہی میرے ذہن میں ایک اور خیال ابھرا۔

گیروے لباس والا وہ شخص پنڈت پرگھیا راج کا فرستادہ بھی ہوسکتا تھا۔ وہ شاید میرے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہتا ہو اور یہ دیکھنا چاہتا ہو کہ اس کٹیا میں کون کون ہے مگر کٹیا کو تالا لگا ہوا تھا۔

گیروے لباس والا وہ شخص کٹیا سے دور جاچکا تھا اور پھر وہ میری نگاہوں سے اوجھل ہوگیا۔ میں کافی دیر تک کٹیا کی طرف دیکھتا رہا لیکن نہ تو گیروے لباس والا وہ شخص دوبارہ نظر آیا اور نہ ہی کوئی اور مشتبہ شخص دکھائی دیا۔

دھوپ اگرچہ تیز تھی مگر موسم بڑا خوشگوار تھا۔ سائبان کے نیچے سائے میں لیٹے ہوئے ہوا کے جھونکے بڑے فرحت بخش لگ رہے تھے۔ ہوا کی تھپکیوں سے میری آنکھیں بند ہونے لگیں اور تھوڑی ہی دیر بعد میں اتنا غافل ہوگیا۔

دوبارہ میری آنکھ کھلی تو سورج مغرب میں پہاڑی کی چوٹی پر جھک رہا تھا۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ گیا لیکن دوسرے ہی لمحے میں اپنی جگہ پر ساکت ہوگیا۔ گیروے لباس والا وہی شخص چترا کی کٹیا کی کھڑکی کے پاس کھڑا اندر جھانک رہا تھا۔ کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ میں کئی روز سے اس کٹیا میں رہ رہا تھا اور مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ دن یا رات کے وقت کبھی کوئی کھڑکی

نہیں کھولی گئی تھی۔

جس جگہ میں بیٹھا تھا' کٹیا کا فاصلہ وہاں سے سوگز کے قریب تھا۔ ایک بار تو میرا دل چاہا کہ خاموشی سے جا کر اس شخص کی گردن دبوچ لوں مگر بڑی مشکل سے میں اپنے آپ کو اس ارادے پر عمل کرنے سے باز رکھ سکا تھا۔ اب میرا یہ شبہ قوی تر ہوتا جارہا تھا کہ اس شخص کا تعلق مخالف پارٹی سے ہے۔ پہلی مرتبہ میں نے اس شخص کو دوپہر دو بجے کے قریب کٹیا کے آس پاس منڈلاتے ہوئے دیکھا تھا اور اب وہ دوبارہ اس وقت نظر آیا تھا جبکہ سورج غروب ہونے میں تھوڑی دیر باقی تھی۔ وہ کوئی یاتری نہیں ہو سکتا تھا۔ یاتری تو گنگا جل میں اشنان کرتے تھے اور مندروں کی یاترا کے چکر میں گھومتے رہتے تھے۔

صبح سے اب تک کئی یاتری اس ندی پر آئے اور واپس گئے ہوں گے لیکن وہ شخص تقریباً ساڑھے چار گھنٹے گزرنے کے بعد بھی اس جگہ پر موجود تھا جبکہ آس پاس کوئی اور ذی روح دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

وہ کٹیا کا پچھلا حصہ تھا۔ گیروے لباس والا وہ شخص کافی دیر تک کھڑکی کے اندر جھانکتا رہا اور پھر کھڑکی بند کر کے شہر کی طرف جانے والی پگڈنڈی پر چل پڑا۔

میں بھی اس چٹان سے اتر آیا اور بڑے بڑے پتھروں کی آڑ لیتے ہوئے تیزی سے کٹیا کی طرف چلنے لگا۔

سورج اس وقت غروب ہو رہا تھا۔ دھوپ کی الوداعی کرنیں مشرقی پہاڑیوں کی چوٹیوں پر چمک رہی تھیں۔ میں تیز تیز چلتے ہوئے کٹیا کے سامنے والے رخ پر آگیا۔ ندی بھی ویران تھی اور آس پاس کسی ذی روح کا نشان تک نظر نہیں آرہا تھا۔ اس طرف آنے والے یاتری سورج غروب ہونے سے بہت دیر پہلے ہی واپس چلے جایا کرتے تھے۔

کٹیا کو تالا لگا ہوا تھا۔ میں نے گھوم کر پگڈنڈی کی طرف دیکھا۔ وہ شخص کافی آگے جا چکا تھا۔ اب اس میں شک کی کوئی گنجائش نہیں رہی تھی کہ سوبھراج نے مرنے سے پہلے انہیں ہمارے بارے میں بتا دیا تھا۔ رات کو انہوں نے کوئی کارروائی کرنا مناسب نہیں سمجھا ہوگا اور ہو سکتا ہے موقع ہی نہ ملا ہو لیکن دن میں انہوں نے کٹیا کی نگرانی شروع کرا دی تھی۔ کوئی کارروائی کرنے سے پہلے شاید وہ لوگ یہ جان لینا چاہتے تھے کہ اس کٹیا میں اور کون کون ہے۔ گیروے لباس والا وہ شخص یقیناً انہی کا آدمی تھا۔ اگر وہ کوئی چور ہوتا اور چوری کی نیت سے آس پاس منڈلا رہا ہوتا تو اس وقت تو اس کے لیے بہترین موقع تھا۔ آس پاس کوئی نہیں تھا۔ اس نے ایک کھڑکی بھی کھول لی تھی۔ وہ بڑے اطمینان سے اندر داخل ہو سکتا تھا لیکن وہ چوری کی نیت سے وہاں نہیں آیا تھا۔

وہ شخص کافی آگے نکل گیا تھا۔ سورج بھی غروب ہو چکا تھا لیکن میں نے اس شخص کو نگاہوں سے اوجھل نہیں ہونے دیا۔ مناسب فاصلے سے اس کا پیچھا کرتے ہوئے میں چترا پرتم کے بارے میں بھی سوچ رہا تھا۔

وہ صبح دس بجے کے قریب معلومات حاصل کرنے کے لیے شہر کی طرف گئی تھی اور اب تک واپس نہیں آئی تھی اور پھر یہ بات بھی تھی کہ میں خود پہاڑیوں میں گھومتا رہا تھا اور کٹیا کی طرف نہیں آیا تھا۔ ممکن ہے دن میں کسی وقت چترا کٹیا میں آئی ہو اور مجھے نہ پا کر شہر واپس چلی گئی ہو۔

اچانک ہی میرے ذہن میں ایک اور خیال ابھرا۔ کہیں چترا بھی تو ان کے ہتھے نہیں چڑھ گئی۔ وہ شخص جس طرح اطمینان سے کٹیا کے آس پاس منڈلا رہا تھا اس سے میرے اس شک کو تقویت بھی ملتی تھی۔ بہرحال میں نے اس شخص کا تعاقب جاری رکھا۔

وہ شخص پگڈنڈیوں پر چلتے ہوئے آبادی میں داخل ہوگا۔ شہر میں بجلی روشنیاں جگمگا اٹھی تھیں۔

مین بازار میں پہنچ کر وہ شخص کچھ دور تک چلتا رہا اور پھر ایک اور تنگ سے بازار میں داخل ہو کر ایک آشرم کے دروازے میں غائب ہو گیا۔ یہ ایک پرانا سا دو منزلہ مکان تھا جسے آشرم میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔ دروازہ بھی عام مکانوں کی طرح تھا۔ اس کے اوپر آشرم کا بورڈ لگا دیا گیا تھا اور وہ بورڈ بھی خاصا پرانا ہو چکا تھا۔

اس تنگ سے بازار میں خاصا رش تھا۔ زیادہ تر دکانیں گفٹ آئٹم کی تھیں۔ بہت سی دکانیں مورتیوں سے بھی بھری ہوئی تھیں۔ ہردوار آنے والے اور واپس جانے والے یاتریوں کو اپنی ضرورت کے مطابق ہر چیز یہاں سے مل جاتی تھی۔ واپس جانے والے اپنے عزیزوں کے لیے تحائف کی خریداری زیادہ تر اسی بازار میں کرتے تھے۔

میں آشرم کے سامنے سڑک کی دوسری طرف رک گیا۔ وہاں سے چند قدم کے فاصلے پر ہی کچوری والا ایک ٹھیلا کھڑا تھا۔ کچوریاں تلے جانے کی اشتہا انگیز خوشبو نے مجھے یاد دلایا کہ میں نے صبح سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ میں اس ٹھیلے کے قریب آگیا۔ اور بھی کئی لوگ کھڑے کچوریاں کھا رہے تھے۔ میں بھی ان میں شامل ہو گیا۔ اچار اور چٹنی سے گرم گرم کچوریاں کھاتے ہوئے طبیعت خوش ہو گئی۔

اس دوران میں میری نظریں مسلسل آشرم کے دروازے پر لگی رہیں۔ بہت سے لوگ آشرم میں آجا رہے تھے لیکن گیروے لباس والا وہ شخص دوبارہ نظر نہیں آیا تھا۔

کچوریاں کھانے کے بعد بھی میں ٹھیلے کے قریب کھڑا رہا۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد وہ شخص آشرم کے دروازے پر نمودار ہوا لیکن ابھی وہ چند ہی قدم آگے بڑھا تھا کہ چار پانچ آدمیوں نے اسے روک لیا۔ ان لوگوں کا باتیں کرنے کا انداز ایسا تھا جیسے کسی بات پر جھگڑ رہے ہوں۔ میں بھی سڑک پار کر کے ان کے قریب پہنچ گیا۔ یہاں کوئی میرا صورت شناس نہیں تھا اس لیے پہچان لیے جانے کا خوف نہیں تھا۔

ان لوگوں کی باتوں سے مجھے گیروے لباس والے اس شخص کا نام بھی معلوم ہو گیا۔ وہ سوامی پرمانند تھا۔ وہ اس آشرم کا منشی تھا اور جو لوگ اسے گھیرے کھڑے تھے وہ اسی آشرم میں رہائش پذیر تھے اور اس سے اپنا سامان کے چوری ہونے کی شکایت کر رہے تھے۔

"اس نوٹس بورڈ پر لکھا ہوا ہے کہ اپنے سامان کی حفاظت خود کریں۔ چوری وغیرہ کی ذمے داری ہم پر نہیں ہوگی۔" سوامی پرمانند نے دروازے کے ساتھ دیوار پر لگے ہوئے بورڈ کی طرف اشارہ کیا "اب اگر سامان چوری ہو گیا ہے تو اس کے ذمے دار ہم تو نہیں ہیں۔ تم لوگوں کو اپنے سامان کی حفاظت کرنی چاہیے تھی۔"

سوامی پرمانند ان لوگوں سے جان چھڑا کر آگے بڑھ گیا۔ دو آدمی کچھ دور تک اس کے ساتھ گئے پھر واپس لوٹ آئے۔ روشنی میں مجھے سوامی پرمانند کا جائزہ لینے کا موقع مل گیا تھا۔ اس کا قد پانچ فٹ کے لگ بھگ تھا۔ شیو باقاعدگی سے بنانے کا عادی تھا لیکن مونچھیں خاصی بڑی تھیں۔ گنجا سر مگر درمیان بالشت بھر چٹیا تھی۔ دونوں کانوں میں سونے کی بالیاں تھیں اور دونوں ہاتھوں کی انگلیوں میں بھی سونے اور چاندی کی کئی انگوٹھیاں تھیں جن میں مختلف رنگوں کے نگینے جڑے ہوئے تھے۔ ایسے لوگوں کو مختلف صفات کے حامل نگینوں سے خاص لگاؤ ہوتا ہے۔

میں نے اس کا تعاقب جاری رکھا۔ وہ مختلف سڑکوں پر چلتا رہا۔ اس کا رخ گنگوتری مندر کی طرف تھا اور بالآخر میرا اندازہ درست نکلا۔ آدھے گھنٹے بعد جب وہ گنگوتری مندر میں داخل ہوا تو میرے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی۔

مندر کی کشادہ سیڑھیوں پر لاتعداد بھکاری بیٹھے ہوئے تھے۔ کچھ لوگ گھوم پھر کر پھول بیچ رہے تھے۔ ان میں عورتیں بھی تھیں جو مندر میں آنے والے یاتریوں کا راستہ روک کر پھول بیچ رہی تھیں۔ ایک دبلی پتلی ادھیڑ عمر عورت ایک ٹوکری میں پھول' ناریل اور مٹھائی بیچ رہی تھی۔ اس نے میرا راستہ روکنے کی کوشش کی تو میں پہلو بچا کر نکل گیا۔

مندر کے اندر خاصی تعداد میں لوگ موجود تھے۔ میں سوامی پرمانند کی تلاش میں اِدھر اُدھر نظریں دوڑانے لگا۔ سامنے ایک اونچے چبوترے پر تقریباً دو فٹ اونچا کالے رنگ کا گول پتھر رکھا ہوا تھا جس پر سفید رنگ سے چہرے کے نقوش بنے ہوئے تھے۔ اس کے آس پاس پھولوں کا انبار لگا ہوا تھا اور سامنے چبوترے پر لوگ بھینٹ کی جانے والی چیزیں رکھتے جا رہے تھے۔

سوامی پرمانند اس چبوترے کی پچھلی طرف ایک بچے کھچے پنڈت کے قریب کھڑا نظر آگیا۔ وہ دونوں سرگوشیوں میں باتیں کرتے رہے اور پھر پیچھے بنتے ہوئے ایک راہداری میں غائب ہو گئے۔ میں اس طرف لپکا تو دو ادھیڑ عمر عورتوں نے مجھے روک لیا۔ دونوں کے ہاتھوں میں تھالیاں تھیں اور دونوں تھالیوں میں ناریل' مٹھائی وغیرہ رکھی ہوئی تھی۔

"بیٹا۔ رام جی کا پرساد۔" ایک عورت نے تھالی میرے سامنے کر دی۔

میں نے برفی کی ڈلی میں سے ایک چھوٹا سا ٹکڑا توڑ کر منہ میں رکھا اور جب آگے بڑھا تو سوامی پرمانند اور دوسرا پنڈت غائب ہو چکا تھا۔

میں مندر کی راہداریوں میں چکراتا رہا لیکن ان دونوں میں سے کوئی بھی نظر نہیں آیا۔ میں دوبارہ مندر کے مرکزی ہال میں آگیا۔ کچھ دیر وہاں اِدھر اُدھر گھومتا رہا اور پھر باہر آکر سیڑھیوں پر ایک طرف کھڑا ہو گیا۔

اب یہ بات طے شدہ تھی کہ سوامی پرمانند' پنڈت پرگھیا راج ہی کا آدمی تھا اور اسے میرے اور چترا پرتم کے بارے میں معلوم کرنے کے لیے ہی کٹیا کی طرف بھیجا گیا تھا لیکن سوال یہ تھا کہ چترا کہاں غائب ہو گئی تھی۔ اب مجھے اس کی طرف سے بھی تشویش ہونے لگی تھی۔

سوامی پرمانند کے بارے میں یہ معلوم ہو چکا تھا کہ وہ آشرم کا منشی تھا اور اسے بہرحال آشرم میں واپس جانا تھا لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ رات اسی مندر میں گزار دے لیکن میرا یہ خدشہ بے بنیاد نکلا۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد سوامی پرمانند مندر کے ایک سائیڈ ڈور سے نکلتے ہوئے نظر آیا۔

وہ دروازہ مرکزی گیٹ سے تقریباً پندرہ فٹ ہٹ کر تھا۔ اس طرف یاتریوں کی آمد و رفت نہیں تھی اور وہ دروازہ شاید مندر میں رہنے والے پنڈتوں اور پجاریوں کے لیے ہی

مخصوص تھا۔

میں اپنی جگہ پر کھڑا سوامی پرمانند کو سیڑھیوں سے اترتے ہوئے دیکھتا رہا۔ وہ سیڑھیاں اتر کر چند رہ میں گز آگے جاچکا تھا۔ اس کے پیچھے جانے کے لیے میں نے جیسے ہی قدم آگے بڑھایا، کسی نے پیچھے سے میرا بازو پکڑلیا۔ میں نے مڑکر دیکھا۔

وہ ایک پجارن تھی۔ توے جیسی کالی رنگت، سفید بال اور سر سے پیر تک گیروے رنگ کی چادر میں لپٹی ہوئی۔ چہرے اور کہنی تک بانہوں کے سوا اس کے جسم کا کوئی حصہ نظر نہیں آرہا تھا۔ یہ پہلی عورت تھی جسے میں نے اس طرح مکمل طور پر لباس میں چھپے ہوئے دیکھا تھا۔ سیاہ چہرے پر آنکھوں کے چمکتے ہوئے سفید دیدے اور موتیوں جیسے دانت بڑا خوفناک اور پُراسرار تاثر دے رہے تھے۔

بھیک مانگنے کے لیے لوگ عجیب وغریب حلیے دھار لیتے ہیں۔ یاتریوں کو بے وقوف بناکر ان کی جیبوں کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے عجیب وغریب ہتھکنڈے استعمال کیے جاتے ہیں۔ میں اسے بھی کوئی ایسی ہی عورت سمجھا تھا جس نے غالباً بھیک مانگنے کے لیے یہ بہروپ دھار رکھا تھا۔

"ارے کیا ہے۔ چھوڑو میرا ہاتھ۔" میں نے اسے گھورتے ہوئے ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑالیا۔

"شانت رہو۔ گھبراؤ نہیں۔" بھکارن نے جواب دیا "خود پر ضبط کرو ورنہ بنا بنایا کھیل بگڑ جائے گا۔"

میں یہ آواز سن کر چونک گیا اور گہری نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کے ساتھ ہی میرے منہ سے گہرا سانس نکل گیا۔ وہ چترا پریتم تھی اور میں نے محض آواز سے اسے پہچانا تھا۔

"اوہ تم!" میرے منہ سے نکلا۔ جلدی چلو ورنہ وہ نکل جائے گا۔"

"لیکن وہ تو ابھی تک اندر ہی بیٹھا ہوا ہے۔ تم کس کی بات کررہے ہو۔" چترا نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا۔

"سوامی پرمانند۔ وہ ابھی اس دروازے سے نکل کر گیا ہے۔" میں نے کہا۔

"میں دارا کی بات کررہی ہوں۔" چترا نے جواب دیا "وہ اس وقت مندر میں موجود ہے۔"

"اوہ!" میں اچھل پڑا۔ میرے دل کی دھڑکن ایک دم تیز ہوگئی تھی "کہاں ہے وہ؟"

"آؤ۔ کہیں بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔" چترا نے یہ کہتے ہوئے ایک بار پھر میرا ہاتھ پکڑلیا اور ایک طرف کھینچنے لگی۔

لوگوں کی آمدورفت جاری تھی۔ کئی لوگوں نے ہماری طرف بھی دیکھا تھا مگر کسی نے زیادہ توجہ نہیں دی تھی۔

ہم سیڑھیوں سے اتر کر کچھ دور تک چلتے رہے پھر ایک تنگ سے راستے پر مڑگئے۔ چند گز آگے کھلی جگہ تھی جہاں پہاڑوں سے آنے والا پانی جمع ہوتا اور اس طرف مندر کی دیواروں کو چھوتے ہوئے دوسری طرف بہہ رہا تھا۔ ہم اس کے کنارے ایک پتھر پر بیٹھ گئے۔ یہاں اندھیرا تھا اور آس پاس کوئی موجود بھی نہیں تھا۔ ہم اطمینان سے بات کرسکتے تھے۔

"ہاں۔ اب بتاؤ۔" میں نے چترا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "تمہیں کیسے پتا چلا کہ دارا مندر میں موجود ہے۔ میرا مطلب ہے تم نے اسے کیسے پہچانا؟"

"تم نے دارا کا جو حلیہ بتایا تھا وہ اس پر بالکل فٹ بیٹھتا ہے۔" چترا نے جواب دیا "تم نے یہ بھی بتایا تھا کہ کسی حادثے پر تم نے اس کی ٹانگ توڑ دی تھی۔ وہ ایک بیساکھی کے سہارے چلتا ہے لیکن لگتا ہے اس کی ٹانگ پوری طرح مفلوج نہیں ہوئی۔ کسی وقت بیساکھی ہٹا کر وہ اس ٹانگ پر بوجھ ڈالتا ہے۔"

میں اپنے آپ میں سنسنی کی عجیب سی کیفیت محسوس کررہا تھا۔ سوبھراج کا خیال درست نکلا تھا۔ دارا بالآخر یہاں پہنچ ہی گیا تھا۔ اگر مجھے اس کے بارے میں پتا نہ چلتا تو یہ اس کے لیے محفوظ ترین جگہ تھی۔ اس نے شاید یہی سوچا ہوگا کہ باقی زندگی انہی مندروں میں گزار دے گا لیکن شاید وہ بھول گیا تھا کہ میں موت کا سایہ بن کر اس کے پیچھے لگا ہوا تھا۔

"اس کے ساتھ اور کون ہے؟" میں نے پوچھا۔

"یہ تو میں نہیں کہہ سکتی کہ اس کے ساتھ اور کون یہاں آیا ہے لیکن پنڈت پر گھیا راج کا ساتھ ہمارے لیے سب سے بڑا خطرہ ہے۔ دارا کو میں نہیں جانتی لیکن پر گھیا راج کے بارے میں بتا چکی ہوں کہ انسانیت نام کی کوئی شے اسے چھو کر نہیں گئی۔ وہ درندہ ہے۔ خوں خوار درندہ۔"

"دارا اس سے بھی زیادہ خوں خوار درندہ ہے۔" میں نے کہا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولا "تم یہاں غائب ہوا اور میں تمہارے لیے پریشان تھا۔ یہ سب چھوڑو میں اس کی طرف اشارہ کرکے خاموش ہوگیا۔

"مجھے معلومات حاصل کرنے کے لیے مندر کے اندر جانا تھا۔" چترا نے جواب دیا "یہاں پنڈت، پجاری اور گرو گھنٹر بندو بھی طرح طرح کے سوانگ بھرتے رہتے ہیں۔ ایسے لوگوں پر شبہ نہیں کیا جاتا۔ اگر میں اپنے اصل حلیے میں ہوتی

مجھے فوراً پہچان لیا جاتا۔ اس لیے مجھے اپنے بدن پر کالک ملنی پڑی۔ اس طرح میں مندر کے اندر تک پہنچنے میں کامیاب ہوئی۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگی "آج دو بجے کے قریب جب میں یہاں سے واپس جانے والی تھی تو مندر میں پر گھیا راج کے ساتھ اس شخص کو دیکھ کر چونک گئی۔ اسے دیکھ کر میرے ذہن میں دارا کا خیال ابھرا۔ حلیہ وہی تھا جو تم نے بتایا تھا۔ اس شخص کو دیکھنے کے بعد میں نے واپس جانے کا ارادہ ترک کردیا۔

"دارا اور پر گھیا راج کچھ دیر ہال میں رہے اور پھر اندر چلے گئے۔ میں بھی انہیں مندر کی راہداریوں میں تلاش کرنے لگی لیکن وہ نجانے کہاں غائب ہوگئے تھے اور پھر یہ بری خوش قسمتی تھی کہ مجھے ایک پنڈت مل گیا جو کھانے پینے کا کچھ سامان اٹھائے جارہا تھا۔ اس نے کچھ سامان میرے حوالے کردیا اور اسی طرح مجھے اندر جانے کا موقع مل گیا۔

"وہ دارا ہی ہے۔ ان پنڈتوں کے ساتھ مل کر عیش کررہا ہے وہ حرامی۔ اچھے کھانے، شراب اور خوب صورت لڑکیاں۔ میں دن بھر ان کے ساتھ رہی۔ میری کالی رنگت نے مجھے بچالیا۔ اگر میں اپنے اصل رنگ و روپ میں ہوتی تو میں بھی ان درندوں سے نہیں بچ سکتی تھی۔

"میں نے پنڈتوں اور پجاریوں کے بارے میں بہت کچھ سنا تھا لیکن کبھی یقین نہیں کیا تھا مگر اس کا پہلا تجربہ اس وقت ہوا جب ایک مندر میں میری بیٹی کی عزت کو تار تار کرکے اسے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا اور میرے شوہر کو بھی قتل کیا گیا اور دوسری مرتبہ آج دیکھا کہ دھرم کا پرچار کرنے والے پنڈت اور پجاری کس طرح دارو پی کر اپنے کپڑوں سے باہر ہورہے تھے۔ وہ جوان لڑکیوں کو اس طرح بھنبوڑ رہے تھے جیسے خوں خوار بھیڑیے اپنے شکار کے بچے ادھیڑتے ہیں۔ میں تو پورا وقت شرم سے پانی پانی ہوتی رہی۔ کئی بار دل چاہا تھا کہ وہاں سے بھاگ جاؤں لیکن ان کے بارے میں جاننے کے لیے وہاں ٹھہری رہی پر ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگی۔

"دارا مسلمان ہے لیکن وہ ان پنڈتوں کے ساتھ اس طرح رہ رہا ہے جیسے خود بھی ہندو ہو۔"

"دارا بہت چالاک ہے۔" میں نے اس کے خاموش ہونے پر کہا "ایسے لوگوں کا کوئی دھرم نہیں ہوتا۔ وہ دھن کو دھرم سمجھتے ہیں اور اس کے لیے کچھ بھی کرسکتے ہیں۔ ویسے سوبھراج کے بارے میں کیا معلوم ہوا۔ اس کی جان کس نے لی؟"

"دارا کل شام کو یہاں پہنچا تھا۔" چترا نے جواب دیا "اس نے مندر میں داخل ہوتے ہی سوبھراج کو دیکھ لیا تھا۔ وہ اسے پوری طرح نہیں پہچان سکا تھا لیکن شک میں پڑگیا تھا۔ اس نے پنڈت پر گھیا راج کو اس کے بارے میں بتا دیا اور پر گھیا راج کے آدمی اسے اٹھا کر اندر لے گئے۔

"ان لوگوں کی باتوں سے اندازہ ہوا ہے کہ سوبھراج آسانی سے زبان کھولنے کو تیار نہیں ہوا تھا۔ اسے تشدد کا نشانہ بنایا جاتا رہا اور بالآخر اس کی قوتِ برداشت جواب دے گئی اور اس نے تمہارے اور میرے بارے میں بتا دیا۔

"انہوں نے سوبھراج کو ہلاک کرڈالا اور اس کی لاش مندر سے دور ویران سڑک پر پھنکوا دی۔ دارا کا خیال تھا کہ انہیں رات ہی کو ہماری کٹیا پر حملہ کردینا چاہیے تھا مگر پر گھیا راج نے اس کی مخالفت کی۔ میری بیٹی اور قتل کے حوالے سے اس کا نام پولیس کی لسٹ پر آچکا تھا۔ اگر میری کٹیا پر حملہ کرکے تمہیں یا مجھے ہلاک کردیا جاتا تو پولیس کو قاتل کے بارے میں اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہ آتی اس لیے پنڈت پر گھیا راج نے یہ منصوبہ بنایا کہ فی الحال ہماری نگرانی کرکے ہماری سرگرمیوں پر نگاہ رکھی جائے اور تمہیں ختم کرنے کے لیے بعد میں کوئی اور منصوبہ بنایا جائے۔"

"لیکن دارا کو کیسے شبہ ہوا کہ سوبھراج میرے ساتھ ملا ہوا ہے؟" میں نے کہا۔

"یہ سب کچھ مجھے ان کی باتوں ہی سے معلوم ہوا ہے۔" چترا نے جواب دیا "دارا سوبھراج کو یہاں دیکھ کر حیران ہوا تھا۔ اس نے پنڈت پر گھیا راج کو اس کے بارے میں بتایا تو پنڈت نے اسے اٹھوالیا۔ دارا کی زندگی کا انحصار اس بات پر تھا کہ یہاں اسے کوئی پہچاننے والا موجود نہ ہو لیکن یہاں سوبھراج کو دیکھ کر وہ پریشان ہوگیا تھا۔ وہ پر گھیا راج کے ذریعے اس سے نجات حاصل کرنا چاہتا تھا اور جب سوبھراج کو دارا اور پنڈت پر گھیا راج کے سامنے لے جایا گیا تو پوچھ گچھ کے دوران میں سوبھراج نے یہ انکشاف کیا کہ تم بھی دارا کی تلاش میں یہاں پہنچ چکے ہو اور اس طرح دارا کو نہ صرف تمہارے بارے میں پتا چل گیا بلکہ سوبھراج کو بھی اپنی زندگی سے ہاتھ دھونے پڑے۔"

"اور تم جانتی ہو میں جس شخص کا تعاقب کررہا تھا وہ کون ہے؟" میں نے اس کے خاموش ہونے پر کہا۔ چترا نے نفی میں سر ہلا دیا تو میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا "وہ شہر کے ایک آشرم کا منشی سوامی پرمانند ہے۔ وہ آج دن بھر ہماری

کٹیا کی نگرانی کرتا رہا ہے۔ شام کے وقت اس نے ایک کمرے کی عقبی کھڑکی کھول کر اندر جھانکا بھی تھا۔ اسے کٹیا کے آس پاس دیکھ کر مجھے اس پر شبہ ہو گیا تھا۔ شام کے بعد جب وہ شہر کی طرف واپس آیا تو میں نے اس کا تعاقب شروع کر دیا۔ وہ پہلے آشرم گیا تھا اور پھر یہاں آیا تھا۔ تقریباً ایک گھنٹے مندر کے اندر رہنے کے بعد وہ واپس جا رہا تھا۔ میں اس کے پیچھے تھا کہ تم نے مجھے روک لیا۔"

"اب اس کا پیچھا کرنے کی ضرورت نہیں۔" چترا نے جواب دیا "یہ لوگ جب تک مندر کے اندر ہیں، ہم ان کے خلاف کچھ نہیں کر سکتے۔ انہیں کسی نہ کسی طرح باہر نکالنا ہوگا۔"

"یہ اتفاق ہے کہ میرے اور تمہارے دشمن اکٹھے ہو گئے ہیں اور دونوں خوں خوار درندوں کی طرح نہایت خطرناک ہیں۔ ان سے نمٹنے کے لیے ہمیں بہت زیادہ احتیاط سے کام لینا ہوگا۔" میں نے کہا۔

"اب یہاں بیٹھنا بے کار ہے۔ واپس چلو۔" چترا نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"ہم دونوں کا ساتھ چلنا مناسب نہیں ہے۔ اگر اب مجھے تمہارے ساتھ دیکھ لیا گیا تو کوئی گڑبڑ ہو سکتی ہے۔ تم آگے چلتی رہو۔ میں تمہارے پیچھے پیچھے آتا ہوں۔"

چترا مندر کی طرف چلی گئی۔ میں بھی کچھ فاصلہ دے کر اس کے پیچھے چلنے لگا۔ مندر کے سامنے پہنچ کر چترا شہر کی طرف جانے والے راستے پر مڑ گئی۔ میرے اور اس کے درمیان تقریباً بیس گز کا فاصلہ تھا۔ تقریباً دو فرلانگ کا فاصلہ طے کرنے کے بعد میں اس کے ساتھ مل گیا۔

ہم کچھ دور تک اکٹھے ہی چلتے رہے۔ اس وقت رات کے نو بجنے والے تھے۔ ایک موڑ پر پہنچ کر میں رک گیا۔

"تم جاؤ۔ میں ذرا بازار کی طرف سے ہو کر آتا ہوں۔ کچھ کھانے کو لے آؤں۔" میں نے کہا۔

چترا پہاڑیوں کی طرف جانے والے راستے پر مڑ گئی اور میں بازار کی طرف چل پڑا۔

میں نے ایک ریسٹورنٹ سے کھانا پیک کروایا۔ بازار سے کچھ اور چیزیں خریدیں اور کٹیا کی طرف چل پڑا۔

دن کے وقت تو اس طرف لوگوں کی آمد و رفت رہتی تھی لیکن اس وقت یہ راستہ سنسان پڑا تھا۔

میں ابھی کٹیا سے چند گز دور ہی تھا کہ ایک ہلکی سی نسوانی چیخ سن کر چونک گیا۔ یہ آواز کٹیا کی طرف سے آئی تھی اور اسے پہچاننے میں بھی مجھے کوئی دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ وہ چترا کے چیخنے کی آواز تھی۔

کٹیا کے قریب پہنچ کر میں رک گیا۔ اس طرح براہ راست اندر داخل ہونا مناسب نہیں تھا۔ میں دبے قدموں چلتے ہوئے کٹیا کے پچھلی طرف پہنچ گیا۔ ہر طرف سناٹا تھا۔ دور دور تک کسی ذی روح کی موجودگی کے آثار دکھائی نہیں دے رہے تھے لیکن کٹیا کے اندر جو ڈراما ہو رہا تھا اس کا اندازہ لگانے میں مجھے دشواری پیش نہیں آئی۔

میں پچھلی کھڑکی کے قریب پہنچ کر رک گیا۔ یہ وہی کھڑکی تھی جہاں سے شام کو سوامی پرمانند نے جھانک کر دیکھا تھا۔ میں نے کھڑکی کے شیشے سے آنکھ لگا دی۔ یہ وہی کمرا تھا جہاں رات کو میں سویا کرتا تھا۔ یہ کمرا خالی تھا البتہ دروازے کی دوسری طرف آتش دان والے کمرے میں دکھائی دینے والا منظر بڑا سنسنی خیز اور خوفناک تھا۔

اس کمرے میں چترا کے علاوہ دو آدمی تھے اور وہ دونوں خوفناک صورتوں والے پجاری تھے۔ ان کے حلیے دیکھ کر ڈر تھا جیسی ان کے جیون کا بیشتر حصہ جنگلوں میں گزرا ہو۔ ان میں سے ایک نے چترا کے بازو موڑ کر اسے پیچھے سے گرفت میں لے رکھا تھا۔ چترا کے بدن پر اب وہ چادر نہیں تھی۔ چھوٹے زیر جامے تھے۔ گھٹنوں سے گردن تک اس کا بدن اپنی اصل رنگت میں تھا جبکہ گردن سے اوپر چہرہ، پورے بازو اور گھٹنوں سے پیروں تک کی رنگت سیاہ تھی۔

دوسرا پجاری چترا کے سامنے کھڑا تھا۔ اس کی آنکھیں سرخ اور چہرے پر بڑے خوفناک تاثرات تھے۔

"گرو جی بہت کھس ہوں گے۔" وہ پہلے اور گندے دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے بولا "اسے جب پتا چلے گا کہ کالے مندر والی جو لونڈیا دن بھر اس کی نظروں کے سامنے رہی ہے وہ اپسرا کی طرح حسین ہے وہ تو بہت کھس ہوں گے۔"

"گبرو! پہلے اپنا تو منہ میٹھا کر لے۔" اس پجاری نے جس نے چترا کو گرفت میں لے رکھا تھا "گرو تو ایسی چیزوں سے مزے لیتا ہی رہتا ہے۔ آج ہم بھی چکھ لیں۔"

"پہلے اس سے پوچھ تو لیں اس کا پریمی کہاں ہے۔" پجاری نے جواب دیا۔ جسے گبرو کے نام سے مخاطب کیا گیا تھا وہ چترا کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"ہاں تو چترا دیوی۔ بہت ناٹک رچا لیے تم نے۔ اب تمہارا بھید کھل گیا ہے۔ بتا دو تمہارا پریمی کہاں ہے۔ وہ جس کی ہمارے گرو کو تلاش ہے۔ ورنہ تم جانتی ہو تمہارے ساتھ کیا ہوگا۔"

"میں کچھ نہیں جانتی۔ چھوڑ دو مجھے۔" چترا نے اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "تم لوگوں نے میری معصوم بیٹی اور میرے شوہر کو مار ڈالا۔ میں نے قسم کھائی ہے کہ تم لوگوں کو زندہ نہیں چھوڑوں گی۔ تمہارے گندے اور غلیظ خون سے گنگا کے پوتر پانی کو بھی گندا کروں گی۔"

"سنا تم نے بھیرو۔" گبرو نے اپنے ساتھی کی طرف دیکھتے ہوئے ہلکا سا قہقہہ لگایا "یہ ناری ہمارے لہو سے گنگا جل کو گندا کرے گی۔ پر یہ نہ جانے ہے کہ ہمارا خون تو گنگا جل سے بھی زیادہ پوتر ہے۔"

"اس کا منہ تو دھلاؤ گبرو۔ چمالو گے تو تمہارا بھی منہ کالا ہو جائے گا۔" بھیرو نے کہا۔

"ہاں۔ یہ تو مجھے خیال ہی نہیں رہا تھا۔ ابھی اس کا مکھڑا دھلاتا ہوں۔ ویسے اپنا منہ بھی تو پہلے ہی کالا ہے۔ ایک بار اور کالا کر لیں گے تو کیا فرق پڑ جائے گا۔" گبرو یہ کہتے ہوئے کمرے کے اس حصے کی طرف چلا گیا جہاں پانی کا مٹکا رکھا ہوا تھا۔ اس طرح وہ میری نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔

میں نے دونوں ہاتھوں میں پکڑے ہوئے شاپنگ بیگ بڑی آہستگی سے زمین پر رکھ دیے اور احتیاط سے کھڑکی کھولنے لگا۔ یہ کھڑکی شام کو سوامی پرمانند نے کھولی تھی اور پھر اس کے پٹ بھیڑ دیے تھے اور اس وقت مجھے کھڑکی کھولنے میں ذرا سی بھی دشواری پیش نہیں آئی تھی۔

میں کھڑکی کے فریم پر چڑھ رہا تھا کہ گبرو پانی سے بھرا ہوا گلاس لے کر سامنے آ گیا۔

"لے منہ دھو لے۔ تیرا اصل روپ تو دیکھیں۔" اس نے یہ کہتے ہوئے پانی چترا کے منہ پر پھینک دیا۔

چترا کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ اس کے چہرے پر چھایا ہوا رنگ پانی کے ساتھ بہہ نکلا۔ وہ ذرا سی مچلی تو اس کے پیچھے بھیرو نے اس کے ہاتھ کچھ اور مضبوطی سے جکڑ لیے۔

"چھوڑو مجھے۔ چھوڑ دو۔" وہ چیخی "ایک عورت پر ظلم کرتے ہوئے تم لوگوں کو شرم آنی چاہیے۔"

"اسی لیے تو کہتے ہیں کہ اپنے اس پریمی کے بارے میں بتا کہاں ہے وہ۔" بھیرو نے اس کی بانہوں کو مروڑتے ہوئے کہا "وہ مرد ہوتا تو تمہیں اکیلے چھوڑ کر بھاگ نہ جاتا۔ خیر۔ اس کو تو ہم تلاش کر ہی لیں گے۔ پہلے تیرے ساتھ تو۔"

"میں آ گیا شیطانو!" میں نے گونج دار آواز میں کہتے ہوئے کھڑکی سے اندر چھلانگ لگا دی "تمہیں انتظار کا کشٹ نہیں اٹھانا پڑے گا۔ میں آ گیا ہوں اور اب تم دونوں تیار ہو جاؤ۔"

میں اچھل کر بیچ والے دروازے کے قریب آ گیا تھا۔ ان دونوں نے بیک وقت میری طرف دیکھا۔ ایک لمحے کو تو یوں لگا جیسے ان دونوں کے دیوتا کوچ کر گئے ہوں لیکن پھر ان دونوں نے حیرت انگیز طور پر بہت جلدی اپنے آپ پر قابو پا لیا۔ بھیرو نے اچانک ہی چترا پر تیم کو پوری قوت سے میری طرف دھکیل دیا۔

چترا لڑکھڑاتی ہوئی مجھ سے ٹکرا گئی۔ اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ میں نے چترا کو دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ اس جھٹکے سے میں بھی ایک لمحے کو گڑبڑا گیا تھا اور پھر میرے سنبھلنے سے پہلے ہی گبرو اور بھیرو نے بیک وقت دو مختلف سمتوں سے مجھ پر حملہ کر دیا۔

میں چترا کو ساتھ لے کر بڑی پھرتی سے نیچے گر گیا اور تیزی سے لوٹ لگا کر ایک طرف ہٹ گیا۔ گبرو اور بھیرو اپنی ہی جھونک میں ایک دوسرے سے ٹکرا گئے۔ ان کے سر آپس میں ٹکرائے تھے۔ ان دونوں میں کسی کے منہ سے چیخ بھی نکلی تھی۔

میں نے چترا کو اپنے سے الگ کیا اور اپنے پیروں پر کھڑے ہوتے ہی ایک زور دار سائیڈ کک بھیرو کے رسید کر دی۔ کک نپی تلی تھی۔ بھیرو چیختے ہوئے گبرو سے ٹکرا گیا اور وہ دونوں ڈھیر ہو گئے۔ میں نے انہیں سنبھلنے کا موقع دیے بغیر ان پر ٹھوکروں کی بارش کر دی۔

وہ اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کرتے رہے مگر میری ہر ٹھوکر ان میں سے کسی نہ کسی کو چیخنے پر مجبور کر دیتی بالآخر بھیرو کا داؤ چل گیا۔ اس نے میرا پیر پکڑ کر زور دار جھٹکا دیا۔ میں لڑکھڑا کر پشت کے بل گرا۔ بھیرو نے بڑی پھرتی سے اٹھ کر میرے اوپر چھلانگ لگا دی۔ میں نے اس سے بھی زیادہ پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے دونوں ٹانگیں سمیٹ کر اسے پیروں پر روکا اور پوری قوت سے دور اچھال دیا۔ وہ لڑکھڑاتے ہوئے دیوار سے ٹکرا کر گرا۔ میرے سنبھلنے سے پہلے ہی گبرو بھی چھلانگ لگا چکا تھا۔ میں اسے روکنے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ وہ بھاری چٹان کی طرح میرے اوپر گرا۔

وہ کم بخت خاصا بھاری بھرکم تھا۔ ایک لمحے کو تو مجھے اپنا سانس گھٹتا ہوا محسوس ہوا لیکن پھر میں ایک گھٹنا سمیٹ کر اس کی ٹانگوں کے بیچ میں ٹھوکر لگانے میں کامیاب ہو گیا۔ وہ کراہ اٹھا۔ میں نے گھٹنے سے اسی انداز میں دوبارہ ٹھوکر لگائی۔ اس مرتبہ وہ بری طرح بلبلایا۔ میں نے دوسری ٹانگ بھی سمیٹ لی اور اسے پیروں پر اٹھا کر پیچھے کی طرف اچھال

دیا۔ وہ میرے سر کے اوپر سے ہوتے ہوئے بھدے سے پیچھے کی طرف گرا۔

میرے اٹھنے تک وہ دونوں بھی اٹھ گئے اور ارنا بھینسے کی طرح پھنکارتے ہوئے میری طرف بڑھے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ان دونوں میں بے پناہ طاقت بھری ہوئی تھی لیکن وہ لڑنے کے فن سے واقف نہیں تھے جبکہ مجھے ان پر یہ فوقیت حاصل تھی کہ میں مارشل آرٹس میں مہارت رکھتا تھا۔

ان دونوں کے انداز بڑے خطرناک تھے۔ وہ مجھے گرفت میں لینا چاہتے تھے اور میں جانتا تھا کہ اگر ان کے قابو میں آگیا تو وہ میری ہڈیوں کا سرمہ بنا دیں گے۔ میں اس طرح پیچھے ہٹنے لگا جیسے ان سے خوف زدہ ہو رہا ہوں۔ تین قدم پیچھے ہٹتے ہی میں طاقت ور اسپرنگ کی طرح اپنی جگہ سے اچھلا۔ اس مرتبہ میں نے ڈبل کک لگائی تھی۔ میرا ایک پیر بھیرو کے منہ پر اور دوسرا گبرو کے سینے پر لگا تھا۔ وہ دونوں بلبلاتے ہوئے پیچھے الٹ گئے۔

اور پھر میری آنکھوں نے ایک حیرت انگیز منظر دیکھا۔ چترا پریتم جو اب تک بیچ والے دروازے کے قریب پڑی ہوئی تھی۔ بڑی تیزی سے اٹھ کر آتش دان کی طرف لپکی جہاں برتنوں میں سبزی کاٹنے کی لمبے پھل والی چھری پڑی ہوئی تھی۔ اس سے پہلے کہ میں صورتِ حال کو سمجھ سکتا، چترا نے چھری اٹھا کر بھیرو پر حملہ کردیا۔

منہ پر میری کک لگنے سے بھیرو کی ناک اور منہ سے خون بہہ نکلا تھا اور وہ قدرے آگے کو جھکا ہوا تھا۔ اس کا ایک ہاتھ ناک اور منہ پر تھا۔ چترا نے خوفناک انداز میں چیختے ہوئے چھری پوری قوت سے اس کے بائیں پہلو میں اتار دی۔

بھیرو چیختے ہوئے منہ کے بل گرا۔ چترا نے چھری اس کے جسم سے باہر کھینچ کر دوبارہ حملہ کردیا۔ یہ وار بھی بھیرو کے پہلو ہی پر پڑا۔ وہ ذبح ہوتے ہوئے بکرے کی طرح بلبلا اٹھا۔ اس کے جسم پر لگنے والے دو زخموں سے خون بہہ نکلا تھا۔ وہ زمین پر لوٹتے ہوئے جیسے ہی سیدھا ہوا، اس مرتبہ چترا نے چھری اس کے سینے میں اتار دی۔

گبرو ایک طرف پڑا دہشت زدہ سی نظروں سے یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا اور پھر وہ اس قدر خوف زدہ ہوا کہ اس نے اٹھ کر چیختے ہوئے دروازے کی طرف چھلانگ لگا دی۔

میں بھی چترا پریتم کے جنون کو دیکھ رہا تھا۔ گبرو کی چیخ سن کر میں جیسے ہوش میں آگیا اور دوسرے ہی لمحے میں نے بھی گبرو کے پیچھے چھلانگ لگا دی۔ گبرو کا پیر میرے ہاتھ میں آگیا۔ وہ دروازے سے ٹکرایا۔ دروازہ باہر کی طرف کھل گیا۔ اس کے ساتھ ہی گبرو بھی گرا اور اس کا پیر میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا اور اس سے پہلے کہ وہ اٹھ کر بھاگنے کی کوشش کرتا، میں نے چھلانگ لگا کر اسے جھپاٹ لیا۔

ہم دونوں ایک دوسرے کو پتھروں پر رگیدتے رہے۔ گبرو کو اس دوران میں کئی مواقع ملے تھے۔ وہ اگر چاہتا تو میری گردن مروڑ سکتا تھا لیکن وہ اپنے آپ کو چھڑا کر بھاگنے کی کوشش میں تھا۔ بھیرو کا حشر دیکھ کر اس پر بری طرح خوف سوار ہوگیا تھا۔ اس نے ایک بار پھر اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کی لیکن اس مرتبہ اس کی گردن میرے بازو کی گرفت میں آگئی۔

میں نے گبرو کی گردن کو بازو کی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ وہ گرفت چھڑانے کی بھرپور کوشش کر رہا تھا لیکن میرے بازو کا لگایا ہوا نیک لاک چھڑانا ممکن نہیں تھا۔ اس کی پشت میرے سینے سے لگی ہوئی تھی۔ اس کی یہ کوشش بھی تھی کہ کسی طرح اپنے پیروں پر کھڑا ہوسکے لیکن پتھروں میں ایڑیاں رگڑنے کے سوا وہ کچھ نہیں کرسکا تھا۔

اور پھر مجھے وہ موقع مل گیا جس کی مجھے تلاش تھی۔ میں نے اس کی گردن کو زوردار جھٹکا دیا۔ خاصی موٹی گردن تھی۔ جھٹکا لگنے سے وہ چیخ اٹھا تھا لیکن میرا مقصد پورا نہیں ہوا تھا۔ میں نے ایک اور جھٹکا دیا اور پھر تیسرے جھٹکے پر "کڑک" کی آواز ابھری۔

گبرو بری طرح مچلا۔ اس کے حلق سے خرخراہٹ کی دبی دبی عجیب سی آوازیں نکل رہی تھیں اور پھر اسی لمحے چترا چیختے ہوئے کٹیا سے باہر آگئی۔ خون آلود چھری اس کے ہاتھ میں تھی۔

ہم جس جگہ پر تھے وہاں کھلے ہوئے دروازے سے لیمپ کی مدھم سی روشنی پہنچ رہی تھی۔ چترا نے آتے ہی گبرو پر حملہ کردیا۔ چھری اس کے پیٹ میں اتر گئی۔ میں نے گبرو کی گردن کو ایک اور جھٹکا دیا اور اسے چھوڑ کر ایک طرف ہٹ گیا۔

گبرو کو میں نے چترا کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ وہ پتھروں پر بری طرح لوٹ رہا تھا اور چترا چھری سے اس پر پے در پے حملے کر رہی تھی۔ اس پر جنون طاری تھا۔ اس نے اپنی ہوش کے ہاتھوں اپنی بیٹی اور اپنے شوہر کو اسی طرح قتل ہوتے دیکھا تھا اور اس نے قسم کھائی تھی کہ بیٹی اور شوہر کے قاتلوں کو زندہ نہیں چھوڑے گی اور میں نے اسے یہ موقع فراہم کردیا تھا۔

گبرو ختم ہوچکا تھا لیکن چترا کے جنون میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ وہ اب بھی چھری سے پے در پے اس پر وار کر رہی تھی۔

"چترا رک جاؤ!" میں نے چیخ کر کہا "وہ ختم ہوچکا ہے۔ چھوڑ دو اسے۔"

"میں اسے نہیں چھوڑوں گی۔ ٹکڑے کردوں گی اس کے۔" چترا نے بھی چیخ کر جواب دیا اور گبرو کے مردہ جسم پر حملے جاری رکھے۔

میں نے پیچھے سے چترا کو اپنی بانہوں کی لپیٹ میں لے لیا۔ وہ چیخ چیخ کر اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کرتی رہی لیکن میں اسے گھسیٹتے ہوئے وہاں سے دور ندی کی طرف لے گیا۔

چترا کی یہ کانچ یا کٹیا آبادی سے بہت دور تھی۔ سناٹے میں چیخ پکار کی آوازیں اگرچہ دور تک پہنچی ہوں گی اور کہیں نہ کہیں سنی بھی گئی ہوں گی لیکن مجھے یقین تھا کہ تحقیقِ حال کے لیے کوئی اس طرف نہیں آئے گا اور پھر کسی کے لیے یہ اندازہ لگانا بھی دشوار ہوگا کہ چیخنے کی یہ آوازیں کس طرف سے آئی تھیں اس لیے کم از کم اس وقت یا فوری طور پر کسی کی مداخلت کا اندیشہ نہیں تھا۔

میں چترا کو کھینچتے ہوئے ندی پر لے گیا۔ اس کے ہاتھ سے چھری لے کر ایک طرف ڈال دی اور اس کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارنے لگا اور پھر وہ جیسے ہوش میں آگئی۔ وہ کتنی دیر تک گہرے گہرے سانس لیتی رہی پھر میرے ساتھ لپٹ کر سسکیاں بھرنے لگی۔ میں اس کا کندھا تھپتھپاتا رہا اور جب اس کی سسکیاں تھمیں تو میں نے اسے اپنے آپ سے الگ کردیا۔

"آج میرے من کو کچھ تسکین مل گئی۔" وہ اب بھی گہرے گہرے سانس لے رہی تھی "لیکن پوری تسکین اس وقت ملے گی جب میں اس تیسرے درندے پنڈت پرگھیا راج کو بھی اسی طرح موت کے گھاٹ اتاروں گی۔"

"لیکن اس سے پہلے ہمیں اور بھی بہت سے کام کرنے ہیں۔" میں نے اس کا بازو تھپتھپاتے ہوئے کہا "ان دونوں لاشوں کو ٹھکانے لگانا ہے اور اپنے لیے کسی دوسرے ٹھکانے کا بندوبست کرنا ہے۔ یہ جگہ اب ہمارے لیے محفوظ نہیں ہے۔" میرے ذہن میں اچانک ہی خیال آیا تھا کہ گبرو اور بھیرو کو مارا اور پنڈت پرگھیا راج نے مجھے اور چترا پریتم کو ختم کرنے کے لیے بھیجا تھا۔ یہ دونوں جب واپس نہیں پہنچیں گے اس بات کا یقینی ہے وہ کسی اور کو بھی اس طرف بھیجیں گے اس طرح یہ جگہ ہمارے لیے بالکل غیر محفوظ ہوگئی تھی۔

چترا ان لاشوں کو ندی میں پھینکنا چاہتی تھی تاکہ اپنی قسم پوری کرسکے لیکن میں جانتا تھا کہ یہ لاشیں پانی میں بہہ کر زیادہ دور تک نہیں جاسکیں گی۔ آگے جاکر اس ندی کا پاٹ چوڑا ہوگیا تھا اور پانی کے بہاؤ کی رفتار بھی کم ہوگئی تھی۔ مزید برآں آگے ندی میں بڑے بڑے پتھر بھی تھے اور کناروں پر جھاڑیاں بھی تھیں جن کی شاخیں پانی کے اندر تک پھیلی ہوئی تھیں وہ لاشیں ان جھاڑیوں اور پتھروں میں اٹک جاتیں اور کل دن میں کسی بھی وقت ان کا پتا چل سکتا تھا جبکہ میرے ذہن میں کچھ اور منصوبہ تھا۔

کانچ میں آکر ہم نے صورتِ حال کا جائزہ لیا۔ اس کمرے میں جا بجا خون پھیلا ہوا تھا جہاں بھیرو کی لاش پڑی تھی۔ خون صاف کرنا ممکن نہیں تھا۔ اس کے علاوہ کانچ میں ہر جگہ اور ہر چیز پر ہماری انگلیوں کے نشانات موجود تھے۔ پولیس اگر تحقیقات کرتی تو ہمیں قاتل ثابت کرنے میں انہیں زیادہ دشواری پیش نہیں آتی۔ ہم ویسے بھی پولیس کے لیے اجنبی نہیں تھے۔ چترا پریتم تو اپنی بیٹی اور شوہر کے قتل کے حوالے سے پہلے ہی پولیس سے رابطے میں تھی اور میں بھی تیس مار خان بنا ہوا تھا۔ سورج گرہن والے دن ہم نے گنگوتری کے پہاڑی غاروں میں بدری ناتھ کی نوجوان بیٹی سیتا کو پنڈت آشوتوش سے بچایا تھا اور پولیس والے ہمارے بے حد مشکور و ممنون ہوئے تھے اور پولیس پر یہ احسان اب ہمارے لیے خصوصاً میرے لیے بہت بڑا خطرہ بن گیا تھا۔ پولیس والے جان گئے تھے کہ میں چترا کے ساتھ رہ رہا ہوں اور اب چترا کے ساتھ مجھے بھی تلاش کیا جانا لازمی تھا۔

اس کانچ سے اپنے جرم کا ہر ثبوت مٹانا ہمارے لیے ضروری تھا تاکہ ہم سامنے بھی رہیں تو کم از کم پولیس ہم پر قتل کا شبہ نہ کرسکے اور میں نے چترا کو سمجھا دیا تھا کہ ثبوت کس طرح مٹائے جاسکتے ہیں۔

میں نے گبرو کی لاش بھی باہر سے اٹھا کر کانچ میں بھیرو کی لاش کے قریب ڈال دی۔

چترا اپنے کمرے میں گھس گئی جہاں ایک طرف اس کا سوٹ کیس پڑا ہوا تھا۔ اس نے سوٹ کیس کھول کر چند کپڑے ایک تھیلے میں بھرلیے۔ میں نے بھی دوسرے کمرے میں جاکر اپنے بکھرے ہوئے کپڑے اپنے بیگ میں ٹھونس لیے۔

"شہر کا رخ کرنا ہمارے لیے خطرے سے خالی نہیں۔" میں نے چترا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "یہ رات ہمیں پہاڑوں میں ہی گزارنی پڑے گی۔ صبح کسی ایسی جگہ کا بندوبست کریں

گے جہاں ہم چند روز تک محفوظ رہ سکیں۔"

"ایک ایسی جگہ ہے۔" چترا نے کہا "تم وہ کمبل اٹھالو۔ ہمیں اس کی ضرورت پڑے گی۔"

ایک کمبل چترا نے بھی اٹھالیا تھا۔ دوسرا میں نے تہ کرکے اپنے کندھے پر رکھ لیا۔ میں نے وہ کھڑکی بھی اندر سے بند کردی۔ چترا کمرے کا جائزہ لے رہی تھی۔

میں نے جلتا ہوا لیمپ اٹھالیا۔ چترا باہر جاچکی تھی۔ لیمپ کا ڈھکن کھول کر پہلے میں نے ان دونوں لاشوں پر تیل چھڑکا پھر تنوں کمروں میں تیل کے چھینٹے دینے لگا۔

لیمپ میں تیل کے چند ہی قطرے بچے تھے۔ اس کی بتی ابھی تک جل رہی تھی۔ میں نے اس کا شیشہ اتار کر نیچے پھینک دیا اور لاشوں کے قریب ایک کپڑے پر جلتا ہوا لیمپ پھینک دیا۔

کپڑے نے فوراً ہی آگ پکڑلی۔ میں جلدی سے باہر آگیا اور دروازہ بند کرکے باہر سے کنڈا لگادیا۔ چترا دروازے سے چند قدم دور کھڑی تھی۔

"کس طرف جانا ہے؟" میں نے قریب پہنچ کر پوچھا اور چترا نے ایک طرف اشارہ کردیا۔

ہم تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے اس طرف چلنے لگے۔ تقریباً سو گز دور نکلنے کے بعد میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ کانچ کی عقبی کھڑکیوں میں روشنی نظر آرہی تھی جس کا مطلب تھا کہ اندر آگ پھیلنے لگی تھی۔ یہ مختصر سی عمارت لکڑی کے تختوں سے بنی ہوئی تھی اور میں جانتا تھا کہ چند منٹ میں ہی پوری عمارت آگ کی لپیٹ میں آجائے گی اور اس کے ساتھ ہی ہمارے اس جرم کے تمام ثبوت مٹ جائیں گے۔

ہم تیز تیز چلتے رہے۔ ہمارا رخ بلندی کی طرف تھا۔ تھوڑی ہی دیر بعد چترا ہانپنے لگی۔ اس وقت ہم کانچ سے تقریباً نصف میل دور نکل آئے تھے۔ چترا کی وجہ سے مجھے رک جانا پڑا۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ ہم چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں میں تھے۔ جلتا ہوا مکان اگرچہ نظر نہیں آرہا تھا لیکن اس طرف فضا میں نارنجی روشنی دکھائی دے رہی تھی۔

پانچ چھ منٹ وہاں رکنے کے بعد ہم ایک بار پھر چل پڑے۔ ہم پہاڑیوں میں بدستور بلندی کی طرف جارہے تھے۔ بلندی، سبزہ اور گھنے درختوں کی وجہ سے سردی میں بھی اضافہ ہورہا تھا۔ میں نے چترا سے اس کا تھیلا لے لیا اور اس کا کمبل کھول کر اس کے جسم پر ڈال دیا۔ کمبل کی وجہ سے چترا کو چلنے میں مزید دشواری پیش آرہی تھی۔ چترا نے ایک ہاتھ سے اپنے بدن پر لپٹے ہوئے کمبل کے دونوں کنارے پکڑ رکھے تھے اور اس کا دوسرا ہاتھ میں نے تھام رکھا تھا اور اسے تقریباً کھینچتے ہوئے لے جارہا تھا۔

ہم تقریباً تین گھنٹے تک رک رک کر چلتے رہے اور ایک بار پھر رک جانا پڑا۔ چترا زمین پر بیٹھ کر ہانپنے لگی اور میں بائیں طرف نشیب میں دیکھنے لگا جہاں دور دور تک بکھری ہوئی روشنیاں نظر آرہی تھیں۔ ہم پہاڑیوں میں چلتے ہوئے شہر کی دوسری طرف نکل آئے تھے اور ہردوار شہر ہم سے تقریباً تین میل دور نشیب میں تھا۔

ہمیں تقریباً بیس منٹ تک اس جگہ رکنا پڑا اور بالآخر ایک بار پھر آگے روانہ ہوگئے۔ پہاڑیوں میں اونچے نیچے راستوں پر چلنا خاصا دشوار کام تھا اور تاریکی میں تو اور بھی مشکل پیش آرہی تھی۔ کئی مرتبہ بڑے بڑے پتھر ہمارے پیروں کے نیچے سے پھسل کر ڈھلان پر لڑھکتے ہوئے دور تک چلے گئے تھے۔ میں نے چترا کا ہاتھ پکڑ رکھا تھا۔

مزید دو گھنٹے چلنے کے بعد ہم ایک بار پھر رک گئے۔ ہم جب کانچ سے روانہ ہوئے تھے تو اس وقت تقریباً دس بجے کا وقت ہوگا اور میرے خیال میں اب تین تو ضرور بج رہے ہوں گے۔ پہاڑیوں پر چلتے چلتے چترا بری طرح ہانپ رہی تھی۔ سردی بھی لگ رہی تھی۔ اس کے جسم پر صرف ازدیر تھے۔ اگر میں اسے کمبل نہ اوڑھاتا تو وہ ٹھٹھر کر رہ جاتی۔

میں چترا کے بتائے ہوئے راستوں پر چلتا رہا جس سے میں اس نشیب پر پہنچا تھا کہ یہ پہاڑی راستے اس کے دیکھے بھالے تھے۔ وہ اس وقت بھی گہرے گہرے سانس لیتے ہوئے متجسس نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی اور پھر اس نے ہاتھ سے ایک طرف اشارہ کردیا۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد ہم ایک جگہ پر رک گئے۔ یہاں درختوں کی بہتات تھی اور ایک چٹان سے آبشار کی طرح پانی گر رہا تھا۔ وہ چٹان بارہ تیرہ فٹ سے زیادہ اونچی نہیں تھی اور آبشار بھی زیادہ بڑا نہیں تھا۔ پانی ایک بڑے پرنالے کی صورت میں نیچے گر رہا تھا اور جمع ہونے پر ندی کی صورت میں آگے بہنے کے بجائے وہیں پتھریلی زمین کے اندر غائب ہورہا تھا۔ یہی پانی چٹانوں کے اندر ہی اندر بہتا ہوا گنگوتری کے مقام پر کہیں نہ کہیں سے باہر نکل آتا تھا۔

اس آبشار سے تقریباً پچاس گز کے فاصلے پر ایک چٹان کے پیچھے دوسری چٹان میں ایک تنگ سا غار تھا۔ غار کے دہانے پر پہنچ کر چترا نے مجھ سے تھیلا لے لیا اور اس کے اندر ٹٹول کر ایک ٹارچ نکال لی۔

میں نے چترا کے ہاتھ سے ٹارچ لے لی اور اس کی روشنی میں غار کا جائزہ لینے لگا۔ غار زیادہ بڑا نہیں تھا۔ فرش پر پیال بچھا ہوا تھا۔

"تم پہلے سے اس غار کے بارے میں جانتی تھیں؟" میں نے سوالیہ نگاہوں سے چترا کی طرف دیکھا۔

"میں کئی مرتبہ یہاں آچکی ہوں۔" اس نے جواب دیا "پہلی مرتبہ تو میں محض اتفاق سے اس طرف نکل آئی تھی۔ ان دنوں یہاں ایک سادھو جاپ پر بیٹھا ہوا تھا۔ میں اس کے لیے کھانے پینے کی چیزیں لے کر آنے لگی اور پھر ایک روز جب یہاں آئی تو وہ سادھو غائب ہوچکا تھا۔ شاید اس کا جاپ پورا ہوگیا تھا اور وہ کہیں چلا گیا تھا۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بولی "اندر چلو۔ مجھے سردی لگ رہی ہے۔"

دو چٹانوں کی وجہ سے یہاں ایک درّہ سا بن گیا تھا جس سے تیز ہوا آرہی تھی۔ جب تک ہم پہاڑیوں پر چڑھتے رہے تھے، خون کی گردش تیز رہی تھی اور سردی کا احساس نہیں ہوا تھا لیکن اب ایک دم سردی اپنا اثر دکھانے لگی تھی۔

ہم غار کے اندر آگئے۔ میں نے اپنا بیگ کندھے سے اتار کر ایک طرف رکھ دیا۔

چترا کمبل اوڑھے دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ اسے شاید زیادہ سردی چڑھ گئی تھی۔ وہ ہولے ہولے کانپ رہی تھی۔ میں بھی اس کے قریب ہی بیٹھ گیا اور کمبل کا کچھ حصہ اس کے اوپر ڈال دیا لیکن چترا کی سردی کم نہیں ہوئی اور وہ مسلسل کانپتی رہی اور بالآخر میرے ساتھ لپٹ گئی۔ میں نے دونوں کمبل ملا کر لپیٹ لیے۔

چترا میرے ساتھ لپٹی ہوئی تھی۔ اس کے دانت بج رہے تھے اور جسم میں جیسے بھونچال سا آیا ہوا تھا لیکن بالآخر وہ پُرسکون ہوتی چلی گئی۔

چترا شاید سوگئی تھی۔ میں دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا صورت حال کے بارے میں سوچتا رہا۔ میرے ذہن میں کئی سوال تھے۔ ان حالات سے چھٹکارا کب ملے گا اور یہ قتل و غارت کب ختم ہوگی؟ کیا میری زندگی کا صرف ایک ہی مقصد رہ گیا تھا؟ کیا میری زندگی میں کبھی ٹھہراؤ نہیں آئے گا اور میں اسی طرح حالات کی متلاطم لہروں پر بہتا رہوں گا؟

میں جیسے جیسے سوچتا رہا، میرا دماغ اُلجھتا گیا۔ کئی ایسے مواقع آئے تھے کہ میں نے ان ہنگاموں سے الگ ہونے کی کوشش کی تھی لیکن میرے دشمنوں نے مجھے کبھی بھی چین سے نہیں بیٹھنے دیا تھا۔ میرے زخموں کو کریدا گیا تھا اور قدم قدم پر مجھے یہ احساس دلایا گیا تھا کہ اگر مجھے زندہ رہنا ہے تو مجھے یہ ظلم بھی برداشت کرنا پڑیں گے۔

میں یہ ظلم برداشت کرتا رہا۔ میرے زخم ہرے ہوتے رہے۔ بار بار میری نظروں میں وہ منظر گھوم جاتا جب میرے ماں باپ کو میرے سامنے نہایت بے دردی سے موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا اور یہ احساس بھی مجھے اپنے دشمنوں کے خلاف ڈٹے رہنے پر مجبور کرتا رہا کہ مجھے ان معصوم لوگوں کے قتل کا بدلہ لینا ہے جنہیں ان کی بے گناہی کی سزا دی گئی تھی۔

میری زندگی میں کوئی رات ایسی نہیں آئی تھی جب میں سکون کی نیند سویا ہوں۔ یہ رات بھی ایسی ہی تھی۔ مجھے ایک بار پھر موت کے گھاٹ اتارنے کی کوشش کی گئی لیکن میں اس مرتبہ بھی بچ نکلا تھا اور اپنی طرح ظلم کا شکار ایک بے گناہ عورت کے ساتھ اس غار میں پڑا سردی سے ٹھٹھر رہا تھا۔

ہمالیہ کی گود میں یہ رات میرے لیے بڑی اذیت ناک ثابت ہورہی تھی۔ دھیان بٹانے کے لیے میں مختلف حوالوں سے سوچتا رہا۔ میرے ذہن میں جانگی کا خیال ابھر آیا۔ جانگی، روپ متی، بلا اور ٹھاکر۔ ٹھاکر تو جانتا تھا کہ میں کہاں اور کیوں جارہا ہوں لیکن جانگی وغیرہ بالکل لاعلم تھیں۔ انہوں نے تو واقعی ٹھاکر کی بوٹیاں نوچ لی ہوں گی۔ اتنے روز سے میں نے ٹھاکر کو اپنے بارے میں کوئی اطلاع بھی نہیں دی تھی اور یقیناً وہ بھی پریشان ہوگا۔

رات کے آخری پہر سردی بڑھ گئی۔ میں اپنے اندر بھی کپکپاہٹ سی محسوس کرنے لگا چترا اگرچہ میرے ساتھ لپٹی سو رہی تھی۔ میں نے دونوں کمبلوں کو اچھی طرح لپیٹا اور چترا کو اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا کہ شاید اس طرح سردی کا احساس کچھ کم ہو۔

اچانک میرے ذہن میں ایک اور خیال ابھرا۔ میں چترا کو چھوڑ کر سیدھا ہوگیا اور آنکھیں بند کرکے گہرے گہرے سانس لینے لگا۔ مجھے مایوسی نہیں ہوئی۔ میرے اندر چی کی پُراسرار قوت بیدار ہونے لگی۔ میرے اندر کی کپکپاہٹ بتدریج کم ہوتی چلی گئی اور میں بالکل پُرسکون ہوگیا۔

سردی کا احساس مٹتے ہی میرے دماغ پر غنودگی سی طاری ہونے لگی اور کچھ ہی دیر بعد میں نیند کی وادی میں اتر گیا۔

میری آنکھ کھلی تو میں اکیلا ہی پیال پر لیٹا ہوا تھا۔ دونوں کمبل میرے اوپر پڑے ہوئے تھے۔ باہر دھوپ پھیلی ہوئی تھی اور دن کی روشنی غار کے اندر بھی پہنچ رہی تھی۔ میں نے لیٹے ہی لیٹے گردن گھما کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ چترا غار میں نہیں تھی۔

میں نے اپنے اوپر سے کمبل ہٹا کر ایک طرف پھینک

دیے اور غار سے باہر آگیا۔ چترا آس پاس کہیں بھی نہیں تھی۔ میں نے ایک دو مرتبہ چترا کا نام لے کر پکارا لیکن کہیں سے جواب نہیں ملا۔ میں چٹان کے اوپر سے گھوم کر اس طرف چلتا گیا جہاں رات کو آبشار دیکھا تھا۔

اور پھر ایک بہت بڑے چٹانی پتھر سے گھوم کر میں جیسے ہی دوسری طرف آیا، ٹھٹک کر رک گیا۔ مجھ سے چند گز کے فاصلے پر چترا پریتم آبشار کے نیچے کھڑی نہا رہی تھی۔ اس کے جسم کی ساری کالک دھل گئی تھی۔ وہ رات بھر میرے ساتھ لپٹی رہی تھی لیکن میرے ذہن میں ایک لمحے کو بھی لغو خیال نہیں آیا تھا مگر اس وقت چترا کو نہاتے دیکھ کر میرے دماغ میں سنسناہٹ سی ہونے لگی۔ میں وہاں سے ہٹ کر اس پتھر کے پیچھے چلا گیا اور ایک جگہ ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔

میرے لباس اور جسم پر بھی خون کے دھبے تھے اور یہ سوچ کر ہی گھن سی محسوس ہونے لگی کہ میرا جسم اور لباس ان غلیظ پجاریوں کے گندے خون سے آلودہ ہے۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد چھوٹے چھوٹے پتھروں کے لڑھکنے کی آواز سن کر میں سمجھ گیا کہ پریتم واپس آرہی ہے۔

"میں یہاں ہوں پریتم۔" میں نے اونچی آواز میں پکار کر اسے اپنی موجودگی سے آگاہ کیا۔

چند سیکنڈ بعد ہی چترا میرے سامنے آگئی۔ اس نے شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ بالوں سے پانی نچوڑ رہا تھا جس سے قمیص تر ہو رہی تھی۔ اسے یقیناً سردی لگ رہی تھی۔ وہ ہولے ہولے کانپ رہی تھی۔

ہم غار کے سامنے آگئے۔ چترا دھوپ میں ایک پتھر سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ میں نے کمبل لا کر اس کے اوپر ڈال دیا اور اپنے بیگ میں سے کپڑے نکال کر نہانے کے لیے چلا گیا۔

اور پھر ایک گھنٹے بعد میں بھی چترا کے پاس دھوپ میں بیٹھا ہوا تھا۔ وہ غار میں جا کر اپنے تھیلے میں سے پلاسٹک کی ایک تھیلی نکال لائی تھی جس میں ایک کلو کے لگ بھگ کالے بھنے ہوئے چنے بھرے ہوئے تھے۔ ان میں نقل دانے بھی تھے۔

"میں اپنی کٹیا میں ہمیشہ ایسی چیزیں رکھتی ہوں جو نہایت سنگین صورتِ حال میں کام آجاتی ہیں۔" وہ تھیلی کھولتے ہوئے بولی "کٹیا سے نکلنے سے پہلے میں نے ایسی چیزیں تھیلے میں ڈال لی تھیں جو اب ہمارے کام آئیں گی۔"

ہم چنے کھاتے ہوئے باتیں کرتے رہے۔ چترا پہلے بھی کئی مرتبہ یہاں آچکی تھی۔ یہ جگہ ہردوار شہر سے تقریباً دو میل کے فاصلے پر اور کافی بلندی پر تھی۔ اس طرف بہت کم لوگ عموماً آتے تھے۔ لوگ اس طرف جاتے تھے جہاں پہاڑیوں میں مندر بنے ہوئے تھے اور اس طرف کوئی مندر نہیں تھا۔

دن گزر گیا۔ شام کے سائے گہرے ہونے لگے۔ اس کے ساتھ ہی خنکی میں بھی بتدریج اضافہ ہوتا گیا۔ پورے دن میں شہر کا کوئی آدمی اس طرف نہیں آیا تھا جس سے ہمیں شہر کی صورتِ حال کا علم ہوتا۔

وہ رات بھی ہم نے تاریک غار کے اندر گزاری۔ میرے اندر چی کی پُراسرار قوت نے مجھے سردی سے بچالیا تھا۔ میں نے دونوں کمبل چترا کو دے دیے تھے تاہم دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے ساتھ ساتھ بیٹھے ہوئے میں نے بھی کمبل کا ایک حصہ ٹانگوں پر ڈال رکھا تھا۔

اگلے روز دوپہر تک ہم غار کے آس پاس ہی رہے اور پھر شہر جانے کا فیصلہ کرلیا۔ جس طرف سے ہم لوگ اس رات آئے تھے وہ بہت طویل فاصلہ تھا لیکن ایک اور راستہ بھی تھا جہاں سے شہر کا فاصلہ دو ڈھائی میل سے زیادہ نہیں تھا اور یہ راستہ بہت کٹھن اور دشوار تھا اور غالباً یہی وجہ تھی کہ لوگ اس طرف سے نہیں آتے تھے۔

اس راستے سے شہر تک پہنچنے میں ہمیں ڈیڑھ گھنٹے سے زیادہ نہیں لگا۔ شہر کے نواحی علاقے میں زیادہ تر گیسٹ ہاؤسز تھے۔ آبادی بہت چھدری تھی۔ کوئی مکان یا گیسٹ ہاؤس کسی پہاڑی کے دامن میں تھا اور کوئی پہاڑی پر واقع تھا۔

ہم لوگ جس سڑک پر چل رہے تھے اس کا نام تو مجھے معلوم نہیں تھا لیکن اگر اسے ٹھنڈی سڑک کا نام دیا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ دونوں طرف گھنی شاخوں والے درخت تھے جن کی شاخیں اوپر سے آپس میں ملی ہوئی تھیں۔

اس وقت دو بج رہے تھے اور ہم نے سوچا تھا کہ سب سے پہلے کسی ریسٹورنٹ میں بیٹھ کر کھانا کھائیں گے اور پھر کچھ معلومات حاصل کرنے کی کوشش کریں گے۔ میں نے چلتے چلتے چترا پریتم کی طرف دیکھا۔ اس نے شلوار قمیص پہن رکھی تھی البتہ دوپٹا نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ کنگھا نہ ہونے کی وجہ سے بال الجھے اور بکھرے ہوئے تھے۔ چہرے پر کسی قسم کا میک اپ بھی نہیں تھا۔ اس کے باوجود وہ بے حد حسین لگ رہی تھی۔ اس کا تعلق پنجاب کے اس سکھ گھرانے سے تھا جو برسوں پہلے سنگاپور میں جا کر آباد ہوگیا تھا۔ سنگاپور میں سیکڑوں سکھ خاندان آباد تھے۔ پاکستان اور ہندوستان سے تعلق رکھنے والے اور بھی ہزاروں خاندان سنگاپور کو اپنا وطن بنا چکے تھے لیکن جو چارم سکھ عورتوں میں تھا وہ کسی اور

قوم کی عورتوں میں نظر نہیں آتا تھا۔

میں نے جینز اور اوپن شرٹ پہن رکھی تھی جس کے اوپر کے دو بٹن کھلے ہوئے تھے۔

اِکا دُکا دکانیں شروع ہو چکی تھیں۔ ہم اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے آگے بڑھتے رہے اور بالآخر ایک مارواڑی ہندو کے ہوٹل کے سامنے رک گئے۔ ہوٹل کے سامنے پھلوں اور کچوری وغیرہ کے ٹھیلے بھی تھے۔ یہ جگہ خاصی بارونق تھی۔

"بھوک لگ رہی ہے۔" چترا نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا "اس ہوٹل میں بیٹھ کر کھانا کھالیتے ہیں پھر آگے چلیں گے۔"

بھوک مجھے بھی لگ رہی تھی۔ ہم اس ہوٹل میں داخل ہوگئے۔ خاصا لمبا چوڑا ہال تھا۔ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر بہت سی میزیں اور کرسیاں بچھی ہوئی تھیں۔ بڑی تعداد میں گاہک بھی موجود تھے۔ گاہکوں میں زیادہ تعداد ان لوگوں کی تھی جو ہندوستان کے مختلف شہروں سے گنگوتری یاترا کو آئے ہوئے تھے۔ ان میں بچے بھی تھے اور عورتیں بھی۔

میں اور چترا پریتم ہال کے آخر میں ایک میز پر بیٹھ گئے۔ میز پر پلاسٹک کا ایک میلا سا جگ اور دو گلاس رکھے ہوئے تھے۔ ہمارے بیٹھتے ہی میلے کچیلے لباس میں ملبوس ایک لڑکا آگیا اور کندھے پر پڑی ہوئی میلی سی صافی اتار کر میز صاف کرنے لگا اور پھر وہ اپنے ہوٹل میں تیار کھانوں کی تفصیل بتانے لگا۔ وہ ایک ہی سانس میں بولتا چلا گیا۔ بہت سی چیزوں کے نام تو میری سمجھ میں ہی نہیں آسکے۔

"دال چاول لے آؤ۔ ہم دونوں کے لیے۔" چترا نے کہا "لیکن پہلے یہ جگ اور گلاس دھو کر تازہ پانی لاؤ۔"

لڑکا جگ اور گلاس اٹھا کر چلا گیا۔ چند منٹ بعد اس نے ہمارے سامنے پانی سے بھرا ہوا جگ اور دونوں گلاس رکھ دیے اور پھر تھوڑی دیر بعد چاول کی دو پلیٹیں بھی ہمارے سامنے رکھ کر چلا گیا۔ چاولوں پر دال پڑی ہوئی تھی۔ ہم نے اپنی اپنی پلیٹ اپنی طرف سرکالی۔ کسی پلیٹ میں بھی چمچ نہیں تھا۔ مجھے بھی بہرحال ہاتھ سے چاول کھانے کا تجربہ ہوچکا تھا۔

ہم ابھی کھانا کھا ہی رہے تھے کہ ایک سادھو ہمارے قریب آکر کھڑا ہوگیا۔ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ٹخنوں تک لمبا گیروے رنگ کا چوغہ، گلے کے بٹن کھلے ہوئے جس کے سینے کے سیاہ بال جھانک رہے تھے۔ گلے میں رنگ برنگے موتیوں کی کئی مالائیں تھیں۔ دونوں ہاتھوں میں اسٹیل کے کڑے تھے۔ ماتھے پر قشقہ اور دونوں گالوں پر بھی سفید لکیریں کھنچی ہوئی تھیں۔ دونوں کانوں میں بڑے بڑے بالے تھے۔ سر کے لمبے بال اس طرح الجھے اور گتھے ہوئے تھے جیسے مٹی میں کسی قسم کا گم ملا کر لپائی کی گئی ہو۔ صاف لگ رہا تھا۔ برسوں سے پانی کو بالوں کے قریب نہیں آنے دیا گیا تھا۔ داڑھی اور مونچھوں کے بال اس طرح آپس میں ملے ہوئے تھے کہ منہ کا دہانہ تلاش کرنا مشکل تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں ترشول تھا اور دوسرے ہاتھ میں پیتل کی ایک چھوٹی سی بالٹی تھی۔ دائیں کندھے پر ایک میلا سا کپڑے کا تھیلا بھی لٹکا ہوا تھا جس میں نجانے کیا کچھ بھرا ہوا تھا۔ مجموعی طور پر وہ سادھو بہت ہی غلیظ تھا۔

اسے اپنے قریب دیکھ کر میرے ذہن میں اچانک ہی یہ خیال ابھرا کہ کہیں وہ پنڈت پرگیا راج کا آدمی تو نہیں۔ اس نے شاید ہمیں پہچان لیا ہو۔ چترا پریتم کے چہرے کا رنگ بھی ایک لمحے کو متغیر ہوگیا تھا لیکن اس نے فوراً ہی اپنی کیفیت پر قابو پالیا۔

وہ سادھو اگرچہ خاصا ہٹا کٹا تھا لیکن اس وقت اس کے چہرے پر یتیمی برس رہی تھی اور وہ جس انداز میں ہمارے قریب آکر کھڑا ہوا تھا اس سے مجھے اس کے بارے میں اپنی پہلی رائے بدلنی پڑی۔

"اوئے چھوکرے۔" کاؤنٹر پر بیٹھا ہوا مارواڑی سیٹھ

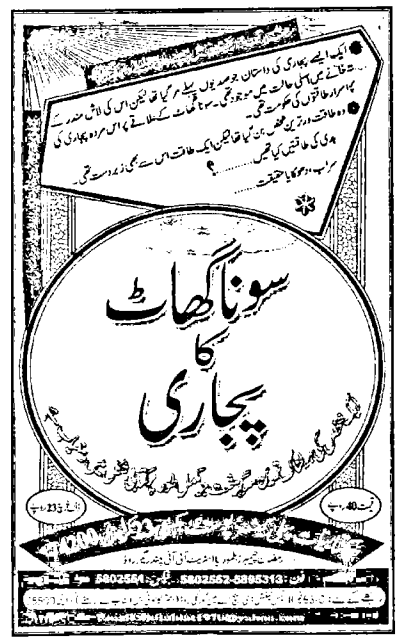

چیخا "اس سادھو کو باہر نکال۔ گراکوں (گاہکوں) کو پریشان کرتا ہے۔"

ویٹرلڑکا میزوں کے درمیان گھومتے ہوئے ہماری طرف آگیا اور قریب پہنچ کر سادھو کا بازو پکڑلیا۔ اسی لمحے میرے ذہن میں ایک اور خیال ابھرا۔

"ایک منٹ!" میں نے ہاتھ اٹھا کر لڑکے کو روک دیا اور سادھو کی طرف دیکھتے ہوئے بولا "بھوک لگ رہی ہے۔ بھوجن کرو گے؟"

سادھو نے اثبات میں سرہلا دیا۔

"اس کے لیے ایک پلیٹ دال چاول لاؤ۔" میں نے لڑکے سے کہا اور سادھو کو اشارہ کیا۔

وہ بڑی بے تکلفی سے کرسی پر بیٹھ گیا۔ ترشول میز کے ساتھ ٹکا کر کھڑا کردیا اور بالٹی کرسی کے قریب فرش پر رکھ دی۔ ایسے غلیظ آدمی کو تو دور سے دیکھ کر ہی کراہیت محسوس ہوتی تھی لیکن میں نے اسے اپنے ساتھ بٹھالیا تھا اور میری اس سادھو سے ہمدردی بلاوجہ نہیں تھی۔

ہم اپنا کھانا ختم کرچکے تھے۔ چند منٹ بعد ہی لڑکے نے سادھو کے سامنے چاولوں کی پلیٹ رکھ دی اور اس سادھو نے جس طرح چاول کھائے وہ میں یہاں بیان نہیں کرنا چاہتا۔ اس کے لیے دوسری اور تیسری پلیٹ بھی منگوائی گئی۔ چترا اس دوران میں منہ پھیرے بیٹھی رہی۔

کسی گندے اور غلیظ سادھو کو اس طرح اپنے پاس بٹھانا اور اس کی سیوا کرنا کوئی انوکھی اور غیر معمولی بات نہیں تھی۔ اس قسم کے سادھوؤں کو بہت قوتوں والا اور پہنچا ہوا سمجھا جاتا تھا اور لوگ ان کے پیچھے پیچھے پھرا کرتے تھے۔

کھانا ختم ہونے کے بعد سادھو نے چائے بھی پی اور پھر میں اسے لے کر ہوٹل سے باہر آگیا۔ میں اس سے جو بات کرنا چاہتا تھا اس کے لیے وہ جگہ مناسب نہیں تھی۔ ہم ہوٹل سے نکل کر سڑک پار کرکے ایک درخت کے نیچے بیٹھ گئے۔ سادھو زمین پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا تھا۔

"یہاں کہاں رہتے ہو۔ میرا مطلب ہے' کون سے مندر میں؟" میں نے پوچھا۔

"سادھوؤں کا کوئی پکا استھان نہیں ہوتا۔" اس نے بے ترتیب داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "ہم آج ہی بنارس سے آئے ہیں۔ کنگوتری کی یاترا کرکے واپس چلے جائیں گے۔ تم نے ہماری سیوا کی بالک۔ ہم بہت خوش ہوئے۔"

"آپ جیسے مہاپرشوں کی سیوا کرنا ہمارا دھرم ہے مہاراج۔" میں نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا "ہم آپ کی اور بھی سیوا کریں گے پر آپ کو بھی ہمارے لیے کچھ کرنا ہوگا۔"

سادھو نے گھور کر میری طرف دیکھا پھر بولا۔

"تمہاری اچھا اوش (خواہش یقیناً) پوری کریں گے۔ مانگ کیا مانگتا ہے بالک؟" اس نے خاموش ہو کر معنی خیز نگاہوں سے چترا کی طرف دیکھا پھر دھیمے لہجے میں بولا۔

"میں سمجھ گیا۔ بتانے کی ضرورت نہیں۔ گھر کا آنگن سونا ہے — اولاد مانگتے ہو؟"

میں نے پریتم کی طرف دیکھا۔ شرم یا غصے سے اس کا چہرہ سرخ ہوگیا۔

"نہیں مہاراج۔" میں نے اپنی مسکراہٹ پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "ایک اور معمولی سا کام ہے۔ وہ کردو تو ہم تمہاری بہت سیوا کریں گے۔" میں نے یہ کہتے ہوئے پانچ پانچ روپے والے دو سکے اس کے ہاتھ میں تھما دیے۔

"بول۔ کیا بولتا ہے؟" اس نے دونوں سکے پیتل کی بالٹی میں ڈال لیے۔

میں جواب دینے سے پہلے چند لمحے خاموشی سے چترا کی طرف دیکھتا رہا پھر سادھو کی طرف دیکھتے ہوئے مدھم لہجے میں بولا۔

"آپ میری بات کا برا مت مانئے مہاراج لیکن بات ایسی ہے کہ کہے بغیر بھی چارہ نہیں۔" میں چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا "چند روز پہلے ایک پنڈت مہاراج ہمارے گھر کی ایک کنیا (لڑکی) کو ورغلا کر لے گئے تھے۔ ہم اس کی تلاش میں یہاں آئے ہیں۔ ہمیں پتا چلا ہے کہ وہ پنڈت مہاراج ہماری کنیا کے ساتھ کنگوتری مندر میں چھپا ہوا ہے اور پرگھیا راج نامی ایک پنڈت کا مہمان ہے۔ ہم مندر میں ان کے ساتھ کوئی جھگڑا نہیں کرنا چاہتے۔ آپ ہمیں یہ پتا کرکے بتا دیں کہ وہ پنڈت مہاراج اور کنیا اب بھی مندر میں ہیں یا نہیں۔ بس مہاراج اتنی سی بات ہے۔"

"اتنی سی بات ہے۔ بہت بے وقوف ہو تم بالک۔" سادھو نے کہا "تین پلیٹ چاول' ایک کپ چائے اور دس روپوں میں اتنا بڑا کام کرانا چاہتا ہے۔ میں چند مہینوں بعد یہاں ضرور آتا ہوں اور پنڈت پرگھیا راج کو بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ بڑا حرامی آدمی ہے۔ اگر اسے مجھ پر شک بھی ہوگیا تو میری چمڑی اتروا دے گا۔ پر تو چنتا (فکر) نہ کر۔ تیرا کام اوش (ضرور) ہوگا۔ لا — سو کا پتا نکال۔" اس نے ہاتھ میرے سامنے پھیلا دیا۔

اس کی باتیں سن کر میں چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ وہ تو بڑا ہی کیمیا گر حرامی نہیں تھا۔ کام کی نوعیت کو فوراً ہی سمجھ گیا تھا اور یہ بھی غنیمت تھا کہ اس نے صرف سو روپے کا مطالبہ کیا تھا۔ ہزار دو ہزار بھی مانگ سکتا تھا۔ میں نے ایک بار پھر چترا کی طرف دیکھا اور جیب سے سو روپے کا نوٹ نکال کر سادھو کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

"ایک بات ہے سادھو مہاراج۔" میں نے کہا "پنڈت پرگھیا راج یا کسی اور کو۔۔۔"

"اشنان رہو مورکھ (بے وقوف)۔" اس نے میری بات کاٹ دی "اس حرامی کے تو باپ کو بھی پتا نہیں چلے گا۔ کام ہوجانے کے بعد پانچ سو روپے اور لوں گا۔ یہ سو روپے تو نے بیعانہ لیا ہے۔"

وہ واقعی بہت حرامی تھا۔ اپنا ریٹ بڑھا رہا تھا لیکن میں نے خاموشی سے سر ہلا دیا۔

"ہم شام کو چھ بجے اسی ہوٹل میں ملیں گے۔" میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ میں آجاؤں گا۔" وہ یہ کہتے ہوئے اٹھ گیا اور ہری رام۔ نارائن" کے نعرے لگاتا ہوا ایک طرف چل پڑا۔

"تم نے بہت بڑا رسک لیا ہے۔" چترا نے اس کے جانے کے بعد کہا "یہ پنڈت' سادھو اور پجاری ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔ اگر اس نے پنڈت پرگھیا راج کو ہمارے آنے کے بارے میں بتا دیا تو۔۔۔"

"وہ ایسا نہیں کرے گا۔ میں نے اس کی باتوں سے اندازہ لگایا ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "اس نے جو الفاظ استعمال کیے تھے ان سے تم نے بھی اندازہ لگالیا ہوگا کہ پنڈت پرگھیا راج سے اسے کتنی نفرت ہے۔ اس کی نفرت سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ یہ دربدر رہے۔ جبکہ پرگھیا راج ایک بڑے مندر میں بیٹھا ہوا ہے۔ اسے یہ بھی دکھ ہوگا کہ پنڈت مہاراج تو عیش کررہا ہے جبکہ وہ خود ٹھوکریں کھاتا پھر رہا ہے۔ اطمینان رکھو۔ وہ پرگھیا راج کو ہمارے بارے میں نہیں بتائے گا بلکہ ہوسکتا ہے کہ وہ آئندہ بھی ہمارے کام آئے۔ ہمیں ایسے آدمیوں کی ضرورت ہے۔"

"ٹھیک ہے لیکن ہمیں محتاط رہنا ہوگا۔" چترا نے سر ہلایا "میرا خیال تھا کہ ہم ایک دو گھنٹے میں واپس چلے جائیں گے لیکن اب چھ بجے تک یہاں رہنا پڑے گا۔"

"اس دوران میں ہم قریب و جوار کی دکانوں سے اپنی ضرورت کی چیزیں خرید لیں گے اور کسی جگہ بیٹھ کر وقت گزار دیں گے اور اس دوران میں ہم لوگوں سے پرسوں رات والے واقعے کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کرنے کی کوشش بھی کریں گے۔" میں نے کہا۔

ہم دونوں آہستہ آہستہ ایک طرف چلنے لگے۔ ابھی ہم نے زیادہ فاصلہ طے نہیں کیا تھا کہ سامنے سے آتے ہوئے کچھ لوگوں کو دیکھ کر میں ٹھٹک گیا۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا لیکن ان چہروں کو جھٹلایا نہیں جاسکتا تھا۔

وہ ٹھاکر بھانوت سنگھ اور اس کے ساتھ جانکی' روپ متی اور بملا تھیں۔ انہوں نے بھی ہمیں دیکھ لیا اور قریب آکر وہ جس طرح مجھ سے ملے وہ منظر چترا پریتم کے لیے خاصی حیرت اور پریشانی کا باعث بنا تھا۔

ان کی باتوں سے یہ انکشاف ہوا کہ وہ لوگ میری تلاش میں تین دن سے یہاں آئے ہوئے تھے اور آشرموں' ہوٹلوں اور گیسٹ ہاؤسز میں میرا حلیہ بتا کر مجھے تلاش کرتے پھر رہے تھے۔

ٹھاکر نے اس طرف۔۔۔ جس طرف سے ہم آئے تھے' پہاڑی کے دامن میں ایک کاٹیج کرائے پر لے لیا تھا۔ ویسے یہ ان کی خوش قسمتی تھی کہ انہیں یہاں آتے ہی کاٹیج مل گیا تھا جبکہ لوگ خوار ہوتے پھرتے تھے اور کھلے آسمان کے نیچے ٹھٹھر ٹھٹھر کر راتیں گزارنے پر مجبور تھے۔

وہ کاٹیج ماروڑی کے اس ہوٹل سے' جہاں ہم نے کھانا کھایا تھا تقریباً ایک میل کے فاصلے پر پہاڑی کے دامن میں تھا۔ ایک دوسرے سے خاصے فاصلے پر کچھ اور بھی کاٹیج تھے اور ایک ڈیڑھ گھنٹا پہلے پہاڑی سے اتر کر ہم اس طرف سے گزر کر آئے تھے۔

کاٹیج دو بڑے کمروں اور ایک رسوئی پر مشتمل تھا اور انہوں نے یہاں چائے وغیرہ بنانے کا انتظام بھی کر رکھا تھا۔ کاٹیج میں آنے کے تھوڑی دیر بعد روپ متی چائے بنانے کے لیے کچن میں چلی گئی۔ جانکی اور بملا میرے دائیں بائیں جس طرح چپک کر بیٹھی ہوئی تھیں اسے دیکھ کر چترا گویا الجھ کر رہ گئی تھی۔

روپ متی کو چائے لانے میں دیر نہیں لگی اور چائے کی چسکیوں کے دوران ہی میں' میں نے انہیں چترا پریتم کے بارے میں بھی بتا دیا اور انہیں اب تک کی صورتِ حال سے آگاہ کرنے لگا۔

"اگر دارا یہیں ہے تو اس مرتبہ اسے بچ کر نہیں جانا چاہیے۔" میرے خاموش ہونے پر ٹھاکر نے کہا۔

"وہ یہیں ہے اور گنگوتری مندر میں چھپا ہوا ہے۔ میں

نے ایک سادھو کو اس کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے بھیجا ہے۔ شام چھ بجے اس سادھو سے ملاقات ہوگی تو کچھ پتا چلے گا۔"

"رہنے کا کہاں بندوبست کیا ہے تم نے؟" ٹھاکر نے پوچھا۔ یہ سوال کرتے ہوئے اس نے کن انکھیوں سے چترا پریتم کی طرف بھی دیکھا تھا۔

"پرسوں رات تک تو میں چترا کے کانیج میں تھا لیکن دارا نے ہمیں ڈھونڈ نکالا تھا۔ اس رات اس کے دو آدمیوں نے کانیج پر حملہ کردیا اور۔۔۔" میں چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر اسے پرسوں رات کے بارے میں بتانے لگا اور آخر میں کہا "دو راتیں ہم نے پہاڑیوں پر ایک غار میں گزاری ہیں لیکن اب بہرحال، ہمیں ٹھکانا تو مل ہی گیا ہے۔" میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

"پرسوں رات۔" ٹھاکر میرے خاموش ہوتے پر بولا "کانیج کو آگ لگنے کے بعد شہر کے بہت سے لوگ اس طرف بھاگ کھڑے ہوئے تھے۔ ہم اس وقت مین بازار کے ایک ہوٹل میں بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ آگ پر قابو نہیں پایا جاسکا تھا۔ کانیج مکمل طور پر جل کر راکھ ہوگیا تھا۔ اگلے روز پتا چلا کہ ملبے سے دو جلی ہوئی لاشیں ملی تھیں لیکن پولیس ان کے بارے میں کچھ معلوم نہیں کرسکی تھی۔ البتہ کسی پنڈی اور اس کے کسی پریمی کا نام لیا جارہا ہے۔"

میں نے مسکرا کر چترا پریتم کی طرف دیکھا اور پھر جانکی کی طرف دیکھنے لگا اس کی بھویں تن گئی تھیں۔

"چترا پریتم میرے ایک پرمی چاچا خشونت سنگھ کی بیٹی ہے۔ یہ سنگاپور سے یہاں آئی تھی اور۔۔۔"

"بس۔" جانکی نے مجھے ٹوک دیا "اب میں جان گئی کہ یہ کون ہے۔" جانکی نے یہ جملہ بات کو ختم کرنے کے لیے ادا کیا تھا۔

اور پھر موضوع بدل گیا۔ ٹھاکر کی باتوں سے یہ تو پتا چل گیا کہ اس رات ہمارے کانیج کے جل جانے کے بعد اگلے روز ملبے میں سے دو جلی ہوئی لاشیں ملی تھیں اور میرا اور چترا کا نام لیا جارہا تھا لیکن یہ اندازہ نہیں ہوا تھا کہ پولیس نے ہمارے بارے میں کیا رائے قائم کی تھی۔ آیا پولیس کی نظروں میں ہم دونوں جل کر راکھ ہوگئے تھے یا ہمیں آتش زنی اور قتل کا ملزم ٹھہرایا جارہا تھا۔ یہ معلوم کرنے کے لیے مجھے شہر میں ایسے لوگوں سے رابطہ کرنا تھا جو اس سلسلے میں کچھ زیادہ جانکاری رکھتے ہوں اور اس بات کا بھی اندیشہ تھا کہ پولیس ہمیں تلاش کررہی ہو۔ میں اور چترا رسک لے کر پہاڑوں سے اتر آئے تھے اور خوش قسمتی سے ہم گرفتار نہیں کیا گیا تھا۔ چترا کو اب فی الحال باہر جانے کی ضرورت نہیں تھی لیکن مجھے یہ رسک لینا ہی تھا۔

ٹھیک چھ بجے میں اور ٹھاکر کانیج سے نکل کر شہر کی طرف روانہ ہوگئے۔ چند منٹ سے زیادہ کا فاصلہ نہیں تھا۔ ہم کانیج کے قریب پہنچ کر میں اور ٹھاکر الگ الگ ہوگئے۔ اس طرح اگرچہ مجھے کوئی شبہ نہیں تھا لیکن ایسے لوگوں پر کبھی بھی نہیں کیا جاسکتا۔ حالات کا تقاضا یہی تھا کہ احتیاط ہاتھ سے نہ چھوٹ جائے۔

ٹھاکر ہوٹل کے سامنے سڑک کی دوسری طرف اور میں اِدھر اُدھر دیکھتا ہوا ہوٹل میں داخل ہوگیا۔ وقت یہاں زیادہ رونق تھی۔ ہوٹل کے اندر بھی کوئی نہیں تھی۔ فلمی گانوں کے شور میں کان پڑی آواز سنائی دے رہی تھی۔

میں ہوٹل میں داخل ہوکر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ وہ اسی میز پر بیٹھا ہوا تھا جہاں دوپہر کو ہم نے کھانا کھایا تھا۔ میز پر دو آدمی اور تھے۔ چوتھی کرسی خالی تھی۔ سامنے چاولوں کی پلیٹ رکھی ہوئی تھی اور وہ بڑی بے تکلفی سے چاول کھا رہا تھا۔ میں اس کے قریب جانے کے بجائے اور میز پر بیٹھ گیا۔ ویٹر لڑکے نے پوچھے بغیر میرے سامنے چائے کا کپ لاکر رکھ دیا۔

چائے بہت بدمزہ تھی لیکن مجھے پینی پڑی۔ میں دوران میں بار بار اس سادھو کی طرف بھی دیکھ رہا تھا۔ وہ ختم کرنے کے بعد سادھو نے جگ اٹھا کر منہ سے لگایا۔ سنے ہوئے ہاتھ اپنے کرتے کے دامن سے پونچھتے ہوئے اُدھر دیکھنے لگا۔ دوپہر کو بھی اس نے یہی حرکت کی تھی۔

میں اپنی جگہ سے اٹھ گیا تاکہ سادھو مجھے دیکھ لے۔ اندازہ درست نکلا۔ سادھو مجھے دیکھتے ہی ایک جھٹکے سے کھڑا ہوگیا۔ میں اس دوران میں کاؤنٹر پر پیسے پھینک کر باہر نکلنے کے لیے مڑا۔ سادھو عقل مند آدمی تھا۔ میں نے پیسے نکالنے کے لیے جیب میں ہاتھ ڈالا تو وہ بھی میرے قریب پہنچ گیا۔

"ہم نے بھوجن (کھانا، کھانا) کیا ہے۔ یہاں پیسے دے دو بالک۔ رام بھلی کرے گا۔" اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اس کا لہجہ بھیک مانگنے والا تھا۔

میں نے پہلے تو گھور کر اس کی طرف دیکھا پھر اس نے پیسے بھی دے دیے اور ہوٹل سے باہر آگیا۔ سادھو مجھ سے پہلے ہی باہر آچکا تھا۔ وہ "ہری اوم ہری اوم" کرتا ہوا ایک طرف جارہا تھا۔ میں بھی اس کے پیچھے چلنا رہا۔

گزور جاکر سادھو رک گیا۔

"پانچ سو روپے نکال بالک۔" اس نے میرے سامنے ہتھیلا دیا "تمہارے کارن (وجہ سے) ہمیں بڑا کشٹ اٹھانا پڑا ہے۔"

میں نے کچھ کہے بغیر جیب سے پانچ سو روپے نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھ دیے۔ اس دوران میں ٹھاکر بھی ہمارے قریب پہنچ چکا تھا۔ سادھو اسے دیکھ کر کچھ جھجکا۔

"اس کی چنتا مت کرو۔ یہ اپنا ہی بندہ ہے۔" میں نے کہا "اب تم وقت ضائع کرنے کے بجائے بولنا شروع کردو۔ تمہاری مشکل ابھی انت (ختم) نہیں ہوئی بالک۔"

سادھو نے کہا۔

"کیا مطلب؟" میں نے اسے گھورا۔

"دوپہر کو میں یہاں سے سیدھا گنگوتری مندر گیا تھا۔" سادھو کہہ رہا تھا "میں نے مندر کے تمام پنڈتوں اور پجاریوں سے پوچھ لیا۔ تمہارے لیے جانکاری یہ ہے کہ پنڈت پرکھیا اپنے ستر (دوست) کے ساتھ کل صبح سویرے ہی گنگوتری مندر سے چلا گیا تھا۔ ان کے ساتھ ایک چھوکری بھی تھی۔"

"اوہ۔ کہاں گئے ہیں وہ لوگ؟" میں نے پوچھا۔

"یہ جانکاری نہیں ملی بالک۔" سادھو نے جواب دیا "پر پنڈت جانتا ہے کہ وہ لوگ بڑی عجلت میں وہاں سے گئے تھے۔"

"ٹھیک ہے سادھو مہاراج۔ اب تم جاسکتے ہو۔" میں نے کہا۔

"کوئی اور سیوا بالک۔" سادھو نے پوچھا۔

"نہیں مہاراج۔ دھنے باد (شکریہ)۔" میں نے اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔

سادھو "ہری اوم ہری اوم۔۔۔ نارائن نارائن کی دھن" کرتے ہوئے واپس چلا گیا۔ میں نے اس سے مزید کچھ معلوم کرنے کا ارادہ ترک کردیا تھا۔ وہ جس طرح شروع ہی میں ٹرخا گیا تھا آگے چل کر ہمارے لیے خطرناک ثابت ہوسکتا تھا۔ میں نے اسے چھ سو روپے دیے تھے اور میری یہ سرمایہ کاری بیکار گئی تھی۔ کم از کم یہ پتا تو چل گیا تھا کہ دارا مہاراج گنگوتری سے چلے گئے تھے۔ وہ کہاں گئے تھے؟ یہ ابھی پتا نہیں چلا تھا۔

ٹھاکر واپس آگیا۔

میں نے اس سادھو کو بھی بھگا دیا۔ اس کے ذریعے یہ معلوم کیا جاسکتا تھا کہ وہ لوگ کہاں گئے ہیں۔" ٹھاکر نے کہا۔

"یہ سادھو قابلِ اعتبار نہیں ہے۔" میں نے جواب دیا "ان کے بارے میں معلوم کرنے کے لیے ہمیں کوئی اور طریقہ اختیار کرنا پڑے گا اور ہاں۔۔۔ یاد آگیا۔" میں ایک دم اچھل پڑا۔

"کیا ہوا؟ کیا یاد آگیا۔" ٹھاکر نے الجھی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھا۔

"سوامی پرمانند۔" میں نے کہا اور پھر اسے سوامی پرمانند کے بارے میں بتانے لگا۔

"تو پھر ٹھیک ہے۔" ٹھاکر ایک دم اٹھ کر کھڑا ہوگیا "ابھی چلو۔ اس کام میں ہمیں دیر نہیں کرنی چاہیے۔"

جانکی وغیرہ کو کچھ ہدایات دینے کے بعد میں اور ٹھاکر کانیج سے نکل کر شہر کی طرف روانہ ہوگئے۔ مین بازار تک پہنچنے میں ہمیں آدھے گھنٹے سے زیادہ نہیں لگا۔ اس وقت رات کے نو بجنے والے تھے اور بازار میں خاصی رونق تھی۔ آشرم والی گلی تلاش کرنے میں مجھے زیادہ دشواری پیش نہیں آئی تھی۔

مجھے یہ بھی اندیشہ تھا کہ کہیں سوامی پرمانند بھی ان لوگوں کے ساتھ غائب نہ ہوگیا ہو لیکن یہ جان کر اطمینان ہوا کہ وہ تقریباً ایک گھنٹا پہلے آشرم سے باہر گیا ہے اور اس کی واپسی میں ایک گھنٹا بھی لگ سکتا ہے اور دو گھنٹے بھی لیکن ہمیں زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد ہی وہ ایک طرف سے آتے ہوئے دکھائی دیا۔ میں نے اشارے سے ٹھاکر کو بتا دیا۔ سوامی پرمانند اکیلا ہی تھا اور تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے آرہا تھا۔ ٹھاکر نے آگے بڑھ کر اسے آشرم میں داخل ہونے سے پہلے ہی روک لیا۔ میں سامنے آنے کے بجائے دور ہی کھڑا رہا تھا۔

ٹھاکر چند منٹ سوامی سے باتیں کرتا رہا پھر وہ آشرم کے سامنے سے ہوتے ہوئے اس گلی میں آگے چلنے لگے۔ میں کچھ فاصلہ دے کر ان کے پیچھے چلتا رہا۔

وہ دونوں اگلی گلی میں مڑ کر رک گئے۔ اس طرف دکانیں وغیرہ نہیں تھیں۔ رہائشی مکان تھے اور لوگوں کی آمد و رفت بھی بہت کم تھی۔ میں جیسے ہی ان کے قریب پہنچا، سوامی پرمانند میری صورت دیکھ کر اچھل پڑا۔

"تت۔۔۔ تم۔۔۔!"

"کیوں۔ مجھے دیکھ کر کرنٹ لگ رہا ہے کیا؟" میں نے کہا۔ مجھے دیکھ کر وہ جس طرح بدحواس ہوا تھا اس سے مجھے اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی تھی کہ وہ مجھے جانتا تھا۔ میں کئی روز سے چترا پریتم کے ساتھ رہ رہا تھا اور پھر

سوبھراج نے بھی مرنے سے پہلے ان لوگوں کو میرے بارے میں بتا دیا تھا۔ وہ لوگ غالباً میری نگرانی بھی کرتے رہے تھے۔ اس طرح میرا چہرہ ان کے لیے اجنبی نہیں تھا۔

"تت... تم مجھے دھوکے سے کہیں لے جا رہے تھے۔" سوامی' ٹھاکر کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ اس کے چہرے پر خوف نمایاں تھا "مم... میں واپس جا رہا ہوں۔ اگر تم لوگوں نے مجھے روکنے کی کوشش کی تو میں شور مچا دوں گا۔"

"میرا یہ کھلونا تم سے زیادہ شور مچا سکتا ہے۔" ٹھاکر نے پستول نکال لیا "خاموشی سے ہمارے ساتھ چلتے رہو۔ اگر کوئی گڑبڑ کرنے کی کوشش کی تو کھوپڑی میں سوراخ کر دوں گا۔"

"میں نہیں جانتا' تم لوگ کون ہو اور کیا چاہتے ہو۔" سوامی ہکلایا "میں تم لوگوں کو جانتا بھی نہیں۔ مجھ سے تمہاری کیا دشمنی ہو سکتی ہے؟"

"تمہارے لیے یہی جان لینا کافی ہے کہ ہم تمہیں جانتے ہیں اور بہت اچھی طرح جانتے ہیں۔" میں نے کہا اور پھر ٹھاکر کی طرف متوجہ ہو گیا "تم اسے لے کر چلو ٹھاکر۔ میں دوسری طرف سے ہو کر آتا ہوں۔ اگر یہ راستے میں کوئی گڑبڑ کرے تو اڑا دینا اس کی کھوپڑی۔"

"چلو سوامی جی۔" ٹھاکر نے اسے اشارہ کیا۔

وہ دونوں گلی میں آگے کی طرف چلنے لگے اور میں واپس آ گیا۔ مین بازار میں آ کر میں نے کھانے پینے کی کچھ چیزیں خریدیں اور تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے چلنے لگا۔ ہمیں شاید دوبارہ بازار کی طرف آنے کا موقع نہ ملتا اس لیے میں نے یہ چیزیں خرید لی تھیں کہ رات کو فاقہ نہ کرنا پڑے۔

ٹھاکر اور سوامی پرماند مجھ سے پہلے ہی کانیج میں پہنچ چکے تھے۔ سوامی' چترا پریتم کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اب وہ سمجھ چکا تھا کہ وہ کسی مشکل میں پھنس گیا ہے۔

میں نے شاپنگ بیگ جانکی کے حوالے کر دیے اور ہم سوامی کو لے کر کانیج سے باہر آ گئے۔ سوامی کے ساتھ جو کچھ ہونے والا تھا اس کے لیے کانیج جیسی جگہ مناسب نہیں تھی۔ قرب و جوار میں اور بھی کانیج تھے۔ شور سن کر کوئی اس طرف آ سکتا تھا۔

ہم کانیج کی پچھلی طرف سے ہو کر پہاڑیوں کی طرف چلنے لگے۔ ٹھاکر نے سوامی کو پستول کی زد پر لے رکھا تھا۔ وہ اندھیرے میں ٹھوکریں کھاتا ہوا چل رہا تھا۔ شاید خوف کی وجہ سے بھی اسے کچھ کم دکھائی دے رہا تھا۔ وہ پیر رکھتا کہیں تھا اور پڑتا کہیں تھا۔

تقریباً ایک میل دور نکل آنے کے بعد ہم ایک جگہ رک گئے۔ یہ ایک مسطح چٹان تھی۔ اس کے اطراف گہرے کھڈ تھے اور ان سے آگے بلند پہاڑیاں تھیں۔ پرماند سے پوچھ گچھ کے لیے یہ بہترین جگہ تھی۔ یہاں چیخنے کی آواز پہاڑیوں میں تو گونج سکتی تھی لیکن کسی کے کان تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔

"تم لوگ کون ہو اور مجھے یہاں کیوں لے کر آئے ہو۔" اس نے ہماری طرف دیکھتے ہوئے خوف زدہ لہجے میں پوچھا۔

"تم سے کچھ جانکاری چاہیے سوامی جی۔" میں نے کہا "اگر تم ہماری باتوں کا ٹھیک ٹھیک جواب دو گے تو ہم تمہیں کچھ نہیں کہیں گے اور اگر تم نے اڑی کی تو تمہاری لاش کے ٹکڑے کر کے یہاں پھینک دیں گے۔ بھیڑیے رات کو دعوت اڑاتے رہیں گے۔"

"کیا پوچھنا چاہتے ہو؟" سوامی نے پوچھا۔

"مجھے اور شریمتی چترا کو دیکھ کر تو تم سمجھ گئے ہو گے کہ ہم کون ہیں۔ تمہارے گرو نے چترا پریتم کی بیٹی اور شوہر کو موت کے گھاٹ اتار دیا لیکن پولیس اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکی۔ چند روز پہلے میرے ایک دوست کو قتل کر کے اس کی ادھ جلی ہوئی لاش سڑک پر پھینک دی۔ دو دن پہلے چترا کو بھی مارنے کی کوشش کی گئی لیکن ہمیں مارنے کے لیے جو دو شیطان بھیجے گئے تھے وہ جل کر بھسم ہو گئے۔ تمہارا گرو گنگوتری مندر سے کہیں اور چلا گیا ہے۔ ہم صرف یہ جاننا چاہتے ہیں کہ وہ کہاں ہے؟"

"میں کسی ایسے شخص کو نہیں جانتا۔ پتا نہیں تم کس کی بات کر رہے ہو۔" سوامی پرماند نے کہا۔

میں نے ایک لمحے کے توقف کے بغیر اس کے منہ پر زناٹے دار گھونسا جڑ دیا۔ وہ چیختے ہوئے لڑکھڑا کر پیچھے ہٹ گیا۔ ٹھاکر کا سامنے کا ایک دانت اکھڑ گیا۔ ہونٹوں سے خون کی دھار نکلی تھی۔

"کچھ یاد آیا یا نہیں۔"

"میں نہیں جانتا کون سا گرو۔" اس نے کراہتے ہوئے میری بات کاٹ دی۔

میں نے پے در پے دو تین گھونسے اور جڑ دیے۔ وہ لڑکھڑا کر زمین پر گرا تو میں نے ایک دو ٹھوکریں بھی مار دیں۔

"میں پنڈت پرگھیا راج کے بارے میں پوچھ رہا ہوں۔" میں نے اسے ایک اور ٹھوکر مارتے ہوئے کہا "اس کے ساتھ ایک اور جرامی بھی آیا ہوا ہے اور مجھے یقین ہے تم اسے جانتے ہو۔ بتاؤ وہ لوگ کہاں ہیں؟"

"وہ... وہ لوگ گنگوتری مندر میں ہیں لیکن میرا ان سے کوئی تعلق نہیں ہے۔" سوامی نے کراہتے ہوئے جواب دیا۔

"تم انہیں نہیں جانتے!" میں نے ایک اور ٹھوکر مار دی "پورے دن بھر ہمارے کانیج کی نگرانی کیوں کرتے رہے۔ شام کو کانیج کی کھڑکی سے جھانک کر کیا دیکھنا چاہتے تھے۔ بتاؤ؟"

"وہ... وہ دراصل..."

"نہیں سوامی جی۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی "میں نہ تو کبھی بے خبر رہا ہوں نہ غافل۔ اگر دوسروں کی طرح احمق ہوتا تو کب کا مارا جا چکا ہوتا۔ اس رات گبرو اور بھیرو کو بھیجا گیا تھا ہمیں ٹھکانے لگانے کے لیے لیکن وہ دونوں خود ہی جال میں پھنس گئے۔ ان کی موت ہی انہیں کھینچ کر وہاں لے گئی تھی۔ اور تم ان لوگوں سے الگ نہیں ہو۔ تم سب کچھ جانتے ہو۔ تمہیں بتانا ہو گا کہ وہ لوگ کہاں گئے ہیں؟"

"ہاں میں جانتا ہوں۔" سوامی پرماند اچانک ہی تن کر کھڑا ہو گیا "لیکن میں تمہیں کچھ نہیں بتاؤں گا۔ تم میرے گرو کے بارے میں ایک لفظ بھی مجھ سے نہیں پوچھ سکو گے۔"

"گڈ۔" میں نے کہا "مجھے ایسے لوگ اچھے لگتے ہیں جو صورت حال کو فیس کرنا جانتے ہوں۔ اب تم سے بات کرنے میں مزہ آئے گا۔ کہاں گئے ہیں وہ لوگ؟"

"میں نہیں جانتا۔" سوامی نے جواب دیا۔

میں نے ایک دم آگے بڑھ کر اسے زوردار گھونسا لگا دیا۔ یہ گھونسا اس کی ٹھوڑی پر لگا۔ وہ لڑکھڑا کر پیچھے ہٹا تو ٹھاکر نے اسے سنبھال لیا اور کندھے پر ہاتھ رکھ کر گھماتے ہوئے دائیں ہاتھ سے اس کے پیٹ پر گھونسا مارا۔ وہ دوہرا ہوا تو ٹھاکر نے گھٹنے سے اس کی ٹھوڑی پر ضرب لگائی۔ وہ چیختے ہوئے سیدھا ہو گیا اور ابھی سنبھل نہیں پایا تھا کہ ٹھاکر نے اس کے سینے پر گھونسا مار دیا۔ وہ الٹے قدموں لڑکھڑاتے ہوئے میری طرف آیا تو میں نے اسے سنبھال لیا۔

اور پھر تقریباً دس منٹ تک وہ میرے اور ٹھاکر کے بیچ فٹ بال بنا رہا۔ میری طرف آتا تو میں اسے کک رسید کر دیتا۔ ٹھاکر کی طرف جاتا تو وہ اسے ٹھوکر یا گھونسا لگا کر میری طرف اچھال دیتا۔

آخری مرتبہ ٹھاکر کا گھونسا کھا کر وہ لڑکھڑاتے ہوئے پشت کے بل گرا تو میں ہوا میں اچھلا اور پیروں کے بل اس کے سینے پر گرا۔ اس کی چیخ بڑی خوفناک تھی لیکن مجھے اس پر ذرا بھی رحم نہیں آیا۔ ایسے لوگوں پر مجھے ذرا بھی ترس نہیں آتا جو دوسروں کی زندگیوں سے کھلونوں کی طرح کھیلتے تھے۔ جنہوں نے شعلہ گنی کو موت کے گھاٹ اتار کر موچھوں پر اس طرح تاؤ دیتے تھے جیسے بہت بڑا کارنامہ انجام دیا ہو۔

میں ایک بار پھر اچھلا۔ اس مرتبہ میرا ایک پیر اس کے سینے پر اور دوسرا اس کے کندھے پر پڑا تھا۔ پسلیاں اس کی چیخوں سے گونج رہی تھیں لیکن ہمیں کوئی خطرہ نہیں تھا۔ اوّل تو اس کی چیخیں کسی کے کانوں تک نہیں پہنچی ہوں گی اور اگر بہت دور کسی نے سنا بھی ہو تو رات کے وقت پہاڑیوں کی طرف آنے کی ہمت کوئی نہیں کر سکتا تھا۔

وہ زمین پر پڑا تڑپ رہا تھا۔ میں نے اس کا ایک بازو پکڑ کر پیر اس کے کندھے پر رکھ دیا اور بازو کو زوردار جھٹکا دیا۔ "کڑک" کی آواز سے اس کے کندھے کا جوڑ اکھڑ گیا۔ اس کی چیخ پہاڑیوں میں بازگشت پیدا کرنے لگی۔

"تم بہت سخت جان ہو۔" میں نے اس کا دوسرا بازو پکڑ کر کندھے پر پیر رکھتے ہوئے کہا "لیکن میں تمہارے جسم کا جوڑ جوڑ الگ کر دوں گا اور اس وقت تک تمہیں نہیں چھوڑوں گا جب تک زبان نہیں کھولو گے۔"

زوردار جھٹکے سے میں نے اس کا دوسرا کندھا بھی اکھاڑ دیا۔ پسلیاں ایک بار پھر اس کی چیخوں سے گونج اٹھیں۔ میں اسے چھوڑ کر الگ ہٹ گیا اور وہ پانی سے نکالی ہوئی مچھلی کی طرح زمین پر لوٹنے لگا۔ وہ واقعی بہت سخت جان تھا۔ کوئی اور ہوتا تو نوبت یہاں تک پہنچنے سے پہلے ہی یا تو زبان کھول دیتا یا ختم ہو چکا ہوتا۔ میں نے اس کا پیر پکڑ کر اوپر اٹھا دیا اور جانگھ پر پیر رکھ کر اس کی ٹانگ کو اٹھاتا چلا گیا۔

"رر... رک جاؤ۔ ایشور کے لیے رک جاؤ۔" وہ ایک ہاتھ اٹھانے کی کوشش کرتے ہوئے چیخا "بب... بتاتا ہوں۔ رک جاؤ..."

میں نے اس کی ٹانگ ایک ہلکے سے جھٹکے سے چھوڑ دی۔ اس کے لیے یہ جھٹکا بھی کافی تھا۔ وہ ایک بار پھر چیخ اٹھا۔

"جلدی بتاؤ۔ ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ بڑے زور کی بھوک لگ رہی ہے مجھے۔" میں نے اس کے سینے پر پیر رکھتے ہوئے کہا۔

"وہ... وہ لوگ سنگری مندر گئے ہیں۔" وہ رک رک کر بولا "یہ درست ہے کہ پرسوں رات پنڈت پرگھیا راج اور اس کے مترپنڈت سنگھ نے گبرو اور بھیرو کو تمہیں اور اس لگی عورت چترا کو ٹھکانے لگانے کے لیے بھیجا تھا۔ پنڈت پرگھیا راج کو اس ناری سے خطرہ تھا۔ اس کی بیٹی اور پتی (شوہر) کے قتل کے الزام میں پولیس اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکی تھی لیکن وہ جانتا تھا کہ جب تک وہ عورت زندہ رہے گی'

خطرے کی تلوار اس کی گردن پر لٹکی رہے گی۔ دوسری طرف پنڈت سنگھ کو تم سے خطرہ تھا۔ وہ تم سے چھٹکارا پھر رہا ہے اور اس کا خیال تھا کہ وہ یہاں تم سے محفوظ رہے گا لیکن تم یہاں بھی پہنچ گئے۔ مندر میں سوبھراج نام کا ایک آدمی اس کے ہاتھ لگ گیا جس نے مار کھا کر تمہارے بارے میں سب کچھ بتا دیا اور انہوں نے سوبھراج کو قتل کر کے لاش سڑک پر پھکوا دی۔

"ایک طرف وہ دونوں شیطان اس مندر میں جمع ہو گئے تھے اور دوسری طرف ان دونوں کے بدترین دشمن بھی آپس میں مل گئے تھے۔ وہ تم دونوں سے نجات حاصل کرنا چاہتے تھے اور بھیرو اور گبرو کو اس لیے بھیجا گیا تھا کہ تم دونوں کو ختم کر دیا جائے لیکن۔۔۔" وہ خاموش ہو کر گہرے گہرے سانس لینے لگا۔ میں اس کے بولنے کا منتظر رہا۔ تقریباً دو منٹ بعد وہ بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا۔

"وہ بھیرو اور گبرو کی واپسی کے منتظر تھے۔ اوم نام کا ایک تیسرا آدمی بھی دور رہ کر ان کی نگرانی کر رہا تھا تاکہ اگر ضرورت پڑے تو ان کی مدد کر سکے۔ اوم کو اس عورت کی چیخوں کی آوازیں سنائی دیتی رہیں اور وہ یہی سمجھتا رہا کہ بھیرو اور گبرو تم دونوں پر حاوی ہو رہے ہیں لیکن جب کانچ میں آگ لگی تو اس نے تم دونوں کو پیچھے پہاڑیوں کی طرف بھاگتے ہوئے دیکھا۔ اوم دوڑتا ہوا کانچ کے قریب پہنچ گیا۔ اس نے دھکا دے کر دروازہ کھول دیا۔ اس وقت تک کانچ کے اندر آگ پھیلتی جا رہی تھی۔ اس نے بھیرو اور گبرو کی لاشوں کو جلتے ہوئے دیکھا تو وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔

"پنڈت پرگھیا راج اور پنڈت سنگھ کو جب اوم سے صورت حال کا پتا چلا تو وہ دونوں بری طرح بدحواس ہو گئے۔ پنڈت سنگھ نے پرگھیا راج کو بتایا کہ تم انسان نہیں شیطان ہو اور ہر مرتبہ اس کے حملوں سے بچتے رہے ہو اور اب تم ان لوگوں کو نہیں چھوڑو گے۔"

"وہ لوگ تم سے اس قدر خوف زدہ تھے کہ صبح ہونے سے پہلے ہی گنگوتری سے نکل گئے۔ صرف دو آدمی جانتے ہیں کہ وہ سنکری مندر گئے ہیں۔ ایک میں اور دوسرا گنگوتری مندر کا پروہت پنڈت رام دیال۔"

"سنکری مندر کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"یہاں سے تقریباً دس کلو میٹر دور اونچے پہاڑوں میں۔ اس سے آگے ہمالیہ کا برفانی سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔" سوامی پرمانند نے جواب دیا۔

"ان کے ساتھ اور کون ہے اور مندر میں کتنے لوگ ہیں جو ان کا ساتھ دے سکتے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"یہاں سے صرف ایک چھوکری ان کے ساتھ گئی ہے۔ اسے پنڈت سنگھ ہی اپنے ساتھ لایا تھا۔" سوامی پرمانند نے جواب دیا "سنکری مندر ایک بہت پرانا مندر ہے۔ وہاں صرف دو پجاری رہتے ہیں۔ راستہ بہت کٹھن اور دشوار ہے اس لیے بہت کم یاتری اس طرف جاتے ہیں۔ ان کے مہینے میں بھی یاترا کی لگن نہیں ہوتی۔ کبھی کبھار دو چار نوجوان یاتری محض مہم جوئی کے شوق میں اس طرف چلے جاتے ہیں۔"

"پنڈت سنگھ کو جانتے ہو وہ کون ہے؟" میں نے پوچھا۔

"صرف اتنا جانتا ہوں کہ وہ پنڈت پرگھیا راج کا مہمان ہے۔ ان دونوں کی ملاقات راجستھان کے کسی مندر میں ہوئی تھی۔ یہاں آ کر اس نے پرگھیا راج کو بتایا تھا کہ راجستھان کی پہاڑیوں میں واقع کالی کے مندر میں کوئی درگھٹنا (واردات) ہو گئی تھی اور تم نے اس کی ٹانگ توڑنے کی کوشش کی تھی اور اس نے بے ہوش ہو جانے کا ناٹک کر کے اپنے آپ کو بچایا تھا۔"

"اس کے بارے میں اور کیا جانتے ہو؟" میں نے ایک اور سوال کیا۔

"کچھ نہیں۔" سوامی نے جواب دیا۔

"تمہیں یہ جان کر حیرت ہو گی کہ پنڈت سنگھ ہندو نہیں ہے۔ وہ نہ تو پنڈت ہے اور نہ ہی یہ اس کا اصل نام ہے۔ وہ مسلمان ہے اور۔۔۔"

"کیا۔۔۔؟" سوامی پرمانند چیخا "ایک مسلا ہمارے دھرم کا شٹ (برباد) کر رہا ہے۔"

"تم کون سا دھرم کی سیوا کر رہے ہو۔" میں نے کہا۔

"پنڈت پرگھیا راج اور تم جیسے لاتعداد دھرم چاری ایسے ہیں جو دھرم کو بدنام کر رہے ہیں۔ تم لوگوں کا اصل دھرم تو دھن شراب اور عورت ہے۔ تم ہی لوگوں نے مندر جیسی پوتر (پاک) جگہوں کو عیاشی کے اڈے بنا رکھا ہے۔ ایک بے دین مسلا اگر تم جیسے بے دھرم پنڈتوں کے ساتھ مل گیا ہے تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ بہرحال، میں اس معاملے پر تم سے بحث نہیں کروں گا۔ تم نے ہمیں جو جانکاری دی ہے اس کے لیے بہت بہت شکریہ۔ اب تم بھی نرک (دوزخ) کے لیے روانہ ہونے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ یہاں سے تمہاری مکتی (نجات) ہونے والی ہے۔"

"کک۔۔۔ کیا مطلب۔۔۔؟" وہ چیخا "کیا تم مجھے مار دو گے؟"

"تمہیں زندہ چھوڑ کر ہم اپنی زندگیاں خطرے میں نہیں ڈال سکتے۔" میں نے کہا۔

"ایشور کے لیے مجھے چھوڑ دو۔" وہ ایک بار پھر چیخا "تم نے جو کچھ پوچھا میں نے بتا دیا۔ اب مجھے کیوں مارتے ہو؟"

"میں نے کہا نا کہ تمہیں زندہ چھوڑ دینے سے ہماری زندگیاں خطرے میں پڑ جائیں گی اور ہم یہ خطرہ مول نہیں لینا چاہتے۔" میں نے کہا۔

میں نے ٹھاکر کو اشارہ کیا۔ اس نے سوامی پرمانند کو دونوں پیروں سے پکڑ لیا اور میں نے بانہوں سے۔ اس کے دونوں بازو تو بے کار ہو چکے تھے البتہ وہ ٹانگیں چھڑانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن ٹھاکر کی گرفت بہت مضبوط تھی۔

ہم اسے چٹان کے کنارے پر لے آئے۔ سوامی پرمانند بری طرح چیخ رہا تھا۔ ہم نے ڈنڈا ڈولی کرتے ہوئے دو تین جھولے دیے اور پھر پوری قوت سے اسے کھڈ کی طرف اچھال دیا۔

سوامی پرمانند کے منہ سے نکلنے والی وہ آخری چیخ بہت ہی خوفناک تھی جو دیر تک چٹانوں میں بازگشت پیدا کرتی رہی۔ وہ کھڈ غالباً سیکڑوں فٹ گہرا تھا اسی لیے بہت دیر بعد اس کے گرنے کی بھد کی آواز سنائی دی تھی اور پھر اچانک سناٹا چھا گیا۔

"خس کم جہاں پاک!" میں نے ہاتھ جھاڑتے ہوئے کہا۔ ایک زندہ انسان کو سیکڑوں فٹ گہرے کھڈ میں دھکیلتے ہوئے مجھے ذرا بھی افسوس نہیں ہوا تھا۔ یہ وہ لوگ تھے جن کے اپنے ہاتھ بے گناہوں کے خون سے رنگے ہوئے تھے۔ دھرم اور انسانیت کے نام پر کلنک کا ٹیکا تھے۔ ایک ایسا دھبا جسے مٹانے کے لیے صرف یہی طریقہ اپنایا جا سکتا تھا۔

کسی پہاڑ پر چڑھنا آسان ہوتا ہے لیکن اترنا بہت مشکل اور رات کی تاریکی میں تو یہ کام اور بھی خطرناک ہو جاتا ہے۔ ہمارے پاس ٹارچ وغیرہ نہیں تھی۔ ہم بہت سنبھل سنبھل کر پہاڑیوں سے اترتے رہے اور بالآخر تقریباً ایک گھنٹے بعد کانچ میں پہنچ گئے۔

جانکی وغیرہ نے ابھی تک کھانا نہیں کھایا تھا۔ وہ ہمارے انتظار میں بیٹھی ہوئی تھیں۔ وہ شاپنگ بیگ بھی میز پر ویسے ہی رکھے ہوئے تھے جن میں 'میں کھانا لے کر آیا تھا۔ روپ متی میں نے شاپنگ بیگ اٹھا کر کچن کی طرف چلی گئی اور میں منہ ہاتھ دھونے کے لیے ایک طرف لگے ہوئے نلکے کے سامنے کھڑے ہو گئے اور پھر چند منٹ بعد ہم سب میز بیٹھ کھانا کھا رہے تھے۔

○☆○

راستہ دشوار ہی نہیں بہت خطرناک بھی تھا اور اب سوامی پرمانند کی کہی ہوئی یہ بات سمجھ میں آ گئی تھی کہ یاتری اس طرف کیوں نہیں آتے تھے۔ یہاں تو وہی مہم جو آ سکتا تھا جسے ہمالیہ کی کوئی چوٹی سر کرنے کا شوق ہو لیکن یہ بات میری سمجھ میں نہیں آ سکی تھی کہ مذہب کے ٹھیکے داروں کو ایسی جگہوں پر مندر بنانے کا کیا شوق تھا جہاں کوئی جا ہی نہ سکے۔ یوں تو ہندوستان کے ہر شہر میں قدم قدم پر مندر نظر آتے ہیں لیکن یہ ایک ایسا خطہ ہے جہاں مندروں کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔ ہردوار اور اس سے ملحق علاقوں رشی کیش، ہری کی دون ویلی، سنکری، وادی تال، گرگھ، کیدار تال، کیدار ناتھ اور بدری ناتھ ویلی اور اس کے ساتھ ہماچل پردیش میں چھ ہزار سے زیادہ مندر موجود ہیں۔ ان میں کچھ مندر تو سیکڑوں سال پرانے ہیں، کچھ کھنڈر بن چکے ہیں اور لاتعداد مندر ایسے ہیں جہاں سال کے بارہ مہینوں میں یاتریوں کی آمد و رفت رہتی ہے لیکن بہت سے مندر ایسے ہیں جہاں کبھی کبھار ہی کوئی یاتری جاتا ہے۔ ایسے مندر یا تو کھنڈروں میں تبدیل ہو چکے ہیں یا آبادی سے اتنی دوری پر ہیں کہ کوئی یاتری اس طرف جانا پسند نہیں کرتا۔

سنکری کا شمار بھی ایسے ہی مندروں میں ہوتا تھا۔ یہ مندر نہ صرف آبادی سے دور تھا بلکہ وہاں تک پہنچنے کا راستہ بھی بہت خطرناک تھا۔

ہم اپنی تیاری مکمل کر کے صبح سات بجے کانچ سے روانہ ہوئے تھے۔ ہمارے ساتھ چترا پریتم اور جانکی بھی تھیں۔ یہ دونوں بہت ضد کر کے ہمارے ساتھ آئی تھیں جبکہ بلاّ اور روپ متی کو کانچ ہی میں چھوڑ دیا گیا تھا۔

جانکی اور چترا پریتم کی وجہ سے ہمیں راستہ طے کرنے میں مزید مشکلات پیش آ رہی تھیں۔ وہ کوئی باقاعدہ راستہ بھی نہیں تھا۔ سنگلاخ چٹانوں کے بیچ ایک تنگ سی پگڈنڈی تھی جو بل کھاتی ہوئی بتدریج بلندی کی طرف چلی گئی تھی۔

جانکی اور چترا بری طرح ہانپ رہی تھیں۔ ان کی وجہ سے ہمیں بار بار رکنا پڑ رہا تھا۔ بعض جگہوں پر تو راستہ بہت ہی خطرناک تھا۔ ایک طرف عمودی چٹان اور دوسری طرف گہرے کھڈ۔ معمولی سی غفلت موت کے منہ میں پہنچا سکتی تھی۔ چترا اور جانکی مسلسل بڑبڑا رہی تھیں کہ ان کم بختوں کو ایسی جگہ پر مندر بنانے کا کیا شوق ہوا تھا جہاں تک پہنچنا بھی جان جوکھوں کا کام تھا۔

جس وقت ہم کانچ سے روانہ ہوئے تھے، سورج طلوع

ہو چکا تھا۔ آسمان بالکل صاف تھا اور دھوپ چمک رہی تھی لیکن پھر یکایک آسمان پر بادل جمع ہونے لگے تھے۔ ہم جیسے جیسے بلندی کی طرف جا رہے تھے' ہوا تیز ہوتی جا رہی تھی اور خنکی بڑھ رہی تھی اور اب بادلوں کی وجہ سے خنکی میں کچھ اور اضافہ ہو گیا تھا۔ کسی جگہ سے ہمیں ہمالیہ کی وہ بلند چوٹیاں بھی نظر آجاتیں جو برف سے ڈھکی ہوئی تھیں اور میں سوچ رہا تھا کہ اگر بارش شروع ہو گئی تو ہمارے لیے بہت سی مشکلات پیدا ہو جائیں گی۔ پہاڑی علاقوں کے موسم کا اعتبار نہیں ہوتا اور یہ تو ہمالیہ کا سلسلہ تھا۔ ہم ہمالیہ کی گود میں تھے۔ اگر بارش ہو جاتی تو سیلابی پانی کے ریلوں سے بچنا مشکل ہو جاتا۔

میں نے ایک مرتبہ ٹھاکر کو مشورہ بھی دیا تھا کہ واپس چلے چلیں اور ان دونوں (جانکی + پریتم) کو چھوڑ کر اگلے روز دوبارہ اس طرف آئیں لیکن ٹھاکر بھی میری طرح ضدی تھا۔ اس نے یہ کہہ کر میرا مشورہ مسترد کر دیا تھا کہ اب جو ہونا ہے' آج ہو ہی جائے۔

ٹھاکر ہم سب سے آگے تھا۔ اس کے پیچھے چترا پریتم پھر جانکی اور سب سے آخر میں' میں تھا۔ اس وقت ہم تنگ سے راستے سے گزر رہے تھے جس کے ایک طرف عمودی چٹان تھی اور دوسری طرف گہرا کھڈ۔ نیچے عمیق گہرائی میں درخت اس طرح نظر آ رہے تھے جیسے چھوٹے چھوٹے پودے ہوں۔

چترا کے پیر کے نیچے سے اچانک ہی ایک پتھر پھسل گیا۔ اس کے قدم لڑکھڑا گئے۔ اس کی چیخ سن کر ٹھاکر بڑی تیزی سے پیچھے پلٹا اور عقاب کی طرح لپک کر اس نے چترا کو بازو سے پکڑ کر چٹان کی طرف کھینچ لیا۔ اگر اسے ایک لمحے کی بھی تاخیر ہو جاتی تو چترا سیکڑوں فٹ گہرے کھڈ میں گر چکی ہوتی اور ہم وہاں بیٹھے اس کا ماتم کر رہے ہوتے۔

چترا ٹھاکر سے لپٹ گئی تھی اور ٹھاکر ایک ہاتھ سے اس کا کندھا تھپتھپا رہا تھا۔ جانکی بھی قریب پہنچ گئی اور اس نے چترا کو ٹھاکر سے الگ کر کے اپنے ساتھ لپٹا لیا۔

ہمیں تقریباً پندرہ منٹ وہاں رکنا پڑا اور پھر ہم آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگے۔ ٹھاکر نے چترا کا ہاتھ تھام رکھا تھا اور میں نے جانکی کو سنبھال رکھا تھا۔

ہم اس خطرناک راستے سے آگے نکل آئے۔ اس سے آگے راستہ کشادہ اور بڑی حد تک محفوظ تھا۔ ہم کچھ دیر کے لیے وہاں رک گئے اور پھر وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا۔ آسمان پر بادل گہرے ہو گئے تھے اور ہلکی ہلکی بوندا باندی ہونے لگی تھی۔ ہم ایک چٹان کی اوٹ میں ہو گئے۔

ہلکی بوندا باندی اچانک ہی تیز بوچھار میں بدل گئی لیکن تین چار منٹ بعد جس طرح اچانک بارش شروع ہوئی تھی اسی طرح اچانک رک بھی گئی۔ بارش رکتے ہی ہم آگے بڑھنے لگے۔

ہمیں ہمالیہ کی گود میں سفر کرتے ہوئے چار گھنٹے ہو چکے تھے۔ سوامی پرماند نے بتایا تھا کہ ستکری مندر تقریباً دس کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ اگر میدانی علاقہ ہوتا تو یہ فاصلہ زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹے میں طے ہو جاتا مگر مسلسل بلندی اور دشوار راستے کی وجہ سے ہمیں اتنا وقت لگ گیا تھا۔

ایک مرتبہ پھر ہمیں تیز بارش نے گھیر لیا۔ اس مرتبہ بھی ہمیں پناہ کی جگہ مل گئی اور بارش بھی اس بار تقریباً پندرہ منٹ تک ہوتی رہی۔

بارش رکی تو ہم پھر آگے چلنے لگے۔ اس مرتبہ ہمیں زیادہ فاصلہ طے نہیں کرنا پڑا۔ ایک چٹان کے گرد تنگ سے راستے پر گھوم کر جیسے ہی ہم اوپر پہنچے' ٹھاکر نے ہاتھ اٹھا کر ہمیں رکنے کا اشارہ کیا اور اس کے ساتھ ہی ہونٹوں پر انگلی رکھ دی۔

میں جانکی کا ہاتھ چھوڑ کر تیزی سے آگے بڑھ گیا اور ٹھاکر کے برابر پہنچ کر سامنے دیکھنے لگا۔ میری آنکھیں حیرت سے پھیلتی چلی گئیں۔ سامنے سنگلاخ چٹانوں کے بیچ میں بہت وسیع و عریض پتھریلا میدان تھا جس کے وسط میں چھ فٹ اونچے چبوترے پر مندر بنا ہوا تھا۔

یہ چبوترہ بھی بہت کشادہ تھا۔ مندر کی عمارت پتھروں سے بنی ہوئی تھی اور یہ پتھر انہی چٹانوں کو توڑ کر تراشے گئے تھے۔ عمارت کے اطراف میں بھی چبوترے پر بہت وسیع و عریض جگہ تھی۔ چبوترے پر پہنچنے کے لیے چھ کشادہ سیڑھیاں تھیں۔

مندر کی عمارت بہت پرانی تھی۔ اوپر سے کلس کا بہت سا حصہ ٹوٹ چکا تھا۔ چبوترے اور سیڑھیوں پر بھی ٹوٹ پھوٹ کے آثار نظر آ رہے تھے۔

مندر کی عمارت نیچے سے چوکور تھی اور اوپر سے ہشت پہلو تھی۔ عمارت میں لگے ہوئے پتھروں پر جا بجا مورتیاں بنی ہوئی تھیں۔

ہماری نظروں کے بالکل سامنے مندر کا محرابی دروازہ تھا۔ محراب بہت بڑی تھی لیکن اس میں کوئی پٹ وغیرہ نہیں تھا۔ کسی اور طرف کا دروازہ بھی کھلا ہوا تھا۔ جہاں سے روشنی اندر تک پہنچ رہی تھی لیکن اس ہال کے اندر عمارت کے آس پاس کسی ذی روح کا نام و نشان تک نہیں آ رہا تھا۔

عمارت زیادہ بڑی نہیں تھی۔ نیچے سے اوپر تک لاتعداد چھوٹی چھوٹی کھڑکیاں بھی نظر آ رہی تھیں۔ مورتیوں کے درمیان ان کھڑکیوں میں سے کسی کھڑکی میں اگر کوئی کھڑا ہو تو اسے دیکھ لینا دشوار تھا لیکن میں گہری نظروں سے ان کھڑکیوں کی طرف دیکھتا رہا۔

پتھریلے میدان کے دائیں طرف بالکل آخر میں چٹان سے ملی ہوئی ایک اور چھوٹی سی عمارت تھی۔ میرے اندازے کے مطابق وہ عمارت تین یا چار کمروں پر مشتمل ہوگی اور کسی زمانے میں رہائش کے لیے استعمال ہوتی ہوگی لیکن اس وقت تو اس طرف بھی زندگی کے آثار دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ اس عمارت کے ساتھ ہی پہاڑی پر جانے کے لیے سیڑھیاں سی بنی ہوئی تھیں۔ یہ چند سیڑھیاں تھیں جو چٹان کو کاٹ کر بنائی گئی تھیں۔ اس سے اوپر چار پانچ فٹ چوڑا راستہ تھا جو اوپر کہیں چلا گیا تھا۔ اس طرف سبزہ تھا اور اس راستے پر جھاڑیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ اس سے اوپر قد آدم پودے اور درخت تھے۔

"یہاں تو کوئی نظر نہیں آ رہا۔" ٹھاکر نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا "کہیں سوامی پرماند نے ہمارے ساتھ دھوکا تو نہیں کیا۔"

"بہت کم لوگ ایسے ہوتے ہیں جو موت کے سامنے جھوٹ بولنے کی ہمت کر سکیں۔" میں نے جواب دیا "وہ جانتا تھا کہ جھوٹ بولنے سے اس کی جان نہیں بچ سکے گی۔ وہ لوگ یقیناً یہیں آئے ہیں۔ مندر کا وہ چبوترہ دیکھ رہے ہو۔ تقریباً چھ فٹ اونچا ہے اور مجھے یقین ہے کہ اس عمارت کے نیچے تہ خانہ ضرور ہوگا۔ ہو سکتا ہے وہ لوگ وہیں ہوں۔"

"تو پھر آگے چلا جائے یا یہیں رک کر کسی کے باہر آنے کا انتظار کریں؟" ٹھاکر نے کہا۔

"آگے ہی جانا پڑے گا۔" میں نے جواب دیا۔

ہم لوگ چٹان کی آڑ سے نکل آئے۔ میں اور ٹھاکر آگے تھے۔ جانکی اور چترا ہمارے پیچھے چل رہی تھیں۔ پتھریلا میدان میں کہیں کہیں چھوٹے چھوٹے گڑھوں میں پانی بھرا ہوا تھا۔ ہم ان گڑھوں سے بچتے ہوئے محتاط انداز میں آگے بڑھتے رہے۔ ٹھاکر نے پستول نکال کر ہاتھ میں لے لیا تھا۔ میرے پاس اگرچہ پستول نہیں تھا لیکن پتلون کے پائنچے کے اندر پنڈلی کے ساتھ خنجر بندھا ہوا تھا جسے میں کسی بھی وقت نکال سکتا تھا۔

ہم چبوترے پر آ گئے۔ ایک لمحے کو رک کر ادھر ادھر دیکھا اور مندر میں داخل ہو گئے۔ باہر سے مندر کی عمارت اگرچہ زیادہ بڑی نہیں لگتی تھی لیکن اندر ہال خاصا بڑا تھا۔ بالکل سامنے والی دیوار کے قریب تین مربع فٹ چوڑا اور چار فٹ اونچا چبوترہ تھا۔ اس چبوترے پر کسی زمانے میں کوئی مورتی رکھی رہتی ہوگی لیکن اب وہاں ایک ٹوٹا پھوٹا سا پتھر پڑا ہوا تھا۔ اس چبوترے کے پیچھے ایک کشادہ دروازہ تھا۔ مندر کے اندر چاروں دیواروں میں کمرے بنے ہوئے تھے۔ صرف ایک کمرے کا دروازہ ٹوٹا ہوا تھا جبکہ دوسرے کمروں کے دروازے سلامت تھے اور بھڑے ہوئے تھے۔

ہم ہال میں داخل ہو کر رک گئے۔ بیچ میں ایک پتھریلا ستون تھا جو چھت تک چلا گیا تھا۔ اس ستون پر بھی چاروں طرف مورتیاں بنی ہوئی تھیں اور دیواروں پر بھی مورتیوں کی شبیہ ابھری ہوئی تھی۔

دو منزلوں تک دو کشادہ بالکونیاں تھیں جن کے سامنے ریلنگ بنی ہوئی تھی۔ یہ ریلنگ کئی جگہوں سے ٹوٹی ہوئی تھی۔ میں کئی منٹ تک ہال کی دیواروں' بالکونیوں اور ان دروازوں کو دیکھتا رہا پھر ٹھاکر کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"میرا خیال ہے' وہ یہیں تہ خانے میں ہوں گے۔ ہمیں تہ خانے کا راستہ تلاش کرنا ہوگا۔" میں نے کہا۔

"تہ خانے کا راستہ تلاش کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہم تمہارے سامنے ہیں۔" یہ آواز سن کر ہم سب اچھل پڑے۔ ہال میں آواز گونجتی ہوئی سی محسوس ہوئی تھی۔ میں نے اوپر دیکھا۔ پہلی منزل کی بالکونی پر دارا اور پنڈت پرگھیا راج کھڑے تھے۔ دارا کے ساتھ ایک خوب صورت اور جوان لڑکی تھی۔ اس نے بھی ساڑی کی طرح کا گیروے رنگ کا لباس پہن رکھا تھا "مجھے یقین تھا کہ تم میرا پیچھا کرتے ہوئے یہاں بھی آؤ گے۔" دارا کہہ رہا تھا "بد روحوں سے پیچھا چھڑانا بہت مشکل ہوتا ہے لیکن اب میں نے طے کر لیا ہے کہ بلی چوہے کے اس کھیل کا فیصلہ ہو ہی جائے۔ آج کے بعد کوئی آسیب میرا پیچھا نہیں کر سکے گا اور ٹھاکر...!" آخر میں اس نے ٹھاکر کو مخاطب کیا "تم نے اس شیطان کا ساتھ دے کر بہت بڑی غلطی کی ہے۔ اس کی وجہ سے تمہیں اب تک جو نقصان پہنچ چکے ہیں ان سے تم نے کوئی سبق حاصل نہیں کیا۔ اب تمہارا بھی انت (اختتام) ہونے والا ہے۔ پستول پھینک دو اور کوئی چالاکی دکھانے کی کوشش مت کرنا۔ ورنہ میرے پستول میں اتنی گولیاں ہیں کہ دو دو تم لوگوں کے حصے میں آ ہی جائیں گی۔ پھینک دو پستول۔" آخر میں دارا کی آواز ہال میں گونج اٹھی تھی۔

ٹھاکر نے میری طرف دیکھا اور پستول پھینک دیا۔

دارا ایک بیساکھی کا سہارا لیے کھڑا تھا۔ اس نے بائیں ہاتھ سے بیساکھی سنبھال رکھی تھی اور داہنے ہاتھ میں پستول تھا۔

"نیرو۔ نیچے جاؤ اور ان کی تلاشی لو۔ ہم بھی آرہے ہیں۔" دارا نے اپنے پیچھے کسی کو اشارہ کیا۔

ایک اور آدمی ایک لمحے کو ہمارے سامنے آیا اور پچھلی طرف کہیں غائب ہوگیا۔ دارا ہم پر پستول تانے کھڑا رہا۔ تقریباً ایک منٹ بعد ہال میں ایک کمرے کا دروازہ کھلا اور وہی آدمی برآمد ہوا جس کی ہم نے صرف ایک جھلک دیکھی تھی۔

وہ بھی انہی کے قبیل کا آدمی تھا۔ اس نے گیروے رنگ کے کپڑے کی دھوتی باندھ رکھی تھی۔ ایک پیلی چادر پشت پر ڈال رکھی تھی جس کے دو کناروں کو آگے سینے پر لاکر گرہ دے رکھی تھی۔ اس کا قد چھ فٹ سے کچھ نکلتا ہوا تھا۔ بے حد مضبوط جسم، سرخ آنکھیں اور بے ترتیب داڑھی مونچھیں۔

اس نے آتے ہی سب سے پہلے زمین پر پڑے ہوئے پستول پر قبضہ کیا پھر ٹھاکر کی پشت پر پہنچ کر اس کا لباس تھپتھپانے لگا۔ ٹھاکر کے پاس اور کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ اس طرف سے مطمئن ہو کر نیرو نام کا وہ پنڈت میری پشت پر آگیا اور اوپر سے نیچے تک میرے جسم کو تھپتھپانے لگا۔ اس کا ہاتھ میرے گھٹنوں سے نیچے نہیں گیا تھا جس پر میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ اگر اس کا ہاتھ میری پنڈلی تک پہنچ جاتا تو میرا خنجر بھی مجھ سے جدا ہو جاتا۔

نیرو ہماری تلاشی لیتے ہوئے بہت محتاط تھا۔ محتاط نہ بھی ہوتا تو ہم کچھ نہیں کرسکتے تھے۔ بالکونی پر کھڑا دارا ہمیں پستول کی زد پر لیے ہوئے تھا۔ نیرو چترا کی طرف بڑھا تو وہ چیختے ہوئے دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔

"میرے شریر (بدن) کو ہاتھ مت لگانا۔ وہیں کھڑے رہو۔"

"اس کو چھوڑ دو نیرو۔ اس کی تلاشی ہم لیویں گے۔" دارا کے ساتھ کھڑے ہوئے پنڈت پرگھیا راج نے چیخ کر کہا۔ اس کے ہاتھ میں ترشول تھا۔

نیرو ہمارے سامنے تن کر کھڑا ہوگیا۔ اس نے ہم چاروں کو پستول کی زد پر لے رکھا تھا۔ دارا وغیرہ بالکونی سے غائب ہوگئے تھے اور پھر ایک ڈیڑھ منٹ بعد وہ نیچے والے دروازے پر نمودار ہوا۔ اس کے پیچھے پنڈت پرگھیا راج اور آخر میں وہی لڑکی دروازے سے باہر آئی تھی۔ اس کی عمر تیئیس چوبیس سال رہی ہوگی۔ اس کے حسین ہونے میں کوئی شبہ نہیں تھا۔ اس کی ہرن جیسی موٹی موٹی سیاہ آنکھوں میں خوف کی جھلک نمایاں تھی۔

"مجھے معلوم تھا کہ تم میرا پیچھا نہیں چھوڑو گے اور یہاں بھی آؤ گے۔" دارا نے میرے سامنے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ اس کے پستول کا رخ میرے سینے کی طرف تھا۔ واقعی بد روح ہو۔ میں جہاں بھی جاتا ہوں تم میرے پیچھے پیچھے جاتے ہو۔ ہردوار میں صرف دو آدمیوں کو معلوم ہے کہ وہ یہاں آئے ہیں اور تم ان دونوں میں سے کسی تک نہیں پہنچ سکتے۔ اس کے باوجود تم نے۔۔۔"

"ان دو میں سے صرف ایک باقی رہ گیا ہے۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی "سوائی پرمانند جنم میں پہنچ چکا ہے اور اب تمہاری باری ہے اور تم یہ بات ذہن میں رکھ لو کہ اس مرتبہ میں تمہیں بھاگنے کا موقع نہیں دوں گا۔ آج ہمارے درمیان جو کچھ بھی ہوگا، فیصلہ کن ہوگا۔ اب ہم دونوں میں سے ایک رہے گا۔ میں یا تم۔"

"میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ آج فیصلہ ہو ہی جائے۔" دارا نے کہا "یہ تمہاری زندگی کی آخری گھڑیاں ہیں اور تمہارے ساتھ ان لوگوں کا بھی خاتمہ ہو جائے گا اور مجھے ان کا کوئی افسوس نہیں ہوگا۔"

"افسوس تو تمہیں ان سیکڑوں بے گناہوں کا بھی نہیں ہوا جنہیں تم اب تک موت کے گھاٹ اتار چکے ہو لیکن اب تمہیں ان سب کا حساب دینا ہوگا۔" میں نے کہا "میں ان خوفناک لمحات کو اب تک نہیں بھولا ہوں جب میرے ماں باپ کو موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا اور پھر تھوڑی کو بھی اسی طرح مار ڈالا گیا۔ ان کے علاوہ سیکڑوں بے گناہ تمہارے ہاتھوں اپنی زندگیاں گنوا بیٹھے۔ تمہیں کسی کا افسوس نہیں ہوا۔ تم تو لاشوں پر کھڑے ہو کر قہقہے لگاتے تھے۔ تم نے مجھے ایک لمحے کو بھی چین سے کہیں ٹکنے نہیں دیا اور جب میرے قدم زمین پر نکلے تو تم بھاگ کھڑے ہوئے۔ میں نے بھی عہد کرلیا تھا کہ جب تک اپنے ہاتھوں سے تمہاری گردن نہیں مروڑ دوں گا، سکون سے نہیں بیٹھوں گا اور اب فیصلے کی گھڑی آن پہنچی ہے۔ تم میں کبھی اتنا حوصلہ نہیں رہا کہ سامنے آکر مقابلہ کرسکو۔ تم نے ہمیشہ بھاگنے ہی میں اپنی عافیت سمجھی لیکن آج میں تمہیں بھاگنے کا موقع نہیں دوں گا۔ نہ تو پیچھوں کو پوجنے والے یہ لوگ تمہاری حفاظت کرسکیں گے اور نہ ہی یہ پہاڑ تمہیں پناہ دے سکیں گے۔"

"میں بھی تمہیں کوئی ایسا موقع نہیں دوں گا۔" دارا

نے بیساکھی والا پیر زمین پر ٹکاتے ہوئے کہا "آج یہ قصہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گا۔"

اس نے پستول والا ہاتھ آگے نکال لیا۔ ٹھاکر نے میری طرف دیکھا اور پھر نیرو کی طرف دیکھنے لگا جس نے ہم سب کو پستول کی زد پر لے رکھا تھا۔

میں نے نظریں دارا کے پستول والے ہاتھ پر جما دیں۔ اس وقت دارا سے نمٹنے کے لیے میں نے اپنے اندر کی پُراسرار قوت سے کام لینے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ مجھے پیٹ میں، ناف کے قریب گرہیں سی پڑتے ہوئے محسوس ہوئیں اور پھر ایک دم یوں لگا جیسے میرے اندر سے کوئی چیز اوپر کو اٹھ رہی ہو۔

میری آنکھیں سلگنے لگیں۔ آنکھوں کے حلقوں میں تپش میں صاف طور پر محسوس کررہا تھا۔ میری نظریں دارا کے پستول والے ہاتھ پر مرکوز تھیں۔

دارا کا ہاتھ پوری طرح آگے کو نکلا ہوا تھا پھر اس کا بازو آہستہ آہستہ پیچھے کو ہٹنے لگا۔ میں نے ایک لمحے کو اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر خوف اور آنکھوں میں عجیب سی دہشت نظر آئی۔

اس ایک لمحے سے فائدہ اٹھا کر اس نے ہاتھ پھر آگے کرلیا تھا۔ اس کی انگلی ٹریگر پر تھی اور پھر وہ انگلی آہستہ آہستہ حرکت کرتے ہوئے ٹریگر سے ہٹ گئی اور اس کے ساتھ ہی اس کی مٹھی بھی آہستہ آہستہ کھلتی چلی گئی۔ اب پستول اس کی ہتھیلی پر رکھا ہوا تھا۔ دوسرے ہی لمحے اس کے ہاتھ کو جھٹکا لگا اور پستول نیچے گر گیا۔

پنڈت پرگھیا راج اور نیرو نے بھی حیرت سے یہ تماشا دیکھا۔ دارا نے مجھے موت کے گھاٹ اتارنے کے لیے پستول اٹھایا تھا لیکن پستول اس کے ہاتھ سے گر گیا تھا۔ نیرو کے چہرے پر تو ہوائیاں سی اڑنے لگی تھیں۔ میں نے ہندو پنڈتوں اور پجاریوں کے بارے میں بہت سنا تھا کہ وہ پُراسرار قوتیں حاصل کرنے کے لیے جاپ کرتے رہتے ہیں۔ نیرو شاید یہی سمجھا تھا کہ میں بھی کچھ ایسی ہی قوتوں کا مالک ہوں۔ اس کی حیرت اور وحشت سے فائدہ ٹھاکر نے اٹھایا۔

دارا نے ہاتھ پر ٹھوکر مار دی۔ پستول نیرو کے ہاتھ سے چھوٹ کر اور جا گرا۔ وہ خود بھی اچھل کر پیچھے ہٹا تھا۔ ٹھاکر نے اس پر زناٹے کا وار کیا اور اسے دھکیلتے ہوئے دور لے گیا۔

دارا ایک دم جیسے ہوش میں آگیا تھا۔ اس نے بیساکھی سے مجھ پر حملہ کردیا۔ میں نے بیساکھی کا وار کلائی پر روکا اور دوسرے ہاتھ سے بیساکھی کو گرفت میں لے کر زور دار جھٹکا دیا۔ دارا بھی بیساکھی کے ساتھ آگے کی طرف کھنچ آیا۔ میں نے جھٹکا دے کر بیساکھی کو چھوڑ دیا تھا۔ دارا منہ کے بل زمین پر گرا لیکن اس نے سنبھلنے میں بھی حیرت انگیز پھرتی کا مظاہرہ کیا تھا۔

دارا نے اٹھ کر ایک بار پھر بیساکھی سے حملہ کردیا۔ اس مرتبہ بھی میں نے وار ہاتھوں پر روکا۔ ہم دونوں میں بیساکھی کے لیے قوت آزمائی ہونے لگی۔

دارا نے میری ٹانگ پر ٹھوکر ماردی۔ میں لڑکھڑا کر نیچے گرا۔ بیساکھی بھی میرے ہاتھ سے چھوٹ گئی تھی۔ دارا نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کلہاڑے کی طرح بیساکھی کو سر سے اوپر اٹھا کر حملہ کردیا۔ میں تیزی سے لوٹ لگا کر ایک طرف ہٹ گیا۔ دارا ایک ٹانگ پر اچھل اچھل کر حملے کرتا رہا اور میں فرش پر لوٹ لگاتا ہوا اس کے حملوں سے بچنے کی کوشش کرتا رہا اور بالآخر مجھے موقع مل گیا۔ میں نے بیساکھی کو پکڑ کر زور دار جھٹکا دیا۔ دارا اپنا توازن برقرار نہیں رکھ سکا اور میرے اوپر سے ہوتے ہوئے منہ کے بل گرا۔

میں لوٹ لگا کر اٹھ گیا اور دارا کو ٹھوکروں پر رکھ لیا لیکن دارا ایسا نہیں تھا کہ دیر تک مار کھا سکتا۔ اس نے میرا پیر پکڑ کر گرانے کی کوشش کی۔ میں تو نہیں گرا البتہ دارا کو اٹھنے کا موقع مل گیا۔

دارا میرے سامنے ایک دم تن کر کھڑا ہوگیا۔ اس کا مفلوج پیر بھی زمین پر ٹکا ہوا تھا۔ اس وقت اسے دیکھ کر لگتا تھا جیسے اس کی ٹانگ میں کوئی نقص نہ ہو اور وہ پوری طرح فارم میں نظر آرہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے شعلے سے برستے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ اس نے اچانک ہی لباس کے اندر ہاتھ ڈال کر خنجر نکال لیا۔

"تمہاری موت ہی تمہیں یہاں لے آئی ہے۔" اس کے حلق سے بھیڑیے جیسی غراہٹ نکلی "اب تمہاری کوئی شکتی (قوت) کام نہیں آئے گی۔ تمہاری موت تمہارے باپ سے زیادہ خوفناک ہوگی۔"

باپ کے نام پر یوں لگا جیسے میرے دل پر گھونسا لگا ہو۔ ایک لمحے کو وہ خوفناک منظر میری آنکھوں کے سامنے گھوم گیا جب میرے باپ پر خنجروں سے وار کیے جارہے تھے۔

دارا نے خنجر سے حملہ کردیا۔ میں نے اس کی کلائی پکڑلی اور پھر خنجر کے لیے ہم میں کھینچا تانی ہونے لگی۔ دارا نے ایک بار پھر وہی حربہ استعمال کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس کے پیر کی ٹھوکر میری پنڈلی پر لگی تھی لیکن میں سنبھل گیا تھا۔

نے ایک ہاتھ سے دارا کی خنجر والی کلائی تھامے رکھی اور دوسرے ہاتھ سے اس کی بغل کے نیچے زور دار گھونسا رسید کردیا۔ دارا تقریباً ایک فٹ اوپر اچھلا تھا۔ اس کے پیر جیسے ہی زمین پر ٹکے' میں نے اڑنگا دے کر اسے گرا دیا۔

خنجر اب بھی دارا کے ہاتھ میں تھا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو زمین پر رگیدنے لگے۔

دوسری طرف بھی گھمسان کا رن پڑا ہوا تھا۔ ٹھاکر اور نیو لڑتے ہوئے مندر سے باہر چلے گئے تھے۔ ان کی غراہٹیں اور اٹھا پٹخ کی آوازیں یہاں تک سنائی دے رہی تھیں۔

پنڈت پرگھیا راج جانگی اور چترا کو رگید رہا تھا۔ اس میں گینڈے کی طرح طاقت بھری ہوئی تھی۔ وہ تو تین آدمیوں کے بس کا بھی نہیں تھا اور اس وقت تو اس کے مقابلے پر دو عورتیں تھیں۔ چترا تو لڑائی بھڑائی والی عورت نہیں تھی۔ بیٹی اور پتی (شوہر) کے قتل کا انتقام اسے بھڑکائے ہوئے تھا اور جانگی۔۔۔ اسے تو مارشل آرٹ میں خاصی مہارت حاصل تھی لیکن اسے کوئی وار کرنے کا موقع نہیں مل رہا تھا۔ کبھی وہ دونوں پرگھیا راج سے لپٹ جاتیں اور کبھی پرگھیا راج ان پر گھونسے اور ٹھوکریں برسانے لگتا۔ اس مار دھاڑ میں چترا کی قمیص پھٹ گئی تھی لیکن اسے شاید اس کی پروا نہیں تھی۔

دارا نے اس وقت مجھے اپنے نیچے دبوچ لیا تھا۔ اس کا ایک ہاتھ اب بھی میری گرفت میں تھا۔ اس نے خنجر سے میرے سینے پر وار کرنے کی کوشش کی لیکن میں نے دوسرے ہاتھ سے اس کا وار روک لیا اور اس کے ساتھ ہی اسے اپنے اوپر سے دھکیل دیا اور اسی لمحے میری نظر پرگھیا راج کی طرف اٹھ گئی۔

چترا پر یتم اپنا سر دونوں ہاتھوں میں پکڑے زمین پر لوٹ رہی تھی اور جانگی بھی پشت کے بل پڑی ہوئی تھی اور پنڈت پرگھیا راج ترشول کو دونوں ہاتھوں میں پکڑے اس پر حملہ کرنے کے لیے پر تول رہا تھا۔

پرگھیا راج ارنا بھینسے کی طرح پھنکارتے ہوئے جانگی پر حملہ آور ہوا۔ میں پوری قوت سے اپنی جگہ سے اچھلا۔ ترشول اور جانگی کے سینے کے بیچ چند انچ کا فاصلہ رہ گیا تھا کہ میں پرگھیا راج سے ٹکرا گیا اور اسے لیتے ہوئے دوسری طرف جا گرا۔ اگر ایک لمحے کی بھی تاخیر ہو جاتی تو ترشول جانگی کے سینے میں پیوست ہو چکا ہوتا۔

میں اٹھ کر پرگھیا راج کی طرف لپکا لیکن اسی وقت دارا نے میرے اوپر چھلانگ لگا دی۔ دارا مجھے رگیدتے ہوئے دور تک لے گیا تھا۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو گئے۔

دارا میرے نیچے دبا ہوا تھا۔ میں اس کی گردن کو گرفت میں لینے کی کوشش کر رہا تھا کہ چترا کی چیخ سن کر چونک کر میں نے گردن گھما کر اس کی طرف دیکھا تو کانپ اٹھا۔

پنڈت پرگھیا راج کا ترشول اس کے سینے میں پیوست تھا۔ پرگھیا راج نے ترشول ایک جھٹکے سے باہر کھینچا تو چترا کے سینے سے خون کی تین دھاریں بہہ نکلیں۔ وہ لڑکھڑا کر گھٹنوں کے بل گر گئی۔ پرگھیا راج نے اس پر ایک اور حملہ کیا۔ ترشول اس مرتبہ بھی دستے تک چترا کے سینے میں پیوست ہو گیا۔ چترا کے منہ سے نکلنے والی چیخ پہلے سے زیادہ خوفناک تھی۔

میں نے دارا کو چھوڑ کر پنڈت پر حملہ کرنے کی کوشش کی مگر دارا نے میری ٹانگ پکڑ لی اور میں لڑکھڑا کر اس کے اوپر ہی گر گیا۔ دارا جونک کی طرح مجھ سے لپٹ گیا تھا۔

چترا پر یتم نے ترشول کے دستے کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ رکھا تھا اور پرگھیا راج دستے کو زور زور سے جھٹکے دے رہا تھا۔

میں اپنے آپ کو دارا سے چھڑانے کی کوشش کرتا رہا مگر کامیاب نہیں ہو سکا۔ اس دوران میں جانگی اٹھ کر گرے پرندے کی طرح ہوا میں اڑتے ہوئے پنڈت پرگھیا راج کی طرف لپکی۔ اس کی ڈبل فلائنگ کک پرگھیا راج کے سینے پر لگی۔ وہ ڈکراتے ہوئے پیچھے گرا۔ ترشول چترا کے سینے ہی میں رہ گیا تھا۔

پنڈت پرگھیا راج جلدی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ جانگی نے بھی اٹھنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔ وہ ایک بار پھر ہوا میں اچھلی۔ اس مرتبہ بھی اس کی کک پنڈت کے سینے پر لگی۔ پنڈت پھر بلبلاتے ہوئے گرا اور پھر یہ سلسلہ جاری رہا۔ پنڈت پرگھیا راج جیسے ہی اٹھتا جانگی کی فلائنگ کک اسے دوبارہ زمین چاٹنے پر مجبور کر دیتی۔

پانچ ٹھوکریں کھا کر پنڈت پرگھیا راج نڈھال ہو چکا تھا۔ اس نے آخری مرتبہ اٹھنے کی کوشش کی تو جانگی کی کک اس کے چہرے پر پڑی۔ وہ ایک بار پھر ڈھیر ہو گیا۔ اس کی ناک اور منہ سے خون بہہ نکلا تھا۔ مسلسل چھ فلائنگ کک لگانے سے جانگی بھی ہانپ گئی تھی۔

میں اپنے آپ کو دارا کی گرفت سے چھڑانے کی کوشش کرنے لگا۔ وہ کم بخت جونک کی طرح مجھ سے لپٹ گیا تھا۔ میں کہنی سے اس کے سر پر ضربیں لگانے لگا۔ اس دوران میں میری نظر ایک بار پھر چترا پر یتم کی طرف اٹھ گئی۔ اس

دشمل کو دستے سے پکڑ کر اپنے سینے سے کھینچ لیا تھا۔ اس کے سینے پر بنی جگہوں سے خون کی دھاریں بہہ رہی تھیں لیکن وہ سینے پر بنی جگہوں سے خون کی دھاریں بہہ رہی تھیں لیکن وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی اور لڑکھڑاتے ہوئے پنڈت پرگھیا راج کی طرف بڑھی۔

پرگھیا راج پشت کے بل پڑا ہانپ رہا تھا۔ اس کا ایک ہاتھ منہ پر تھا۔ چترا کو اپنے سامنے دیکھ کر اس کی آنکھیں خوف اور دہشت سے پھیل گئیں۔ اس نے دونوں ہاتھ اٹھا لیے۔

"مجھے مت مارو۔ بھگوان کے لیے مجھے مت مارو۔۔۔" وہ گھگیایا۔

"تمہیں نہ ماروں کیونکہ تم بھگوان کے اوتار ہو۔" چترا کے حلق سے غراہٹ سی نکلی۔ اس کے سینے سے خون بہہ رہا تھا اور قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ اس نے ترشول کو دونوں ہاتھوں میں اس طرح پکڑ رکھا تھا کہ اس کا رخ نیچے کی طرف تھا "تم نے جب میری پھول سی نازک بیٹی کا شریر (بدن) ادھیڑا تھا۔ میرے بے گناہ شوہر پر خنجر سے وار کیے تھے اس وقت تمہیں خیال نہیں آیا تھا کہ وہ بھی انسان ہیں۔ میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گی پرگھیا راج۔۔۔ تم انسان نہیں شیطان ہو۔ میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گی۔"

اور پھر چترا پر یتم نے چیختے ہوئے پوری قوت سے وار کیا۔ ترشول دستے تک پرگھیا راج کے پیٹ میں اتر گیا۔ پرگھیا راج کی چیخوں سے مندر گونج اٹھا۔ چترا نے ترشول باہر کھینچ کر ایک اور وار کیا اور پھر گویا اس پر جنون طاری ہو گیا۔ وہ ترشول سے پرگھیا راج پر پے در پے وار کرتی رہی۔ پرگھیا راج کی آنتیں پیٹ سے نکل کر باہر بکھر گئی تھیں اور پھر شاید چترا کی ہمت جواب دے گئی۔ اس وقت ترشول پنڈت پرگھیا راج کے سینے میں پیوست تھا۔ چترا کے دونوں ہاتھ دستے پر تھے۔ اس کے ہاتھ دستے پر پھسلنے لگے اور وہ نیچے جھکتی چلی گئی۔

دارا اب بھی جونک کی طرح مجھ سے لپٹا ہوا تھا۔ وہ اچانک ہی مجھے چھوڑ کر چند فٹ دور پڑے ہوئے پستول کی طرف لپکا لیکن اسی وقت جانگی نے لپک کر اسے ٹھوکر مار دی۔ دارا پلٹ کر مندر کے دروازے کی طرف لپکا۔

میں نے اٹھنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہیں ہو سکا۔ دارا نے میرے بائیں پہلو پر پے در پے چند گھونسے مارے جس سے کروٹے میں درد کی شدید لہریں اٹھنے لگی تھیں۔ میں اپنے آپ کو گھسیٹتے ہوئے چترا کے قریب پہنچ گیا۔ وہ گر پڑی تھی اور جب میں نے اسے سیدھا کیا تو میرے منہ سے بے اختیار گہرا سانس نکل گیا۔ وہ ختم ہو چکی تھی۔

پنڈت پرگھیا راج بھی ختم ہو چکا تھا۔ میں نے گردن گھما کر ادھر ادھر دیکھا۔ دارا باہر بھاگ گیا تھا اور جانگی بھی اس کے پیچھے گئی تھی۔ میں کھڑے ہو کر چند لمحے اپنا پہلو سہلاتا رہا اور پھر باہر کی طرف دوڑ لگا دی۔

ٹھاکر ابھی تک نیو سے گتھم گتھا تھا لیکن وہ اس پوزیشن میں تھا کہ نیو اب اس سے بچ نہیں سکتا تھا۔

دارا میدان کے آخر میں اس چھوٹی عمارت کی طرف بھاگ رہا تھا جس کے ساتھ ہی چٹان کاٹ کر سیڑھیاں بنائی گئی تھیں اور ان سے آگے اوپر جانے کا تنگ سا راستہ تھا۔ جانگی بھی اس کے پیچھے دوڑ رہی تھی۔ میں نے بھی اس طرف دوڑ لگا دی۔ دارا حسب معمول پھر راہِ فرار اختیار کرنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن میں نے طے کر لیا تھا کہ اب اسے بھاگنے کا موقع نہیں دوں گا۔

دارا سیڑھیاں چڑھ کر پتھریلے راستے پر پہنچ چکا تھا۔ بارش کی وجہ سے اس ڈھلان پر ہلکا سا پانی بہہ رہا تھا۔ دارا چند قدم اوپر گیا تھا کہ اس کا پیر جھاڑیوں میں الجھ گیا۔ وہ پھسلتے ہوئے تین چار فٹ نیچے آیا پھر اوپر چڑھنے لگا۔ اس کی ایک ٹانگ پوری طرح اس کا ساتھ نہیں دے رہی تھی لیکن مجھے اس کی پھرتی دیکھ کر واقعی حیرت ہو رہی تھی۔

وہ ابھی دو تین قدم اوپر چڑھا تھا کہ جانگی نے اسے پیر سے پکڑ کر کھینچ لیا۔ دارا پھر چند فٹ نیچے آ گیا۔ اس نے دوسری ٹانگ چلا دی۔ ٹھوکر جانگی کے کندھے پر لگی۔ دارا کا پیر اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور جانگی ڈھلان پر لڑھکتے ہوئے پتھریلی سیڑھیوں پر آن گری۔

میں جانگی کے قریب سے گزرتے ہوئے دارا کے پیچھے دوڑا۔ وہ اس دوران میں تقریباً پچاس فٹ اوپر پہنچ چکا تھا۔ گیلے پتھروں اور جھاڑیوں میں میرا پیر بھی بار بار پھسل رہا تھا۔ میں کبھی جھاڑیاں پکڑ کر اور کبھی پتھروں کے سہارے اوپر چڑھتا رہا۔ ایک مرتبہ مڑ کر دیکھا تو جانگی بھی میرے پیچھے آ رہی تھی۔

تقریباً سو فٹ مزید اوپر جا کر دارا میری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ میں تیزی سے اوپر چڑھنے لگا۔ میں نے صرف ایک بات سوچ رکھی تھی کہ اگر دارا آج میرے ہاتھ سے نکل گیا تو دوبارہ اس سے کبھی سامنا نہیں ہو سکے گا۔

اس تنگ سے پتھریلے راستے کے اختتام پر ایک مختصر سا میدان تھا جس کے دو اطراف میں چٹانیں تھیں۔ تیسری سمت وہ تھی جہاں سے ہم اوپر آئے تھے اور چوتھی سمت

سیکنڈ ہاف گہرا کھٹ تھا۔

ایک چٹان تو بالکل عمودی تھی جس کے اوپر سے پانی کا پرنالا سا گر رہا تھا۔ یہ پرنالا پتھروں میں گر رہا تھا اور پانی وہیں زمین میں غائب ہو رہا تھا جبکہ دوسری چٹان ایسی تھی کہ اس پر آسانی سے چڑھا جا سکتا تھا۔ اس چٹان پر جھاڑیاں بھی تھیں اور اکا دکا اونچے درخت بھی جو اوپر تک چلے گئے تھے اور دارا اسی چٹان کی طرف دوڑ رہا تھا۔

میں پوری قوت سے دوڑنے لگا اور اس پہاڑی پر چند گز اوپر جا کر اسے پکڑ لیا۔ دارا کی نیم مفلوج ٹانگ میرے ہاتھ میں آ گئی تھی۔ میں اسے نیچے کھینچنے لگا۔ وہ دوسری ٹانگ سے مجھے ٹھوکریں مارنے کی کوشش کرتا رہا لیکن میں اپنا چہرہ اس سے بچاتا رہا۔

ہم دونوں جھاڑیوں میں لڑھکتے ہوئے نیچے آ گئے۔ دارا نے سنبھلتے ہی مجھے گرفت میں لینے کی کوشش کی تھی لیکن میں بڑی پھرتی سے اپنے آپ کو بچا گیا اور اچھل کر ڈبل سائیڈ کک اس کے پیٹ پر ماری۔ وہ چیختے ہوئے نیچے گرا اور وہ جیسے ہی سنبھلا میں ایک بار پھر اپنی جگہ سے اچھل کر گھوم گیا۔ اسپن کک اس کی پسلیوں پر لگی۔ وہ لڑکھڑا گیا۔ اس کے گرنے سے پہلے میں نے ایک اور سائیڈ کک رسید کر دی۔

دارا جھاڑیوں میں گرا۔ میں نے اس پر چھلانگ لگا دی اور اسے رگیدتے ہوئے دور تک لے گیا۔ اس دوران میں دارا کو موقع مل گیا۔ اس نے مجھے پیروں پر اٹھا کر دور اچھال دیا۔

میرے خیال میں میرے اور دارا کے بیچ برسوں سے جاری لڑائی کے فیصلہ کن لمحات آن پہنچے تھے۔ میں جھاڑیوں میں پشت کے بل گرا تھا۔ اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے میں نے پتلون کا پائنچہ اٹھا کر خنجر نکال لیا۔

دارا اس وقت مجھ پر حملہ کرنے والا تھا لیکن میرے ہاتھ میں خنجر دیکھ کر رک گیا۔ اس کے چہرے پر ایک دم خوف کے سائے پھیل گئے تھے۔

میں آگے بڑھا تو دارا آہستہ آہستہ پیچھے ہٹنے لگا۔ وہ راہِ فرار تلاش کر رہا تھا۔ میں نے تیزی سے آگے بڑھ کر اس پر حملہ کر دیا۔ اس نے میرا وار روک لیا اور بڑی مضبوطی سے میری کلائی کو گرفت میں لے لیا۔ میں نے دوسرے ہاتھ سے اس کی کہنی پر نیچے کی طرف ضرب لگائی۔ اس نے بلبلا کر میری کلائی چھوڑ دی۔ وہ ابھی سنبھل نہیں پایا تھا کہ میں نے خنجر سے وار کر دیا۔

کامیاب نہیں ہو سکا۔ خنجر دستے تک اس کے پیٹ میں پیوست ہو گیا۔ دارا کی چیخ بڑی خوفناک تھی۔ میں نے جھٹکے سے اس کے سینے سے خنجر کھینچ لیا۔ خون کا فوارہ اس کے سینے سے بہہ نکلا۔ میں نے ایک اور وار کیا اور اس کے سینے میں ایک اور سوراخ بنا دیا۔

اس مرتبہ دارا اپنے قدموں پر کھڑا نہیں رہ سکا۔ وہ لڑکھڑا کر پشت کے بل جھاڑیوں میں گرا۔ میں نے چھلانگ لگا دی اور اس کے سینے پر ایک اور وار کر دیا اور پھر تو مجھ پر جیسے جنون طاری ہو گیا۔ میں دارا پر پے در پے خنجر کے وار کرتا رہا۔ میری آنکھوں کے سامنے مختلف چہرے گھومتے رہے۔ میری ماں، میرا باپ، ماسٹر پھوپھا جانگ، تھائی اور نجانے کون کون معصوم اور بے گناہ لوگ تھے جو اس خوں خوار بھیڑیے کے ہاتھوں موت کا شکار ہو چکے تھے۔

میرا ہاتھ مشینی انداز میں چل رہا تھا اور پھر اچانک پیچھے سے کسی نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ مجھے ایک جھٹکا سا لگا۔

وہ ٹھاکر تھا جو مجھے پکڑ کر کھینچتے ہوئے وہاں سے دور لے گیا۔ چٹان کے کنارے پر جانگی بھی کھڑی تھی۔ ٹھاکر مجھے لے کر اس کے قریب رک گیا۔ میں زمین پر بیٹھ کر ہانپنے لگا۔

میں اپنے آپ میں عجیب سی کیفیت محسوس کر رہا تھا۔ میرا ازلی دشمن، میرے ماں باپ کا قاتل آج میرے ہاتھوں اپنے انجام کو پہنچ چکا تھا۔ میری قسم پوری ہو گئی تھی۔ اب اگر مجھے موت بھی آ جاتی تو پروا نہیں تھی۔

جانگی اور ٹھاکر بھی میرے قریب بیٹھے ہوئے تھے۔ ٹھاکر میرا کندھا تھپتھپا رہا تھا اور جانگی میرے بالوں میں انگلیاں پھیر رہی تھی۔ اچانک آہٹ سن کر ہم تینوں چونک گئے اور جب میں نے گردن گھما کر دیکھا تو میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔

دارا میرا خنجر ہاتھ میں پکڑے لڑکھڑاتے ہوئے ہماری طرف آ رہا تھا۔ میرا خنجر دستے تک پیوست اس کے پیٹ میں رہ گیا تھا۔ میں نے اس پر خنجر سے اتنے وار کیے تھے کہ اس کی آنتیں باہر نکل آئی تھیں لیکن وہ مرا نہیں تھا۔ اس نے خنجر پیٹ سے نکال لیا تھا اور حملہ کرنے کے لیے ہماری طرف آ رہا تھا۔ آنتیں اس کے کٹے ہوئے پیٹ سے نکل کر نیچے گر رہی تھیں۔

جانگی اسے دیکھ کر چیخ اٹھی۔ ہمارے اور دارا کے درمیان صرف تین چار گز کا فاصلہ تھا۔ ٹھاکر مجھے دھکیل کر ایک طرف لے گیا۔ جانگی نے بھی اٹھ کر ایک طرف دوڑ لگانے کی کوشش کی لیکن پتھروں پر اس کا پیر رپٹ گیا اور وہ گر گئی۔

پیٹ کے بل گری اور اس سے پہلے کہ وہ اٹھ کر پوری طرح سنبھل سکتی، دارا اس کے سر پر پہنچ چکا تھا۔

دارا کا چہرہ بہت بھیانک ہو رہا تھا۔ وہ خوفناک عفریت کی طرح جانگی پر حملہ آور ہوا۔ سنبھلنے کی کوشش میں جانگی ایک بار پھر لڑکھڑائی۔ دارا کے ہاتھ میں پکڑا ہوا خنجر اس کے پیٹ میں پیوست ہو گیا۔

جانگی کی چیخ بڑی خوفناک تھی۔ میں اور ٹھاکر اٹھ کر ان کی طرف لپکے۔ دارا جانگی سے لپٹ گیا اور اسے اپنے ساتھ لڑھکتے ہوئے چٹان کے کنارے کی طرف لے گیا۔ میرے دماغ میں دھماکے ہونے لگے۔ میں نے اپنی جگہ سے چھلانگ لگا دی۔

دارا کی ٹانگ میرے ہاتھ میں آ کر نکل گئی۔ دارا جانگی کو اپنے ساتھ لپٹائے کھڈ کے عین کنارے پر پہنچ چکا تھا۔ میں نے ایک بار پھر چھلانگ لگا دی۔ اس مرتبہ دارا کا ایک پیر میرے ہاتھ میں آ گیا لیکن اس کا دوسرا پیر زمین چھوڑ چکا تھا۔ وہ جانگی کو ساتھ لیے چٹان کا کنارہ چھوڑ چکا تھا۔ میں اس کے ساتھ گھسٹ رہا تھا لیکن اچانک ٹھاکر نے میری ٹانگ پکڑ لی۔ میں ایک جھٹکے سے رک گیا۔ دارا کا پیر میرے ہاتھ سے نکل گیا۔

جانگی کی وہ آخری چیخ بڑی خوفناک تھی جو ہمالیہ کی چٹانوں میں دیر تک گونجتی رہی۔

ٹھاکر مجھے پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے کھڈ کے کنارے سے پیچھے لے گیا۔ میں اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کرتا رہا لیکن ٹھاکر نے مجھے بڑی سختی سے گرفت میں لے رکھا تھا۔ اس وقت اگر ٹھاکر میری ٹانگ نہ پکڑ لیتا تو میں بھی ان دونوں کے ساتھ گہری گہرائیوں میں پہنچ چکا ہوتا۔

تقریباً دس منٹ بعد ٹھاکر نے مجھے چھوڑ دیا اور ہم کنارے پر پہنچ کر نیچے جھانکنے لگے۔ تقریباً دو سو فٹ گہرائی میں پتھروں میں جانگی کی شکستہ لاش پڑی ہوئی تھی۔ میرا دماغ گھوم گیا۔ آنکھوں کے سامنے تاریکی چھانے لگی۔ میں اپنی ٹانگوں پر کھڑے کھڑے لہرایا تو ٹھاکر بڑی تیزی سے مجھے گھسیٹتے ہوئے پیچھے لے گیا۔

میری ٹانگیں بے جان ہو گئی تھیں۔ آنکھوں کے سامنے تاریکی ہوتی جا رہی تھی اور پھر مجھے کچھ ہوش نہیں رہا۔ میں تاریکی کی بانہوں میں جھول گیا تھا۔

○☆○

جب مجھے ہوش آیا تو اس آدھے گھنٹے بعد بحال ہوئے تھے۔

دارا واقعی شیطان تھا۔ عفریت ـــــ جس نے مرتے ہوئے بھی ایک انسان کی جان لے لی تھی۔ وہ خوفناک منظر بار بار میری آنکھوں کے سامنے گھوم رہا تھا۔ میں جانگی کو نہیں بچا سکا تھا۔ میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ ٹھاکر نے مجھے اپنے سینے سے لپٹا لیا اور مجھے دلاسا دینے لگا۔ وہ خود بھی رو رہا تھا۔

میرا اور جانگی کا ساتھ کئی سال رہا تھا۔ تھائی کی طرح اس نے بھی میری خاطر اپنا سب کچھ لٹا دیا تھا اور بالآخر جان بھی دے دی تھی۔

ہم تقریباً دو گھنٹے تک ان پہاڑوں میں نیچے اترنے کا راستہ تلاش کرتے رہے لیکن چٹانیں بالکل عمودی تھیں۔ دور دور تک کہیں ایسی کوئی جگہ نظر نہیں آئی جہاں سے نیچے اترنے کی کوشش کی جا سکتی۔ ایک جگہ پر میں نے اترنے کی کوشش کی تھی مگر ٹھاکر نے مجھے روک دیا تھا۔ کسی بھی طرف سے نیچے اترنے کی کوشش کرنا خودکشی کے مترادف تھا۔

ہم پھر اسی جگہ پر آ گئے اور میں کنارے پر جھک کر نیچے جھانکنے لگا۔ دو سو فٹ نیچے پتھروں پر جانگی کی لاش تو نظر آ رہی تھی۔ اسے کپڑوں سے شناخت کیا جا سکتا تھا لیکن دارا کی لاش کہیں دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ وہ بھی کسی پتھر کی آڑ میں یا جھاڑیوں میں پڑی ہو گی۔

میں دیر تک جانگی کی لاش کو دیکھتا رہا۔ اس نے میرے لیے جان دے دی تھی لیکن میں اس کے لیے کچھ نہیں کر سکا تھا۔ اپنے آپ کو اس قابل نہیں پا رہا تھا کہ اس کی آخری رسومات انجام دے سکوں۔

اچانک ہی بارش شروع ہو گئی۔ ٹھاکر نے مجھے سہارا دے کر اٹھا لیا۔ میں نے آخری مرتبہ جانگی کی لاش کی طرف دیکھا اور ٹھاکر کے ساتھ ڈھلان اترنے لگا۔

جب ہم ڈھلان کے اختتام پر پتھر کی سیڑھیوں پر پہنچے تو بارش تیز ہو چکی تھی۔ ہم مندر کی طرف دوڑنے لگے۔ نیو کی لاش میدان میں پڑی تھی۔ بارش کے پانی کے ساتھ اس کا خون میدان میں دور تک بہہ رہا تھا۔

مندر میں دو اور لاشیں ہماری منتظر تھیں۔ پنڈت پرگھیا راج کے سینے میں اب بھی ترشول پیوست تھا۔ اس کے قریب ہی چترا پریتم کی لاش پڑی ہوئی تھی۔ اس نے اپنی بیٹی اور شوہر کا انتقام لے لیا تھا اور خود بھی اس پاپی سنسار سے بہت دور چلی گئی تھی۔

باہر بارش بہت تیز ہو گئی تھی۔ بارش کے شور میں اچانک ایک اور آواز سن کر میں چونک گیا۔ میں نے ٹھاکر کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں الجھن تیر رہی تھی۔ اس

نے بھی وہ آواز سن لی تھی جس نے مجھے چونکایا تھا۔

بارش کے شور میں یہ اندازہ لگانا دشوار تھا کہ سسکیوں کی وہ آواز کس طرف سے آرہی تھی اور پھر اچانک ہی میرے دماغ میں جھماکا سا ہوا۔

مجھے وہ خوب صورت لڑکی یاد آگئی جسے ہم نے دارا وغیرہ کے ساتھ اس مندر میں دیکھا تھا۔ میں نے ایک بار پھر ٹھاکر کی طرف دیکھا۔ ٹھاکر چند لمحے میری طرف دیکھتا رہا پھر اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے اونچی آواز میں بولا۔

"اے! کہاں ہو تم؟ سامنے آجاؤ۔ ہم تمہیں کچھ نہیں کہیں گے۔"

ٹھاکر کچھ دیر متجسس نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھتا رہا پھر دیوار کے قریب اس چبوترے کی طرف بڑھنے لگا جس پر مورتی کا ٹوٹا ہوا پتھر پڑا ہوا تھا۔ ٹھاکر گھوم کر اس چبوترے کی دوسری طرف چلا گیا۔ وہ جھک کر میری نگاہوں سے اوجھل ہوگیا اور جب واپس آیا تو وہ لڑکی اس کے ساتھ تھی۔ ٹھاکر نے اس کا ایک بازو پکڑ رکھا تھا۔

وہ بے حد حسین لڑکی تھی لیکن خوف سے اس کا چہرہ مرجھا گیا تھا۔ آنکھیں سرخ ہورہی تھیں۔ جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ دیر سے رو رہی تھی۔ ہم نے مندر کے اندر داخل ہونے کے تھوڑی دیر بعد اسے بالکونی میں دارا کے ساتھ دیکھا تھا اور پھر یہ ان کے ساتھ نیچے بھی آئی تھی اور جب لڑائی شروع ہوئی تھی تو میں نے اسے نظرانداز کردیا تھا اور وہ بھی شاید ڈر کر اس چبوترے کے پیچھے چھپ گئی تھی اور آخر وقت تک نظر نہیں آئی تھی۔

ہمارے جانے کے بعد اس نے شاید یہ لاشیں دیکھی تھیں اور خوف زدہ ہو کر پھر چبوترے کے پیچھے بیٹھ کر رونے لگی تھی۔ اگر اس کی سسکیاں سنائی نہ دیتیں تو شاید اب بھی ہمیں اس کا خیال نہ آتا۔

وہ سردی اور خوف سے ہولے ہولے کانپ رہی تھی۔ ٹھاکر اسے لے کر ستون کی دوسری طرف بیٹھ گیا تاکہ لاشوں پر اس کی نظر نہ پڑ سکے۔ میں بھی ان کے قریب پہنچ گیا۔ ٹھاکر اسے تسلیاں دے رہا تھا کہ ہم سے اسے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ہم اسے کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد وہ لڑکی اپنی ہیجانی کیفیت پر قابو پاسکی تھی۔ ہم نے اسے وہیں ستون کے قریب بیٹھے چھوڑ دیا اور چترا پر تم کی لاش اٹھا کر ایک کمرے میں فرش پر ڈال دی اور دروازہ بند کردیا۔ یہاں نہ تو لکڑیاں تھیں اور نہ ہمارے پاس ماچس کہ اس کی چتا تیار کرکے آخری رسم ادا کی جاسکتی۔ ہم نے اس کی لاش کمرے میں ڈال دی تھی تاکہ جانوروں کی خوراک بننے سے بچی رہے۔

ہم اس لڑکی کو لے کر مندر سے باہر آگئے۔ بارش ابھی بھی ہورہی تھی۔ ہم دروازے کی محراب میں کھڑے ہوگئے۔ اس لڑکی کو سردی لگ رہی تھی۔ وہ دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔

ٹھاکر برستی ہوئی بارش کو دیکھ رہا تھا اور میں اس لڑکی سے باتیں کرنے لگا۔ اس نے بتایا کہ اوپر کی دو منزلوں پر وہ قیام کرتے ہیں اور وہ لوگ پہلی منزل کے دو کمروں میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ ان لوگوں نے ہمیں ایک کمرے کی کھڑکی سے دیکھ لیا تھا اور ہمارا سامنا کرنے کے لیے تیار ہوگئے تھے۔

میرے اندازے کے مطابق اس وقت تین بج رہے تھے۔ مزید آدھے گھنٹے بعد بارش بند ہوگئی۔ ہم نے گھوڑوں کا انتظار کیا اور بالآخر واپسی کے لیے روانہ ہوگئے۔

ہم میدان سے گزر کر اس راستے کی طرف جارہے تھے جہاں سے آئے تھے لیکن لڑکی نے ہمیں اس طرف جانے سے روک دیا۔

"ہم لوگ اس طرف سے آئے تھے۔ یہ بہت آسان راستہ ہے۔" اس نے ایک طرف اشارہ کیا۔

میں نے راستے کے بارے میں اس سے ایک دو سوال کیے اور پھر اسے اشارہ کرتے ہوئے ہم اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگے۔ یہ راستہ کافی کشادہ تھا۔ کئی جگہوں پر اگرچہ نشیب اور خطرناک موڑ تھے لیکن ہمیں زیادہ دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ ایک دو مقامات پر ہمیں چٹانوں پر بھی چڑھنا پڑا تھا۔ یہ راستہ اگرچہ طویل بھی تھا لیکن مجموعی طور پر یہ اس راستے سے کہیں بہتر تھا جہاں سے ہم مندر کی طرف گئے تھے۔ میرا خیال تھا کہ مندر کی طرف جاتے ہوئے ہم غلط راستے پر چل پڑے تھے جس سے نہ صرف ہمیں خاصی دشواریاں پیش آئی تھیں بلکہ وقت بھی بہت لگا تھا۔ یہ راستہ طویل ہونے کے باوجود ہم تین گھنٹے میں پہاڑ کے دامن میں پہنچ گئے تھے۔

دن کا اجالا شام کے اندھیارے کی آغوش میں بہت دور تھا۔ نشیب میں بکھرے ہوئے شہر کی بتیاں جگمگا رہی تھیں۔ آسمان پر اب بھی گہرے بادل تھے اور کسی بھی لمحے مزید بارش ہوسکتی تھی۔

اس لڑکی کا نام دیگاوتی تھا۔ میں راستے میں اس سے باتیں کرتے ہوئے آیا تھا۔

"لگتا ہے تمہارا تعلق کسی اچھے گھرانے سے ہے پھر تم اس شیطان کے ہاتھ کیسے لگ گئیں؟" میں نے پوچھا۔

"میں متھرا کی رہنے والی ہوں۔" دیگاوتی نے جواب دیا "ہم برہمن خاندان سے ہیں۔ میرے پتا جی بھی پنڈت ہیں۔ ان کی بہت مانی جاتی ہے۔ لوگ ان کا بہت احترام کرتے ہیں۔ مجھے بھی دھرم سے بہت لگاؤ تھا۔ میں بھی گوپی بن کر دھرم کی سیوا کرنا چاہتی تھی۔ پتا جی نے میری حوصلہ افزائی کی اور میں مندر ہی میں رہنے لگی۔

"چند روز پہلے پنڈت سنگھ ہمارے مندر میں آیا۔ اس کی ایک ٹانگ مفلوج ہورہی تھی۔ اس وقت پتا جی بھی مندر ہی میں موجود تھے۔ سیلانی پنڈت اور پجاری مندر میں آتے رہتے تھے لیکن پتا جی نے کبھی ایسے لوگوں کو مندر میں ٹھہرنے کی اجازت نہیں دی تھی۔ ایسے لوگوں کے لیے ایک الگ آشرم بنایا گیا تھا۔ انہیں وہیں بھیج دیا جاتا تھا لیکن پنڈت سنگھ نے نجانے کیسے پتا جی کو رام کرلیا اور اسے مندر میں نہ صرف رہنے کی اجازت دے دی بلکہ اس کی ٹانگ کے علاج کے لیے ڈاکٹر کا بھی بندوبست کردیا۔ یوں تو مندر کے تمام پجاریوں کو حکم دیا گیا تھا کہ پنڈت سنگھ کی دیکھ بھال کریں لیکن دو گوپیوں کو خاص طور پر اس کی سیوا (خدمت) کے لیے مقرر کردیا۔ ان میں ایک ساوتری تھی اور دوسری میں۔

"چند ہی روز میں مجھے پتا چل گیا کہ پتا جی پنڈت سنگھ سے اتنا زیادہ متاثر کیوں تھے۔ پنڈت سنگھ نے پتا جی کو بتایا تھا کہ جے پور میں ایک مسلمان نے ہندو راجکماری کو اپنی رکھیل بنا رکھا تھا۔ اس بات پر جے پور میں ہنگامے بھی ہوئے تھے۔ پتا جی بھی ان ہنگاموں سے واقف تھے۔ پنڈت سنگھ نے پتا جی کو بتایا تھا کہ وہ ایک ایسا منصوبہ بنا رہا ہے کہ آئندہ کسی مسلمان کو کسی ہندو ناری کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی جرأت نہ ہو۔ اس نے پتا جی کو یہ بھی بتایا تھا کہ اس کی ٹانگ اسی مسلمان نے توڑی تھی۔

"پتا جی کو مسلمانوں سے شدید نفرت ہے۔ ان کا بس نہیں چلتا کہ ہندوستان سے مسلمانوں کے وجود کو مٹادیں۔ پنڈت سنگھ ان کا ہم خیال تھا اور یہی وجہ تھی کہ پتا جی اسے بہت پسند کرنے لگے تھے۔

"پنڈت سنگھ کی ٹانگ ٹھیک ہوگئی۔ وہ بیساکھی کے سہارے چلنے لگا۔ ڈاکٹر نے بتایا کہ چند مہینوں بعد وہ بیساکھی کے بغیر بھی چلنے لگے گا۔

"پتا جی پنڈت سنگھ کی شرافت کے بھی قائل ہوگئے تھے۔ میرے اور ساوتری کے علاوہ اور بھی کئی گوپیاں اس کی خدمت پر مامور تھیں لیکن پنڈت سنگھ نے کبھی آنکھ اٹھا کر ان کی طرف نہیں دیکھا تھا۔

"پنڈت سنگھ نے ہردوار آنے کا پروگرام بنایا تو میں بھی تیار ہوگئی۔ گنگوتری یاترا میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش تھی۔ پتا جی نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ انہیں اطمینان تھا کہ میں پنڈت سنگھ کے ساتھ جارہی ہوں جو مجھے پتری کہا کرتا تھا۔ لیکن۔۔۔" دیگاوتی خاموش ہوگئی۔ میں بھی اس کے ساتھ خاموشی سے چلتا رہا۔ تقریباً ایک منٹ بعد اس نے دوبارہ کہنا شروع کیا۔

"لیکن گنگوتری پہنچ کر پنڈت سنگھ کی اصلیت آشکارہ ہوگئی۔ اس رات پنڈت سنگھ اور پنڈت پرگھیا راج تہ خانے والے کمرے میں بیٹھے وارو پی رہے تھے۔ انہوں نے دوسرے سیوکوں (خادموں) کو باہر بھیج دیا تھا۔ میں پنڈت سنگھ کے پیر دبا رہی تھی۔ اس کی یہ سیوا میں پہلے بھی کیا کرتی تھی لیکن اس رات اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے اپنے اوپر گرالیا۔ پہلے تو میں نے کوئی اعتراض یا احتجاج نہیں کیا لیکن جب اس کی دست درازی بڑھنے لگی تو میں نے مزاحمت شروع کردی۔

"میرا خیال تھا کہ پنڈت پرگھیا راج اسے روکے گا لیکن وہ بھی میرے ساتھ دست درازی کرنے لگا تو میں بدحواس ہوگئی۔ میں نے اپنے آپ کو چھڑا کر اس کمرے سے بھاگنے کی کوشش کی مگر پنڈت سنگھ نے مجھے دبوچ لیا۔

"میں چیختی رہی مگر مندر کے تہ خانے میں میری چیخیں سننے والا کون تھا اور اس رات یہ انکشاف بھی ہوا کہ پنڈت سنگھ ہندو نہیں مسلمان تھا۔ اس نے اپنے کسی دشمن سے بچنے کے لیے یہ سوانگ بھرا ہوا تھا اور پرگھیا راج جیسے دھرم کے غدار اس کا ساتھ دیتے رہے تھے۔

"اور پھر مجھے پتا چل گیا کہ پنڈت سنگھ دراصل کون ہے۔ ان کی باتوں سے پتا چلا کہ اس کا دشمن بھی ہردوار پہنچ گیا ہے اور پھر ایک رات وہ ایک آدمی کو پکڑ لائے جس سے کچھ پوچھنے کے لیے بے پناہ تشدد کیا گیا اور جب وہ ختم ہوگیا تو اس کی لاش مندر سے دور پھنکوا دی۔

"اگلے روز ان کے دو آدمی مارے گئے۔ انہیں جلا کر بھسم کردیا گیا تھا۔ پنڈت سنگھ بری طرح خوف زدہ ہوگیا اور پھر پنڈت پرگھیا راج ہی اسے یہاں لے کر آیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ یہاں ان کا سراغ نہیں لگایا جاسکے گا۔ چند روز بعد پنڈت سنگھ کا دشمن بھی مایوس ہو کر ہردوار سے چلا جائے گا تو وہ گنگوتری واپس آجائیں گے لیکن شاید ان کی موت ہی انہیں گھیر کر اس ویران مندر میں لے آئی تھی۔" وہ خاموش ہو کر گہرے گہرے سانس لینے لگی۔

ہم باتیں کرتے ہوئے شہر کے نواح میں پہنچ گئے۔ ہماری حالت ایسی نہیں تھی کہ بازار کا رخ کرسکتے۔ اس لیے آبادی سے دور رہ کر چلتے رہے۔ ٹھاکر خاموشی سے ہمارے ساتھ چلتے ہوئے ہماری باتیں سنتا رہا تھا لیکن جب ہم ایک سڑک پر پہنچے تو وہ رک گیا اور ویگاوتی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"اب تم کہاں جانا چاہتی ہو؟"

"میری سمجھ میں نہیں آرہا کہاں جاؤں۔" ویگاوتی نے جواب دیا "میں اس مندر میں نہیں جانا چاہتی جہاں دھرم کی سیوا کی آڑ میں میری عزت لوٹی گئی تھی۔ سب کچھ چھن جانے کے بعد میں اپنے گھر بھی نہیں جانا چاہتی۔ کیا منہ دکھاؤں گی اپنوں کو۔"

"ٹھیک ہے۔ ہمارے ساتھ چلو۔ جے پور۔" ٹھاکر نے کہا۔

ویگاوتی نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور کچھ کہنے کے بجائے خاموشی سے ہمارے ساتھ چلتی رہی۔ اس کے دل میں یقیناً اندیشے اور وسوسے ہوں گے لیکن کانچ میں روپ متی اور بلا کو دیکھ کر اس کے چہرے پر طمانیت سی آگئی۔

روپ متی اور بلا کو جب چترا اور جانکی کے بارے میں پتا چلا تو وہ دونوں مجھ سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ وہ میرے اور جانکی کے لگاؤ کے بارے میں جانتی تھیں۔ میرے ضبط کے بندھن بھی ٹوٹ گئے اور میں بھی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

میری وہ رات بڑی اذیت میں گزری۔ میں نے اگرچہ اپنے ماں باپ کے قتل کا بدلہ لے لیا تھا لیکن اس کے لیے مجھے کتنا طویل فاصلہ طے کرنا پڑا تھا یہ کچھ میں ہی جانتا تھا۔ کتنی لاشوں پر سے گزرنا پڑا تھا۔ خون کی کتنی ندیاں پار کی تھیں میں نے یہاں تک پہنچنے کے لیے۔ میں نے اپنا سب کچھ کھو دیا تھا۔ مجھے بڑے اچھے دوست اور ہمدرد ملے تھے۔ وہ بھی ایک ایک کرکے مجھ سے چھنتے گئے۔ جانکی کو مجھ سے کتنا لگاؤ تھا۔ وہ ہمیشہ میرے ساتھ رہی تھی۔ اس نے کبھی بھی مجھے اکیلے باہر نہیں جانے دیا تھا اور اب مجھے اکیلا چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے چلی گئی تھی۔

رات بھر میرا ذہن انہی خیالات میں الجھا رہا۔ اس رات کسی نے کھانا بھی نہیں کھایا۔ کسی کا دل ہی نہیں چاہا تھا۔

صبح چھ بجے روپ متی نے چائے بنالی۔ اس وقت بھی ہم جانکی ہی کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔

رات بھر جاگنے سے میری آنکھوں میں شدید جلن ہورہی تھی۔ میں اس وقت ان لوگوں سے الگ تھلگ بیٹھا ہوا تھا۔ ویگاوتی سب کی باتیں سنتی اور سب کے چہرے دیکھتی رہی تھی۔ اس وقت وہ اٹھ کر میرے قریب آگئی۔

"جانکی کون تھی؟" اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے مدھم لہجے میں پوچھا "اور وہ جو پنڈت پرگھیا راج کے ہاتھوں۔۔۔"

"وہ چترا پریتم تھی۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی "وہ کئی مہینے پہلے اپنے شوہر اور جوان بیٹی کے ساتھ یاترا کے لیے یہاں آئی تھی۔ پنڈت پرگھیا راج اور اس کے دو چیلوں نے اس کی بیٹی کی عزت کو تار تار کردیا۔ باپ نے بچانے کی کوشش کی تو اسے بھی موت کے گھاٹ اتار دیا۔"

"اسی گنگوتری مندر میں؟" ویگاوتی بولی۔

"نہیں۔ اس روز وہ تینوں پہاڑیوں میں ایک مندر کی یاترا کرنے کے لیے گئے تھے۔ بارش شروع ہوگئی اور انہیں رات اسی مندر میں رکنا پڑا۔" میں نے کہا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد اسے چترا پریتم کے ساتھ پیش آنے والے واقعہ کے بارے میں بتانے لگا "اس کے سینے میں انتقام کی آگ بھڑک رہی تھی۔" میں آخر میں کہہ رہا تھا "پنڈت پرگھیا راج کے دو چیلے اس رات اس کے کانچ میں جل کر بھسم ہوگئے تھے اور کل پرگھیا راج اس کے ہاتھوں مارا گیا۔"

"اور جانکی؟" ویگاوتی نے سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا "میرا خیال ہے وہ تمہاری پتنی (بیوی) تھی؟"

"نہیں۔ جانکی میری دوست تھی۔ ہمارا کئی برسوں کا ساتھ تھا۔" میں نے کہا۔

"تم کون ہو؟" وہ میری طرف دیکھنے لگی "پنڈت سنگھ سے تمہاری کیا دشمنی تھی؟"

"وہ میرے ماں باپ کا ہتیارا (قاتل) تھا۔" میں نے جواب دیا "جیسا کہ تم جان چکی ہو' وہ ہندو نہیں مسلمان تھا۔ کئی سال پہلے اس نے سنگاپور میں میرے ماں باپ کو قتل کردیا تھا۔ میں اس وقت بارہ تیرہ سال کا تھا۔ میں کسی طرح بچ گیا۔ میں وارا کے اس جرم کا چشم دید گواہ تھا۔ وہ مجھے بھی قتل کرنا چاہتا تھا اور میں اس سے چھپتا پھر رہا تھا۔ مجھے جس نے بھی پناہ دی اسے اس شیطان نے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ جانکی بھی ان لوگوں میں سے ایک تھی جس نے میری خاطر اپنا سب کچھ لٹا دیا۔

"پہلے میں وارا سے چھپتا رہا تھا اور جب میں زمین پر قدم جمانے کے قابل ہوا تو وارا مجھ سے بچنے کے لیے بھاگتا رہا۔ جانکی نے قدم قدم پر میرا ساتھ دیا اور بالآخر اس نے بھی اپنی جان لٹا دی۔ میں اسے کبھی نہیں بھول سکوں گا۔ کبھی نہیں۔"

میرا گلا رندھ گیا اور آنکھوں میں آنسو آگئے۔ روپ متی بھی اٹھ کر میرے قریب آگئی۔ اس نے مجھے اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا۔

ٹھاکر مجھے اٹھا کر باہر لے گیا۔ ہم دیر تک درختوں کے نیچے بیٹھے رہے۔ تازہ ہوا نے خوشگوار اثر ڈالا تھا۔

اس کے تھوڑی دیر بعد ٹھاکر ناشتے کا سامان لینے کے لیے بازار چلا گیا۔

تین دن گزر گئے۔ میں اس دوران میں کانچ سے باہر نہیں نکلا تھا۔ کہیں جانے کو دل ہی نہیں چاہتا تھا۔ ٹھاکر' روپ متی اور بلا کے دل بھی جیسے بجھ سے گئے تھے۔ وہ بھی زیادہ تر کانچ ہی میں رہے۔ ویگاوتی بھی خاصی متاثر ہوئی تھی۔ وارا اور پنڈت پرگھیا راج کی حقیقت جاننے کے بعد اسے بھی ان جیسے لوگوں سے نفرت ہوگئی تھی۔ وہ تو خود اس تجربے سے گزر چکی تھی۔ ان کی ہوس کا شکار ہوچکی تھی۔ اسے کچھ اور جاننے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ خود لٹ چکی تھی۔ اس طرح اجڑ کر اپنے گھر واپس نہیں جانا چاہتی تھی اسی لیے اس نے ٹھاکر کی پیشکش قبول کرلی اور ہمارے ساتھ جانے کا فیصلہ کرلیا تھا۔

اس سے اگلے روز میں نے بھی اپنے ان دوستوں سے رخصت ہونے کا فیصلہ کرلیا اور اس وقت میری بات سن کر وہ سب ہی چونک گئے تھے۔

"راج کماری روپ متی جی۔" میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "میں تمہارا زر خرید غلام ہوں۔ میں تمہاری کوئی سیوا نہیں کرسکا نہ ہی وہ قیمت ادا کرسکتا ہوں لیکن تمہاری اجازت کے بغیر میں ایسا کوئی قدم نہیں اٹھانا چاہتا جس پر میرا ضمیر مجھے ملامت کرتا رہے اس لیے میری خواہش ہے کہ تم مجھے آزاد کردو۔ زندگی رہی اور قسمت نے ساتھ دیا تو میں اپنی قیمت چکانے کی کوشش کروں گا۔"

"ہمت سنگھ!" روپ متی کے چہرے کا رنگ ایک دم متغیر ہوگیا اور پھر وہ والہانہ انداز میں مجھ سے لپٹ گئی۔ میری پیشانی اور گالوں پر بوسے دیتی رہی پھر میرا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھام کر میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولی "یہ تم کیا کہہ رہے ہو وجہ ان۔ میں نے تمہیں قیمت دے کر خریدا ضرور تھا لیکن تم نے میرے لیے جو کچھ کیا' میں تو خود تمہاری داسی بن گئی ہوں۔ اگر تم میری زندگی میں نہ آتے تو آج شاید میں کسی کوٹھے پر بیٹھی اپنے مقدر کو کوس رہی ہوتی مگر تم نے تو میرے جیون کے راستے بدل دیے۔ مجھے گناہ کی دلدل سے نکال کر اس مقام پر لا کھڑا کیا جس کا میں تصور بھی نہیں کرسکتی۔ تم بہت مہان ہو ہمت سنگھ۔ میں تمہارے احسانوں کا بدلہ کبھی نہیں چکا سکوں گی لیکن۔۔۔ لیکن۔" وہ خاموش ہو کر میری طرف دیکھتی رہی پھر بولی "لیکن یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ کیا تم ہمیں چھوڑ کر جانا چاہتے ہو؟ لیکن یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ ہم تمہیں نہیں جانے دیں گے۔"

"مجھے جانا ہی ہوگا روپ متی جی۔" میں نے کہا۔

"تمہارا مشن پورا ہوگیا ہے۔" روپ متی نے کہا "تم نے قسم کھائی تھی کہ جب تک اپنے ماتا پتا (والدین) کے ہتیاروں (قاتلوں) کو موت کے گھاٹ نہیں اتارو گے' چین سے نہیں بیٹھو گے۔ تمہارے سارے دشمن نرک (جہنم) میں پہنچ چکے ہیں۔ اب تمہارے لیے ایسا کوئی کام نہیں رہا۔ تم نے بہت کشٹ اٹھائے ہیں۔ اب کچھ عرصہ ہمارے ساتھ رہ کر آرام کرو اور پھر کوئی بزنس شروع کردو۔ ٹھاکر اپنا ہوٹل تمہارے حوالے کرنا چاہتا ہے۔"

"نہیں روپ متی۔" میں نے جواب دیا "تم لوگوں کے تو پہلے ہی مجھ پر اتنے احسانات ہیں کہ میں گردن نہیں اٹھا سکتا اور پھر میرا مشن ابھی مکمل نہیں ہوا۔ میرے دل میں ایک کانٹا باقی رہ گیا ہے۔ میں اسے بھی نکال ڈالنا چاہتا ہوں۔"

"کیا مطلب؟" روپ متی نے مجھے گھورا "وارا ہی اصل آدمی تھا جسے تم نے موت کے گھاٹ اتار دیا ہے۔ اب کون سا کانٹا رہ گیا ہے؟"

"وارا تو جیون کی بساط پر ایک مہرا تھا جس کے ہاتھوں میرے ماں باپ قتل ہوگئے۔" میں نے جواب دیا "ان مہروں کو حرکت دینے والا اصل شیطان تو ابھی باقی ہے۔"

"وہ کون ہے؟" روپ متی نے پوچھا۔

"جس نے میرے ماں باپ کو ان کی زمینوں اور گھر سے بے دخل کرکے انہیں زندہ جلا ڈالنے کی کوشش کی تھی اور انہیں اپنا وطن چھوڑنا پڑا تھا۔" میں نے جواب دیا "میں اس وقت چند روز کا تھا۔ میری ماں مجھے سینے سے لپٹائے جان بچانے کے لیے بھاگی پھر رہی تھی۔ انہیں کہیں پناہ نہیں ملتی تھی اور بالآخر انہیں وہ شہر تو کیا وہ ملک ہی چھوڑنا پڑا تھا۔ بہت پرانا حساب ہے جسے میں بے باق کرنا چاہتا ہوں۔"

"دیکھو وجہ ان۔" روپ متی نے میرے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ "وارا نے تمہارے ماتا پتا کی ہتیا کی تھی۔ تم نے اسے ختم کرکے بدلہ چکا دیا۔ میرا خیال ہے اس معاملے کو اب یہیں ختم کردو۔ گڑے مردے اکھاڑنے کا

کوئی فائدہ نہیں۔ تم ہمارے ساتھ جے پور چلو اور سب کچھ بھول کر ایک نئی زندگی شروع کرنے کی کوشش کرو۔"

ٹھاکر بھی مجھے سمجھانے کی کوشش کرتا رہا۔ اس نے مجھے روکنے کے لیے یہ پیشکش بھی کردی کہ ہوٹل کے علاوہ ٹیلے والی حویلی بھی مجھے دینے کو تیار ہے۔

"میں تمہاری مہربانیوں اور محبت کو کبھی نہیں بھول سکوں گا ٹھاکر۔" میں نے کہا "لیکن مجھے مجبور مت کرو۔ مجھے جانا ہی ہوگا۔"

"ٹھیک ہے۔" ٹھاکر نے گہرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا "کہاں جاؤ گے؟"

"فی الحال تو میں رشی کیش جاؤں گا۔ کچھ عرصہ وہاں رہنے کے بعد پنجاب کی طرف نکل جاؤں گا۔" میں نے جواب دیا۔

"ہم تمہیں نہیں روکیں گے۔" ٹھاکر نے کہا "میں جانتا ہوں کہ نہ تو ہوا کے پیروں میں بیڑیاں ڈالی جاسکتی ہیں اور نہ ہی بگولوں کو قید کیا جاسکتا ہے لیکن کم از کم آج کا دن تو ہمارے پاس رک جاؤ۔ کل ہم تمہیں نہیں روکیں گے۔"

"ٹھیک ہے۔ میں کل روانہ ہوجاؤں گا۔" میں نے جواب دیا۔

اور پھر وہ پورا دن ہم نے کانیج ہی میں گزارا۔ ٹھاکر صرف دوپہر اور رات کا کھانا لینے کے لیے بازار گیا تھا۔ وہ رات بھی ہم نے جاگتے ہوئے گزاری۔ دیگاوتی بھی ہماری باتوں میں پوری طرح دلچسپی لے رہی تھی۔ وہ سب سے خاصی بے تکلف ہوگئی تھی۔ اس کے اطمینان اور بے تکلفی کی وجہ غالباً یہ تھی کہ اس کے دل سے ہر قسم کا خوف نکل گیا تھا۔

بملا میرے ساتھ جڑ کر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے چہرے پر اداسی تھی۔ یوں تو میرے جانے کے فیصلے سے روپ متی اور ٹھاکر بھی اداس تھے لیکن بملا کی کیفیت کچھ اور تھی۔ اس نے ایک مرتبہ کھل کر اپنی محبت کا اظہار بھی کردیا تھا لیکن میں نے ہر مرتبہ اس کے بڑھتے ہوئے قدم روک دیے تھے۔ میں جانتا تھا کہ محبت کے سیلاب کے آگے بند باندھنا ممکن نہیں ہوتا لیکن میں بملا کو ہر وقت یہی سمجھانے کی کوشش کرتا رہا تھا کہ وہ جس راستے پر چلنے کی کوشش کررہی ہے اس کی کوئی منزل نہیں ہے۔ میری باتوں کا بملا پر اثر ہوا تھا یا نہیں؟ میں اس سلسلے میں کچھ نہیں کہہ سکتا تھا لیکن میں جانتا تھا کہ میرے جانے کے بعد وہ پریشان ضرور ہوگی۔

ہم رات بھر جاگتے رہے اور باتیں کرتے رہے۔

صبح ناشتے کے بعد ہم لاری اڈے پر آگئے۔ اس وقت آٹھ بجے تھے۔ رشی کیش کی ایک بس جاچکی تھی اور دوسری نو بجے جانے والی تھی۔ میں نے ٹکٹ لے لیا اور ہم ایک بنچ پر بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ میں نے اپنا بیگ گود میں رکھ لیا تھا۔ ٹھاکر نے مجھے اچھی خاصی رقم دے دی تھی جو کئی روز تک میرے کام آسکتی تھی۔

رشی کیش جانے والے بہت سے مسافر لاری اڈے پر موجود تھے۔ ان میں زیادہ تعداد غیر ملکی سیاحوں کی تھی۔ ان میں مرد بھی تھے اور عورتیں بھی۔

رشی کیش یوگا کا بہت بڑا مرکز تھا۔ دنیا بھر سے لوگ یوگا سیکھنے کے لیے یہاں آتے تھے۔ یوگا صرف ورزش ہی نہیں یہ تو سمندر کی طرح بہت گہرا اور بہت پُراسرار علم تھا اور اس پُراسرار علم کو سیکھنے کی جستجو لوگوں کو دنیا کے دور دراز کونوں سے یہاں کھینچ لاتی تھی۔

بس کی روانگی میں چند منٹ رہ گئے تھے۔ لوگ اپنی اپنی سیٹوں پر بیٹھ رہے تھے۔ میں بھی اپنے دوستوں سے رخصت ہونے لگا۔ ان سب نے بڑی گرم جوشی سے مجھے سینے سے لگا کر بھینچا۔ سب کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں۔ بملا ضبط نہیں کرسکی اور آنسو آنکھوں سے نکل کر اس کے رخساروں پر بہہ نکلے۔

ان سے رخصت ہو کر میں بس میں آگیا۔ میری سیٹ کھڑکی کے ساتھ تھی۔ میرے ساتھ دو غیر ملکی آکر بیٹھ گئے۔ ان میں ایک جوان اور خوب صورت لڑکی تھی اور دوسرا ادھیڑ عمر مرد۔ ان کا تعلق یورپ کے کسی ملک سے تھا۔ بس میں ان کے اور ساتھی بھی تھے جو دوسری سیٹوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔

بس حرکت میں آئی تو میں ٹھاکر وغیرہ کی طرف دیکھ کر ہاتھ ہلانے لگا۔ وہ سب بھی ہاتھ ہلا رہے تھے۔ بس آگے نکل آئی۔ میں اپنی سیٹ پر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ تقریباً پندرہ منٹ بعد بس ہردوار کی شہری حدود سے نکل کر رشی کیش کی طرف جانے والی سڑک پر دوڑنے لگی۔

سڑک کے دونوں طرف پہاڑیاں سبزے سے لدی ہوئی تھیں۔ ڈھلانوں پر رنگ برنگے پھولوں کی گویا چادریں سی بچھی ہوئی تھیں۔ میں نے تھائی لینڈ میں چیانگ رائے اور چیانگ سین کے پہاڑی علاقوں میں بھی سفر کیا تھا۔ اسی طرح سبزے سے ڈھکے ہوئے پہاڑ، مہکتی ہوئی وادیاں اور خنکناتی ہوئی ندیاں لیکن مجھے اعتراف کرنا پڑا کہ ہمالیہ کی ترائیوں میں واقع یہ خطہ اس سے کہیں زیادہ حسین تھا۔

رشی کیش ہردوار سے اگرچہ صرف چوبیس کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے لیکن بل کھاتا ہوا راستہ بہت خطرناک تھا۔ کہیں بلندیاں تھیں، کہیں پستیاں اور کہیں نہایت خطرناک موڑ۔ ڈرائیور کی معمولی سی غفلت بس کے مسافروں کو موت کے منہ میں پہنچا سکتی تھی۔

چوبیس کلومیٹر کا فاصلہ ڈیڑھ گھنٹے میں طے ہوا۔ یہ شہر بھی پہاڑیوں پر بکھرا ہوا تھا۔ جگہ جگہ مندر دکھائی دے رہے تھے۔ پہاڑیوں پر اور ان کے دامن میں بنے ہوئے مکان بہت بھلے لگ رہے تھے۔

رشی کیش کا لاری اڈا زیادہ بڑا نہیں ہے۔ ایک چھوٹا سا میدان اور اس کے اطراف میں بکھری ہوئی چھوٹی چھوٹی عمارتیں۔ زیادہ تر عمارتیں لکڑی کے تختوں سے تعمیر کی گئی تھیں۔

میں بس سے اتر کر ایک ریسٹورنٹ میں بیٹھ گیا۔ چائے پیتے ہوئے میں سوچ رہا تھا کہ سب سے پہلے مجھے گوتم بھوش کو تلاش کرنا ہے۔ یہ وہی یوگی تھا جس کے بارے میں مجھے چترا پرتم نے بتایا تھا۔

آدھے گھنٹے تک میں ریسٹورنٹ میں بیٹھا رہا اور پھر اٹھ کر کاؤنٹر پر پیسے دیتے ہوئے میں نے گوتم بھوش کے بارے میں دریافت کیا تو اس شخص نے کندھے اچکا دیے۔

"یہاں تمہیں قدم قدم پر یوگی ملیں گے۔ کسی ایک شخص کے بارے میں سب لوگ نہیں جانتے۔" اس شخص نے کہا "ویسے میں تمہیں مشورہ دوں گا کہ تم اِدھر اُدھر گھومنے کے بجائے بھوت ناتھ آشرم چلے جاؤ۔ وہاں ویرومل کو پوچھ لینا۔ وہ گائیڈ ہے اور بہت سے یوگیوں کو جانتا ہے۔ ہوسکتا ہے، تمہیں گوتم بدھ کے بارے میں بتادے۔"

"گوتم بدھ نہیں۔ گوتم بھوش۔" میں نے نام کی تصحیح کی۔

"وہی وہی۔" اس شخص نے کہا "یہاں سے نکل کر بائیں طرف چلے جاؤ۔ کسی سے بھی پوچھ لینا، آسانی سے بھوت ناتھ آشرم پہنچ جاؤ گے۔"

میں ریسٹورنٹ سے نکل کر بائیں طرف چل پڑا۔ ہر دوار کے مقابلے میں زیادہ بلندی پر ہونے کی وجہ سے یہاں خنکی بھی زیادہ تھی۔ میں بیگ کندھے پر لٹکائے ایک طرف چلتا رہا۔ اس چھوٹے سے شہر میں مجھے کئی قومیتوں کے لوگ نظر آئے تھے۔ سکھ، مسلمان، ہندو، عیسائی۔ بہت سے غیر ملکی بھی تھے۔ کئی ایسے غیر ملکی بھی نظر آئے تھے جو میری طرح بیگ کندھوں پر لٹکائے کسی نہ کسی جگہ کی تلاش میں اِدھر اُدھر گھوم رہے تھے۔

یوگا کا مرکز ہونے کے علاوہ رشی کیش کو مندروں اور آشرم سراؤں کا شہر کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ یہاں قدم قدم پر مندر تھے اور آشرم تھے۔ لاتعداد چھوٹے چھوٹے رہائشی ہوٹل اور پرائیویٹ گیسٹ ہاؤسز بھی تھے۔ مجھے کئی جگہ ہوٹلوں اور گیسٹ ہاؤسز کے ایجنٹوں نے روکا تھا لیکن رہائش کے لیے کسی ٹھکانے کا بندوبست کرنے سے پہلے میں یوگی گوتم بھوش کو تلاش کرلینا چاہتا تھا۔

بھوت ناتھ آشرم تلاش کرنے میں مجھے زیادہ دشواری پیش نہیں آئی۔ ایک پہاڑی کے دامن میں پتھروں اور لکڑی کے تختوں کی دو منزلہ عمارت خاصی بڑی تھی۔ نیچے چار فٹ تک پتھروں کی دیوار ہی تھی اور اوپر سارا کام لکڑی کا تھا۔ اس کے پہلو میں ایک مندر بھی تھا۔ بھوت ناتھ دراصل اس مندر ہی کا نام تھا اور یہ آشرم بھی اس کے نام سے منسوب کردیا گیا تھا۔

آشرم کے چھوٹے سے دفتر میں تین چار آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ چوکی کے سامنے بیٹھا ہوا باریک مونچھوں والا شخص اس آشرم کا منشی تھا۔ میں نے ویرومل کے بارے میں دریافت کیا تو اس نے باہر کی طرف اشارہ کردیا۔

باہر آشرم کے سامنے تقریباً پندرہ گز کے فاصلے پر ایک ڈھابا سا بنا ہوا تھا۔ یہ لکڑی کا ایک بڑا سا کیبن تھا جو لکڑی ہی کے ستونوں پر زمین سے تقریباً تین فٹ اوپر تھا۔ اس کے اندر دکان دار بیٹھا ہوا تھا اور باہر ایک آدمی کھڑا اس سے باتیں کرتے ہوئے بیڑی کے کش لگا رہا تھا۔

وہ ویرومل تھا جو فوراً ہی میری طرف متوجہ ہوگیا۔ ویرومل گائیڈ تھا لیکن اس کے پاس لائسنس نہیں تھا اور وہ گھوم پھر کر اپنے گاہک تلاش کرتا تھا۔ مجھے بھی وہ ایسا سیاح سمجھا تھا جسے اس کی خدمات درکار تھیں لیکن جب میں نے اس سے یوگی گوتم بھوش کے بارے میں دریافت کیا تو اس کے چہرے پر مایوسی چھاگئی۔

"وہ تو تین دن پہلے دھرم شالا جاچکا ہے۔ اگر اس کے ڈیرے پر جانا چاہو تو میں تمہیں وہاں پہنچا سکتا ہوں۔ پانچ روپے دینے پڑیں گے۔" ویرومل نے کہا۔

ویرومل سے زیادہ مایوسی تو مجھے ہوئی تھی لیکن بہرحال، میں نے اس کے ساتھ جانے کی ہامی بھرلی اور جیب سے پانچ روپے کا ایک سکہ نکال کر اس کے ہاتھ میں تھمادیا۔

گوتم بھوش کا ڈیرا وہاں سے خاصا دور تھا۔ یہ بھی لکڑی کے تختوں سے بنا ہوا ایک کیبن تھا۔ ویرومل راستے میں مجھے مندروں اور دوسری چیزوں کے بارے میں بتاتا رہا۔ اس

طرح اس نے میری معلومات میں اضافہ کرکے پانچ روپے وصول کرنے کا حق بھی ادا کردیا تھا۔

اس کیبن میں دو آدمیوں سے ملاقات ہوئی۔ ان میں ایک ہندو تھا اور دوسرا بدھ بھکشو۔ میں دیر تک بھکشو سے باتیں کرتا رہا۔ اس نے بتایا کہ گوتم بھوش دھرم شالا جاچکا ہے اور اس کا واپس آنے کا کوئی ارادہ نہیں۔ اس نے مجھے یہ پیش کش بھی کی تھی کہ میں چاہوں تو یوگا سیکھنے کے لیے اس کی شاگردی اختیار کرسکتا ہوں۔

"ٹھیک ہے۔ اگر ضرورت محسوس کی تو میں دوبارہ تمہارے پاس آجاؤں گا۔"

میں شہر کی طرف واپس آگیا۔ لاری اڈے پر پہنچ کر دھرم شالا کی بس کے بارے میں معلوم کیا تو پتا چلا کہ یہاں سے کوئی بس سیدھی دھرم شالا نہیں جاتی۔ پہلے مجھے شملہ جانا پڑے گا۔ رات وہاں گزارنے کے بعد اگلے روز صبح دھرم شالا کی بس ملے گی۔

مجبوری تھی۔ مجھے کم از کم یہ رات تو رشی کیش میں گزارنی تھی۔ میں یہ بھی سوچ رہا تھا کہ اگر یہاں کوئی ماہر یوگی مل جائے تو چند روز یہیں رہ جاؤں گا۔

یہاں یوگیوں کے کئی سینٹرز تھے۔ میں مختلف جگہوں پر گھومتا رہا۔ کئی سینٹروں پر یوگا کی مشق کے کئی دلچسپ مناظر بھی دیکھے۔ ایک ہندو یوگی آہنی کیلوں کے بستر پر دراز تھا۔ ایک یوگی کو ایک ٹانگ پر کھڑے دیکھا جس کے بارے میں بتایا گیا کہ وہ صبح چھ بجے سے ایک ٹانگ پر کھڑا ہے اور شام چھ بجے تک اسی طرح کھڑا رہے گا۔ ایک اور یوگی کو سر کے بل کھڑے دیکھا۔ ان کے علاوہ مختلف یوگی مختلف آسنوں میں نظر آئے۔

میں نے ایک ریسٹورنٹ میں دوپہر کا کھانا کھایا اور اس کے بعد ایک بار پھر کسی یوگی کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ ایک جگہ میں ایک بوڑھے ہندو یوگی کو دیکھ کر رک گیا۔ وہ خاصا بوڑھا تھا۔ اس کے بدن پر ایک مختصر سے لنگوٹ کے علاوہ لباس نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ وہ مختلف شعبدے دکھا رہا تھا۔ میں دلچسپی سے اسے دیکھتا رہا اور جب وہ اپنی شعبدے بازی سے فارغ ہوا تو میں اس کے قریب زمین پر بیٹھ کر اس سے باتیں کرنے لگا۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد میں وہاں سے رخصت ہوگیا۔ اس وقت شام ہورہی تھی۔ برقی روشنیاں جگمگا اٹھی تھیں۔ میں ایک ریسٹورنٹ میں بیٹھ گیا اور کھانا کھاتے ہوئے یہ سوچتا رہا کہ دو چار روز یہاں رہ لینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

کھانا کھانے کے بعد میں کسی گیسٹ ہاؤس کی تلاش میں چل پڑا۔ آشرموں، ہوٹلوں اور گیسٹ ہاؤسز کی یہاں کمی نہیں تھی۔ ریسٹورنٹ سے نکل کر میں ابھی چند قدم ہی چلا تھا کہ کسی نے پیچھے سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ میں ٹھٹک کر رک گیا اور پھر جیسے ہی پیچھے مڑا، اچھل پڑا۔

وہ سونیا تھی!

سونیا کو یہاں دیکھ کر مجھے واقعی حیرت ہورہی تھی۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس دور دراز خطے میں کسی جانکار سے ملاقات ہوسکتی ہے اور جانکار بھی وہ جو میرے قریب بلکہ بہت قریب رہ چکا ہو۔

سونیا کے چہرے کے تاثرات بھی کچھ عجیب سے تھے۔ اسے بھی یقیناً یہاں مجھ سے ملاقات کی توقع نہیں تھی۔

سونیا سے میری آخری ملاقات تقریباً تین مہینے پہلے جے پور میں ہوئی تھی۔ میں نے جانکی کو اس کے بارے میں بتایا تو تھا لیکن ان دونوں کا آپس میں سامنا نہیں ہوا تھا۔ ان دنوں بلونت سنگھ، رامو پدمعاش اور اس کے گرگوں سے ہماری ٹھنی ہوئی تھی۔ ہم اگرچہ ٹھاکر بھانوت سنگھ کے ساتھ رہ رہے تھے اور اپنے آپ کو محفوظ سمجھتے تھے لیکن جب رامو، بلونت سنگھ اور وارا جیسے کینے دشمنوں سے مقابلہ چل رہا ہو تو اپنے آپ کو مکمل طور پر محفوظ نہیں سمجھا جاسکتا۔ میں ماضی کے تجربات نہیں بھولا تھا۔ وارا نے ہمیشہ چھپ کر وار کرنے کی کوشش کی تھی اور جے پور میں بھی اسی سوچ کے پیش نظر میں نے ٹھاکر کی حویلی کے علاوہ کسی اور محفوظ ٹھکانے کا بندوبست کرنے کا بھی فیصلہ کیا تھا تاکہ کسی ہنگامہ صورت حال میں وہاں پناہ لے سکیں اور اس مقصد کے لیے میں نے سونیا کو ایک خطیر رقم بھی دی تھی تاکہ وہ کسی مکان کا بندوبست کرسکے لیکن پھر حالات نے ایسا پلٹا کھایا کہ سونیا اس کے بعد ملاقات ہی نہ ہوسکی۔

ہم بلونت سنگھ اور وارا کے تعاقب میں سارسکا چلے گئے۔ جہاں چوہدری ڈاکو کے آدمی بلا کو اٹھا کرلے گئے۔ کئی روز اس مہم میں لگ گئے۔ ڈاکو بلا کے ساتھ کئی اور سیاحوں کو بھی اٹھا کر جنگل میں لے گئے تھے۔ پولیس ان بے گناہوں کو ڈاکوؤں کے چنگل سے چھڑانے میں بالکل ناکام رہی تھی اور بالآخر میں اکیلا جنگل میں گھس گیا تھا اور ایک زبردست معرکے کے بعد میں نے نہ صرف بلا اور دوسرے لوگوں کو چھڑالیا بلکہ خطرناک ڈاکوؤں کے اس گروہ کا بھی خاتمہ ہوگیا۔ گنگولی چوہدری میرے ہاتھوں مارا گیا۔

ڈاکوؤں کے اس گروہ نے سیکڑوں مربع میل کے علاقے میں تباہی پھیلا رکھی تھی۔ کوئی بستی محفوظ نہیں تھی۔ لوگ خوف و ہراس میں زندگی گزار رہے تھے لیکن میرے ہاتھوں اس گروہ کے خاتمے سے لوگوں کو خوف و دہشت سے نجات مل گئی۔

ہم بلونت اور وارا کی تلاش میں سارسکا گئے تھے لیکن وہاں ہماری اپنی الجھنیں بڑھتی رہیں۔ جنگل سے بلا کی رہائی اور چوہدری کے گروہ سے نمٹنے کے بعد روپ متی اور ٹھاکر ایک حادثے کا شکار ہوگئے۔ ٹھاکر کو زیادہ چوٹیں نہیں آئی تھیں لیکن روپ متی کی جان کے لالے پڑگئے۔ اس کی زندگی بچانے کے لیے ہم نے کیا کچھ نہیں کیا تھا۔

اسی دوران میں ہمیں پتا چلا کہ بلونت اور وارا سل سرتھ کے قریب پہاڑیوں کی طرف چلے گئے ہیں جہاں کالی کے مندر میں انسانی جانوں کی بھینٹ دی جاتی ہے۔ روپ متی کی حالت سنبھل گئی تھی۔ میں، جانکی اور ٹھاکر، وارا کے تعاقب میں کالی کے مندر کی طرف چلے گئے۔ وہاں ایک معرکے میں بلونت مارا گیا اور وارا جانکی کو زخمی کرکے فرار ہوگیا۔ اس کے ساتھ ہی ایک اور دلچسپ واقعہ یہ پیش آیا کہ پولیس کا ایک نہایت ذہنی دار اور فرض شناس (میری نظروں میں) آفیسر کالی کے مندر سے کروڑوں روپے کا مال لوٹ کر فرار ہوگیا۔

سارسکا سے واپس آکر جے پور میں ہماری کچھ اور مصروفیات رہیں۔ اس دوران میں، میں نے کئی مرتبہ سونیا سے ملنا چاہا تھا لیکن ہر مرتبہ کوئی نہ کوئی مسئلہ آڑے آتا رہا اور پھر پنڈت سوبھراج سے ملاقات ہوگئی جس نے بڑھنے کے بجائے میری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھا دیا اور پھر میں اور سوبھراج وارا کی تلاش میں ہردوار آگئے۔

ہردوار میں جو کچھ بھی ہوا وہ آپ جان چکے ہیں اس لیے میں مزید تفصیل میں جانے کی کوشش نہیں کروں گا۔ وارا کو جہنم رسید کرنے کے بعد بلا، روپ متی اور ٹھاکر جیسے دوستوں سے رخصت ہو کر میں رشی کیش چلا آیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ یہاں کچھ عرصہ یوگی گوتم بھوش کے پاس رہ کر کچھ علم حاصل کرنے کی کوشش کروں گا اور اس کے بعد پنجاب سے ہوتا ہوا سرحد پار کرکے پاکستان پہنچ جاؤں گا جہاں لاہور میں چوہدری نوازش علی سے اپنے والدین کا پرانا حساب چکانا تھا۔ فساد کی اصل جڑ تو چوہدری نوازش علی ہی تھا جس کی وجہ سے میرے والدین کو اپنا وطن چھوڑنا پڑا تھا۔

مجھے یہ جان کر بڑی مایوسی ہوئی تھی کہ یوگی گوتم بھوش یہاں سے جاچکا ہے اور اب سونیا کو اپنے سامنے دیکھ کر میری مایوسی حیرت میں بدل چکی تھی بلکہ سونیا کو یہاں دیکھ کر مجھے شدید حیرت ہورہی تھی۔

"ارے! تم یہاں کیا جھک مار رہی ہو۔" میں نے اسے اوپر سے نیچے تک دیکھتے ہوئے کہا۔ موسم میں خنکی ہونے کے باوجود وہ اسکرٹ اور بلاؤز پہنے ہوئے تھی۔

"یہی سوال میں تم سے کرسکتی ہوں۔" سونیا یہ کہتے ہوئے والہانہ انداز میں مجھ سے لپٹ گئی اور میرے گالوں اور پیشانی پر چٹاچٹ بوسے دینے لگی۔ قریب سے گزرتے ہوئے لوگ مسکراتی ہوئی نظروں سے ہماری طرف دیکھ رہے تھے لیکن کسی کے لیے اعتراض کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ وہاں سربراہ بوس وکنار کو معیوب نہیں سمجھا جاتا تھا۔

"تم یہاں کیا کررہے ہو اور جانکی کہاں ہے؟" اس نے مجھ سے الگ ہو کر کہا اور متجسس نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔

جانکی کے نام پر میرے دل پر گھونسا سا لگا۔ سونیا نے میرے چہرے سے میری کیفیت کو بھانپ لیا۔

"کیا بات ہے۔ جانکی کا نام سن کر تم خاموش کیوں ہوگئے۔ وہ ٹھیک تو ہے نا؟" وہ بولی۔

"جانکی مجھے چھوڑ کر جاچکی ہے۔ دور... بہت دور جہاں سے واپسی ممکن نہیں ہوتی۔" میرے لہجے میں بھی افسردگی نمایاں تھی۔

"اوہ... کیا ہوا اسے؟" سونیا بھی ایک دم افسردہ ہوگئی۔

"آؤ۔ کہیں بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔" میں نے جواب دیا اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

ہم اسی ریسٹورنٹ میں آگئے جہاں سے کچھ دیر پہلے میں کھانا کھا کر نکلا تھا۔ میں نے کافی منگوائی اور کافی کی چسکیوں کے دوران میں اسے بیتے ہوئے واقعات اور جانکی کے بارے میں بتاتا رہا۔ سونیا سے بھی جانکی کا طویل ساتھ رہا تھا۔ جانکی کی موت کا سن کر وہ بھی رنجیدہ ہوگئی۔

"تمہیں یہاں دیکھ کر مجھے واقعی حیرت ہورہی ہے۔" میں نے موضوع بدلتے ہوئے کہا "تم یہاں کیا کررہی ہو۔ کسی کے ساتھ آئی ہو یا...."

"اپنی باس کے ساتھ آئی ہوں۔" سونیا نے جواب دیا "وہ بہت عرصے سے بیمار ہے۔ علاج کروانے کے باوجود کوئی افاقہ نہیں ہوا۔ کسی نے بتایا کہ یوگا کی ورزشوں سے یہ بیماریاں رفتہ رفتہ دور ہوسکتی ہیں۔ وہ کچھ عرصے تک تو جے پور ہی میں یوگا کی ابتدائی ایکسرسائز کرتی رہی۔ اس مقصد کے لیے اس نے ایک ہندو یوگی کی خدمات بھی حاصل کر رکھی

تھیں پھر اس یوگی نے مشورہ دیا کہ وہ رشی کیش چلی جائے۔ یہاں کی آب و ہوا سے بھی اس پر اچھا اثر پڑے گا۔ اس ہندو یوگی نے یہاں اپنے گرو کا پتا بتا دیا تھا۔ ہم تقریباً ایک ہفتے سے یہاں ہیں اور تم۔" اس نے خاموش ہو کر سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا "میرا خیال ہے تم کچھ دیر پہلے ہی یہاں آئے ہو۔ شاید آخری بس سے جو پانچ بجے کے قریب یہاں پہنچتی ہے۔"

"میں صبح گیارہ بجے کے قریب یہاں آیا تھا۔" میں نے جواب دیا "یہاں رہائش کا بندوبست کرنے سے پہلے میں ایک یوگی کو تلاش کرنا چاہتا تھا جس کے بارے میں پتا چلا ہے کہ وہ دھرم شالا جا چکا ہے۔ اب مجھے رہائش کے لیے کسی جگہ کی تلاش تھی۔"

"اب تمہیں کوئی جگہ تلاش نہیں کرنی پڑے گی۔" سونیا نے مسکراتے ہوئے کہا "میں اپنی باس کے ساتھ ایک کاٹیج میں ٹھہری ہوئی ہوں۔ کاٹیج کافی کشادہ ہے اور میرا خیال ہے تمہارے وہاں آجانے سے شوبھا دیوی کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ میں نے اس سے تمہارا غائبانہ تعارف کرا رکھا ہے۔ وہ تم سے مل کر بہت خوش ہوگی۔"

"تو پھر چلو۔ صبح سے ان اونچے نیچے راستوں پر پھرتے ہوئے تھک گیا ہوں اور کچھ آرام کرنا چاہتا ہوں۔" میں نے اپنا بیگ اٹھاتے ہوئے کہا۔

ہم ریسٹورنٹ سے باہر آگئے۔ سونیا ضرورت کی کچھ چیزیں لینے کے لیے آئی تھی کہ مجھ سے ملاقات ہوگئی۔ ریسٹورنٹ سے نکلنے کے بعد اس نے ایک ڈھابے سے مطلوبہ چیزیں خریدیں اور میں اس کے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔

وہ کاٹیج وہاں سے تقریباً نصف میل کے فاصلے پر ایک چھوٹی سی پہاڑی پر واقع تھا۔ اس پہاڑی پر بھی چیڑ اور چنار کے درختوں کی بہتات تھی۔ بل کھاتے ہوئے راستے کے دونوں طرف رنگ برنگے پھولوں سے لدی ہوئی خود رو جھاڑیاں تھیں۔ وہ کاٹیج تقریباً دو سو فٹ کی بلندی پر تھا جبکہ وہ راستہ کاٹیج کے قریب سے گزرتے ہوئے مزید اوپر چلا گیا تھا۔ پہاڑی پر اوپر بھی تھوڑے تھوڑے فاصلے پر اور بھی کاٹیج اور ہٹ تھے۔ درختوں میں کہیں کہیں ان کاٹیجز میں جلتی ہوئی روشنیاں اچھی لگ رہی تھیں۔

سونیا والا کاٹیج ایک کھلی جگہ پر تھا۔ آس پاس کی جگہ یا تو درختوں سے محروم تھی یا درخت کاٹ دیے گئے تھے۔ تعمیر کے حوالے سے یہ کاٹیج بھی دوسروں سے مختلف نہیں تھا۔ چار فٹ تک پتھروں کی دیواریں اور اس سے اوپر لکڑی کے تختے۔

اس کاٹیج کے تین کمرے تھے۔ ایک نشست گاہ اور دو بیڈ رومز۔ نشست گاہ میں ایک کافی ٹیبل، ایک عام سا صوفہ سیٹ اور تین چار کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ سونیا مجھے وہاں بٹھا کر دائیں طرف والے کمرے میں چلی گئی۔ اس کی واپسی تین چار منٹ بعد ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ اس کی باس شوبھا بھی تھی۔

جے پور میں سونیا سے ملاقات ہوئی تھی تو اس نے بتایا تھا کہ جس ہوٹل میں وہ کام کرتی ہے اس کی مالکن ایک بیوہ عورت ہے۔ بیوگی کے حوالے سے میرے ذہن میں ایک بوڑھی عورت کا تصور ابھرا تھا لیکن اسے دیکھ کر میں چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔

اس کی عمر پینتیس اور چالیس کے درمیان رہی ہوگی۔ دراز قامت، چھریرا بدن، چہرے کے نقوش بڑے دلکش تھے لیکن پژمردگی اس کے حسن کو متاثر کر رہی تھی۔ اس نے سفید ساڑی پہن رکھی تھی۔ جو اس کے بیوہ ہونے کی نشان دہی کر رہی تھی۔

"ہیلو۔" اس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر پرنام (سلام) کیا "بیٹھو نا۔ کھڑے کیوں ہو۔" میں صوفے پر بیٹھ گیا تو وہ بھی میرے ساتھ صوفے پر بیٹھ کر بات جاری رکھتے ہوئے بولی "سونیا نے مجھے جے پور میں تمہارے بارے میں بتایا تھا۔ تمہارے ساتھ واقعی بہت انیائے (ظلم) ہوا ہے۔ میں نے سونیا سے کہا تھا کہ تمہیں میرے پاس لے کر آئے لیکن تم نے دوبارہ سونیا سے بھی رابطہ نہیں کیا جس سے وہ بہت پریشان رہی تھی۔"

"کچھ ایسی الجھنیں پیدا ہوگئی تھیں جس کی وجہ سے میں سونیا سے بھی رابطہ نہیں کر سکا تھا۔" میں نے کہا "میں ان دنوں جے پور سے باہر ہی رہا اور واپس آیا تو چند روز بعد مجھے ہردوار آنا پڑا۔ آج صبح یہاں آیا ہوں۔"

"ابھی سونیا بتا رہی تھی کہ تم رہائش کے لیے کوئی گیسٹ ہاؤس تلاش کر رہے تھے۔" شوبھا نے کہا "گیسٹ ہاؤس جانے کی کیا ضرورت ہے۔ یہاں بڑی گنجائش ہے۔ تم یہاں رہ سکتے ہو۔ تمہاری وجہ سے ہمیں بھی ڈھارس رہے گی۔ ہمیں اکیلی سمجھ کر۔"

"کوئی مسئلہ؟" میں نے اس کے خاموش ہونے پر سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"پرسوں رات۔" شوبھا کے بجائے سونیا نے جواب دیا "پرسوں رات کوئی ہمارا دروازہ کھولنے کی کوشش کر رہا تھا۔

میں نے کھڑکی سے شور مچایا تو وہ بھاگ گیا۔"

"چلیے جب تک میں یہاں ہوں ایسی کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔" میں نے کہا "لیکن میں بھی زیادہ دنوں تک یہاں نہیں رہ سکوں گا۔ مجھے دراصل ایک یوگی کی تلاش ہے جو دھرم شالا جا چکا ہے۔ ہو سکتا ہے مجھے اس کے پیچھے جانا پڑے۔"

گوتم بھوش کے تذکرے کے ساتھ ہی ہماری گفتگو کا موضوع بھی بدل گیا۔ شوبھا بے خوابی کا شکار تھی۔ اسے ہائی بلڈ پریشر تھا۔ سانس کی تکلیف بھی تھی اور دل کی مریضہ بھی تھی۔ وہ اگرچہ ان تکالیف کا ایلوپیتھک علاج بھی کروا رہی تھی لیکن کسی ہمدرد نے اسے مشورہ دیا تھا کہ ان بیماریوں کے علاج کے لیے کسی یوگی کی خدمات حاصل کرے۔ پہلے اس نے جے پور ہی میں ایک یوگی کی خدمات حاصل کیں اور پھر یہاں آگئی اور تقریباً ایک ہفتے سے یوگی دھیراج کی ہدایات کے مطابق شیو آسن پر عمل کر رہی تھی۔ خون کے دباؤ کو نارمل رکھنے کے لیے یوگا میں اس سے بہتر کوئی ورزش نہیں۔ شوبھا صبح شام پندرہ بیس منٹ کے لیے یہ ورزش کر رہی تھی۔ اس کا ایک فائدہ ضرور ہوا تھا کہ اسے رات کو سونے کے لیے خواب آور گولیاں کھانے کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ اب وہ رات کو گولی کھائے بغیر سکون کی میٹھی نیند سوتی تھی۔

آج کے مشینی دور میں انسان افراتفری کا شکار ہے۔ جذباتی خلفشار نے اسے ادھ موا کر رکھا ہے۔ کسی کے پاس اتنا وقت نہیں کہ اپنی صحت برقرار رکھنے کے لیے وقت طلب ورزشیں کر سکے لیکن یوگا کی ورزشوں پر کم سے کم وقت میں اور زیادہ آسانی سے عمل کر کے اپنے آپ کو چاق و چوبند اور تندرست و توانا رکھا جا سکتا ہے۔

یوگا کی یہ ورزشیں نئی نہیں، ہزاروں سال سے ان پر عمل ہو رہا ہے اور یوگا صرف ورزشوں کا نام ہی نہیں، ایک فن اور سمندر کی طرح گہرا اور پُراسرار علم ہے اور یہ پُراسرار علم ہزارہا سال سے سادھوؤں، یوگیوں اور راہبوں سے بڑے پُراسرار طریقے سے نسل در نسل منتقل ہوتا رہا ہے۔ اس پُراسرار علم کو عام لوگوں سے ہمیشہ خفیہ رکھا گیا۔ صرف خواص ہی اس سے فائدہ اٹھاتے رہے اور یہ علم عام آدمی کی دسترس سے دور رہا۔

یوگا کی مشقیں آج سے نہیں، ہزارہا سال سے لاکھوں انسانوں کو روشن ضمیری کی دولت سے مالا مال اور سپر نارمل صلاحیتوں سے لیس کر چکی ہیں۔ سانس کی مشقیں یوگا کی مشقوں میں بنیادی حیثیت رکھتی ہیں۔ جس دم کی مشق انسانی قوت میں غیر معمولی حرکت پیدا کرتی ہے۔ ایک پُراسرار قوت ریڑھ کی ہڈی کی نچلی تہ میں سانپ کی طرح کنڈلی مارے خوابیدہ حالت میں ہوتی ہے۔ سانس کی مشقوں سے یہ قوت بیدار ہو کر دماغ کی طرف سفر شروع کرتی ہے۔ یہ بڑا کٹھن مرحلہ ہوتا ہے۔ کبھی کبھی یہ قوت آزاد ہو کر انسان کے دماغی اور اعصابی نظام کو درہم برہم کر دیتی ہے اس لیے ضروری ہے کہ یہ مشقیں کسی ماہر استاد کی نگرانی ہی میں کی جائیں۔

ہو سکتا ہے، کچھ لوگ اس سے اختلاف بھی کریں لیکن اس حقیقت سے تو بہرحال انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا تو اسے بے پناہ قوتیں بھی عطا فرمائیں۔ بعض قوتیں تو ایسی ہیں جن سے ہر کوئی واقف ہے لیکن بعض قوتوں کو انسان سے پوشیدہ رکھا اور انسان کو یہ قدرت بھی دی کہ وہ مختلف ریاضتوں سے اپنے اندر پوشیدہ ان قوتوں کو اجاگر کر سکے۔

یوگا کے ماہرین نے ان ہی خوابیدہ قوتوں کو بیدار کرنے کے لیے تجربات کیے اور انسان کے اندر بے شمار پُراسرار پوشیدہ قوتوں کا سراغ لگایا اور کئی قسم کی ریاضتیں ایجاد کیں جن کے ذریعے جسم کے ہر ہر عضو کو کنٹرول کیا اور یہاں تک کمال حاصل کر لیا کہ جب دل چاہا، دل کی حرکت بند کر کے ایک معینہ مدت کے لیے مصنوعی موت طاری کر لی۔

چھٹی حس کے بعد انسان میں اور بھی کئی حسیں موجود ہیں جو بعض اوقات خود بخود اور بعض اوقات مشقوں سے بیدار کی جا سکتی ہیں اور پھر فطرت کے خلاف بھی کام کیا جا سکتا ہے۔ اگرچہ خلافِ فطرت اس کام کے بعد ازاں بڑے بھیانک نتائج سامنے آتے ہیں۔

شوبھا حیرت سے میری باتیں سن رہی تھی۔ میں خاموش ہوا تو وہ سونیا کی طرف دیکھتے ہوئے جھٹ سے بول پڑی۔

"سونیا۔ یوگی مہاراج کی کل سے چھٹی کر دو۔ ہم پرسوں جے پور واپس جا رہے ہیں۔ تمہارا یہ دوست بھی ہمارے ساتھ جائے گا۔"

"یوگی مہاراج کی چھٹی کیوں کر دی جائے دیدی؟" سونیا حیرت سے بولی۔

"اب مجھے کسی گرو کی ضرورت نہیں۔" شوبھا نے کہا "میں نے تمہارے دوست وجدان کو گرو مان لیا ہے۔ مجھے وشواس ہو گیا ہے کہ یہ بھی بہت دھارمک یوگی ہے اور یہ میرا علاج کر سکتا ہے۔ اب مجھے کسی اور یوگی کی ضرورت نہیں۔"

"نہیں شوبھا جی۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا "میں یوگا کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا۔ میں تو خود کچھ سیکھنے کے لیے

یہاں آیا ہوں۔ آپ کو تو ماہر یوگی کی ضرورت ہے۔ آپ یہاں اپنی مشقیں جاری رکھیے۔ اس وقت آپ جو مشقیں کررہی ہیں وہ بالکل ٹھیک ہیں۔ آپ کو بتدریج دوسری مشقیں بھی کرائی جائیں گی اور آپ ٹھیک ہوجائیں گی۔"

"تو ٹھیک ہے۔ جب تک میں یہاں ہوں تم ہمارے ہی پاس رہو گے۔" شوبھا نے کہا۔

اور پھر باتوں ہی باتوں میں یہ انکشاف ہوا کہ دھیراج نامی جس یوگی سے شوبھا راہنمائی حاصل کررہی تھی وہ پانچ سو روپے ہفتہ معاوضہ لے رہا تھا اور ایک مہینے کا معاوضہ ایڈوانس لے چکا تھا۔ وہ صرف دو وقت مشق کرواتا تھا۔ پندرہ بیس منٹ صبح اور پندرہ بیس منٹ شام کو۔

ہم دیر تک باتیں کرتے رہے۔ میں نے شوبھا سے اس کے شوہر کے بارے میں پوچھا تو اس کے چہرے پر افسردگی سی چھاگئی اور پھر کچھ دیر کی خاموشی کے بعد وہ بتانے لگی کہ اس کا شوہر ڈاکٹر وجے شرما ایک حادثے میں جاں بحق ہوگیا تھا۔

یہ پانچ سال پہلے کی بات تھی۔ شوہر کی موت کے بعد اس کے رشتے داروں نے ہمدردی کرا دھیکا سے اس کی جائداد ہتھیانے کی کوشش کی تھی۔ اسے بڑے سبز باغ دکھائے تھے لیکن وہ کسی کی باتوں میں نہیں آئی۔ اس کے جیٹھ نے زبردستی اس بلڈنگ پر قبضہ کرنے کی کوشش بھی کی تھی۔ شوبھا کو بلڈنگ سے نکال دیا گیا تھا لیکن شوبھا نے حوصلہ نہیں ہارا۔ اس کے پاس شوہر کا وصیت نامہ موجود تھا جس میں شوبھا کو اس کی ساری منقولہ و غیر منقولہ جائداد کا وارث قرار دیا گیا تھا۔ شوبھا نے اپنے جیٹھ کے خلاف مقدمہ دائر کردیا اور شوہر کا وصیت نامہ بھی عدالت میں پیش کیا۔ اس طرح شوبھا کو اپنے شوہر کی جائداد مل گئی۔

یہ بلڈنگ کرائے پر اٹھی ہوئی تھی جسے شوبھا نے خالی کروالیا اور گراؤنڈ فلور پر ایک معیاری کافی ہاؤس قائم کرکے اوپر کے حصے پر رہائش اختیار کرلی۔ اسے کچھ مخلص لوگ بھی مل گئے تھے جو نہ صرف اخلاقی طور پر بلکہ کاروبار میں بھی اس کی مدد کررہے تھے۔ اس طرح شوبھا نے اپنے آپ کو سنبھال لیا تھا اور وہ بڑی ثابت قدمی سے زندگی کی سختیوں کا مقابلہ کررہی تھی۔

شوبھا کی کہانی ان ہزاروں عورتوں سے مختلف نہیں تھی جو تنہا رہ جانے کے بعد ظلم و ستم کا شکار ہوجاتی ہیں۔ بعض ہمت ہار کر حالات کے سامنے سر جھکا دیتی ہیں اور بعض سینہ تان کر میدان میں اتر آتی ہیں۔ شوبھا کا شمار بھی ایسی ہی عورتوں میں ہوتا تھا جو زندگی کے آخری لمحوں تک بھی شکست تسلیم نہیں کرتیں۔

شوبھا گیارہ بجے کے قریب سونے کے لیے اپنے کمرے میں چلی گئی۔ میں اور سونیا کچھ دیر بیٹھک ہی میں بیٹھے رہے پھر سونیا اٹھ کر کچن میں چلی گئی اور کافی بنا کر لے آئی۔ اس نے دونوں کپ میز پر رکھ دیے اور دوسرے کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔

"تم کافی پیو۔ میں کپڑے تبدیل کرلوں۔"

سونیا کمرے میں چلی گئی۔ میں کافی کی چسکیاں لینے لگا۔ اس نے کافی واقعی بہت خوش ذائقہ بنائی تھی۔ کوئی چیز گرنے کی آواز سن کر میں چونک گیا۔ میرا خیال تھا' یہ آواز کچن کی طرف سے آئی تھی لیکن وہاں کچھ نہیں تھا۔ میری نظریں کمرے کی طرف اٹھ گئیں اور اس کے ساتھ ہی میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔

کمرے کا دروازہ چند انچ کے قریب کھلا ہوا تھا اور سونیا عین سامنے کمرے میں کھڑی اپنے جسم پر سے لباس اتار رہی تھی۔ میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا اور دماغ میں سنسناہٹ سی ہونے لگی۔

سونیا کا دھیان دوسری طرف تھا۔ میں سمجھ گیا کہ اس نے مجھے متوجہ کرنے کے لیے کمرے میں جان بوجھ کر کوئی چیز گرائی تھی اور غافلانہ انداز اختیار کرلیا تھا۔

میں اٹھ کر دوسری کرسی پر بیٹھ گیا تاکہ میری نظریں دروازے کی طرف نہ اٹھ سکیں۔ مجھے اپنی کیفیت پر قابو پانے میں کئی سیکنڈ لگ گئے۔ میں نے آنکھیں بند کرلیں اور گہرے گہرے سانس لینے لگا۔ وہ منظر میرے ذہن میں گھوم گیا جب گولڈن ٹرائی اینگل کے ایک غار میں اسی سونیا نے مجھے پچھاڑ دیا تھا اور اب یہ وہی سونیا تھی جو ایک بار پھر میرے راستے میں آگئی تھی اور میں سوچ رہا تھا کہ کہیں میں نے سونیا کے ساتھ یہاں آکر غلطی تو نہیں کی!

"ارے! سوگئے کیا؟"

سونیا کی آواز سن کر میں نے آنکھیں کھول دیں۔ اسے دیکھ کر میں نے ایک بار پھر آنکھیں بند کرلیں لیکن کب تک ایسا کرسکتا تھا۔ مجھے دوبارہ آنکھیں کھولنا پڑیں۔

سونیا میرے سامنے کھڑی تھی۔ اس نے شب خوابی کا باریک لباس پہن رکھا تھا جس سے اس کا بدن جھلک رہا تھا۔ میں نے سر کو ایک دو جھٹکے دیے اور فاسد خیالات کو ذہن سے نکالنے کی کوشش کرنے لگا۔

"بہت تھکے ہوئے لگ رہے ہو۔" وہ میرے سامنے اس صوفے پر بیٹھ گئی جہاں کچھ دیر پہلے میں بیٹھا ہوا تھا۔

"ہاں۔ آج سارا دن اونچے نیچے راستوں پر گھومتا رہا ہوں۔" میں نے اپنا کافی کا کپ اٹھاتے ہوئے جواب دیا۔

سونیا نے بھی اپنا کپ اٹھالیا اور کافی کی چسکیاں لیتے ہوئے کن انکھیوں سے میری طرف دیکھتی رہی۔

باتیں کرتے ہوئے رات کا ایک بج گیا۔ میں سونا چاہتا تھا لیکن سونیا کو شاید نیند نہیں آرہی تھی۔ وہ مجھے بھی جگائے رکھنا چاہتی تھی۔

"تمہیں نیند آرہی ہے۔" بالآخر وہ اٹھتے ہوئے بولی "تم اندر میرے بیڈ پر سوجاؤ۔ میں یہاں صوفے پر لیٹ جاؤں گی۔"

"میں صوفے پر ٹھیک ہوں۔ تم اپنے بستر پر آرام سے سوجاؤ۔" میں نے جواب دیا۔

میں چند لمحے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر اٹھ کر کمرے میں آگیا۔ سونیا بھی میرے ساتھ ہی آئی تھی۔ میں ایک جگہ رک کر کمرے کا جائزہ لینے لگا۔ ایک دیوار پر بھارتی فلمی اداکاراؤں کی نیم عریاں تصویریں چسپاں تھیں جو کسی میگزین سے کاٹی گئی تھیں۔ سونیا ایسی بد ذوق نہیں تھی کہ کمرے کو ایسی چیزوں سے سجاتی۔ ہوسکتا ہے ان سے پہلے جو کرائے دار یہاں رہائش پذیر رہے ہوں یہ ان کا ذوق ہو۔

دوسری دیوار پر لگی ہوئی کھونٹی پر سونیا کے تین چار جوڑے کپڑے ٹنگے ہوئے تھے۔ اس کے ساتھ ہی باتھ روم کا دروازہ تھا۔ میں نے دروازہ کھول کر اندر جھانکا۔ باتھ روم زیادہ بڑا نہیں تھا۔

سونیا بستر کی چادر درست کررہی تھی۔ بیڈ پر دو کمبل تھے جنہیں اٹھا کر اس نے کرسی پر رکھ دیا تھا۔ چادر درست کرکے اس نے ایک کمبل بیڈ پر رکھ دیا اور دوسرا اٹھا کر دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔

"رات کے آخری پہر یہاں اچھی خاصی سردی ہوجاتی ہے۔ اگر تم ایک کمبل میں سردی محسوس کرو تو۔"

"مجھے سردی نہیں لگے گی۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی "تم چاہو تو یہ دوسرا کمبل بھی لے جاسکتی ہو۔"

سونیا مجھے گھورتے ہوئے کمرے سے نکل گئی۔ میں نے کمرے کی بتی بجھادی اور بستر پر لیٹ کر آنکھیں بند کرلیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ دن بھر گھومنے سے میں بہت تھک گیا تھا لیکن نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ میں ایک بار پھر ماضی میں پہنچ گیا تھا۔ ممی' ڈیڈی' چاچا پرتاب سنگھ' مہاراج' تھائی' جانکی اور کئی چہرے میری نظروں کے سامنے گھومتے چلے گئے۔ رنگولی اور سردار تھالوب۔ انہوں نے ہمارا کتنا ساتھ دیا تھا۔ سونیا بھی چیانگ رائے سے ہماری پارٹی میں شامل ہوئی تھی۔ اس کی ماں پولیس میں تھی لیکن دوسروں کی طرح وہ بھی کرپشن کی دلدل میں دھنسی ہوئی تھی۔ اس کی موت کے بعد ہی سونیا پر یہ انکشاف ہوا تھا کہ اس کی ماں کرپٹ تھی اور شہنشاہ کے خلاف ایک گھناؤنی سازش میں شریک تھی۔ ماں کے گناہوں کا پراپچت (کفارہ) کرنے کے لیے وہ ہمارے ساتھ مل گئی تھی اور گولڈن ٹرائی اینگل میں بھی ہمارے ساتھ گئی تھی جہاں قدم قدم پر موت سے ہمارا سامنا ہوتا رہا تھا۔

گولڈن ٹرائی اینگل سے نکل کر جب ہم برما پہنچے تو سونیا' بوما اور ہوفا کے ساتھ ہندوستان کی طرف نکل گئی تھی اور میں جانکی کے ساتھ شاؤلن ٹیمپل کے راستے پر چل پڑا تھا۔ میرا خیال تھا کہ سونیا سے دوبارہ کبھی ملاقات نہیں ہوگی لیکن وہ جے پور میں مل گئی اور اب جے پور سے سیکڑوں میل دور ہمالیہ کی گود میں بھی وہ اچانک اور بالکل غیر متوقع طور پر مجھے مل گئی تھی۔ گولڈن ٹرائی اینگل میں جو کچھ ہوا وہ مجھے یاد تھا اور مجھے اب تک اس پر ندامت تھی لیکن سونیا کو اس کا احساس نہیں تھا۔ اس نے جے پور میں بھی کوشش کی تھی اور یہاں بھی گولڈن ٹرائی اینگل والے واقعے کو دہرانے کی کوشش میں تھی لیکن میں اسے دوبارہ ایسا کوئی موقع نہیں دینا چاہتا تھا جس سے مجھے اپنے آپ سے شرمندگی محسوس ہونے لگے۔

یہی سب کچھ سوچتے ہوئے میں نیند کی آغوش میں پہنچ گیا۔

○☆○

آہٹ سے میری آنکھ کھل گئی۔

صبح کے سات بج رہے تھے۔ سونیا میرے لیے چائے کا کپ لیے کھڑی تھی۔ اس وقت خاصی سردی تھی اور سونیا نے شال اوڑھ رکھی تھی۔ مجھے چائے دے کر وہ کمرے سے چلی گئی۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد میں کمرے سے باہر نکلا۔ رات کو شوبھا نے بتایا تھا کہ یوگی دھیراج صبح سات بجے آتا ہے لیکن آج وہ ابھی تک نہیں آیا تھا اور پھر آٹھ بج گئے۔

میں سونیا کے ساتھ شوبھا کے کمرے میں آگیا۔ وہ یوگی کے انتظار میں بیٹھی ہوئی تھی تاکہ اپنی مشق شروع کرسکے لیکن وہ ابھی تک نہیں آیا تھا۔

"آپ شیو آسن کی مشق کررہی ہیں نا شوبھا جی۔" میں نے کہا۔ شوبھا نے اثبات میں سرہلا دیا تو میں نے کہا "آپ مشق آپ کو میں کروا دیتا ہوں۔ میں یوگا کے بارے میں اتنا علم تو رکھتا ہوں کہ کسی کو یہ بے ضرر مشق کرواسکوں۔ آپ یہاں لیٹ جائیے۔" میں نے فرش پر بچھی ہوئی دری کی طرف اشارہ کیا۔ شوبھا کرسی سے اٹھ کر دری پر لیٹ گئی اور میں اسے ہدایات دینے لگا "آپ کو یہ آسن بنانے میں دشواری پیش نہیں آنی چاہیے۔ بالکل سیدھی لیٹیے۔ آپ کی ایڑیاں ملی ہوئی ہوں۔ ہتھیلیاں پھیلا کر ہاتھوں کا رخ اوپر کی طرف رکھیے اور اب آنکھیں بند کرلیں۔" شوبھا ایک ہفتے سے یہ پریکٹس کررہی تھی۔ اسے میری ہدایات پر عمل کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آرہی تھی۔ میں مسلسل بول رہا تھا "اب آپ آنکھیں بند کرلیں اور اپنی تمام تر توجہ سیدھے پیر کے انگوٹھے پر مرکوز رکھیں اور یہ تصور کریں کہ آپ کے پیر کے انگوٹھے کا تناؤ ختم ہورہا ہے۔" میں تقریباً ایک منٹ تک خاموش رہا اور پھر ہدایات دینے لگا "آپ کے انگوٹھے میں تناؤ نہیں رہا۔ اب آپ انگوٹھے کے ساتھ والی انگلی پر توجہ مرکوز کریں اور یہ تصور کریں کہ اس انگلی کا تناؤ ختم ہورہا ہے۔ بالکل ٹھیک۔۔۔ اب باری باری دوسری انگلیوں کے بارے میں بھی یہی تصور کیجئے۔

"اب دوسرے پیر کی طرف آجائیے اور انگوٹھے سے شروع کرکے اس ترتیب سے اس تصوراتی عمل کو دہرائیے۔ اب ایک بار پھر سیدھے پیر کی طرف آجائیں اور پنڈلی پر توجہ مرکوز رکھیں اور اب دوسری پنڈلی کا تناؤ بھی اسی طرح ختم کردیجئے۔

"اب سیدھی ٹانگ کولھے تک اور پھر الٹی ٹانگ کولھے تک۔۔۔ اس کے بعد پیٹ اور سینے پر توجہ مرکوز کریں اور یہ تصور کرتی رہیے کہ تناؤ ختم ہورہا ہے۔ ٹھیک۔۔۔ اب ہاتھوں اور بازوؤں کی باری ہے۔ ان کا طریقہ بھی یہی ہے۔ گردن' چہرے' ناک' کان' آنکھیں اور جسم کے ہر حصے کا تناؤ اس طرح تصور میں ختم کیجئے۔ اب آخر میں دماغ کی طرف آجائیے۔ دماغ کا تناؤ ختم کرتے ہوئے یہ جملے دہراتی رہیے "میرے دماغ پر اب کوئی بوجھ نہیں ہے۔ میرا دماغ بالکل پُرسکون اور آزاد ہے۔ یہ جملے پانچ چھ مرتبہ دہرائیے۔ اور اب دوبارہ یہ عمل سیدھے پیر کے انگوٹھے سے شروع کریں۔ ٹھیک ہے۔ میں یہاں بیٹھا ہوا ہوں۔ آپ یہ عمل جاری رکھیے۔"

میں نے شوبھا کو یہ مشق بیس منٹ تک کرائی اور پھر اسے اٹھادیا۔

"آپ کو کبھی دل کا دورہ تو نہیں پڑا شوبھا جی؟" میں نے پوچھا۔

"ابھی ایسی نوبت نہیں آئی لیکن انجائنا کی تکلیف تو ہے۔" شوبھا نے جواب دیا۔

"ایسی صورت میں بہتر ہوگا کہ شیو آسن کی اس مشق کو آپ اپنی عادت بنالیں۔" میں نے کہا "اسے صبح و شام جاری رکھیے۔ کم سے کم پندرہ منٹ اور زیادہ سے زیادہ تو بے منٹ لیکن اپنے گرو سے مشورہ ضرور کرلیں۔ دل کے مریضوں اور خون کے دباؤ کو نارمل رکھنے کے لیے اس سے بہتر یوگا کی اور کوئی مشق نہیں ہوسکتی۔ اگر اس مشق کو عادت بنالیا جائے تو کبھی دل کا دورہ نہیں پڑسکتا۔"

"تم تو کہتے تھے کہ سیکھنا چاہتے ہو لیکن۔۔۔" شوبھا نے میرے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا "لیکن تم نے تو ایک ماہر یوگی کی طرح مجھے یہ مشق کرائی ہے۔ یوگی مہاراج بھی مجھے یہ مشق ایسے ہی کراتے ہیں۔"

"یہ بہت معمولی اور ابتدائی مشقیں ہیں جو میں نے شاؤلن ٹیمپل میں سیکھی تھیں۔ اصل یوگا تو بہت دور ہے جو میں سیکھنا چاہتا ہوں۔"

"تو کیا یوگا کی بھی کئی قسمیں ہیں؟" شوبھا نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

"بے شک۔" میں نے جواب دیا "ایک تو منتر یوگا ہے جس سے ہمیں یہ پتا چلتا ہے کہ روحانی قوتوں کو بیدار کرنے کے لیے کس قسم کی ریاضتوں یا جاپ کی ضرورت ہوتی ہے۔ راج یوگا سے لاشعور کے دریچے کھولے جاسکتے ہیں اور پُراسرار ذہنی قوتیں بیدار کی جاسکتی ہیں۔ کنڈلینی یوگا سے ہمیں پتا چلتا ہے کہ ریڑھ کی ہڈی کے نچلے حصے میں جو پُراسرار قوت محو خواب ہے اسے کس طرح بیدار کیا جائے۔ یہ وہ پُراسرار قوت ہے جس پر قابو پاکر اور بھی لاتعداد طلسماتی قوتوں کو قبضے میں کیا جاسکتا ہے۔ یہ وہ قوتیں ہیں جن کے ذریعے بڑے بڑے کارنامے انجام دیے جاسکتے ہیں جن کا عام آدمی تصور بھی نہیں کرسکتا۔ ان پُراسرار قوتوں کا غلط استعمال تباہی اور بربادی کا باعث بنتا ہے۔ ہندو پنڈت اور یوگی عام طور پر اس پُراسرار قوت کو تسخیر کرنے کے لیے جاپ کرتے رہتے ہیں لیکن بہت کم لوگ کامیاب ہوپاتے ہیں۔ ہتھ یوگ' یوگا کی وہ قسم ہے جس کے مختلف آسنوں پر عمل کرکے اپنے آپ کو جسمانی طور پر تندرست' صحت مند اور چاق و چوبند رکھا جاسکتا ہے۔ ہتھ یوگ ہی سے نہ صرف مختلف بیماریوں پر قابو پایا جاسکتا ہے بلکہ چہرے پر جھریاں اور جسم پر بڑھاپے کے اثرات کو بھی روکا جاسکتا ہے۔ یہ جو آپ

شیو آسن کی مشق کررہی ہیں ہتھ یوگ ہی کی ایک قسم ہے۔"

ہم ابھی یہ باتیں کررہی رہے تھے کہ یوگی دھیراج بھی آگیا۔ اس نے آتے ہی اپنے تاخیر سے آنے پر شوبھا سے معذرت کی اور جب آسن کی تیاری کے لیے کہا تو شوبھا نے مسکراتے ہوئے بتایا کہ اس وقت کی مشق تو وہ کرچکی ہے۔ یوگی نے چونک کر میری طرف دیکھا اور میں بھی مسکرا دیا۔

اس یوگی کی عمر ساٹھ اور پینسٹھ کے درمیان رہی ہوگی۔ دبلا پتلا جسم، تمام نسیں ابھری ہوئی اور ہڈیاں تک گنی جاسکتی تھیں۔ اس نے صرف دھوتی لنگوٹ کے انداز میں باندھ رکھی تھی۔ اس کی آنکھوں میں سرخی نمایاں تھی۔ میری طرف دیکھتے ہوئے اس کے ہونٹوں پر بھی خفیف سی مسکراہٹ آگئی۔

"اگر میں سمجھنے میں غلطی نہیں کررہا تو تم وہی نوجوان ہو جو گوتم بھوش مہاراج کی تلاش میں یہاں آئے ہو؟" اس نے میرے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

میں اچھل پڑا "آپ کو کیسے پتا چلا؟"

"پریشان مت ہو۔" اس کی مسکراہٹ گہری ہوگئی "کل رات دیروول میرے پاس آیا تھا۔ اس نے مجھے بتایا تھا۔ گوتم بھوش مہاراج میرے گرو ہیں۔"

"اوہ۔" میرے منہ سے گہرا سانس نکل گیا "مگرو تو کل مجھے کسی اور جگہ پر لے گیا تھا جہاں سے پتا چلا کہ گوتم بھوش دھرم شالا جاچکے ہیں۔"

"دیروول بڑا پاپی ہے۔" یوگی دھیراج بدستور مسکرا رہا تھا "آج اگر تم باہر نکلو گے تو وہ انہیں تلاش کرلے گا اور باتیں بناکر تمہاری جیب سے پھر کچھ پیسے نکلوا لے گا۔ اس کا دھندا یہی ہے۔ خیر! تم گوتم بھوش مہاراج سے ہی کیوں ملنا چاہتے ہو۔ یہاں اور بھی سیکڑوں یوگی ہیں۔ جن کے پاس لوگ بہت دور دور سے آتے ہیں۔"

"میں بھی بہت دور سے آیا ہوں۔" میں نے جواب دیا "اس میں شبہ نہیں کہ یہاں بڑے بڑے ماہرِ فن یوگی موجود ہیں لیکن گوتم بھوش۔۔۔"

"میں تم سے بحث نہیں کروں گا۔" اس نے میری بات کاٹ دی "گرو مہاراج دھرم شالا نہیں گئے۔ یہیں ہیں۔ رشی کیش میں۔ تم آج شام ان سے مل سکتے ہو۔"

"کہاں؟" میں نے جلدی سے پوچھا۔

"میں شام کو یہاں آؤں گا تو میرے ساتھ چلنا۔" دھیراج نے کہا اور پھر یوگا کے بارے میں باتیں کرنے لگا۔

یوگی دھیراج کی باتوں سے میں سمجھ گیا کہ اس کے پاس بہت کچھ ہے۔ میں نے بھی اگرچہ شاؤلن ٹیمپل سے بہت کچھ سیکھا تھا لیکن دھیراج کی باتیں سن کر میں اپنے آپ کو طفلِ مکتب سمجھنے لگا اور میں واقعی طفلِ مکتب تھا۔ میں یہاں سے کچھ سیکھنے اور لینے ہی کے لیے تو آیا تھا۔

ہم بہت دیر تک یوگا کے بارے میں باتیں کرتے رہے پھر ہمارا موضوع شعور اور لاشعور کی طرف مڑ گیا۔

"یوگا کی طرح لاشعور بھی ہمارے اندر کی ایک پُراسرار قوت ہے جس کے بارے میں جاننا بہت ضروری ہے۔ کسی بھی علم اور لاشعور کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔ جب ہم یوگا کی بات کرتے ہیں تو ہم لاشعور کو اس سے الگ نہیں کرسکتے۔" یوگی دھیراج کہہ رہا تھا "ہم میں سے کسی نے بھی لاشعور کو دیکھا نہیں ہے لیکن اس کے بے حد طاقت ور ہونے اور ہمہ جہت اثرات کی بنا پر ہم اس کے وجود کو محسوس ضرور کرتے ہیں۔

"ہم میں سے ہر شخص لاشعور کا حامل ہے کہ لاشعور ہمارے نظامِ تنفس، نظامِ ہضم، حرکتِ قلب اور دیگر تمام جسمانی و ذہنی اعمال و افعال پر اَن دیکھی حکومت کرتا ہے۔ یہ ایک ایسا اسٹور روم ہے جہاں ہماری سوئی ہوئی یادوں کا ذخیرہ موجود رہتا ہے۔ ہمارا لاشعور ہی ہماری تمام کامیابیوں اور ناکامیوں کا تعین کرتا ہے۔ یہ ہماری زندگی کو ایک دہشت انگیز خواب میں تبدیل کرکے ہمیں خوف زدہ کرسکتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ یہ زندگی کو ہمارے لیے زیادہ خوشگوار اور فرحت انگیز بناکر ہمیں شاد اور مسرور بھی کرسکتا ہے۔" دھیراج خاموش ہو کر میری طرف دیکھنے لگا۔ میں پوری توجہ سے اس کی باتیں سن رہا تھا۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"لاشعور کی دریافت سے ہمیں معلوم ہوا کہ ہم ہمیشہ اپنی تقدیر کے کامیاب مالک نہیں بن سکتے۔ ایک نادیدہ اور نامعلوم قوت ہمیں اکثر و بیشتر ہدایات دیتی رہتی ہے چنانچہ ہمارے لاشعوری ذہن میں جو کچھ موجود ہے اس کی آگاہی کے ساتھ اس پر مکمل قابو حاصل کرلینا ہمیں زندگی کی مسرتوں سے ہمکنار کرسکتا ہے کیونکہ لاشعور ہماری تخلیقی قوت اور ہمارے تخیل کی بنیاد کا سرچشمہ ہے۔

"تحلیلِ نفسی ایک ایسا علم ہے جس کے ذریعے انسان اپنے ذہن و دماغ کا افہام و ادراک حاصل کرلیتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ ایک ایسا فن بھی ہے جس کی مدد سے کوئی شخص اپنے لاشعوری احساسات سے آگہی حاصل کرتا ہے۔ اس طرح لاشعور میں مقید جذبات آزاد ہوجاتے ہیں اور انسان

ان تمام دکھوں سے نجات حاصل کرلیتا ہے جو اس کے لیے سب سے زیادہ اہم رہے ہوں۔ تحلیلِ نفسی کی تخلیق نے انسان کے لیے یہ امکان پیدا کردیا ہے کہ وہ ان جذبات اور احساسات کی عکاسی کرسکے جو اس کے لیے تکلیف اور دکھ کا بنیادی سبب بنتے ہیں۔ جن کی بنا پر وہ بڑی بڑی غلطیاں کرتا ہے اور اپنے ساتھ دوسروں کے لیے بھی تکلیف دہ مسائل پیدا کرلیتا ہے۔

"لاشعور سے آگہی کا علم انسان کے سخت رویے، جارحانہ پن، خوف اور نقصانات کے دکھ پر قابو پانے میں مدد دیتا ہے اور انسان کی مختلف تحریکات اور توانائیوں کا رخ مثبت امور کی طرف موڑتا ہے۔ یہ علم اس عام اور مشترک ذہنی خلل کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے جو ہر شخص کے دماغ کی سطح کے نیچے موجود ہے۔ اس نظریے نے ثابت کردیا ہے کہ انسانی فطرت تبدیل ہوسکتی ہے اور لاشعور کی آگہی کے ذریعے انسان اپنے آپ کو ماضی کے غلط خوف سے اور ہر طرح کے ڈر سے آزاد کرا سکتا ہے اور ڈر اور خوف ہی وہ چیز ہے جو ہمیں کسی عمل سے دور رکھتی ہے۔" وہ ایک بار پھر خاموش ہوگیا۔

میری نظریں اس کے چہرے پر مرکوز تھیں۔ شوبھا اور سونیا بھی بڑی توجہ سے اس کی باتیں سن رہی تھیں اور میں سوچ رہا تھا کہ شاید میں صحیح جگہ پر پہنچ گیا ہوں۔ مجھے بدھ بھکشو گوتم بھوش کی تلاش تھی اور دھیراج اس کا چیلا تھا اور اس کے پاس بھی بہت کچھ تھا۔

"اب میں ایک بار پھر یوگ کی طرف آتا ہوں۔" اس نے بات جاری رکھتے ہوئے کہنا شروع کیا "اگر ہمیں اپنے لاشعور کے بارے میں جانکاری ہوجائے تو یوگ ہمارے لیے زیادہ مشکل نہیں رہتا۔ یوں تو یوگ کی بہت قسمیں ہیں لیکن سب سے زیادہ اہم ہتھ یوگ اور راج یوگ ہے۔

"ہتھ یوگ کا تعلق انسانی شریر (بدن) سے ہے۔ یعنی یہ کہ اپنے شریر کو کیسے تندرست و توانا رکھا جائے اور اسے بیماریوں سے کیسے بچایا جائے جبکہ راج یوگ کا تعلق براہِ راست دماغ سے ہے۔ یعنی اپنے دماغ کو کیسے کنٹرول کیا جائے۔ ہمارے اندر جو پُراسرار قوتیں خوابیدہ ہیں انہیں کیسے بیدار کیا جائے اور منفی جذبات اور تخریبی رجحانات سے کیسے بچا جائے۔

"یوگ میں یہی دو بڑے مکتبِ ہائے فکر ہیں اور ان میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے۔ ہتھ یوگ کے ماہرین کہتے ہیں کہ راج یوگ اس کی ہمسری نہیں کرسکتا۔ کیونکہ ان کے کہنے کے مطابق انسان کا جسمانی لحاظ سے تندرست ہونا کافی ہے۔ اگر دماغی طور پر سست بھی ہوں تو اس سے زندگی متاثر نہیں ہوگی۔ دوسری طرف راج یوگ کے ماہرین راج یوگ کو فی افضل و برتر سمجھتے ہیں۔ ان کے نظریے کے مطابق اگر کوئی شخص دماغی لحاظ سے نارمل ہے اور اس کی خوابیدہ قوتیں بیدار ہوچکی ہیں تو وہ محض ان قوتوں کے بل بوتے پر اپنے شریر کی دیکھ بھال کرسکتا ہے۔ ذہن بیمار نہیں ہے تو شریر بھی بیمار نہیں ہوسکتا۔ ان ماہرین کے نظریے کے مطابق دماغ تندرست ہو تو شریر پر کوئی بیماری حملہ آور نہیں ہوسکتی۔

پتنجلی (PATANJLI) کو فادر آف یوگا کہا جاتا ہے۔ یہ مہا یوگی تین ہزار سال پہلے چندر گپت کے زمانے میں ہوا تھا اور تاریخ میں پہلی مرتبہ یوگ کو اس کی نگرانی میں ضبطِ تحریر میں لایا گیا تھا۔ منجلی کو بھی ہتھ یوگ سے اختلاف تھا اس لیے اس کی کسی بھی تحریر میں ہتھ یوگ کا ذکر نہیں ملتا۔

"یوگ کے ان دونوں شعبوں کے ماہرین کے اختلافات اپنی جگہ لیکن سیدھی سی بات یہ ہے کہ اگر کوئی انسان دیو جیسی طاقت رکھتا ہے مگر اس کا دماغ خالی ہے تو اسے کامیاب انسان نہیں کہا جاسکتا۔ اس کے برعکس ایک بالکل کمزور و نحیف آدمی، جس کے لیے دو قدم چلنا بھی مشکل ہو، اگر چلتی پھرتی لاش کہا جائے مگر وہ ذہنی طور پر بیدار ہے۔ بے پناہ مخفی قوتوں کا مالک بن چکا ہے لیکن اس شخص کی زندگی بھی کوئی معنی نہیں رکھتی۔

"ہمارے لیے اہم شخص وہ ہے جو جسمانی لحاظ سے تندرست و توانا، صحت مند ہو اور اس کے ساتھ ہی وہ دماغی لحاظ سے بھی چاق و چوبند اور بے پناہ قوتِ ارادی کا مالک ہو۔ اپنے دماغ اور مخفی قوتوں پر اسے پورا کنٹرول حاصل ہو، ہر معاملے کو فہم و فراست اور عقل و دانش سے سلجھاتا ہو۔ جہاں طاقت کی ضرورت ہو وہاں دماغ کی تگرانی میں طاقت کا مظاہرہ بھی کرتا ہو۔ اس کے تمام مظاہر عقل کے دائرے میں رہتے ہوئے بالکل معتدل اور معقول ہوں تو یہ شخص پرہومن SUPER HUMAN کہلانے کا حق دار ہے۔

"ہتھ یوگ اور راج یوگ ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔ تنہا کوئی بھی شاخ کسی انسان کو برتر انسان نہیں بنا سکتی۔ پہلے ہتھ یوگ سے اپنے آپ کو جسمانی طور پر مضبوط اور طاقت ور بنایا جائے اور اس کے بعد راج یوگ پر عمل کرتے ہوئے دماغی صلاحیتوں کو اجاگر کیا جائے۔ ان کی خوابیدہ قوتوں کو بیدار کیا جائے اور ان کے منفی جذبات کا دھارا تعمیری مقاصد کی طرف موڑا جائے۔

"کوئی بھی علم سہل نہیں ہوتا۔ راج یوگ تو بہت گہرا اور بہت ہی پُراسرار علم ہے۔ اس میں مراقبے کا بھی بڑا دخل ہے۔ مراقبہ ایک ایسا عمل ہے جس میں آنکھیں، کان اور منہ بند کرکے تمام تر توجہ اپنے من کی طرف مبذول کردی جاتی ہے۔ ہمارا من کیا ہے؟ "من" کی وضاحت اس طرح کی جاسکتی ہے کہ ہمارے اپنے اندر ایک بے حد وسیع و عریض دنیا قائم ہے جس کی ہم نے کبھی ایک جھلک بھی نہیں دیکھی۔ مختلف مراقبوں اور ریاضتوں اور جاپ سے ہم اس دنیا کی سیر کرتے ہیں۔ اس کے اسرار و رموز سے واقفیت حاصل کرتے ہیں۔ اس پُراسرار جزیرے کی خاک چھانتے ہیں۔ اس کے غاروں اور بھول بھلیوں کو کھنگالتے ہیں اور اگر ہمارے سرپرگرو کا ہاتھ نہ ہو تو ہم بھٹک بھی سکتے ہیں۔

"قدرت نے ہمیں بے شمار قوتوں سے نوازا ہے۔ بے پناہ طاقتیں ہمیں عطا فرمائی ہیں لیکن ہمیں اپنے اندر چھپی ہوئی بے پناہ قوتوں کا علم ہی نہیں ہے کیونکہ ہم نے کبھی ان پر توجہ ہی نہیں دی۔ ہم تو صرف مادی دنیا ہی کو سب کچھ سمجھ بیٹھے ہیں۔ عالی شان محلات، ہرے بھرے باغات، مرغن غذائیں، شوخ و شنگ حسینائیں، راگ رنگ کی محفلیں، ہم نے انہی سب چیزوں کو زندگی کا مقصد بنالیا ہے۔ یہ تو ہم نے کبھی سوچا ہی نہیں کہ ہمارے اندر جو ایک عظیم الشان سلطنت موجود ہے اور جس کے ہم خود بادشاہ ہیں، وہ کیسی ہے؟ اس کے محلات، اس کے باغات کیسے ہیں؟ اس میں کیسی کیسی پُراسرار وادیاں ہیں، کیسی کیسی خوب صورت گھاٹیاں ہیں۔ اس پُراسرار دنیا کے تاریک غاروں میں کیسی کیسی جھلملاتی روشنیاں ہیں اور یہ دنیا کتنی پُراسرار اور رنگین ہے۔ یہ جاننے کی ہم نے کبھی زحمت ہی نہیں کی۔"

یوگی دھیراج ایک بار پھر خاموش ہوگیا۔ اس مرتبہ خاموشی کچھ زیادہ طول کھینچ گئی اور بالآخر اس نے دوبارہ کہنا شروع کیا۔

"یہ سب کچھ جاننے کے لیے محنت کرنی پڑے گی۔ بعض لوگ محنت سے گھبراتے ہیں اور آدھے راستے ہی سے بھاگ جاتے ہیں۔ بات لگن، ہمت اور حوصلے کی ہے۔ ساگر کی موجوں کو دیکھو جو سنگلاخ چٹانوں سے بار بار ٹکراتی اور واپس آجاتی ہیں۔ بظاہر ان کی جدوجہد بے بنیاد نظر آتی ہے مگر ایسا ہرگز نہیں ہے۔ حقیقت میں ان ہی موجوں نے چٹانوں کے اندر پیوست ہو کر انہیں کمزور کیا ہے۔ زندگی میں اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے محنت کی ضرورت ہے اور وہ بھی سچائی، ایمان داری، خلوص اور خود اعتمادی کے ساتھ ہو تو کامیابی ضرور قدم چومے گی۔"

یوگی دھیراج اٹھ کر کھڑا ہوگیا "اب میں چلتا ہوں۔" وہ بولا "میں شام کو آؤں گا۔ تم میرے ساتھ چلو گے۔ میں نے تمہاری باتیں سنی ہیں اور مجھے وشواس (یقین) ہے کہ تم بہت اوپر جاؤ گے۔ ہمالیہ کی چوٹیوں سے بھی اوپر۔"

یوگی دھیراج چلا گیا۔ وہ میرے اندر ایک نئی آگ بھڑکا گیا تھا اور میں چشم تصور سے اپنے آپ کو ہمالیہ کی چوٹیوں سے بھی اوپر اڑتے ہوئے محسوس کررہا تھا۔

میں نے شاؤلن ٹیمپل میں ماسٹر ہینگ پائی سے یوگا پر بھی بہت سیکھا تھا لیکن میری وہ مشقیں جس دم اور صحت کے حوالے سے تھیں۔ کسی پُراسرار شکتی کے حصول کا خیال ذہن میں نہیں تھا۔ اس وقت تو میری تمام تر توجہ مارشل آرٹس پر مرکوز تھی۔ میں اس فن میں مہارت حاصل کرنا چاہتا تھا۔ دوسری چیزیں میرے لیے ضمنی حیثیت رکھتی تھیں۔ ان چیزوں کے بارے میں مجھے اتنا ہی بتایا گیا تھا جتنی مجھے اس وقت ضرورت تھی۔ یوگا کی چند خاص مشقوں کے علاوہ مجھے مراقبہ اور ارتکاز کے بارے میں بھی بتایا گیا تھا اور لاشعور کو اجاگر کرنے کی بھی تھوڑی بہت تربیت دی گئی تھی۔

لیکن اب یوگا کے حوالے سے یوگی دھیراج کی باتیں سن کر میری آتش شوق بھڑک اٹھی تھی اور میں نے اس میں بھی کچھ شدبد... حاصل کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ شدبد... کا لفظ میں نے اس لیے استعمال کیا ہے کہ کوئی علم مکمل طور پر حاصل نہیں کیا جاسکتا۔ کوئی بھی انسان اپنے آپ کو مکمل نہیں کہہ سکتا۔ انسان زندگی بھر بھی اگر سیکھتا رہے وہ نامکمل ہی رہتا ہے۔

کوئی بھی علم سطحی نہیں ہوتا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر علم اتنا گہرا اور اتنا پُراسرار ہوتا ہے کہ طالب علم جیسے جیسے آگے بڑھتا ہے اس پر ایسے ایسے سنسنی خیز انکشافات ہوتے ہیں کہ اس کی عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ بعض اوقات تو ذہن ایسی باتوں کو قبول کرنے سے انکار کردیتا ہے لیکن اس کے لیے حقیقت کو جھٹلانا بھی آسان نہیں ہوتا۔

جب میں نے مارشل آرٹس سیکھنا شروع کیا تو مجھے بتایا گیا تھا کہ انسان کے اندر ایسی پُراسرار قوتیں پوشیدہ ہیں جن پر اگر قابو پالیا جائے تو انسان مافوق الفطرت بن جاتے لیکن ان باطنی قوتوں کا حصول آسان نہیں ہے۔ ان کے لیے بڑی کٹھن ریاضت کرنی پڑتی ہے۔ بہت سے لوگ ایسی کوششیں کرتے ہیں مگر کٹھنائیوں سے گھبرا کر آدھے راستے ہی میں ہمت ہار جاتے ہیں۔ لاکھوں میں ایک ایسا ہوگا جو اپنی منزل پر

پہنچ سکا ہو۔

مارشل آرٹس میں انسان کے اندر پوشیدہ پُراسرار قوتوں میں "چی" کی قوت کا بڑا چرچا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ انسان کے جسم میں ناف کے نیچے پوشیدہ قوت واقعی بہت پُراسرار ہے اور ہر مارشل آرٹسٹ چی کی اس پُراسرار قوت کے حصول کے خواب دیکھتا ہے لیکن اس میں بھی لاکھوں میں ایک آدھ ہی منزل مقصود تک پہنچنے میں کامیاب ہوپاتا ہے۔

میں اپنے آپ کو اس حوالے سے بہت خوش قسمت سمجھتا ہوں کہ میرا شمار بھی دنیا کے چند ایسے لوگوں میں ہوتا ہے جو اپنے اندر چی کی اس پُراسرار قوت کو بیدار کرنے میں کامیاب ہوسکے ہیں۔ میں کوئی شیخی نہیں بگھار رہا بلکہ یہ کہنا چاہتا ہوں کہ کسی بھی مقصد کو حاصل کرنے کے لیے، کسی بھی منزل تک پہنچنے کے لیے بڑی محنت کرنا پڑتی ہے۔ بڑے کٹھن اور دشوار راستوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ اس کے لیے بڑی لگن کی ضرورت ہوتی ہے۔ ثابت قدمی سے آگے بڑھنا پڑتا ہے۔ معمولی سی لڑکھڑاہٹ سارے کیے دھرے پر پانی پھیر دیتی ہے اور منزل پر پہنچنے کا خواب چکنا چور ہوجاتا ہے۔

میں نے بھی چی کی پُراسرار قوت حاصل کرنے کے لیے بڑی کٹھنائیاں برداشت کی ہیں۔ بڑی ریاضت کی ہے۔ میری کامیابی میں میرے ماسٹرز کا بھی بڑا ہاتھ ہے جنہوں نے مجھے سنبھالے رکھا اور میرے پایۂ استقلال میں لغزش نہیں پیدا ہونے دی اور میری لگن بھی تھی جو اس پُرخار راستے پر انتھک کشاں کشاں مجھے آگے لیتی چلی گئی اور بالآخر میں نے اپنے اندر پوشیدہ ہزاروں پراسرار قوتوں میں سے ایک "چی" پر مکمل طور پر قابو پالیا۔ میں اگر چاہتا تو یہ پراسرار قوت حاصل ہوجانے کے بعد اپنے آپ کو سپرمین ثابت کرسکتا تھا۔ اپنے طاقت دولت کے انبار لگا سکتا تھا۔ کسی بھی شخص کو اپنے قدموں پر جھکنے پر مجبور کرسکتا تھا لیکن میرے دل میں کبھی ایسی گندی خواہش نہیں ابھری۔ میرے دل میں کبھی کوئی ایسی خواہش نہیں ہوئی۔ خیالات کبھی پراگندہ نہیں ہوئے۔ میں نے اس پراسرار قوت کو قدرت کی ایک امانت سمجھ کر اپنے سینے میں محفوظ رکھا ہوا ہے۔ میں نے اسے جب بھی استعمال کیا کسی اچھے مقصد کے لیے ہی استعمال کیا اور پراسرار چی ہر مشکل وقت پر میری مدد کو پہنچتی رہی۔

مجھے یاد ہے، شاؤلن ٹیمپل میں جب ایک جمناسٹک کی مشق کررہا تھا تو ایک آدمی نیچے دب کر چیخ رہا تھا۔ بے چارے کے اوپر سے آہنی گارڈر بنانے کی کوشش کررہے تھے مگر وہ وزنی گارڈر اپنی جگہ سے ہل کر نہیں دے رہا تھا اور پھر یکایک میرے اندر یہ تحریک اٹھی کہ مجھے اس شخص کی مدد کرنی چاہیے۔ میں نے آگے بڑھ کر بڑے آرام سے وہ آہنی گارڈر اٹھالیا اور اس کے نیچے دبے ہوئے آدمی کو نکال لیا گیا۔

میرے اندر اتنی طاقت نہیں تھی۔ میں اپنی جسمانی قوت کے مطابق ہی وزن اٹھا سکتا تھا مگر میں نے وہ وزنی آہنی گارڈر ایک ہاتھ سے بڑے آرام سے اٹھالیا تھا جسے کئی آدمی مل کر ہلا بھی نہیں سکے تھے۔

وہ دراصل میرے اندر چی کی وہی پراسرار قوت تھی جو انگڑائی لے کر بیدار ہوئی تھی اور میرے ہاتھوں سے ایک ایسا کام کروا دیا تھا جس کا میں تو کیا دوسرے بھی تصور نہیں کرسکتے تھے۔

وہ پہلا موقع تھا جب مجھے بھی احساس ہوا کہ میرے اندر وہ خفیہ قوت بیدار ہوچکی ہے جس کے لیے میں طویل عرصے سے بڑی کٹھن ریاضت کررہا تھا۔

اور اب یوگا جس کے بارے میں ماسٹر ہینگ پائی نے بھی بتایا تھا کہ یہ بڑا پراسرار علم ہے اور اس علم کے ذریعے بھی انسان کے اندر پوشیدہ بے پناہ پراسرار خوابیدہ قوتوں کو بیدار کرکے زندگی کو خوش گوار بنایا جاسکتا ہے۔ میں کچھ عرصے اور وہاں رہتا تو ماسٹر ہینگ پائی ہی سے اس علم کے اسرار و رموز سمجھنے کی کوشش کرتا لیکن اس وقت تو میرا سینہ انتقام کی آگ سے تپ رہا تھا۔ مارشل آرٹس کی تربیت حاصل کرنے کے بعد جلد از جلد دارا کو تلاش کرکے اپنے انتقام کی آگ کو بجھانا چاہتا تھا۔

دارا کا قصہ ختم کرنے کے بعد میں لاہور جانا چاہتا تھا لیکن لاہور میں چوہدری نوازش علی کی گردن پر ہاتھ ڈالنے کے لیے ابھی میرے پاس کچھ وقت تھا۔ وقت کی ڈور کو ڈھیل دینے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ہردوار میں رہتے ہوئے میں نے کئی ہندو یوگیوں اور سادھوؤں کو دیکھا تھا جو بھوک پیاس اور موسم کی شدتوں سے بے نیاز ایک مختصر سا لنگوٹ باندھے یوگا کی ریاضت یا جاپ میں مصروف تھے۔ اگر آپ کو بھی کبھی ہمالیائی سلسلے میں سفر کرنے کا اتفاق ہو تو آپ کو جگہ جگہ ایسے دلچسپ منظر دکھائی دیں گے۔ آبادی سے دور ویرانوں میں، پہاڑوں کی گپھاؤں میں، کسی شمشان گھاٹ میں یا گنگا کے کنارے ایسے ہندو یوگی، پنڈت اور سادھو نظر آئیں گے جو شدت کی سردی میں صرف ایک لنگوٹ باندھے ننگ دھڑنگ اپنے یوگ کی تپسیا میں مصروف نظر آئیں گے لیکن یہ ہندو یوگی، پنڈت اور سادھو حصول علم کے لیے نہیں، اس علم کے اسرار سے واقفیت حاصل کرنے کے لیے نہیں بلکہ اپنے

اندر کی پراسرار قوتوں کو قابو کرنے کے لیے جاپ کرتے ہیں۔ انسان کے اندر کی یہی وہ پراسرار قوتیں ہیں جن پر قابو پاکر ہمالیہ کو بھی اپنے قدموں میں جھکنے پر مجبور کیا جاسکتا ہے اور یہ ہندو یوگی اور پنڈت کسی نیک مقصد کے لیے یہ تپسیا نہیں کرتے۔ ان کے تو ارادے ہی کچھ اور ہوتے ہیں۔

انہی تنگ دھڑنگ یوگیوں کو دیکھ کر میرے اندر بھی یوگا سے کچھ حاصل کرنے کا شوق پیدا ہوا تھا۔ اس رات یوگا کے بارے میں باتیں کرتے ہوئے چترا پریتم نے بھی میرے اس شوق کو کچھ ہوا دی تھی۔ اس نے بدھ یوگی گوتم بھوش کے بارے میں بتا کر میرے جذبہ شوق کو مہمیز کیا تھا۔

یہ میں جانتا تھا کہ یوگ کی جنم بھومی ہندوستان ہے لیکن اس نے پرورش تبت کی بدھ عبادت گاہوں میں پائی تھی۔ بدھ بھکشوؤں نے ہندوستان سے یہ علم سیکھا اور تبت میں اسے درجہ کمال حاصل ہوا۔ انسان کے اندر خوابیدہ خفیہ طاقتوں کو ابھارنے کے لیے بدھ راہبوں نے نت نئی ریاضتیں ایجاد کیں۔ یہ ریاضتیں یا جاپ بے پناہ کٹھن اور وقت طلب تھیں مگر انہوں نے ہمت نہیں ہاری اور اس علم کے اسرار سے پردے اٹھاتے رہے۔

کٹھن ریاضتوں سے بدھ راہبوں نے اپنے اندر پوشیدہ کئی پراسرا قوتوں کو زیر کرلیا۔ وہ مختلف ریاضتوں کے ذریعے اپنے اوپر وقتی طور پر مصنوعی موت طاری کرسکتے ہیں۔ کیا یہ اس فن کا کمال نہیں کہ ایک شخص محض ایک لنگوٹ پہن کر صفر سینٹی گریڈ درجہ حرارت پر برف پر لیٹا رہتا ہے لیکن نہ تو اس کا خون جمتا ہے اور نہ ہی اس کے جسم کا درجہ حرارت گرتا ہے۔ ان خاص مشقوں کے ذریعے انتہائی ناموافق حالات میں بھی جسم کا درجہ حرارت برقرار رکھا جاسکتا ہے۔ وہ انتہائی گرم درجہ حرارت جس پر انسان کی موت واقع ہوجاتی ہے لیکن اپنے آپ پر مصنوعی موت کی مشق میں مہارت رکھنے والے اس سے بھی دس بارہ سینٹی گریڈ زیادہ درجہ حرارت پر زندہ رہ سکتے ہیں۔

یوگ کا یہ کمال صرف بدھ راہبوں ہی نے حاصل نہیں کیا' ہندو یوگیوں نے بھی اس پر دسترس حاصل کی لیکن ایسے ہندو یوگی خال خال ہی ملتے ہیں اور یوگی دھیراج کی باتوں سے مجھے اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی تھی کہ اس کے پاس بہت کچھ ہے اور میرے لیے دلچسپی کی بات یہ تھی کہ وہ ایک ایسے بدھ راہب کا چیلا تھا جس کے بارے میں چترا پریتم نے بھی مجھے بتایا تھا کہ وہ واقعی گرو ہے۔

یوگی دھیراج کی باتوں نے میری آتش شوق کو کچھ اور بھی بھڑکا دیا تھا اور میں نے کچھ عرصہ وہاں رہنے کا فیصلہ کرلیا تھا تاکہ اس سے کچھ حاصل کرسکوں۔

دھیراج کے جانے کے بعد ہم دیر تک اس کے بارے میں باتیں کرتے رہے پھر سونیا اٹھ کر کانیج کے چھوٹے سے کچن میں چلی گئی اور کچن کی طرف سے کچھ ہی دیر بعد اس کے اور پراٹھے تلنے کی خوشبو آنے لگی۔

اس دوران میں شوبھا دیوی سے میں باتیں کرتا رہا۔ شوبھا بتا رہی تھی کہ اس نے یہ ڈیکوریٹڈ کانیج دو ہزار روپے ماہوار کرائے پر حاصل کیا تھا اور کچھ برتن بازار سے خرید کر اپنے پکانے کھانے کا بندوبست بھی کرلیا تھا۔ اس طرح بہت سی زحمتوں سے بچ گئے تھے۔ سونیا نے کئی ہندوستانی کھانے بنانا سیکھ لیے تھے اور شوبھا بتا رہی تھی کہ سونیا اس کی بڑی خدمت کرتی ہے۔

ہماری گفتگو کے دوران ہی میں سونیا نے دروازے میں نمودار ہو کر بتایا کہ ناشتا تیار ہوچکا ہے۔ ہم اس کرسیوں کے آگے جو نشست گاہ کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ صوفوں اور کرسیوں کے درمیان اگرچہ سینٹر ٹیبل موجود تھی مگر سونیا نے وہ میز ہٹا دی تھی اور صوفے اور کرسیاں بھی ایک دوسرے سے فاصلے پر کردیے تھے۔ بیچ میں دری کا فرش تھا جس پر سونیا نے دسترخوان بچھا کر ناشتا لگا دیا تھا۔ تکونے پراٹھے' آملیٹ بھی تھا اور دوسری پلیٹ میں ہاف فرائی انڈے تھے۔ ان کے ساتھ ایک کٹوری میں دال تھی اور بغیر گھی ایک چپاتی۔

یوگا کی مشقوں میں مرغن اور بھاری غذائیں کھانے کی ممانعت تھی اور یہ دال اور چپاتی شوبھا کے لیے تھی۔ پراٹھے اور انڈے میرے اور سونیا کے لیے تھے۔ ہندو ہونے کے بھی ماس خور نہیں ہوتے اور مجھے بھی سبزیاں اور دال وغیرہ کھانے کی عادت سی ہوگئی تھی اور اس وقت کا ناشتا بھی زبردست تھا۔ میرا ایک تجربہ یہ بھی تھا کہ گوشت خوری پر پابندی صرف ان ہندوؤں تک محدود رہ گئی تھی جو برہمن کے قریب تھے جبکہ آج کے دور میں اکثر ہندو بھی باقاعدگی سے گوشت کھانے لگے۔ ناشتے کے دوران میں اس گوشت خوری کے حوالے سے باتیں کرتے ہوئے شوبھا دیوی نے ایک بڑی دلچسپ بات کہی تھی۔

"میں گوشت سے پرہیز نہیں کرتی۔ کبھی کبھی گوشت بھی کھالیتی ہوں۔" اس نے کہا "ہندو گوشت اس لیے نہیں کھاتے کہ اسے مقدس گائیں کہتی ہیں لیکن کتنی حیرت کی بات ہے کہ یہی ہندو گاؤ ماتا کو قتل کرکے ہاتھ فروخت کردیتے ہیں کہ پھیرو اس کے گلے پر چھری ہے نا مزے کی بات؟" شوبھا نے سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔

"ٹھاکر بھانوت سنگھ۔" میں نے جواب دیا "آپ نے جے پور میں اس کا نام ضرور سنا ہوگا۔ بہت معروف شخصیت ہے۔"

"وہ کرم ہوٹل والا ٹھاکر۔" شوبھا بولی "اسے کون نہیں جانتا لیکن تمہارا اس سے کیا تعلق؟"

"وہ کل تک ہردوار میں میرے ساتھ تھا۔" میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "وہ بہت اچھا انسان اور بہت مخلص دوست ہے۔ میں کئی مہینے جے پور میں اس کے پاس رہا ہوں۔ اس کی دوست راج کماری روپ متی....."

"تم روپ متی کو بھی جانتے ہو۔" شوبھا کی آنکھوں میں عجیب سی چمک ابھر آئی "وہ تو جے پور کی بڑی معروف اور متنازعہ شخصیت ہے۔ معاف کرنا وہ....."

"میں آپ کا مطلب سمجھ رہا ہوں شوبھا دیوی۔" میں نے مسکراتے ہوئے اس کی بات کاٹ دی "لیکن روپ متی اب متنازعہ شخصیت نہیں رہی۔ اب وہ بہت بدل گئی ہے۔"

"اس کے بارے میں تو آئے دن نئے اسکینڈلز سننے میں آتے رہے ہیں۔ ابھی کچھ عرصہ پہلے جے پور کے پنڈتوں نے اس کے خلاف بغاوت کردی تھی۔ وہ کسی مسلمان مرد کے ساتھ....."

"اور وہ مسلمان میں ہوں۔" میں نے ایک بار پھر اس کی بات کاٹ دی۔

"کیا.....؟" وہ اچھل پڑی اور اس طرح دیکھنے لگی جیسے میری بات کا یقین نہ ہو۔

"یہ درست ہے۔" میں نے کہا "بات کا بتنگڑ بنانے میں بعض لوگوں کو بہت ملکہ حاصل ہوتا ہے۔ بات وہ نہیں تھی جس کا چرچا ہوا تھا۔ اصل قصہ یوں ہے کہ بلونت سنگھ نامی ایک بدمعاش جو اپنے آپ کو چتوڑ گڑھ کا راج کمار کہتا تھا' اسے پریشان کررہا تھا۔ میں نے اس کے خلاف روپ متی کی مدد کی تھی۔" میں چند لمحوں کو خاموش ہوا اور پھر اسے پورا قصہ سنانے لگا۔ غلاموں کی منڈی والا حصہ میں نے گول کردیا تھا۔ شوبھا بڑی دلچسپی سے میری باتیں سن رہی تھی۔ میں آخر میں کہہ رہا تھا "بات صرف اتنی سی تھی۔ بدقسمتی سے میرا ایک ازلی دشمن بھی بلونت سنگھ کے ساتھ مل گیا تھا۔ ہمارے خلاف ان کے پاس ایسی کوئی بات نہیں تھی جس پر محاذ کھولا جاسکتا۔ انہوں نے پنڈتوں کو ہمارے خلاف بھڑکا دیا کہ ایک مسلمان مرد ایک ہندو عورت کو زبردستی اپنے پاس رکھے ہوئے ہے۔ بات دھرم کی ہو تو لوگ بڑے جذباتی ہوجاتے ہیں۔ وہ اصل بات جاننے کی کوشش نہیں کرتے۔ دھرم کی آڑ لے کر لوگوں کو بھڑکانا بہت آسان ہوتا ہے۔ میرے اور

بات تو واقعی مزے کی تھی لیکن میں اس موضوع پر بحث نہیں کرنا چاہتا تھا کیونکہ میں ابھی شوبھا کے بارے میں کچھ اور بھی جاننا چاہتا تھا۔ گاؤ ماتا اور قسائی کی بات سے اگرچہ کچھ اندازہ ہوگیا تھا لیکن نجانے میری کون سی بات اسے بری لگ گئی تھی اس لیے میں نے یہ موضوع ہی بدل دیا تھا۔

ناشتے کے بعد ہم کانیج سے باہر آکر کھلی فضا میں کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ موسم بہت خوشگوار تھا۔ آسمان پر بادل بھی تھے اور دور دور پوش پہاڑی چوٹیوں پر بادلوں نے گویا مستقل ڈیرے ڈال رکھے تھے۔

یہ کانیج اس پہاڑی پر زمین کی سطح سے تقریباً دو سو فٹ کی بلندی پر تھا۔ اس سے اوپر بھی چند کانیج نظر آرہے تھے۔ ایک پتھریلا راستہ پہاڑ پر بل کھاتا ہوا اوپر تک چلا گیا تھا۔ یہ راستہ اتنا کشادہ تھا کہ دو کاریں پہلو بہ پہلو آسانی سے چل سکتی تھیں۔ اس سڑک کے علاوہ سانپ کی طرح بل کھاتی پگڈنڈیاں تھیں جن سے اوپر آنے جانے کا فاصلہ سمٹ کم ہوجاتا تھا۔

شوبھا دیوی دل کی مریضہ تھی۔ پہاڑی پر چڑھنا اس کے لیے مشکل اور تکلیف دہ کام تھا۔ وہ جب سے یہاں آئی تھی' صرف دو مرتبہ بازار کی طرف گئی تھی اور اس کے لیے بھی دونوں مرتبہ کرائے کی موٹر منگوائی تھی۔ اس کا زیادہ وقت کانیج کے آس پاس ٹہلتے ہوئے یا آرام کرتے ہوئے گزرتا تھا۔

"یہ بہت اچھی جگہ ہے۔" وہ ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھی "میں سوچ رہی ہوں کہ اگر یہاں جگہ مل جائے تو جے پور کی جائداد فروخت کرکے یہاں ایک شان دار گیسٹ ہاؤس بنوالوں۔ کاروبار بھی چلتا رہے گا اور صحت افزا ماحول میں رہائش بھی اچھا گزرے گا۔"

"بہت اچھا آئیڈیا ہے۔" میں نے کہا "لیکن کیا آپ یہاں رہ سکیں گی؟"

"اکیلی کیوں؟" شوبھا نے کہا "سونیا میرے پاس ہے۔ ہم نے اس کو اپنا سب کچھ مان لیا ہے اور مجھے امید ہے کہ یہ بھی مجھے کبھی چھوڑ کر نہیں جائے گی۔" وہ کہہ کر سونیا کی طرف دیکھنے لگی۔

"میں آپ کو چھوڑ کر کہاں جاؤں گی دیدی۔" سونیا نے آگے بڑھ کر اس کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔

"اگر واقعی آپ سنجیدہ ہیں تو میرا ایک دوست اس سلسلے میں آپ کی بہت مدد کرسکتا ہے۔" میں نے کہا "اسے اس قسم کا بہت تجربہ ہے۔ گیسٹ ہاؤس اور ریسٹورنٹ زیادہ آپ کے لیے بہت کارآمد ثابت ہوسکتا ہے۔"

"کون؟" شوبھا نے سوالیہ نگاہوں سے میری طرف

روپ متی کے معاملے میں بھی یہی کچھ ہوا تھا۔

"ہمارے خلاف وہ پنڈت اور پجاری تھے جنہوں نے خود دھرم کو برباد کر رکھا تھا۔ مندر جیسے پوتر استھانوں کو عیاشی کے اڈے بنا رکھا تھا۔ ان کے اپنے کرتوت کالے تھے۔ ہمارا وہ کچھ بھی نہیں بگاڑ سکے۔ اس کے برعکس وہ خود تباہ و برباد ہوگئے۔"

"ٹھاکر بھانوت سنگھ راج کماری روپ متی کے سٹورگ باشی پتی کا دوست ہے۔ اس نے اس معاملے میں ہماری بڑی مدد کی۔ وہ ایک سچا اور کھرا آدمی ہے۔ اگر آپ یہاں گیسٹ ہاؤس اور ریسٹورنٹ بنانے کے معاملے میں اس کی مدد لینا چاہیں گی تو وہ انکار نہیں کرے گا۔"

"اب مجھے کوئی پریشانی نہیں۔" شوبھا نے مسکراتے ہوئے کہا "تم ہو سونیا ہے ٹھاکر اور روپ متی ہیں تو مجھے کیا پریشانی ہو سکتی ہے۔"

"میں تو سیلانی آدمی ہوں۔" میں نے کہا "میرا کوئی بھروسا نہیں، کب چلا جاؤں البتہ سونیا تو آپ کے پاس رہے گی اور روپ متی اور ٹھاکر بھی آپ کے پاس ہوں گے۔ اگر آپ گیسٹ ہاؤس بنانے کے معاملے میں واقعی سنجیدہ ہیں تو پروگرام بنا لیجئے۔ ٹھاکر کو یہاں بلایا جا سکتا ہے یا ان سے آپ کی ملاقات جے پور میں بھی ہو سکتی ہے۔"

"اب تو سنجیدگی سے سوچنا ہی پڑے گا۔" شوبھا نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "لیکن... تم کہاں جاؤ گے ہمیں چھوڑ کر؟"

"میرا کوئی ٹھکانا نہیں۔" میں نے جواب دیا "میری منزل کا کوئی نشان نہیں ہے۔ میں تو پتا نہیں کب تک اور کہاں کہاں بھٹکتا رہوں گا۔"

سونیا اس دوران میں اٹھ کر اندر جا چکی تھی۔ ہم ابھی باتیں کر رہے تھے کہ وہ تیار ہو کر باہر آگئی۔ اس نے وہی کل شام والا اسکرٹ اور بلاؤز پہن رکھا تھا۔

"دیدی! ہم ذرا بازار تک جا رہے ہیں۔ اگر آپ کو جانا ہو تو گاڑی منگوا لی جائے؟" سونیا نے قریب آکر کہا۔

"نہیں بھئی۔ فی الحال میرا کہیں جانے کا موڈ نہیں ہو رہا۔ تم لوگ جاؤ۔ میں یہیں ٹھیک ہوں۔" شوبھا نے جواب دیا۔

میں نے کرسی چھوڑ دی اور پھر پانچ منٹ بعد میں اور سونیا پہاڑی کی بل کھاتی ہوئی پگڈنڈی پر اتر رہے تھے۔

اس وقت شملہ اور ہردوار کی طرف سے آنے والی دو بسیں اڈے پر آکر رکی تھیں اور زیادہ رونق نواح میں تھی۔

ان بسوں کے مسافروں میں زیادہ تعداد غیر ملکیوں کی تھی۔ غیر ملکی سیاحوں کی ہر پارٹی میں ایک دو خوب صورت اور جوان لڑکیاں ضرور شامل تھیں۔

میں سونیا کے ساتھ کچھ دیر بازار میں گھومتا رہا۔ اس نے کچھ سودا سلف خریدا اور کاٹیج کی طرف واپس چلی۔ میں اس میں آزادانہ طور پر کچھ دیر گھومنا چاہتا تھا۔

تقریباً ایک گھنٹے تک تو میں بازاروں میں گھومتا رہا پھر پہاڑیوں کی طرف نکل گیا۔ شہر کے اطراف کی پہاڑیوں پر بھی مندروں کی بھرمار تھی۔ ہر تھوڑے فاصلے پر کوئی نہ کوئی مندر ضرور نظر آجاتا تھا۔

کئی جگہوں پر غیر ملکی سیاحوں کی ٹولیاں ڈیرے جمائے نظر آئیں۔ پیسے بچانے کے لیے ان لوگوں نے رہائش کا یہ انتظام کر رکھا تھا۔ کسی پارٹی نے تو باقاعدہ خیمہ گاڑ رکھا تھا۔ بہت سی پارٹیاں ایسی تھیں جنہوں نے محض چھولداریاں لگا رکھی تھیں۔

میں سہ پہر تک آس پاس کی پہاڑیوں پر گھومتا رہا اور بالآخر کاٹیج واپس آگیا۔ سونیا اور شوبھا اس وقت بھی کاٹیج کے سامنے کرسیوں پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ سونیا مجھے دیکھتے ہی اٹھ گئی۔

"ارے کہاں رہ گئے تھے تم۔ بیٹھو۔ میں تمہارے لیے کھانا گرم کرتی ہوں۔"

"کھانے کا موڈ نہیں ہو رہا۔ چائے چلے گی۔" میں نے اس کی چھوڑی ہوئی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

سونیا کاٹیج میں چلی گئی۔ پہلے اس نے ایک کرسی لا کر وہاں رکھی اور اس کے تھوڑی دیر بعد چائے بنا کر لے آئی۔ ہم ابھی چائے پی رہے تھے کہ غیر ملکی سیاحوں کی ایک پارٹی اس طرف نکل آئی۔ ان میں تین مرد اور دو عورتیں تھیں۔ ان میں سے ہر ایک نے کندھے پر بیگ لاد رکھا تھا۔ وہ لوگ شاید پہاڑی پر مزید اوپر جانا چاہتے تھے لیکن ہمیں دیکھ کر رک گئے اور ادھر ادھر دیکھنے لگے۔ ان میں سے ایک عورت نے کھلی جگہ پر ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کچھ کہا اور پھر وہ لوگ ہماری طرف آگئے۔

ان میں ایک آدمی کلین شیو تھا۔ دو کے چہروں پر ترتیب داڑھیاں تھیں۔ ان میں سے کسی کی عمر پینتیس سے زیادہ نہیں تھی۔ وہ تینوں ٹی شرٹس اور نیکرز پہنے ہوئے تھے۔ ان کے ساتھ دونوں لڑکیاں بے حد خوب صورت تھیں۔ ایک کی عمر سترہ اٹھارہ سال اور دوسری کی بیس اکیس سال ہوگی۔ ان میں سے ایک نے جینز اور ٹی شرٹ پہن رکھی تھی اور دوسری نے نہایت مختصر نیکر اور اوپن شرٹ پہنی ہوئی تھی جس کے اوپر کے دو بٹن کھلے ہوئے تھے اور سامنے سے ہوا میں لہراتا محض بڑے اطمینان سے گریبان کے اندر تک جھانک سکتا تھا۔

"ہیلو!" قریب آکر کلین شیو والے نے باری باری ہماری طرف دیکھا پھر اس کی نظریں میرے چہرے پر مرکوز ہوگئیں "اگر ہم یہاں کیمپ لگا لیں تو تم لوگوں کو کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا؟"

میں نے شوبھا کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں الجھن سی تیر گئی۔

"یہ لوگ ہمارے لیے کوئی مسئلہ تو پیدا نہیں کریں گے؟" اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے اردو میں کہا۔

"کوئی مسئلہ تو پیدا نہیں کریں گے البتہ یہ فائدہ ضرور ہوگا کہ ہمارا پڑوس آباد ہو جائے گا۔" میں نے جواب دیا۔

"تو ٹھیک ہے۔ ان سے کہہ دو جہاں جی چاہے کیمپ لگا لیں۔" شوبھا نے جواب دیا۔

میں نے ان سیاحوں کو اجازت دے دی کہ وہ جہاں چاہیں اپنا کیمپ لگا لیں۔ ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہے۔

وہ ہمارا شکریہ ادا کر کے کھلی جگہ پر ادھر ادھر گھومنے لگے اور بالآخر ہمارے کاٹیج سے تقریباً پچھتر گز کے فاصلے پر بڑے بڑے پتھروں کے بیچ میں انہوں نے کیمپ کے لیے جگہ منتخب کر لی۔ اس جگہ کیمپ لگانے کا ایک فائدہ یہ تھا کہ وہ ہوا سے بچ سکتے تھے۔

انہوں نے اپنے بیگ کھول لیے اور کام میں مصروف ہوگئے اور پھر ایک گھنٹے کے اندر اندر وہاں پیرا شوٹ کے کپڑے کا ایک خیمہ نظر آرہا تھا۔ اس خیمے کے اندر پانچ چھ آدمی آرام سے سو سکتے تھے۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ پیرا شوٹ کا یہ خیمہ انہوں نے اپنے ایک بیگ میں سے برآمد کیا تھا۔

ان یورپین سیلانیوں کی زندگی بھی عجیب ہے۔ خانہ بدوشوں کی طرح دنیا بھر میں آوارہ گردی کرتے رہتے ہیں۔ نہ گھر کی فکر نہ وطن کی یاد۔ ان لوگوں کا کوئی وطن ہوتا ہی نہیں۔ جہاں پڑاؤ ڈال دیا وہی جگہ عارضی وطن بن گئی۔

ہوا میں خنکی بڑھ گئی تھی۔ سورج غروب ہونے میں

پوری دنیا میں پھیلے ہوئے اسلام کے پھیلانے والے صاحب کمالات بزرگان دین کے حالات پر مشتمل

اردو میں اپنی نوعیت کی منفرد کتاب

پراسرار بندے

قیمت 150 روپے

ڈاک خرچ 25 روپے

کتاب کی قیمت مع ڈاک خرچ بذریعہ پیشگی منی آرڈر/ڈرافٹ یا کراسڈ چیک ارسال کریں

کتاب منزل کمپنی

کراچی 74200

فون: 5802551 فیکس: 5802552-5895

kitablat1970@yahoo.com

رابطے کے لئے: C-63 فیز III ایکسٹینشن ڈی ایچ اے مین کورنگی روڈ (اختر کالونی بس اسٹاپ کے سامنے) کراچی 75500

تھوڑی ہی دیر باقی تھی۔ ہم لوگ کانیج میں آگئے اور تھوڑی ہی دیر بعد یوگی دھیراج بھی پہنچ گیا۔ وہ شوبھا کو شیو آسن کی مشق کرانے لگا تو میں بھی قریب بیٹھا خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔

مشق ختم کرانے کے بعد وہ دیر تک مجھ سے باتیں کرتا رہا اور جب وہ واپس جانے لگا تو میں بھی اس کے ساتھ تھا۔ ہم پہاڑی سے اتر کر بازار میں آگئے اور مختلف راستوں سے گھومتے ہوئے شہر کی دوسری طرف ایک اور پہاڑی کے دامن میں پہنچ گئے۔

وہ کانیج خاصا بڑا تھا۔ وسطی کمرا تو کسی بڑے ہال کی طرح تھا۔ اس ہال میں کئی لوگ تھے جو یوگا کی اپنی اپنی مشقیں کررہے تھے۔ دھیراج مجھے کانیج کے اوپر ایک کمرے میں لے گیا۔

بدھ یوگی گوتم گھوش کو دیکھ کر میں چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ اسے دیکھ کر مجھے بے اختیار مہاراج اور ماسٹر ہنگ پائی یاد آگئے تھے۔

گوتم بھوش کی عمر پچاسی سال سے کم تو کسی طرح نہیں ہوگی۔ وہ لکڑی کی ایک چوکی پر آلتی پالتی مارے اس طرح سیدھا بیٹھا تھا کہ اس کی کمر اور گردن ایک ہی لائن میں تھی۔ ذرا سا بھی خم نہیں تھا حالانکہ اس عمر میں کمر کمان بن جاتی ہے اور چہرہ مکڑی کے جالے کا تاثر دینے لگتا ہے لیکن اس کے چہرے پر ایک بھی لکیر دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

اس کا سر گنجا تھا اور میرے اندازے کے مطابق اس کا قد چھ فٹ سے نکلتا ہوا تھا۔ اس نے صرف ایک لنگوٹ باندھ رکھا تھا۔ اس کے بیٹھنے کا انداز کچھ ایسا تھا کہ عام شخص اسے آلتی پالتی ہی کہہ سکتا تھا لیکن وہ پدم آسن کا انداز تھا۔ (پدم آسن کو کنول آسن یا لوٹس پوسچر بھی کہتے ہیں) بایاں گھٹنا موڑ کر پیر دائیں ران پر جانگ کے قریب اور دایاں گھٹنا موڑ کر بایں ران پر جانگ کے قریب رکھا ہوا تھا۔ دونوں ہاتھ گھٹنوں پر رکھے ہوئے تھے اور بازوؤں میں معمولی سا خم بھی نہیں تھا۔

اس کے سامنے بچھی ہوئی دری پر تین چار آدمی بیٹھے ہوئے تھے اور وہ انہیں کوئی لیکچر دے رہا تھا۔ ہم جیسے ہی اندر داخل ہوئے' دوسرے لوگوں نے تو باری باری ہماری طرف دیکھا تھا مگر گوتم بھوش نے ہماری طرف توجہ نہیں دی تھی۔ لگتا تھا جیسے اسے ہمارے آنے کی خبر ہی نہ ہوئی ہو۔

یوگی دھیراج نے مجھے آنکھ سے اشارہ کیا اور میں بھی دری پر بیٹھے ہوئے ان آدمیوں کے پیچھے پدم آسن بنا کر بیٹھ گیا۔ میرے قریب ہی دھیراج نے بھی یہی آسن اختیار کیا تھا۔

پدم آسن یوگا میں ایک بہت ہی خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اس سے جسم میں غدودوں کی نشوونما ہوتی ہے جس سے ہارمونز پیدا ہوتے ہیں۔ اس سے دل' پھیپھڑوں' معدہ' جگر اور تلی کی کارکردگی پر خوشگوار اثر پڑتا ہے۔ ریڑھ کی ہڈی کے مہروں اور پٹھوں میں لچک پیدا ہوتی ہے۔ یہ انداز نشست جسم کو صحت مند رکھنے میں نہایت اہم کردار ادا کرتا ہے اور ستراسی یا اس سے بھی زیادہ عمر میں آدمی اپنے آپ کو جوان محسوس کرتا ہے۔ مراقبے اور ارتکاز کی مشقوں میں بھی عام طور پر یہی آسن اختیار کیا جاتا ہے۔

دس منٹ گزر گئے اور پھر گوتم بھوش نے گہرا سانس لیتے ہوئے یہ نشست ختم کردی اور پیر چوکی سے نیچے لٹکا لیے۔ دری پر بیٹھے ہوئے لوگوں نے بھی نشست ختم کردی اور الٹو اٹھ کر باہر جانے لگے مگر میں اپنی جگہ پر اسی انداز میں بیٹھا رہا۔

یوگی دھیراج اپنی جگہ سے اٹھ کر گوتم بھوش کے قریب چلا گیا اور اسے مدھم لہجے میں میرے بارے میں بتانے لگا۔ گوتم بھوش نے میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں سرخی اور مقناطیسی کشش تھی۔ میرے دماغ کو ایک جھٹکا سا لگا۔ اس کی آنکھوں میں بے پناہ چمک تھی۔ عام آدمی کے لیے اس سے نظریں ملانا ممکن نہیں تھا لیکن میں پلکیں جھپکے بغیر اس کی آنکھوں میں جھانکتا رہا۔ اس وقت مجھے ماسٹر ہنگ پائی یاد آگیا تھا جس نے شمس بنی کے ذریعے میری آنکھوں میں بے پناہ قوت پیدا کی تھی کہ میں سانپ کی طرح پلکیں جھپکے بغیر گھنٹوں اپنے مقابل کی آنکھوں میں جھانک سکتا تھا۔

مجھے یاد تھا کہ میں شاؤلن ٹیمپل میں مارشل آرٹس کی تربیت حاصل کررہا تھا تو ماسٹر ہنگ پائی طلوع آفتاب سے ایک گھنٹا پہلے پہاڑی پر پرسکون اور کھلی فضا میں مجھے سانس اور مراقبے کی مشقیں کرایا کرتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی شمس بنی کی مشقیں بھی ہوتی تھیں۔

مشرقی افق پر جب سرخی پھیلنے لگتی تو میں یہی پدم آسن اختیار کرکے پہاڑ کی چوٹی پر اس جگہ نظریں جمادیتا جہاں سے سورج طلوع ہونے والا ہوتا اور جب سورج طلوع ہونا شروع ہوتا تو میری نظریں خود بخود اس آتشی گولے پر مرکوز ہوجاتیں اور میں یہ تصور کرلیتا کہ سورج کی توانائی آنکھوں کے راستے میرے اندر منتقل ہورہی ہے۔

شروع میں یہ پریکٹس صرف پانچ منٹ تک محدود رہتی اور پھر ہر ہفتے اس میں ایک ایک منٹ کا اضافہ ہونے لگا۔ شروع میں مجھے خاصی دشواری پیش آئی تھی۔ کبھی آنکھوں میں شدید جلن ہونے لگتی اور کبھی پانی بہنے لگتا لیکن مجھے ماسٹر ہنگ پائی جیسے استاد کی رہنمائی حاصل تھی اس لیے میں نے بہت جلد ان دشواریوں پر قابو پالیا۔

انسان کے اندر پوشیدہ پراسرار اور غیر مرئی قوتوں کو بیدار کرنے کے لیے مختلف مشقیں اور ریاضتیں کی جاتی ہیں۔ ان میں شمس بنی کو بھی بڑی اہمیت حاصل ہے۔ شمس بنی سے آنکھوں میں ایسی پراسرار مقناطیسی چمک پیدا ہوجاتی ہے کہ کوئی عام آدمی اس سے نظریں نہیں ملا سکتا۔ اس سے نہ صرف دوسروں کو ہپناٹائز کیا جاسکتا ہے بلکہ ٹیلی پیتھی کی قوت کو بھی اجاگر کیا جاسکتا ہے۔

میں اس وقت یوگی گوتم بھوش کو کسی قسم کا چیلنج نہیں کررہا تھا لیکن نجانے کیا بات تھی کہ میری نظریں گویا اس کی نظروں سے چپک کر رہ گئی تھیں۔ گوتم بھوش نے سیدھا ہاتھ آشیرباد دینے والے انداز میں اٹھا دیا تو میرے دماغ کو ایک بار پھر جھٹکا سا لگا اور میں سنبھل کر بیٹھ گیا اور اب میں پلکیں بھی جھپکا رہا تھا۔

بدھ یوگی گوتم بھوش کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔

"کہاں سے آئے ہو؟" اس نے ملی جلی ہندی اور اردو میں پوچھا۔

"بہت دور سے۔" میں نے جواب دیا "کچھ لینے آیا ہوں۔ مجھے امید ہے' آپ مایوس نہیں کریں گے۔"

"میں جانتا ہوں' تم نے مایوس ہونا نہیں سیکھا۔" اس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ گہری ہوگئی "تمہاری نظریں بتا رہی ہیں کہ جو ارادہ کرلیتے ہو اس سے پیچھے نہیں ہٹتے۔ میں تمہارے اندر اور بھی بہت کچھ دیکھ رہا ہوں۔ یہ سب کچھ تم نے گرو سے سیکھا ہے یا....."

"گرو سے۔" میں نے کہا "میں نے کچھ وقت شاؤلن ٹیمپل میں گزارا ہے جہاں ماسٹر ہنگ پائی سے مارشل آرٹس کی تربیت حاصل کی اور....."

"ماسٹر ہنگ پائی!" وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ میں حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ میں بھی اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔

"ماسٹر ہنگ پائی۔" گوتم بھوش کہہ رہا تھا "میں نے ماسٹر ہنگ پائی سے بہت کچھ سیکھا ہے اور اس کے ایک چیلے کی حیثیت سے مجھے بہت خوشی ہوگی۔"

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟" میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا "سیوا تو میں آپ کی کرنے آیا ہوں۔ میں آپ سے کچھ حاصل کرنا چاہتا ہوں۔"

"تم یہاں سے خالی ہاتھ نہیں جاؤ گے۔" اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا "ماسٹر ہنگ پائی کی آتما تمہیں میرے پاس دیکھ کر بہت خوش ہورہی ہوگی۔"

"ماسٹر ہنگ پائی کی آتما!" میں اچھل پڑا "آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟"

وہ چند لمحے میری طرف دیکھتا رہا پھر یہ سنسنی خیز انکشاف کیا کہ چند مہینے پہلے ماسٹر ہنگ پائی کا انتقال ہوگیا تھا۔

ماسٹر کے انتقال کی خبر سن کر مجھے بڑا دکھ ہوا۔ میں دارا کے تعاقب میں دنیا بھر کی آوارہ گردی کرتا رہا تھا اور مجھے کہیں سے ماسٹر ہنگ پائی کے انتقال کی خبر نہیں ملی تھی۔ ماسٹر کا چہرہ میری نظروں میں گھوم گیا۔ اس کے ساتھ ہی مہاراج وانگ ونگ یائے کا خیال بھی میرے ذہن میں ابھر آیا۔ جب میری ان سے پہلی ملاقات ہوئی تھی تو اس وقت ان کی عمر پچھتر کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ کئی برس گزر گئے تھے اور پتا نہیں وہ ابھی زندہ تھے یا اس دنیا سے رخصت ہوچکے تھے۔ بہرحال یہ دو ہستیاں ایسی تھیں جنہیں میں کبھی نہیں بھلا سکوں گا۔ انہی کی محبت اور محنت سے میں اس قابل ہوا تھا کہ نہ صرف اپنے دشمنوں سے انتقام لے سکوں بلکہ دنیا والوں کو اپنے وجود کا احساس بھی دلا سکوں۔

میں مطمئن ہوگیا کہ ٹھیک جگہ پر آیا تھا۔

ہم دیر تک ماسٹر ہنگ پائی کے بارے میں باتیں کرتے رہے اور پھر ہمارا موضوع بدل گیا اور اب ہم یوگ کے بارے میں باتیں کررہے تھے۔

"یوگا کی جنم بھومی ہندوستان ہے۔" گوتم بھوش کہہ رہا تھا "اور ہندو فلسفے کے مطابق لفظ "اوم" کو سب سے مقدس و متبرک سمجھا جاتا ہے۔ یہ آتما یا برہما کا نشان بھی ہے چنانچہ مختلف جاپ اس لفظ سے کیے جاتے ہیں۔ جاپ کے دوران میں انسان دنیا و مافیہا سے بے خبر ہوجاتا ہے اور اس پر ایک قسم کی محویت سی طاری ہوجاتی ہے لہٰذا اس محویت کے عالم میں جاپ کرنے والے کی غیر معمولی قوتیں بیدار ہونا شروع ہوجاتی ہیں جس کے نتیجے میں یوگی بہت سی غیر مرئی قوتیں حاصل کرنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں۔ ہندو یوگی اسے اوم کا کمال سمجھتے ہیں حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ یوگا کا کوئی مذہب نہیں ہے۔ کوئی بھی یوگی اپنے دھرم کے متبرک ترین نام سے جاپ کرکے کامیابی حاصل کرسکتا ہے۔

"کسی بھی ریاضت یا جاپ میں دھرم کو نظرانداز نہیں

کیا جاسکتا۔ ہندوستان کی تاریخ پر نظر ڈالنے سے پتا چلتا ہے کہ جنہوں نے فلسفہ ریاضت کے ذریعے مختلف مذاہب کی بنیاد ڈالی' راجے مہاراجے تھے۔ ان کے راج ان کے نظریات کے فروغ میں بہت زیادہ معاون ثابت ہوئے لیکن وہ اس حقیقت کو بھول گئے کہ ان سے اوپر بھی ایک ایسی ہستی موجود ہے جسے قوت کا سرچشمہ کہا جاسکتا ہے۔

"تین ہزار سال قبل چندر گپت کے دور میں پیدا ہونے والا پتنجلی نامی شخص نہ صرف یوگ کا جد امجد مانا جاتا تھا بلکہ اس کی تھیوری کو بھی مستند تسلیم کیا جاتا ہے۔ پتنجلی نے خدا کے وجود پر زور دیتے ہوئے انسان کو اس کے فعل کا مختار بنا کر باور کرایا کہ وہ ریاضت کاملہ کے ذریعے اپنے اندر خدائی صفات پیدا کرسکتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ انسان کو چاہیے کہ وہ اپنی ذاتی صفات کو مٹا کر حواس کو مردہ کردے تاکہ روح عظیم سے جا ملے۔ انسان فعل کا خود مختار ہے۔ وہ چاہے تو اپنے آپ میں خدائی صفات پیدا کرسکتا ہے۔" گوتم بھوش چند لمحوں کو خاموش ہو کر میری طرف دیکھتا رہا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا۔

"جیسا کہ تم جانتے ہو کہ انسان میں بے پناہ پراسرار قوتیں پوشیدہ ہیں۔ بعض قوتیں تو بغیر کسی کوشش اور جدوجہد کے حاصل ہوجاتی ہیں لیکن بعض قوتیں مختلف کٹھن ریاضتوں اور مشقوں کے ذریعے ہی حاصل کی جاسکتی ہیں۔

"ماہرین یوگ نے ان پوشیدہ اور پراسرار قوتوں کو منکشف کرنے کے لیے نت نئے تجربات کیے۔ بھوک پیاس سے اپنے آپ کو نڈھال کیا اور عرصہ دراز تک اپنے آپ کو اذیتیں دیتے رہے اور بالآخر ان مخفی اور پراسرار قوتوں کا سراغ لگالیا اور انہیں اجاگر کرنے کے طریقے بھی وضع کیے۔ انہی پوشیدہ قوتوں میں ایک نہایت پراسرار اور زبردست قوت کنڈلینی ہے۔"

گوتم بھوش ایک بار پھر خاموش ہوگیا۔ اس بار اس کی خاموشی قدرے طول کھینچ گئی اور بالآخر وہ بات کو جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا۔

"ماہرین یوگ کے کہنے کے مطابق ہماری ریڑھ کی ہڈی کے نچلے حصے میں ایک ناگن کنڈلی مارے سو رہی ہے۔ مختلف جاپ اور ریاضتوں سے جب اس پر ضرب لگائی جاتی ہے تو یہ جاگ اٹھتی ہے اور بیدار ہونے کے بعد ریڑھ کی ہڈی میں پوشیدہ نسوں اور پٹھوں کے ذریعے دماغ کی طرف سفر شروع کردیتی ہے۔ اس سفر کے دوران میں کئی پڑاؤ آتے ہیں جنہیں یوگا کی اصطلاح میں کنول یا چکر کہا جاتا ہے۔ وہ ناگن یا پراسرار قوت ان پڑاؤ سے گزرتے ہوئے بالآخر دماغ کے اس حصے تک پہنچ جاتی ہے جہاں مائع ہوتا ہے۔ چنانچہ جب یہ پراسرار قوت یعنی کنڈلینی کا ملاپ دماغ کے مخصوص حصے سے ہوجاتا ہے تو اس وقت انسان کے قلب کا دروازہ کھل جاتا ہے۔ قلب سے مراد گوشت کا وہ لوتھڑا نہیں جو ہر انسان کے سینے میں دھڑکتا ہے بلکہ قلب سے مراد "مرکز روح" ہے۔ اس ملاپ کے بعد یوگی کی مشاہدے کی قوت بڑھ جاتی ہے۔ یوگی پورے طور پر اپنے قلب اور جسم سے علیحدہ ہوجاتا ہے اور اس کا جسم مکمل طور پر اس کے کنٹرول میں آجاتا ہے اور اس سے حیرت انگیز کام لیے جاسکتے ہیں جن کا عام آدمی تصور بھی نہیں کرسکتا۔"

گوتم بھوش ایک بار پھر خاموش ہوگیا۔ اس نے دھیراج کو اشارہ کیا۔ وہ اٹھ کر باہر چلا گیا۔ دھیراج کی واپسی ایک منٹ بعد ہوئی تھی۔ اس نے بھی اشارے ہی سے گوتم بھوش کو کچھ بتایا اور اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔ گوتم بھوش نے میری طرف دیکھتے ہوئے دوبارہ کہنا شروع کیا۔

"اس پراسرار قوت کنڈلینی کی بیداری کے بعد یوگی اپنے جسم سے بالکل علیحدہ ہوجاتا ہے اور وہ جسم کے ہر ہر عضو کو کنٹرول میں لے آتا ہے۔ اس وقت انسان کے قبضے میں بے شمار قوتیں آجاتی ہیں۔ وہ ہوا میں اڑ سکتا ہے اور پانی پر چل سکتا ہے۔ بھوک پیاس سے بے نیاز ہوجاتا ہے اور برسوں بغیر کھائے پیے محض فضا سے خوراک حاصل کرکے زندہ رہ سکتا ہے۔ سردی گرمی اس پر اثر انداز نہیں ہوسکتی اور وہ واقعی مافوق الفطرت بن جاتا ہے۔

"ریڑھ کی ہڈی سے دماغ تک کے سفر کے دوران میں کنڈلینی راستے میں کس کس پڑاؤ پر رکتی ہے اور اپنے اندر پوشیدہ اس پراسرار قوت کو کس طرح بیدار کیا جاسکتا ہے، میں تمہیں بعد میں بتاؤں گا اور مجھے وثوق ہے کہ تمہیں اس پراسرار سفر میں کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی۔"

گوتم بھوش اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ میں نے اور دھیراج نے بھی اپنی اپنی جگہ چھوڑ دی۔ بیرونی ہال میں اس وقت بھی بیشتر لوگ بیٹھے ہوئے اپنی اپنی مشقوں میں مشغول تھے۔ ان میں ایک بوڑھی مرد اور دو عورتیں بھی شامل تھیں۔

گوتم بھوش وہیں رک گیا۔ اس نے میرے ساتھ دونوں ہاتھ جوڑ کر اپنی پیشانی کو چھوا جس کا مطلب تھا کہ اس کی ملاقات ختم۔

یوگی دھیراج کانیچ کے باہر والے دروازے تک رخصت کرنے کے لیے میرے ساتھ آیا۔ اسے یہ جان کر بڑی خوشی ہوئی تھی کہ میں اس کے گرد کے گرد کا چیلا ہوں۔

کانیچ کے دروازے پر ہم نے ایک دوسرے کو پرنام کیا اور میں وہاں سے چل پڑا۔ میرے اندازے کے مطابق اس وقت ساڑھے دس کا وقت تھا۔ خنکی بہت بڑھ گئی تھی۔ بازاروں کی رونق بھی اجڑ چکی تھی۔ تاہم کہیں کہیں ریسٹورنٹس کھلے ہوئے تھے۔

میں جب اپنے کانیچ پر پہنچا تو گیارہ بج چکے تھے۔ شوبھا دیوی سو چکی تھی اور سونیا میرے انتظار میں جاگ رہی تھی۔

"ارے! کہاں رہ گئے تھے تم؟ میں تو پریشان ہوگئی تھی۔" سونیا نے کہا۔

"پریشانی کیسی؟" میں نے جواب دیا "میں کوئی بچہ تو ہوں نہیں جو راستہ بھٹک جاتا۔"

"راستہ بھٹکنے کی بات نہیں ہے۔" سونیا بولی "یہاں رہزنی کی وارداتیں ہوتی رہتی ہیں۔ غنڈے اور بدمعاش کونوں کھدروں میں گھات لگائے موقع کی تاک میں رہتے ہیں۔ اکیلے آدمی کو دیکھ کر جھپٹ پڑتے ہیں۔ چند روپوں کے لیے کسی کو موت کے گھاٹ اتار دینے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتے۔ ہم جب سے یہاں آئے ہیں اس وقت سے اب تک یہاں اسی طرح قتل کی دو وارداتیں ہوچکی ہیں۔"

"یہ اتفاق ہے کہ مجھے راستے میں کوئی رہزن یا بدمعاش نہیں ملا۔ شاید آئندہ کبھی ملاقات ہوجائے۔" میں نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے جواب دیا۔

"چائے پیو گے؟" اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں۔ طلب تو ہو رہی ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"چائے نہیں۔ میں کافی بنا کر لاتی ہوں۔ بہت دیر سے برا بھلا دل چاہ رہا تھا اور میں تمہارا ہی انتظار کر رہی تھی۔" سونیا یہ کہتے ہوئے کچن کی طرف چلی گئی اور میں اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔

وہ شب خوابی کے لباس میں تھی۔ باہر اگرچہ خاصی خنکی تھی لیکن دروازے اور کھڑکیاں بند ہونے کی وجہ سے کانیچ کے اندر کی فضا خاصی خوشگوار تھی۔ پیروں سے جوگرز اتارتے ہوئے مجھے اچانک ہی ان غیر ملکی سیاحوں کا خیال آیا جو کھلی فضا میں چھولداریوں یا خیموں میں پڑے ہوئے تھے لیکن پھر میں نے سر جھٹک دیا۔ ان کی زندگیاں گھروں سے باہر ہی گزرتی ہیں اور اس قسم کی تکلیفوں کے عادی ہوتے ہیں لیکن میں جانتا تھا کہ انہوں نے سردی کے بچاؤ کا کوئی نہ کوئی بندوبست ضرور کر رکھا ہوگا۔

چند منٹ بعد سونیا کافی بنا کر لے آئی۔ اس نے دونوں مگ سینٹر ٹیبل پر رکھ دیے اور سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئی۔

"تمہارے نئے پڑوسیوں کا کیا حال ہے؟" میں نے اپنا مگ اٹھا کر چسکی لیتے ہوئے پوچھا۔

"تمہارے جانے کے تھوڑی دیر بعد دو افراد یہاں آئے تھے۔ ایک وہ لڑکی جس نے نیکر پہن رکھی تھی اور دوسرا اس کا داڑھی والا ساتھی۔" سونیا نے جواب دیا "یہ لوگ پیرس سے آئے ہیں اور ایک دو روز یہاں رہ کر دھرم شالا کی طرف چلے جائیں گے۔ تمہارے آنے سے کچھ دیر پہلے میں انہی لوگوں کے بارے میں سوچ رہی تھی۔"

"کیا۔۔۔؟" میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"وہ لوگ سردی سے ٹھٹھر رہے ہوں گے۔" سونیا بولی۔

"یہ تمہارا خیال ہے۔" میں نے جواب دیا "ان کے پاس سردی سے بچاؤ کا پورا بندوبست ہوگا۔ یہ لوگ سلیپنگ بیگز اپنے ساتھ رکھتے ہیں اور یہ سلیپنگ بیگز اتنے گرم ہوتے ہیں کہ سردی لگنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

"پھر بھی کھلی فضا میں۔۔۔" وہ بولی۔

"تو پھر ایسا کرو کہ انہیں یہاں لے آؤ۔" میں نے کافی کی چسکی لیتے ہوئے کہا "وہ لوگ یہاں کمرے میں سوجائیں گے اور ہم باہر گھوم پھر کر رات بتادیں گے۔"

"اب ایسی بھی ہمدردی نہیں ہے مجھے ان سے۔" سونیا نے تیوری چڑھا کر جواب دیا۔

میں نے صرف مسکرانے پر ہی اکتفا کیا تھا۔ کافی پینے کے بعد میں کچھ دیر اور وہاں بیٹھا اور پھر اٹھ کر کمرے میں آگیا۔ سونیا خالی مگ اٹھا کر کچن کی طرف چلی گئی تھی۔

میں کمرے میں آکر بستر پر لیٹ گیا اور پائنتی کی طرف پڑا ہوا کمبل کھول کر اپنے اوپر ڈال لیا۔ میرا خیال تھا کہ سونیا بھی سونے کے لیے اپنے کمرے میں چلی جائے گی لیکن وہ میرے کمرے میں آگئی۔ ٹھنڈے پانی سے مگ دھونے سے وہ ایک دم سردی محسوس کرنے لگی تھی۔ کمرے میں آکر اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ بیڈ کے قریب ہی ایک کرسی بھی پڑی تھی اور میرا خیال تھا کہ وہ کرسی پر بیٹھ جائے گی لیکن دوسرے ہی لمحے وہ اچھل کر بیڈ پر آگئی اور میرے کمبل میں گھس گئی۔ میں ایک دم حواس باختہ سا ہوگیا۔ میں نے اٹھنے کی کوشش کی تو وہ مجھ سے لپٹ گئی۔

"اگر تم نے بھاگنے کی کوشش کی تو میں شور مچادوں گی۔ شوبھا اٹھ کر آجائے گی اور وہ تمہارے بارے میں کوئی اچھا تاثر نہیں لے گی۔ آرام سے لیٹے رہو۔" اس نے مجھے کھینچ کر دوبارہ بستر پر گرا دیا۔

سونیا نے بڑی خوفناک دھمکی دی تھی۔ اگر اس کی تیز آواز سن کر شوبھا آجاتی تو وہ قصوروار مجھے ہی سمجھتی۔ ایسے معاملات میں مجرم مرد کو ہی سمجھا جاتا ہے۔ یہ تو کوئی سوچنے کی ضرورت ہی نہیں محسوس کرتا کہ عورت بھی کسی مرد کے ساتھ اس قسم کی زیادتی کرسکتی ہے۔

میں نے سونیا کو گھور کر دیکھا تو اس کے ہونٹوں پر گہری مسکراہٹ آگئی۔

"کیا تم سمجھتے ہو کہ میں واقعی شور مچادوں گی۔" وہ بولی "لیکن کیا مجھے اتنا بھی حق نہیں کہ تمہارے پاس بیٹھ سکوں۔"

"پرانی دوستی کے ناتے میں تمہیں اس حق سے محروم نہیں کروں گا لیکن اس حق کے معاملے میں مجھے تم پر بھروسا نہیں رہا۔" میں نے جواب دیا۔

"میں تمہیں کھا نہیں جاؤں گی۔" سونیا نے جواب دیا۔

"لیکن اگر شوبھا جاگ گئی اور اس نے ہمیں اس طرح دیکھ لیا تو وہ کیا سوچے گی!" میں نے کہا۔

"شوبھا کی آنکھ صبح چھ بجے سے پہلے نہیں کھلے گی اور ویسے اطمینان رکھو۔ تمہارے بارے میں اس کے خیالات بہت مختلف ہیں۔ آج وہ تمہاری باتوں سے بہت متاثر ہوئی ہے۔ آرام سے لیٹ جاؤ۔ میں اس کے بارے میں تمہیں کچھ بتانا چاہتی ہوں۔"

میں گہرا سانس لیتے ہوئے پلنگ کی پشت سے ٹیک لگا کر نیم دراز ہوگیا اور کمبل اپنے اوپر سے ہٹا دیا تاکہ اتفاق سے شوبھا کی آنکھ کھل جائے اور وہ اپنے کمرے سے نکل کر اس طرف آجائے تو اسے کسی قسم کی غلط فہمی نہ ہو۔

"کیا بتانا چاہتی ہو؟" میں نے گردن گھما کر سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"شوبھا جے پور میں اپنی جائداد بیچنے اور یہاں گیسٹ ہاؤس کھولنے کے معاملے میں خاصی سنجیدہ ہے۔" سونیا نے جواب دیا۔

"کوئی بات ہوئی تھی؟" میں نے پوچھا۔

"دوپہر کو بھی بات ہوئی تھی اور شام کو تمہارے جانے کے بعد بھی۔" سونیا نے جواب دیا "تمہاری باتوں سے اسے کافی حوصلہ ملا ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور بات بھی ہے جس کی وجہ سے وہ جے پور سے نکلنا چاہتی ہے۔"

"کوئی خاص بات؟" میں نے ایک بار پھر سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"جے پور کا ایک سیاست داں دیش مکھ بہت عرصے سے شوبھا کو پریشان کررہا ہے۔" سونیا نے جواب دیا۔ وہ بھی میری پشت سے ٹیک لگا کر نیم دراز ہوگئی تھی اور میرے لیے اچھی بات یہ تھی کہ اس نے کوئی شرارت کرنے کی کوشش نہیں کی تھی "یوگا سے علاج تو ایک بہانہ ہے۔ وہ دیش مکھ سے چھپ کر یہاں آئی ہے۔"

"کب تک چھپی رہے گی۔ ایک دن تو اسے واپس جانا ہی ہوگا۔" میں نے اس کے خاموش ہونے پر کہا "لیکن دیش مکھ اسے کیوں پریشان کررہا ہے۔ وہ کیا چاہتا ہے؟"

"پہلے تو دیش مکھ کی نظریں شوبھا کی پراپرٹی پر تھیں۔" سونیا نے جواب دیا "کافی ہاؤس والی بلڈنگ کے علاوہ مہاویر روڈ پر اس کا ڈیڑھ ایکڑ کا ایک پلاٹ بھی ہے۔ جس پر بھینسوں کا باڑا بنا ہوا ہے۔ یہ پلاٹ شوبھا کے شوہر نے بہت عرصہ پہلے خریدا تھا اور اس کے گرد چار دیواری اٹھا کر چھوڑ دیا گیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ مناسب وقت پر بیچ دیا جائے گا لیکن زندگی نے اسے موقع نہیں دیا۔

"شوبھا نے یہ پلاٹ اپنے ایک جاننے والے کو بغیر کرائے کے دے دیا جس پر اس نے بھینسوں کا باڑا بنالیا۔ شوبھا کا خیال تھا کہ اس طرح اس کے پلاٹ کی حفاظت رہے گی اور ضرورت کے وقت اسے خالی کروالیا جائے گا لیکن تقریباً ایک سال پہلے گوالے کو پلاٹ خالی کرنے کو کہا گیا تو اس نے صاف انکار کردیا۔ اسے پولیس کی دھمکی بھی دی گئی لیکن اس کے چند ہی روز بعد دیش مکھ شوبھا کے فلیٹ پر پہنچ گیا۔" سونیا خاموش ہوگئی۔ اسے سردی لگ رہی تھی۔ اس نے ٹانگیں سمیٹ کر کمبل اچھی طرح لپیٹ لیا "اس وقت میں بھی وہاں موجود تھی۔" وہ کہہ رہی تھی "میں نے یہ بات خاص طور پر نوٹ کی تھی کہ شوبھا کو دیکھ کر دیش مکھ کی آنکھوں میں عجیب سی چمک ابھر آئی تھی۔ تم نے شوبھا کو دیکھا ہی ہے۔ کتنی حسین ہے وہ۔ سادگی میں بھی اس کا حسن قیامت خیز ہے۔ میک اپ اور دوسرے کپڑوں میں تو وہ اور بھی قیامت بن جاتی ہوگی۔ بہرحال، دیش مکھ کی آنکھوں میں ابھرنے والی چمک دیکھ کر میں بھی دہل گئی تھی۔

"دیش مکھ نے شوبھا سے کہا کہ اس کے پلاٹ پر جس گوالے نے بھینسوں کا باڑا بنا رکھا ہے وہ اس کا آدمی ہے اس لیے اسے وہاں سے ہٹانے کی کوشش نہ کی جائے۔ اس نے وہ پلاٹ خالی کروا دیا لیکن دیش مکھ تلملا اٹھا۔

"ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ اس کارروائی کے بعد دیش مکھ دبک کر بیٹھ جاتا لیکن اس قسم کے لوگ آسانی سے کسی بات کو نہیں سمجھتے۔ وہ اپنے خلاف کسی بھی قسم کی کارروائی کو اپنی ہتک سمجھتے ہیں۔ دیش مکھ بھی بپھر گیا اور شوبھا کو ہراساں کرنے کے لیے نت نئے ہتھکنڈے استعمال کرنے لگا۔

"وہ سیاست داں ہے۔ اسمبلی کا ممبر ہے۔ اس کا بھی اثر و رسوخ ہے۔ اس کے علاوہ وہ غنڈا بھی ہے۔ ایسے لوگ آسانی سے اپنی شکست نہیں مانتے۔ اس نے ایک اور چال چلی۔"

"کیسی چال؟" سونیا کے خاموش ہونے پر میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"چند مہینے پہلے وہ ایک بار پھر شوبھا کے فلیٹ پر آیا تو حلیہ بدلا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ دو عورتیں بھی تھیں۔ دیش مکھ، شوبھا کے لیے بہت سے تحائف لے کر آیا تھا اور ان تحائف میں جیولری کا ایک قیمتی سیٹ بھی تھا۔ اس نے باتوں ہی باتوں میں شوبھا کو شادی کی پیشکش کی تو وہ ایک دم بھڑک اٹھی اور انہیں ذلیل کرکے گھر سے نکال دیا۔

"دیش مکھ نے اسے سوچنے کے لیے ایک مہینے کا وقت دیا اور ساتھ ہی یہ دھمکی بھی دی کہ اگر اس نے غلط فیصلہ کیا تو اسے سنگین نتائج بھگتنا پڑیں گے۔

"اس بات کو تین مہینے گزر چکے ہیں۔ اس دوران میں دیش مکھ خود تو اس کے فلیٹ پر نہیں آیا لیکن وہ بار بار فون کرتا رہتا ہے۔ پندرہ دن پہلے اس نے فون پر آخری مرتبہ دھمکی دی تھی کہ اگر شوبھا نے جواب نہیں دیا تو وہ اسے اپنے آدمیوں کے ذریعے اٹھوالے گا اور جب تک کوئی اس کی مدد کو آئے گا اس وقت تک وہ شوبھا کے ساتھ بہت کچھ کرچکا ہوگا۔

"میں شوبھا کو بہت اچھی طرح سمجھ چکی ہوں۔ وہ بہت شریف عورت ہے۔ خوب صورت ہے، عمر بھی زیادہ نہیں ہے۔ دھرم کے معاملے میں اتنی کٹر بھی نہیں ہے۔ اسے دوسری شادی کرنے میں بھی کوئی اعتراض نہیں ہے لیکن دیش مکھ جیسے شخص سے تو شادی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ وہ آدمی ہے جو کپڑوں کی طرح عورتیں بدلتا ہے۔ ایسے لوگ شادی کا مفہوم نہیں سمجھتے۔ شوبھا جانتی ہے وہ اسے شادی کا چکما کیوں دے رہا ہے۔ اس کی نظریں دراصل شوبھا کی جائداد، خصوصاً اس پلاٹ پر ہیں۔ شوبھا کے حسن کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں ہوس کی چمک جاگ اٹھتی ہے لیکن وہ دھمکی آمیز تھا۔ وہ شکل و صورت سے بھی غنڈا ہی لگتا ہے اور اس نے غنڈوں کی فوج بھی پال رکھی ہے۔ دیش مکھ کا شمار ان لوگوں میں کیا جاسکتا ہے جو اپنے رتبے سے بھرطور پر ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں اور سماجی کاموں کی آڑ میں گھناؤنے دھندے کرتے ہیں۔ شہر میں دلالی شراب اور منشیات کی سپلائی پر دیش مکھ کا کنٹرول ہے۔ ایک دو اور پارٹیاں بھی اگرچہ یہ دھندا کررہی ہیں لیکن دیش مکھ نے ان سب کو دبا رکھا ہے۔

"انہی دنوں ایک اخبار نے اس کے کالے دھندوں کی تفصیل شائع کی تھی۔ اس کے ایک ہفتے بعد اخبار کے دفتر کو آگ لگا دی گئی۔ ایڈیٹر کو اس کے دفتر میں قتل کردیا گیا اور اس رپورٹر کی ادھڑی ہوئی لاش بھی ایک سڑک پر پڑی ہوئی ملی تھی جس نے اس کے خلاف وہ رپورٹ مرتب کی تھی۔ سب ہی لوگ جانتے تھے کہ اخبار کے دفتر اور پریس میں آتش زدگی اور ایڈیٹر اور رپورٹر کے قتل میں کس کا ہاتھ ہوسکتا ہے لیکن پولیس نے دیش مکھ کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی۔ اس کے برعکس اس کی مخالف پارٹی کے چند آدمیوں کو پکڑ کر ان کی دھنائی کردی۔ بہرحال..." سونیا نے گہرا سانس لیتے ہوئے بات جاری رکھی۔

"شوبھا نے ایک بار پھر گوالے کو پلاٹ خالی کرنے کو کہا اور اس کے انکار پر وہ پولیس اسٹیشن پہنچ گئی۔ پولیس کو یہ پتا چل گیا تھا کہ دیش مکھ بھی اس معاملے میں دلچسپی لے رہا ہے۔ انہوں نے شوبھا کو ٹال دیا اور گوالے کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی گئی۔

"اس کے دو دن بعد دیش مکھ ایک بار پھر شوبھا کے فلیٹ پر پہنچ گیا اور اس کا پلاٹ خریدنے کی پیشکش کی۔ اس نے پلاٹ کی اتنی کم قیمت لگائی تھی کہ اس پر سوچنا بھی وقت اور اپنی ضائع کرنے کے مترادف تھا۔ اس وقت وہ پلاٹ کم سے کم بیس کروڑ روپے مالیت کا ہے اور دیش مکھ اسے صرف پچاس لاکھ کی آفر دے رہا ہے۔ اس نے اپنے غنڈوں کے ذریعے شوبھا پر دباؤ بھی ڈلوانا شروع کردیا۔ کافی ہاؤس میں توڑ پھوڑ ہونے لگی۔ پولیس کو ان واقعات کی اطلاع دی جاتی لیکن شوبھا کے ساتھ قانون کے محافظوں کا طرزِ عمل معاندانہ تھا۔ وہ الٹا اس کو دبانے کی کوشش کرتے۔

"دیش مکھ کا دباؤ بڑھتا رہا۔ شوبھا نے راجا صاحب سے مدد مانگی۔ یہ وہی سابق راجا ہے جس کا علاج شوبھا کے شوہر نے کیا تھا اور اس نے خوش ہوکر کافی ہاؤس والی بلڈنگ انہیں دے دی تھی۔ راجا صاحب کے دباؤ کی وجہ سے پولیس

میں جانتی ہوں شوبھا سے اس کا دل بہت جلد بھر جائے گا اور اس دوران میں جب وہ دھوکے سے یا دھونس دھمکیوں سے شوبھا کی جائداد پر قابض ہو جائے گا تو اسے اٹھا کر سڑک پر پھینک دے گا۔

"دیش مکھ سے بچنے کے لیے ہی شوبھا چوری چھپے یہاں آتی ہے۔ کل گیسٹ ہاؤس یا ریسٹورنٹ کی بات ہوئی تھی۔ اس معاملے میں وہ اب بہت سنجیدہ ہے اور اس کا خیال ہے کہ جے پور کی جائداد فروخت کرنے کے لیے تمہارے دوست ٹھاکر سے مدد لے گی۔ شوبھا سمجھتی ہے کہ یہاں وہ محفوظ رہے گی۔ جے پور میں وہ کسی کو ہوا بھی نہیں لگنے دے گی کہ کہاں گئی ہے۔"

"یہ اس کی خام خیالی ہے کہ یہاں دیش مکھ کے شر سے محفوظ رہے گی۔" میں نے سونیا کے خاموش ہونے پر کہا "دارا کو شاید تم بھول چکی ہو۔ اس گندی فطرت کے لوگ نہ خود چین سے بیٹھتے ہیں نہ دوسروں کو بیٹھنے دیتے ہیں۔ دارا نے ہمیں کتنا پریشان کیا تھا۔ دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک اس نے کہیں بھی ہمیں چین سے نہیں بیٹھنے دیا۔ بہرحال، شوبھا اگر یہ سمجھتی ہے کہ وہ یہاں محفوظ رہے گی تو میں اس کے دل میں کوئی وسوسہ نہیں ڈالنا چاہتا۔ میں ٹھاکر سے کہہ دوں گا۔ وہ اس کی ہر ممکن مدد کرے گا لیکن میرے خیال میں شوبھا اگر جے پور ہی میں رہے تو ٹھاکر بہتر طور پر اس کی مدد کر سکے گا۔"

"میرے خیال میں ایسا ممکن نہیں ہے۔" سونیا نے جواب دیا "وہ، دیش مکھ سے خوف زدہ ہے۔ ایک اکیلی عورت اس جیسے لوگوں کے خلاف کر بھی کیا سکتی ہے۔ جے پور میں رہتے ہوئے اسے ٹھاکر کا سہارا تو بہت ہوگا اور وہ اپنے پتی کے دوست راجا سے بھی مدد لے سکتی ہے لیکن بات تو وہی ہے۔ جب تک کوئی اس کی مدد کو آئے گا شوبھا کا کام ہو چکا ہوگا اس لیے وہ اتنا دور چلی جانا چاہتی ہے کہ دیش مکھ کی نظر اس تک نہ پہنچ سکے۔ اس نے شاید بہت پہلے سے یہ فیصلہ کر لیا تھا۔ وہ یہاں چوری چھپے آئی ہے۔ اس کے کافی ہاؤس کے منیجر کو بھی معلوم نہیں کہ وہ کہاں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ شوبھا یہ سوچ کر ہی یہاں آئی ہو کہ صورت حال کا جائزہ لے کر کوئی فیصلہ کرے گی اور کل اس نے تمہارے سامنے اس کا تذکرہ بھی کر دیا اور تم نے کاروباری حوالے سے اپنی رائے بھی دے دی اور ٹھاکر کے تعاون اور امداد کی امید بھی دلا دی لیکن اصل بات وہی ہے جو میں نے بتائی ہے۔ وہ دیش مکھ کی نظروں سے دور رہنا چاہتی ہے۔"

"لیکن اس نے شاید یہ نہیں سوچا کہ اس دنیا میں جو قدم پر دیش مکھ جیسے لوگ ہیں جو اس کا جینا حرام کر دیں گے۔" میں نے کہا "عورت خوب صورت ہو، جوان ہو، اکیلی ہو اور اس کے پاس بے حساب دولت بھی موجود ہو تو ہوس کے پجاری مردار خور گدھوں کی طرح اس کے آس پاس منڈلانے لگتے ہیں۔"

"ایک بات کہوں؟" سونیا میری طرف دیکھنے لگی۔

"بولو۔" میں نے کہا۔

"تمہارے لیے اب کوئی مسئلہ باقی نہیں رہا۔ تم یہاں کیوں نہیں رہ جاتے؟" سونیا نے کہا "شوبھا کو بھی آرام رہے گا اور۔۔۔"

"نہیں سونیا۔" میں نے اسے بات پوری کرنے کا موقع نہیں دیا "میں زیادہ عرصہ یہاں نہیں رہ سکوں گا۔"

"فی الحال تو تم یہیں ہو نا۔" سونیا نے کہا "ٹھیک ہے ہم پھر کسی وقت بات کریں گے۔ ہو سکتا ہے صورت حال کو دیکھتے ہوئے تم اپنا خیال بدل دو۔"

"اس وقت تو مجھے نیند آ رہی ہے۔" میں نے کہا "لان رہے ہیں۔ بہتر ہوگا کہ تم بھی جا کر سو جاؤ۔ صبح بات کریں گے۔"

اور مجھے یہ جان کر بڑی حیرت ہوئی کہ سونیا بغیر کسی حیل و حجت کے بستر سے اٹھ کر شوبھا والے کمرے میں چلی گئی۔ وہ اپنا بستر گزشتہ رات ہی اس کمرے میں لے گئی تھی۔

میں نے بستر پر لیٹ کر کمبل اوڑھ لیا۔ کچھ دیر تک شوبھا کے بارے میں سوچتا رہا اور پھر میری آنکھیں بند ہونے لگیں۔

رات کو دیر سے سونے کے باوجود میری آنکھ صبح سویرے ہی کھل گئی۔ اس وقت چھ بج رہے تھے۔ میں بستر سے نکلا اور کاٹیج کا دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔ کچھ دیر تک ادھر ادھر ٹہلتا رہا اور پھر ایک جگہ پر بیٹھ کر سانس کی مشق کرنے لگا۔ میں نے اس وقت بھی بیٹھنے کے لیے پدم یا کمل آسن اختیار کیا تھا۔ یوگا کی لاتعداد مشقوں میں یہ آسن اختیار کیا جا سکتا تھا۔

جیسے ہی سورج طلوع ہوا، میں اپنی مشق ختم کر کے کاٹیج کی طرف واپس آ گیا۔ واپسی پر میں بڑے بڑے پتھروں کی آڑ میں غیر ملکی سیاحوں کے خیمے کے قریب سے گزرا تھا۔ خیمہ چاروں طرف سے بند تھا اور اندر خاموشی تھی۔ ظاہر ہے لوگ سلیپنگ بیگز میں دبکے گہری نیند سو رہے ہوں گے۔ ٹھیک سات بجے یوگی دھیراج آ گیا۔ وہ شوبھا کو اس کے

کمرے میں مشق کروا تا رہا لیکن میں اس کے سامنے نہیں آیا اور اپنے کمرے میں بیڈ کی پشت سے ٹیک لگائے بیٹھا چائے پیتا رہا۔ سونیا بھی میرے سامنے بیٹھی چائے کی چسکیاں لے رہی تھی۔

شوبھا سے میری ملاقات ناشتے پر ہی ہوئی تھی لیکن اس وقت کوئی ایسی بات نہیں ہوئی۔ میں خود سے کوئی بات نہیں کرنا چاہتا تھا اور میرا خیال تھا کہ سونیا نے رات کو مجھ سے جو باتیں کی تھیں، شوبھا سے ابھی تک ان کا کوئی تذکرہ نہیں کیا تھا۔

ہم ابھی ناشتا کر رہے تھے کہ گٹار کی آواز سنائی دینے لگی۔ اس کے ساتھ ہی میرے ذہن میں ان غیر ملکی ٹورسٹوں کا خیال ابھر آیا۔ کل جب وہ لوگ یہاں آئے تھے تو کسی ایک کے پاس میں نے گٹار بھی دیکھا تھا اور پھر تھوڑی ہی دیر بعد فضا میں ایک ناگوار سی بو محسوس کر کے میں چونک گیا۔ یہ بو میرے لیے اجنبی نہیں تھی۔ سونیا اور شوبھا نے بھی یہ بو محسوس کر لی تھی۔ شوبھا تو ناگوار سے انداز میں اپنے نتھنے سکوڑنے لگی۔

"یہ۔۔۔ یہ بو کیسی ہے؟" وہ اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔

"ہمارے پڑوس میں جو لوگ آ کر آباد ہوئے ہیں وہ دم مار رہے ہیں۔" میں یہ کہتے ہوئے اٹھ گیا۔ شوبھا شاید میری بات کا مطلب نہیں سمجھ سکی تھی لیکن سونیا کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آ گئی تھی۔

میں کاٹیج سے باہر آ گیا اور نتھنے پھلا پچکا کر فضا میں کچھ سونگھنے کی کوشش کرنے لگا اور پھر سُلگنے والے انداز میں ان بڑے بڑے پتھروں کی طرف چلنے لگا جن کی دوسری طرف ان غیر ملکیوں کا خیمہ نصب تھا۔

میرا اندازہ درست نکلا۔ ان کا داڑھی والا ایک ساتھی ایک پتھر پر بیٹھا گٹار بجا رہا تھا اور باقی چاروں خیمے کے سامنے زمین پر ایک دائرے کی صورت میں بیٹھے چرس پی رہے تھے۔ نیکر والی لڑکی کے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی چلم تھی۔ جس پر تمباکو کے ساتھ چرس بھری ہوئی تھی۔ اس کے نیچے ایک پلاسٹک کپڑا لگا ہوا تھا۔ لڑکی نے چلم کو دونوں ہاتھوں میں مخصوص انداز میں پکڑ کر نچلا حصہ ہونٹوں سے لگایا اور پھیپھڑوں کی پوری قوت سے سانس اندر کو کھینچنے لگی۔

ایک بھرپور کش لگانے کے بعد اس نے سلفی اپنے ساتھی کی طرف بڑھا دی اور نڈھال سی ہو کر زمین بوس ہو گئی۔ اس کی آنکھوں سے پانی بہہ نکلا تھا۔ وہ زمین پر بے سدھ سی پڑی گہرے گہرے سانس لے رہی تھی۔

وہ باری باری کش لگاتے رہے۔ میں پتھر کی آڑ میں کھڑا تھا اس لیے وہ ابھی تک مجھے نہیں دیکھ سکے تھے۔ میں جب ان کے سامنے آیا تو اس وقت سلفی دوسری لڑکی کے پاس تھی۔

انہوں نے مجھے دیکھ لیا لیکن ان میں سے کسی کے چہرے پر پریشانی کے آثار نمودار نہیں ہوئے تھے۔ دوسری لڑکی نے سلفی دکھا کر مجھے بھی دعوت دی۔ میں ان کے قریب ایک پتھر پر بیٹھ گیا اور باری باری ان کی شکلیں دیکھنے لگا۔

یہ منظر میرے لیے اجنبی نہیں تھا۔ تھائی لینڈ میں خصوصاً بنکاک میں قدم قدم پر ایسے مناظر دیکھنے کو ملتے تھے۔ امریکی اور یورپین ہپی محض منشیات کی طلب میں دنیا بھر میں آوارہ گردی کرتے پھرتے ہیں۔ یہ زیادہ تر ان ممالک کا رخ کرتے ہیں جہاں چرس اور ہیروئن جیسی منشیات آسانی سے دستیاب ہو جاتی ہیں۔

ان لوگوں کا تعلق بھی اسی قبیل سے تھا۔ ان میں ایک لڑکی اور ایک لڑکے کا تعلق لندن سے تھا جبکہ باقی تینوں فرانس کے رہنے والے تھے۔ سفر کے دوران میں ہی یہ لوگ آپس میں مل گئے تھے اور اس طرح یا جماعت آوارہ گردی کر رہے تھے۔ منشیات کی طلب انہیں ہندوستان لے آئی تھی۔ ہندوستان میں انہوں نے اپنا سفر بمبئی سے شروع کیا تھا اور کل شام یہاں پہنچے تھے۔ ان کا ارادہ ہماچل پردیش کی طرف جانے کا تھا، جہاں بقول ان کے، دنیا کی بہترین چرس ملتی تھی۔

میں بھی ایک عرصے سے ہندوستان میں رہ رہا تھا لیکن یہاں منشیات کے حوالے سے میری معلومات صفر کے برابر تھی لیکن ان ہپیوں کو ایک ایک بات کا علم تھا۔ انہیں پتا تھا کہ پوست کی کاشت کن علاقوں میں ہوتی تھی اور سب سے اچھی چرس یا ہیروئن کہاں مل سکتی تھی۔ ان کے کہنے کے مطابق پوست جتنی زیادہ بلندی پر کاشت ہوگی، چرس اور ہیروئن کی کوالٹی اتنی ہی زیادہ بہتر ہوگی اور یہ لوگ چرس اور ہیروئن کی اعلیٰ کوالٹی سے لطف اندوز ہونے کے لیے ہماچل پردیش کی طرف جا رہے تھے۔ وہاں چرس کی خرید و فروخت اور اس کے استعمال پر کوئی پابندی بھی نہیں تھی۔ چرس یا ہیروئن کسی بھی دکان یا ڈھابے سے بغیر کسی دشواری کے خریدی جا سکتی تھی۔

ہم جیسے لوگ جب سفر پر نکلتے ہیں تو سب سے بڑی پریشانی زاد راہ کی ہوتی ہے۔ ہمیں سوبار سوچنا پڑتا ہے کہ سفر کے دوران میں ہم کھائیں گے کہاں سے؟ ٹھہریں گے کہاں اور

دوسرے اخراجات کیسے پورے ہوں گے لیکن یورپین ہپیوں کو ایسی کوئی پریشانی نہیں ہوتی۔ وہ اپنا بینک ساتھ لے کر چلتے ہیں۔ ہپیوں کے ہر گروپ میں کوئی نہ کوئی خوب صورت اور جوان لڑکی ضرور ہوتی ہے اور یہی خوب صورت لڑکی ان کے لیے پیرچیک کی حیثیت رکھتی ہے جسے جب چاہا اور جہاں چاہا کیش کروالیا جاتا ہے۔ اس طرح ان کے اخراجات پورے ہوتے رہتے ہیں۔

اس گروپ کے ساتھ دو لڑکیاں تھیں۔ دونوں جوان اور حسین تھیں اس لیے ان لوگوں کو اخراجات کی بھی کوئی پریشانی نہیں تھی۔

میں تقریباً ایک گھنٹے تک ان کے پاس بیٹھا گپ شپ کرتا رہا۔ انہوں نے ابھی تک ناشتا نہیں کیا تھا۔ چائے کا ایک گھونٹ تک نہیں پیا تھا لیکن چرس کا زہریلے دھڑک اپنے پھیپھڑوں میں اتار رہے تھے۔ سلفی کے کش لگانے کے بعد اب انہوں نے چرس بھرے سگریٹ سلگا لیے تھے اور ادھر اُدھر بیٹھے کش لگا رہے تھے۔ اس دوران میں نیکر والی وہ لڑکی اپنی جگہ سے اٹھ کر میرے قریب آگئی۔ اس نے اپنی شرٹ کا ایک اور بٹن کھول لیا تھا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ وہ مسکراتے ہوئے میری طرف جھکنے لگی۔ اس نے انگلیوں میں دبا ہوا سگریٹ بھی میری طرف بڑھا دیا۔

میں ایک جھٹکے سے اٹھ گیا اور تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے کاٹیج کی طرف واپس آگیا۔

سونیا اور شوبھا کاٹیج کے سامنے کرسیوں پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ ایک خالی کرسی میرے لیے بھی رکھی ہوئی تھی۔ ناشتے کے دوران میں ہم نے چائے نہیں پی تھی۔ سونیا کاٹیج میں جاکر چائے بنا لائی اور چائے پیتے ہوئے میں انہیں ان غیر ملکی ٹوریسٹوں کے بارے میں بتانے لگا۔

انہی باتوں کے دوران میں سونیا نے رات والی گفتگو کا ذکر چھیڑ دیا۔ اس طرح مجھے شوبھا کے بارے میں اس سے براہ راست بات کرنے کا موقع مل گیا۔ میں نے صرف ایک سوال کیا تھا اور شوبھا پلٹ پڑی تھی۔ وہ رکے بغیر اپنے بارے میں سب کچھ بتاتی چلی گئی۔

"کیا آپ سمجھتی ہیں کہ اس طرح دیش مکھ کے شر سے محفوظ رہ سکیں گی؟" میں نے اس کے خاموش ہونے پر کہا۔

"شاید ایسا نہ ہو۔" شوبھا نے جواب دیا "لیکن میرے غائب رہنے سے اتنا فائدہ تو ضرور ہوگا کہ وہ شیطان مجھے بھلا دے گا اور عرصے بعد جب کبھی ہمارا آمنا سامنا ہو تو ہو سکتا ہے وہ۔۔۔"

"دیش مکھ جیسے بدکردار لوگ دولت اور عورت کو کبھی نہیں بھولتے۔" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا "لیکن بہرحال، اگر آپ اس میں اپنا کوئی مفاد سمجھتی ہیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ میں آج ہی ٹھاکر سے فون پر بات کرکے اسے یہاں بلوا لیتا ہوں۔ وہ آپ کو بہتر مشورہ دے سکتا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ تم ٹھاکر کو یہاں بلا ہی لو۔ میں اس سے بات کروں گی۔" شوبھا نے کہا۔ گویا وہ جے پور میں اپنی جائداد بیچنے اور یہاں رشی کیش میں سیٹل ہونے کا فیصلہ کر چکی تھی۔

اس دوران میں سونیا سودا سلف لینے کے لیے بازار چلی گئی۔ اس نے مجھے بھی چلنے کو کہا تھا لیکن اس وقت میرا کہیں جانے کا موڈ نہیں تھا۔ میں وہیں بیٹھا شوبھا سے باتیں کرتا رہا اور پھر شوبھا بھی اٹھ کر کاٹیج میں چلی گئی۔

تھوڑی ہی دیر بعد وہی نیکر اور اوپن شرٹ والی ہپی لڑکی آگئی اور نہایت بے تکلفی سے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی۔ وہ کافی دیر تک بیٹھی باتیں کرتی رہی اور پھر میں نے اسے بھگا دیا۔

میں کرسی سے اٹھنا چاہتا تھا کہ شوبھا کاٹیج سے باہر آگئی۔ اسے دیکھ کر میں چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ وہ نہا کر آئی تھی۔ کپڑے بھی بدل لیے تھے۔ وہی سفید ساڑی اور سفید بلاؤز۔ ساڑی کا پلو نیچے لٹکا ہوا تھا اور سر کے لمبے بال اس نے تولیے میں لپیٹ رکھے تھے۔

میں گہری نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا اور پہلی بات تو یہ ہے کہ اسے اس طرح بغور دیکھنے کا پہلی مرتبہ موقع ملا تھا۔ وہ بیوہ ضرور تھی لیکن عمر زیادہ نہیں تھی اور اس کے حسین ہونے میں بھی کوئی شبہ نہیں تھا۔ لانبا قد، گداز بدن، بادام جیسی موٹی موٹی سیاہ آنکھیں، گلاب کی پتیوں جیسے سرخ ہونٹ، لمبے سیاہ بال اور بدن کی رنگت ایسی جیسے میدے میں گلابی رنگ گھول کر بنایا گیا ہو۔

اب یہ بات میری سمجھ میں آگئی تھی کہ وہ کم بخت دیش مکھ نیچے جھاڑ کر اس کے پیچھے کیوں پڑ گیا تھا۔ اور بھی بہت سے لوگ ہوں گے جو اسے دیکھ کر ٹھنڈے سانس بھرتے ہوں گے۔ ہو سکتا ہے کچھ نے مہذبانہ انداز میں اپنے دل کی بات بھی کہہ دی ہو لیکن انکار سن کر دوبارہ کچھ کہنے کی ہمت نہ ہوئی ہو۔ یہ ہمت تو دیش مکھ میں پیدا ہوئی تھی اور وہ اس کے درپے آزار ہو گیا تھا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ شوبھا کے حسن و شباب کے ساتھ اس کی دولت بھی تھی۔ دیش مکھ سیاست داں تھا۔ اس کے بارے میں ہر شخص بہت کچھ نہیں تو کچھ نہ کچھ ضرور جانتا ہوگا۔ شوبھا بھی جانتی ہوگی اور جب اس نے گوالے کے ذریعے اس کے پلاٹ پر قبضہ کرنے کی کوشش کی تھی تو شوبھا کو تجربہ ہو گیا تھا کہ وہ کس قسم کا آدمی ہے اور اب وہ اس سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی۔

"کیا دیکھ رہے ہو؟" شوبھا نے مجھے اپنی طرف گھورتے پا کر کہا۔

"اوہ۔۔۔ کچھ نہیں۔" میں گڑبڑا سا گیا۔

شوبھا نے جرح نہیں کی اور کرسی اٹھا کر دھوپ میں بیٹھ گئی۔ اس وقت اگرچہ گیارہ بج چکے تھے لیکن نرم دھوپ بہت بھلی اور خوشگوار لگ رہی تھی۔ میں ایک پتھر پر بیٹھ گیا اور اس کی طرف دیکھتا رہا۔

ابھی زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ میں ان ہپیوں کو پتھروں کی آڑ سے برآمد ہوتے دیکھ کر چونک سا گیا۔ انہوں نے اپنے اپنے بیگ کندھوں پر لاد رکھے تھے۔ قریب سے گزرتے ہوئے وہ چند لمحوں کو رک گئے۔ کلین شیو والے نے بتایا کہ وہ شملہ جا رہے ہیں۔ وہاں سے دھرم شالا کی طرف نکل جائیں گے۔

تھوڑی دیر بعد سونیا بھی سودا لے کر آگئی اور میں اٹھ کر اس سرسبز پہاڑی پر اِدھر اُدھر گھومنے لگا۔ کاٹیج کے عقب میں تقریباً پچاس گز کے فاصلے پر شفاف پانی کی ایک چھوٹی سی ندی بہہ رہی تھی۔ میں پانی میں پیر لٹکا کر بیٹھ گیا اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

شام کی چائے میں نے سونیا اور شوبھا کے ساتھ پی اور پھر میں بازار کی طرف نکل گیا۔ بازار میں کئی پبلک فون شاپس تھیں۔ میں ایک دکان پر رک گیا۔ دکان کیا تھی، سڑک کے کنارے لکڑی کا ایک بڑا سا کیبن تھا۔ وہاں ایک لمبی سی میز تھی جس پر تین ٹیلی فون سیٹ رکھے ہوئے تھے۔ اس کے سامنے ایک لمبی سی بینچ بچھی ہوئی تھی۔ دوسری طرف ایک کرسی تھی جس پر اس فون شاپ کا مالک بیٹھا ہوا تھا۔ اس کیبن میں ایک طرف بوتھ بھی بنا ہوا تھا اس میں بھی دیوار کے ساتھ ایک ٹیلی فون سیٹ لگا ہوا تھا۔ اس بوتھ میں ایک آدمی کھڑا ہو کر فون پر بات کر سکتا تھا۔

میز پر رائٹنگ پیڈ اور بال پین بھی رکھا ہوا تھا۔ میں نے ٹھاکر کا نمبر لکھ کر پیڈ کرسی پر بیٹھے ہوئے آدمی کی طرف بڑھا دیا۔

"جے پور کا نمبر ہے۔ لائن ملنے میں کتنی دیر لگے گی؟"

"لائن تو ایک سیکنڈ میں مل جائے گی مگر پچاس روپے ہوں گے۔" اس نے نمبر دیکھتے ہوئے کہا۔

"کتنے منٹ؟" میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"منٹ کی کوئی پابندی نہیں۔ آرام سے بات کر لینا۔" اس نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے۔ نمبر ملا دو۔ میں اس فون پر بات کروں گا۔" میں نے بوتھ کی طرف اشارہ کیا اور جیب سے پچاس روپے نکال کر اس کے حوالے کر دیے۔

مجھے بڑی حیرت ہوئی تھی۔ ٹرنک کال صرف پچاس روپے میں اور وقت کی کوئی پابندی نہیں تھی حالانکہ ٹرنک کالز میں ایک ایک منٹ کا حساب ہوتا ہے اور بڑی مہنگی کالز ہوتی ہیں۔ یہ سب کرپشن کا کمال تھا۔ پی سی او اور ٹیلی فون ایکسچینج والے ملی بھگت سے ایسے دھندے کر رہے تھے کہ کمائی تو ان لوگوں کی ہو اور بوجھ سرکار کو اٹھانا پڑے۔

اس نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ لائن ملنے میں چند سیکنڈ سے زیادہ نہیں لگے اور پھر اس نے مجھے بوتھ کی طرف جانے کا اشارہ کیا۔ میں نے بوتھ میں داخل ہو کر ہک پر ٹنگا ہوا ریسیور اٹھا لیا۔

کال ٹھاکر ہی نے ریسیو کی تھی۔ وہ میری آواز سنتے ہی چہک اٹھا۔ میں پہلے تو ٹھاکر سے خیر خیریت دریافت کرتا رہا پھر جلد ہی اصل موضوع پر آگیا اور اسے شوبھا کے بارے میں بھی بتا دیا۔

"بہتر ہوگا کہ تم ایک دو دن کے لیے یہاں آجاؤ۔ تم لوگوں سے ملنے کو بہت دل چاہتا ہے۔" میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ میں روپ متی اور بملا کو لے کر ایک دو روز میں پہنچ رہا ہوں۔ وہ دونوں بھی تمہیں بہت یاد کرتی ہیں۔ بس تمہارے ہی نام کی مالا جپتی رہتی ہیں۔ بملا تو ہمیں بہت پریشان کرتی ہے کہ ہم نے تمہیں جانے ہی کیوں دیا تھا۔ وہ جب تمہارے بارے میں سنے گی تو بہت خوش ہوگی۔"

"اوکے۔" میں نے کہا "میں انتظار کروں گا۔" میں نے اسے اپنا پتا سمجھا دیا اور فون بند کرکے بوتھ سے باہر آگیا۔

"مہاراج۔ آپ کو جب بھی فون کرنا ہو، یہاں آجایا کریں۔ ڈومیسٹک کال پچاس روپے اور انٹرنیشنل صرف سو روپے۔ وقت کی کوئی پابندی نہیں۔ اپنے دوستوں اور گھر والوں سے جتنی دیر چاہیں بات کریں۔"

"شکریہ مہاراج۔" میں نے بھی دونوں ہاتھ جوڑ دیے "جب بھی کہیں کال کرنے کی ضرورت پڑی، میں یہیں آؤں گا۔"

فون شاپ سے نکل کر میں کچھ دیر بازاروں میں گھومتا

رہا اور پھر گوتم بھوش کے کانیج آگیا۔ یہاں لوگ مختلف مشقوں میں مشغول تھے۔ میں بھی ان میں شامل ہوگیا۔

مشقوں سے فارغ ہو کر کافی دیر گوتم بھوش سے گپ شپ ہوتی رہی اور پھر یہ طے ہوا کہ اگلے روز صبح مجھے کنڈلینی کی ریاضت شروع کردینی چاہیے۔

اس روز بھی میں رات گیارہ بجے کے قریب اپنے کانیج واپس آیا تھا۔ شوبھا سو چکی تھی البتہ سونیا میرے انتظار میں جاگ رہی تھی۔ اس نے کھانے کے لیے پوچھا تو میں نے انکار کردیا۔ طبیعت نہیں چاہ رہی تھی۔

اگلے روز صبح ہی میں گوتم بھوش کے پاس پہنچ گیا۔ میرے لیے ایک الگ کیبن نما کمرے کا انتظام کردیا گیا تھا۔ اصل جاپ شروع کرنے سے پہلے میں نے سانس کی ایک دو مشقیں کیں اور پھر پدم آسن اختیار کرکے بیٹھ گیا۔ اس سے پہلے گوتم بھوش نے مجھے بڑی تفصیل سے بتادیا تھا کہ ریڑھ کی ہڈی کے نیچے پوشیدہ آتشی ناگن یا کنڈلینی کو کس طرح بیدار کیا جاسکتا ہے اور پوری ریاضت کے دوران میں کیسے کیسے مرحلے پیش آتے ہیں۔

گوتم بھوش کے کہنے کے مطابق، ریاضت پر عمل کرتے ہوئے ایک خاص عرصہ گزر جانے کے بعد اچانک بجلی سی چمکتی ہوئی دکھائی دیتی ہے اور یوگ کرنے والا اس روشنی میں نہا جاتا ہے۔ اس کے بعد ایک ایسا مرحلہ بھی آتا ہے کہ یوگی اپنے آپ کو ہوا میں معلق محسوس کرتا ہے جیسے زمین سے اس کا کوئی تعلق نہ رہا ہو اور جب ریاضت سے توجہ ہٹتی ہے تو وہ اپنے آپ کو زمین پر بیٹھے ہوئے پاتا ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ عجیب و غریب اور ناقابل یقین قسم کے واقعات پیش آتے رہتے ہیں اور پھر وہ مرحلہ بھی آجاتا ہے جب ریڑھ کی ہڈی کے آخری سرے سے کوئی چیز اوپر کی طرف رینگتے ہوئے محسوس ہونے لگتی ہے۔ یہی کنڈلینی یا آتشی ناگن یا اس پراسرار قوت کی بیداری کا نقطہ آغاز ہے۔

جیسے ہی یہ پراسرار قوت بیدار ہونا شروع ہوتی ہے انسان کے اندر لاشعوری مزاحمت بھی شروع ہوجاتی ہے "ارے چھوڑو۔ یہ کس چکر میں پڑگئے ہو۔ یہ تو سادھوؤں کے کام ہیں۔ تم تو اچھے خاصے سمجھ دار انسان ہو۔ یہ کام تمہارے بس کا نہیں ہے۔" اس قسم کے لاشعوری خیالات حملہ آور ہوتے رہتے ہیں اور دراصل یہی وہ وقت ہوتا ہے جب زیادہ یک سوئی اور ریاضت کی ضرورت ہوتی ہے۔ عدم توجہی سے سارا کھیل بگڑ سکتا ہے۔

اس کے بعد ایک اور مرحلہ آتا ہے جب یوگ کرنے والے کو اپنا جسم سکڑتا اور سمٹتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ درحقیقت ایسا نہیں ہوتا۔ جسم میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی تو اس پراسرار قوت کا کرشمہ ہے جو ریڑھ کی ہڈی میں سے ہوتی اوپر کی طرف سرایت کرتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے یوگی روشنی کے سمندر میں غوطہ زن ہو۔ پانی کی طرح روشنی کی لہروں کے تھپیڑے لگتے رہتے ہیں۔ یوگی اپنے آپ کو ایک نئی اور پراسرار دنیا میں محسوس کرتا ہے جہاں کی ہر چیز انوکھی ہے۔ ریاضت ختم کرکے یہ سب کچھ غائب ہوجاتا ہے لیکن ریاضت جب دوبارہ شروع کی جاتی ہے تو یوگی ایک بار پھر اس پراسرار دنیا میں پہنچ جاتا ہے۔

اس کے بعد ایک اور مرحلہ آتا ہے جب یوگی اپنے آپ کو بالکل مفلوج اور بے دست و پا سمجھنے لگتا ہے جیسے جسم میں جان نہ رہی ہو لیکن رفتہ رفتہ یہ کیفیت ختم ہوجاتی ہے اور یوگی اپنے آپ کو ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ذہنی قوتیں وسعت اختیار کرنے لگتی ہیں اور ریڑھ کی ہڈی میں لہریں بدستور اوپر کی طرف رینگتے ہوئے محسوس ہوتی رہتی ہیں۔

اور پھر ایک اور نیا مرحلہ شروع ہوتا ہے۔ بھوک پیاس غائب ہوجاتی ہے۔ کسی سے بات کرنے کو دل نہیں چاہتا۔ بالکل الگ تھلگ رہنے کو دل چاہتا ہے اور دل چاہتا ہے کہ اس پراسرار دنیا کی سیر کی جائے۔ بعض اوقات نیند اڑ جاتی ہے اور بے چینی کی سی کیفیت طاری رہنے لگتی ہے لیکن چند روز بعد یہ کیفیت تو ختم ہوجاتی ہے البتہ ایک نئی الجھن پیدا ہوجاتی ہے۔

یہ مرحلہ بہت زیادہ کٹھن ہوتا ہے۔ ریاضت یا جاپ میں دل نہیں لگتا۔ خیالات کو یکسو کرنا بے حد کٹھن لگتا ہے اور وہ کیفیت حاصل کرنے کے لیے بڑی محنت اور کوشش کرنی پڑتی ہے۔ اگر یوگی ہمت ہار جائے تو ساری محنت پر پانی پھر جاتا ہے۔ تاہم کوشش جاری رکھی جائے تو یکسوئی حاصل ہوتے ہی وہ پراسرار شکتی ریڑھ کی ہڈی کے نیچے ایک بار پھر اوپر کی طرف رینگتے ہوئے محسوس ہونے لگتی ہے۔

اس موقع پر کانوں میں عجیب خوفناک اور گرج دار آوازیں گونجنے لگتی ہیں جیسے پہاڑ ٹوٹ رہے ہوں۔ جسم پھیلتا ہوا محسوس ہوتا ہے حالانکہ جسم میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ یوگی کو یوں لگتا ہے جیسے وہ کسی پراسرار قسم کے چکر میں پھنس گیا ہو اور اس چکر سے نکلنا اس کے بس میں نہ ہو۔

اب ایک نیا مرحلہ شروع ہوجاتا ہے۔ بھوک پیاس غائب ہوجاتی ہے۔ نیند اڑ جاتی ہے اور بستر پر لیٹنے کی صورت میں ریڑھ کی ہڈی میں کرنٹ سا محسوس ہوتا ہے۔ آنکھیں سرخ ہوجاتی ہیں اور چہرے سے وحشت سی برسنے لگتی ہے۔ اس دوران میں وہ پراسرار قوت بدستور اوپر کی طرف چڑھتے ہوئے محسوس ہوتی ہے اور بعض اوقات سانپ کے پھنکارنے کی سی آوازیں سنائی دیتی ہیں شاید اسی لیے اس پراسرار قوت کا نام کنڈلینی شکتی رکھا گیا ہے۔ اس پراسرار قوت کی حرکت روز بہ روز بڑھتی رہتی ہے اور وہ ریڑھ کی ہڈی میں راستہ بناتے ہوئے دماغ کی طرف اپنا سفر جاری رکھتی ہے۔

اور پھر وہ آخری مرحلہ آتا ہے جب یوگی طرح طرح کے اندیشوں میں مبتلا ہوجاتا ہے۔ اسے خوف کے سائے گھیرنے لگتے ہیں۔ چہرہ زرد، گال پچکے ہوئے اور جسم میں آگ سی لگتے ہوئے محسوس ہوتی ہے۔ یوگی برسوں کا بیمار نظر آتا ہے۔ اس دوران میں وہ پراسرار قوت بدستور اوپر کی طرف اپنا سفر جاری رکھتی ہے اور جب یہ دل میں سے گزرتی ہے تو دل کی دھڑکن تیز ہوجاتی ہے۔

اور پھر یہ مرحلہ بھی گزر جاتا ہے۔ جسم کی توانائیاں آہستہ آہستہ بحال ہونے لگتی ہیں۔ یہ پراسرار قوت جسم کے جس جس عضو سے گزرتی ہے اسے بیدار کرتی چلی جاتی ہے اور جب یہ کنڈلینی یا پراسرار قوت دماغ میں پہنچتی ہے تو یوں لگتا ہے جیسے پورا وجود روشنی میں نہا گیا ہو اور یوگی اپنے آپ کو نیا انسان محسوس کرنے لگتا ہے۔ اس کے اندر وہ قوتیں بیدار ہوجاتی ہیں جن کا عام انسان تصور بھی نہیں کرسکتا۔

"گرو کی رہنمائی کے بغیر اس طرح کے جاپ خطرناک بھی ثابت ہوسکتے ہیں۔" گوتم بھوش کہہ رہا تھا "اس لیے جب بھی تم کوئی پریشانی یا غیر معمولی بات محسوس کرو، مجھے بتا دینا۔ جاپ کے دوران میں خوراک کا بھی خاص خیال رکھا جاتا ہے۔ وہ میں تمہیں ساتھ ساتھ بتاتا رہوں گا۔ اب تم شروع ہوجاؤ۔ ویسے مجھے دشواس ہے کہ تمہیں کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی۔"

گوتم بھوش اس کیبن نما کمرے سے نکل گیا۔ میں نے آنکھیں بند کرلیں اور تپسیا شروع کردی۔ گوتم بھوش نے مجھے یہ بھی سمجھا دیا تھا کہ ریڑھ کی ہڈی کے نچلے حصے میں خوابیدہ اس پراسرار قوت کو بیدار کرنے کے لیے کس طرح ضربیں لگائی جاسکتی ہیں۔

تین چار روز گزر گئے۔ میری ریاضت جاری رہی اور اس دوران میں میری معمول کی سرگرمیوں میں بھی کوئی فرق نہیں آیا۔

ٹھاکر کو فون کیے ہوئے پانچ روز گزر چکے تھے اور وہ چھٹا دن تھا۔ اس وقت رات کے دس بج رہے تھے۔ ہم کانیج میں شوبھا والے کمرے میں بیٹھے چائے پیتے ہوئے باتیں کررہے تھے کہ باہر سے بہت سے قدموں اور باتوں کی آوازیں سنائی دینے لگیں اور پھر ایک آواز سن کر میری آنکھوں میں چمک سی ابھر آئی۔ وہ ٹھاکر کی آواز تھی۔ اسی لمحے دروازے پر دستک کی آواز ابھری اور میں اٹھ کر دروازے کی طرف لپکا۔

وہ ٹھاکر ہی تھا۔ اس کے ساتھ روپ متی اور بملا بھی تھی۔ وہ تینوں مجھ سے اس طرح ملے جیسے مدتوں سے بچھڑے ہوئے ہوں۔ بملا کی آنکھوں میں تو آنسو آگئے تھے۔

سونیا اور شوبھا بھی روپ متی اور بملا سے اسی انداز میں ملی تھیں۔ شوبھا کی ان سے اگرچہ پہلے کبھی ملاقات نہیں ہوئی تھی لیکن روپ متی جے پور کی ایک معروف ہستی تھی۔ اسے تو شہر کا ہر شخص جانتا تھا۔ شوبھا نے ٹھاکر سے مل کر بھی بہت خوشی کا اظہار کیا تھا۔

"آپ لوگ کب آئے۔ اس وقت تو کوئی بس نہیں آتی؟" سونیا نے پوچھا۔

"ہم لوگ دوپہر کو یہاں پہنچے تھے۔ بہت تھکے ہوئے تھے۔ گیسٹ ہاؤس میں جاتے ہی سوگئے۔" ٹھاکر نے جواب دیا۔

"گیسٹ ہاؤس کیوں ٹھاکر جی؟" شوبھا بولی "یہ کانیج موجود ہے نا۔ اس میں اتنی گنجائش تو ہے کہ سب لوگ سماسکیں۔"

"بات یہ ہے شوبھا جی۔" ٹھاکر نے کہا "میں نے سوچا سوٹ کیس اٹھائے کہاں گھومتے پھریں گے۔ پہلے کسی ٹھکانے کا بندوبست کرلیا جائے پھر تسلی سے آپ لوگوں کو تلاش کریں گے۔"

"اب تو آپ یہاں پہنچ گئے نا۔" شوبھا بولی "اب آپ لوگ واپس نہیں جائیں گے۔ صبح سونیا گیسٹ ہاؤس سے سامان لے آئے گی۔"

"چلیے، ٹھیک ہے۔ ہم آپ کی بات مان لیتے ہیں۔" ٹھاکر مسکرایا۔

"ہمارا یہ ٹھکانا تلاش کرنے میں دشواری تو پیش نہیں آئی؟" میں نے پوچھا۔

"تم نے پتا اس قدر تفصیل سے سمجھایا تھا کہ ہمیں کسی اور دروازے پر دستک دینے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ گیسٹ ہاؤس سے نکلنے کے بعد سیدھے یہیں آکر رکے

ہیں۔" ٹھاکر نے جواب دیا۔

سونیا بہلا کے قریب بیٹھی باتیں کررہی تھی پھر وہ اٹھ کر کچن میں چلی گئی اور کچھ دیر بعد چائے بنا کرلے آئی۔ چائے پینے کے دوران میں باتوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ ٹھاکر اور شوبھا ذاتی طور پر ایک دوسرے کو نہیں جانتے تھے مگر ان کا بزنس ایک ہی تھا۔ وہ ہوٹلنگ کے بزنس کے بارے میں بات کرتے رہے۔

"یہ جگہ بھی اچھی ہے۔" ٹھاکر کہہ رہا تھا "میں دو تین مرتبہ پہلے بھی یہاں آچکا ہوں۔ یہاں سرائے، گیسٹ ہاؤسز اور ہوٹل تو بے شمار ہیں مگر کوئی ڈھنگ کا ہوٹل یا گیسٹ ہاؤس نہیں ہے۔ ایک مرتبہ میں نے بھی یہاں ہوٹل بنانے کے بارے میں سوچا تھا مگر مصروفیت کی وجہ سے اس طرف توجہ نہیں دے سکا تھا۔"

"تو پھر آپ کا کیا خیال ہے؟" شوبھا نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا "اگر یہاں کوئی معیاری گیسٹ ہاؤس اور اس کے ساتھ ریسٹورنٹ بنایا جائے تو اس کی کامیابی کے کتنے فیصد امکانات ہیں؟"

"اس قسم کے بزنس کبھی فیل نہیں ہوتے۔" ٹھاکر نے جواب دیا "میرا پروگرام تو یہ تھا کہ ایک معیاری رہائشی ہوٹل کے ساتھ ایک ہاسٹل بھی بنایا جائے۔ لوگ دور دراز کے علاقوں سے یہاں یوگا سیکھنے کے لیے آتے ہیں۔ ہر شخص کے پاس اتنا پیسہ نہیں ہوتا کہ وہ کسی اچھے ہوٹل میں رہائش اختیار کرسکے۔ سستے گیسٹ ہاؤسز اور سرائے وغیرہ میں انہیں وہ سہولتیں نہیں ملتیں جس کے وہ حق دار ہوتے ہیں۔ میرا پروگرام یہ تھا کہ ہوسٹل کا ایک ایک کمرا دو دو آدمیوں کے لیے مخصوص رکھا جائے۔ کرایہ بھی کم ہوگا اور انہیں مناسب سہولتیں بھی ملیں گی لیکن یہ لمبا کام ہے۔ آپ ان بکھیڑوں میں کہاں پڑیں گی۔ ایک معیاری گیسٹ ہاؤس اور اس کے ساتھ ریسٹورنٹ ایک آئیڈیل پروگرام ہے۔ اس سلسلے میں مجھ سے جو بھی ہوسکے گا وہ میں آپ کے لیے کروں گا۔"

"شکریہ ٹھاکر جی۔" شوبھا نے کہا "لیکن اس کے لیے سب سے پہلے ہمیں یہاں کوئی مناسب جگہ دیکھنی ہوگی۔"

"وہ ہم دیکھ لیں گے۔" ٹھاکر نے جواب دیا "میں دو چار دن یہاں رہوں گا۔ ہم گھوم پھر کر دیکھ لیں گے۔ جگہ تلاش کرلیں گے۔"

"اور ٹھاکر جی۔" شوبھا نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "جے پور میں میرا پلاٹ اور کافی ہاؤس ہے۔ اس کا بندوبست بھی آپ ہی کو کرنا ہوگا۔ دراصل میں اب واپس نہیں جانا چاہتی۔ میں آپ کو پاور آف اٹارنی دے سکتی ہوں۔ آپ جس طرح مناسب سمجھیں، میری جائداد کو ڈسپوز آف کردیں۔ اس شہر سے میرا دل اچاٹ ہوگیا ہے۔"

"کافی ہاؤس اور وہ بلڈنگ تو مجھے میں نے خرید لی۔" ٹھاکر نے مسکراتے ہوئے کہا "آپ اس کی جو قیمت لگائیں میں وہ میں دوں گا۔ اس میں بھی کوئی بارگیننگ نہیں ہوگی اور وہ پلاٹ۔ اس کے لیے مجھے مارکیٹ سے قیمت لگوانی ہوگی اور وہ وشواس کیجیے۔ میں اس میں بھی آپ کو کوئی نقصان نہیں ہونے دوں گا۔"

"وشواس!" شوبھا بولی "آپ نے عجیب بات کہہ دی ٹھاکر جی۔ وجدان کے ہوتے ہوئے مجھے کیا پروا ہوسکتی ہے۔ آپ میرے لیے جو بھی کریں گے، ٹھیک ہی کریں گے۔"

"وجدان تو ہیرا ہے ہیرا۔" ٹھاکر مسکرایا "میں نے تو اسے کہا تھا کہ میرا ہوٹل یا ریسٹورنٹ سنبھال لے لیکن یہ نہیں مانا۔ چلیے اچھا ہے آپ کے ساتھ رہے گا۔ آپ دونوں سے ملاقات کے بہانے ہمیں بھی کبھی کبھی یہاں آنے کا موقع مل جایا کرے گا لیکن وجدان نے مجھے فون پر بتایا تھا کہ آپ دیش مکھ سے خوف زدہ ہیں اور اس کی وجہ سے جے پور چھوڑنا چاہتی ہیں۔ اگر ایسی بات ہے تو میں آپ کو مشورہ دوں گا کہ آپ جے پور ہی میں رہیں۔ میرے ہوتے ہوئے کوئی مائی کا لال آپ کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھ سکتا۔ اس دیش مکھ کو میں بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ تو تھرڈ ریٹ غنڈا ہے۔ رام گنج بازار اور گھاٹ دروازہ کے علاقے کی دکانوں سے بھتا وصول کیا کرتا تھا اور آئے دن پٹتا تھا۔ لوگوں سے بھی اور پولیس سے بھی۔ وہ تو پریم چند راٹھور نے اسے اٹھا دیا لیکن اسے بھی کیا ملا؟ دیش مکھ کی وجہ سے اسے ذلت اٹھانی پڑی اور آخر اسی نمک حرام کے ہاتھوں مارا بھی گیا لیکن راٹھور ہی نے اپنی آستین میں پلنے والے اس سانپ کو دودھ پلا پلا کر اتنا طاقت ور بنا دیا تھا کہ پولیس راٹھور کے قتل کے الزام میں بھی اس کے خلاف کوئی کارروائی نہ کرسکی۔ دراصل راٹھور کی زندگی میں ہی اس دیش مکھ نے اپنے نیچے زمین میں اس مضبوطی سے گاڑ لیے تھے کہ اسے ہلانا مشکل ہوگیا تھا۔"

"مجھے اس کا اندازہ ہوچکا ہے۔" شوبھا نے کہا "وہ تو بھگوان بھلا کرے راجا صاحب کا۔ اگر وہ پولیس کمشنر پر دباؤ نہ ڈالتے تو یہ شیطان میرا پلاٹ ہضم کرجاتا۔ میں نے سنا ہے کہ اس نے میرے پلاٹ پر کئی منزلہ پلازا تعمیر کرانے کے لیے نقشہ بھی بنوالیا تھا۔"

"لیکن محض دیش مکھ کے خوف سے جے پور چھوڑ کر آپ بہت بڑی غلطی کررہی ہیں شوبھا جی۔" ٹھاکر نے کہا۔

"اب تو اس شہر سے جی اکھڑ چکا ہے۔" شوبھا نے گہرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا "یہ جگہ مجھے پسند آگئی ہے۔ ہردوار بھی یہاں سے زیادہ دور نہیں۔ مہینے میں ایک چکر تو لگتا رہے گا۔"

"میں ایک بار پھر کہوں گا کہ دیش مکھ کا خوف ذہن سے نکال دیں۔" ٹھاکر نے کہا "میں وہاں موجود رہوں گا۔ اس کے تعلقات کتنے ہی وسیع کیوں نہ ہوں، وہ کتنا ہی طاقت ور کیوں نہ بن گیا ہو، اس نے غنڈوں کی کتنی ہی بڑی فوج کیوں نہ بنالی ہو مگر میں بھی ایسے لوگوں سے نمٹنا جانتا ہوں۔ میں غنڈوں کی اس سے بھی بڑی فوج جمع کرسکتا ہوں۔ اس نے کبھی آپ کی طرف میلی آنکھ سے بھی دیکھا تو اسے جے پور تو کیا پورے ہندوستان میں کہیں پناہ نہیں ملے گی۔"

"نہیں ٹھاکر جی۔" شوبھا نے کہا "میں نے جے پور واپس نہ جانے اور یہاں رہنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" ٹھاکر نے گہرا سانس لیتے ہوئے اس کے ساتھ ہی گفتگو کا موضوع بدل دیا۔

شوبھا دو بجے تک ہمارے پاس بیٹھی رہی پھر سونے کے لیے اپنے کمرے میں چلی گئی۔ ہم لوگ لاؤنج میں تھے۔ میں نے بہلا اور روپ متی سے کہا تھا کہ وہ سونیا والے کمرے میں سوجائیں مگر انہوں نے اس جگہ سے اٹھنے کا نام نہیں لیا۔ صوفے اور کرسیاں ہٹا دی گئیں۔ اس طرح دری پر اتنی جگہ بن گئی کہ ہم سب وہیں تیم دراز ہوگئے۔ سونیا کمرے سے کمبل اٹھا لائی تھی جو ہم نے پیروں پر ڈال لیے۔

چار بجے تک باتوں کا سلسلہ جاری رہا۔ کبھی روپ متی، سونیا کو جے پور میں میری سرگرمیوں کے قصے سنانے لگتی اور کبھی سونیا مسکرا کر تھائی لینڈ والی میری کہانیاں اسے سنانے لگتی۔ روپ متی کو یہ جان کر بڑی حیرت ہوئی تھی کہ میں نے تھائی لینڈ کے شہنشاہ کے خلاف ایک خوفناک سازش کو ناکام بنایا تھا اور میرے لیے اب بھی تھائی سرکار کی طرف سے یہ پیشکش برقرار ہے کہ میں جب چاہوں وہاں جاکر کوئی بڑا عہدہ سنبھال سکتا ہوں۔

اور پھر جاپانی کی باتیں شروع ہوگئیں۔ سونیا انہیں بتا رہی تھی کہ جاپانی کس طرح مجھ پر جان چھڑکتی تھی۔ اس داستان میں تھائی کا ذکر بھی آیا۔ میں اسے کیسے بھول سکتا تھا۔ سونیا نے اس کی یاد تازہ کرکے میرے زخموں کو چھیڑ دیا تھا۔

صبح چار بجے تک باتیں ہوتی رہیں۔ ٹھاکر تو بہت پہلے ہی اونگھنے لگا تھا۔ بہلا اور روپ متی ایک لمبے سفر سے تھکی ہوئی تھیں لیکن یہ ہمت تھی کہ چار بجے تک جاگتی رہی تھیں اور بالآخر وہ بھی اونگھنے لگیں۔ میں ٹھاکر کے قریب لیٹ گیا اور سونیا نے بھی بہلا کے قریب جگہ سنبھال لی۔

صبح چھ بجے میری آنکھ کھل گئی۔ سونیا بھی جاگ گئی۔ اس کی آنکھیں سرخ ہورہی تھیں۔ اس نے میرے لیے ہلکا سا ناشتا تیار کردیا۔ میں نے کچن ہی میں چوکی پر بیٹھ کر ناشتا کیا اور پھر بڑی آہستگی سے کاٹیج سے نکل گیا۔

صبح ناشتے کے بعد جوگنگ اور لمبی واک اگرچہ صحت کے اصولوں کے خلاف تھا لیکن میں پہاڑیوں پر دور تک چکر لگاتا رہا۔ مجھے جگہ جگہ کئی یوگی جاپ اور مختلف مشقوں میں مصروف نظر آئے تھے۔ میں نے بھی ایک جگہ بیٹھ کر تھوڑی دیر سانس کی مشق کی اور پھر گم بھوش کے کاٹیج پہنچ گیا اور اس کے تھوڑی ہی دیر بعد اپنی ریاضت شروع کردی۔

دس بجے میں اپنے کاٹیج واپس پہنچا تو شوبھا اور ٹھاکر باہر کرسیوں پر بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ میں بھی وہیں بیٹھ گیا اور سونیا نے کاٹیج سے برآمد ہو کر چائے کی ایک پیالی میرے ہاتھ میں بھی تھمادی۔ بہلا اور روپ متی ابھی تک سو رہی تھیں۔

گیارہ بجے کے قریب وہ دونوں بیدار ہوئیں تو میں اور ٹھاکر اس وقت بازار کی طرف جارہے تھے۔

ہم دونوں پورا دن شہر کے گرد و نواح میں گھومتے رہے۔ ہم نے دو تین جگہوں کا انتخاب کیا تھا۔ وہ جگہیں شہر کے مرکز سے زیادہ دور بھی نہیں تھیں کہ کسی کے لیے وہاں پہنچنا مشکل ہو۔ ان میں ایک جگہ مجھے سب سے زیادہ پسند آئی تھی۔ وہ تقریباً پانچ سو فٹ اونچی پہاڑی کے دامن میں ایک وسیع پتھریلا سا میدان تھا جس کے ایک طرف نشیب میں تاحد نگاہ سرسبز وادی پھیلی ہوئی تھی۔ اس میدان کے عقب میں پہاڑی میں تقریباً تیس فٹ چوڑی ایک دراڑ تھی جہاں تقریباً سو فٹ کی بلندی سے آبشار گر رہا تھا۔ جہاں پانی گرتا تھا وہاں ایک لمبا چوڑا تالاب سا بن گیا تھا اور اس تالاب کا پانی ایک چھوٹی ندی کی صورت میں نشیب کی طرف بہہ رہا تھا۔

ایک پتھریلا راستہ شہر کے نواح سے یہاں تک آتا تھا۔ اس راستے پر اگرچہ گاڑی وغیرہ نہیں چل سکتی تھی لیکن یہاں سڑک بنائی جاسکتی تھی۔

میرے خیال میں یہ گیسٹ ہاؤس اور ریسٹورنٹ کے لیے ایک آئیڈیل جگہ تھی۔ اس آبشار کو گیسٹ ہاؤس اور ریسٹورنٹ کی حدود میں شامل کرکے اسے خوب صورت بنایا جاسکتا تھا۔

"یہ جگہ مجھے بھی پسند آئی ہے۔" ٹھاکر نے میری بات کا جواب دیتے ہوئے کہا "لیکن بہتر یہ ہے کہ ہم شوبھا کو بھی یہ تمام جگہیں دکھادیں تاکہ وہ بھی کوئی رائے دے سکے۔"

"یہی مناسب رہے گا۔" میں نے کہا۔

واپس آتے ہوئے ہم ایک ڈھابے کے سامنے بیٹھ گئے جہاں چائے کا بھی بندوبست تھا۔ یہاں بینچوں پر چند گاہک اور بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ ملازم لڑکے نے ہمارے سامنے چائے لاکر رکھ دی۔

"تمہارا کیا پروگرام ہے؟" ٹھاکر نے اپنا کپ اٹھاتے ہوئے کہا۔

"میں نے یوگا کی ایک مشق شروع کر رکھی ہے۔ تم اسے جاپ کہہ سکتے ہو۔ اس کے مکمل ہونے میں کچھ عرصہ لگے گا۔ اس کے بعد میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔" میں نے بھی اپنا کپ اٹھاتے ہوئے جواب دیا۔ کپ اگرچہ میلا سا تھا لیکن پہلی چسکی لیتے ہی اندازہ ہوگیا کہ چائے بڑی خوش ذائقہ تھی۔

"میں نے تمہیں پیشکش کی تھی کہ جے پور میں ہوٹل یا ریسٹورنٹ سنبھال لو لیکن تم نے منع کردیا۔" ٹھاکر نے کہا "اب تمہیں میرا مشورہ یہ ہے کہ یہاں رہ جاؤ۔ شوبھا کے پاس۔ وہ بڑی اچھی عورت ہے اور تم سے بہت متاثر ہے۔ تم یہاں رہ جاؤ گے تو اسے بھی ڈھارس رہے گی۔"

"کسی ایک جگہ ٹک کر بیٹھنا شاید میرے مقدر میں نہیں ہے۔" میں نے جواب دیا "میرا کام ابھی ادھورا ہے۔ اسے مکمل کرنا ہے۔ اس کے بعد اگر موقع ملا تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ سیدھا تمہارے پاس آؤں گا۔"

"سونیا کی باتوں سے یہ انکشاف ہوتا ہے کہ وہ بہت عرصے تمہارے ساتھ رہی ہے اور جے پور میں بھی اس سے تمہاری ملاقات ہوچکی ہے لیکن جے پور میں تم نے کبھی اس کا ذکر تو نہیں کیا تھا۔" ٹھاکر نے کہا۔

"جے پور میں سونیا سے میری ملاقات اتفاقیہ طور پر ہوئی تھی۔" میں نے جواب دیا "میں اس رات کافی پینے کے خیال سے کافی ہاؤس گیا تھا اور وہاں سونیا کو دیکھ کر چونک گیا تھا۔ ایک دو ملاقاتیں اس کے بعد بھی ہوئی تھیں اور میرا خیال تھا کہ میں اسے تم لوگوں سے ملواؤں گا لیکن ان دنوں ہم بلونت سنگھ والے معاملے میں الجھے ہوئے تھے اور پھر ہم سارسکا چلے گئے۔ واپس آنے کے بعد نہ تو سونیا سے میری ملاقات ہوئی اور نہ ہی میں اسے تم لوگوں سے ملوا سکا اور پھر جس روز میں یہاں رشی کیش پہنچا ہوں اس روز شام کو اتفاق سے سونیا سے آمنا سامنا ہوگیا۔ وہ مجھے کانیج میں لے آئی جہاں شوبھا سے ملاقات ہوئی۔

"شوبھا کے بارے میں سونیا نے مجھے دوسرے دن بتایا تھا اور پھر اس سے اگلے روز شوبھا سے براہ راست بات ہوئی۔ وہ دیش مکھ سے اس قدر خوف زدہ ہے کہ بے پور واپس نہیں جانا چاہتی۔"

"لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ وہ یہاں محفوظ رہے گی۔" ٹھاکر نے میرے خاموش ہونے پر کہا "دیش مکھ کو میں بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ کمینہ آدمی ہے۔ اس کے غائب ہونے کے بعد وہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے نہیں بیٹھا رہے گا اور کبھی نہ کبھی اسے تلاش کرلے گا۔ شوبھا بے حد حسین ہے۔ اس کا خیال آسانی سے دل سے نہیں نکالا جاسکتا اور پھر اس کے ساتھ کروڑوں کی دولت بھی ہے۔ اس کا ڈیڑھ ایکڑ کا وہ پلاٹ ہی کم سے کم بیس بائیس کروڑ کا ہوگا۔ کالی ہاؤس والی بلڈنگ اور ہوا محل کے قریب رام گنج بازار کے چوراہے پر ایک بڑا مکان اور اس کے نیچے تین دکانیں بھی ہیں۔ کروڑوں کی جائداد ہے یہ اور دیش مکھ جیسا شخص اس دولت کے لیے نرک تک بھی کسی کا پیچھا کرسکتا ہے۔ اگر شوبھا بے پور میں رہتی تو اسے کچھ تحفظ فراہم کیا جاسکتا تھا۔ وہ ہم سے تقریباً تین دن کے فاصلے پر آگئی ہے۔ کسی ایمرجنسی میں فوری طور پر اس کے پاس پہنچا بھی نہیں جاسکتا۔"

"لیکن وہ اب یہیں رہنے پر بضد ہے۔ یہاں بھی اس کی حفاظت کا کوئی نہ کوئی بندوبست کرنا پڑے گا۔" میں نے کہا۔

"ہاں۔ یہ بندوبست تو کرنا ہی پڑے گا۔" ٹھاکر نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا "آؤ اب چلیں۔" ٹھاکر مجھ سے پہلے بینچ سے اٹھ گیا۔ اس نے چائے کے پیسے ادا کیے اور میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر میرے ساتھ چلتے ہوئے بولا "تمہارے لیے ایک مسئلہ پیدا ہونے والا ہے۔"

"وہ کیا؟" میں نے گردن گھما کر سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"بلا۔" ٹھاکر کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی "وہ کہتی ہے کہ اب تمہارے پاس ہی رہے گی۔ جہاں تم جاؤ گے، تمہارے ساتھ جائے گی۔"

"یہ تو واقعی ایک مسئلہ ہوگا۔" میرے لہجے میں تشویش نمایاں تھی "میرا کوئی بھروسا نہیں کہ میں کب کس طرف نکل جاؤں اور میرے ساتھ کس وقت کیا حادثہ پیش آجائے۔ میں اسے اپنے ساتھ ساتھ نہیں لے پھر سکتا۔ پلیز ٹھاکر! اسے کسی نہ کسی طرح واپس لے جانا۔" میں چند لمحوں کو خاموش

ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہا "بلا بہت اچھی لڑکی ہے۔ بہت پیاری، بہت معصوم اور بہت بھولی بھالی۔ اگر میرا کہیں ٹک بیٹھنے کا ارادہ ہوتا تو اسے ضرور اپنے ساتھ رکھتا لیکن میں تو سیلانی ہوں۔ میرا اپنا کوئی بھروسا نہیں۔ اسے کس طرح اپنے ساتھ ساتھ لیے پھروں گا۔ اس کے علاوہ۔۔۔"

"اس کے علاوہ کیا؟" ٹھاکر نے میرے خاموش ہونے پر پوچھا۔

"میرے سر پر نحوست کے سائے منڈلا رہے ہیں۔" میں نے جواب دیا "جس نے بھی میرا ساتھ دیا، مارا گیا۔ چاچا پرتاب سنگھ، ٹھائی، جانکی اور نجانے کون کون۔ مجھے تو ان کے نام اور چہرے بھی یاد نہیں رہے۔ تم خود کتنا نقصان اٹھا چکے ہو۔ روپ متی کی میری وجہ سے کیا کیا مصیبتیں نہیں اٹھانی پڑیں۔ یہ سب کچھ تو تمہارے ساتھ اور تمہارے سامنے ہوا ہے اور اب تم چاہتے ہو کہ میں بلا کو اپنی نحوست کے پروں میں سمیٹ لوں۔"

"وارا واقعی نحوست کا سایہ تھا جو کئی برسوں سے تمہارے سر پر منڈلا رہا تھا۔" ٹھاکر نے کہا "لیکن اب نحوست کا وہ سایہ فنا ہوچکا ہے۔ اب تمہارے راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں۔ تمہارے آگے پیچھے خوف یا نحوست کا کوئی سایہ نہیں رہا۔ اب تمہیں اپنے بارے میں سنجیدگی سے سوچنا ہوگا۔ یہ زندگی آوارہ گردی میں تو نہیں گزاری جاسکتی۔ میری باتوں کا برا مت ماننا وجدان۔ میں تمہیں اپنا چھوٹا بھائی سمجھ کر ہی بات کررہا ہوں۔ تم اندازہ نہیں لگاسکتے کہ ہم سب تمہیں کتنا چاہتے ہیں۔ روپ متی کو تم نے جس طرح سنبھالا دیا ہے وہ ایک بہت بڑا کارنامہ ہے۔ میں تو اس سے مایوس ہوگیا تھا لیکن تم نے اپنی شرافت اور اپنے کردار سے اسے جس طرح گندگی کی دلدل سے نکالا ہے وہ ایک بہت بڑا چمتکار ہے۔ تمہاری جگہ کوئی اور ہوتا تو ایسا کبھی نہ کرتا بلکہ وہ بھی بہتی گنگا میں ہاتھ دھوتا اور پھر بلا۔۔۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا۔

"وہ جنگل میں دو دن تمہارے ساتھ رہی ہے۔ مجھے روپ متی نے بتادیا تھا۔ بلا نے جنگل میں رہتے ہوئے بے قابو ہونے کی کوشش کی تھی مگر تم نے اسے جس طرح سنبھالا وہ قابل تعریف ہے اور یہ تمہاری شرافت ہے کہ بلا تمہارے ہی نام کی مالا جپتی ہے۔ چند روز پہلے جب اسے یہ پتا چلا کہ ہم تمہارے پاس آرہے ہیں تو تم اس کی خوشی کا اندازہ نہیں لگاسکتے۔ اب اگر تم نے اسے واپس بھیج دیا تو وہ مرجائے گی۔ ویسے میرے خیال میں اب وقت آگیا ہے کہ تم ایک جگہ ٹک جاؤ۔ یہاں ہم ہیں، شوبھا ہے۔ یہ سب تمہارے اپنے ہیں۔ تم ہمارے ہو۔ تمہیں اب فیصلہ کرلینا چاہیے۔"

ہم کانیج پہنچ گئے اور ہماری گفتگو کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکی تھی۔

اس وقت شام کے ساڑھے سات بج رہے تھے اور یوگی دھیراج شوبھا کو یوگا کی مشق کروا کے واپس جارہا تھا۔ اس سے ہماری ملاقات ہٹ سے چند گز کے فاصلے پر ہوئی تھی۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کو پرنام کیا۔ خیر و عافیت دریافت کی اور وہ رخصت ہوگیا۔

سونیا کچن میں کھانا پکانے کی تیاری کررہی تھی اور بلا بھی اس کے ساتھ تھی۔ وہ کام چھوڑ کر فوراً ہی ہماری طرف آگئی اور جب میں صوفے پر بیٹھا تو وہ بھی میرا بازو پکڑ کر میرے ساتھ جڑ کر بیٹھ گئی۔ سامنے والے صوفے پر بیٹھی ہوئی شوبھا کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی۔

رات کے کھانے کے بعد پھر ہماری محفل جمی۔ ٹھاکر نے شوبھا کو بتادیا تھا کہ ہم آج کچھ جگہیں دیکھ کر آئے ہیں۔ ایک جگہ ہم دونوں کو پسند ہے اور کل کسی وقت شوبھا کو بھی ساتھ لے جاکر دکھادیں گے اور پھر کوئی فیصلہ کرنے کے بعد اس جگہ کو خریدنے کی کوشش شروع کردی جائے گی۔

صبح ناشتے کے بعد سونیا بازار جاکر کرائے کی کار لے آئی اور ہم سب اس میں لد کر بازار کی طرف روانہ ہوگئے۔

ہم نے شوبھا کو وہ تمام جگہیں دکھادیں جنہیں ہم نے گیسٹ ہاؤس اور ریسٹورنٹ کے قیام کے لیے گزشتہ روز منتخب کیا تھا۔ آخر میں آبشار والی پہاڑی کے دامن میں آگئے۔ یہاں گاڑی کا راستہ نہیں تھا اس لیے ہمیں ایک لمبا فاصلہ پیدل ہی طے کرنا پڑا تھا۔

آبشار سے چند گز کے فاصلے پر چند یورپین بیٹھے چرس بھرے سگریٹوں کے کش لگا رہے تھے۔ ان میں جوان لڑکیاں بھی تھیں اور ادھیڑ عمر اور جوان مرد بھی۔

"یہ اس قوم کے افراد ہیں جو دنیا میں سب سے زیادہ مہذب ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔" ٹھاکر نے ان دونوں کی طرف دیکھ کر برا سا منہ بناتے ہوئے کہا "لیکن ان لوگوں کو دیکھ کر لگتا ہے کہ تہذیب انہیں چھو کر بھی نہیں گزری۔ یہ چرس اور ہیروئن کی طلب میں دنیا بھر میں مارے مارے پھرتے ہیں۔"

"اسی قوم نے تو اس خطے پر بھی طویل عرصے تک حکمرانی کی ہے۔" میں نے کہا۔

"اور اب بھی یہ اپنے آپ کو ہمارا آقا اور ہمیں اپنا

غلام سمجھتے ہیں۔" ٹھاکر نے کہا "یہ لوگ جو ہمارے سامنے بیٹھے ہیں، چرسی اور موالی، ان لوگوں سے بات کی جائے تو پتا چلے گا یہ اپنے آپ کو ہم سے برتر سمجھتے ہیں۔"

"اس بات میں تو کوئی شبہ نہیں ٹھاکر۔" میں نے کہا "ان کے ہندوستان سے جانے کے بعد بھی یہاں آباد قوموں نے اپنے آپ کو نہیں سنبھالا۔ متحد اور متفق ہونے کے بجائے ان میں نفرتیں بڑھتی گئیں اور بہت سے معاملات تمہارے سامنے ہیں۔ ہم اپنے آپ کو ان سے برتر تو نہیں کہہ سکتے۔"

"یہی تو المیہ ہے۔" ٹھاکر نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا "ہم نے اپنے آپ کو سنبھالا ہوتا تو انہیں باہر سے آکر ہم پر حکومت کرنے کا موقع ہی نہ ملتا۔"

"ارے بھئی، تم لوگ کس بحث میں پڑ گئے۔ مجھے کچھ بتاؤ۔ سمجھاؤ تو سہی۔"

یہ شوبھا کی آواز تھی۔ ہم دونوں اس کی طرف متوجہ ہوگئے۔ ٹھاکر اسے بتانے لگا کہ اگر یہ زمین مل گئی تو گیسٹ ہاؤس کس طرف بنایا جائے گا اور ریسٹورنٹ کس طرف۔

"یہ آبشار بھی اوپن ائر ریسٹورنٹ کا ایک حصہ ہوگا۔" وہ اشارہ کرتے ہوئے بتا رہا تھا "ریسٹورنٹ کی عمارت اس طرف ہوگی اور گیسٹ ہاؤس کی دو منزلہ عمارت کے لیے وہ بہترین جگہ ہے۔" اس نے دوسری طرف اشارہ کیا "اور اس نشیب کے کنارے پر ریلنگ لگا کر اس کے ساتھ ساتھ بھی پختہ روش اور سرسبز لان بنایا جائے گا اور اس طرف پورا قطعہ لان پر مشتمل ہوگا جس میں حوض اور فوارے بھی ہوں گے۔ آپ یقین کریں شوبھا جی۔ اگر یہ جگہ مل گئی اور میری پلاننگ کے مطابق کام ہوا تو یہ اس وادی کا سب سے حسین اور سب سے بارونق گیسٹ ہاؤس اور ریسٹورنٹ ہوگا۔ لوگ دور دور سے یہاں آیا کریں گے۔"

"سب کچھ آپ ہی کو کرنا ہے ٹھاکر جی۔" شوبھا نے کہا "اس جگہ کو خریدنے کا بندوبست، مل گئی تو نقشہ اور اس کے بعد تعمیر۔ سب آپ ہی کے منشا کے مطابق آپ کی نگرانی میں ہوگا۔ ویسے یہ جگہ مجھے پسند آئی ہے۔ بہت اچھی جگہ ہے۔ اگر گنجائش نکلی تو میں اپنی رہائش کے لیے بھی ایک طرف کوارٹر بنوالوں گی۔"

"کوارٹر!" ٹھاکر کے لہجے میں حیرت تھی "ارے اس طرف اس کارنر میں ایک خوب صورت کوٹھی بن سکتی ہے۔ بس آپ تو یہ پرارتھنا کیجئے کہ یہ جگہ ہمیں مل جائے۔"

ہم لوگ تقریباً ایک گھنٹے تک اس جگہ اور اس کے آس پاس گھوم پھر کر جائزہ لیتے رہے اور پھر واپس آگئے۔ دوپہر کا کھانا ہم نے بازار کے ایک ریسٹورنٹ میں کھایا تھا۔

روپ متی اور ٹھاکر دو دن مزید رہ کر چلے گئے لیکن بلا یہیں رہ گئی۔ ٹھاکر نے شوبھا کی جے پور والی جائداد کو ڈسپوز آف کرنے کے لیے بھی ایک پروگرام بنالیا تھا۔ اس نے چند روز بعد واپس آنے کا وعدہ کیا تھا۔

میری ریاضت معمول کے مطابق جاری تھی۔ میں نے اس میں کوئی ناغہ نہیں ہونے دیا تھا۔ میں روزانہ صبح مقررہ وقت پر یوگی گوتم بھوش کے کانج میں پہنچ جاتا۔ اس ریاضت کے علاوہ بھی میں نے مختلف ہلکی پھلکی مشقیں جاری رکھی تھیں۔

بلا کی وجہ سے مجھے کچھ الجھن سی ہو رہی تھی لیکن میں اس سے بے رخی اختیار نہیں کر سکتا تھا۔ وہ بہت معصوم تھی اور میں اس کے دل کو ٹھیس نہیں پہنچانا چاہتا تھا۔ دوسری طرف سونیا تھی۔ اس نے بھی ماضی کے حوالے سے مجھ سے بہت سی امیدیں وابستہ کر رکھی تھیں۔ ویسے مجھے اس بات کی خوشی بھی کہ ہندوستان میں آکر ٹھوکریں کھانے کے بعد بالآخر اسے شوبھا جیسی عورت مل گئی تھی۔ سونیا اس سے وابستہ رہ کر اپنی زندگی بنا سکتی تھی۔

ٹھاکر اور روپ متی کو گئے ہوئے ایک ہفتہ گزر چکا تھا۔ اس روز میں اور سونیا بازار سے واپس آرہے تھے۔ ہم دونوں کے پاس کچھ سامان تھا جس سے چلنے میں خاصی دقت پیش آرہی تھی۔

سورج غروب ہونے میں تقریباً آدھا گھنٹا باقی تھا۔ دھوپ آہستہ آہستہ پہاڑوں کی برف پوش چوٹیاں سرکرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

میں نے محسوس کیا کہ سونیا کچھ بے چینی سی محسوس کر رہی تھی اور بار بار پیچھے مڑ کر دیکھ رہی تھی۔

"کیا بات ہے۔ تم کچھ پریشان لگ رہی ہو؟" میں نے پوچھا۔

"ایک آدمی ہمارا پیچھا کر رہا ہے۔" سونیا نے جواب دیا "ایک گھنٹا پہلے میں نے اسے بنئے کی دکان پر دیکھا تھا جہاں سے ہم سودا لے رہے تھے پھر آدھے گھنٹے بعد وہ دوسری جگہ بھی نظر آیا تھا اور اس وقت بھی ہمارے پیچھے آرہا ہے۔ تم ایک دم سے پیچھے مڑ کر مت دیکھنا۔ ہم کوئی چیز لینے کے بہانے سامنے والے ڈھابے پر رک جائیں گے۔ اس وقت تم اسے دیکھ سکو گے۔ وہ بغیر آستین کی چمڑے کی کالی جیکٹ پہنے ہوئے ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ آرام سے چلتی رہو۔" میں نے جواب دیا "ہو سکتا ہے تمہیں وہم ہوا ہو۔ اس شخص سے بار بار آمنا سامنا اتفاق بھی ہو سکتا ہے اور یہ بھی محض اتفاق ہی ہو سکتا ہے کہ جس طرف ہم جا رہے ہیں اسے بھی ادھر ہی جانا ہو۔"

وہ ڈھابا ہم سے تقریباً پچاس گز آگے دو راستوں کے سنگم پر تھا۔ وہاں سے ایک راستہ تو ہمارے کانچ والی پہاڑی کی طرف جاتا تھا اور دوسرا راستہ دائیں طرف درختوں میں ہوتے ہوئے ایک اور پہاڑی کی طرف چلا گیا تھا۔ اس طرف بھی کانچ تھے اور ایک گیسٹ ہاؤس بھی تھا۔

میں نے ڈھابے سے خشک دودھ کا ایک پیکٹ خریدا اور اسی دوران میں مجھے اس شخص کو دیکھنے کا موقع بھی مل گیا جو ہم سے تقریباً بیس گز کے فاصلے پر رک گیا تھا اور بیڑی کے کش لگاتے ہوئے اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔

درمیانے قد کا وہ آدمی گٹھے ہوئے جسم کا مالک تھا۔ اس نے جینز اور اوپن شرٹ پہن رکھی تھی۔ شرٹ کے اوپر کے دو بٹن کھلے ہوئے تھے اور گلے میں سونے کی چین تھی جس میں لگا ہوا لاکٹ اس کے بالوں بھرے سینے پر جھول رہا تھا۔ اس کی عمر تیس اور پینتیس کے درمیان رہی ہوگی۔ وہ کلین شیو تھا مگر سر کے بال لمبے تھے جو چٹیا کی صورت میں گردن پر بندھے ہوئے تھے۔ اس کے بائیں کان میں سونے کی بالی تھی۔

میں نے ڈھابے پر جان بوجھ کر دیر لگا دی۔ میں اس دوران میں کن انکھیوں سے اس کی طرف دیکھتا رہا اور اس طرح مجھے اس کا جائزہ لینے کا موقع مل گیا۔

وہ چہرہ میرے لیے اجنبی تھا۔ اسے میں اپنا دشمن بھی نہیں سمجھ سکتا تھا لیکن وہ صورت سے تو بدمعاش ہی لگتا تھا۔ میرے ذہن میں صرف ایک خیال تھا۔ ہو سکتا ہے وہ محض سونیا کی وجہ سے ہمارے پیچھے لگا ہو۔ سونیا کم بخت تھی بھی تو بہت حسین۔ اس نے بلاؤز اور اسکرٹ پہن رکھا تھا۔ اس طرح وہ خود لوگوں کو دعوت نظارہ دے رہی تھی اور یہ بدمعاش شاید کسی توقع پر اس کے پیچھے لگ گیا تھا۔ مجھے تو شاید اس نے نگاہوں میں ہی نہیں رکھا ہوگا۔ اس قسم کے غنڈے حسین عورتوں کے ساتھی مردوں کو خاطر میں نہیں لاتے۔ بزعم خود وہ اپنے آپ کو بہت طاقت ور سمجھتے ہیں اور انہیں بڑا گھمنڈ ہوتا ہے اپنے آپ پر۔ وہ سمجھتے ہیں کہ مرد کو ایک دو ہاتھ مار کر مفلوج کر دیں گے اور عورت کو اٹھا کر لے جائیں گے۔ اس کے ذہن میں بھی شاید کوئی ایسی ہی بات تھی۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ وہ اکیلا ہی تھا۔

سورج غروب ہو رہا تھا۔ دھوپ اب صرف پہاڑوں کی برف پوش چوٹیوں پر چمک رہی تھی جبکہ وادی میں گہری اندھیارا پھیلنے لگا تھا۔ میں نے سونیا کو اشارہ کیا اور ہم اپنے اپنے شاپنگ بیگز اٹھا کر آگے چلنے لگے۔

اب اس میں شک کی کوئی گنجائش نہیں رہی تھی۔ وہ شخص ہمارا پیچھا ہی کر رہا تھا لیکن میں اس کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے ابھی تک ہمیں کسی طرح بھی پریشان نہیں کیا تھا۔ سونیا کو چھیڑا بھی نہیں تھا۔ کوئی آوازہ نہیں کسا تھا۔ میں کس بنیاد پر اس پر ہاتھ ڈالتا۔ ہمارے پاس کیا ثبوت تھا کہ وہ ہمارا پیچھا کر رہا تھا۔ ہو سکتا ہے اسے بھی اسی طرف جانا ہو جس طرف ہم جا رہے تھے۔

میں نے زندگی کا بہت کٹھن راستہ طے کیا تھا۔ بہت مشکلیں اٹھائی تھیں۔ یہاں چند لمحے سکون کے میسر آئے تھے۔ یہ میری زندگی کا عارضی پڑاؤ تھا اور میں یہاں کسی سے پنگے بازی نہیں کرنا چاہتا تھا۔

میں اور سونیا باتیں کرتے ہوئے چلتے رہے۔ پہاڑی پر درختوں کی وجہ سے شام کا دھندلکا کچھ زیادہ گہرا لگ رہا تھا اور ویسے بھی اب تو اندھیرے کو گہرا ہونا ہی تھا۔ آس پاس کے کاٹیجز میں بتیاں جل اٹھی تھیں۔

ہم پہاڑی کے بل کھاتے ہوئے کشادہ راستے سے اس راستے کی طرف مڑ گئے جو پودوں میں بل کھاتے ہوئے ہمارے کانچ کی طرف چلا گیا تھا۔ کچھ آگے جانے کے بعد میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ دو تین منٹ بعد وہ آدمی اسی کشادہ راستے پر سیدھا آگے کو نکل گیا تھا۔

کانچ کے برآمدے کی بتی جل رہی تھی۔ بلا اور شوبھا برآمدے ہی میں کرسیاں ڈالے بیٹھی ہوئی تھیں۔ بلا نے اٹھ کر ہمارے ہاتھوں سے شاپنگ بیگ لے لیے اور اندر چلی گئی۔

کانچ کی طرف آنے والا راستہ بل کھاتا ہوا تھا اور اس راستے کے دونوں طرف قد آور پودے تھے۔ کانچ کے برآمدے میں بیٹھا ہوا آدمی کشادہ راستے پر آنے جانے والے کسی شخص کو نہیں دیکھ سکتا تھا لیکن باہر کا کوئی آدمی چاہے تو پودوں میں چھپ کر بڑی آسانی سے کانچ کی نگرانی کر سکتا تھا۔

میں برآمدے میں بیٹھا سامنے دیکھتا رہا لیکن نہ تو کوئی ہیولا دکھائی دیا اور نہ ہی کوئی آہٹ سنائی دی۔

باہر کھلی فضا میں بیٹھنا بہت اچھا لگ رہا تھا لیکن خنکی بڑھ گئی تھی اور مچھروں نے بھی یلغار کر دی تھی۔ ہم اٹھ کر اندر آ گئے۔

شوبھا نے شاید میرے چہرے سے میرے بارے میں کچھ اندازہ لگا لیا تھا اور میں نے بھی محسوس کیا تھا کہ پچھلے ایک دو روز کے دوران میں وہ گہری نظروں سے میری طرف دیکھتی رہتی تھی۔ اس نے شاید یہ بات خاص طور پر نوٹ کر لی تھی کہ گفتگو کے دوران میں جب میرے والدین یا تھائی اور جاپانی کا تذکرہ ہوتا تو میرے چہرے پر اداسی چھا جاتی تھی اور پچھلے دو تین دنوں کے دوران میں تو میں خود اپنے آپ میں ایک عجیب سی بے چینی محسوس کر رہا تھا۔ کبھی لگتا جیسے میری کوئی قیمتی چیز کھو گئی ہو اور کبھی میں خود بیٹھے بیٹھے کھو جاتا۔

اس وقت میں شوبھا کے کمرے میں بیٹھا ہوا تھا۔ بلا ہمیں چائے بنا کر دے گئی تھی اور وہ سونیا کے ساتھ کچن کے کاموں میں مصروف تھی۔

"میں دو تین دن سے دیکھ رہی ہوں کہ تم کچھ بجھے بجھے سے رہنے لگے ہو۔" شوبھا نے چائے کی چسکی لے کر میری طرف دیکھتے ہوئے کہا "اس سے پہلے تو میں نے تمہیں ہمیشہ چہکتے ہوئے دیکھا ہے لیکن جب بھی کبھی جاپانی وغیرہ کا ذکر آتا ہے تو ایک دم اداس ہو جاتے ہو۔ تم خوش رہا کرو نا۔ تم ہنستے مسکراتے اچھے لگتے ہو۔"

"ہنستے مسکراتے چہرے تو سب کو اچھے لگتے ہیں لیکن میری خوشیاں تو نجانے کہاں کھو گئی ہیں۔ عجیب سی وحشت اور بے چینی رہنے لگی ہے۔" میں نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔ میں دیکھ رہی ہوں۔" شوبھا نے کہا "خوشی تو ایک ایسی کیفیت کا نام ہے جسے صرف محسوس کیا جا سکتا ہے۔ بیان نہیں کیا جا سکتا۔ جب کوئی انسان خوش ہوتا ہے تو اسے دنیا کی ہر چیز حسین لگتی ہے لیکن جب انسان اندر سے اداس ہوتا ہے تو دنیا کی خوب صورتی اس کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتی اسی لیے تو کہتے ہیں کہ جب من کا موسم پر کیف دیر بہار ہوتا ہے تو باہر کا موسم خود بخود سہ رنگے لگنا ہے۔ یاد رکھو' خوشیوں کو کوئی پلیٹ میں سجا کر ہمارے سامنے پیش نہیں کرتا بلکہ ہمیں خود ہی خوشیاں تلاش کرنی پڑتی ہیں۔ انسان کو چاہیے کہ وہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر خوش ہونا سیکھے کیونکہ ایک روز یہ چھوٹی چھوٹی خوشیاں خود بخود بڑی خوشیوں میں بدل جائیں گی۔

"ہمیشہ خوش رہنے کی کوشش کرو اور دوسروں کو بھی خوش رکھو۔ دوسروں میں خوشیاں بانٹنے سے خوشیاں کم ہونے کے بجائے دگنی ہو جاتی ہیں۔ وہ باتیں جن کے یاد کرنے سے دل کو تکلیف پہنچتی ہے ان باتوں کو بھلانے کی کوشش کرو کیونکہ بار بار کریدنے سے زخم بھرتا نہیں بلکہ ناسور بن جاتا ہے اسی لیے ہمیں ہر لمحہ خوش رہنے کی کوشش کرنی چاہیے اور زندگی سے بھرپور انداز میں لطف اندوز ہونا چاہیے۔" وہ خاموش ہو کر چند لمحے میری طرف دیکھتی رہی پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگی۔

"میرے حالات سے تم اچھی طرح واقف ہو۔ مجھ سے زیادہ دکھی کون ہوگا لیکن اس کے باوجود میں خوش رہنے کی کوشش کرتی ہوں۔ میری یہ ایک پریشانی دور ہو جائے تو دیکھنا میں کس طرح بدلتی ہوں۔ پتی کے زندہ رہنے تک میں نے بڑی بھرپور زندگی گزاری ہے۔ ان کے بعد بس انہی کی کمی محسوس ہوئی۔ اس کے سوا مجھے کبھی کسی چیز کی کمی محسوس نہیں ہوئی۔"

شوبھا کا لیکچر خاصا طویل ہو گیا تھا۔ میں بھی دوسروں کو ایسے ہی لیکچر دیا کرتا تھا۔ خود دکھی تھا مگر دوسروں کو سکھی رہنے کی تلقین کرتا تھا اور اب شوبھا۔ وہ مجھے لیکچر دے رہی تھی۔ ہمیشہ خوش رہنے کا مشورہ دے رہی تھی۔ گزرے ہوؤں کو بھول جانے کی تلقین کر رہی تھی لیکن خود سوگ کی سفید چادر میں لپٹی ہوئی تھی اور سوگ کی یہ سفید چادر پتی کی یاد کو اس کے دل میں تازہ رکھے ہوئے تھی۔

"آپ شاید مجھے تسلی دینے کے لیے یہ سب کچھ کہہ رہی ہیں حالانکہ آپ نے خود یہ سفید ساڑی۔۔۔" میں کہتے کہتے رک گیا۔ مجھے اچانک ہی خیال آ گیا کہ ایسی بات نہیں کہنی چاہیے۔

"یہ سفید ساڑی۔" وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولی "محض دنیا کو دکھانے کے لیے ہے۔ اس کے لیے تو میں نے بھی اپنا من مار رکھا ہے لیکن اب میں اس سے عاجز آ گئی ہوں۔ میرا بھی دل چاہتا ہے کہ میں بھی دنیا کے بنگاموں میں حصہ لوں۔ رنگینیوں میں رنگی جاؤں اور۔۔۔"

"اور میرا خیال ہے آپ کا دیا ہوا لیکچر مجھے دہرانا چاہیے۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی۔

شوبھا نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ اس کے چند سیکنڈ بعد ہی بلا خالی کپ لینے آئی تو ہم بھی اٹھ کر لاؤنج میں آ گئے۔ سونیا کچن میں کھانے کی تیاری میں مصروف تھی۔ بلا ہمارے پاس بیٹھ گئی۔ اب ہماری گفتگو کا موضوع بھی بدل گیا تھا۔ اسی دوران میں سونیا بھی ہمارے پاس آ کر بیٹھ گئی۔

"آدھے گھنٹے میں کھانا تیار ہو جائے گا۔" اس نے باری باری ہماری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

شوبھا سر ہلا کر رہ گئی اور پھر وہ ٹھاکر کے بارے میں بات

کرنے لگی۔ اسے ٹھاکر کی شخصیت بہت پسند آئی تھی۔

ابھی ہم باتیں کررہے تھے کہ باہر سے ہلکی سی آہٹ سن کر میں چونک گیا۔ وہ آواز ایسی تھی جیسے کوئی چھوٹا سا پتھر لڑھکا ہو اور میرا خیال تھا کہ وہ آواز کسی اور نے نہیں سنی تھی کیونکہ ان میں سے کسی کے چہرے پر کوئی ردعمل ظاہر نہیں ہوا تھا لیکن میں اس آواز کو اپنا واہمہ بھی نہیں سمجھ سکتا تھا۔ میں نے بائیں ہاتھ کی چھوٹی انگلی اٹھاوی اور اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے قدرے اونچی آواز میں بولا۔

"اب باتوں کا سلسلہ یہیں پر ختم ہوتا ہے۔ میں باتھ روم سے ہو کر آؤں تو ہم یہ سلسلہ وہیں سے جوڑیں گے جہاں سے ٹوٹا تھا۔ بس چند منٹ۔" میں نے ایک ہاتھ پیٹ پر رکھ لیا اور قدرے جھک کر چلتے ہوئے شوبھا والے کمرے میں گھس گیا۔ اس طرح میں یہ تاثر دینا چاہتا تھا کہ میرے پیٹ میں شدید قسم کا مروڑ اٹھ رہا ہے۔

شوبھا والے کمرے میں آکر میں نے بیچ کا دروازہ کھلا ہی رہنے دیا اور سیدھا ہو کر تیزی سے آگے بڑھا۔ اس کمرے کا ایک دروازہ باہر کی طرف بھی کھلتا تھا اور میرا رخ اسی طرف تھا۔

میں نے بڑی آہستگی سے بولٹ ہٹایا اور آہستہ آہستہ دروازہ کھولنے لگا۔ سونیا لاؤنج والے کمرے میں عین سامنے والی کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے مجھے کمرے کا بیرونی دروازہ کھولتے ہوئے دیکھ لیا تھا لیکن اس کے چہرے پر ایسا کوئی تاثر نمودار نہیں ہوا جس سے شوبھا یا بلا کو کسی قسم کا شبہ ہو سکتا۔

میں کمرے سے نکل کر وہ قدموں دیوار کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے کانچ کی پچھلی طرف بڑھنے لگا۔ پتھر لڑھکنے کی وہ آواز اسی طرف سے آئی تھی۔

میرا شبہ درست نکلا۔ ایک انسانی ہیولا کھڑکی کے قریب کھڑا اندر جھانکنے کی کوشش کررہا تھا۔ یہ لاؤنج ہی کی عقبی کھڑکی تھی لیکن اندر کی طرف دبیز پردہ پڑا ہوا تھا اور اس شخص کو شاید اندر دیکھنے میں دشواری پیش آرہی تھی۔ وہ بار بار جگہ بدل رہا تھا اور پھر ایک جگہ اس نے آنکھیں شیشے کے ساتھ چپکا دیں۔ وہاں کونے سے شاید پردہ ذرا سا ہٹا ہوا تھا اور اسے اندر دیکھنے کا موقع مل گیا تھا۔

میرا خیال تھا کہ میں پیچھے سے جا کر اس کی گردن دبوچ لوں گا لیکن میں کارنر گھوم کر جیسے ہی آگے بڑھا، میرا پیر ایک پتھر سے ٹکرا گیا۔ پتھر پُرشور آواز سے لڑھکتے ہوئے دور چلا گیا۔

وہ آدمی ایک دم سیدھا ہو گیا اور پھر مجھے دیکھتے ہی اس نے مخالف سمت میں دوڑ لگا دی۔ میں بھی اس کے پیچھے لپکا۔ اس میں شک کی کوئی گنجائش نہیں تھی کہ یہ وہی آدمی تھا جو شام کو بازار سے ہمارا پیچھا کرتے ہوئے یہاں آیا تھا۔ اس وقت تو وہ آگے نکل گیا تھا اور اب موقع پا کر کانچ کے اندر جھانکنے کی کوشش کررہا تھا۔

اس کی رفتار خاصی تیز تھی۔ وہ پلک جھپکنے کی دیر میں مجھ سے تقریباً بیس گز آگے نکل گیا اور پھر شاید اس کا پیر جھاڑیوں میں الجھ گیا تھا۔ وہ لڑکھڑا کر گرا۔ وہ اٹھنے کی کوشش کررہا تھا کہ میں دوڑتے ہوئے پوری قوت سے اچھلا اور ہوا میں اڑتے ہوئے اس کے اوپر جا گرا اور اسے ساتھ لیتے ہوئے جھاڑیوں میں ڈھیر ہو گیا۔

اس نے اپنے آپ کو چھڑا کر اٹھنے کی کوشش کی لیکن اسے گرفت میں لینے کی کوشش میں میرا ہاتھ اس کی گردن پر جھولتی ہوئی چٹیا پر پڑ گیا۔ اب کوئی شک باقی نہیں رہا تھا۔ یہ وہی آدمی تھا۔

میں نے چٹیا کو مٹھی میں لے کر زور سے جھٹکا دیا۔ وہ کراہ اٹھا اور پھر شاید تکلیف کی پروا کیے بغیر اس نے اپنے سر کو زوردار جھٹکا دے کر چٹیا کو میری گرفت سے چھڑا لیا اور پلٹ کر اندھا دھند ہاتھ چلا دیا۔

اس کا گھونسا میری گردن پر لگا۔ میں لڑکھڑا گیا۔ سنبھلنے سے پہلے ہی دوسرا گھونسا کھوپڑی پر لگا۔ میرا دماغ جھنجنا اٹھا۔ اس کے تیسرے وار سے بچنے کے لیے میں تیزی سے نیچے جھک گیا۔ اس مرتبہ اس شخص کا وار خالی گیا اور وہ اپنی جگہ پر گھوم کر رہ گیا۔ میں نے اس کے پیٹ پر گھونسا رسید کردیا۔ وہ کراہ کر دوہرا ہو گیا۔ میں نے کسی توقف کے بغیر ایک دو گھونسے اور جڑ دیے۔ وہ پیٹ پکڑے جیسے ہی مزید نیچے جھکا، میں نے اس کی گردن پر دو ہتڑ جما دیا۔ وہ منہ کے بل میرے قدموں میں گرا اور اس کے ساتھ ہی اسے موقع بھی مل گیا۔

اس نے میرے دونوں پیر پکڑ کر زوردار جھٹکا دیا۔ میں پشت کے بل گرا۔ وہ مجھ سے پہلے اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور مجھے سنبھلنے کا موقع دیے بغیر میرے جسم پر ٹھوکریں برسانے لگا اور پھر ایک ٹھوکر مارنے کی کوشش میں اس کا اپنا پیر پھسل گیا۔ وہ لڑکھڑایا تو مجھے سنبھلنے کا موقع مل گیا اور اس مرتبہ میں نے اسے ٹھوکروں پر رکھ لیا۔

میری ہر ٹھوکر اور میرا ہر گھونسا اسے بلبلانے پر مجبور کردیتا۔ میں نے ایک چوب سے اس کے کندھے پر وار کیا۔ وہ ذرا سا پیچھے ہٹا تھا اور میرا یہ چوب کلہاڑے کی طرح اس کی

ہنسلی کی ہڈی پر لگا۔

اس کے منہ سے نکلنے والی چیخ بڑی خوفناک تھی۔ وہ نیچے گر کر تڑپنے لگا۔ میں نے اسے دو تین ٹھوکریں رسید کردیں لیکن وہ موقع پا کر اٹھ گیا اور اندھا دھند لات گھما دی۔

ٹھوکر میری پنڈلی پر لگی۔ میں کراہتے ہوئے ایک ٹانگ پر ناچ کر رہ گیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ شخص حملہ کرے گا لیکن اس نے ایک طرف چھلانگ لگا دی۔ میں بھی اپنی جگہ سے اچھلا اور اس کے اوپر گرا۔

اس کی ایک ٹانگ میری گرفت میں آگئی تھی اور وہ زور دار جھٹکے دیتے ہوئے اپنی ٹانگ چھڑانے کی کوشش کررہا تھا۔ اس دوران میں کانچ کی طرف سے بلا اور سونیا کی آوازیں سنائی دیں۔

"وجدان! کہاں ہو تم۔۔۔ کیا ہو رہا ہے۔ کون ہے ادھر؟"

یہ سونیا کی آواز تھی۔ انہوں نے میرے حریف کی چیخ اور اٹھا پٹخ کی آوازیں سن لی تھیں۔ بلا اور سونیا شاید اسی طرف دوڑی آرہی تھیں۔

ان دونوں کی آوازوں کی وجہ سے میری توجہ ایک لمحے کو بٹی تھی جس سے اس شخص کو موقع مل گیا۔ اس نے زور سے میرے کندھے پر دوسرے پیر کی ٹھوکر ماری۔ اس کی ٹانگ میری گرفت سے نکل گئی۔ وہ اٹھ کر ایک طرف بھاگ کھڑا ہوا۔

میں نے بھی اس کے پیچھے دوڑ لگا دی۔ وہ مجھ سے کافی آگے نکل چکا تھا۔ میں اس کے پیچھے بھاگتا رہا لیکن وہ قد آور پودوں اور جھاڑیوں میں غائب ہو گیا۔ اندھیرے میں اس کے دوڑنے کی آواز سنائی دے رہی تھی اور میں اس آواز کا تعاقب کررہا تھا۔

اور پھر اچانک میرا پیر جھاڑیوں میں الجھ گیا۔ میں منہ کے بل گرا۔ یہ بھی غنیمت تھا کہ میں جھاڑیوں ہی میں گرا تھا۔ اگر پتھروں پر گرتا تو اچھی خاصی چوٹ آسکتی تھی۔

دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز بھی اب غائب ہو چکی تھی۔ وہ شخص تاریکی میں بہت دور نکل گیا تھا اور عین ممکن تھا وہ اب تک پہاڑی کے دامن میں پہنچ چکا ہو۔ اب اس کا پیچھا کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔

بلا اور سونیا مجھے آوازیں دے رہی تھیں۔ میں اٹھ کر اس طرف چل پڑا۔ وہ دونوں مجھے کانچ سے دس بارہ گز دور ہی مل گئیں۔

"کیا ہوا۔ کون تھا وہ؟" سونیا نے میرا بازو پکڑ لیا۔

"وہی تھا جس نے شام کو ہمارا پیچھا کیا تھا۔ بھاگ گیا حرامی۔" میں نے ایک طرف تھوکتے ہوئے جواب دیا۔

"تمہیں کوئی چوٹ تو نہیں آئی ہمت سنگھ؟" بلا بولتے بولتے مجھے ٹٹولنے لگی۔

"نہیں۔ میں ٹھیک ہوں۔ کوئی چوٹ نہیں آئی۔" میں نے کہا۔

ہم کانچ کے قریب پہنچے تو شوبھا بھی اپنے کمرے کے باہر والے دروازے کے قریب کھڑی تھی۔ اس نے بھی سوالات کی بوچھار کردی۔

"پتا نہیں کون تھا۔ کھڑکی میں سے جھانکنے کی کوشش کررہا تھا۔ میں نے پکڑنے کی کوشش کی تو بھاگ نکلا۔" میں نے جواب دیا۔

"تمہیں کیسے پتا چلا کہ کوئی باہر کھڑا کھڑکی سے جھانک رہا ہے؟" شوبھا نے پوچھا۔ اس وقت ہم اندر آگئے تھے۔

"جب ہم یہاں بیٹھے باتیں کررہے تھے تو میں نے کسی پتھر کے لڑھکنے کی آواز سنی تھی اور اس وقت مجھے باہر کسی کی موجودگی کا شبہ ہوا تھا۔" میں نے کہا اور پھر اس کے آگے کی بات بتانے لگا۔

"مگر وہ تھا کون اور اس طرح کھڑکی سے کیوں جھانک رہا تھا؟" شوبھا نے کہا۔ اس کے لہجے میں تشویش نمایاں تھی اور میرا خیال ہے وہ معاملے کی تہ کو پہنچ رہی تھی۔

"پتا نہیں کون تھا۔" میں نے جواب دیا "شام کو جب ہم بازار سے لوٹے تھے تو اس وقت اس نے ہمارا پیچھا کیا تھا۔ سونیا نے میری توجہ تو دلائی تھی مگر میں نے زیادہ پروا نہیں کی تھی اور وہ اسی راستے پر اوپر چلا گیا تھا۔"

"یہ۔ یہ آدمی ایک دو مرتبہ کافی ہاؤس میں بھی آیا تھا۔" سونیا نے بتایا۔

"کیا۔۔۔؟" میں اچھل پڑا۔

"جے پور میں جب دیش مکھ سے معاملہ چل رہا تھا تو پہلی مرتبہ میں نے اسے دیش مکھ کے ساتھ دیکھا تھا۔ اس کے بعد بھی یہ ایک دو مرتبہ کافی ہاؤس میں آیا تھا۔" سونیا نے کہا۔

"اوہ۔۔۔" میں اس انکشاف پر چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا "تم نے شام کو یہ بات کیوں نہیں بتائی جب وہ ہمارا پیچھا کررہا تھا؟"

"اس وقت یہ بات میرے ذہن میں بھی نہیں رہی تھی۔" سونیا نے جواب دیا۔

اب یہ بات میری سمجھ میں آگئی۔ شام کو ہمارا تعاقب محض اتفاق نہیں تھا۔ وہ غنڈا دیش مکھ کا آدمی تھا اور اسے

شوبھا کی تلاش تھی۔ سونیا چونکہ شوبھا کے کافی ہاؤس میں کام کرتی تھی اور شوبھا کے ساتھ وہ بھی جے پور سے غائب تھی اسی لیے اسے یہاں دیکھ کر اس نے سونیا کا تعاقب شروع کردیا تھا تاکہ اس کے ذریعے شوبھا کا پتا چلا سکے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ رشی کیش میں اس شخص کی موجودگی محض اتفاق تھی یا وہ شوبھا کی تلاش میں خاص طور سے یہاں آیا ہوا تھا؟ دیش مکھ کو میں نے پرکھا نہیں تھا لیکن شوبھا اور ٹھاکر سے اس کے بارے میں جو کچھ سنا تھا اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ وارا سے بھی زیادہ کینہ اور گھٹیا آدمی تھا۔ ایسے لوگ آسانی سے اپنی ہار نہیں مانتے۔

شوبھا کے حسن و شباب کے ساتھ کروڑوں کی جائداد بھی تھی۔ دیش مکھ آسانی سے اس کا پیچھا نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ شوبھا کے جے پور سے غائب ہوجانے کے بعد دیش مکھ نے اس کی تلاش میں چاروں طرف اپنے آدمی دوڑا دیے ہوں گے۔ ہوسکتا ہے اسے یہاں شوبھا کی موجودگی کی بھنک مل گئی ہو اور اس کی تلاش میں اپنا ایک آدمی یہاں بھی بھیج دیا ہو یا اس شخص کی یہاں آمد محض اتفاق ہو اور اس نے سونیا کو دیکھ کر اس کا پیچھا شروع کردیا ہو تاکہ شوبھا کی موجودگی کی تصدیق کرسکے۔

اب مجھے افسوس ہو رہا تھا کہ وہ آدمی بچ کر نکل گیا۔ اگر سونیا شام ہی کو اس کے بارے میں بتا دیتی تو میں اس کا کچھ ایسا بندوبست کرتا کہ وہ واپس نہ جاسکتا۔ اب صورت حال کچھ تشویش ناک ہوگئی تھی۔ میں نے شوبھا کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر خوف کے سائے لہرانے لگے تھے۔

"اگر یہ دیش مکھ کا آدمی ہے تو اب کیا ہوگا؟" شوبھا نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اس کے لہجے میں ہلکی سی... تھرتھراہٹ تھی۔

"کچھ نہیں ہوگا۔ ہمیں ذرا احتیاط کرنی پڑے گی۔" میں نے جواب دیا۔

ایک بات میرے ذہن میں بھی تھی اور وہ یہ کہ یہ جگہ اب ہمارے لیے محفوظ نہیں تھی۔ ہمیں کسی اور جگہ کا بندوبست کرنا پڑے گا۔ مجھے یہ بھی اندازہ نہیں تھا کہ وہ شخص اکیلا ہی تھا یا اس کا کوئی دوسرا ساتھی بھی اس شہر میں موجود تھا۔ ایسی صورت میں ہمارے لیے کچھ دشواریاں پیدا ہوسکتی تھیں۔

بلا اب بھی بار بار میرے جسم کو ٹٹول کر دیکھ رہی تھی کہ مجھے کوئی چوٹ تو نہیں لگی۔ اس شخص کے چند گھونسے مجھے پڑے تھے۔ تکلیف تو ہو رہی تھی لیکن ظاہر ہے' میری یہ تکلیف دوسروں کو نظر نہیں آرہی تھی۔

گیارہ بج گئے۔ ہم نے ابھی تک کھانا بھی نہیں کھایا تھا۔ اس کے کچھ دیر بعد سونیا نے دری پر دسترخوان بچھا دیا اور کھانا لگانے لگی۔

ہم نے تو پھر بھی تھوڑا بہت کھالیا لیکن شوبھا کے حلق سے نوالہ نہیں اتر رہا تھا۔ اس نے یہاں چند روز سکون سے گزارے تھے لیکن اب اس کا سکون برباد ہوگیا تھا۔ ہم نے زبردستی اسے کچھ کھانا کھلا دیا۔

اس رات ہم دیر تک جاگتے رہے۔ مجھے شبہ تھا کہ اگر اس شخص کا کوئی اور ساتھی بھی رشی کیش میں موجود ہوا تو یہ رات ہمارے لیے بھاری ہوسکتی تھی لیکن میرا یہ خدشہ بے بنیاد نکلا اور وہ رات خیریت سے گزر گئی۔

صبح حسب معمول میں یوگی گوتم بھوش کے کانچ پہنچ گیا۔ آپنی مشق کی اور دس بجے کے قریب واپس آگیا۔

شوبھا کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اور انجانے سے خوف سے چہرے پر زردی سی کھنڈ رہی تھی۔ میں ناشتا کرکے دوبارہ شہر کی طرف آگیا اور مکان کی تلاش شروع کردی۔

مجھے مایوسی نہیں ہوئی۔ سہ پہر چار بجے تک میں نے تین چار مکان دیکھ ڈالے۔ ایک بنگلا نما مکان مجھے پسند آیا تھا۔ یہ بنگلا نہ تو زیادہ گنجان آبادی میں تھا اور نہ ہی وہاں آبادی زیادہ چھدری تھی۔ اس علاقے میں زیادہ تر بنگلے ہی تھے۔ یہ بنگلے مختلف شہروں کے رہنے والے ان دولت مند لوگوں کے تھے جو گرمیوں کا سیزن یہاں آکر گزارتے تھے۔ کچھ بنگلے مقامی لوگوں نے بھی بنوا رکھے تھے۔ یہ بنگلا ایک مقامی آدمی ہی کا تھا۔ بازار میں اس کی گرین گروسری اور پھلوں کی ایک دکان بھی تھی۔ وجے نامی اس شخص سے میری ملاقات ایک پراپرٹی ایجنٹ کے توسط سے ہوئی تھی۔

تین بیڈ رومز کے اس بنگلے کا لان خاصا وسیع تھا اور اس کی چار دیواری بھی خاصی اونچی تھی اور سب سے بڑی سہولت یہ تھی کہ یہاں ٹیلی فون بھی موجود تھا اور ٹیلی فون کی وجہ سے زیادہ کرایہ دینا پڑا تھا۔

اسی روز میں نے یوگی دھیراج سے کہہ کر حفاظت کے لیے دو آدمیوں کا بھی بندوبست کرلیا تھا۔ وہ دونوں نیپالی تھے۔ ایک درمیانے قد کا تھا اور دوسرا قدرے نکلتے ہوئے قد کا مالک تھا۔ وہ دونوں چہروں ہی سے خرانٹ لگتے تھے اور ان دونوں کے پاس پستول بھی موجود تھے۔ میں نے یہ جاننے کی کوشش نہیں کی تھی ان کا یہ اسلحہ لائسنس یافتہ تھا یا ناجائز۔ مجھے بہرحال اس سے کوئی غرض بھی نہیں تھی۔ مجھے تو کام چاہیے تھا۔

یہ بنگلا ڈیکوریٹڈ تھا۔ تینوں بیڈ رومز میں اور لاؤنج میں ضروری فرنیچر موجود تھا۔ میں نے کچھ اور سامان بھی ڈلوا دیا تھا۔ یہ سارا بندوبست کرتے ہوئے مجھے بار بار بازار کی طرف جانا پڑا تھا۔ اس دوران میں میری نظریں اس شخص کو بھی تلاش کرتی رہی تھیں لیکن وہ مجھے کہیں بھی دکھائی نہیں دیا اور نہ ہی کوئی اور مشتبہ آدمی نظروں میں آیا تھا۔

میں جب کانچ واپس پہنچا تو شام ڈھل رہی تھی۔ میں بیچ میں بھی ایک مرتبہ ادھر آیا تھا اور ان سے کہہ دیا تھا کہ وہ سامان وغیرہ پیک کرلیں۔ ہم آج رات ہی یہاں سے شفٹ ہوجائیں گے۔

میری ہدایات پر عمل کرتے ہوئے سونیا وغیرہ نے تمام تیاریاں مکمل کرلی تھیں۔ سامان وغیرہ پیک کیا جاچکا تھا۔ کھانے پینے کے کچھ برتن ابھی کچن میں تھے۔ میں نے دن بھر کچھ بھی نہیں کھایا تھا۔ اس وقت بھی میرا صرف چائے کا موڈ ہو رہا تھا۔

سونیا چائے بنا کر لے آئی۔ چائے پیتے ہوئے میں زیادہ تر شوبھا سے باتیں کرتا رہا۔ وہ بے چاری بہت خوف زدہ تھی اور میں اسے تسلیاں دے رہا تھا۔ بلا بھی اسے بتا رہی تھی کہ میرے ہوتے ہوئے اسے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ وہ اسے بتا رہی تھی کہ میں نے کس طرح جے پور میں رامو جیسے بدمعاش کو مارا تھا اور پھر سارسکا کے جنگل میں گنگولی چوہدری ڈاکو کو کس طرح موت کے گھاٹ اتارا تھا۔

چائے پینے کے بعد سونیا نے وہ برتن بھی دھو کر پیک کرلیے۔ اب ہم لوگ یہاں سے رخصت ہونے کے لیے بالکل تیار تھے لیکن مجھے گاڑی کا انتظار تھا۔ یہاں آنے سے پہلے میں نے اس پراپرٹی ایجنٹ کے توسط سے کرائے کی ایک گاڑی کا بندوبست کرلیا تھا اور اسے آٹھ بجے کے قریب یہاں آنے کا کہہ دیا تھا۔

سات بجے یوگی دھیراج بھی آگیا لیکن شوبھا آج یوگا کی کسی کے موڈ میں نہیں تھی۔ یک سوئی اور ذہنی سکون نہ ہو تو کوئی بھی کام نہیں ہوسکتا اور یوگا کی پریکٹس کے لیے تو مکمل یک سوئی کی ضرورت ہوتی ہے۔

ٹھیک آٹھ بجے گاڑی آگئی۔ یہ ٹویوٹا پک اپ تھی۔ سامان لاد کر سونیا اور بلا پیچھے ہی بیٹھ گئیں اور میں شوبھا کے ساتھ آگے بیٹھ گیا۔ کانچ کو تالا لگا کر چابی میں نے اپنے پاس رکھی تھی۔ یہ چابی کل صبح کانچ کے مالک کو واپس کردی جانی اور اتفاق سے شوبھا نے یہ کانچ بھی اسی پراپرٹی ایجنٹ کے توسط سے لیا تھا جس نے مجھے وجے والا یہ بنگلا دلایا تھا۔

رات دس بجے تک ہم اس بنگلے میں سامان سیٹ کرچکے تھے۔ ایک کمرا شوبھا کو دے دیا گیا۔ ایک پر سونیا اور بلا نے قبضہ کرلیا اور تیسرا کمرا میرے حصے میں آیا۔ میرا اور شوبھا کا کمرا ساتھ ساتھ تھا اور بیچ میں دروازہ بھی تھا۔ شوبھا بہت سہمی ہوئی تھی۔ اس نے بیچ کا دروازہ کھول دیا تھا۔

ہمارے آنے کے تھوڑی ہی دیر بعد دونوں نیپالی گارڈز بھی پہنچ گئے تو شوبھا کو کچھ تسلی ہوئی۔ مجھے بھی اس سیٹ اپ سے اگرچہ قدرے اطمینان ہوگیا تھا لیکن میں پوری طرح مطمئن نہیں تھا۔ ہم نے یہاں شفٹ ہونے میں کسی قسم کی رازداری سے بھی کام نہیں لیا تھا۔ اس کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ یہ شہر اتنا چھوٹا تھا کہ کسی کو آسانی سے تلاش کیا جاسکتا تھا اور ویسے بھی ظاہر ہے ہم چوبیس گھنٹے گھر میں چھپ کر نہیں بیٹھے رہ سکتے تھے۔

اس رات کھانا میں ہوٹل سے لے کر آیا تھا۔ شوبھا نے کل رات کے بعد پہلی مرتبہ رغبت سے کھانا کھایا۔ کھانے کے بعد چائے کا دور بھی چلا۔ چائے کے دوران میں باتیں بھی ہوتی رہیں۔ شوبھا کو یہ فکر دامن گیر تھی کہ اس نے یہاں گیسٹ ہاؤس اور ریسٹورنٹ کا جو پروگرام بنایا تھا اس پر اب عمل نہیں ہوسکے گا۔

"کیوں۔ ایسی کیا بات ہے؟" میں نے پوچھا۔

"میں دیش مکھ کی وجہ سے جے پور سے بھاگ کر یہاں آئی تھی۔" اس نے جواب دیا "اس نے یہاں بھی میرا کھوج لگالیا ہے۔ وہ مجھے چین سے بیٹھنے نہیں دے گا۔"

"یہ صورت حال وقتی ہے۔" میں نے کہا "اگر جے پور میں ہماری ملاقات ہوئی ہوتی تو یہ ٹنٹا ختم ہوچکا ہوتا۔ میں مانتا ہوں کہ وہ یہاں گڑبڑ کرنے کی کوشش کرے گا لیکن وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوسکے گا۔ پہلے تو وہ اکیلی سمجھ کر تمہیں پریشان کرتا رہا ہے لیکن اب تم اکیلی نہیں ہو۔ ہم ہیں نا! اب اسے سوچ سمجھ کر ہی کوئی قدم اٹھانا ہوگا۔"

"ہم نے جو پروگرام بنایا تھا' کیا اس پر عمل ہوسکے گا؟" شوبھا نے پوچھا۔

"کیا رکاوٹ ہے اس میں؟" میں نے کہا "میں نے کہا نا کہ وقتی پریشانی ہے۔ اس کے بعد سب ٹھیک ہوجائے گا۔"

میں نے اس بات کو آگے نہیں بڑھنے دیا اور اٹھ کر باہر آگیا۔ دونوں نیپالی گارڈز اپنی ڈیوٹی پر موجود تھے۔ گیٹ کے اندر اور باہر دونوں طرف کیبن بنے ہوئے تھے۔ لمبے قد والا سریندر اندر والے کیبن میں بیٹھا ہوا تھا اور دوسرا درمیانے

قد والا رابندر باہر والے کیبن میں تھا۔ میں نے پہلے سریندر کے ساتھ گھوم پھر کر اندر کی صورت حال کا جائزہ لیا۔ چار دیواری تقریباً چھ فٹ اونچی تھی اور اس کے اوپر کانٹوں والے تار کی باڑ لگی ہوئی تھی۔ دیواروں کے اندر کی طرف قد آور پودے تھے لیکن ان پودوں کی شاخیں پتلی اور لچک دار تھیں۔ ان پر کسی کے چڑھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

اس بنگلے کی پچھلی طرف خالی جگہ تھی۔ دائیں طرف ایک بنگلا تھا لیکن دونوں بنگلوں کے بیچ تقریباً پندرہ فٹ جگہ خالی تھی۔ اس طرح ایک گلی سی بن گئی تھی۔ بائیں طرف دو تین پلاٹوں کی جگہ خالی تھی۔ اس کے بعد ایک بنگلا تھا اور پھر کچھ جگہ خالی تھی۔ سامنے بھی کچھ ایسی ہی صورت حال تھی۔ کوئی بھی بنگلا ایک دوسرے سے ملا ہوا نہیں تھا۔

میں رابندر کے ساتھ دیر تک باہر کی صورت حال کا جائزہ لیتا رہا اور پھر ان دونوں کو مختلف ہدایات دینے کے بعد اندر آگیا۔ میرے اندر آنے کے فوراً ہی بعد سونیا نے تمام دروازے اور کھڑکیاں بند کردی تھیں۔ عقبی دروازہ تو اس نے لاک کرکے اس کے سامنے ایک بھاری صوفہ رکھ دیا تھا۔

ٹیلی فون لاؤنج ہی میں رکھا ہوا تھا۔ میں اس کے قریب ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور ریسیور اٹھا کر جے پور میں ٹھاکر کا نمبر ملانے لگا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ اس وقت ہوٹل یا ریسٹورنٹ میں موجود ہوگا۔ میں نے ریسٹورنٹ کا نمبر ملایا اور کال ٹھاکر ہی نے ریسیو کی تھی۔

میں نے ٹھاکر کو صورت حال سے آگاہ کرتے ہوئے کانچ سے اس بنگلے میں منتقلی کا بھی بتا دیا اور ٹیلی فون نمبر بھی نوٹ کروا دیا۔

"گھبراؤ نہیں۔" اس نے میری پوری بات سننے کے بعد کہا "میں یہاں دیش مکھ کے بارے میں معلوم کرتا ہوں۔ اس کے بارے میں جیسے ہی کچھ پتا چلا، میں تمہیں اطلاع دے دوں گا۔"

"میں تو نہیں، شوبھا گھبرا رہی ہے۔" میں نے جواب دیا "وہ کچھ اپ سیٹ ہو رہی ہے اور سوچ رہی ہے کہ شاید اسے یہاں سے بھی بھاگنا پڑے۔"

"وہ دیش مکھ کے ڈر سے کب تک اور کہاں تک بھاگتی رہے گی۔ اس سے کہو، پریشان ہونے کی ضرورت نہیں بلکہ میری بات کراؤ اس سے۔" ٹھاکر نے کہا۔

میں نے شوبھا کو بلا کر ریسیور اس کے حوالے کردیا۔ شوبھا تقریباً دس منٹ تک ٹھاکر سے بات کرتی رہی پھر ریسیور میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے کچھ دیر ٹھاکر سے بات کی اور پھر فون بند کردیا۔

وہ رات بھی تقریباً جاگتے ہوئے گزری تھی۔ میں نے اگرچہ حفاظت کا معقول بندوبست کرلیا تھا لیکن شوبھا کے ذہن میں اب بھی کچھ خوف تھا۔ اگر وہ شوبھا کا معاملہ نہ ہوتا اور صرف سونیا یا بلا میرے ساتھ ہوتی تو مجھے یہ سارا کھیڑا کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں ایسا مفلوج یا اپاہج تو نہیں تھا کہ مجھے اپنی حفاظت کے لیے گن مینوں کی ضرورت پڑتی اور ویسے میں یہ بات بھی جانتا تھا کہ ہونے والی بات تو ہو کر ہی رہتی ہے۔ میں نے نہایت معقول حفاظتی انتظامات کرلیے تھے لیکن اگر کچھ ہونا ہوگا تو میں اور دونوں گن مین بھی اسے نہیں روک سکیں گے۔

دو تین دن گزر گئے۔ شوبھا کے چہرے کا رنگ بھی اب پھر گیا تھا۔ اس کے گالوں پر پھر سرخی نظر آنے لگی تھی۔ اس کا خوف بتدریج دور ہو رہا تھا اور وہ ایک بار پھر پہلے کی طرح چہکنے لگی تھی۔

اور پھر اس دن تو میں اسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ میں حسب معمول صبح چھ بجے ریاضت کے لیے یوگی گوتم بھوش کے کانچ چلا گیا تھا جہاں سے میری واپسی دس بجے کے قریب ہوئی۔ سونیا سے تو لان ہی میں ملاقات ہوگئی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر بڑی معنی خیز مسکراہٹ تھی۔

"کیا بات ہے؟" میں نے بھی مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔

"کوئی عورت تم سے ملنے کے لیے آئی ہوئی ہے۔" سونیا نے بدستور مسکراتے ہوئے جواب دیا "پتا نہیں تم کب سے چھپ چھپ کر اس سے ملتے رہے ہو۔ ہم سے تو کبھی تم نے اس کا ذکر ہی نہیں کیا تھا۔"

"کون عورت؟" میں گڑبڑا سا گیا "میں یہاں کسی عورت کو نہیں جانتا اور نہ ہی کسی سے ملتا رہا ہوں۔ کون ہے وہ؟"

"اندر بیٹھی ہوئی ہے۔ جاکر دیکھ لو۔" سونیا نے جواب دیا۔

میں برآمدے والے دروازے سے اندر آگیا۔ سونیا بھی میرے ساتھ ہی تھی۔ لاؤنج میں عین سامنے والے صوفے پر بلا بیٹھی ہوئی تھی۔ مجھے دیکھ کر اس کے ہونٹ بھی مسکرا دیے۔ اس کے سامنے دوسرے صوفے پر کوئی عورت بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کی پشت میری طرف تھی اور میں صرف اتنا دیکھ سکتا تھا کہ اس نے سرمئی رنگ کی ساڑی پہن رکھی تھی۔

میں جھجکتے ہوئے آگے بڑھا اور جیسے ہی سامنے پہنچا، وہ عورت اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ میرے دماغ میں ایک زوردار دھماکا ہوا اور میں اچھل پڑا۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔

وہ شوبھا تھی۔ سرمئی ساڑی اس کے گورے بدن پر خوب کھل رہی تھی۔ ہلکے سے میک اپ نے اس کے حسن میں بے حد نکھار پیدا کردیا تھا۔ اسے دیکھ کر کوئی بھی نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ وہی عورت ہے جس نے کل تک سوگ کی چادر اوڑھ رکھی تھی۔

سرمئی ساڑی پر ایک بالشت چوڑا خوب صورت بارڈر تھا۔ سلیولیس بلاؤز خاصا مختصر تھا۔ اس نے سونے کا خوب صورت لاکٹ اور ہلکے بندے پہن رکھے تھے۔ وہ ایک بھرپور جوان اور حسین عورت تھی۔ بلاؤز میں اس کا شباب گویا چھلکا پڑ رہا تھا۔ میرے لیے اس پر نظریں ٹکانا مشکل ہوگیا اور میں یہ سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ اگر دیش مکھ اس کے لیے مرنے مارنے کو تیار تھا تو کچھ غلط بھی نہیں تھا۔ اس عورت کے لیے تو سلطنت بھی لٹائی جاسکتی تھی اور مجھے حیرت تھی کہ وہ اب تک اپنی زندگی کو اس طرح ضائع کیوں کرتی رہی تھی۔ اس میں شبہ نہیں کہ اسے شوہر کی موت کا بہت صدمہ ہوگا لیکن چند روز پہلے کانچ میں اس نے مجھ سے کہا تھا کہ جانے والوں کے لیے اپنی زندگی کو روگ نہیں لگایا جاسکتا۔ بن باس لے لینا یا اپنی زندگی کو تج دینا تو اپنے ساتھ ہی بہت بڑا ظلم ہوتا ہے۔

میں یہ نہیں کہتا کہ عورت کو عیش و عشرت میں زندگی گزارنی چاہیے یا وہ شمع محفل بنی رہی لیکن اسے اتنا حق تو حاصل ہو کہ وہ زندگی کی خوشیوں میں سے اپنا حصہ وصول کرسکے۔

میرے سامنے کھڑی ہوئی شوبھا نے نمسکار کے لیے دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔ اس کے ہونٹوں پر بڑی دلکش مسکراہٹ تھی۔ وہ زندگی سے بھرپور عورت نظر آرہی تھی۔ نجانے اس وقت میرا دل یہ کیوں چاہنے لگا کہ میں آگے بڑھ کر اسے اپنی بانہوں میں سمیٹ لوں لیکن میں بڑی مشکل سے اپنی اس خواہش پر قابو پاسکا تھا۔

"کہو!" میں مسکرا دیا "آپ سے مل کر خوشی ہوئی۔ مجھے افسوس ہے کہ آپ کو انتظار کی زحمت اٹھانی پڑی لیکن بہرحال دیر آید درست آید۔"

میری اس بات پر ان تینوں نے قہقہہ لگایا اور جب ہنسی تھمی تو میں نے شوبھا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"آپ کو یکایک یہ خیال کیسے آگیا؟"

"میں کئی روز سے اپنا حلیہ بدلنے کے بارے میں سوچ رہی تھی۔" شوبھا نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "اس روز میں نے تمہیں تو لمبا چوڑا لیکچر سنا دیا تھا لیکن بعد میں اپنے بارے میں سوچتی رہی کہ میں خود ان باتوں پر کس حد تک عمل کر رہی ہوں۔ حقیقت یہ ہے....." وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بولی۔

"میں جب جے پور سے نکلی تھی تو یہ طے کرلیا تھا کہ جہاں بھی جاؤں گی، اس اداسی اور افسردگی سے نجات حاصل کرلوں گی۔ میں اپنے بہت سارے کپڑے اور زیور ساتھ لے کر آئی تھی لیکن ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ لوگوں کی باتوں سے ڈر لگتا تھا لیکن جب سے اس بنگلے میں آئے ہیں یہ دونوں میرے پیچھے پڑی ہوئی تھیں۔" اس نے بلا اور سونیا کی طرف اشارہ کیا "اور پھر میں نے بھی سوچا کہ پوری زندگی تو سوگ میں نہیں گزاری جاسکتی۔ دھرم بھی ودھوا (بیوہ) عورت پر یہ پابندی نہیں لگاتا کہ وہ دوسری شادی نہ کرے۔ یہ عورت پر منحصر ہے کہ وہ مرنے والے پتی کی یاد کو سینے سے لگائے رکھے یا پہاڑ جیسی زندگی گزارنے کا کوئی دوسرا سہارا تلاش کرلے۔ اس میں شبہ نہیں کہ مجھے اپنے پتی سے بہت محبت تھی۔ اس نے مجھے زندگی میں بہت خوشیاں دیں۔ میں اسے کبھی نہیں بھول سکوں گی لیکن کسی کی یادوں کے سہارے تو زندگی بسر نہیں کی جاسکتی۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگی "میں جے پور میں بہت سی ایسی عورتوں کو جانتی ہوں جنہوں نے ودھوا ہونے کے بعد دوسری بلکہ اس کے بعد تیسری شادی بھی کرلی۔ ودھوا عورت کے لیے شادی نہ کرنا کوئی زبردستی نہیں ہے۔ اگر وہ دوسری شادی کرنا چاہے تو اسے منع نہیں کیا جاسکتا۔ یہ بات بڑی عجیب سی لگتی ہے کہ دولت مند طبقے میں تو سب کچھ جائز سمجھا جاتا ہے۔ دھرم کو اپنے حق میں استعمال کرنے کے لیے طرح طرح کی تاویلیں گھڑلی جاتی ہیں اور پنڈت بھی ان دھن والوں کا ساتھ دیتے ہیں لیکن نچلے اور غریب طبقے پر ساری پابندیاں عائد رکھی جاتی ہیں۔ ان کا کوئی قدم عام ڈگر سے ہٹ جائے تو ان کا حقہ پانی بند کردیا جاتا ہے اور....."

"لمبی بحث میں جانے کی ضرورت نہیں شوبھا جی۔" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا "آپ مجھے یہ بتائیے کہ کیا آپ نے دوسری شادی کا فیصلہ کرلیا ہے۔ کسی کو نظروں میں ٹکالیا ہے؟"

"نہیں نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔" شوبھا جلدی

سے بولی۔ اس کا چہرہ کچھ اور گل گوں ہوگیا تھا "ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں تو بس۔۔۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے مسکرا کر کہا "تو پھر کیوں نا آج دوپہر کا کھانا باہر ہوجائے۔ یہاں ایک اچھا ریسٹورنٹ بھی ہے۔ پریم نورس۔ یورپین اور چائنیز کھانے بہت اچھے بنتے ہیں وہاں۔"

"مجھے کوئی اعتراض نہیں لیکن۔۔۔"

"لیکن ویکن کچھ نہیں۔" میں نے ایک بار پھر اس کی بات کاٹ دی "ایک بار باہر نکلو گی تو ساری جھجک اور خوف دور ہوجائے گا۔"

"ٹھیک ہے۔ چلو۔" شوبھا نے میری بات مان لی۔

"ارے بھئی۔ ہمیں دس منٹ کا وقت دو۔ ہم بھی تو تیار ہوجائیں۔" سونیا نے جلدی سے کہا۔

وہ دونوں فوراً ہی اپنے کمرے میں گھس گئیں اور دروازہ بند کرلیا۔ میں شوبھا کے پاس بیٹھا باتیں کرتا رہا۔ میری نظریں بار بار شوبھا کی طرف اٹھ رہی تھیں۔ میری نظروں میں میل نہیں تھا نہ ہی من میں کھوٹ تھی لیکن نجانے کیوں میرے سینے میں گدگدی سی ہونے لگی تھی اور دل چاہتا تھا اسے دیکھتا رہوں۔

ٹھیک دس منٹ بعد سونیا اور بملا بھی تیار ہو کر کمرے سے نکل آئیں اور اس کے دو تین منٹ بعد ہم بنگلے کے گیٹ سے نکل رہے تھے۔ میں نے سریندر اور راہبندر کو کچھ ہدایات دیں اور ہم ایک طرف چلنے لگے۔

بازار زیادہ دور نہیں تھا۔ شوبھا ہمارے ساتھ پہلی مرتبہ اس طرح آزادی سے باہر نکلی تھی اور بہت خوش تھی۔

ہم کافی دیر تک بازاروں میں گھومتے رہے۔ ایک چکر لاری اڈے کا بھی لگایا۔ شوبھا انجانا کی مریضہ تھی۔ اس کی وجہ سے ہمارے چلنے کی رفتار بہت سست رہی تھی۔

دو بجے کے قریب ہم پریم نورس ریسٹورنٹ میں پہنچ گئے۔ بہت کشادہ ہال تھا۔ مناسب فاصلوں پر میزیں بچھی ہوئی تھیں۔ دیواروں کے ساتھ ہٹ نما کیبن بنے ہوئے تھے۔ اوپر بھی وسیع بالکونی تھی اور وہاں بھی میزیں بچھی ہوئی تھیں اور کیبن بھی تھے۔ نچلے ہال میں اگرچہ ایک دو میزیں خالی تھیں لیکن ہم اوپر بالکونی میں آگئے اور ایک ایسی میز پر بیٹھ گئے جہاں سے نیچے آمدورفت کے دروازے پر بھی نگاہ رکھی جاسکتی تھی۔ اس ریسٹورنٹ میں اگرچہ مقامی گاہک بھی تھے مگر زیادہ آمدورفت یورپین سیاحوں کی تھی۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ یہاں چائنیز اور یورپین کھانے دستیاب تھے۔

ریسٹورنٹ میں سروس کے لیے حسین اور خوب صورت لڑکیاں تھیں۔ اسکرٹ بلاؤز میں ملبوس یہ خوب صورت لڑکیاں گاہکوں کی سیوا کے لیے بڑی مہارت اور پھرتی سے اِدھر اُدھر آجا رہی تھیں۔ ایک ویٹریس ہماری میز پر بھی آگئی اور ہم نے تین چار مختلف ڈشوں پر مشتمل چائنیز کھانے کا آرڈر دے دیا۔

ریسٹورنٹ سے نکل کر ہم پھر بازاروں میں گھومنے لگے۔ ضرورت کی چند چیزیں بھی خریدیں اور واپس آگئے۔

شوبھا کی جھجک اور خوف دور ہوگیا تھا۔ اسی دوران میں ہمیں کوئی ایسا آدمی بھی نظر نہیں آیا تھا جس پر کسی قسم کا شبہ کیا جاسکتا۔ شوبھا ایک بار پھر گیسٹ ہاؤس اور ریسٹورنٹ کے منصوبے بنانے لگی تھی۔

اس کے تیسرے دن ہم پھر پریم نورس ریسٹورنٹ میں رات کا کھانا کھا رہے تھے۔ اس وقت بملا بھی ساڑی میں تھی اور شوبھا نے بھی نیوی بلو ساڑی پہن رکھی تھی۔ اس ساڑی میں وہ پہلے سے کہیں زیادہ حسین لگ رہی تھی۔ سونیا حسب معمول اسکرٹ بلاؤز میں تھی۔ آس پاس کی میزوں پر بیٹھے ہوئے لوگ مڑ مڑ کر ان کی طرف دیکھ رہے تھے۔

ہم ریسٹورنٹ سے نکل کر ٹہلتے ہوئے گیارہ بجے کے قریب کوٹھی پر پہنچ گئے۔ گیٹ کے باہر کیبن میں کرسی پر بیٹھا ہوا نیپالی گارڈ راہبندر ہمیں دیکھتے ہی اٹھ گیا۔

"صاحب جی۔ آپ کے دو مہمان آئے ہوئے ہیں۔ ہم نے انہیں بڑی عزت سے اندر بٹھا دیا ہے۔" اس نے باری باری ہماری طرف دیکھتے ہوئے بتایا۔

"دو مہمان!" میں چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا پھر میرے ذہن میں اچانک ہی ٹھاکر اور روپ متی کا خیال ابھر آیا "اوہ۔۔۔ جے پور سے آئے ہیں؟" میں نے سوالیہ نگاہوں سے راہبندر کی طرف دیکھا۔

"جی صاحب۔ مہمان لوگ ایسا ہی بولا۔ جے پور سے آنے کا ہے۔" راہبندر نے جواب دیا۔

ہم گیٹ کے اندر داخل ہوئے تو سریندر نے بھی اٹھ کر سلام کیا۔

"ٹھاکر اور روپ متی آئے ہوں گے۔" شوبھا نے کہا۔

"ان کے سوا کون ہوسکتا ہے۔" میں نے جواب دیا "تین دن پہلے ٹھاکر سے فون پر بات ہوئی تھی۔ اس وقت تو اس نے یہاں آنے کے بارے میں کچھ نہیں کہا تھا۔"

"ہوسکتا ہے وہ ہمیں سرپرائز دینا چاہتے ہوں اس لیے اپنے آنے کی اطلاع نہیں دی۔" بملا نے کہا۔

ہم برآمدے والے دروازے میں داخل ہوئے تو میں ٹھٹک کر رک گیا۔

مجھے یوں لگا جیسے زمین نے میرے پیر پکڑ لیے ہوں۔

سامنے ہی صوفے پر دو آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک کو میں نے فوراً ہی پہچان لیا۔ کئی مرتبہ اخباروں میں اس کی تصویر دیکھ چکا تھا۔

وہ دیش مکھ تھا۔

میں نے مڑ کر شوبھا کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ ایک دم پیلا پڑ گیا تھا جیسے سارا خون نچڑ گیا ہو۔ سونیا اور بملا کے چہروں پر بھی ہوائیاں سی اڑنے لگیں۔ وہ دونوں سہمی ہوئی نظروں سے دیش مکھ کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

دیش مکھ صورت ہی سے غنڈا لگتا تھا۔ اس کا قد چھ فٹ کے قریب تو ضرور رہا ہوگا۔ کسرتی بدن، سر پر گول ٹوپی جس پر رنگین دھاگوں سے کشیدہ کاری کی گئی تھی۔ ٹوپی کسی قدر ترچھی رکھی ہوئی تھی۔ اس کے دائیں گال پر چنے کے دانے کے برابر کالا مسّا تھا۔ وہ باقاعدگی سے شیو بنانے کا عادی تھا۔ باریک مونچھیں جو کناروں سے اوپر کو اٹھی ہوئی تھیں انہیں شاید تلوار کٹ مونچھیں کہا جاتا تھا۔

دیش مکھ نے جینز کی پتلون اور اوپن شرٹ پہن رکھی تھی جس کے اوپر کے بٹن کھلے ہوئے تھے اور گلے میں سونے کی موٹی سی چین نظر آرہی تھی۔ وہ نیتا (سیاست داں) تھا اور میرے خیال میں کسی سیاست داں کو اس قسم کا حلیہ زیب نہیں دیتا تھا لیکن پھر یہ بات بھی تھی کہ وہ بنیادی طور پر غنڈا تھا۔ اس کی فطرت تو نہیں بدل سکتی تھی۔ وہ صوفے پر آلتی پالتی مارے بیٹھا ہوا تھا۔

اس کا دوسرا ساتھی درمیانے قد اور گٹھے ہوئے جسم کا مالک تھا۔ صورت سے وہ بھی چھٹا ہوا بدمعاش لگتا تھا۔

"واہ شوبھا دیوی۔" وہ اپنی جگہ پر پہلو بدلتے ہوئے بولا تھا۔ اس کی ہوس بھری نظریں شوبھا کے سراپا کا جائزہ لے رہی تھیں "یہاں آکر تو خوب پر پرزے نکال لیے۔ روپ بھی ساتھ لے آئی۔ غضب کا نکالا ہے۔ یہ لونڈا پھانس لیا ہے کیا۔ ہم میں کیا کمی ہے؟"

"ارے! کون ہو تم اور یہ کیا بکواس کر رہے ہو؟" میں نے بے ساختہ آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

"ارے ہوش میں رہ چھوکرے۔" دیش مکھ پہلو بدلتے ہوئے غرایا "تو ہم کا نہیں جانت ہو۔ نیتا ہوں نیتا۔۔۔ الٹا ٹانگ کے چڑی گرا دوں گا۔ تو چپکا کھڑا رہ۔ ہم شوبھا سے بات کر رہا ہوں۔"

"پہلے تو میں تمہاری نیتائی نکال دوں۔" میں نے بھی غرا کر کہا اور شوبھا کو کمرے میں جانے کا اشارہ کیا "سنا ہے تم بہت بڑے غنڈے ہو۔ لوگ تمہارا نام سن کر کانپتے ہیں۔ تمہیں تمہاری شامت ہی یہاں کھینچ لائی ہے۔ اب تم اپنے پیروں پر چل کر یہاں سے نہیں جاسکو گے۔"

"ارے۔ کتے کی طرح کیا بھونکت ہو۔" دیش مکھ نے کہا۔ وہ اب بھی صوفے پر آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا جبکہ اس کا دوسرا ساتھی مجھ پر جھپٹ پڑنے کو تیار تھا "ہمارا تمہارا کوئی دشمنی ناہی ہے اے۔ ہم اس کو لینے آیا ہوں۔ شوبھا کو۔ بہت عیش کرلیا تم نے اس کا ساتھ۔ اب اسے ہمار حوالہ کرو۔ ہم یہاں سے چلا جاؤں گا۔"

"یہ درست ہے کہ پہلے میری اور تمہاری کوئی دشمنی نہیں تھی۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے لیے اجنبی تھے لیکن تم نے اس گھر میں داخل ہو کر دشمنی کی بنیاد رکھ دی ہے۔ میں تمہیں صرف ایک منٹ کا وقت دے رہا ہوں۔ اگر تم نے اس مہلت سے فائدہ نہ اٹھایا تو۔۔۔"

"کیا دیکھت رہے ہو رانگڑ!" دیش مکھ نے میری بات کاٹ کر اپنے ساتھی کو مخاطب کیا "لونڈے کو بتا ہم کون ہووت ہیں اور یہاں کیوں آیا ہوں۔ اس کو یہ بھی بتا کہ شوبھا ہماری ہے۔ اس نے اب تک اس کے ساتھ جو عیاشی کرلی وہ ہم ماف کرت دیویں ہوں۔ چل۔ بتا دے اس کو۔ ہم شیر کے منہ میں ہاتھ ڈال کر سکار چھین لیوت والا ہوں۔"

رانگڑ اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ اس نے جینز کی پتلون پر بغیر آستین کی چمڑے کی جیکٹ پہن رکھی تھی۔ بازوؤں کے مسلز ابھرے ہوئے تھے۔ سینے اور چہرے پر زخموں کے کئی نشان تھے جس سے اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ اس کی زندگی کا بیشتر حصہ لڑتے ہوئے ہی گزرا ہے۔ اس کی آنکھوں میں سرخی بھی نظر آرہی تھی۔

وہ صوفے سے اٹھ کر نپے تلے قدم اٹھاتے ہوئے میری طرف بڑھا اور دو قدم کے فاصلے پر رک گیا۔ میں اس طرح آگے کو جھکا جیسے اس کی ٹانگوں سے لپٹنا چاہتا ہوں۔ وہ اپنے آپ کو بچانے کے لیے تیزی سے نیچے جھکا لیکن میں نے اس سے بھی زیادہ تیزی سے سیدھا ہو کر اس کی ٹھوڑی پر گھٹنے سے زوردار ضرب لگا دی۔ وہ کراہتے ہوئے سیدھا ہوا تو میں نے اپنی جگہ پر اچھل کر اس کے سینے پر فلائنگ کک لگائی۔

کک اس کے سینے پر لگی۔ میرا خیال تھا کہ وہ ڈھیر ہوجائے گا مگر وہ محض لڑکھڑا کر رہ گیا تھا۔ میں پھر اچھلا۔ اس مرتبہ میں نے ہوا میں گھوم کر کک لگائی تھی۔ میرے دائیں پیر

کا پنجہ گدی کی طرف سے اس کے دائیں کندھے کے جوڑ پر لگا۔ اس مرتبہ وہ کراہ کر دو قدم اور پیچھے ہٹ گیا۔

میں اسے سنبھلنے کا موقع نہیں دینا چاہتا تھا۔ اس مرتبہ میں نے فلائنگ کک کے بجائے وہیں کھڑے کھڑے لٹو کی طرح گھوم کر اسپن کک لگائی۔ یہ ضرب اس کے پہلو پر لگی۔ وہ اس مرتبہ بھی گرنے کے بجائے گھوم کر رہ گیا۔ وہ ایک ہاتھ پہلو پر رکھے نیچے جھکا تو میں بھی تیزی سے نیچے جھک گیا اور اسے کندھے پر اٹھا کر صوفے کی طرف اچھال دیا۔

رانگڑ دیش مکھ کے اوپر گرا۔ دیش مکھ چیخ اٹھا۔ وہ دونوں صوفے سمیت پیچھے الٹ گئے۔ میں بھی چھلانگ لگا کر صوفے کی پچھلی طرف پہنچ گیا۔ دیش مکھ کی ٹوپی دور جا گری تھی۔ اس کے بال اتنے بڑے نہیں تھے کہ مٹھی میں آسکتے۔ میں نے اسے شرٹ کے کالر سے پکڑ کر اٹھایا اور اس کے کولھے پر ایک زوردار ٹھوکر مار دی۔ وہ لڑکھڑاتے ہوئے منہ کے بل صوفے کی دوسری طرف گرا۔ میں بھی چھلانگ لگا کر واپس اسی طرف آگیا۔

دیش مکھ بڑی پھرتی سے اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ اس نے اپنی جیب کی طرف ہاتھ بڑھایا لیکن اس سے پہلے کہ اس کا ہاتھ جیب تک پہنچتا، میں ایک بار پھر اپنی جگہ سے اچھلا۔

میری دونوں ٹانگیں اس کی گردن سے لپٹ گئیں۔ اس طرح میرا سر نیچے کی طرف ہوگیا تھا۔ دیش مکھ نے اپنے حواس قابو میں رکھے تھے۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے میرے پہلوؤں کو گرفت میں لینے کی کوشش کی۔ اگر اس کی گرفت جم جاتی تو میری خیریت خطرے میں پڑجاتی لیکن میں نے اپنے دونوں ہاتھ زمین پر ٹکا کر اپنے آپ کو آگے کی طرف جھٹکا دیا۔

دیش مکھ میرے اوپر سے ہوتے ہوئے پورے قد کے ساتھ الٹی قلابازی کھا کر پشت کے بل سینٹر ٹیبل پر گرا۔ میز کی ٹاپ شیشے کی تھی۔ شیشہ ایک زوردار چھناکے سے ٹوٹ گیا اور اس کے ساتھ ہی دیش مکھ کے منہ سے زوردار چیخ نکل گئی تھی۔

میں فوراً ہی سنبھل گیا تھا اور اٹھنے کی کوشش کررہا تھا کہ رانگڑ ہاتھ میں چاقو لیے مجھ پر حملہ آور ہوا۔ میں نے اسے دونوں پیروں پر روک کر پوری قوت سے دوسری طرف اچھال دیا اور بڑی تیزی سے اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔

رانگڑ بھی اٹھنے کی کوشش کررہا تھا لیکن میں نے اس کو موقع نہیں دیا۔ میں نے زوردار راؤنڈ ہاؤس کک لگادی جو اس کی پنڈلی کی پچھلی طرف لگی۔ وہ چیختے ہوئے نیچے گرا۔ میرا خیال تھا اس کی پنڈلی کا گوشت پھٹ گیا تھا۔

دیش مکھ اس دوران میں اٹھ چکا تھا اور وہ ایک بار پھر جیب میں ہاتھ ڈالنے کی کوشش کررہا تھا لیکن میں نے اس مرتبہ بھی اسے موقع نہیں دیا۔

میری سائیڈ کک اس کے بازو پر لگی اور پھر میں نے اسے سنبھلنے کا موقع نہیں دیا اور کک پر کک لگاتا چلا گیا۔ اس دوران میں رانگڑ بھی سنبھل کر میری طرف لپکا تھا لیکن میں اس سے غافل نہیں تھا۔ میری ایک ہی اسپن کک نے اسے زمین چاٹنے پر مجبور کردیا۔ میں پھر دیش مکھ کی طرف متوجہ ہوگیا۔ میرا ایک بھرپور پنچ اس کے جبڑے پر لگا۔ وہ چیخ اٹھا۔ اس کے منہ سے خون بہہ نکلا۔ میں نے اسی جگہ ایک اور پنچ لگایا۔ اس مرتبہ اس نے خون تھوکا تو اس کے ساتھ ایک دانت بھی تھا۔

"مارو۔ مارو اسے۔ اور مارو۔۔۔"

یہ شوبھا کی آواز تھی۔ میں نے اسے کمرے میں بھیجا تھا لیکن وہ باہر آگئی تھی۔ ان دونوں کو میرے ہاتھوں پٹتے دیکھ کر اس کا حوصلہ بڑھا تھا اور وہ چیخ چیخ کر میرا حوصلہ بڑھا رہی تھی۔

مجھے واقعی اس کے چیخنے سے مزید حوصلہ ملا تھا۔ میں نے دیش مکھ اور رانگڑ کو ایک بار پھر ٹھوکروں پر رکھ لیا تھا۔ شوبھا کے جی میں جانے کیا آئی کہ وہ بھی میدانِ جنگ میں کود پڑی اور پھر بھلا بھی اس سے پیچھے نہیں رہی تھی۔ ان دونوں نے ٹوٹی ہوئی سینٹر ٹیبل کے پائے کھینچ لیے تھے اور ان دونوں کی اس طرح دھنائی کررہی تھیں جیسے دھوبی گھاٹ پر بیٹھی کپڑے کوٹ رہی ہوں۔

سونیا باہر دوڑ گئی تھی۔ وہ دونوں نیپالی گن مینوں کو لے آئی۔ نیپالی گن مینوں نے یہ صورت حال دیکھی تو رانگڑ اور دیش مکھ پر پل پڑے۔ میں نے بھلا اور شوبھا کو پیچھے کھینچ لیا۔ شوبھا بری طرح بپھری ہوئی تھی۔ میں اسے بانہوں کی لپیٹ میں لے کر کمرے میں آگیا۔

"چھوڑ دو مجھے۔" وہ اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے چیخ رہی تھی "میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گی۔ مار دو اسے۔ اس نے مجھے بہت پریشان کیا ہے۔ مجھے سولی پر ٹانگ رکھا تھا اس نے۔۔۔"

"ہوش میں آؤ شوبھا۔" میں نے اسے بانہوں سے پکڑ کر جھنجوڑ دیا "اپنے حواس قابو میں رکھو۔ اب وہ تمہیں پریشان نہیں کرے گا۔ تم یہیں بیٹھی رہو۔ باہر مت آنا۔"

میں اسے کمرے میں چھوڑ کر لپک کر باہر آگیا۔ سریندر نے اپنا پستول نکال لیا تھا اور رابندر لاتوں اور گھونسوں سے ان دونوں کی دھنائی کررہا تھا۔

"بس۔ چھوڑ دو اب انہیں۔" میں نے چیخ کر کہا "گھر آئے ہوئے مہمانوں کی اتنی ہی سیوا کافی ہے۔"

سریندر اور رابندر مشینی انداز میں رک گئے اور پھر میری ہدایت پر رابندر ان کی تلاشی لینے لگا۔ دیش مکھ کی پتلون کی جیب سے پستول برآمد ہوا جسے لڑائی کے دوران میں وہ بار بار نکالنے کی کوشش کرتا رہا تھا۔

رانگڑ کے پاس سے کوئی آتشیں اسلحہ برآمد نہیں ہوا۔ اس کے پاس وہی چاقو تھا جو اب ٹوٹی ہوئی میز کے قریب دری پر پڑا تھا۔ رابندر نے وہ چاقو بھی اٹھالیا۔

"کیا خیال ہے نیتا جی۔" میں نے دیش مکھ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "اس حالت میں تمہاری تصویر کھینچ کر اخباروں میں چھپوا دی جائے تو کیسی رہے؟"

"تیرا دماغ چل گیا ہے لونڈے۔" دیش مکھ کے منہ سے آواز بھی بمشکل نکل سکی تھی "ہم اب بھی کہتا ہوں کہ شوبھا کو میرے حوالے۔۔۔"

اس کی کھوپڑی پر لگنے والی میری ٹھوکر سے اس کے آخری الفاظ چیخ میں بدل گئے تھے۔

"اب اگر تمہاری زبان پر شوبھا کا نام آیا تو میں تمہاری زبان کاٹ دوں گا۔" میں نے اسے ایک اور ٹھوکر مارتے ہوئے کہا "تم شوبھا کو جس طرح پریشان کرتے رہے ہو، مجھے سب معلوم ہوچکا ہے لیکن اب اگر تم نے شوبھا کی طرف میلی آنکھ سے بھی دیکھا تو آنکھیں نکال دوں گا اور تمہارے ہاتھ پیر کاٹ کر کتوں کو کھلا دوں گا۔ تم بھیک مانگنے کے قابل بھی نہیں رہو گے۔"

"بول لے۔ بول لے تو۔" دیش مکھ نے دری پر خون تھوکتے ہوئے کہا "پر یہ جان لے اے کہ شوبھا میری ہے۔ دنیا کی کوئی شکتی اسے مجھ سے نہیں بچا سکتی۔ وہ۔۔۔"

اس کے آخری الفاظ ایک بار پھر چیخ میں بدل گئے۔ پتا نہیں شوبھا کس وقت کمرے سے نکل آئی تھی۔ اس نے ہاتھ میں پڑا ہوا میز کا پایہ پوری قوت سے اس کے کندھے پر مارا اور پھر پے در پے اس پر ضربیں لگاتی رہی۔ دیش مکھ اپنے آپ کو بچانے کے لیے دری پر لوٹتا رہا لیکن شوبھا کا ہر وار اسے چیخنے پر مجبور کردیتا۔ میں نے لپک کر شوبھا کو بڑی مشکل سے قابو میں کیا تھا۔

"شوبھا کو تم نے لوٹ کا مال سمجھ رکھا ہے۔" وہ چیخی "شرم ہے تمہاری مردانگی پر!" اس نے دیش مکھ کے منہ پر تھوک دیا "کمزور اور بے سہارا عورتوں پر دھونس جما کر اپنے آپ کو بہت بہادر سمجھتے تھے۔ ایک مرد سامنے آیا تو تمہاری ساری مردانگی نکل گئی۔ تھو۔۔۔" اس نے ایک بار پھر تھوک دیا۔

"مردانگی تو ہم تمہیں دکھاؤں گا۔" دیش مکھ بولا۔

وہ واقعی بہت ڈھیٹ اور بہت بے غیرت تھا۔ اتنی پٹائی ہونے کے بعد بھی اسے غیرت نہیں آئی تھی۔

"بہتر ہے کہ تم اب یہاں سے چلے جاؤ۔" میں نے اسے گھورتے ہوئے کہا "میں تمہیں ایک موقع دے رہا ہوں۔ یہ پہلا اور آخری موقع ہے۔ آئندہ اگر تم نے شوبھا کے راستے میں آنے کی کوشش کی تو تم اپنے پیروں پر چلنے کے قابل بھی نہیں رہو گے۔"

"دیکھ لوں گا اے۔ تیرے کو بھی دیکھ لوں گا۔" دیش مکھ خوں خوار نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"اس کو چھوڑنے کا مت صاحب۔" سریندر نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا "اس لوگ کو پولیس کسٹڈی میں دینے کا ہے نا۔"

"نہیں۔ اس مرتبہ انہیں جانے دو لیکن اگر آئندہ کہیں آس پاس نظر بھی آئیں تو اڑا دینا گولیوں سے۔" میں نے کہا۔

"ٹھیک بولنے کا ہے صاحب۔" سریندر نے کہا اور دیش مکھ کو شرٹ کے کالر سے پکڑ کر اٹھا دیا "چل اٹھ۔ تم تو ہم کو بولنے کا تھا کہ بیگم صاحب کا رشتے دار ہو اس لیے ہم تم کو عزت کے ساتھ اندر بٹھا دیا۔ کوئی چیز تو چوری نہیں کیا ہو؟"

"تم ہماری تلاش لے چکے ہو۔" دیش مکھ نے تنکے سے اپنا کالر چھڑا لیا پھر میری طرف دیکھتے ہوئے بولا "ہم چلتا ہوں۔"

"چلے بھی جاؤ۔" میں نے غصے میں کہا "اور ہاں۔ اپنا یہ دانت بھی اٹھا کر لے جاؤ۔ ہمیں اس کی ضرورت نہیں ہے۔"

اس نے خوں خوار نظروں سے میری طرف دیکھا اور رانگڑ کو اشارہ کرتے ہوئے لڑکھڑاتے ہوئے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ رانگڑ لنگڑاتے ہوئے چل رہا تھا۔ اس کی پنڈلی کی پچھلی طرف لگنے والی میری راؤنڈ ہاؤس کک سے گوشت پھٹ گیا تھا اور میں جانتا تھا کہ وہ آٹھ دس دن بالش کرواتا رہے گا۔ دیش مکھ کی حالت بھی کچھ اچھی نہیں تھی۔ اس کا ایک دانت ٹوٹ چکا تھا اور جسم کے دوسرے حصوں پر بھی چوٹیں آئی تھیں۔

جیسا کہ میں پہلے بھی کہیں بتا چکا ہوں کہ اس قسم کے

غنڈوں کی ساری طاقت ان کے گرگوں میں ہوتی ہے۔ وہ خود کسی کے ہتھے چڑھ جائیں تو چند ہاتھ کھا کر ہی قدموں پر گر جاتے ہیں اور گڑگڑا کر رحم کی بھیک مانگنے لگتے ہیں۔ دیش مکھ اس لحاظ سے دوسرے غنڈوں سے مختلف ثابت ہوا تھا کہ بری طرح پٹنے کے بعد بھی وہ ہاتھ جوڑ کر گڑگڑایا نہیں تھا بلکہ آخری وقت تک سنگین نتائج کی دھمکیاں دیتا رہا تھا۔

میں بھی ان کے پیچھے ہی باہر نکل آیا۔ بملا بھی میرے ساتھ تھی۔ سریندر اور راجندر دیش مکھ اور راگنز کو دھکے دیتے ہوئے گیٹ سے باہر لے آئے اور ان کے کولھوں پر لاتیں رسید کر کے چھوڑ دیا۔

وہ دونوں گلی کے آخر میں موڑ پر کھڑی ہوئی ایک کار کے قریب رک گئے۔ جب ہم بازار سے واپس آئے تھے تو اس کار کے قریب سے گزرے تھے مگر توجہ نہیں دی تھی۔ وہ دونوں کار میں بیٹھ گئے۔ چند سیکنڈ بعد انجن اسٹارٹ ہونے کی آواز سنائی دی اور پھر کار پرشور آواز کے ساتھ مخالف سمت میں چلی گئی۔

میں نے راجندر کو گیٹ پر ہی چھوڑ دیا اور سریندر کو اشارہ کرتے ہوئے اندر آگیا۔ سونیا اور شوبھا اسی جگہ پر کھڑی تھیں جہاں میں انہیں چھوڑ کر گیا تھا۔ شوبھا کی ساڑی کا پلو نیچے لٹکا ہوا تھا اور اسے دیکھ کر لگتا تھا جیسے اس نے صرف دھوتی اور بلاؤز پہن رکھا ہو..... میں اس کے سامنے رک گیا۔ وہ چند لمحے عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھتی رہی پھر سونیا، بملا اور سریندر کی موجودگی کی پروا کیے بغیر والہانہ انداز میں مجھ سے لپٹ گئی اور میرے رخساروں اور پیشانی پر چٹاچٹ بوسے دینے لگی۔

"تم واقعی بہت بہادر اور حوصلہ مند ہو۔" وہ ایک قدم پیچھے ہٹ کر میرے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولی "دیش مکھ کو یہاں دیکھ کر تو میری روح فنا ہو گئی تھی۔ میں تو یہ سمجھی تھی کہ شاید....."

"ہمارا انت ہونے والا ہے۔" میں نے اس کا جملہ مکمل کر دیا۔

"ہاں ہاں۔ میں تو کانپ کر رہ گئی تھی۔" اس نے سر ہلا دیا۔

"میرا ہمت سنگھ بہت ہمت والا ہے ویدی۔" بملا بول پڑی "مجھے یاد ہے جب سار سکا میں ڈاکو مجھے اغوا کر جنگل میں لے گئے تھے تو یہ اکیلا ان ڈاکوؤں کے پیچھے جنگل میں آگیا اور ڈاکوؤں کے سردار کو اس طرح پنچ پنچ کر اور اچھل اچھل کر مارا کہ وہ منظر میں آج بھی نہیں بھول سکتی۔"

"باتیں بعد میں ہوں گی۔ پہلے یہاں کی صفائی تو کرلیا جائے۔" میں نے کہا۔

سریندر پہلے ہی اپنے کام میں مصروف ہو چکا تھا۔ اس نے الٹے ہوئے صوفے اور کرسیاں سیدھی کر دیں اور ٹوٹی ہوئی میز اور شیشے کے ٹکڑے اٹھانے لگا۔

بملا اور سونیا بھی اس کا ہاتھ بٹانے لگیں۔ سریندر نے شیشے کے ٹکڑے اٹھا کر باہر پھینک دیے۔ سونیا ایک بالٹی میں پانی اور پرانا کپڑا لے آئی۔ سریندر کپڑا بھگو کر دری پر خون کے دھبے صاف کرنے لگا۔ اس نے دیش مکھ کا ٹوٹا ہوا دانت بھی اٹھا کر باہر پھینک دیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ دیش مکھ چار چھ روز تک اپنے جبڑوں کی سکائی ضرور کرے گا۔

صفائی میں پون گھنٹا لگ گیا۔ صفائی کے دوران میں دری سے دیش مکھ اور راگنز کی سونے کی زنجیریں بھی مل گئیں۔ لڑائی کے دوران میں زنجیریں ان کے گلوں سے ٹوٹ کر گر گئی تھیں۔ میں نے ایک چین سریندر کو اور دوسری راجندر کو انعام کے طور پر دے دی۔ وہ دونوں بہت خوش ہوئے۔ پستول اور چاقو میں نے سریندر سے لے لیا تھا۔ ان دونوں نے پھر اپنی ڈیوٹی سنبھال لی۔

سونیا نے ایک اور اچھا کام یہ کیا کہ کافی بنا کر لے آئی۔ اس وقت واقعی چائے یا کافی کی طلب محسوس ہو رہی تھی۔ اس دوران میں شوبھا بار بار میرا جسم ٹٹول رہی تھی اور پوچھ رہی تھی کہ مجھے چوٹ تو نہیں لگی۔

"تم نے انہیں یہاں سے چلے جانے کا موقع دے کر اچھا نہیں کیا۔" شوبھا نے کہا "وہ دھمکی دے کر گیا ہے اور پھر آئے گا۔"

"اب اگر وہ آیا تو اپنے پیروں پر چل کر نہیں، کھاٹ پر ہی واپس جائے گا۔" میں نے جواب دیا "ویسے آج تم نے بھی اپنے دل کی کچھ بھڑاس نکال لی۔ اب تمہارے دل میں کوئی خوف نہیں ہونا چاہیے۔ غنڈوں سے ڈرا جائے تو وہ اتنا ہی زیادہ ڈراتے ہیں۔ ان سے نمٹنے کا ایک ہی طریقہ ہے جو آج تم نے دیکھ لیا۔"

"ہاں۔ اب میرے دل میں کوئی خوف نہیں رہا۔ اب میں اسے معاف نہیں کروں گی۔" شوبھا نے جواب دیا۔

ہم ابھی باتیں کر رہے تھے کہ فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ ہم سب اچھل پڑے۔ بملا قریب بیٹھی تھی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر ریسیور اٹھا لیا۔ بات کرتے ہوئے اس کے چہرے پر تمتماہٹ سی آگئی۔ میں سمجھ گیا کہ وہ کس کی کال ہو سکتی ہے اور پھر اس نے ریسیور میری طرف بڑھا دیا۔

"ویدی روپ متی ہے۔" اس نے بتایا۔

میں نے ریسیور لے لیا۔ چند لمحے روپ متی سے بات کرتا رہا پھر فون کرلائن پر آگیا۔ چند رسمی جملوں کے تبادلے کے بعد اس نے کہا۔

"میں اپنے ایک آدمی کے ذریعے دیش مکھ کی نگرانی کروا رہا تھا لیکن دو دن پہلے وہ اچانک غائب ہو گیا۔ وہ جے پور میں ہے۔"

"اس سے ہماری ملاقات ہو گئی ہے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے۔" میں نے جواب دیا۔

"کیا مطلب؟ کیا وہ....."

"ہاں۔ وہ یہاں پہنچ گیا ہے اور ایک ڈیڑھ گھنٹا پہلے یہاں کوٹھی پر آیا تھا۔ ہم نے اس کی مناسب تواضع کر دی ہے۔ امید ہے اسے کوئی شکایت نہیں رہے گی۔" میں نے کہا اور پھر اسے آج کے واقعے کی تفصیل بتانے لگا۔

"اوہ!" ٹھاکر نے کہا "میری ضرورت ہو تو آجاؤں؟"

"فی الحال نہیں۔" میں نے جواب دیا "ابھی تو کئی روز تک وہ اپنی چوٹیں سہلاتا رہے گا۔ ہو سکتا ہے رشی کیش ہی میں کہیں چھپا رہے یا کہیں اور چلا جائے لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ واپس ضرور آئے گا اور اگر ضرورت پڑی تو میں تمہیں اطلاع کر دوں گا۔"

"اگر کہو تو میں ایک دو آدمی بھیج دوں۔" ٹھاکر نے کہا۔

"نہیں۔ میں نے یہاں بندوبست کر لیا ہے۔ تم پریشان مت ہو۔ ایسی کوئی بات ہوئی تو میں فوراً تمہیں اطلاع دوں گا۔" میں نے جواب دیا اور کچھ دیر مزید گفتگو کے بعد فون بند کر دیا۔

میں فون بند کر کے شوبھا وغیرہ کو ٹھاکر سے ہونے والی گفتگو سے آگاہ کرنے لگا اور پھر اس رات بھی دیر تک باتیں کرتے رہے۔ شوبھا اسی حالت میں بیٹھی ہوئی تھی یعنی اس کی ساڑی کا پلو زمین پر پڑا ہوا تھا اور میری نظریں بار بار اس کی طرف اٹھ رہی تھیں۔

گیارہ بجے کے قریب سب سے پہلے بملا اٹھ کر اپنے کمرے میں گئی اور پھر شوبھا بھی اٹھ گئی۔ میں نے باہر آکر سریندر اور راجندر کو ہوشیار رہنے کی ہدایات دیں اور اندر دروازے اور کھڑکیاں بند کر دیں۔ اگرچہ آج کی رات دشمن کی طرف سے کسی کارروائی کی توقع نہیں تھی لیکن احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔

سونیا بھی کمرے میں جا چکی تھی۔ میں بھی اپنے کمرے میں آیا۔ میں تھکن سی محسوس کر رہا تھا۔ جسم کے بعض حصوں میں درد بھی ہو رہا تھا۔ راگنز اور دیش مکھ سے یہ لڑائی اگرچہ پندرہ بیس منٹ تک ہی محدود رہی تھی لیکن اس دھواں دھار لڑائی نے میرا انجر پنجر ڈھیلا کر دیا تھا۔ میری زندگی دشمنوں کے خلاف لڑتے ہوئے گزری تھی لیکن آج کی لڑائی سب سے برق رفتار تھی جس کا فیصلہ چند منٹ ہی میں ہو گیا تھا اور اس دوران میں، میں نے اپنے دو طاقت ور حریفوں کو ایک لمحے کو بھی سنبھلنے کا موقع نہیں دیا تھا۔ اگر میری طرف سے ذرا بھی سستی یا غفلت ہوتی تو شاید اس لڑائی کا نتیجہ مختلف ہوتا۔

بیچ کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور پردہ لٹکا ہوا تھا۔ شوبھا والے کمرے میں بتی جل رہی تھی۔ میں نے اپنے کمرے کی بتی بجھا دی اور بستر پر گر گیا۔ بستر پر لیٹتے ہی میری آنکھیں بند ہو گئیں۔

اور پھر اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ گیا۔ شوبھا میرے پلنگ پر بیٹھی میری ٹانگیں دبا رہی تھی۔

"ارے شوبھا جی۔" میں نے جلدی سے ٹانگیں سمیٹ لیں "یہ آپ کیا کر رہی ہیں؟"

"مجھے اپنے محسن کی سیوا سے محروم نہ کرو۔" شوبھا نے کہا۔ اس کی آواز سرگوشی سے زیادہ نہیں تھی "تم نے میری خاطر اپنا جیون داؤ پر لگا دیا اور کیا مجھے اتنا بھی حق نہیں کہ میں تمہاری ذرا سی سیوا کر سکوں۔ تمہارے پیر دباتے ہوئے مجھے بڑا سکون مل رہا ہے۔ آرام سے لیٹے رہو۔"

"نہیں شوبھا جی۔" میں نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے "مجھے شرمندہ نہ کریں۔ آپ بھی تھکی ہوئی ہیں۔ آپ جا کر سو جائیں۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ مجھے کچھ نہیں ہوا۔"

"تم نیند میں کراہ رہے تھے۔ آواز سن کر ہی تو میں آئی تھی۔" شوبھا نے کہا "ہو سکتا ہے تمہیں لڑائی میں کچھ چوٹیں بھی آئی ہوں لیکن بعض اوقات تھکن کے کارن بھی آدمی نیند میں کراہنے لگتا ہے۔ میں تمہاری ٹانگیں دبانے لگی تھی تاکہ تمہیں کچھ سکون تو ملے لیکن تم اٹھ کر بیٹھ گئے۔"

"میں بالکل ٹھیک ہوں شوبھا جی۔" میں نے جواب دیا۔

"تم نے آج کمال ہی کر دیا وجدان۔" اس نے کہا "میں تو ڈر گئی تھی۔ وہ دو تھے اور تم اکیلے۔ اگر تمہیں کچھ ہو جاتا تو میں اپنے آپ کو کبھی معاف نہ کرتی لیکن تم نے جس طرح ان کی ہڈیوں کی سنکائی کی ہے اس پر مجھے حیرت بھی ہوئی، خوشی بھی۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ تم ان دونوں کو اس طرح ڈھیر کر دو گے۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بولی "سونیا نے مجھے تمہارے بارے میں بہت کچھ بتایا تھا۔ مجھے یقین نہیں آتا تھا۔ آج میں نے اپنی آنکھوں سے سب کچھ

دیکھ لیا ہے۔ مجھے تم پر گھمنڈ ہے۔ اب مجھے کوئی فکر نہیں ہے۔"

شوبھا باتوں کے موڈ میں تھی اور مجھے نیند آرہی تھی۔ میں اس سے کہہ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ اپنے کمرے میں جاکر سوجائے لیکن شاید اسے خود ہی خیال آگیا۔

"دیکھو میں تمہیں کتنا پریشان کررہی ہوں۔ تمہیں نیند سے جگا کر بٹھا دیا۔ اچھا۔ اب تم سوجاؤ۔ میں چلتی ہوں۔" شوبھا نے کہا۔ وہ چند لمحے میری طرف دیکھتی رہی پھر جھک کر اپنے ہونٹ میری پیشانی پر ثبت کردیے۔

میرے پورے بدن میں سنسنی کی ایک لہر سی دوڑ گئی لیکن میرے سینے میں کسی فتنے نے سر نہیں ابھارا تھا نہ ہی کوئی لغو خیال میرے ذہن میں آیا تھا۔ نجانے کیوں مجھے اس وقت تھائی یاد آگئی تھی۔ میرا دل چاہتا تھا کہ شوبھا اسی طرح میرے اوپر جھکی رہے اور اس کے ہونٹوں کا لمس میری پیشانی کو گرماتا رہے۔ عجیب سا سرور تھا اس بوسے میں۔

شوبھا سیدھی ہوگئی۔ اس کے ہونٹوں پر بڑی دل فریب مسکراہٹ تھی۔

"میں چلتی ہوں۔" وہ پلنگ سے اتر گئی "سوجاؤ۔ تمہیں نیند آرہی ہے۔" دروازے کے قریب پہنچ کر اس نے مڑ کر میری طرف دیکھا "شب بہ راتری۔" (شب بخیر) اس نے گنگناتی ہوئی آواز میں کہا اور اپنے کمرے میں چلی گئی۔

میں دروازے کے سامنے ہلتے ہوئے پردے کو دیکھتا رہا اور پھر میری آنکھیں بند ہونے لگیں اور میں سرور و کیف کی عجیب سی کیفیت میں ڈوبتا چلا گیا۔

○☆○

کئی روز گزر گئے۔

اس دوران میں یوگی گوتم بھوش کے کانیج میں میری ریاضت جاری رہی۔ میرے اندر خوابیدہ پراسرار قوت کی بیداری کا ابتدائی مرحلہ شروع ہوچکا تھا اور میں اپنے آپ میں عجیب سی تبدیلی اور کیفیت محسوس کرنے لگا تھا۔ اب مجھے یکسوئی اور مکمل توجہ کی ضرورت تھی اور اس معاملے میں ذرا سی غفلت سے سب کیے کرائے پر پانی پھر سکتا تھا۔

پہلے تو روزانہ رات کو ٹھاکر کا فون آتا رہا پھر اس میں ایک دن کا وقفہ آگیا۔ وہ دیش مکھ کی وجہ سے ہمارے لیے پریشان تھا۔ ٹھاکر دیش مکھ کو مجھ سے زیادہ جانتا تھا۔ وہ اس کی فطرت سے اچھی طرح واقف تھا۔ اسے شبہ تھا کہ دیش مکھ چند روز کہیں دبکا رہے گا اور پھر ہمارے خلاف کوئی کارروائی کرے گا۔ ٹھاکر کو یہ اندیشہ اس لیے بھی تھا کہ دیش مکھ جسے پورا واپس نہیں پہنچا تھا۔

دیش مکھ رشی کیش میں بھی کہیں دکھائی نہیں دیا تھا۔ ہمارا نیپالی گن مین سریندر بڑے کام کا آدمی ثابت ہوا تھا۔ اس نے دو اور آدمیوں کا بندوبست کردیا تھا۔ وہ بھی نیپالی اور اسی کی طرح خرانٹ تھے۔ ان میں سے ایک کو تو اس نے دیش مکھ اور اس کے ساتھی راگھو کی تلاش پر لگا دیا تھا۔ اس نے رشی کیش اور اس کے گرد و نواح میں تمام ہوٹل، گیسٹ ہاؤسز اور مندر دیکھ ڈالے تھے مگر ان کا کوئی سراغ نہیں ملا تھا۔ وہ یا تو کہیں چھپے ہوئے تھے یا شہر چھوڑ کر کہیں اور چلے گئے تھے لیکن مجھے یہ بھی یقین تھا کہ وہ زیادہ دور نہیں گئے ہوں گے اور پلٹ کر ضرور آئیں گے۔

شوبھا کے دل میں اب کسی قسم کا خوف نہیں رہا تھا۔ اب تو وہ سونیا یا بملا کو ساتھ لے کر میرے بغیر سیر و تفریح کے لیے یا کوئی سودا وغیرہ لینے کے لیے بازار کی طرف چلی جاتی تھی۔ اودھن نام کا ایک نیپالی گن مین بہرحال ان کے ساتھ رہتا تھا۔ یہ ان دو میں سے ایک تھا جن کی خدمات سریندر کے ذریعے حاصل کی گئی تھیں۔

اس روز صبح سویرے ہی ٹھاکر کا فون آیا تھا۔ اس نے شوبھا سے بات کرتے ہوئے بتایا تھا کہ اس نے شوبھا کے کالی ہاؤس والی بلڈنگ کی قیمت لگوائی ہے۔ اس نے شوبھا کو وہ قیمت بتا کر اس کی رائے مانگی تھی کہ اگر شوبھا اس قیمت پر بلڈنگ بیچنے کو تیار ہو تو وہ (ٹھاکر) اسے خرید لے گا۔ شوبھا نے بلا جھجک آمادگی کا اظہار کردیا اور کہا کہ وہ کاغذات تیار کرالے۔ اس کے ساتھ ہی مہاویر روڈ والے پلاٹ کی بات بھی ہوئی تھی لیکن ٹھاکر نے بتایا تھا کہ اس کی ابھی مناسب قیمت نہیں لگ رہی۔ ڈیڑھ ایکڑ کے اس پلاٹ کو تو کوئی بلڈر ہی خرید سکتا تھا اور وہ مختلف کمپنیوں سے رابطہ کررہا تھا۔

اسی روز میں، سونیا اور شوبھا کے ساتھ بازار کی طرف نکل گیا۔ بملا گھر پر ہی رہ گئی تھی۔ شوبھا کا خیال تھا کہ مستقل یہاں رہنا ہے تو اب اسے کوئی بنگلا خرید ہی لینا چاہیے اور ہم بنگلے کی تلاش میں پراپرٹی ایجنٹوں کے دفتروں میں بھٹکتے پھر رہے تھے۔

دوپہر کا کھانا ہم نے ایک ریسٹورنٹ میں کھایا۔ بملا کے لیے کھانا پیک کروالیا گیا۔ ہم صبح نو بجے سے گھوم رہے تھے اور اس وقت دوپہر کے ڈھائی بج رہے تھے۔ سونیا اور شوبھا تھک گئی تھیں اس لیے ہم نے واپسی کے لیے ٹیکسی لی۔ ٹیکسی مختلف راستوں پر گھومتی ہوئی نیلم ندی کی طرف آگئی۔ یہ بارونق علاقہ تھا۔ ہماری ٹیکسی نے جیسے ہی

اوور ٹیک کیا، پیچھے سے آنے والی ایک کار تیزی سے اوور ٹیک کرتے ہوئے ہماری ٹیکسی کے آگے آگئی۔ ڈرائیور کو زور سے ٹیکسی روکنا پڑی۔ ایک کار ٹیکسی کے پیچھے بھی رک گئی تھی اور اس سے پہلے کہ میں صورت حال کا کچھ اندازہ لگا سکتا، ٹیکسی کے آگے کھڑی ہوئی کار سے دو آدمی اترے۔ دونوں نے چہروں پر ماسک چڑھا رکھے تھے۔ دونوں کے ہاتھوں میں آٹومیٹک رائفلیں تھیں۔ انہوں نے کار سے اترتے ہی ہوائی فائرنگ شروع کردی۔

میں فوری طور پر نہیں سمجھ سکا کہ یہ سب کیا ہورہا ہے لیکن چونکا تو اس وقت جب اگلی کار سے اترنے والے ایک آدمی نے ٹیکسی کا دروازہ کھول کر شوبھا کو نیچے گھسیٹ لیا۔ شوبھا خوف و دہشت سے چیخنے لگی۔ وہ آدمی اسے گھسیٹتے ہوئے اگلی کار کی طرف لے جارہا تھا۔

مجھے یکایک جیسے ہوش آگیا۔ میں ٹیکسی کی اگلی سیٹ پر تھا۔ دروازہ کھول کر بڑی عجلت میں نیچے اترا اور اس شخص کی طرف لپکا جو شوبھا کو گھسیٹ رہا تھا مگر اس شخص نے پلٹ کر میرے پیٹ پر ٹھوکر ماردی۔ میں بلبلا کر دہرا ہوگیا مگر اپنی تکلیف کی پروا کیے بغیر اٹھ کر دوبارہ اس شخص کی طرف لپکا۔ اس نے شوبھا کا ہاتھ پکڑ لیا اور اسے اپنی طرف کھینچنے لگا۔ اس دوران میں دوسرا آدمی بھی اس طرف پہنچ گیا اور اس نے اپنی رائفل کا بٹ پوری قوت سے میرے کندھے پر مار دیا۔ میرے منہ سے چیخ نکل گئی۔ شوبھا کا ہاتھ بھی میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ میں نے سنبھلنا چاہا مگر اس شخص نے ایک بار پھر اپنی رائفل گھما دی۔ اس مرتبہ رائفل کا بٹ میرے کولھے پر پڑا۔

پہلا آدمی شوبھا کو گھسیٹتے ہوئے اگلی کار تک لے جاچکا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں رائفل تھی اور دوسرے ہاتھ سے اس نے شوبھا کی کلائی تھام رکھی تھی۔ وہ پوری قوت سے کار میں ٹھونسنے کی کوشش کررہا تھا۔ شوبھا بری طرح مزاحمت کررہی تھی۔ اس نے اس شخص کی کلائی دانت سے کاٹ ڈالی۔ وہ شخص چیخ اٹھا۔ اس شخص نے شوبھا کو کھلے ہوئے دروازے میں دھکیل دیا اور خود بھی اندر گھس کر دروازہ بند کرلیا۔

میں اپنے انجام کی پروا کیے بغیر دوسرے آدمی سے لپٹ گیا۔ اس دوران میں پیچھے کی کار سے بھی دو آدمی اتر آئے تھے اور سونیا کو ٹیکسی سے کھینچ کر اپنی کار کی طرف گھسیٹ رہے تھے۔ سونیا بھی چیختے ہوئے مزاحمت کررہی تھی۔ میں اس سے لپٹا ہوا تھا۔ میرا پیر ایک آدمی کے پیر میں الجھا اور میں... میرا منہ کے بل گرا۔ میں سنبھلنے کی کوشش کررہا تھا کہ میری کھوپڑی پر زوردار ٹھوکر پڑی۔ میں سر کو دونوں ہاتھوں میں تھام کر سڑک پر لوٹنے لگا۔ وہ دونوں آدمی میرے جسم پر ٹھوکروں کی بارش کرتے رہے جبکہ ان کا تیسرا ساتھی آٹومیٹک رائفل سے مسلسل ہوائی فائرنگ کررہا تھا۔

"چلو بھاگو۔ اب دیر نہیں کرو۔" فائرنگ کرنے والا چیخا۔ اس کا ایک ساتھی دوڑ کر اگلی کار میں سوار ہوگیا جس میں شوبھا کو ٹھونسا گیا تھا اور دوسرا پچھلی کار کی طرف دوڑا جہاں سے سونیا کے چیخنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

دونوں کاریں حرکت میں آکر تیز رفتاری سے آگے بڑھ گئیں۔ میں اٹھ کر کاروں کے پیچھے دوڑا لیکن ٹھوکر کھا کر گر گیا۔ میں اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے چیخ رہا تھا کہ لوگو! ان بدمعاشوں کو روکو۔ ان دو معصوم عورتوں کو بچاؤ جنہیں وہ اغوا کرکے لے جارہے ہیں۔

وہاں آس پاس سیکڑوں لوگ جمع ہوچکے تھے۔ تقریباً سو گز کے فاصلے پر پولیس اسٹیشن تھا لیکن نہ تو پولیس آئی اور نہ ہی کسی اور نے ان بدمعاشوں کو روکنے کی کوشش کی۔ اپنی جان ہر ایک کو پیاری ہوتی ہے۔ کوئی آگے بڑھنے کی حماقت نہیں کرسکتا تھا۔

میں پاگلوں کی طرح چیختے ہوئے اِدھر اُدھر دوڑتا رہا لیکن کوئی شخص میری مدد کو تیار نہیں تھا۔ میں ٹیکسی کی طرف لپکا لیکن ٹیکسی ڈرائیور بھی دہشت سے بے ہوش ہوچکا تھا۔ میں اسے بازو سے پکڑ کر باہر کھینچنے لگا لیکن اسی لمحے میرے سر میں ایک زوردار ٹیس اٹھی اور میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ میں سنبھلنے کی کوشش کرتا رہا لیکن تاریکی کی چادر پھیلتی چلی گئی اور پھر میرا ذہن تاریکی میں ڈوبتا چلا گیا۔

ہوش میں آنے کے بعد میں کچھ دیر تک دھندلائی ہوئی نظروں سے اپنے چاروں طرف دیکھتا رہا۔ پہلے تو مجھے یہ جگہ اجنبی سی لگی لیکن اپنے اطراف میں بیڈ پر لیٹے ہوئے مریضوں کو دیکھ کر مجھے اندازہ ہوگیا کہ میں اسپتال میں ہوں لیکن مجھے یہ احساس نہیں ہوسکا کہ میں اسپتال میں کیوں ہوں؟ ذہن پر زور ڈالنے سے دماغ میں دھماکے سے ہونے لگے پھر یکایک مجھے یاد آگیا کہ میرے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا تھا۔ شوبھا اور سونیا کو دن دہاڑے اغوا کرلیا گیا تھا اور میں انہیں بچانے میں کامیاب نہیں ہوسکا تھا۔

ان دونوں کا خیال آتے ہی میں ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس کے ساتھ ہی میرے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ چیخ کی آواز سن کر ایک نرس اور اس کے ساتھ بملا دوڑتے ہوئے میرے قریب پہنچ گئیں۔ بملا نجانے کب سے وارڈ کے آخر میں نرس کے پاس بیٹھی ہوئی تھی۔ میں بیڈ سے اترنے کی کوشش کررہا تھا کہ وہ دونوں مجھے پکڑ کر دوبارہ لٹانے

کی کوشش کرنے لگیں۔

"ارے ارے۔ کہاں جارہے ہو۔ لیٹے رہو۔ تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔" بلا نے میرا بازو پکڑتے ہوئے کہا۔

"نہیں بلا۔" میں نے اپنا بازو چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "میں یہاں لیٹ کر آرام نہیں کرسکتا۔ وہ لوگ شوبھا اور سونیا کو اٹھا کرلے گئے ہیں۔"

"میں جانتی ہوں۔" بلا بولی "تم دو گھنٹوں بعد ہوش میں آئے ہو۔ وہ لوگ پتا نہیں اب تک کتنی دور جاچکے ہوں گے اور پھر تم زخمی ہو۔ دیکھو، تمہارے پورے جسم پر نیل پڑے ہوئے ہیں۔"

"مجھے کوئی تکلیف نہیں۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔" میں بیڈ سے اتر آیا "آؤ۔ میرے ساتھ چلو بلا۔ ہم وقت ضائع نہیں کرسکتے۔"

اس دوران میں ایک ڈاکٹر بھی وارڈ میں آگیا۔ اس نے بھی مجھے روکنے کی کوشش کی مگر میں اسے ایک طرف دھکیلتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔

یہ چھوٹا سا اسپتال ہمارے بنگلے سے زیادہ دور نہیں تھا۔ ہم پیدل ہی وہاں تک چل کر آئے تھے۔ میرے پیروں میں جوتے بھی نہیں تھے۔ جسم کے ہر حصے میں ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ سر میں دھماکے سے ہو رہے تھے۔ اگر بلا مجھے سہارا نہ دیے ہوئے ہوتی تو میں راستے میں کئی بار گرتا اور یہاں تک پہنچنا مشکل ہوجاتا۔

گھر پہنچتے ہی میں نے سب سے پہلے اسٹیٹ ڈیلر کو ٹیلی فون کیا۔ روشن نامی اس شخص سے میری اچھی خاصی دوستی ہوچکی تھی۔ وہ پراپرٹی کے علاوہ کاروں کی خرید و فروخت اور کرائے پر دینے کا کاروبار بھی کرتا تھا۔

"ہیلو روشن۔" میں نے ریسیور پر اس کی آواز سنتے ہی کہا "مجھے ایک گاڑی چاہیے۔ بہترین حالت میں ہو اور لمبے سفر کے لیے کارآمد ہو۔ ہاں ہاں۔ میں ٹھیک ہوں اور سنو۔ کار کی ٹینکی فل ہو۔ ٹھیک ہے۔ میں انتظار کررہا ہوں۔ تم اس کی پروا مت کرو۔ اگر کار واپس نہ آئی تو میرے دوست ٹھاکر بھانو سنگھ سے تمہیں اس کی پوری قیمت مل جائے گی۔ ٹھیک ہے۔ میں انتظار کررہا ہوں۔"

میں نے فون بند کردیا اور باتھ روم میں گھس کر آئینے میں اپنا جائزہ لینے لگا۔ میرا حلیہ اس قدر بگڑا ہوا تھا کہ مجھے اپنے آپ کو پہچاننے میں بھی دشواری پیش آرہی تھی۔ بائیں آنکھ کے نیچے سیاہ دھبا تھا۔ دایاں جبڑا بھی سوجا ہوا تھا۔ کندھے پر دونوں طرف شدید ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ کولھے میں بھی تکلیف تھی اور سر پر بھی گومڑ بنا ہوا تھا۔ ان ظالموں نے بری طرح میری دھنائی کی تھی۔

میں نے منہ ہاتھ دھو کر سوجے ہوئے جبڑے اور رخسار پر لوشن لگالیا اور کپڑے بدل کر باہر آیا تو بلا چائے بنا چکی تھی اور اس وقت میں واقعی چائے کی طلب بڑی شدت سے محسوس کررہا تھا۔

چائے کا کپ لیتے ہوئے میں نے بلا کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ لگتا تھا وہ دیر تک روتی رہی ہو اور مجھے حیرت تھی کہ وہ اس وقت اپنے آپ پر کیسے قابو پائے ہوئے تھی۔ وہ میرے سامنے بیٹھی خاموشی سے مجھے دیکھتی رہی۔ میں چائے ختم کرکے اپنے کمرے میں آیا اور تھیلے میں اپنے کپڑے ٹھونسنے لگا۔

"یہ بھی اسی میں ڈال لو۔" بلا کی آواز سن کر میں پیچھے مڑا۔ وہ بھی غالباً میرے پیچھے ہی کمرے میں چلی آئی تھی۔ اس نے اپنے کپڑوں کے دو جوڑے میری طرف اچھال دیے۔ میں سیدھا ہو کر کھڑا ہوگیا۔

"بلا!" میں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا "ان کی تلاش میں نجانے مجھے کہاں کہاں ٹھوکریں کھانی پڑیں گی۔ کن حالات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ میں تمہیں ساتھ نہیں لے جاسکتا۔ تم آج کی رات یہاں گزار کر صبح جے پور چلی جاؤ۔ مجھے کہیں موقع ملا تو میں فون پر ٹھاکر سے بات کرلوں گا۔"

"تم میرے بغیر جاسکو گے؟" بلا نے کہا "نہیں ہت سنگھ۔ میں تمہیں اکیلے نہیں جانے دوں گی۔ بالکل نہیں۔"

"میرا کوئی راستہ نہیں ہے۔ کوئی منزل نہیں ہے۔" میں نے کہا "میں تو ہمیشہ ہی سے خطرات میں گھرا ہوا ہوں۔ ان طاغوتی قوتوں سے لڑتے ہوئے عرصہ گزر گیا۔ حیرت تو اس بات پر ہے کہ میں اب تک زندہ کیسے ہوں۔ اب میں جس سفر پر نکل رہا ہوں وہ پہلے سے کہیں زیادہ کٹھن اور خطرناک ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ تم بھی۔۔۔"

"نہیں ہت سنگھ۔" وہ والہانہ انداز میں مجھ سے لپٹ گئی "تم ہمیشہ دوسروں کے لیے لڑتے رہے ہو۔ دوسروں کے لیے اپنے جیون کو خطرے میں ڈالے رکھا اور اب بھی تم موت کے اندھے کنوئیں میں چھلانگ لگانے جارہے ہو۔ کس کے لیے؟ دوسروں کے لیے نا؟ تو کیا کسی دوسرے کو یہ حق نہیں کہ وہ چند قدم تک تمہارا ساتھ دے سکے۔ نہیں۔ میں تمہیں اکیلے نہیں جانے دوں گی۔"

میں نے اسے بانہوں سے پکڑ کر اپنے سے الگ کیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ میں اسے سمجھانے کی کوشش کرتا رہا لیکن وہ میرے ساتھ جانے پر بضد رہی۔

"تم مجھے کمزور مت سمجھو۔" وہ کہہ رہی تھی "جانکی نے قدم قدم پر تمہارا ساتھ دیا اور بالآخر اپنا جیون تمہارے لیے جھونک دیا۔ سونیا کب سے تمہارے ساتھ ہے۔ اس نے تمہارے لیے کیا کیا مصیبتیں نہیں اٹھائی ہوں گی لیکن میں نے اس کے چہرے پر کبھی بھی گھبراہٹ نہیں دیکھی۔ شوبھا بھی تمہیں بہت پسند کرنے لگی تھی۔ اس نے بھی فیصلہ کرلیا تھا کہ تمہیں کہیں نہیں جانے دے گی اور میں۔۔۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بولی "کیا تم مجھے ان سے کمزور سمجھتے ہو۔ یقین کرو میں تمہارے پیروں کی زنجیر نہیں بنوں گی۔ اس وقت تمہیں میری ضرورت ہے اور میں تمہیں اکیلے نہیں جانے دوں گی اور میں وعدہ کرتی ہوں کہ جب میں یہ سمجھوں گی کہ تم پر بوجھ بن رہی ہوں یا تمہارے راستے کی رکاوٹ بن رہی ہوں تو میں خاموشی سے اپنا راستہ بدل لوں گی اور تمہیں اکیلا چھوڑ دوں گی۔"

میرے منہ سے گہرا سانس نکل گیا۔ میں نے کچھ کہنے کے بجائے اس کے کپڑے بھی تھیلے میں ٹھونس لیے۔ بلا کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی اور وہ ایک بار پھر مجھ سے لپٹ گئی۔ میں نے اسے اپنے آپ سے الگ کیا اور تھیلا بلا کے حوالے کردیا کہ وہ اس میں ضرورت کی اور چیزیں ڈال لے۔ میں اس کمرے سے نکل کر لاؤنج میں آگیا۔ اس وقت میری حالت ایسی تھی کہ مجھے واقعی آرام اور علاج کی ضرورت تھی۔ میرے پورے بدن میں ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ بات کرنے کے لیے منہ بھی پوری طرح نہیں کھل رہا تھا لیکن میں جو کچھ بھی کررہا تھا، اپنی قوت ارادی کے بل بوتے پر کررہا تھا۔

میں نے کرسی پر بیٹھ کر فون کا ریسیور اٹھالیا اور جے پور میں ٹھاکر کا نمبر ملانے لگا۔ لائن ملنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ گھنٹی بجنے کے بعد ہی ریسیور کی تھی۔ میں نے ایک دو رسمی جملوں کے تبادلے کے بعد ٹھاکر کو صورت حال سے آگاہ کردیا۔

"اوہ!" ٹھاکر بولا "اس کے ساتھ اور کون لوگ تھے؟"

"وہ خود نہیں تھا۔" میں نے جواب دیا "میرا خیال ہے اس نے یہ کام کرائے کے غنڈوں سے کروایا ہے جنہوں نے چہروں پر نقاب چڑھا رکھے تھے۔ رشی کیش میں تو ایسا کوئی دل والا غنڈا نہیں جو اتنی سنگین واردات کا ارتکاب کرسکے۔ میرے خیال میں اس نے ہردوار یا دہرادون سے ان غنڈوں کی خدمات حاصل کی ہوں گی اور ہوسکتا ہے اس وقت وہ خود ہردوار یا دہرادون میں بیٹھا رہا ہو۔ بہرحال، میں ان کے پیچھے جارہا ہوں۔" اس موقع پر ٹھاکر نے کچھ کہنا چاہا تھا مگر میں نے اسے بولنے کا موقع نہیں دیا "تم کچھ مت بولو ٹھاکر، میں تمہاری کوئی بات نہیں مانوں گا۔ البتہ تمہیں میرے جانے کے بعد یہاں آکر ایک دو کام کرنے ہوں گے۔" میں نے کہا اور پھر اسے سمجھانے لگا کہ اسے کیا کرنا ہے۔ میں نے اسے یہ بھی بتادیا کہ بلا میرے ساتھ جارہی ہے۔

میں ابھی فون پر باتیں کررہا تھا کہ پراپرٹی ایجنٹ روشن لال پہنچ گیا۔ میں نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور پھر فون پر ٹھاکر کو اس کے بارے میں بتانے لگا اور پھر میں نے فون بند کردیا۔

میرے ساتھ پیش آنے والے واقعے کی خبر اس وقت پورے شہر میں پھیل گئی تھی۔ روشن لال نے اس موقع پر تاسف کا اظہار کیا۔

"گاڑی لے آئے؟" میں نے موضوع بدل کر سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"ہاں۔" اس نے جواب دیا "گاڑی دیکھنے میں اگرچہ پرانی لگتی ہے لیکن اس کا انجن بہترین حالت میں ہے۔ پہاڑی راستوں پر بھی بالکل پریشان نہیں کرے گی۔ ٹینکی فل کروا دی ہے۔ اس کے علاوہ ڈکی میں پیٹرول سے بھرے ہوئے پانچ پانچ گیلن والے تین کین بھی رکھوا دیے ہیں۔ پانی کا مشکیزہ اور کچھ کھانے پینے کی اشیا بھی پچھلی سیٹ پر رکھوا دی ہیں۔ تمہیں راستے میں ان چیزوں کی ضرورت پڑے گی۔"

"شکریہ روشن لال۔" میں نے کہا "میں نے جے پور میں اپنے دوست سے کہہ دیا ہے۔ وہ چند روز میں یہاں آئے گا۔ اگر ایک ہفتے تک میں واپس نہ آیا تو وہ اس بنگلے، کار اور تمہاری گاڑی کا حساب کردے گا۔ احتیاطاً تم بھی اس کا فون نمبر لکھ لو۔" میں نے اسے ٹھاکر کا فون نمبر لکھوا دیا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولا "میں نے ان میں سے ایک کار کا نمبر دیکھا تھا۔ اس کے ساتھ ڈی این کے حروف لکھے ہوئے تھے۔ کیا تم بتاسکتے ہو یہ سیریل نمبر کہاں کا ہے؟"

"یہ تو دہرادون کا نمبر ہے۔" اس نے کہا۔

"میرا بھی یہی خیال تھا۔" میں نے کہا اور اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔

"مگر قصہ کیا تھا۔ کون لوگ تھے وہ؟" روشن نے پوچھا۔ وہ بھی اٹھ کر کھڑا ہوگیا تھا۔

"لمبی کہانی ہے۔" میں نے گہرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا "زندہ رہا اور واپس آگیا تو ضرور بتاؤں گا۔ ویسے کیا تم بتاسکتے ہو کہ وہ لوگ کس طرف گئے ہوں گے؟"

"سننے میں تو یہی آیا تھا کہ وہ لوگ ہردوار کی طرف فرار ہوئے تھے۔ لوگوں نے پولیس تھانے کا گھیراؤ کرلیا تھا کہ ان کا پیچھا کیا جائے لیکن پولیس نے کوئی کارروائی نہیں کی۔"

"پولیس ایسے موقعوں پر کوئی کارروائی نہیں کرتی اور ایسی سنگین وارداتیں پولیس کے تعاون کے بغیر کی بھی نہیں جاسکتیں۔" میں نے کہا۔

"عام لوگوں کا بھی یہی خیال ہے کہ یہ کارروائی کرنے سے پہلے پولیس کو گھوس (رشوت) کھلا دیا گیا تھا تاکہ وہ مداخلت نہ کرے۔" روشن لال نے کہا "اور ویسے بھی یہاں کے تھانے کا انچارج بہت حرامی آدمی ہے۔"

"شکریہ روشن لال جی۔" میں نے کہا "اس بنگلے کی چابی میں آپ کو دے کر جارہا ہوں۔ ٹھاکر بھانو سنگھ آجائے تو اس سے سارا حساب کرلیجئے۔"

"آپ ان کے پیچھے جارہے ہیں؟" روشن کے لہجے میں حیرت تھی "آپ کی اپنی حالت اچھی نہیں ہے۔ ویسے بھی شام کا اندھیرا چھا رہا ہے۔ رات کے وقت ان خطرناک پہاڑی راستوں پر سفر کرنا خودکشی کے مترادف ہے۔"

"پہلے ہی بہت وقت ضائع ہوچکا ہے۔" میں نے کہا "اس سے پہلے کہ میرے اور ان کے درمیان وقت کی خلیج مزید وسیع ہو جائے' میں ان تک پہنچ جانا چاہتا ہوں۔"

میں نے بہلا کو اشارہ کیا۔ وہ تھیلا اٹھا کر باہر نکل گئی۔ میں نے بتیاں بجھا کر دروازہ بند کردیا اور چابی روشن کے حوالے کردی۔ گیٹ پر نیپالی محافظ موجود تھے۔

"آپ ان سب کا حساب کردیجئے روشن لال جی اور اگر مناسب سمجھیں تو ایک آدمی کی ڈیوٹی یہاں لگائے رکھیں۔ گھر کی حفاظت ہوتی رہے گی۔" میں نے کہا۔

"میں سارا انتظام کرلوں گا۔ آپ چنتا نہ کریں۔" روشن لال نے کہا۔

گاڑی گیٹ کے سامنے موجود تھی۔ چابی اگنیشن میں لگی ہوئی تھی۔ روشن لال نے بتادیا کہ گاڑی کے کاغذات بھی ڈیش بورڈ میں رکھے ہوئے ہیں۔

بہلا نے تھیلا پچھلی سیٹ پر ڈال دیا اور آگے پسنجرز سیٹ پر بیٹھ گئی۔ میں نے روشن لال سے ہاتھ ملایا اور ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ چابی گھماتے ہی انجن اسٹارٹ ہوگیا۔ اس کی ہموار آواز سے بھی اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ انجن واقعی بہترین حالت میں تھا۔ میں نے روشن لال کی طرف دیکھ کر ہاتھ ہلایا اور گاڑی آگے بڑھادی۔

شہر کی حدود سے نکلتے ہی میں نے رفتار بڑھا دی۔ پہاڑیوں میں بل کھاتے ہوئے دوسرے ہی موڑ پر سامنے سے آنے والی بس کو دیکھ کر میں نے رفتار کم کرکے کار کو بالکل سائیڈ پر لے لیا۔ یہ ہردوار کی طرف سے آنے والی آخری بس تھی جو سات بجے رشی کیش کے اڈے پر پہنچ جاتی۔ شام کا اندھیرا پھیلنے کے بعد ان پہاڑی راستوں پر سفر کرنا نہایت خطرناک تھا اسی لیے شام کے بعد اس سڑک پر ٹریفک بالکل نہیں ہوتا تھا۔ ہماری طرح کسی مجبوری کے تحت سفر کرنا اور بات تھی۔

اندھیرا گہرا ہوگیا تھا۔ میں نے ہیڈ لائٹس جلالی تھیں۔ اندھیرے میں چکراتی ہوئی ہیڈ لیمپس کی روشنی ہزار اسرار تاثر دے رہی تھی۔ میں بہت محتاط ہو کر ڈرائیو کررہا تھا۔ بہلا اپنی سیٹ پر سکڑی ہوئی سی بیٹھی تھی۔ اس کے چہرے پر خوف کے ہلکے سے تاثرات تھے۔

ہم ساڑھے آٹھ بجے کے قریب ہردوار شہر کے نواح میں پہنچ گئے۔ لب سڑک چونگی ناکے پر مجھے کار روک لینی پڑی۔ سڑک پر بیریئر لگا ہوا تھا۔ کار رکتے ہی سڑک کے کنارے پر بنی ہوئی کوٹھری سے ایک آدمی نکل کر سامنے آگیا۔ میں نے کار کے اندر کی بتی جلادی۔ اس نے قریب آکر پہلے ہمیں پھر کار کی پچھلی سیٹ پر دیکھا اور آگے جاکر سڑک پر تنی ہوئی لوہے کی زنجیر گرادی۔ میں نے کار آگے بڑھادی اور پھر اچانک ہی ایک اور خیال کے تحت اس شخص کے قریب پہنچ کر میں نے کار روک لی۔ رشی کیش سے ہردوار کی طرف آنے والا یہی ایک واحد راستہ تھا اور چونگی کے بیریئر کی وجہ سے ہر گاڑی کو یہاں رکنا پڑتا تھا۔ یہ شخص اگر شام سے پہلے بھی یہاں ڈیوٹی پر تھا تو اس نے ان لوگوں کو یہاں سے گزرتے ہوئے ضرور دیکھا ہوگا۔

"سنو۔" میں نے اس شخص کو مخاطب کیا "تم کتنے بجے سے یہاں ڈیوٹی پر ہو؟"

"میں تو چوبیس گھنٹے یہاں ڈیوٹی پر رہتا ہوں سرکار۔" اس نے جواب دیا۔

"سہ پہر تین بجے کے بعد رشی کیش کی طرف سے دو کاریں اس طرف آئی تھیں' ان میں دو آدمیوں کے ساتھ دو عورتیں بھی تھیں۔ ایک کار کا نمبر میں تمہیں بتا سکتا ہوں۔ کیا تم....."

"مجھے کسی کار کا نمبر تو یاد نہیں ہے سرکار مگر ان عورتوں کو میں نے دیکھا تھا۔" اس نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا "مجھے اس لیے یاد ہے کہ ان میں سے ایک کار میں رادھن بیٹھا ہوا تھا اور اس نے بتایا تھا کہ دونوں عورتیں بیمار ہیں اور انہیں اسپتال لے جارہے ہیں۔"

"اوہ!" میرے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی۔ اس نے ایک آدمی کا نام لیا تھا جس کا مطلب تھا کہ وہ اسے جانتا تھا

"رادھن کون ہے۔ کہاں رہتا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"رادھن کو تو سارا شہر جانتا ہے سرکار۔ وہ ادھر کا راجہ ہے۔" اس شخص نے جواب دیا "وہ سرائے داروں اور گیسٹ ہاؤس والوں سے بھتا لیتا ہے۔ اس کی منظوری کے بغیر کوئی یہاں دھندا نہیں کرسکتا۔"

میں نے سونیا اور شوبھا کے حلیے بتا کر پوچھا تو اس نے تصدیق کردی کہ ان کاروں میں یہی دو عورتیں تھیں جو بے ہوش پڑی ہوئی تھیں۔ میرے دماغ میں دھماکے سے ہونے لگے۔ ان دونوں کو یقیناً بے ہوش کرکے رکھا گیا ہوگا۔ میں نے بہلا کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر بھی سنسنی کے تاثرات ابھر آئے تھے۔ میں نے چونگی محرر کا شکریہ ادا کیا اور گاڑی آگے بڑھادی۔

اچھا ہی ہوا کہ میں نے چونگی محرر سے پوچھ لیا تھا۔ اس طرح ہماری بہت بڑی مشکل آسان ہوگئی تھی۔ کم از کم ایک سراغ تو مل گیا تھا۔ چونگی محرر کے کہنے کے مطابق رادھن یہاں کا مشہور بدمعاش تھا۔ اس جیسے شخص کا ٹھکانا معلوم کرنا زیادہ مشکل نہیں ہوتا۔ اگر وہ نہ بھی ملا تو اس کے کسی گرگے سے یہ تو معلوم ہوجائے گا کہ وہ کہاں ہے۔ رادھن قابو آجائے تو اس سے دیش بکھ کا پتا معلوم کیا جاسکتا تھا۔

بازاروں میں رونق تھی۔ میں نے کار ایک گلی میں موڑ کے ایسی جگہ پر کھڑی کردی جہاں کسی قدر اندھیرا تھا اور زیادہ لوگوں کی آمدورفت بھی نہیں تھی۔ سامنے بازار تھا۔ اس طرف البتہ خاصی رونق تھی۔

"ہم نے دوپہر کو ہوٹل میں کھانا کھایا تھا اور تمہارے لیے کھانا لے کر آرہے تھے کہ راستے میں یہ سانحہ پیش آگیا۔" میں نے بہلا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "تم نے دوپہر کو بھی کھانا نہیں کھایا تھا اور اب نو بج رہے ہیں۔ تم یہیں کار میں بیٹھی رہو۔ میں کچھ کھانے کو لے کر آتا ہوں۔"

"من نہیں چاہ رہا۔ ویسے کھانے پینے کا سامان تو پیچھے بھی رکھا ہوا ہے۔" بہلا نے کہا۔

"اوہ! اسے تو میں بھول ہی گیا تھا۔" میں نے کہا اور سیٹ کے اوپر سے جھک کر پچھلی سیٹ پر پڑی ہوئی پوٹلی اٹھالی۔

پلاسٹک کا ڈھکنے والا باؤل تھا جس میں پوری مرغی بوٹ کی ہوئی رکھی تھی۔ اس کے ساتھ چار پانچ تنوری نان تھے۔ پچھلی سیٹ پر ایک تکلوں والی ٹوکری بھی رکھی ہوئی تھی۔ اس میں پھل وغیرہ رکھے ہوئے تھے۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ روشن لال نے روسٹڈ چکن اور نان کسی ہوٹل سے خرید کر پیک کروائے تھے۔

ہم کار ہی میں بیٹھے کھانا کھاتے رہے۔ جبڑے اور رخسار کی ہڈی پر سوجن کی وجہ سے مجھے نوالہ چبانے میں خاصی تکلیف ہورہی تھی لیکن پیٹ میں کچھ نہ کچھ ایندھن ڈالنا ضروری تھا۔ تقریباً ڈیڑھ گھنٹا ڈرائیونگ سیٹ پر سیدھا بیٹھے رہنے سے میری کمر تختے کی طرح اکڑ گئی تھی اور پورا جسم دکھ رہا تھا لیکن میں نے بھی قسم کھائی تھی کہ اس وقت تک آرام نہیں کروں گا جب تک سونیا اور شوبھا کو چھڑا کر دیش مکھ کا کھڑا نہ بگاڑ دوں۔

کھانے کے بعد میں قریبی ہوٹل سے چائے لے آیا۔ چائے پینے کے بعد ہی حواس کچھ بحال ہوئے تھے۔

ہردوار میرے لیے اجنبی نہیں تھا۔ میں کئی روز یہاں رہ چکا تھا۔ تقریباً تمام راستے میرے دیکھے بھالے تھے۔ میں کار اسٹارٹ کرکے پچھلی سڑک پر لے آیا۔ یہاں ٹریفک بہت کم تھا اور میں نے کار کی رفتار کم ہی رکھی تھی۔

میں شہر کی مختلف سڑکوں پر گھومتے ہوئے اس طرف نکل آیا جہاں ذرا آگے بہلا اور ٹھاکر وغیرہ کے ساتھ کانیج میں ٹھہرا تھا۔

"اس طرف ایک گیسٹ ہاؤس ہے۔" بہلا نے ایک ذیلی سڑک کی طرف اشارہ کیا۔ وہ شاید سمجھ گئی تھی کہ مجھے کس چیز کی تلاش ہے۔

میں نے کار اسی سڑک پر گھما دی اور تقریباً دو سو گز آگے جاکر نارائن گیسٹ ہاؤس کے سامنے کار روک لی۔ خاصا بڑا گیسٹ ہاؤس تھا۔ گیٹ پر اور اندر لان میں رنگ برنگی روشنیاں جگمگا رہی تھیں۔ میں بہلا کو کار میں بیٹھے رہنے کا اشارہ کرکے نیچے اتر آیا اور نپے تلے قدم اٹھاتے ہوئے گیٹ میں داخل ہوگیا۔

لان ایک بارونق اوپن ائیر ریسٹورنٹ کا منظر پیش کررہا تھا۔ میں بجری والی روش پر چلتے ہوئے عمارت میں داخل ہوگیا۔ برآمدے سے اندر داخل ہوتے ہی کشادہ راہداری تھی جہاں استقبالیہ کاؤنٹر بنا ہوا تھا۔ اس سے آگے ہال تھا اور اس ہال میں بھی خاصی رونق نظر آرہی تھی۔

کاؤنٹر کے پیچھے ایک ادھیڑ عمر عورت بیٹھی ہوئی تھی۔ نقش و نگار بتا رہے تھے کہ وہ جوانی میں بڑی حسین رہی ہوگی۔ میں کاؤنٹر کے سامنے رک گیا۔ اس عورت نے میری طرف دیکھا۔ ہونٹوں پر کاروباری مسکراہٹ آگئی لیکن میرا حلیہ دیکھ کر وہ چونکے بغیر نہیں رہ سکی تھی۔

"سوری سر۔" وہ بولی "اگر آپ کو کمرے کی ضرورت ہے تو میں آپ کی کوئی خدمت نہیں کرسکوں گی۔ البتہ کل ایک کمرا خالی ہونے والا ہے۔ اگر آپ....."

"مجھے کمرا نہیں چاہیے۔" میں نے اس کی بات پوری ہونے نہیں دی "مجھے ایک آدمی کی تلاش ہے اور میں جانتا

ہوں کہ تم اس کے بارے میں بات سکتی ہو۔"

"کون؟" اس نے الجھی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھا "کس کو پوچھ رہے ہو؟"

"رادھن!" میں نے کہا۔

یہ نام سنتے ہی اس کا چہرہ دھواں ہوگیا۔ وہ ایک بار پھر مجھے گھور کر دیکھنے لگی۔

"سوری سر۔ میں اس نام کے کسی آدمی کو نہیں جانتی۔" وہ اپنی کیفیت پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔

"دیکھو میڈم!" میں نے اس کے چہرے پر نظریں جما دیں "میں نے کہا تھا کہ تم اسے جانتی ہو۔ وہ تم سے بھتا وصول کرتا ہے۔ اگر تم مجھے اس کے بارے میں بتا دو تو میں خاموشی سے یہاں سے چلا جاؤں گا۔ دوسری صورت میں تمہارا یہ خوب صورت گیسٹ ہاؤس صبح تک کھنڈر بن جائے گا۔"

اس کا چہرہ ایک بار پھر دھواں ہوگیا۔

"تم اس کو کیوں پوچھ رہے ہو۔ کیوں ملنا چاہتے ہو اس سے؟" اس نے پوچھا۔

"میرا یہ چہرہ دیکھ رہی ہو۔" میں نے انگلی سے اشارہ کیا "میرے جسم پر اور بھی ایسے بہت سے نشان ہیں اور میں رادھن سے ان کا حساب چکانا چاہتا ہوں۔"

"لگتا ہے تم پہلے ہی اس سے بہت نقصان اٹھا چکے ہو۔" وہ بولی "رادھن بہت خطرناک آدمی ہے۔ اس کا تجربہ تمہیں ہو چکا ہے۔ بہتر ہے مزید پنگا مت لو اور جہاں سے آئے ہو، خاموشی سے واپس چلے جاؤ۔"

"میں واپس جانے کے لیے نہیں آیا۔" میں نے کہا "اس کا پتا بتا رہی ہو یا نہ۔۔۔"

"ایک منٹ!" اس نے ہاتھ اٹھا دیا۔ چند لمحے محتاط نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھتی رہی پھر رازدارانہ لہجے میں بولی "میں تمہیں اس کا پتا بتا دوں گی لیکن۔۔۔"

"اطمینان رکھو۔ تمہارا نام نہیں آئے گا۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی۔

"پاروتی آشرم۔۔۔" وہ ایک بار پھر محتاط نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگی "اس نے ایک سال سے پاروتی آشرم پر قبضہ جما رکھا ہے۔ وہ وہیں رہتا ہے۔"

"اور یہ پاروتی آشرم کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"گاندھی مارگ کے آخر میں درختوں میں گھرا ہوا ایک مکان ہے۔ تین چار کمروں کا ہوگا۔" اس نے بتایا "چند سال پہلے یہ مکان ایک دولت مند آدمی نے خرید کر اپنی سوئرگ باشی پتنی کے نام پر آشرم بنا دیا تھا لیکن ایک سال پہلے نجانے کس طرح رادھن نے اس پر قبضہ کرلیا۔ وہ آشرم اس کے تصرف میں ہے۔ ایک دو گرگے اس کے ساتھ رہتے ہیں۔"

"شکریہ شریمتی جی۔" میں نے کہا "لیکن اگر تم نے اسے میرے بارے میں اطلاع دینے کی کوشش کی تو۔۔۔"

"نہیں نہیں۔ میں کسی سے کچھ نہیں بولوں گی۔" وہ جلدی سے بولی "ویسے تم مجھے شکل و صورت اور گفتگو سے شریف آدمی لگتے ہو۔ بہتر ہے اس جیسے حرامی آدمی سے پیچھا چھڑانے کے بجائے واپس چلے جاؤ۔"

"شکریہ۔" میں نے ایک بار پھر اس کا شکریہ ادا کیا اور باہر نکل آیا۔

مجھے یقین تھا کہ گیسٹ ہاؤس کی مالک یہ عورت رادھن کو میرے بارے میں اطلاع نہیں دے گی۔ غنڈوں سے ہر کوئی پریشان رہتا ہے۔ ہر شخص ان سے دور ہی رہنا پسند کرتا ہے۔

ہلا کار میں بیٹھی بے چینی سے پہلو بدل رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر اس کے چہرے پر طمانیت سی آگئی۔ میں نے اسٹیئرنگ کے سامنے بیٹھ کر انجن اسٹارٹ کرکے گاڑی آگے بڑھا دی۔

"کچھ معلوم ہوا؟" ہلا نے میری طرف دیکھے بغیر پوچھا۔

"رادھن گاندھی مارگ کے ایک آشرم میں رہتا ہے۔" میں نے جواب دیا اور پھر اسے اس عورت سے حاصل ہونے والی معلومات سے آگاہ کرنے لگا۔

گاندھی مارگ کا علاقہ میرا دیکھا ہوا تھا۔ میں چترا پرنم کے ساتھ کئی مرتبہ اس طرف آچکا تھا۔ وہیں سے ایک راستہ گنگوتری کی طرف بھی جاتا تھا۔

اس وقت رات کے دس بج رہے تھے۔ یہ علاقہ گنجان آبادی سے ہٹ کر تھا اور یہاں زیادہ لوگوں کی آمد و رفت بھی نہیں تھی۔ پاروتی آشرم تلاش کرنے میں مجھے زیادہ دشواری پیش نہیں آئی۔ درختوں میں گھرا ہوا یہ مکان بھی آبادی سے کافی ہٹ کر تھا۔

میں نے کار کو مکان سے دور درختوں کے نیچے روک کر انجن بند کرکے بتیاں بھی بجھا دیں۔ ہلا بھی میرے ساتھ جانے کو تیار تھی لیکن میں نے اسے وہیں روک دیا اور تھیلے میں سے دیش مکھ والا پستول نکال کر اس کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے بولا۔

"اگر میں پندرہ بیس منٹ تک مکان سے باہر نہ آؤں یا تم کوئی گڑبڑ محسوس کرو تو اندر آجانا اور کوئی بھی مزاحمت کی کوشش کرے تو بے دریغ گولی مار دینا۔"

میں کار سے اتر کر درختوں کے جھنڈ کی طرف بڑھ گیا جہاں اس مکان کی بعض کھڑکیوں سے مدھم سی روشنی جھلکتی

نظر آرہی تھی۔ یہ مکان دو منزلہ تھا اور اوپر کی ایک دو کھڑکیوں میں بھی روشنی دکھائی دے رہی تھی۔

مکان کا گیٹ خاصا بڑا تھا۔ اس کے پہلو میں ایک چھوٹا دروازہ بھی تھا۔ گیٹ اور دروازہ دونوں بند تھے۔ میں نے جھری میں سے جھانک کر دیکھا۔ صحن میں تاریکی تھی لیکن کہیں کہیں کسی جگہ ہلکی سی روشنی جھلک رہی تھی۔

میں گیٹ پر چڑھ کر اندر داخل ہونے کے بارے میں سوچتا ہی رہا تھا کہ صحن میں قدموں کی چاپ سنائی دی۔ میں آڑ میں کھڑا ہوگیا۔ وہ آواز چھوٹے دروازے کے قریب آکر رک گئی اور پھر اندر سے دروازے کا آہنی بولٹ ہٹائے جانے کی آواز سنائی دی۔ چند سیکنڈ بعد دروازہ کھلا اور ایک آدمی باہر نکلا۔

میں اس آدمی پر جھپٹ پڑا۔ میرا ایک ہاتھ اس کے منہ پر تھا اور دوسرے ہاتھ سے میں اسے گرفت میں لینے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ تڑپ کر میری گرفت سے نکل گیا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی تھی۔ وہ ایک دم گڑبڑا گیا تھا لیکن فوراً ہی سنبھل گیا مگر اس سے پہلے کہ وہ اپنے دفاع میں یا میرے خلاف کوئی کارروائی کرتا یا منہ سے کوئی آواز نکالتا، میں عقاب کی طرح اس پر جھپٹا اور اسے اپنی گرفت میں لے لیا۔ میرا ایک ہاتھ اس کے منہ پر جم گیا تاکہ وہ چیخ نہ سکے۔ اس کی گردن میرے سیدھے بازو کی بغل میں تھی۔

وہ بری طرح مچل رہا تھا۔ میں اس کی گردن پر دباؤ بڑھانے لگا۔ میرے پاس زیادہ وقت نہیں تھا۔ یہ بھی اندیشہ تھا کہ اس کا کوئی اور ساتھی نہ آجائے۔ میں اس کی گردن کو دباتا رہا۔ وہ میری گرفت سے نکلنے کے لیے مچھلی کی طرح تڑپ رہا تھا لیکن میری یہ گرفت ایسی نہیں تھی جس سے نکلنا کامل سکتا۔

میں نے اس کی گردن کو ایک اور زوردار جھٹکا دیا۔ "کڑک" کی آواز ابھری۔ گردن کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ میں نے بازو کو جھٹکے دیے۔ وہ میرے ہاتھوں میں بری طرح مچل رہا تھا۔ میں اسے گھسیٹتے ہوئے گیٹ سے دور لے گیا اور درختوں کے نیچے چھوڑ دیا۔

اس کے حلق سے "خرخراہٹ" کی عجیب سی آوازیں نکل رہی تھیں۔ وہ ذبح ہوتے ہوئے بکرے کی طرح تڑپ رہا تھا۔ میں نے اسے اسی حالت میں چھوڑ دیا اور مکان کے دروازے کی طرف لپکا۔

میری حالت بھی اچھی نہیں تھی۔ جسم بری طرح دکھ رہا تھا لیکن یہ وقت ایسا نہیں تھا کہ میں اپنی تکلیف کے بارے میں سوچتا۔ میں گیٹ میں داخل ہو کر ایک لمحے کو رکا اور پھر صحن پار کرتے ہوئے اس دروازے کی طرف بڑھنے لگا جہاں روشنی دکھائی دے رہی تھی۔

ابھی میں چند قدم دور ہی تھا کہ دروازہ کھلا اور میں پوری طرح کمرے سے آنے والی روشنی میں نہا گیا۔ کمرے سے برآمد ہونے والا آدمی مجھے دیکھ کر ایک جھٹکے سے رک گیا۔

"اے۔۔۔ کون ہو تم۔۔۔؟" اس دراز قامت شخص نے یہ کہنے کے ساتھ ہی اپنی جیب کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

لیکن میں نے اس کا ہاتھ جیب تک نہیں پہنچنے دیا۔ میں کھڑے کھڑے اپنی جگہ سے اچھلا اور اس کے اوپر جا گرا۔ ہم دونوں دروازے سے ٹکرا کر کمرے کے اندر گرے تھے۔ مجھ سے اندازے کی ذرا سی غلطی ہوئی تھی جس کے نتیجے میں، میں گرتے ہوئے اس شخص کے نیچے دب گیا تھا۔

اس شخص نے بڑی تیزی سے میرے مضروب جبڑے پر دو تین گھونسے جڑ دیے۔ میرا دماغ جھنجھنا اٹھا لیکن میں نے اسے مزید موقع نہیں دیا اور بائیں ہاتھ کی ہتھیلی پوری قوت سے اس کی ناک پر مار دی۔ وہ بلبلا اٹھا۔ اس کی ناک سے خون بہہ نکلا تھا۔ مجھے موقع مل گیا۔ میں نے اسے اپنے اوپر سے ایک طرف گرا دیا اور اس کے سینے پر سوار ہو کر اس کے چہرے پر تابڑ توڑ گھونسے برسانے لگا لیکن میں زیادہ دیر تک اپنے حملے جاری نہیں رکھ سکا تھا۔ اس نے مجھے پیروں پر اٹھا کر پیچھے اچھال دیا اور سنبھل کر میرے اوپر چھلانگ لگا دی لیکن میں نے اپنے آپ کو اس کی زد سے بچا لیا اور بڑی پھرتی سے پلٹ کر اس کی گردن کو بازو کی لپیٹ میں لے لیا۔ اس نے دونوں ہاتھ میری کلائی پر جما دیے اور گرفت چھڑانے کی کوشش کرنے لگا لیکن یہ میرا پسندیدہ داؤ تھا اور میرا کوئی حریف آج تک اس سے بچ نہیں سکا تھا۔

"رادھن کہاں ہے؟" میں نے اس کی گردن پر دباؤ ڈالتے ہوئے کہا "جلدی بتاؤ ورنہ گردن توڑ دوں گا۔"

"وہ۔۔۔ وہ اوپر ہے۔" اس کے حلق سے پھنسی پھنسی سی آواز نکلی "تت۔۔۔ تم یہاں سے بچ کر نہیں جا سکو گے۔"

"اور وہ حرام زادہ کہاں ہے۔ دیش مکھ؟" میں نے دوسرا سوال کیا۔

"مم۔۔۔ مجھے نہیں معلوم۔۔۔" اس نے جواب دیا۔

"رادھن کے ساتھ اور کون ہے؟" میں نے پوچھا۔

"وہ۔۔۔ وہ لونڈیا۔۔۔" گردن پر میرے بازو کے دباؤ کی وجہ سے آواز اس کے حلق میں پھنس رہی تھی۔

"اور کون ہے؟"

"کک۔۔۔ کوئی نہیں۔" اس نے جواب دیا۔

میں اس کی گردن پر دباؤ بڑھانے لگا۔ وہ اپنی گردن چھڑانے کی کوشش کے ساتھ بری طرح لاتیں چلا رہا تھا۔ اس کی گردن پر میرا دباؤ بڑھتا گیا اور پھر میں نے زوردار جھٹکا دیا۔ کڑک کی آواز ابھری اور میں نے دباؤ کچھ اور بڑھا دیا۔ اس کے حلق سے خرخراہٹ کی آوازیں نکل رہی تھیں۔ آنکھیں حلقوں سے اُبل پڑی تھیں اور زبان باہر نکل آئی تھی۔ میں نے اسے چھوڑ دیا۔ وہ بری طرح تڑپ رہا تھا۔ میں اس کے مرنے کا انتظار کرنے کے لیے وہاں رکا نہیں۔

کمرے سے نکل کر میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگا اور پھر برآمدے کی دوسری طرف اوپر جانے کی سیڑھیاں نظر آگئیں۔ میں دوڑتے ہوئے سیڑھیوں پر چڑھتا چلا گیا۔

اوپر بھی تین چار کمرے تھے۔ دو کمروں میں روشنی ہو رہی تھی۔ ایک کمرے کا دروازہ آدھا کھلا ہوا تھا۔ میں نے جھانک کر دیکھا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ میں تیزی سے دوسرے کمرے کی طرف بڑھا۔ اس کمرے کا دروازہ بند تھا اور نیچے سے روشنی جھلک رہی تھی۔ میں نے ہینڈل پر ہاتھ رکھ کر اسے گھمانے کی کوشش کی مگر دروازہ اندر سے لاک تھا۔ میں نے کی ہول سے جھانکنے کی کوشش کی مگر اندر کچھ نظر نہیں آیا اور پھر میں سیدھا ہو کر زور زور سے دروازہ دھڑدھڑانے لگا۔

"دن ہے بے... کیا ہوا؟" اندر سے ایک بھاری آواز سنائی دی۔

"دروازہ کھولو دادا۔ پولیس نے گھیرا ڈال لیا ہے۔" میں نے چیختے ہوئے کہا۔

میرا یہ حربہ کامیاب رہا۔ اندر سے یہ پوچھنا ضروری نہیں سمجھا گیا تھا کہ میں کون ہوں۔

چند سیکنڈ بعد دروازہ ایک جھٹکے سے کھلا۔ اس کے ساتھ ہی میرا گھونسا اس شخص کے منہ پر پڑا جس نے دروازہ کھولتے ہی باہر آنے کی کوشش کی تھی۔ وہ چیختے ہوئے لڑکھڑا کر پیچھے ہٹا۔ میں نے سنبھلنے کا موقع دیے بغیر اس کے جبڑے پر ایک اور زوردار گھونسا جما دیا۔ اس مرتبہ وہ اپنا توازن برقرار نہیں رکھ سکا اور پشت کے بل گر گیا۔

میں نے بڑی پھرتی سے جھک کر اپنی پنڈلی پر بندھا ہوا خنجر نکال لیا لیکن وہ میرے حملے سے پہلے ہی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"تم یہاں تک پہنچ گئے۔" اس کے حلق سے بھینسے کی سی غراہٹ نکلی "رادھن کے ڈیرے پر آکر کوئی زندہ واپس نہیں گیا۔ تمہاری موت ہی تمہیں یہاں لے آئی ہے۔"

"موت کس کی آئی ہے' یہ فیصلہ ہونے میں چند منٹ سے زیادہ نہیں لگیں گے۔" میں نے جواب دیا "اگر تم زندہ رہنا چاہتے ہو تو یہ بتا دو کہ دیش مکھ کہاں ہے اور وہ دونوں لڑکیاں کہاں ہیں؟"

"دیش مکھ شوبھا کو لے کر الموڑا چلا گیا ہے... اور لڑکی اس نے مجھے دان کر دی تھی۔ وہ سالی تو بڑی خطرناک بے ہوش ہو گئی ہے۔ اب تم آگئے ہو تو اپنی آنکھوں سے لینا اس کا کیا حشر ہوتا ہے۔ رامو۔ چندر۔ ادھر آؤ۔ شکار آیا ہے۔"

"کوئی نہیں آئے گا رادھن۔" میں نے کہا "دونوں خود شکار ہو چکے ہیں اور اب تمہاری باری ہے۔"

رادھن کا چہرہ دھواں ہو گیا۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھا اور اندر والے دروازے کی طرف دوڑا۔ اس نے اندر داخل ہو کر دروازہ بند کرنے کی کوشش کی تھی لیکن میں دروازے سے ٹکرا گیا۔ دروازے کی ٹکر سے وہ پیچھے گر پڑا۔

میں نے اس پر چھلانگ لگائی لیکن میرا پیر فرش پر بچھی ہوئی دری میں الجھ گیا۔ میں نے سنبھلنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہیں ہو سکا اور لڑکھڑا کر ایک کرسی سے ٹکرایا اور کرسی سمیت دوسری طرف الٹ گیا۔ خنجر بھی میرے ہاتھ سے نکل کر گر گیا تھا۔

رادھن نے لپک کر میرا خنجر اٹھا لیا اور مجھ پر حملہ آور ہوا لیکن میں اس سے پہلے ہی سنبھل چکا تھا۔ اس کا وار روکنے کے لیے میں نے ہاتھ پر روکا۔ اس کی کلائی میری گرفت میں آگئی۔ میں نے اس کا دوسرا ہاتھ بھی گرفت میں لے لیا اور اسے پیچھے دھکیلنے لگا۔

اس دوران میں میری نظریں پلنگ کی طرف اٹھ گئیں جہاں سونیا بے ہوش پڑی تھی۔ اس کے جسم پر لباس نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ اس کی حالت دیکھ کر مجھے اندازہ ہو گیا میں دشواری پیش نہیں آئی کہ اس کے ساتھ کیا کچھ ہوا ہو گا۔

میں رادھن کو دھکیلتے ہوئے پیچھے لے گیا اور پھر اچانک ہی اس نے میری ٹانگ میں اڑنگا لگا دیا۔ میں لڑکھڑا کر گرتے گرتے بچا۔ اس کے بل سونیا والے بیڈ پر گرا۔ رادھن کی کلائی بھی میرے ہاتھ سے چھوٹ گئی تھی۔

رادھن نے خنجر والا ہاتھ اوپر اٹھا کر حملہ کیا۔ میں پھرتی سے ایک طرف ہٹ گیا۔

میں تو اس حملے سے بچ گیا لیکن رادھن کا خنجر پوری سُدھ بدھ پڑی ہوئی سونیا کے سینے میں دستے تک پیوست ہو گیا۔ میں پھٹی پھٹی سی نظروں سے سونیا کو دیکھ رہا تھا جس کے سینے سے خون کا فوارہ اُبل پڑا تھا۔

اگر میں خنجر کے وار سے بچنے کے لیے لوٹ نہ لگاتا اور رادھن کو روکنے کی کوشش کرتا تو یہ صورتِ حال نہ ہوتی جو وار کو روکنے کا وقت گزر چکا تھا۔

سونیا بے ہوش تھی لیکن خنجر سینے میں پیوست ہوا تو اس کا جسم کو زوردار جھٹکا لگا تھا۔ اس کے سینے سے بہتا خون بری آنکھوں میں وحشت سی بھر گئی۔ رادھن کے بھی ایک لمحے کو عجیب سے تاثرات ابھرے۔ اسے شاید اس بات پر اچنبھا ہوا تھا کہ اس کے خنجر نے میرے سونیا کو شکار کر لیا تھا لیکن اس نے فوراً ہی اپنی کیفیت پر قابو پا لیا۔ اسے شاید اس بات کی پروا نہیں تھی کہ خنجر کس جسم میں پیوست ہوا تھا۔ ظاہر ہے اسے سونیا سے بھی کوئی ہمدردی نہیں تھی۔

رادھن نے بڑی پھرتی سے خنجر کھینچ لیا۔ اس کے ساتھ ہی زخم کا فوارہ سونیا کے سینے سے بہہ نکلا تھا۔ میں لوٹ لگا کر پوری طاقت سے اس کی ٹانگوں پر آگیا تھا۔ اس کے سینے سے بہتا خون دیکھ کر میرے حواس مختل ہو گئے تھے۔ رادھن نے اس کا فائدہ اٹھایا۔ اس مرتبہ بھی اس کا نشانہ میں ہی تھا لیکن اب میں اپنے حواس پر قابو پا چکا تھا۔

میں نے بڑی پھرتی سے اس کا وار روکا اور اس کی کلائی موڑنے لگا۔ اس کم بخت میں بے پناہ طاقت بھری ہوئی تھی۔ اس کے چہرے پر بے پناہ درندگی تھی۔ وہ خنجر کو میرے جسم میں پیوست کرنے کے لیے پوری طاقت استعمال کر رہا تھا۔

ایک ہلکے سے جھٹکے سے خنجر کا رخ بدل گیا اور اب اس کی نوک میری شہ رگ کو چھونے کی کوشش کر رہی تھی۔

میری پشت سونیا کی ٹانگوں پر ٹکی ہوئی تھی اور میری ٹانگیں بیڈ سے نیچے لٹکی ہوئی تھیں۔ رادھن میرے اوپر اس طرح چڑھا ہوا تھا کہ میری ٹانگیں اس کے نیچے دبی ہوئی تھیں۔ میں نے بڑی مشکل سے ایک ٹانگ سمیٹ کر اس کی ٹانگوں کے بیچ گھٹنے سے ٹھوکر لگائی لیکن یہ ٹھوکر زیادہ موثر ثابت نہیں ہوئی۔ اس کے برعکس رادھن کو مزید طاقت لگانے کا موقع مل گیا تھا۔

خنجر کی نوک اب میرے نرخرے سے صرف ڈیڑھ دو انچ کے فاصلے پر رہ گئی تھی۔ رادھن کے ہاتھ کا ہلکا سا جھٹکا میری زندگی کا خاتمہ کر سکتا تھا۔ میں نے دوسرے ہاتھ کی ہتھیلی سے اس کے منہ پر ضرب لگائی۔ میرا یہ وار کچھ کارگر ثابت ہوا۔ میں نے دوبارہ یہی حربہ آزمایا۔ اس نے بچنے کے لیے اپنا چہرہ پیچھے کی طرف جھٹکا دیا۔ اس طرح اس کے خنجر والے ہاتھ کا دباؤ کم ہو گیا اور مجھے موقع مل گیا۔ میں نے ایک زوردار جھٹکے سے اس کا بازو موڑ دیا۔ اس کے ساتھ ہی گھٹنا سمیٹ کر اس کی ٹانگوں کے بیچ میں ایک اور ضرب لگائی۔ یہ وار بھی کارگر ثابت ہوا اور وہ اچھل کر سونیا کے سینے پر گرا۔ اس کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے خنجر کی نوک ایک بار پھر سونیا کے سینے میں پیوست ہو گئی۔ سونیا کے جسم کو مسلسل جھٹکے لگ رہے تھے۔

میں نے بڑی پھرتی سے لوٹ لگا کر رادھن کا خنجر والا ہاتھ موڑ دیا۔ خنجر ایک جھٹکے سے اپنی جگہ سے ہٹا تو سونیا کے سینے سے خون کی ایک اور دھار بہہ نکلی۔

سونیا کے بدن سے بہتا خون دیکھ کر میری آنکھوں میں خون اتر آیا۔ میں نے اس کا بازو موڑ کر اس کی پشت سے لگا دیا اور انگوٹھے کا ناخن اس کی کلائی کی نس میں پیوست کر دیا۔

رادھن آہستہ آہستہ اپنے جسم کو سمیٹ رہا تھا اور پھر اچانک ہی اس نے ایک زوردار جھٹکا لے کر مجھے گرانے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ اس کے برعکس مجھے موقع مل گیا اور میں نے اس کی ٹانگوں کو پکڑ کر زوردار جھٹکا دیا۔ وہ الٹی قلابازی کھاتا ہوا بیڈ کے دوسری طرف جا گرا۔ خنجر اس کے ہاتھ سے نکل کر بیڈ پر گر گیا تھا۔

میں بھی ایک جھٹکے سے اٹھ گیا۔ سونیا کے سینے پر دو جگہوں سے خون بہہ رہا تھا اور اس کے جسم کو ہلکے ہلکے جھٹکے لگ رہے تھے۔ اس نے ایک آخری جھٹکا لیا اور ساکت ہو گئی۔

میں اس وقت عجیب سی کیفیت میں مبتلا ہو رہا تھا۔ رگوں میں خون کھول رہا تھا اور سینے میں جیسے آگ سی بھر گئی تھی۔ میں نے رادھن پر چھلانگ لگا دی۔ وہ سنبھلنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن میں نے اسے موقع نہیں دیا۔

مجھ پر جنون سا طاری ہو رہا تھا۔ میں نے رادھن پر گھونسوں اور ٹھوکروں کی بارش کر دی اور اسے بیڈ کے دوسری طرف کھلی جگہ پر لے آیا۔ رادھن سنبھلنے کی کوشش کرتا رہا لیکن میں نے اسے موقع نہیں دیا۔ ایک مرتبہ اس نے باہر بھاگنے کی کوشش کی تھی۔ میں نے اس پر چھلانگ لگا دی۔ اس کی ٹانگ میری گرفت میں آگئی۔ وہ منہ کے بل ایک کرسی پر گرا۔ اس کا منہ کرسی کے ہتھے سے ٹکرایا تھا۔ وہ بے اختیار چیخ اٹھا تھا۔

میں نے اسے ایک بار پھر گھونسوں اور ٹھوکروں پر رکھ لیا تھا۔ اس کا چہرہ لہولہان ہو رہا تھا۔ وہ ہر مرتبہ اپنے آپ کو چھڑا کر باہر بھاگنے کی کوشش کرتا مگر میں اسے پکڑ لیتا۔ وہ

اپنے گُرگوں کے نام لے لے کر چیخ رہا تھا۔ انہیں مدد کے لیے پکار رہا تھا۔

رادھن اس شہر کا بہت بڑا بدمعاش تھا۔ یہاں کا دادا تھا۔ شہر کے سارے گیسٹ ہاؤسز سے بھتا وصول کرتا تھا۔ اس کی اجازت کے بغیر یہاں کوئی شریف آدمی کام دھندا نہیں کرسکتا تھا۔ لوگ اس کے نام سے کانپتے تھے لیکن اس کی ساری بدمعاشی اور دادا گیری ناک کے راستے نکل گئی تھی۔ وہ مدد کے لیے اپنے گرگوں کو پکار رہا تھا۔

ایک موقع پر اس کا داؤ چل گیا اور میں اس کے قابو میں آگیا۔ اس نے میرے جبڑے پر ایک گھونسا بھی لگا دیا تھا۔ میرا دماغ جھنجھنا اٹھا لیکن میں نے اسے دوسرا وار کرنے کا موقع نہیں دیا اور اسے بالوں سے پکڑ کر اس کا سر زور زور سے ٹکرانے لگا۔ اس کا سر پھٹ گیا۔ ہر ٹکر پر اس کے منہ سے خوفناک چیخ نکل جاتی۔

رادھن نے گھٹنے سے میری ٹانگوں کے بیچ ٹھوکر لگائی۔ میں لڑکھڑا کر پیچھے ہٹا۔ اس نے موقع پاکر ایک طرف چھلانگ لگا دی۔ میرا خیال تھا کہ وہ ایک بار پھر بھاگنے کی کوشش کررہا ہے لیکن اس مرتبہ اس نے بیڈ کی طرف چھلانگ لگائی تھی جہاں سونیا کے برہنہ جسم کے قریب خنجر پڑا ہوا تھا۔ رادھن خنجر اٹھا کر بڑی تیزی سے میری طرف پلٹا تھا۔ اگر میں غافل ہوتا تو خنجر میرے سینے میں پیوست ہوچکا ہوتا لیکن میں بڑی پھرتی سے ایک طرف ہٹ گیا اور وہ اپنی ہی جھونک میں آگے نکل کر دیوار سے ٹکرا گیا۔ میں نے سنبھلنے کا موقع دیے بغیر اسے دبوچ لیا۔ میں اپنے دونوں بازو اس کی بغلوں کے نیچے سے نکال کر ہاتھ اس کی گردن پر لے آیا اور دونوں ہاتھوں کی انگلیاں آپس میں پھنسالیں۔ اس طرح اس کی گردن میرے شکنجے میں آگئی تھی اور اس کے دونوں بازو بھی میرے داؤ کی گرفت میں تھے۔

میں نے ایک ہلکا سا جھٹکا دیا۔ اس کی گردن اور کندھوں پر دباؤ پڑا۔ خنجر اس کے ہاتھ سے نکل کر نیچے گر گیا۔ میں نے ایک اور جھٹکا دے کر اس کی گردن چھوڑ دی۔ وہ منہ کے بل نیچے گرا۔ اس نے ایک بار پھر خنجر کی طرف ہاتھ بڑھایا تھا لیکن اس سے پہلے خنجر میرے ہاتھ میں آگیا۔

اسی لمحے باہر دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دی۔ اس کے ساتھ ہی کسی کے دہاڑنے کی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ میں نے گردن گھما کر دیکھا۔ وہ رادھن ہی کا کوئی آدمی تھا جو کمرے میں داخل ہو کر خنجر تانے مجھ پر حملہ آور ہورہا تھا لیکن اسی لمحے فضا فائر کی آواز سے گونج اٹھی۔ اس کے ساتھ ہی اس آدمی کی چیخ بھی سنائی دی تھی۔ وہ کمرے کے کٹے ہوئے درخت کی طرح لہرایا اور ڈھیر ہوگیا۔ اس کی پشت پر بائیں طرف سے خون کی دھار بہہ نکلی تھی۔

وہ بلا تھی۔ جو پستول ہاتھ میں لیے دروازے میں کھڑی تھی اور پھر اس کی نظر جیسے ہی بیڈ پر پڑی ہوئی سونیا پر پڑی وہ چیختی ہوئی اس کی طرف دوڑی۔

رادھن نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر ایک بار پھر بھاگنے کی کوشش کی تھی لیکن میں نے دروازے کے قریب اسے دبوچ لیا اور اسے نیچے گرا کر اس کے سینے پر سوار ہوگیا۔ اس کا خون آلود چہرہ بہت بھیانک منظر پیش کررہا تھا۔ میں نے خنجر کی نوک اس کے نرخرے پر رکھ دی۔

"وہ حرامی دیش مکھ' شوبھا کو لے کر کہاں گیا ہے۔ سچ بتاؤ ورنہ تمہارا گلا کاٹ دوں گا۔" میں نے اس کے نرخرے پر خنجر کا ہلکا سا دباؤ ڈالا۔

"آ۔۔۔ آ۔۔۔ المورا۔۔۔" اس کے حلق سے بمشکل یہ آواز نکلی تھی۔

"المورا۔۔۔ کس جگہ۔۔۔؟" میں نے ایک اور سوال کیا۔

"شش۔۔۔ شہر کے شمال میں نصف میل کے فاصلے پر کھٹال جا گیش وری مندر سے ذرا ہٹ کر آبشار کے قریب تھوڑے تھوڑے فاصلے پر کئی ہٹ بنے ہوئے ہیں۔ ان ہٹوں کی چھت اور نیلی دیواروں والا ہٹ دیش مکھ کی ملکیت ہے۔ وہ ہر سال چھٹیاں منانے کے لیے وہاں جاتا ہے۔ نینی تال میں بھی اس کا ایک ہٹ ہے۔ کبھی وہاں بھی چلا جاتا ہے۔"

"تم اسے کب سے جانتے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"بہت عرصے سے۔" رادھن نے جواب دیا۔ "کبھی وہ راجستھان سے کسی لڑکی کو ساتھ لے کر آتا تھا اور کبھی یہیں سے لڑکیاں سپلائی کرتا تھا۔ یہاں ہردوار میں لڑکیوں کی کمی نہیں۔ ملک کے کونے کونے سے یاتری یہاں آتے ہیں۔ ان میں خوب صورت لڑکیاں بھی ہوتی ہیں۔ ایسی جگہوں پر کسی لڑکی کو اٹھانا زیادہ مشکل نہیں ہوتا۔ اس معاملے میں مندروں کے بعض پنڈت بھی ہمارے بہت کام آتے ہیں۔ لڑکیوں کو اٹھا کر نینی تال یا المورا جہاں دیش مکھ ہوتا ہے پہنچا دیا جاتا ہے۔" وہ ایک لمحے کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا "اس مرتبہ دیش مکھ وقت سے پہلے آیا تھا۔ اس نے بتایا کہ اس مرتبہ رشی کیش سے ایک عورت کو اغوا کیا ہے۔ اس مقصد کے لیے اس نے مجھے پچاس ہزار روپے دیے تھے۔ تمہاری وجہ سے ہمیں خاصی مشکل پیش آئی تھی لیکن دیش مکھ کی مطلوبہ عورت کے ساتھ یہ لڑکی بھی ہمارے ہاتھ لگ گئی۔" اس نے بیڈ کی طرف دیکھا "دیش مکھ کسی حسین لڑکی کو نہیں چھوڑتا لیکن اس مرتبہ اسے صرف شوبھا کی ضرورت تھی۔ یہ لڑکی اس نے مجھے تحفے میں دے دی۔"

"اس کے ساتھ کتنے آدمی ہیں؟" میں نے ایک اور سوال کیا۔

"دو۔۔۔ وہ دونوں اس کے ساتھ راجستھان سے آئے تھے۔" رادھن نے جواب دیا "وہ بہت خطرناک آدمی ہیں۔ تم دیش مکھ تک نہیں پہنچ سکو گے لیکن اگر تم مجھے چھوڑ دو تو میں اس کے خلاف تمہاری مدد کرسکتا ہوں۔"

"دیش مکھ سے تو میں نمٹ لوں گا لیکن تم جیسے حرامی کو زندہ چھوڑ دینا میری سرشت میں نہیں ہے۔" میں نے یہ کہنے کے ساتھ ہی پوری قوت سے اس کے نرخرے پر خنجر پھیر دیا اور اچھل کر ایک طرف ہٹ گیا۔

رادھن پانی سے نکلی ہوئی مچھلی کی طرح تڑپ رہا تھا۔ اس کی کٹی ہوئی شہ رگ سے خون فوارے کی طرح اچھل رہا تھا اور خرخراہٹ کی عجیب سی آوازیں خارج ہورہی تھیں۔

چند منٹ بعد وہ بے حرکت ہوگیا۔ فرش پر چاروں طرف خون بکھرا ہوا تھا۔ رادھن کا چہرہ کچھ اور بھیانک ہوگیا تھا۔ میں چند لمحے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر لپک کر بیڈ کے قریب پہنچ گیا۔

بلا' سونیا پر جھکی ہوئی تھی۔ اس کا ایک ہاتھ بلا کے ہاتھ میں تھا۔ بستر کی چادر خون سے تربتر ہورہی تھی۔ میں نے بلا کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر بے پناہ وحشت اور آنکھوں میں نمی تھی۔ میں نے سونیا کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور نبض ٹٹولنے کی کوشش کرنے لگا پھر میں نے ہاتھ اس کے جبڑے کے نیچے گلے پر رکھ دیا۔ میری انگلیاں اس کے گلے کو مختلف جگہوں سے ٹٹولتی رہیں لیکن کہیں بھی کوئی تحریک محسوس نہیں ہوئی۔

میں نے ہر طرح سے اطمینان کرلیا۔ سونیا میں زندگی کا کوئی نشان نہیں رہا تھا۔ خنجر کا پہلا وار سینے پر عین دل کے مقام پر ہوا تھا اور خنجر دستے تک سینے میں پیوست ہوگیا تھا۔ اس خوفناک وار کے بعد بھی وہ زندہ بچ جاتی تو مجھے حیرت ہوتی۔

میں نے بلا کی طرف دیکھا۔ اس کے ضبط کے بندھن ٹوٹ گئے۔ آنکھوں میں رکے ہوئے آنسو بہہ نکلے اور وہ مجھ سے لپٹ کر ہچکیاں بھرنے لگی۔ میں بھی اپنے آنسو ضبط نہیں کرسکا۔

میں نے بڑی مشکل سے بلا کو اپنے آپ سے الگ کیا۔ دوسرے کمرے کے بیڈ سے چادر اٹھا کر سونیا پر ڈال دی۔ آخری مرتبہ اس کے چہرے کو دیکھا اور پھر چہرہ بھی ڈھک دیا۔ ہم اس سے زیادہ اس کی کوئی مدد نہیں کرسکتے تھے۔

میں بلا کو لے کر کمرے سے باہر آگیا اور جب ہم سیڑھیاں اتر رہے تھے تو سامنے دور سے کسی گاڑی کے ہیڈ لیمپس کی روشنیاں چمکتی ہوئی نظر آئیں۔ وہ گاڑی اسی طرف آرہی تھی۔ میں نے بلا کا ہاتھ پکڑ لیا اور تیزی سے سیڑھیاں اترنے لگا۔ آخری سیڑھی پر پہنچ کر بلا کا پیر رپٹ گیا۔ وہ چیختی ہوئی نیچے گری۔ میں نے جھک کر اسے اٹھانے کی کوشش کی تو وہ ایک بار پھر چیخ اٹھی۔

"اٹھو۔ جلدی کرو۔ وہ گاڑی اسی طرف آرہی ہے۔" میں نے اسے اٹھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"میرا پیر!" وہ کراہ اٹھی۔

میں نے جھک کر اسے گود میں اٹھا لیا اور تقریباً دوڑتا ہوا گیٹ سے باہر نکل گیا۔ وہ گاڑی کافی دور تھی۔ وہ اگرچہ اس آشرم کی طرف ہی آرہی تھی لیکن اس کا رخ قدرے بائیں طرف تھا۔ وہ راستہ ذرا سا گھوم کر آشرم کی طرف آتا تھا۔ راستے کے اس خم کی وجہ سے ہم اس گاڑی کے ہیڈ لیمپس کی روشنی کی زد میں آنے سے بچ گئے تھے۔

میں بلا کو گود میں اٹھائے درختوں کی طرف بھاگ کھڑا ہوا جہاں ہماری کار کھڑی تھی۔ کار کے قریب پہنچ کر میں نے بلا کو نیچے اتار دیا اور پسنجرز سائڈ کا دروازہ کھول دیا۔ اسی دوران وہ کار آشرم کے سامنے پہنچ کر رک چکی تھی۔

"جلدی سے بیٹھ جاؤ۔" میں بلا کو چھوڑ کر سامنے سے گھومتا ہوا ڈرائیونگ سیٹ کی طرف لپکا۔

اس کار میں آنے والے بھی یقیناً رادھن ہی کے آدمی تھے اور میں جانتا تھا کہ آشرم کے اندر کی صورتِ حال دیکھ کر وہ پاگل ہوجائیں گے اور ظاہر ہے ہمارا پیچھا کرنے کی کوشش کریں گے۔

بلا بمشکل کار میں بیٹھ سکی تھی۔ اس نے دروازہ زور سے بند کیا تھا جس کی آواز سناٹے میں دور تک گونجی تھی اور پھر اسی وقت آشرم کی طرف سے کسی کے چیخنے کی آواز سنائی دی تھی۔ انہوں نے غالباً دیوار کے قریب پڑی ہوئی اس شخص کی لاش دیکھ لی تھی جو سب سے پہلے میرے ہاتھوں سے مارا گیا تھا اور پھر اسی وقت آشرم کی طرف سے ایک اور چیختی ہوئی آواز سنائی دی۔

"وہ دیکھو۔ اس طرف کوئی گاڑی کھڑی ہے۔"

"تم اندر جاؤ۔ میں اس گاڑی کو دیکھتا ہوں۔" یہ دوسری آواز تھی۔

وہ شخص ہماری طرف دوڑا۔ میں نے انجن اسٹارٹ کردیا اور کار کو ایک زوردار جھٹکے سے آگے بڑھا دیا۔ وہ شخص ہماری طرف دوڑ رہا تھا۔ فاصلہ تقریباً سو گز کے قریب تھا۔ میں نے کار کو تیزی سے دائیں طرف گھما دیا اور ایکسلی ریٹر پر پیر کا دباؤ بڑھاتا چلا گیا۔ اسی لمحے فضا فائر کی آواز سے گونج اٹھی۔ پہلی گولی کار کی پچھلی ونڈ شیلڈ کے ایک کونے میں لگی اور شیشے میں سوراخ کرتی ہوئی کھڑکی سے نکل گئی۔

میں درختوں میں کار کی رفتار بڑھاتا چلا گیا۔ اس کے بعد دو فائر اور ہوئے تھے لیکن کوئی گولی ہماری کار تک نہیں پہنچ سکی تھی۔

کار درختوں سے نکل کر سڑک پر آگئی' میں نے اسے بائیں طرف گھما دیا اور اس کی رفتار بڑھاتا چلا گیا۔

آدھے گھنٹے بعد ہماری کار شہر سے باہر جانے والی سڑک پر دوڑ رہی تھی۔ رات کے ساڑھے گیارہ بجے تھے۔ سڑک پر سناٹا تھا۔ اس وقت اس سڑک پر ٹریفک کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ یہ پختہ سڑک تھی۔ میں تیز رفتاری سے کار دوڑاتا رہا۔ ہم نے اس آشرم یا راوھن بدمعاش کے اڈے پر چار آدمیوں کو موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ پانچویں لاش سونیا کی تھی۔ راوھن اور اس کے گرگے بدمعاش تھے۔ شہر والوں کی زندگیوں کے لیے عذاب بنے ہوئے تھے۔ امن و امان کے لیے مستقل خطرہ تھے۔ ان کی موت سے شہر والوں کو کچھ عرصے کے لیے سکون ضرور ملے گا مگر ان کا قتل بہرحال جرم تھا۔ کسی عام آدمی کو ان کے جرائم کی سزا دینے کا کوئی حق نہیں تھا۔ کسی مجرم کو سزا دینا صرف قانون کا کام تھا لیکن اس ملک میں قانون کتنا بے بس تھا؟ وہ میں دیکھ چکا تھا۔ جے پور میں روپ متی کے ساتھ کیا کچھ نہیں ہوا تھا۔ اس نے قانون کا سہارا لینے کی کوشش کی تھی لیکن قانون کو تو ان لوگوں نے خرید لیا تھا جو قانون کی دھجیاں اڑاتے ہیں اور آج دن میں کیا ہوا تھا؟ سیکڑوں لوگوں کی موجودگی میں شوبھا اور سونیا کو اغوا کرلیا گیا تھا۔ وہاں سے صرف سو گز کے فاصلے پر پولیس اسٹیشن تھا۔ لوگوں نے تھانے جاکر اس واردات کی اطلاع بھی دے دی۔ فائرنگ کی آوازیں تھانے تک بھی سنی گئی تھیں لیکن قانون کے محافظوں کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگی تھی۔ میں دو گھنٹے اسپتال میں بے ہوش پڑا رہا تھا لیکن قانون کے کسی محافظ نے آکر میری خبر تک نہیں لی تھی۔ بعد میں بھی کسی نے مجھ سے یہ پوچھنے کی کوشش نہیں کی تھی کہ سونیا اور شوبھا کو اغوا کرنے والے کون لوگ تھے؟

کوئی بڑا جرم قانون کے رکھوالوں کے تعاون کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ دلیش مکھ نے بھی یہ واردات کرنے سے پہلے قانون کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی تھی اور محافظوں کے ہاتھ دولت کی زنجیر سے باندھ دیے تھے۔

میں نے خود ان لوگوں کا سراغ لگایا تھا۔ میں اگر پولیس کے پاس جاتا تو بھی راوھن اور اس کے آدمیوں کا کچھ نہ بگڑتا۔ وہ بدمعاش آدمی تھا۔ طاقت ور تھا۔ پولیس والے بھی اس کی طاقت سے خائف تھے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ گیسٹ ہاؤس والوں سے بھتا کیوں وصول کرتا۔ لوگوں کے دلوں میں اس کا خوف کیوں ہوتا؟ قانون کے محافظ اس کے جرائم سے پردہ پوشی کیوں کرتے؟ اگر قانون کے یہ رکھوالے فرض شناس اور ایمان دار ہوتے تو راوھن بدمعاش کیوں بنتا۔ جرائم کیوں ہوتے؟ راوھن اور اس کے گرگے مارے گئے تھے۔ دو شریف عورتوں کو بھرے بازار سے اغوا کرلیا گیا تھا تو قانون کے محافظوں کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگی تھی۔ اب راوھن جیسا بدمعاش اور اس کے گرگے مارے گئے تھے تو شہر میں قیامت مچ جائے گی۔ پولیس کا ہر فرد قاتلوں کی تلاش میں اِدھر اُدھر دوڑتا ہوا نظر آئے گا۔ ممکن ہے وہ شہر سے باہر جانے والے راستوں پر بھی توجہ دیں اسی لیے میں جلد سے جلد شہر سے دور نکل جانا چاہتا تھا۔

بملا اپنی سیٹ پر خاموش بیٹھی تھی۔ اس نے ایک ہاتھ سے اپنا بایاں پیر دبا رکھا تھا اور اس کے چہرے پر کرب کے آثار نمایاں تھے۔

میں نے صرف ایک دو مرتبہ اس کی طرف دیکھا تھا لیکن بات نہیں کی تھی۔ میرے سینے میں ہلچل سی مچی ہوئی تھی اور دماغ میں جھکڑ سے چل رہے تھے۔ سونیا کی دردناک موت نے مجھے جھنجوڑ کر رکھ دیا تھا۔ میرے پرانے ساتھی ایک ایک کرکے مجھے چھوڑ گئے تھے۔ تھائی... جانکی اور اب سونیا۔ مجھے لگتا تھا جیسے میرے بدن کا ایک اور حصہ مجھ سے الگ ہوگیا ہو۔

سڑک کے دونوں طرف چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں اور گھنے جنگل تھے۔ کار کے ہیڈ لیمپس کی روشنی نے تاریکی میں ایک سرنگ سی بنا دی تھی اور لگتا تھا جیسے ہم ایک طویل اور ختم نہ ہونے والی سرنگ میں سفر کر رہے ہوں۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد ہم رور کی نامی ایک بستی میں پہنچ گئے۔ یہاں سے ایک سڑک سہارنپور' انبالہ' چندی گڑھ اور

پنجاب کی طرف چلی گئی تھی جبکہ دوسری سڑک نگینہ' خاص پور اور رامپور سے ہوتی ہوئی بریلی اور لکھنؤ وغیرہ کی طرف جاتی تھی۔

اس وقت ساڑھے بارہ بج رہے تھے۔ بستی سناٹے اور تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ میں نے کار کی رفتار کم کردی تھی۔ بستی کے ایک دو آوارہ کتے بھونکتے ہوئے ہماری کار کے پیچھے لگ گئے تھے لیکن میں نے ان کی پروا نہیں کی۔ کتوں کا تو کام ہی راہ گیروں پر بھونکنا ہوتا ہے۔

میں ہلکی رفتار سے کار ڈرائیو کرتے ہوئے متجسس نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ ایک ذیلی سڑک پر روشنی دیکھ کر میں نے کار اس طرف موڈ دی اور مجھے یہ جان کر بڑی حیرت ہوئی کہ اس طرف ایک بنئے کی دکان کھلی ہوئی تھی میں نے دکان کے سامنے کار روک لی۔

دکان میں دو آدمی بیٹھے حقے کے کش لگا رہے تھے۔ ان میں ایک تو دکان دار تھا اور دوسرا اس کا دوست۔ میں کار سے اتر کر دکان میں داخل ہوگیا اور پرنام کرکے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ دروازہ اگرچہ چھوٹا تھا مگر اندر سے دکان بہت بڑی تھی اور بقول شخصے یہاں سوئی سے لے کر ہاتھی تک مل سکتا تھا۔ ایک طرف شیلفوں پر ایلوپیتھی کی ادویات بھی سجی ہوئی تھیں۔

"کیا چاہیے مہاراج۔ کس چیز کی تلاش ہے آپ کو؟" دکان والے نے پوچھا۔

"وہ دراصل میری پتنی کے پیر میں موچ آگئی ہے۔ اس کے لیے کوئی مرہم وغیرہ ہو تو۔" میں کہتے ہوئے ایک بار پھر اوھر ادھر دیکھنے لگا۔

"مرہم تو مل جائے گا۔ پر موچ آئی ہے یا چوٹ لگی ہے؟" اس نے پوچھا۔

"پیر رپٹ گیا تھا اور۔۔۔"

"نارائن۔" دکان دار نے میری بات کاٹ کر اپنے ساتھی کو مخاطب کیا۔ "بٹیا کو دیکھ لے۔ وہ سامنے موڑ میں بیٹھی ہے اور یہ مرہم لے جا۔ لگا کر پٹی باندھ دینا۔" اس نے ایک ڈبیا نارائن کی طرف بڑھادی پھر میری طرف دیکھ کر بولا "نارائن رامپور میں پہلوانی کیا کرتا تھا۔ اب تو سب چھوڑ دیا۔ عرصے سے یہاں رہ رہا ہے۔"

نارائن کے ساتھ میں بھی دکان سے باہر آگیا۔ میں نے پینجرز سیٹ کا دروازہ کھول دیا اور بلا کو اشارہ کیا۔ وہ سیٹ پر پہلو بدل کر بیٹھ گئی۔ نارائن دروازے کے سامنے زمین پر بیٹھ گیا اور بلا کا پیر ٹٹول کر دیکھنے لگا۔ اس نے پیر کو ایک دو ہلکے ہلکے جھٹکے بھی دیے۔ بلا سسکاریاں بھر کر رہ گئی۔

"موچ نہیں آئی۔ ہلکا سا جھٹکا لگا ہے۔ میں مالش کردیتا ہوں ٹھیک ہوجائے گی۔" نارائن نے کہا اور مرہم سے پیر کی مالش کرنے لگا۔

بلا نچلا ہونٹ دانتوں میں دبائے تکلیف ضبط کرنے کی کوشش کرتی رہی۔ نارائن نے مالش کرکے اپنے کندھے پر پڑا ہوا پٹکا اتارا اور اسے پھاڑ کر پیر پر پٹی باندھ دی۔

"صبح اس مرہم سے پھر مالش کرلینا۔ بٹیا ٹھیک ہوجائے گی۔" اس نے کہا۔

بلا نے ڈبیا اس سے لے لی اور سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ میں نارائن کے ساتھ دکان میں آگیا اور ایک بار پھر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ ایک طرف مجھے کمبل بھی تہ در تہ رکھے ہوئے نظر آئے۔ یہ آرمی کے نیلام شدہ کمبل تھے۔ میں نے دو کمبل لے لیے۔

دکان دار نے کمبلوں کے پیسے تو لے لیے لیکن مرہم کے پیسے نہیں لیے۔ مجھے خوشی ہوئی کہ ایسے ہمدرد اور نیک لوگ بھی موجود ہیں جنہیں اجنبیوں سے بھی ہمدردی ہوتی ہے۔

"شریمان جی۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آدھی رات کو اتنا لمبا سفر۔"

"ہم رام پور سے آرہے ہیں۔" میں نے کہا "راستے میں گاڑی خراب ہوگئی جس وجہ سے دیر ہوگئی۔ ہمیں بہرحال صبح سے پہلے پہلے ہردوار پہنچنا ہے۔ اس لیے رات میں بھی سفر جاری رکھے ہوئے ہیں لیکن آپ لوگ اس وقت دکان کیوں کھولے بیٹھے ہیں جبکہ بستی کے سب لوگ گہری نیند سو رہے ہیں۔"

"رام پور سے آنے والی ٹرین بھی آج چار گھنٹے لیٹ ہوگئی ہے۔" دکان والے نے جواب دیا۔

اور پھر اس کی باتوں سے پتا چلا کہ رورکی ایک چھوٹا سا ریلوے جنکشن ہے۔ آٹھ بجے رام پور سے چندی گڑھ جانے والی ٹرین یہاں سے گزرتی ہے۔ اس کی بہن اور بہنوئی اس ٹرین سے آنے والے ہیں۔ اس کا گھر بھی دکان کے پیچھے ہے اس لیے وہ دکان کھولے بیٹھے ہیں۔ اس کے کہنے کے مطابق ریلوے اسٹیشن وہاں سے تقریباً ایک فرلانگ آگے تھا۔ اس طرف بعض دکانیں اور ایک آدھ ہوٹل ضرور کھلا ہوگا۔

میں نے باتوں ہی باتوں میں ان سے یہ بھی معلوم کرلیا کہ المورا جانے کے دو راستے ہیں۔ ایک تو نگینہ شہر سے پکی سڑک ہے جو رام نگر شہر تک چلی گئی ہے۔ اس سے آگے المورا جانے والی سڑک ابھی زیرِ تعمیر ہے لیکن زیادہ ٹریفک

اس طرف سے جاتا ہے۔ دوسرا راستہ اس بستی سے المورا کی طرف جاتا ہے۔ یہ سڑک کہیں پکی ہے اور کہیں کچی لیکن گھنے جنگلوں کی وجہ سے یہ راستہ خطرناک سمجھا جاتا ہے۔ ان جنگلوں میں خوں خوار درندے بکثرت پائے جاتے ہیں۔ اسی لیے لوگ دن کے وقت بھی اس طرف سفر کرتے ہوئے ڈرتے ہیں۔

میں ان کا شکریہ ادا کرکے کار میں واپس آگیا اور انجن اسٹارٹ کرکے کار کو ریورس میں لیتا ہوا سڑک پر لے آیا اور اسے اس طرف موڑ دیا جس طرف سے ہم آئے تھے۔ المورا کی طرف جانے والا راستہ ہم پیچھے چھوڑ آئے تھے۔

میں نے ان لوگوں سے جھوٹ کہا تھا کہ ہم رام پور سے آئے تھے اور ہردوار جارہے ہیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اگر کسی وقت یہاں سے ہمارے بارے میں پوچھا جائے تو ہمارا سراغ نہ لگایا جاسکے اور ویسے بھی اب ہم ہردوار کی طرف ہی جارہے تھے۔

اس سڑک پر تقریباً ایک میل آگے جاکر میں نے کار دائیں طرف موڑ دی۔ یہ سڑک اگرچہ پختہ تھی لیکن زیادہ کشادہ نہیں تھی۔ چند میل کا فاصلہ طے ہونے کے بعد ہی گھنا جنگل شروع ہوگیا۔ اس کے ساتھ ہی سردی بھی بڑھ گئی تھی۔ میں نے کار میں بیٹھتے ہوئے دونوں کمبل بلا کے حوالے کردیے تھے۔ اس نے ایک کمبل اپنے اوپر لپیٹ لیا تھا اور دوسرا گود میں رکھا ہوا تھا۔

آج دن میں دیش مکھ اور اس کے ساتھیوں نے رشی کیش میں میری اچھی خاصی دھنائی کی تھی پھر طویل سفر اور آشرم میں راادھن اور اس کے آدمیوں سے مار پیٹ۔ اس وقت میرے جسم کا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا۔ سردی کی وجہ سے چوٹوں میں تکلیف شروع ہوگئی تھی لیکن میں اپنی قوتِ ارادی کے بل بوتے پر اپنے آپ کو سنبھالے ہوئے تھا۔

مجھے سیٹ پر بار بار پہلو بدلتے دیکھ کر بلا نے دوسرا کمبل کھول کر میرے اوپر ڈال دیا۔ اس کے ساتھ ہی یہ مشورہ بھی دیا تھا کہ اگر راستے میں کوئی بستی آئے تو ہم گھنٹا دو گھنٹے وہاں رک کر آرام کرلیں لیکن میں نے اس وقت تک آرام نہ کرنے کی قسم کھائی تھی جب تک دیش مکھ کی گردن نہ مروڑ لوں۔

ہم اس جنگل میں میلوں دور آچکے تھے۔ اچانک کار کا انجن ہچکولے کھانے لگا۔ میں گیئر بدل بدل کر اسے سنبھالنے کی کوشش کرتا رہا مگر کامیاب نہ ہوسکا۔ کار کی رفتار بتدریج کم ہوتی چلی گئی اور بالآخر وہ رک گئی۔

"اس کم بخت کو بھی... یہیں خراب ہونا تھا۔" میں دونوں ہاتھ اسٹیئرنگ پر مارتے ہوئے بڑبڑایا۔

"پیٹرول تو ختم نہیں ہوگیا؟" بلا نے کہا۔

بلا کی بات سنتے ہی میں اچھل پڑا اور میری نظریں بے اختیار ڈیش بورڈ کی طرف اٹھ گئیں۔ فیول بتانے والی سوئی زیرو پر رکی ہوئی تھی۔ ہم جب رشی کیش سے روانہ ہوئے تھے تو روشن لال نے کار میرے حوالے کرتے ہوئے بتایا تھا کہ اس نے ٹینک فل کروا دیا ہے۔ ٹینک میں کتنے گیلن پیٹرول آتا تھا اس کا مجھے کوئی علم نہیں تھا لیکن ہم شام چھ بجے سے سفر کررہے تھے۔ رشی کیش سے ہردوار وہاں سے رورکی اور رورکی سے اس جنگل میں کم و بیش پچاس میل کا فاصلہ طے ہوچکا تھا۔ پیٹرول کو تو ختم ہونا ہی تھا۔ راستے میں مجھے کہیں بھی خیال نہیں آیا تھا کہ پیٹرول ختم بھی ہوسکتا ہے۔ ہردوار میں رادھن کو تلاش کرنے سے پہلے پیٹرول ڈلوایا جاسکتا تھا۔ بہرحال یہ ہماری خوش قسمتی تھی کہ کار کی ڈکی میں پانچ پانچ گیلن والے تین کین رکھے ہوئے تھے۔

میں نے اپنے کندھوں پر سے کمبل ہٹا دیا اور اگنیشن میں سے کی رنگ نکال کر نیچے اتر آیا۔ کار کا دروازہ کھولتے ہی یخ ہوا کا جھونکا میرے جسم سے ٹکرایا تھا اور ایک لمحے کو میں کپکپا کر رہ گیا تھا۔

جنگل بہت گنجان تھا۔ سڑک کے کنارے تک خودرو پودے اور جھاڑیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ اوپر درختوں کی شاخیں اس طرح آپس میں ملی ہوئی تھیں کہ آسمان پر چمکتے ہوئے ستارے بھی نظر نہیں آرہے تھے۔ میرا خیال ہے کہ یہاں تو دن کے وقت دھوپ بھی زمین تک نہیں پہنچتی ہوگی۔

ہر طرف گہری تاریکی طاری تھی۔ حشرات الارض کی آوازیں اس تاریکی میں بڑا خوفناک تاثر دے رہی تھیں۔ اچانک ہی مجھے رورکی کے اس بوڑھے دکان دار کی بات یاد آگئی۔ اس نے بتایا تھا کہ اس جنگل میں خوفناک درندے بکثرت پائے جاتے ہیں اور لوگ ان درندوں کے خوف سے دن کے وقت بھی سفر کرتے ہوئے ڈرتے ہیں اور یہ تو رات کا آخری پہر تھا۔ درندوں کے خوف سے میں ایک بار پھر کانپ کر رہ گیا۔

میں نے ڈکی کھول کر پہلے پیٹرول کا ایک کین نکالا اور ٹینکی کا ڈھکنا کھول کر اس میں پیٹرول انڈیل رہا تھا کہ پتوں اور جھاڑیوں کی کھڑکھڑاہٹ کی آواز سن کر اچھل پڑا۔ اس کے ساتھ ہی ایک باریک سی سیٹی کی طرح کی چیخ میری سماعت سے ٹکرائی تھی۔ پیٹرول کا کین میرے ہاتھ سے گرتے گرتے

بچا۔ جسم کے مسام پسینہ اگلنے لگے۔

دو جانور گاڑی کے سامنے ہیڈ لیمپس کی روشنی میں سڑک کے ایک طرف سے دوڑتے ہوئے دوسری طرف تاریک جھاڑیوں میں غائب ہوگئے۔ ایک دوسرے کے پیچھے دوڑنے والے وہ جانور جنگلی بلی یا لومڑی سے زیادہ بڑے نہیں تھے۔

میں نے باری باری تینوں کین کا پیٹرول ٹینکی میں انڈیلا' آخری کین سڑک پر ہی پھینک دیا' ٹینکی کا ڈھکنا بند کیا اور ڈکی کا ڈھکنا گرا کر بند کرلیا۔

"کیا ہوا؟" بلا نے میری طرف دیکھا "شاید تم ان جانوروں سے ڈر گئے ہو؟"

"ہاں۔" میں نے گہرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا "یہ تو بے ضرر جانور تھے۔ ان کی جگہ درندے بھی ہوسکتے تھے۔"

"تو کیا ہوا۔ تم تو بہت اچھے مارشل آرٹسٹ ہو۔"

"ہاں۔ میں تو بہت اچھا مارشل آرٹسٹ ہوں مگر افسوس تو اس بات کا ہے کہ جنگلی درندے مارشل آرٹ نہیں جانتے۔ بہرحال' تمہارا پیر کیسا ہے؟"

"اس مرہم کی مالش سے تکلیف حیرت انگیز طور پر کم ہوگئی ہے۔ اب تو میں کمبل کے اندر پیر کو آہستہ آہستہ حرکت بھی دے رہی ہوں۔"

"زیادہ حرکت مت دینا۔ بس اسی طرح کمبل لپیٹ کر آرام سے بیٹھی رہو۔ بلکہ بہتر ہے تم سوجاؤ۔" میں نے انجن اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔

گاڑی کو آگے بڑھانے سے پہلے میں نے بھی اپنے کندھوں پر کمبل ڈال لیا تھا۔ اچھا ہی ہوا تھا کہ اس دکان پر مجھے یہ کمبل نظر آگئے تھے۔ بصورتِ دیگر سردی میں سفر کرنا مشکل ہوجاتا۔

اس خطرناک اور تاریک جنگل میں ہمارا سفر جاری رہا۔ کئی مرتبہ بعض جانوروں کو کار کے ہیڈ لیمپس کی روشنی میں سڑک پر یا اس کے آس پاس دیکھا تھا لیکن ہمیں کوئی ناخوشگوار حادثہ پیش نہیں آیا۔

صبح پانچ بجے کے قریب ہم ایک بستی میں پہنچ گئے۔ یہ بستی سڑک کے دائیں طرف قدرے ہٹ کر تھی جبکہ دوسری طرف تقریباً پچاس گز کھلی جگہ تھی اور اس سے آگے ڈھلان پر دھان کے کھیت تھے جن کے پرلی طرف تاحدِ نگاہ گھنا جنگل پھیلا ہوا تھا۔

بستی میں ایک آدھ ہی کچا مکان دکھائی دے رہا تھا جبکہ باقی سب جھونپڑے تھے۔ گھاس پھونس اور درختوں کی شاخوں سے بنے ہوئے گول جھونپڑے جیسے بڑے بڑے پیالے اوندھے رکھے ہوں۔ اوپر وسط میں ایک ایک فٹ تک بانسوں کی کھپچیاں نکلی ہوئی تھیں۔ ہر جھونپڑے کے گرد خشک جھاڑیوں اور درختوں کی موٹی موٹی شاخوں سے باڑھ لگی ہوئی تھی۔

ہماری کار جیسے ہی بستی کی حدود میں داخل ہوئی دو کتوں نے بھونکتے ہوئے ہمارا تعاقب شروع کردیا۔ میں نے کار کی رفتار پہلے ہی کم کردی تھی۔ بستی میں سڑک کی طرف دو جھونپڑوں میں شاید دکانیں بنی ہوئی تھیں اور دونوں جھونپڑوں کے اوپر کوکا کولا کے بورڈ لگے ہوئے تھے۔ انہی سے میں نے یہ اندازہ لگایا تھا کہ یہ دکانیں یا ڈھابے ہیں۔ دونوں دکانیں کھلی ہوئی تھیں۔ میں نے ایک ڈھابے کے سامنے کار روک لی۔ کتے بھی ہمارے پیچھے رک گئے۔ کچھ دیر بھونکتے رہے اور پھر واپس چلے گئے۔

ڈھابے کا مالک ایک ادھیڑ عمر آدمی تھا۔ اس نے ابھی ابھی دکان کھولی تھی اور اپنی چیزیں درست کررہا تھا۔ میں کار کا دروازہ کھول کر نیچے اتر آیا۔

"چائے ملے گی کاکا؟" میں نے آگے بڑھ کر پوچھا۔

"ضرور ملے گی مہاراج۔ پر دس منٹ انتظار کرنا پڑے گا۔" اس نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے۔ ہم انتظار کرلیتے ہیں۔ دو چائے بنادو۔" میں نے کہا۔

بلا بھی نیچے اتر آئی اور ہم ڈھابے کے آس پاس ٹہلنے لگے۔ میں نے بلا کو سہارا دے رکھا تھا اور وہ اپنے مضروب پیر پر ہلکا سا دباؤ ڈال کر چل رہی تھی۔ ڈھابے کے مالک نے دو فولڈنگ کرسیاں نکال کر رکھ دیں۔ ہم دونوں کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

چائے تیار ہونے میں دس کے بجائے بیس منٹ لگے تھے۔ دکان دار کو یہ جان کر بڑی حیرت ہوئی تھی کہ ہم رات ہی رات میں رورکی کی طرف سے سفر کرتے ہوئے آئے ہیں۔

"اس علاقے میں رات کو کوئی سفر نہیں کرتا مہاراج۔" اس نے بتایا۔ اس جنگل میں شیر اور چیتے بکثرت پائے جاتے ہیں۔ لوگ تو دن کے وقت بھی اس طرف سفر کرتے ہوئے ڈرتے ہیں۔"

اور پھر باتوں ہی باتوں میں اس نے بتایا کہ یہاں سے چند میل آگے رانی کھیت نام کا بل اسٹیشن ہے۔ ایک بس صبح چھ بجے رانی کھیت سے رورکی کے لیے روانہ ہوتی ہے جو پونے سات بجے کے قریب یہاں پہنچتی ہے۔ بس کے آنے سے پہلے اسے اپنی دکان تیار کرنی پڑتی ہے۔

اس کی باتوں سے ہماری معلومات میں خاصا اضافہ ہوا۔ پہاڑی کماؤں کا علاقہ تھا جو ہزاروں مربع میل تک پھیلا ہوا تھا۔ دنیا کے خوب صورت اور خطرناک ترین جنگلات اس خطے میں پائے جاتے ہیں۔ ان جنگلوں میں دوسرے درندوں کے علاوہ شیر اور چیتے بھی بکثرت پائے جاتے ہیں۔ یہ چیتے اور شیر آئے دن ان جنگلوں میں آباد انسانی بستیوں میں تباہی پھیلاتے رہتے ہیں۔ جب کسی شیر یا چیتے کے منہ کو انسانی خون لگ جاتا ہے تو سیکڑوں مربع میل تک انسانی بستیوں میں خوف وہراس پھیل جاتا ہے۔

اسی وادی کماؤں میں نینی تال' میسوری' رانی کھیت اور الموڑا جیسے خوب صورت ہل اسٹیشن ہیں جہاں گرمیوں کے موسم میں ہزاروں کی تعداد میں سیاح سیر و تفریح کے لیے آتے ہیں۔

اس بستی سے رانی کھیت تک پختہ سڑک تھی۔ دن کی روشنی میں جنگل سے آئے ہوئے پہاڑی راستوں پر سفر کرتے ہوئے واقعی مزہ آگیا۔

ہمالیہ کی تراشیوں میں تقریباً آٹھ ہزار فٹ کی بلندی پر واقع رانی کھیت رشی کیش سے زیادہ بڑا نہیں تھا۔ اونچی نیچی سڑکیں' بکھری ہوئی پختہ اور لکڑی کے تختوں سے بنی ہوئی عمارتیں' ایک دو مختصر شاپنگ سینٹرز' ریسٹورنٹ اور گیسٹ ہاؤسز۔ سب سے زیادہ بارونق جگہ لاری اڈا تھا جس کے اطراف میں شاپنگ سینٹرز بھی تھے۔

میں نے ایک ریسٹورنٹ کے سامنے کار روک لی اور ہم دونوں اتر کر ریسٹورنٹ میں آگئے۔ موسم میں خنکی تھی۔ اگرچہ دھوپ چڑھ آئی تھی مگر زیادہ رونق نہیں تھی۔ ایسی جگہوں پر تو لوگ آرام سے سو کر اٹھتے ہیں اور نو بجے کے بعد ہی بازاروں میں رونق نظر آنے لگتی ہے۔

ناشتے کے بعد ہم نے تقریباً ایک گھنٹے تک اسی ریسٹورنٹ میں بیٹھ کر آرام کیا۔ رات بھر کے سفر نے مجھے بری طرح تھکا دیا تھا۔ بلا بھی اگرچہ راستے میں اونگھتی رہی تھی لیکن تھکن اس کے چہرے سے بھی ظاہر تھی۔

ایک پیٹرول پمپ سے میں نے نہ صرف کار کی ٹینکی فل کروالی بلکہ دونوں خالی کین بھی بھروا کر ڈکی میں رکھ لیے۔ اب مجھے افسوس ہورہا تھا کہ میں نے تیسرا کین جنگل میں کیوں پھینک دیا تھا۔

اس پیٹرول پمپ سے ہمیں معلوم ہوگیا کہ الموڑا وہاں سے تقریباً دو گھنٹوں کی مسافت پر ہے اور سڑک پختہ ہے۔ راستے میں لب سڑک کچھ بستیاں بھی ہیں جہاں سے ہمیں ضرورت کی چیزیں مل سکتی ہیں۔

پیٹرول پمپ سے نکل کر بتائے ہوئے راستوں پر کار دوڑاتا ہوا میں الموڑا کی طرف جانے والی شاہراہ پر آگیا اور رفتار بڑھادی۔

اس سڑک پر کوئی ماہر ڈرائیور ہی گاڑی چلا سکتا تھا۔ میں روپ متی کا شکر گزار تھا کہ اس نے جے پور میں مجھے ڈرائیونگ سکھادی تھی۔ اگر میں نے اس کی بات نہ مانی ہوتی تو اس وقت میں دیش مکھ کے تعاقب میں یہاں تک نہیں آسکتا تھا۔ سڑک پر بعض جگہ عمودی چٹانیں اور دوسری طرف سیکڑوں فٹ گہرے کھڈ تھے۔ موڑا ایسے خطرناک کہ ذرا سی غلطی تحت الثریٰ میں پہنچا سکتی تھی۔ میں رات بھر کا جاگا ہوا تھا۔ دماغ میں دھماکے سے ہورہے تھے۔ مسلسل سیٹ پر بیٹھے رہنے سے کمر تختے کی طرح اکڑی ہوئی تھی۔ اگر ہم رانی کھیت کے ریسٹورنٹ میں گھنٹا بھر آرام نہ کرتے تو میرے لیے گاڑی چلانا مشکل ہوجاتا۔ میں ہلکی رفتار سے اور بہت محتاط ہوکر کار چلا رہا تھا۔ اس طرح ہم نے یہ فاصلہ دو کے بجائے ڈھائی گھنٹوں میں طے کیا۔ الموڑا میں داخل ہوتے ہی میں نے ایک گیسٹ ہاؤس کے سامنے کار روک لی۔

میرا خیال تھا کہ ہم یہاں چائے وغیرہ پی کر تازہ دم ہوں گے اور پھر دیش مکھ کی تلاش میں نکل کھڑے ہوں گے لیکن بلا بضد تھی کہ ہمیں چند گھنٹے یہاں ضرور آرام کرنا چاہیے اور پھر یہ ہماری خوش قسمتی تھی کہ ہمیں ایک کمرا بھی مل گیا جو اسی وقت خالی ہوا تھا۔

بلا نے ٹھیک کہا تھا۔ مجھے آرام کی اشد ضرورت تھی۔ کمرے میں آتے ہی میں بستر پر گرا تو پھر مجھے ہوش نہیں رہا۔

میری آنکھ سہ پہر چار بجے کھلی تھی۔ بلا بھی میرے بستر پر گہری نیند سو رہی تھی۔ میں چند منٹ بستر پر لیٹا چھت کو گھورتا رہا پھر اٹھ کر باتھ روم میں گھس گیا۔ اس وقت بھی بدن کا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا۔

میں کافی دیر گرم پانی کے شاور کے نیچے کھڑا رہا۔ گرم پانی سے جسم کی تکور ہورہی تھی اور بڑا سکون مل رہا تھا۔

میں کپڑے پہن کر باہر آیا تو بلا بھی جاگ گئی تھی۔ وہ بیڈ پر بیٹھی متوحش نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں سرخ ہورہی تھیں اور لگتا تھا جیسے اس کے دماغ پر اب بھی نیند کا خمار طاری ہو۔

"تم کہاں چلے گئے تھے۔ میں تو پریشان ہوگئی تھی۔" اس کا لہجہ کبھی خوابیدہ سا تھا۔

"میں تو یہیں تھا۔ تم شاید کہیں اور پہنچی ہوئی ہو۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "تمہارا پیراب کیسا ہے؟"

"اب تو ٹھیک ہے۔ کوئی تکلیف بھی نہیں ہو رہی۔" وہ پیر کو پکڑ کر اِدھر اُدھر موڑنے لگی "میرا خیال ہے کوئی نس چڑھ گئی تھی۔ مالش اور آرام کرنے سے ٹھیک ہو گیا۔ اب بالکل تکلیف نہیں ہو رہی۔"

"اچھا تو اب بہت آرام ہو چکا۔" میں نے کہا "پانی گرم ہے۔ تم بھی نہالو۔ کسل مندی دور ہو جائے گی پھر ہم شوبھا کی تلاش میں نکلیں گے۔"

بلا کچھ دیر بیڈ پر پڑی اینٹھتی رہی اور پھر اتر کر باتھ روم کی طرف چل پڑی۔ میں گہری نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کا پیر بالکل سیدھا پڑ رہا تھا اور میرا خیال ہے اس میں اب کوئی تکلیف بھی نہیں رہی تھی۔

بلا جیسے ہی باتھ روم میں گھسی میں کمرے کے ایک کونے میں آلتی پالتی مار کر مراقبے میں چلا گیا۔ دو دن سے میں نے اپنی یوگا کی مشق نہیں کی تھی اور اس ریاضت کو جاری رکھنے کا اب فی الحال کوئی امکان بھی نہیں تھا۔ گرو کی موجودگی کے بغیر میں اس ریاضت کو جاری بھی نہیں رکھنا چاہتا تھا لیکن مراقبہ ایک مختلف چیز تھی۔ اس کی ریاضت تو میں پہلے بھی کر چکا تھا۔

آدھے گھنٹے کے مراقبے سے میں اپنے آپ کو بالکل ہشاش بشاش اور تر و تازہ محسوس کرنے لگا۔ میرے اندر ایک نئی توانائی آ گئی تھی۔ مراقبے کا یہی تو کمال ہے۔ تھوڑی سی ریاضت سے ہی انسان کے اندر چھپی ہوئی توانائیاں انگڑائی لے کر بیدار ہونے لگتی ہیں۔

بلا تیار ہو گئی تھی۔ وہ بھی تازہ کھلے ہوئے گلاب کی طرح کھلی ہوئی لگ رہی تھی۔

ہم کمرے سے نکل کر ڈائننگ روم میں آ گئے۔ یہاں خاصی رونق تھی۔ ہمیں ایک ایسی میز مل گئی جہاں دو عورتیں پہلے ہی سے بیٹھی ہوئی تھیں انہوں نے ہمارے بیٹھنے پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔ ہم نے دوپہر کا کھانا نہیں کھایا تھا۔ اس وقت چائے کے ساتھ بسکٹ وغیرہ پر ہی اکتفا کیا گیا۔

کاؤنٹر پر بل دیتے ہوئے میں کھٹمال جا گیشوری مندر کے بارے میں دریافت کرنے لگا۔ اتفاق سے ہم اسی کے نواح میں تھے اور وہ مندر یہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ زیادہ سے زیادہ ایک میل کا فاصلہ تھا۔

آدھے میل تک تو گاڑی نے ہمارا ساتھ دیا۔ اس سے آگے گاڑی کا راستہ نہیں تھا۔ پہاڑی کے دامن میں بہت سی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ ہم نے بھی کار ایک طرف کھڑی کر دی اور دوسرے لوگوں کے ساتھ پیدل چلنے لگے۔

تنگ سے راستے سے گزر کر پہاڑی کے دوسری طرف کھٹمال جا گیشوری مندر تھا۔ یہ مندر بہت بڑا تھا اور لوگ دور دور سے یاترا کے لیے یہاں آتے تھے لیکن ہمارا رخ مندر کی طرف نہیں تھا۔ ہم مندر کے پہلو میں ایک اور تنگ سے راستے سے گزرتے ہوئے پچھلی طرف آ گئے اور اس طرف کا منظر دیکھ کر مجھے سینے میں سانس رکتا ہوا محسوس ہوا۔

میں نے تھائی لینڈ میں بھی بہت سے حسین قدرتی مناظر دیکھے تھے مگر ہمالیہ کی گود میں یہ منظر دیکھ کر تو مجھے سینے میں سانس رکتا ہوا محسوس ہونے لگا تھا۔

سبزے اور رنگ برنگے پھولوں سے لدی ہوئی پہاڑی پر تقریباً ڈیڑھ سو فٹ کی بلندی سے آبشار گر رہا تھا۔ لگتا تھا جیسے سفید ریشمی چادر اوپر سے نیچے تک پھیلا دی گئی ہو۔ نیچے جہاں پانی گر رہا تھا ایک چھوٹی سی جھیل معرضِ وجود میں آئی تھی اور ایک کشادہ ندی جھیل سے نکل کر نشیب کی طرف بہہ رہی تھی۔ چاروں طرف سبزہ ہی سبزہ تھا۔ لاتعداد لوگ مختلف جگہوں پر ٹولیوں کی صورت میں بیٹھے ہوئے تھے۔ کچھ لوگ ندی کے پانی سے کھیل رہے تھے اور کچھ آبشار کے قریب کھڑے تھے۔

ایک اور دلچسپ منظر یہ تھا کہ جس جگہ آبشار گر رہا تھا وہاں پانی کی چادر کے پیچھے پہاڑی میں ایک تنگ سی کھوہ بنی ہوئی تھی۔ بہت سے لوگ اس پہاڑی کے ساتھ تنگ سے راستے پر چلتے ہوئے پانی کی چادر کے پیچھے اسی کھوہ سے گزر کر جھیل کے دوسری طرف جا رہے تھے۔

اس دلکش منظر کو قدرت کا ایک حسین شاہکار کہا جا سکتا تھا۔ لوگ یہاں تفریح کے لیے آئے ہوئے تھے اور پوری طرح لطف اندوز ہو رہے تھے لیکن ہم پکنک منانے کے لیے نہیں آئے تھے۔ ہمیں اس کائیچ کی تلاش تھی جہاں دیش کھ چھپا بیٹھا تھا۔

آبشار کے گرد و نواح میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر کئی کائیچ تھے۔ بعض کائیچ تو باقاعدہ بنگلوں کی طرح تھے۔ ان کی تعمیر بھی پختہ تھی اور ان کے اردگرد باؤنڈری وال بھی تھی۔

میں اور بلا سرخ چھت اور نیلی دیواروں والا کائیچ تلاش کرتے رہے۔ مختلف جگہوں پر سرخ کھپریل والے دو تین کائیچ نظر آئے تھے مگر ایسا کوئی کائیچ دکھائی نہیں دیا تھا جس کی دیواریں بھی نیلی ہوں۔

اس وقت سورج غروب ہو رہا تھا۔ دن کی روشنی دم توڑنے لگی۔ تفریح اور پکنک کے لیے آئے ہوئے لوگ واپس جانے لگے۔ بلا نے بھی واپسی کی تکرار شروع کر دی لیکن میں اس وقت تک اپنی تلاش جاری رکھنا چاہتا تھا جب تک دن کی روشنی ساتھ دے رہی تھی۔

میں جھیل سے نکلنے والی ندی کے ساتھ ساتھ نشیب کی طرف چلنے لگا۔ تقریباً سو گز آگے ایک پُلیا تھی۔ یہ کوئی باقاعدہ پلیا نہیں تھی۔ درختوں کے دو موٹے تنے ساتھ ساتھ ندی پر ڈال کر ان پر مٹی ڈال دی گئی تھی۔ اس طرح پیدل چلنے والوں کے لیے ندی کے اوپر ایک گزرگاہ سی بن گئی تھی جسے بہرحال پُلیا بھی کہا جا سکتا تھا۔

ندی کے دوسری طرف بھی تھوڑے تھوڑے فاصلے پر کائیچ اور بنگلے تھے لیکن اب اندھیرا گہرا ہو گیا تھا۔ بعض کائیچ اور بنگلوں کی کھڑکیوں میں روشنی نظر آنے لگی تھی لیکن باہر کی تاریک فضا میں مطلوبہ کائیچ کی تلاش جاری رکھنا ممکن نہیں تھا۔

ہم ندی کے ساتھ ساتھ چلتے رہے۔ کھٹمال مندر بائیں طرف پیچھے رہ گیا تھا۔ مندر کے گنبد پر سرخ بتی جل رہی تھی اور گیٹ کی روشنیاں بھی یہاں سے دکھائی دے رہی تھیں۔

دو سو گز مزید آگے چلنے کے بعد ندی پر ایک کشادہ اور پختہ پلیا نظر آئی جس پر سے دو کاریں پہلو بہ پہلو آسانی سے گزر سکتی تھیں۔ اس کے دونوں طرف کشادہ راستے تھے۔ انہیں پختہ سڑک نہیں کہا جا سکتا تھا مگر گاڑیوں کی بکثرت آمدورفت سے سڑک کی طرح ایک باقاعدہ اور پختہ راستہ بن گیا تھا۔ ہم پُلیا پار کر کے دوسری طرف آ گئے اور اس کشادہ راستے پر چلتے رہے۔ اس دوران ایک ہمارے عقب سے اور دو سامنے سے آنے والی گاڑیاں بھی قریب سے گزری تھیں۔ بتدریج بلندی کی طرف جاتا ہوا یہ راستہ پہاڑی کے اوپر سے گھوم کر بہت آگے اس سڑک سے جا ملا تھا جو شہر سے مندر والی پہاڑی کی طرف چلی گئی تھی۔ ہماری گاڑی اس پہاڑی کے دوسری طرف تھی۔

بلا تھک گئی تھی۔ اس کا سانس پھول گیا تھا۔ مسلسل چلتے رہنے سے اس کے پیر میں بھی تکلیف شروع ہو گئی تھی۔ میں اسے سہارا دے کر چلاتا ہوا اس پتھریلے میدان میں آ گیا جہاں ہماری کار کھڑی تھی۔

مندر اور آبشار کی طرف سے آنے والے بہت سے لوگ واپس جا چکے تھے لیکن تین چار گاڑیاں اب بھی موجود تھیں۔ میں اپنی کار کے قریب رک کر چاروں طرف دیکھنے لگا۔ اب صورتِ حال میری سمجھ میں آ گئی تھی۔ مندر اور آبشار کی طرف جانے والا اصل راستہ وہی تھا جس طرف سے ہم واپس آئے تھے۔ پلیا والا راستہ تو ندی کے دوسری طرف بکھرے ہوئے کائیچ اور بنگلوں کی طرف چلا جاتا تھا لیکن پلیا سے پہلے ایک کشادہ راستہ مندر اور آبشار کی طرف بھی جاتا تھا۔ اس طرف کے کائیچ میں رہنے والے وہی راستہ استعمال کرتے ہوں گے۔ جس راستے سے ہم آبشار تک گئے تھے وہ اگرچہ قریب پڑتا تھا لیکن اس طرف سے گاڑی نہیں جا سکتی تھی۔

ہم گیسٹ ہاؤس واپس آ گئے۔ تقریباً تین گھنٹے اونچے نیچے راستوں پر پیدل چلتے رہنے سے بلا کے پیر میں ہلکی سی تکلیف شروع ہو گئی تھی۔ وہ بیڈ پر بیٹھی ایک ہاتھ سے ہولے ہولے پیر کو دبا رہی تھی۔ میں نے تھیلے میں سے مرہم کی ڈبیا نکال لی اور اس کے سامنے بیڈ پر بیٹھ گیا۔

"لاؤ۔ تمہارے پیر پر مالش کر دوں۔" میں نے کہا "مجھے خیال نہیں رہا تھا۔ تمہیں اتنا زیادہ نہیں چلنا چاہیے تھا۔"

بلا نے خاموشی سے وہ پیر آگے کر دیا۔ میں نے ڈبیا کھول کر انگلی پر مرہم لگایا اور اس کے ٹخنے کے آس پاس ملنے لگا۔ بلا نے شلوار کا پانچا اوپر کھینچ لیا۔ میں اب چاروں انگلیوں سے مالش کر رہا تھا۔ پیر کے اوپر، جہاں پانچوں انگلیوں کے جوڑ ملتے ہیں، ٹخنے پر دونوں طرف اور ذرا اوپر پنڈلی کی طرف۔ بلا کے منہ سے ہلکی ہلکی سسکاریاں سی نکل رہی تھیں۔ میں یہی سمجھ رہا تھا کہ ہاتھ کے دباؤ سے اسے تکلیف محسوس ہو رہی ہے اور پھر اس نے میرے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا۔

"کیا ہوا....؟" میں نے نظریں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا اور دوسرے ہی لمحے مجھے چونک جانا پڑا۔

بلا کے چہرے پر سنسنی کے عجیب سے تاثرات تھے اور آنکھوں میں سرخی کے ڈورے تیر رہے تھے۔ اس نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا اور آگے میری طرف جھکنے لگی۔ میں نے اس کے دونوں بازو پکڑ کر اسے جھنجوڑ دیا۔

"ہوش میں آؤ بلا اور پیروں پر کمبل ڈال لو تاکہ ہوا نہ لگے۔" میں بیڈ سے اتر کر کھڑا ہو گیا "میں ہاتھ دھو کر چائے منگواتا ہوں۔ تھوڑی دیر آرام کریں گے اور پھر نو بجے کے قریب کھانا کھانے کے لیے چلیں گے۔ کھانا ہم یہاں نہیں کسی ریسٹورنٹ میں کھائیں گے۔"

بلا کے منہ سے گہرا سانس نکل گیا۔ اس نے خشمگیں نظروں سے میری طرف دیکھا اور کمبل اپنے اوپر کھینچ کر بیڈ کی پشت سے ٹیک لگا لی۔ میں اس کے غصے کو نظرانداز کرتا

ہوا باتھ روم میں گھس گیا۔

ویٹر کو کمرے میں بُلانے کے لیے کوئی بیل وغیرہ نہیں تھی۔ چائے کا آرڈر دینے کے لیے مجھے خود ہی کاؤنٹر پر جانا پڑا۔ کاؤنٹر پر اس وقت ایک خوب صورت عورت بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کی عمر تیس بتیس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ اس کی رنگت اگرچہ سانولی تھی مگر چہرے کے نقوش بڑے غضب کے تھے۔ بڑا چارم تھا اس میں۔

میں اس سے باتیں کرنے لگا۔ وہ وادی کماؤں کے بارے میں بتا رہی تھی۔

"یہ دنیا کی خوب صورت ترین وادی ہے۔" وہ کہہ رہی تھی "یہاں کئی ہل اسٹیشن ہیں جہاں گرمیوں میں خوب رونق رہتی ہے۔ یہاں سے آگے کوشانی' بیچ ناتھ اور اس سے آگے دھیکوری اور دیوال کی طرف نکل جاؤ تو پندوری گلیشیر اور پچیس ہزار چھ سو پچیس فٹ بلند نندا دیوی کی برف پوش چوٹی کا نظارہ کیا جاسکتا ہے۔ کماؤں وادی کے گھنے جنگلات شیروں' چیتوں اور دوسرے خطرناک درندوں سے بھرے ہوئے ہیں۔ ان جنگلوں کے ساتھ جم کارٹ کا نام بھی زندہ رہے گا۔ جم کارٹ کو جانتے ہو نا؟"

"نہیں میڈم!" میں نے نفی میں سر ہلا دیا "بدقسمتی سے میں اس نام سے واقف نہیں ہوں۔ کیا یہ بہت بڑی شخصیت ہے؟"

"جم کارٹ شکاری ہے۔" اس عورت نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "آدم خور شیروں کا شکار اس کی ہابی ہے۔ کماؤں وادی اس کی شکارگاہ ہے۔ وہ درجنوں خوں خوار اور آدم خور شیروں کو ہلاک کرچکا ہے۔ کماؤں وادی میں لاتعداد چھوٹی چھوٹی بستیاں ہیں۔ جہاں کے لوگ جم کارٹ کو دیوتا سمان سمجھتے ہیں۔"

"کیا آپ کبھی اس شخص سے ملی ہیں۔ میرا مطلب ہے جم کارٹ سے۔" میں نے پوچھا۔

"کئی مرتبہ۔" اس نے مسکرا کر جواب دیا "وہ اکثر یہاں آتا رہتا ہے۔ کیا تمہیں بھی شکار سے دلچسپی ہے؟"

"ہاں لیکن میں کسی اور قسم کا شکار کرتا ہو۔" میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "جس طرح جم کارٹ اپنے شکار کا دور تک پیچھا کرتا ہوگا اسی طرح میں بھی اپنے شکار کا دور بلکہ بہت دور تک پیچھا کرتا ہوں۔ ابھی کچھ دن پہلے میں نے ایک شکار کیا ہے جس کا میں کئی سال سے پیچھا کر رہا تھا۔"

"اوہ!" اس نے دلچسپی لیتے ہوئے کہا "وہ کون سا درندہ تھا جس کا تم کئی ورشوں سے پیچھا کرتے رہے۔"

"بدروح! میں بدروحوں کا شکاری ہوں اور دور تک ان کا پیچھا کرتا ہوں۔" میں نے بدستور مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"اوہ!" اس کا چہرہ دھواں ہوگیا۔

اسی دوران ویٹر نے آکر بتایا کہ چائے میرے کمرے میں پہنچائی جاچکی ہے۔ میں کاؤنٹر پر بیٹھی ہوئی تمکین حسینہ کو الجھن میں مبتلا چھوڑ کر کمرے کی طرف چل پڑا۔ چائے کا کہنے کے بعد میں جان بوجھ کر تھوڑی دیر کے لیے یہاں رکا تھا تاکہ اس دوران بلا کا غصہ فرو ہوجائے۔

میں کمرے میں آیا تو چائے کی ٹرے تپائی پر رکھی ہوئی تھی اور بلا اسی طرح بیڈ کی پشت سے ٹیک لگائے بیٹھی ہوئی تھی۔ میں نے کرسی پر بیٹھ کر چائے بنائی۔ کیتلی اور دودھ دانی میز پر رکھ دی۔ دونوں کپ ٹرے میں رکھے اور ٹرے اٹھا کر بلا کے سامنے بیڈ پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا اور ایک کپ اٹھا کر بلا کی طرف بڑھا دیا۔

"لو چائے پیو۔" میں نے کہا "گرم ہونے کے باوجود چائے کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ اس سے دماغ میں بھرے ہوئے بخارات ٹھنڈے ہوجاتے ہیں۔"

"تم بہت ستاتے ہو مجھے۔" بلا نے کپ لیتے ہوئے کہا۔ اس کے لہجے میں شکوے کی جھلک نمایاں تھی۔

"دیکھو بلا۔" میں نے اپنا کپ اٹھاتے ہوئے کہا "ایک روز جے پور میں' میں نے تمہیں سمجھانے کی کوشش کی تھی۔ میں جانتا ہوں تم مجھے بہت چاہتی ہو مگر چاہت کی انتہا جاسوس کا اتصال تو نہیں۔ یہ تو ایک بہت پوتر جذبہ ہے۔ ان جذبوں میں لغویت کے لیے کوئی جگہ نہیں ہوتی۔ ایک بار کھوٹ آجائے تو سب کچھ ختم ہوجاتا ہے۔ ہم ایک دوسرے کے دوست بن کر رہ سکتے ہیں اور دوستی کے جذبے تو پریم سے بھی زیادہ پوتر ہوتے ہیں۔ اگر تم اس جذبے کا اظہار کرو گی تو تمہیں مجھ سے کوئی شکایت نہیں ہوگی۔"

میں بولتا رہا اور بلا خاموشی سے سنتی رہی۔ چائے ختم ہونے کے بعد میں نے خالی کپ اس سے لے کر ٹرے میں رکھ دیا تھا۔ اس کے بعد بھی میں اس کے سامنے بیٹھا باتیں کرتا رہا اور پھر دروازے پر دستک کی ہلکی سی آواز سن کر میں بیڈ سے اٹھ گیا۔

وہ ویٹر تھا جو خالی برتن لینے کے لیے آیا تھا۔ ویٹر کے جانے کے بعد میں نے دروازہ بند کردیا اور بلا کے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔ میری باتوں سے بلا کے چہرے کا رنگ بدلنے لگا۔ اس کے چہرے پر خشونت غائب ہوگئی اور وہ پھر

پہلے کی طرح چہکنے لگی۔

ساڑھے نو بجے کے قریب ہم تیار ہو کر کمرے سے نکل آئے۔ بلا تین دن سے وہی کپڑے پہنے ہوئے تھی اور میرے کہنے پر اس نے کپڑے بدل لیے تھے۔ اس راجستھانی لباس میں بھی وہ اچھی لگ رہی تھی۔

میں نے اگرچہ رانی کھیت میں کار کی ٹینکی فل کروالی تھی۔ پانچ پانچ گیلن کے دو بھرے ہوئے کین بھی ڈکی میں رکھے ہوئے تھے لیکن ایک پیٹرول پمپ دیکھ کر میں نے کار روک لی اور رانی کھیت سے یہاں تک جتنا پیٹرول استعمال ہوا تھا اتنا ہی ٹینکی میں ڈلوالیا۔

ہم کافی دیر تک مختلف سڑکوں پر گھومتے رہے۔ موسم میں خنکی ہونے کے باوجود شاپنگ سینٹروں پر خاصی گہما گہمی تھی۔

میں نے ایک ریسٹورنٹ کے سامنے کار روک لی اور ہم نیچے اُتر کر ریسٹورنٹ میں داخل ہوگئے۔ ریسٹورنٹ کے اندر کی فضا خاصی خوشگوار تھی۔ تمام میزیں بھری ہوئی تھیں۔ بعض میزیں ایسی تھیں جن پر ..... ایک یا دو سیٹیں خالی تھیں۔ دائیں طرف والی میز سے ایک آدمی اور دو عورتیں اٹھیں تو ہم نے آگے بڑھ کر اس میز پر قبضہ کرلیا اور ویٹر کو بلا کر کھانے کا آرڈر دے دیا۔

میرا رخ دروازے کی طرف تھا۔ ہم کھانا کھا رہے تھے کہ ایک آدمی دروازے میں داخل ہو کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا اور پھر ایک ایسی میز کی طرف بڑھ گیا جہاں ایک کرسی خالی تھی۔ کرسی گھسیٹ کر بیٹھتے ہوئے اس نے ایک بار پھر اِدھر اُدھر دیکھا۔ اس مرتبہ اس کی نظریں میری طرف بھی اٹھ گئیں۔ نجانے کیا بات تھی کہ مجھے دیکھتے ہی اس کے چہرے کا رنگ متغیر ہوگیا لیکن اس نے فوراً ہی اپنی کیفیت پر قابو پالیا تھا۔

کرسی پر بیٹھنے کے بعد بھی وہ کن انکھیوں سے بار بار میری طرف دیکھ رہا تھا۔ مجھے اس پر شبہ ہوا۔ کوئی بات ضرور تھی جو مجھے دیکھ کر وہ شخص بدحواس ہو رہا تھا۔ اسی دوران ویٹر نے اس کے سامنے چائے رکھ دی تھی۔ اس نے کپ اٹھایا تو اس کے ہاتھ میں ہلکی سی کپکپاہٹ تھی۔ چائے چھلک گئی۔ اس نے کپ دوبارہ پرچ میں رکھ دیا اور ایک بار پھر کن انکھیوں سے میری طرف دیکھنے لگا۔

شکل صورت سے تو وہ کوئی اچھا آدمی نہیں لگتا تھا لیکن مجھے حیرت تھی کہ مجھے دیکھ کر وہ خوف زدہ کیوں ہوگیا تھا جیسے اس نے بھوت دیکھ لیا ہو۔

اس میز پر دو عورتیں اور ایک ادھیڑ عمر آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ انہوں نے بھی اس شخص کی کیفیت بھانپ لی تھی۔ ادھیڑ عمر آدمی نے آگے جھک کر کچھ کہا بھی تھا جواب میں وہ شخص بڑبڑا کر رہ گیا تھا۔ چائے پیتے ہوئے بھی اس نے دو تین مرتبہ میری طرف دیکھا تھا۔

اچانک میرے دماغ میں جھماکا سا ہوا۔ رشی کیش میں جن لوگوں نے شوبھا کو اغوا کیا تھا ان تمام نے چہروں پر ماسک چڑھا رکھے تھے۔ میں کسی کی شکل نہیں دیکھ سکا تھا۔ ان کے تعاقب میں ہردوار پہنچنے کی اتفاق سے چونگی محرر سے رادھن کے بارے میں پتا چل گیا تھا۔ رادھن کے تین اور آدمی جو ہمارے ہاتھوں مارے گئے تھے وہ بھی رشی کیش کے حملہ آوروں میں شامل تھے اور یہ شخص ... میرا شبہ یقین میں بدل گیا کہ یہ بھی ان لوگوں میں شامل تھا۔ میں اس کا چہرہ نہیں دیکھ سکا تھا لیکن اس نے مجھے پہچان لیا تھا۔ یہ لوگ مجھے مردہ سمجھ کر پھینک آئے تھے اور اب مجھے اپنے سامنے دیکھ کر وہ بدحواس ہو رہا تھا۔ یقیناً یہی بات تھی۔ ورنہ میں کوئی بھوت تو نہیں تھا کہ وہ مجھے دیکھ کر اس طرح خوف زدہ ہوگیا تھا۔

اس شخص نے جلدی جلدی چائے ختم کی اور اپنی سیٹ سے اٹھ گیا۔ کاؤنٹر پر پیسے دے کر باہر نکلتے ہوئے بھی اس نے مڑ کر میری طرف دیکھا تھا۔

"بلا۔" میں نے ٹشو پیپر سے ہاتھ پونچھتے ہوئے کار کی چابیوں کا گچھا اس کی طرف سرکا دیا۔

"وہ آدمی جو ابھی اس ٹیبل سے اٹھ کر گیا ہے مجھے شبہ ہے کہ وہ دیش دروہی کا آدمی ہے اور اس نے مجھے پہچان لیا ہے۔ تم کھانا ختم کر کے گیسٹ ہاؤس چلی جانا۔ میں اس کے پیچھے جا رہا ہوں۔ ہوسکتا ہے مجھے واپسی میں دیر ہوجائے مگر تم پریشان مت ہونا۔"

"مم... میں تمہیں اکیلے نہیں جانے دوں گی۔ میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی۔" بلا نے کہا۔ وہ بھی ایک دم بدحواس ہوگئی تھی۔

"میری بات کو سمجھنے کی کوشش کرو بلا۔" میں نے کہا۔ "پتا نہیں کس قسم کی صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑے۔ تمہارے پیر میں پہلے ہی تکلیف ہے۔ ہوسکتا ہے تم میری مدد کرنے کے بجائے میرے لیے مسئلہ بن جاؤ۔ اس لیے تمہارا جانا ٹھیک نہیں ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ میں غلط سمجھ رہا ہوں اور وہ آدمی کوئی اور ہو۔ ایسی صورت میں..."

"ٹھیک ہے۔ تم جاؤ اور اپنا خیال رکھنا۔" بلا نے کہا۔

میں نے جیب سے کچھ رقم بھی نکال کر بلا کے حوالے

کردی اور سیٹ چھوڑ دی۔ ریسٹورنٹ سے نکلتے ہی میں دروازے کے بالکل ساتھ بنے ہوئے پان سگریٹ کے کیبن کی آڑ میں کھڑا ہوگیا۔ میں نے اس شخص کو زرد رنگ کی شرٹ سے پہچان لیا۔ وہ بائیں طرف تقریباً پچاس گز آگے نکل چکا تھا۔ اس نے ایک دو مرتبہ پیچھے مڑ کر بھی دیکھا تھا۔ میں موقع پاتے ہی دوڑ کر سڑک کے دوسری طرف پہنچ گیا اور لوگوں کی آڑ لیتا ہوا اس کا پیچھا کرنے لگا۔

وہ شخص جلد ہی شہر کی حدود سے نکل گیا۔ اس کا رخ اسی طرف تھا جس طرف ہم دن میں کھنڈال مندر اور آبشار کا چکر لگا کر آئے تھے۔ اس طرف اندھیرا تھا اور مجھے تعاقب کرنے میں آسانی ہورہی تھی۔

وہ اسی کشادہ راستے پر جارہا تھا جس سے ہماری واپسی ہوئی تھی۔ میں اس راستے کے بالکل کنارے بڑے پتھروں اور قدِ آدم پودوں کی آڑ میں چل رہا تھا اور میری یہ احتیاط کام آگئی تھی۔ سامنے مندر والے موڑ سے اچانک ہی ایک کار اس راستے پر مڑی تھی۔ زرد شرٹ والا وہ شخص تو کار کے ہیڈ لیمپس کی روشنی میں آگیا لیکن میں فوراً ہی پودوں میں دبک گیا۔

میں اس وقت تک پودوں کے پیچھے چھپا رہا جب تک وہ کار میرے قریب سے گزر کر دور نہیں نکل گئی۔

میں پودوں کی آڑ سے نکل آیا۔ قدموں کی ہلکی آہٹ بتا رہی تھی کہ وہ شخص اس دوران کافی آگے نکل چکا تھا۔ میں تیز تیز چلنے لگا۔ میرے پیروں میں جو گرز تھے اس لیے آواز زیادہ نہیں اُبھر رہی تھی۔

پُلیا پر پہنچ کر میں رک گیا۔ یہاں گہری تاریکی تھی اور وہ شخص نگاہوں سے اوجھل ہوچکا تھا لیکن قدموں کی ہلکی آہٹ بدستور سنائی دے رہی تھی۔ میں نے اس آواز کا تعاقب شروع کردیا۔

پلیا سے قریب ترین کانچ تقریباً چالیس گز کے فاصلے پر تھا جس کے دروازے پر نہایت مدھم روشنی کا بلب جل رہا تھا۔ اس کی روشنی زیادہ دور تک نہیں پھیل رہی تھی۔

میں اس کانچ کے پہلو سے نکل کر آگے بڑھ گیا۔ قدموں کی آواز بائیں طرف سے آرہی تھی۔ میں بھی اس طرف چلتا رہا اور پھر چند چھوٹے پتھروں کے لڑھکنے کی آواز سنائی دی۔ وہ شخص اصل راستہ چھوڑ کر شارٹ کٹ اختیار کررہا تھا۔

تعاقب کا یہ سلسلہ تقریباً دس منٹ اور جاری رہا اور ایک کانچ کی آڑ سے نکلتے ہی مجھے دوبارہ جھاڑیوں میں دبک جانا پڑا۔ وہ شخص وہاں سے تقریباً تیس گز آگے ایک بنگلے کے گیٹ کے سامنے کھڑا کال بیل کا بٹن دبا رہا تھا۔

بنگلے کے گیٹ پر بلب جل رہا تھا اور اس کی روشنی میں دیوار پر نیلا رنگ دیکھ کر میں دل ہی دل میں مسکرا دیا۔ اس شخص پر میرا شبہ درست ثابت ہوا تھا۔ وہ دیش مکھ کا ہی آدمی تھا اور مجھے دیکھ کر بد حواس ہوگیا تھا۔ وہ اس قدر خوف زدہ ہوا تھا کہ ریسٹورنٹ سے نکل کر سیدھا اس بنگلے پر آیا تھا۔ اس نے شاید مجھے اپنا پیچھا کرتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ سیدھا یہاں نہ آتا۔

کال بیل کی آواز سناٹے میں دور تک پھیل گئی تھی۔ چند منٹ بعد گیٹ کا ذیلی دروازہ کھلا اور وہ شخص تیزی سے اندر داخل ہوگیا۔ ایک منٹ بعد میں نے ایک اور آدمی کو دروازے سے باہر آتے ہوئے دیکھا۔ وہ تقریباً دس منٹ تک وہاں کھڑا اِدھر اُدھر دیکھتا رہا اور پھر سرہلاتا ہوا اندر چلا گیا اور گیٹ بند ہوگیا۔

میں اس کے بعد بھی تقریباً پانچ منٹ تک وہاں کھڑا رہا اور پھر جھاڑیوں سے نکل کر دبے قدموں اس بنگلے کے عقبی سمت بڑھنے لگا۔

بنگلے کی دیوار چھ فٹ سے زیادہ اونچی نہیں تھی۔ پچھلی دیوار پہاڑی سے ملی ہوئی تھی۔ میں اس پہاڑی پر سے ہوتا ہوا دیوار پر آگیا اور بڑی آہستگی سے اندر کی طرف کود گیا۔ اندر کی طرف کیاریاں تھیں اور پودے لگے ہوئے تھے۔ کچی جگہ پر کودنے سے آواز زیادہ نہیں ابھری تھی۔ میں چند لمحے وہاں کھڑا رہا اور پھر گھنگروؤں کی آواز سن کر اچھل پڑا۔ یہ آواز سامنے والے کمرے سے آئی تھی۔ میں دبے قدموں اس طرف بڑھنے لگا اور کھڑکی کے قریب رک گیا۔

کھڑکی کے اندر کی طرف پردہ کھنچا ہوا تھا لیکن ایک کونے سے مجھے جھانکنے کا موقع مل گیا۔ وہ ایک خوب صورت لڑکی تھی جو قالین پر مسند سے ٹیک لگائے بیٹھے ایک شخص پر جھکی ہوئی تھی۔ اس کا چہرہ نظر نہیں آرہا تھا لیکن لڑکی جب سیدھی ہوئی تو اس کے ہاتھ میں شراب کا گلاس تھا جس میں چند گھونٹ بچے تھے۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ وہ لڑکی قالین پر بیٹھے ہوئے شخص کو اپنے ہاتھ سے شراب پلا رہی تھی۔

اس کی عمر بیس اکیس سال کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ خوب صورت نقش و نگار اور رنگت گوری تھی۔ اس نے پائل بھی بہت مختصر سا پہن رکھا تھا۔ اس کے پیروں میں پائل تھیں۔ مجھے اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ میں نے گھنگروؤں کی جو مدھم سی آواز سنی تھی وہ اس پائل کی تھی۔ میں اس شخص کا چہرہ دیکھنے کی کوشش کرتا رہا مگر

کامیاب نہیں ہوسکا۔

میں دبے قدموں دیوار کے ساتھ ساتھ آگے بڑھنے لگا اور گھوم کر دوسری طرف آگیا۔ اس طرف بھی ایک کمرے میں مدھم نیلگوں روشنی نظر آرہی تھی۔ اندر شاید نائٹ بلب جل رہا تھا۔ اس کھڑکی کا پردہ ایک باتھ روم کے قریب ہٹا ہوا تھا۔ میں نے شیشے سے آنکھ لگا دی۔

اندر کا منظر دیکھ کر میں چونک گیا۔ بیڈ پر کوئی عورت سو رہی تھی۔ میں نے غور سے دیکھا تو دل کی دھڑکن خطرناک حد تک تیز ہوگئی۔ کنپٹیاں سلگ اٹھیں۔ مدھم نیلگوں روشنی میں شوبھا کو پہچاننے میں مجھے کوئی دشواری پیش نہیں آئی تھی۔

وہ پشت کے بل بالکل سیدھی لیٹی ہوئی تھی۔ اس کے سینے کا زیرو بم بتا رہا تھا کہ وہ زندہ ہے اور گہری نیند سو رہی ہے۔

میں نے کھڑکی کھولنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہیں ہوسکا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کرنا چاہیے۔ آیا اوپر سے گھوم کر برآمدے والے دروازے سے اندر گھس جاؤں اور شوبھا کو اٹھا کر بھاگ نکلوں لیکن یہ اتنا آسان کام نہیں تھا۔

ہردوار میں رادھن نے مرنے سے پہلے بتایا تھا کہ دیش مکھ کے ساتھ دو آدمی تھے جو راجستھان ہی سے اس کے ساتھ آئے تھے۔ ایک کو تو میں نے دیکھ لیا تھا جس کا تعاقب کرتا ہوا میں یہاں تک آیا تھا اور دوسرا ساتھ والے کمرے میں بیٹھا ہوا اس نیم عریاں عورت کے ہاتھوں سے شراب پی رہا تھا۔ اس کے بارے میں میرا اندازہ تھا کہ وہ دیش مکھ کے سوا اور کوئی نہیں ہوسکتا لیکن تیسرا آدمی ابھی تک میری نظروں میں نہیں آسکا تھا۔

میں ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ ایک دراز قامت آدمی کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں سرنج تھی جس میں بنفشی رنگ کا کوئی سیال بھرا ہوا تھا۔ وہ بیڈ کے قریب رک گیا اور جھک کر سرنج کی سوئی شوبھا کے بازو میں پیوست کردی۔ شوبھا کے جسم میں ذرا بھی حرکت نہیں ہوئی تھی۔ سرنج کا سارا سیال شوبھا کے بازو میں منتقل ہوگیا۔ اس شخص نے انجکشن کی جگہ پر شوبھا کے بازو کو ذرا سا مسلا اور دروازے سے باہر نکل گیا۔

میرے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ شوبھا بے ہوش تھی۔ اسے انجکشنوں کے ذریعے مسلسل بے ہوش رکھا جارہا تھا۔ وہ آدمی چہرے سے کسی طرح بھی ڈاکٹر نہیں لگتا تھا لیکن آج کل تھوڑی سی کوشش سے انجکشن لگانا سیکھا جاسکتا تھا اور ایسے انجکشن بلکہ اس سے بھی زیادہ خطرناک ادویات حاصل کرنا زیادہ مشکل نہیں تھا۔

بہرحال، یہ صورتِ حال میرے لیے خاصی تشویش ناک تھی۔ شوبھا کو بے ہوشی کی حالت میں یہاں سے نکالنا بڑا مشکل تھا..... لیکن ظاہر ہے میں مایوس ہونے کے لیے یہاں نہیں آیا تھا۔ مجھے شوبھا کو ہر صورت میں اس وحشی کے چنگل سے نکالنا تھا۔

میں دبے قدموں چلتا ہوا دوبارہ اس کمرے کی کھڑکی کے سامنے آگیا جہاں اس نیم عریاں لڑکی کو دیکھا تھا۔ اس مرتبہ پردے کی جھری سے آنکھ لگا کر اندر جھانکا تو چونکے بغیر نہیں رہ سکا۔ سامنے ہی زرد شرٹ والا وہ آدمی موجود تھا جس کا تعاقب کرتا ہوا میں یہاں تک پہنچا تھا۔ اس کے ساتھ وہی آدمی تھا جس نے شوبھا کو انجکشن لگایا تھا اور نیم عریاں لباس میں وہ لڑکی تھی جو اس وقت سہمی ہوئی ایک طرف کھڑی تھی۔ پیلی شرٹ والے کے چہرے پر بھی خوف کے تاثرات نمایاں تھے۔

"اتنی دیر تک خاموش کیوں رہے تھے۔ کہاں دیکھا تھا اسے؟" یہ گرجتی ہوئی آواز اس شخص کی تھی جس کا چہرہ میں ابھی تک نہیں دیکھ سکا تھا لیکن میں نے آواز سے اسے پہچان لیا۔ وہ دیش مکھ ہی تھا۔

"ایک ہوٹل میں سرکار۔" اس شخص نے جواب دیا۔

"وہ ایک چھوکری کے ساتھ بھوجن کررہا تھا اور وہ چھوکری....."

"کون تھی وہ؟" دیش مکھ کی آواز گونجی۔

"جے پور کے پنڈت رام سروپ کی بیٹی۔" اس شخص نے جواب دیا۔

"کیا بکواس کررہے ہو۔ بھنگ تو نہیں پی رکھی تم نے؟" دیش مکھ چیختا ہوا آگے آگیا۔ اس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات تھے۔

"میں سچ کہتا ہوں سرکار۔" پیلی شرٹ والے نے جواب دیا "ایک مرتبہ آپ کے کہنے پر ہم نے اسے اٹھانے کی کوشش کی تھی مگر وہ ٹھاکر بھانوت سنگھ کے شرن (پناہ) میں چلی گئی تھی اور اس کے بعد سرکار نے ہی روک دیا تھا کہ اس لونڈیا کو نہ چھیڑا جائے۔ آج تو میں اسے دیکھ کر حیران رہ گیا سرکار۔ وہ اپنے راجستھانی لباس میں تھی اور وہ تو ہیرا ہے

سرکار ہیرا۔ میری مانو تو اسے بھی اٹھوا ہی لیں۔ آپ کو اس کی ضرورت نہیں تو اسے ہمیں دان (تحفے میں دینا) کردینا۔ آخر وہ لونڈیا بھی تو سرکار نے رادھن کو دان کردی تھی۔"

"سمپت۔" دیش مکھ نے دوسرے آدمی کو مخاطب کیا "تم ابھی جاکر پتا کرو کہ وہ کہاں ٹھہرا ہوا ہے اور اس کے ساتھ اور کون کون لوگ ہیں۔ اگر وہ اکیلا ہو تو ختم کردو اسے اور بلا کو اٹھا لاؤ یہاں۔ سارے ہوٹل اور گیسٹ ہاؤسز چھان مارو۔ وہ کہیں نہ کہیں مل جائے گا اور پران تم۔" وہ پہلی شرٹ والے کی طرف گھوم گیا۔

میرا خون کھول اٹھا تھا۔ میں یہ نہیں سن سکا کہ اس نے پران سے کیا کہا تھا۔ میں نے جھک کر پتلون کے پائنچے کے نیچے پنڈلی پر بندھا ہوا خنجر نکالا اور اس کا دستہ زور سے کھڑکی کے شیشے پر دے مارا۔

چھناکے کی زور دار آواز ابھری۔ شیشہ چکنا چور ہو کر بکھر گیا۔ میں نے بڑی پھرتی سے ٹوٹے ہوئے شیشے کے اندر ہاتھ ڈال کر چٹخنی ہٹادی اور کھڑکی کھول کر پردہ ایک طرف کھینچ دیا اور دونوں ہاتھ چوکھٹ پر ٹکا کر بڑی پھرتی سے اوپر چڑھ گیا۔

"نہیں دیش مکھ۔ میری تلاش میں کہیں جانے کی ضرورت نہیں۔ میں خود یہاں موجود ہوں۔" میں نے چیختے ہوئے کہا۔

یہ سب کچھ ایک سیکنڈ میں ہوگیا تھا۔ وہ سب بدحواس ہو کر کھڑکی کی طرف دیکھنے لگے۔

"پکڑو اسے۔ مار ڈالو۔ زندہ نہ بچ کر جائے۔" دیش مکھ چیخا اور اس نے خود باہر نکلنے کے لیے دروازے کی طرف سرکنا شروع کردیا تھا۔

میں نے کھڑکی پر سے چھلانگ لگا دی۔ میرا اندازہ کسی قدر غلط نکلا۔ میں دیش مکھ کے اوپر تو نہیں گرا لیکن میری لات اس کے کولھے پر لگی تھی۔ وہ چیختا ہوا لڑکھڑا کر گر گیا۔

میں فوراً ہی سنبھل گیا لیکن اس دوران پران اور سمپت میرے اوپر چھلانگ لگا چکے تھے۔ سمپت نے میرے خنجر والے ہاتھ کو پکڑ کر زور دار جھٹکا دیا۔ خنجر میرے ہاتھ سے نکل گیا لیکن اس کے فوراً بعد میں نے خود کو ان کی گرفت سے چھڑالیا اور پران کو اٹھا کر ایک طرف پھینک دیا۔ پران اس لڑکی پر گرا جو ایک طرف سہمی کھڑی تھی۔ وہ خوف ناک انداز میں چیختے ہوئے پران کے ساتھ ہی نیچے گری۔ میں سنبھلنے کی کوشش کررہا تھا کہ سمپت نے میرے اوپر چھلانگ لگا دی اور مجھے دھکیلتا ہوا دیوار تک لے گیا۔ میرا سر دیوار سے ٹکرایا اور دماغ جھنجنا اٹھا۔ میں نے دونوں ہاتھ اس کے گلے پر جمادیے اور اسے پیچھے دھکیلنے کی کوشش کرنے لگا لیکن وہ چٹان کی طرح اپنی جگہ پر جما ہوا تھا۔ میں نے اس کی ٹانگوں کے بیچ گھٹنے سے زور دار ضرب لگائی۔ وہ اچھل پڑا۔ مجھے اپنے آپ کو اس کی گرفت سے چھڑانے کا موقع مل گیا۔

دیش مکھ زمین پر پڑا ہوا تھا۔ اس نے اٹھ کر دروازے کی طرف بھاگنے کی کوشش کی تو میں نے اس پر چھلانگ لگا دی۔ اس کی ٹانگ میرے ہاتھ میں آگئی تھی لیکن اسی وقت پران اور سمپت نے بیک وقت میرے اوپر چھلانگ لگادی۔

میں نے لوٹ لگا کر بچنے کی کوشش کی تھی لیکن سمپت نے مجھے چھاپ لیا۔ وہ مجھے بُری طرح رگید رہا تھا۔ ایک موقع پر مجھے داؤ لگانے کا موقع مل گیا۔ میں نے ایک ٹانگ سمیٹ کر پیر اس کے پیٹ پر جمادیا اور اسے آہستہ آہستہ اوپر اٹھانے لگا۔ مجھے مایوسی نہیں ہوئی۔ میں نے اسے پوری قوت سے اچھال دیا۔ وہ دیوار سے ٹکرا کر گرا۔ قریب ہی وہ لڑکی بھی دیوار کے ساتھ سہمی کھڑی تھی اس نے اپنے دونوں بازو سینے پر لپیٹ رکھے تھے اور اس کے منہ سے خوف زدہ آوازیں نکل رہی تھیں۔

دیش مکھ اور پران کمرے سے نکل چکے تھے۔ میں نے اٹھ کر دروازے کی طرف چھلانگ لگانے کی کوشش کی تو سمپت نے میرے اوپر چھلانگ لگا دی۔ اس نے پشت کی طرف سے بایاں بازو میرے گلے پر لپیٹ دیا تھا اور دائیں ہاتھ سے میرے پہلو پر زور دار گھونسے مار رہا تھا۔ ہر ضرب مجھے براہِ راست گردے پر لگتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

میں نے اپنے دونوں ہاتھ اس کے بازو پر جمادیے اور گلے پر اس کی گرفت ڈھیلی کرنے کی کوشش کرنے لگا لیکن اس کی گرفت خاصی مضبوط تھی۔ میرا نرخرا دب رہا تھا اور سینے میں سانس رکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ میں اس کے بازو پر دونوں ہاتھ جمائے آہستہ آہستہ آگے جھکنے لگا۔ اسی طرح سمپت میری پشت پر لدتا چلا گیا اور پھر میں گھٹنوں کو جھکاتا ہوا ایک جھٹکے سے آگے جھکا۔ سمپت میرے اوپر سے قلا بازی کھاتا ہوا پشت کے بل نیچے گرا۔ میں ایک ہاتھ سے گلا سہلاتا ہوا بڑی تیزی سے اٹھ گیا لیکن سمپت نے لیٹے لیٹے ٹانگ چلادی۔ ٹھوکر میرے گھٹنے کے پیچھے لگی اور میں بھد سے نیچے گر گیا۔

اسی وقت باہر کسی گاڑی کا انجن اسٹارٹ ہونے اور بنگلے کا گیٹ کھلنے کی آواز سنائی دی۔ دیش مکھ بھاگ رہا تھا۔ میں نے دروازے کی طرف چھلانگ لگائی تو سمپت مجھ سے

لپٹ گیا۔

ہم ایک بار پھر ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہوگئے۔ میں اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کررہا تھا لیکن وہ کم بخت جونک کی طرح مجھ سے لپٹا ہوا تھا۔ میں نے کہنی سے اس کے سر پر دو تین ضربیں لگائیں۔ اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ میں اسے ایک طرف دھکیل کر اٹھ گیا لیکن سمپت نے بھی اٹھنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔ وہ ایک بار پھر میری طرف جھپٹا۔ اس مرتبہ میں نے بڑی تیزی سے نیچے جھک کر اسے ہاتھوں پر اٹھالیا اور سر سے اوپر لے جاکر پوری قوت سے اچھال دیا۔

نیچے گرتے ہوئے سمپت کا سر دیوار سے ٹکرایا۔ اس کے منہ سے خوفناک چیخ نکلی اور وہ زمین پر ڈھیر ہوگیا۔

میں نے باہر کی طرف دوڑ لگا دی۔ جب میں برآمدے والے دروازے سے نکلا تو سرخ رنگ کی ایک کار بنگلے کے گیٹ سے نکل رہی تھی۔ میں نے اس کے پیچھے دوڑ لگا دی لیکن کار بڑی تیزی سے آگے بڑھ گئی تھی اور جب میں گیٹ پر پہنچا تو کار تیز رفتاری سے دوڑتی ہوئی تقریباً پچاس گز دور جاچکی تھی اور اس کی عقبی سرخ بتیاں لحہ بہ لحہ دور ہوتی جارہی تھیں۔ کار کے پیچھے بھاگنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ میں نے مڑ کر برآمدے کی طرف دوڑ لگا دی۔

اور جب میں شوبھا والے کمرے میں داخل ہوا تو ایک جھٹکے سے رک گیا۔ مجھے اپنا دل کنپٹیوں میں دھڑکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ بیڈ خالی تھا۔ وہ کم بخت دیش مکھ شوبھا کو کار میں ڈال کرلے گیا تھا۔

میں آہٹ سن کر ایک دم پلٹ پڑا۔ اگر مجھے ایک لمحے کی بھی تاخیر ہوجاتی تو میری زندگی کا خاتمہ ہوچکا ہوتا۔ سمپت خنجر تانے دہاڑتا ہوا میری طرف لپکا تھا۔ اس کا سر اور چہرہ خون میں تر ہو رہا تھا۔

اس کے ہاتھ میں میرا ہی خنجر تھا۔ اس نے جیسے ہی حملہ کیا میں نے اس کا وار روک لیا۔ اس کی کلائی میرے دونوں ہاتھوں کی گرفت میں آگئی۔ میں نے پوری قوت سے بائیں طرف جھکائی دیتے ہوئے زور دار جھٹکا دیا۔ وہ لڑکھڑا کر بیڈ پر گرا۔ خنجر بھی اس کے ہاتھ سے نکل گیا تھا۔

میں نے سمپت کو ہلنے کا موقع نہیں دیا اور بیڈ پر چڑھ کر اس کی گردن دبوچ لی۔

"وہ کہاں گئے ہیں۔ جلدی بتاؤ ورنہ میں تمہاری گردن مروڑ دوں گا۔" میرے حلق سے غراہٹ سی نکلی۔

سمپت مجھ سے زیادہ قد آور اور طاقت ور تھا لیکن اس کی گردن میرے مخصوص داؤ کی گرفت میں تھی۔ وہ اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کرتا رہا مگر کامیاب نہیں ہوسکا۔ میں نے اس کی گردن کو ہلکا سا جھٹکا دیا۔ وہ چیخ اٹھا۔

"میں تمہیں صرف ایک منٹ دے رہا ہوں۔" میں ایک بار پھر غرایا "بتاؤ وہ کہاں گیا ہے۔ ورنہ ایک ہی جھٹکا۔۔۔"

"بب۔۔۔ بتاتا ہوں۔" وہ چیخا۔

میں نے اس کی گردن پر دباؤ ذرا سا کم کردیا۔

"تت۔۔۔ تمہیں کیسے پتا چلا تھا کہ دیش مکھ یہاں ہے۔۔۔" وہ رک رک کر بولا۔

"یہ میرے سوال کا جواب نہیں۔" میں نے کہا "لیکن میں تمہاری یہ خواہش پوری کردینے میں کوئی حرج بھی نہیں سمجھتا۔ سب سے پہلے میں نے ہردوار میں رادھن کا سراغ لگایا۔ وہ بھی اپنے آپ کو بہت بڑا بدمعاش سمجھتا تھا اس نے سونیا کو مار دیا۔ وہی لڑکی جو دیش مکھ نے اس کے حوالے کی تھی۔ میں سونیا کی موت کا اصل ذمے دار دیش مکھ کو ہی سمجھتا ہوں اور اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ رادھن نے بھی تمہاری طرح اڑی کی تھی۔ اسے اپنے گرگوں پر بڑا گھمنڈ تھا لیکن تین آدمی ضائع کرانے کے بعد اس نے بتایا کہ تم لوگ اس طرف آئے ہو۔ ہم دونوں رات بھر جنگلوں اور پہاڑوں میں سفر کرتے ہوئے آج صبح ہی یہاں پہنچ گئے تھے۔ ایک گھنٹا پہلے ایک ریسٹورنٹ میں کھانا کھاتے ہوئے پران میری نظروں میں آگیا۔ میں اسے نہیں پہچانتا تھا لیکن وہ مجھے دیکھ کر اس طرح بدحواس ہوگیا تھا جیسے اس نے بھوت دیکھ لیا ہو۔ مجھے اس پر شک ہوا اور میں اس کا پیچھا کرتا ہوا یہاں پہنچ گیا۔ مجھے افسوس ہے، دیش مکھ بچ کر نکل گیا لیکن میں اسے چھوڑوں گا نہیں۔ بتاؤ وہ کہاں گیا ہے؟" میں نے ایک بار پھر اس کی گردن پر دباؤ ڈال دیا۔

"بب۔۔۔ بتاتا ہوں۔" وہ ایک بار پھر چیخا۔ میں نے دباؤ کم کردیا۔ وہ رک رک کر بولا "یہاں اس کا دوسرا کوئی ٹھکانا نہیں ہے۔۔۔ وہ۔۔۔ وہ نینی تال کی طرف نکل گیا ہوگا۔ وہاں۔۔۔ وہاں بھی اس کا کانیج ہے۔ وہ وہیں گیا ہوگا۔"

"نینی تال میں کس جگہ۔۔۔ کانیج کہاں ہے۔۔۔" میں نے پوچھا۔

وہ رک رک کر کانیج کا پتا سمجھانے لگا۔ مجھے اطمینان ہوگیا کہ وہ جھوٹ نہیں بول رہا تو میں نے اس کی گردن پر دباؤ بڑھا دیا۔ وہ بری طرح مچلنے لگا لیکن میں نے اس وقت تک اسے نہیں چھوڑا جب تک اس کی گردن کی ہڈی نہیں توڑ دی۔ میں اسے چھوڑ کر بیڈ سے کود گیا۔ وہ کٹے ہوئے بکرے

کی طرح بیڈ پر تڑپتا رہا پھر نیچے گر گیا۔

میں چند لمحے اسے دیکھتا رہا پھر اسی کمرے میں آگیا جہاں سب سے پہلے ان لوگوں سے سامنا ہوا تھا۔ شراب کی دو بوتلیں اور گلاس قالین پر لڑھکے ہوئے تھے۔ میں آگے بڑھ گیا۔ وہ لڑکی دروازے کے پیچھے دیوار کے ساتھ بیٹھی تھر تھر کانپ رہی تھی۔ خوف کی شدت سے اس کا چہرہ بالکل سفید ہو رہا تھا۔ مجھے حیرت تھی کہ وہ موقع سے فائدہ اٹھا کر یہاں سے بھاگ کیوں نہیں گئی تھی۔

"اے۔ اٹھو۔ تم کون ہو اور ان سے تمہارا کیا تعلق ہے؟" میں نے اس لڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے تیز لہجے میں کہا۔

"مم۔ میرا ان سے۔ کوئی تعلق نہیں ہے۔" لڑکی ہکلائی "یہ لوگ مجھے شہر سے لے کر آئے تھے۔ ایک رات کے لیے۔"

"اوہ۔" میرے منہ سے گہرا سانس نکل گیا۔ وہ کال گرل تھی۔ المورا جیسے تفریحی مقامات پر ایسی عورتوں کی کمی نہیں ہوتی جو شکار کی تلاش میں رہتی ہیں "تمہارے کپڑے کہاں ہیں؟" میں نے یہ کہتے ہوئے اِدھر اُدھر دیکھا۔ اس کمرے میں مجھے ایسی کوئی چیز نظر نہیں آرہی تھی۔

"دوسرے کمرے میں ہیں۔" اس نے جواب دیا۔

"چلو۔ کپڑے پہنو جاکر۔" میں نے کہا۔

وہ بمشکل اٹھ کر کھڑی ہو سکی تھی۔ خوف سے اس کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔ وہ جیسے ہی آگے بڑھی لڑکھڑا گئی۔ میں نے جلدی سے آگے بڑھ کر اسے سہارا دیا۔ ورنہ وہ گر پڑتی۔ میں اسے کمرے سے باہر لاؤنج میں لے آیا۔ وہ دائیں طرف مڑی تو میں بھی اس کا بازو پکڑے اس کے ساتھ مڑ گیا۔

یہ وہ کمرا نہیں تھا جس میں' میں نے سمیت کی گردن مروڑی تھی۔ یہ بھی بیڈ روم ہی تھا۔ بستر پر اس لڑکی کے کپڑے بکھرے پڑے تھے۔ وہ بیڈ کے کنارے پر بیٹھ گئی اور کپڑے اٹھا کر پہننے لگی۔ اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔

میں کمرے میں کھڑا اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ ایک کھونٹی پر مردانہ کپڑے ٹنگے ہوئے تھے۔ یہ یقیناً دیش مکھ کا کمرا تھا اور وہ کپڑے بھی اسی کے تھے۔

میری ٹی شرٹ خون آلود تھی۔ میں نے اپنی شرٹ اتار کر ایک طرف پھینک دی اور کھونٹی سے دیش مکھ کی نیلے رنگ کی ایک ٹی شرٹ اتار کر پہن لی۔ وہ لڑکی بھی کپڑے پہن چکی تھی۔ وہ اس وقت تک اپنے آپ پر بڑی حد تک قابو پا چکی تھی۔

"کیا نام ہے تمہارا۔ کہاں رہتی ہو؟" میں نے پوچھا۔

"میرا نام سونالی ہے اور میں مس ورما کے گیسٹ ہاؤس میں ٹھہری ہوئی ہوں۔" اس نے جواب دیا۔

"گیسٹ ہاؤس میں۔" میں نے اس کی طرف دیکھا۔

"اس کا مطلب ہے کہ یہاں کی رہنے والی نہیں ہو؟"

"میں مراد آباد کی رہنے والی ہوں۔ گرمیوں کے سیزن میں کبھی نینی تال اور کبھی یہاں آجاتی ہوں۔" اس نے جواب دیا۔ اس کا بدن اب بھی ہولے ہولے کانپ رہا تھا اور آواز میں بھی کپکپاہٹ تھی۔

اس کے بارے میں میرا اندازہ درست نکلا تھا۔ وہ طوائف تھی جو شکار کی تلاش میں گھومتی رہتی تھی مگر اس مرتبہ خود شکار ہو گئی تھی۔ وہ یقیناً دیش مکھ کے بارے میں کچھ نہیں جانتی ہوگی اس لیے میں نے اس سے کچھ پوچھا بھی نہیں۔

میں اسے کمرے میں چھوڑ کر باہر آگیا۔ لاؤنج سے ملحق باورچی خانے میں پانی کا مٹکا رکھا ہوا تھا۔ میں نے ایک گلاس میں پانی انڈیلا اور دوبارہ اسی کمرے میں آگیا۔ وہ اب بھی بیڈ کی پٹی پر بیٹھی ہوئی تھی۔

"لو۔ پانی پیو اور یہاں سے چلنے کی تیاری کرو۔" میں نے پانی کا گلاس اس کی طرف بڑھا دیا "یہاں ایک لاش بھی پڑی ہے اور ہم زیادہ دیر یہاں نہیں رک سکتے۔"

وہ گلاس پکڑ چکی تھی۔ لاش کا سنتے ہی اس کا ہاتھ کانپنے لگا۔ پانی چھلک کر اس کے کپڑوں پر گرا۔ میں نے جلدی سے گلاس پکڑ کر اس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ چند گھونٹ پینے کے بعد اس نے گلاس منہ سے ہٹا دیا۔

خوف سے اس کے چہرے پر ایک بار پھر پیلاہٹ بڑھ گئی تھی۔ اسے اپنی حالت سنبھالنے میں مزید دس منٹ لگ گئے تھے۔ میں اسے بازو سے پکڑ کر باہر لے آیا۔ گیٹ کے قریب پہنچ کر میں نے اسے وہیں رکنے کا اشارہ کیا اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا اس کمرے میں آگیا جہاں سمیت کی لاش پڑی ہوئی تھی۔ اس کا چہرہ بہت بھیانک ہو گیا تھا۔ زبان باہر نکلی ہوئی تھی اور آنکھیں بھی اپنے حلقوں سے ابلی ہوئی تھیں۔

میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ میرا خنجر بیڈ پر ایک طرف پڑا ہوا تھا۔ میں نے خنجر اٹھا کر پنڈلی پر بندھے ہوئے فیتے میں اڑسا اور باہر آگیا۔

بنگلے کے تمام دروازے اور کاٹیج کا گیٹ بھی میں نے کھلا ہی چھوڑ دیا تھا۔ قرب و جوار میں اگرچہ بہت سے کاٹیج اور بنگلے تھے مگر کسی کو دیش مکھ والے کاٹیج میں اس ہنگامے کی خبر

...سی تھی۔ دولت مند لوگ ایسی جگہوں پر عیاشی کے ...تے تھے اور کوئی بھی اپنے رنگ میں بھنگ نہیں ڈالنا

...شہر کی طرف جانے والے راستے پر چلتے رہے۔ ...نے میرا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔ وہ ڈر رہی تھی۔ پُلیا پار کرنے ...ڑی ہی دیر بعد سامنے سے ایک کار آتی ہوئی دکھائی ...ہیڈ لیمپس کی تیز روشنی میں میری آنکھیں چندھیا ...میں سونالی کو لے کر سڑک کے کنارے پر ہو گیا۔

...کار سست روی سے ہمارے قریب سے گزر گئی۔ کار ...ے اندر کی بتی بھی جل رہی تھی۔ پچھلی سیٹ پر دو عورتیں ...ایک آدمی ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔

...ڑھائی چڑھتے ہوئے سونالی ہانپ رہی تھی۔ بالآخر ...ڑھنے کے بعد ہم پختہ سڑک پر اس جگہ پہنچ گئے جہاں سے ...ایک راستہ میرے گیسٹ ہاؤس کی طرف اور دوسرا شہر کی ...طرف جاتا تھا۔ میرے خیال میں اس وقت گیارہ بجے تھے اور ...کی طرف روشنیاں جگمگاتی ہوئی نظر آرہی تھیں۔

"میرا خیال ہے اب تم اپنے گیسٹ ہاؤس تک اکیلی ...سکتی ہو۔" میں نے سونالی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ...تمہارے لیے بہتر یہی ہے کہ اپنے کمرے میں جاکر آرام ...کرو۔ اس بنگلے میں جو کچھ بھی ہوا اسے بھول جاؤ۔ اگر کسی ...سے کچھ کہو گی تو خود ہی پھنس جاؤ گی۔ ہو سکتا ہے تمہیں قتل ...کے الزام میں دھر لیا جائے۔ بہتر ہے کہ صبح پہلی بس سے ...یہاں سے نکل جاؤ۔"

"مم۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔" اس نے میرا ہاتھ ...چھوڑنے کے بجائے گرفت مضبوط کر دی "مجھے۔ مجھے آگے ...اکیلا چھوڑ کر آؤ۔"

"چلو۔" میں نے کہا۔

...نے میرا ہاتھ سختی سے پکڑا رکھا تھا جیسے اندیشہ ہو کہ ...مجھے چھوڑ کر بھاگ جاؤں گا۔

...المورا میں کئی نائٹ کلب تھے۔ جن کے باہر رنگ برنگی ...روشنیاں جگمگا رہی تھیں۔ اس وقت اگرچہ گیارہ بج رہے ...تھے مگر ہوٹل اور ریسٹورنٹس ابھی کھلے ہوئے تھے۔ تقریباً ...منٹ بعد ہم ایک اور سڑک پر مڑ گئے اور بالآخر ایک ...گیسٹ ہاؤس کے سامنے رک گئے۔

"میں نے جو کچھ کہا ہے اسے ذہن میں رکھنا۔" میں نے ...اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "تمہارے لیے بہتر یہی ہوگا کہ ...تم بس پر یہاں سے نکل جاؤ۔"

"شکریہ میرے دوست۔ میں تمہارے مشورے پر ضرور عمل کروں گی۔" سونالی کے ہونٹوں پر پہلی بار مسکراہٹ آئی تھی "میں تو سمجھی تھی کہ تم مجھے پولیس کے حوالے کرو گے لیکن۔ تم واقعی اچھے انسان ہو۔ مجھ سے ہمدردی کر کے تم نے مجھ پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ تمہارا شکریہ ادا کرنے کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں لیکن کیا تم بتاؤ گے نہیں کہ قصہ کیا ہے۔ وہ عورت کون تھی جو اس بنگلے میں بے ہوش پڑی تھی اور دیش مکھ سے تمہاری کیا دشمنی ہے۔"

"یہ جاننا تمہارے لیے ضروری نہیں۔" میں نے آہستگی سے اس سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا "اب تم جاؤ اور اگر مصیبت سے بچنا چاہتی ہو تو میری باتوں کا خیال رکھنا۔"

میں واپس چل پڑا۔ تقریباً پچاس گز آگے جانے کے بعد میں نے مڑ کر دیکھا۔ سونالی اب بھی وہیں کھڑی تھی۔ میں تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا چلتا رہا۔

جب میں اپنے گیسٹ ہاؤس پہنچا تو بارہ بج چکے تھے۔ کمرے کا دروازہ بھڑا ہوا تھا۔ میں اندر داخل ہوا تو بلا سامنے ہی کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے کمبل اوڑھ رکھا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ اٹھ کر میری طرف لپکی۔ کمبل اس کے اوپر سے ہٹ گیا۔ اس کے ہاتھ میں پستول دیکھ کر میرے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی۔ میں نے دروازہ بند کر دیا۔ بلا نے پستول بیڈ پر پھینک دیا اور آگے بڑھ کر مجھے ٹٹولنے لگی۔

"میں بالکل ٹھیک ہوں۔" میں نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے "لیکن تم۔"

"میں کسی بھی صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے تیار بیٹھی تھی۔" اس نے کہا "میں نے طے کر لیا تھا کہ جیسے ہی کوئی اندر داخل ہوگا اسے گولی مار دوں گی۔ اسی لیے میں نے دروازہ بھی لاک نہیں کیا تھا تاکہ مجھے اپنی جگہ سے اٹھنا نہ پڑے لیکن تم۔ یہ شرٹ۔"

"میری شرٹ پر خون کے دھبے لگ گئے تھے۔ اس لیے میں نے تبدیل کر لی۔" میں نے جواب دیا۔

"اوہ۔" وہ بولی "شوبھا کا پتا چلا؟"

"ہاں۔" میں نے جواب دیا "دیش مکھ اسے انجکشنوں کے ذریعے مسلسل بے ہوش رکھے ہوئے ہے لیکن مجھے افسوس ہے کہ میں اسے چھڑا نہیں سکا۔ دیش مکھ اسے لے کر فرار ہو گیا ہے۔ تم بھی اپنی چیزیں سمیٹ لو۔ ہم نینی تال جا رہے ہیں۔"

"اس وقت۔ آدھی رات کو؟" بلا نے چونک کر میری طرف دیکھا۔

"ہاں۔ اسی وقت۔" میں نے کہا "دیش مکھ بھی نینی تال ہی گیا ہے۔ میں اسے سنبھلنے کا موقع نہیں دینا چاہتا۔"

بلا اپنی چیزیں سمیٹنے لگی اور میں اسے اس واقعے کی تفصیل بتاتا رہا۔ آدھے گھنٹے بعد ہم اس گیسٹ ہاؤس سے نکل رہے تھے۔ میں نے گیسٹ ہاؤس کے منیجر کو بتایا تھا کہ ہمیں ایک ہوٹل میں جگہ مل گئی ہے جہاں ہمارے کچھ اور جاننے والے بھی ٹھہرے ہوئے ہیں۔

المورا میں بھی لاتعداد مندر اور آشرم تھے۔ شہر سے باہر ایک مندر کے قریب پہنچتے ہی گاڑی کا انجن پھر گڑبڑ کرنے لگا۔ مندر سے کچھ دور گاڑی رک گئی۔ میں نے ڈیش بورڈ پر مختلف ڈائلز کو چیک کیا اور پھر نیچے اُتر کر بونٹ اٹھادیا۔

ریڈی ایٹر میں پانی نہیں تھا۔ بھاپ اٹھ رہی تھی۔ یہ بھی غنیمت تھا کہ ہم نے زیادہ فاصلہ طے نہیں کیا تھا۔ ورنہ انجن سیز بھی ہوسکتا تھا۔ میں نے بونٹ کھلا چھوڑ دیا اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ آس پاس اگر کوئی ندی تھی بھی تو اندھیرے میں دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ میں نے ڈکی میں سے خالی ڈبا نکال لیا اور بلا کو وہیں بیٹھے رہنے کا اشارہ کرتا ہوا مندر کی طرف چل پڑا۔

سڑک سے تقریباً پچاس گز ہٹ کر بہت بڑا مندر تھا۔ گیٹ اگرچہ بند تھا مگر سامنے بتیاں جل رہی تھیں۔ سڑک سے ایک پختہ راستہ مندر تک چلا گیا تھا۔ میں مندر کے سامنے رک کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا اور پھر ایک آواز سن کر اچھل پڑا۔ یہ آواز بائیں طرف سے آئی تھی۔ میں تیزی سے اس طرف مڑ گیا۔

"کیا دیکھ رہے ہو مورکھ۔ کس چیز کی تلاش ہے؟"

وہ دراز قامت ہٹا کٹا پجاری تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں ترشول بھی تھا۔ وہ پجاری نجانے کس طرف سے نکل کر وہاں آگیا تھا۔

"جل مہاراج" میں نے کہا "ہماری گاڑی کے ریڈی ایٹر میں پانی ختم ہوگیا ہے۔ میں پانی کی تلاش میں اس طرف آیا ہوں۔"

"ادھر ندی ہے۔ وہاں تمہیں جل مل جائے گا۔" اس نے ایک طرف اشارہ کیا "پر اس سے کہاں سے آئے ہو؟"

"ہم نینی تال جارہے ہیں مہاراج۔ ایک ایمرجنسی ہے۔ ہمارا صبح سے پہلے وہاں پہنچنا بہت ضروری ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"نینی تال جانے کا یہ راستہ بند ہوگیا ہے مورکھ۔" پجاری نے کہا "آج شام سے ذرا پہلے یہاں سے بیس میل آگے پہاڑی کا ایک تودہ سڑک پر گر جانے سے راستہ بند ہوگیا ہے۔ اسے صاف کرنے میں کم از کم دو دن لگیں گے۔"

"اوہ۔" میرے منہ سے بے اختیار نکلا "کوئی اور راستہ نہیں ہے مہاراج؟"

"ہے۔ دوسرا راستہ ہے۔" پجاری نے سرہلایا "یہاں سے دو کلو میٹر پیچھے چلے جاؤ۔ وہاں ایک راستہ پہاڑیوں میں جاتا ہوا ملے گا۔ وہ راستہ اگرچہ زیادہ اچھا نہیں ہے مگر تقریباً پانچ کلو میٹر آگے جاکر وہ کچا راستہ پکی سڑک سے مل جاتا ہے۔ وہ سڑک نینی تال کی طرف چلی جاتی ہے۔ اس طرح تمہارا سفر اگرچہ طویل ہوجائے گا مگر تمہیں کوئی کشٹ نہیں اٹھانا پڑے گا۔"

میں نے پجاری کا شکریہ ادا کیا۔ کچھ دور درختوں کے جھنڈ میں جاکر ندی سے ڈبے میں پانی بھرا اور کار کی طرف واپس آگیا۔ ریڈی ایٹر میں پانی ڈالنے کے بعد میں نے بلا کو صورتِ حال سے آگاہ کردیا۔

انجن ٹھنڈا ہونے تک ہمیں کم از کم آدھا گھنٹا وہیں کھڑے رہنا پڑا اور پھر میں نے بونٹ بند کردیا اور انجن اسٹارٹ کرکے گاڑی کو واپس گھمالیا۔

دو کلو میٹر پیچھے آکر وہ راستہ تلاش کرنے میں دشواری پیش نہیں آئی۔ کنجان درختوں میں گھرا ہوا وہ کچا راستہ جھاڑیوں سے پٹا پڑا تھا۔ جھاڑیاں دبی ہوئی تھیں جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ پہلے بھی یہاں سے کچھ گاڑیاں گزر چکی ہیں۔

کار کی رفتار بہت کم تھی اور مسلسل جھٹکے لگ رہے۔ پانچ کلو میٹر کا یہ فاصلہ کوئی آدھے گھنٹے میں طے ہوا اور بالآخر ہم پختہ سڑک پر پہنچ گئے۔ میں نے رفتار بڑھادی۔

بہت ہی کٹھن اور خوفناک سفر تھا۔ تقریباً دو گھنٹوں بعد ہم مکتسار پہنچ گئے۔ جو رات کے اس سمے تاریکی اور سناٹے میں ڈوبا ہوا تھا۔ ہم رکے بغیر اس قصبے سے نکل گئے۔ مزید دو گھنٹوں کے بعد ہم بھیوالی نامی قصبے میں پہنچ گئے۔ رات کا آخری پہر تھا اور یہاں بھی سناٹا تھا۔

بھیوالی سے ایک سڑک کاٹھ گودام اور دوسری نینی تال کی طرف چلی گئی تھی۔ میں نے کار کا رخ نینی تال کی طرف جانے والی سڑک پر موڑ دیا۔

یہ راستہ زیادہ دشوار اور خطرناک تھا۔ میں کئی گھنٹوں سے مسلسل ڈرائیونگ کررہا تھا۔ ڈرائیونگ اور رات بھر جاگنے کی وجہ سے میری حالت بڑی خستہ ہورہی تھی لیکن میں اپنے آپ کو سنبھالے ہوئے تھا۔

صبح سات بجے کے قریب ہم نینی تال کے نواح میں پہنچ گئے اور ایک آشرم سے ذرا آگے ایک ریسٹورنٹ کے سامنے کار روک لی۔ دیش مکھ پر حملہ آور ہونے سے پہلے میں کچھ توانائی مجتمع کرلینا چاہتا تھا۔

ریسٹورنٹ میں ہلکا سا ناشتا اور گرم گرم چائے سے کچھ حواس کسی قدر بحال ہوگئے۔ بلا بھی اس سفر میں تھک کر نڈھال ہوچکی تھی۔ اس کی آنکھیں سُرخ ہورہی تھیں۔

تقریباً آدھا گھنٹا مزید اسی ریسٹورنٹ میں رکنے کے بعد ہم کار میں آکر بیٹھ گئے۔ ایک پیٹرول پمپ سے میں نے ٹینکی فل کروالی۔ آگے نجانے کس قسم کی صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑے اور میں پیٹرول کے چکر میں وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔

اب میں پوری طرح سے تیار تھا اور دیش مکھ کو سنبھلنے کا موقع نہیں دینا چاہتا تھا۔ المورا میں سمپت نے مجھے جو پتا بتایا تھا وہ میرے ذہن میں محفوظ تھا۔ لوگوں سے پوچھتے ہوئے جب ہم اس جگہ پہنچے تو صبح کے نو بج رہے تھے۔

پہاڑی کے دامن میں یہ بھی ایک خوب صورت بنگلا تھا۔ اس کے آس پاس اور بھی بنگلے اور کاٹیج تھے۔ دیش مکھ کے بنگلے کا گیٹ بند تھا۔ میں نے کار گیٹ کے عین سامنے روک لی۔ میں نے ہر قسم کی احتیاط کو بالائے طاق رکھ دیا تھا کیونکہ اب براہِ راست حملہ آور ہونا چاہتا تھا۔

میں نے انجن بند کردیا۔ بلا کو کار ہی میں بیٹھے رہنے کا کہا اور خود نیچے اُتر کر گیٹ کے قریب پہنچ کر جھری سے اندر جھانکنے لگا۔

کمپاؤنڈ خاصا وسیع تھا لیکن اندر کوئی گاڑی وغیرہ نظر نہیں آرہی تھی۔ دیش مکھ ہم سے تقریباً دو گھنٹے پہلے المورا پہنچا تھا۔ اسے اب تک یہاں پہنچ جانا چاہیے تھا۔ شاید اس نے اپنی کار بنگلے کے پیچھے کمپاؤنڈ میں کھڑی کی ہو۔ المورا سے نکلنے کے بعد کوئی اور راستہ اختیار کیا ہو جو ابھی تک یہاں پہنچا ہی نہ ہو۔

میں ذرا پیچھے ہٹ کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ بجلی کے کھمبوں کے علاوہ ٹیلی فون لائن بھی نظر آرہی تھی۔ جس کا مطلب تھا کہ اس بنگلے میں ٹیلی فون بھی موجود تھا۔ میں نے جھری سے گیٹ کے ستون پر کال بیل کا بٹن دبا دیا اور انگلی اس وقت تک نہیں ہٹائی جب تک برآمدے والا دروازہ نہیں کھل گیا۔

گیٹ کی جھری میں سے جھانک رہا تھا۔ برآمدے والے دروازے سے برآمد ہونے والا آدمی ادھیڑ عمر تھا اور حلیے سے کٹر ہندو لگتا تھا۔ دھوتی اور کھدر کا کرتا۔ گنجا سر، ماتھے پر قشقہ اور کھوپڑی پر پچھلی طرف چٹیا کی طرح مٹھی بھر بال۔

"کون ہے بھایا۔ آتا ہوں۔ صبر تو کرو۔" وہ اونچی آواز میں بولتا ہوا برآمدے سے نکل کر تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا گیٹ کی طرف آگیا۔ اس نے جیسے ہی ذیلی دروازہ کھولا میں نے اس کے جبڑے پر زوردار گھونسا جڑ دیا۔

وہ چیخ کر لڑکھڑاتا ہوا پیچھے ہٹا۔ میں نے بڑی پھرتی سے اندر داخل ہوکر دھڑ سے دروازہ بند کردیا اور اس سے بھی زیادہ پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے جھک کر اپنا خنجر نکال لیا۔

"کک۔۔۔ کون ہو تم مہاشے۔۔۔ کک۔۔۔ کیا بات ہے۔" وہ ہکلا گیا۔ اس کے چہرے پر خوف کے سائے پھیل گئے تھے۔

"اندر کون ہے۔ دیش مکھ کہاں ہے؟" میں نے غراتے ہوئے خنجر کی نوک اس کے سینے پر رکھ دی۔

"کک۔۔۔ کوئی نہیں مہاراج۔ اندر کوئی نہیں ہے۔" وہ گھگیایا۔

قارئین کی ذوقی نذر
ایک شاہکار معاشرتی ناول
بہتی ہوئی پہ پکاں
اس نے بہتے پانی پہ پکاں بنانا چاہا...!!!
لیکن مقدر کی بات کہ وہ ہار کے بھی جیت گئی۔
فاہد صفدر اختر کے قلم کا ایک طلسماتی شاہکار
کتابیات پبلی کیشنز

"اندر چلو۔" میں نے اسے دھکا دیا۔

بنگلے میں واقعی کوئی نہیں تھا اور نہ ہی ایسے کوئی آثار نظر آئے تھے جس سے پتا چلتا کہ یہاں کوئی آیا ہوگا۔

"دیش مکھ کا یہاں اور کوئی ٹھکانا ہے؟" میں نے اس شخص کے سینے پر خنجر کی نوک رکھتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں مہاراج۔ وہ جب بھی آتے ہیں یہیں آتے ہیں لیکن آپ کون ہیں اور کیوں پوچھ رہے ہیں؟" وہ شخص خوف زدہ لہجے میں بولا۔

میں جواب دینے کے بجائے چند لمحے اسے گھورتا رہا اور پھر اسے گھونسوں اور لاتوں پر رکھ لیا۔ مجھے شبہ تھا کہ وہ کوئی بات چھپانے کی کوشش کررہا ہے۔

میں ابھی اس کی دھنائی کررہا تھا کہ بلا دوڑتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ وہ بدحواس ہورہی تھی۔

"وجدان بھاگو۔ وہ لوگ نکل گئے۔" وہ مجھے دیکھتے ہی چیخی۔

"کیا ہوا۔ وہ لوگ کہاں نکل گئے؟ یہ بنگلا تو خالی پڑا ہے۔" میں نے کہا۔

"وہ سامنے والی سڑک سے آئے تھے۔" بلا اپنے سانس پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے بولی "بنگلے کے سامنے ہماری کار دیکھ کر انہوں نے اپنی گاڑی دور ہی روک لی۔ میں اپنی کار سے اتر کر باہر کھڑی تھی۔ دیش مکھ کے ساتھ وہ آدمی بھی تھا جسے تم نے المورا کے ریسٹورنٹ میں دیکھا اس نے میری طرف اشارہ کرکے چیخ کر کچھ کہا اور دیش مکھ نے گاڑی تیزی سے واپس گھمالی۔ جلدی چلو۔ وہ کہیں دور نکل جائیں گے۔"

میں نے اس شخص کو ایک زوردار دھکے سے پیچھے گرا دیا اور بلا کے ساتھ باہر کی طرف دوڑا۔

ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھتے ہوئے میں نے ہاتھ میں پکڑا ہوا خنجر ڈیش بورڈ کے اوپر ڈال دیا اور انجن اسٹارٹ کرنے لگا۔ اسی دوران بلا بھی اپنی سیٹ پر بیٹھ چکی تھی۔ میں نے ایک زوردار جھٹکے سے گاڑی آگے بڑھادی اور اگلے موڑ پر اسے بلا کی بتائی ہوئی سمت میں موڑ دیا۔

المورا والے بنگلے میں، میں نے سرخ رنگ کی کار دیکھی تھی اور دیش مکھ اسی کار پر وہاں سے فرار ہوا تھا۔ وہ ہم سے دو گھنٹے پہلے المورا سے نکلا تھا اور تقریباً تین گھنٹے بعد یہاں پہنچا تھا اور بنگلے کے سامنے ہماری کار دیکھ کر فرار ہوگیا تھا۔

میں جگہ جگہ گاڑی روک کر دیش مکھ کی سرخ کار کے بارے میں پوچھتا رہا اور بالآخر ہم شہر سے نکل کر کاٹھ گودام کی طرف جانے والی شاہراہ پر نکل آئے۔ کاٹھ گودام نیپال کی سرحد کی طرف ایک بڑا قصبہ تھا۔ وہاں سے ایک سڑک نیپال کی سرحد کی طرف اور ایک سڑک رامپور اور بریلی وغیرہ کی طرف چلی گئی تھی۔

اس پختہ شاہراہ پر آتے ہی میں کار کی رفتار بڑھاتا چلا گیا۔ اچھا ہی ہوا تھا کہ نینی تال پہنچتے ہی میں نے کار کی ٹینکی فل کروالی تھی اور اب مجھے پٹرول کی بھی فکر نہیں تھی۔

اس شاہراہ پر تقریباً بیس میل کا فاصلہ طے ہوچکا تھا اور پھر مجھے دیش مکھ کی کار نظر آگئی۔ وہ سرخ کار ایک موڑ کاٹ کر پہاڑی کے دوسری طرف چلی گئی تھی۔ راستہ اگرچہ انتہائی خطرناک تھا۔ جگہ جگہ اندھے موڑ تھے مگر میں ایکسلی ریٹر پیر کا دباؤ بڑھاتا چلا گیا۔

سرخ کار ایک بار پھر نظر آگئی۔ فاصلہ بتدریج کم ہورہا تھا اور پھر یہ فاصلہ پچاس گز کے قریب رہ گیا اور اس وقت میں نے پران کو کار کی کھڑکی سے باہر جھکتے ہوئے دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں پستول تھا اور دوسرے ہی لمحے اس کا پستول شعلے اگلنے لگا۔

پہلی گولی میرے اور بلا کے درمیان ونڈ اسکرین میں سوراخ کرتی ہوئی نکل گئی۔ بلا چیختی ہوئی نیچے جھک گئی۔ دوسری گولی نے بھی بلا کے سامنے ونڈ اسکرین میں سوراخ کیا تھا۔ اگر بلا سیٹ پر نہ جھکتی تو یہ گولی ونڈ شیلڈ میں سوراخ کرنے کے بعد بلا کی پیشانی میں بھی سوراخ کردیتی۔

سڑک کے ایک طرف عمودی چٹانیں تھیں اور دوسری طرف ڈھلان تھی۔ یہ ڈھلان اگرچہ زیادہ خطرناک نہیں تھی لیکن نیچے بہت دور پھیلی ہوئی وادی تک چلی گئی تھی۔

ایک اور گولی کار کے فینڈر پر لگی۔ میں نے پروا کیے بغیر ایکسلی ریٹر پر پیر کا دباؤ کچھ اور بڑھا دیا۔ اچانک زوردار دھماکا ہوا اور کار لہرا گئی۔ اس مرتبہ گولی اگلے ٹائر پر لگی تھی اور ٹائر دھماکے سے پھٹ گیا تھا۔ کار بری طرح لہرائی تھی میں نے اسے سنبھالنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہیں ہوسکا اور وہ سڑک سے ہٹ کر ڈھلان پر اترنے لگی۔

ڈھلان پینتالیس یا پچاس کے زاویے پر نشیب میں میلوں دور تک چلی گئی تھی۔ ڈھلان پر آتے ہی کار کی رفتار بھی ایک دم تیز ہوگئی تھی۔ ایک دم بریک لگانے سے کار الٹ جانے کا اندیشہ تھا۔ بلا بری طرح چیخ رہی تھی اور میں آہستہ آہستہ بریک لگاتے ہوئے کار کو سنبھالنے کی کوشش کررہا تھا اور بالآخر تقریباً دو سو گز نیچے آکر میں کار کو جھاڑیوں میں روکنے میں کامیاب ہوگیا۔

"نیچے اترو۔ جلدی کرو۔" میں چیخا۔

بلا نے دروازہ کھول کر چھلانگ لگا دی۔ میں نے ہینڈ بریک بھی لگا دیے اور کار کا دروازہ کھول کر آہستگی سے نیچے اتر آیا۔ میرا خیال تھا کہ کار پھر ڈھلان پر لڑھکنے لگے گی مگر اس کے پہیے جھاڑیوں میں پھنس گئے تھے۔

میں ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ وہ سرخ کار بہت دور چٹانوں کے ساتھ ساتھ سڑک پر جاتی ہوئی نظر آرہی تھی اور پھر وہ ایک موڑ گھوم کر نگاہوں سے اوجھل ہوگئی۔ میں گہرا سانس لے کر بلا کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کا چہرہ خوف سے پیلا ہورہا تھا۔ وہ دوڑ کر مجھ سے لپٹ گئی۔ میں اس کا کندھا تھپتھپانے لگا اور پھر اسے الگ ہٹا کر صورتِ حال کا جائزہ لینے لگا۔

صورتِ حال نہایت تشویش ناک تھی۔ یہ ہماری خوش قسمتی تھی کہ ڈھلان زیادہ خطرناک نہیں تھی۔ اگر ڈھلان عمودی ہوتی تو کار کے پرخچے اڑ جاتے اور ہمارا بھی خاتمہ ہوچکا ہوتا۔

کار میں اسٹپنی نہیں تھی۔ ہوتی بھی تو اس کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ کار کو اس چڑھائی پر ڈرائیو کرتے ہوئے تقریباً دو سو گز اوپر لے جانا ممکن نہیں تھا۔ کار کا اور ہمارا ساتھ یہیں تک کا تھا۔ میں نے تھیلا اور کمبل نکال لیے اور پھر ہم دونوں چڑھائی چڑھنے لگے۔

مجھے دیش مکھ کے نکل جانے کا بہت افسوس تھا۔ شوبھا بھی اس کے ساتھ تھی۔ المورا والے بنگلے تک تو میں نے خود کو سمجھا تھا کہ اسے بے ہوش رکھا گیا تھا۔ وہ اب بھی بے ہوش رہی ہوگی لیکن کس حال میں؟ کاش! میں دیش مکھ کو روکنے میں کامیاب ہوجاتا۔

پتھریلی چڑھائی پر چڑھنا خاصا دشوار کام تھا۔ بلا ہانپ رہی تھی۔ اس کا پیر بار بار رپٹ جاتا۔ میں نے تھیلا بھی کندھے سے لٹکایا ہوا تھا اور دونوں کمبل بھی اٹھا رکھے تھے۔ بلا ہاتھ سے بلا کا ہاتھ بھی تھام رکھا تھا۔

ہم تقریباً ایک گھنٹے میں سڑک پر پہنچ سکے تھے۔ بلا ایک پتھر سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ وہ بری طرح ہانپ رہی تھی۔ میں بھی اس کے قریب ہی بیٹھ گیا۔ نیچے جھانک کر دیکھا تو جھاڑیوں میں پھنسی ہوئی وہ کار ایک چھوٹے سے کھلونے کی طرح دکھائی دے رہی تھی۔

"کیا ہم سارا دن یہیں بیٹھے رہیں گے۔ اس ویرانے میں؟" بلا نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا۔

"یہ پختہ اور بڑی سڑک ہے۔ یہاں بسوں کی آمدورفت بھی ضرور ہوگی۔" میں نے سڑک پر دونوں طرف دیکھتے ہوئے کہا "ہمیں انتظار تو کرنا ہی پڑے گا۔ کوئی نہ کوئی بس یا کوئی اور گاڑی یہاں سے ضرور گزرے گی۔"

اور پھر ہمیں زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ بیس پچیس منٹ بعد فضا میں موٹر کے انجن کی گرر گرر کی آواز سنائی دینے لگی اور تھوڑی دیر بعد ہی نیچی تال کی طرف سے آنے والی ایک بس پہاڑی کا موڑ گھوم کر سامنے آگئی۔ میں سڑک کے وسط میں کھڑا ہوگیا اور دونوں ہاتھ اٹھا دیے۔ بس مجھ سے چند فٹ کے فاصلے پر رک گئی۔

یہ بس کاٹھ گودام جارہی تھی اور اس میں کئی سیٹیں خالی تھیں۔ ہم بس میں سوار ہوگئے۔ ڈرائیور اور بس کے کئی مسافروں نے نشیب میں ہماری کار کو دیکھ لیا تھا۔ کنڈکٹر نے اس حوالے سے پوچھا بھی تھا۔

"ٹائر برسٹ ہوگیا تھا۔" میں نے جواب دیا "کار سنبھلی نہیں اور ڈھلان پر اترتی چلی گئی۔ بڑی مشکل سے دور جاکر اسے روکنے میں کامیاب ہوسکا۔ کار سے تو اب ہاتھ دھونے ہی پڑے ہیں۔ شکر ہے ہماری جانیں بچ گئیں۔"

میں نے کاٹھ گودام کے ٹکٹ لے لیے۔ ہمارے ساتھ والی سیٹ پر ایک لمبا تڑنگا آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی عمر چالیس اور پینتالیس کے درمیان رہی ہوگی۔ سانولی رنگت اور صحت مند جسم کا مالک تھا۔ وہ خاصا اسمارٹ اور خوب رو

ایک مقبول ترین جاسوسی سلسلہ
شاطر
قیمتی حصہ 50 روپے
2 حصے
ڈاک خرچ 23 روپے
کتاب گھر میں ہمارے ہوکر جائے
شاطر کو مشہور انعام یافتہ مصنف شکیل انجم نے اپنے خاص انداز میں تحریر کیا ہے۔
ایک ایسی دلچسپ، ہنگامہ آرا اور سنسنی خیز داستان جس میں قدم قدم سسپنس اور سطر سطر قیامت آرائی ہے۔
کتاب کی قیمت بذریعہ پیشگی ڈرافٹ منی آرڈر یا کرنسی نوٹ رجسٹرڈ خط میں ارسال فرمائیں
کتابیات پبلی کیشنز

آدمی تھا۔ اس نے گرے کلر کا سفاری سوٹ پہن رکھا تھا۔ مجھے اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ اس کا تعلق پولیس یا کسی خفیہ ایجنسی سے ہے۔ وہ مشتبہ نظروں سے کبھی میری طرف دیکھتا اور کبھی بملا کی طرف اور پھر اس نے مجھ سے باتیں شروع کردیں۔ وہ جس طرح مجھ سے سوالات کررہا تھا اس سے میرے اس شک کو تقویت مل رہی تھی کہ اس کا تعلق پولیس ہی سے ہے۔

میں نے اسے بتایا کہ بملا میری پتنی ہے۔ اپنا نام میں نے ہمت سنگھ ہی بتایا تھا۔ میں اسے بتا رہا تھا کہ ہماری شادی چند مہینے پہلے ہوئی تھی اور ہم تین ہفتے پہلے سیرو تفریح کے لیے نکلے تھے کہ آج یہ حادثہ پیش آگیا۔

لیکن میرا خیال ہے کہ میری باتوں سے وہ مطمئن نہیں ہوا تھا۔ وہ کرید کرید کر پوچھتا رہا اور میں مناسب جواب دیتا رہا۔

بس پہاڑوں میں آباد مختلف چھوٹی چھوٹی بستیوں میں رکتی ہوئی کاٹھ گودام پہنچ گئی۔

میں بس سے اتر کر بملا کے ساتھ ایک طرف چل پڑا۔ میں جگہ جگہ لوگوں سے سرخ کار کے بارے میں بھی پوچھتا رہا اور بالآخر ایک پیٹرول پمپ سے مجھے یہ پتا چل گیا کہ سرخ رنگ کی وہ کار، جس میں پچھلی سیٹ پر ایک بیمار عورت بھی پڑی تھی، نیپال کی سرحد پر واقع تنک پور نامی گاؤں کی طرف گئی ہے۔ میں نے دیش مکھ اور شوبھا کے حلیے بتائے تو پیٹرول پمپ کے سروس بوائے نے اس کی تصدیق کردی۔ اس کار میں اس نے پیٹرول بھرا تھا۔

تنک پور یہاں سے چونسٹھ کلو میٹر کے فاصلے پر تھا لیکن نیپال کی سرحد سے چند کلو میٹر کے فاصلے پر تنک پور ایک چھوٹی بستی تھی۔ کاٹھ گودام سے تنک پور کے لیے صرف دو بسیں چلتی تھیں۔ ایک صبح آٹھ بجے اور دوسری دوپہر دو بجے۔ دوسری بس آدھا گھنٹا پہلے نکل چکی تھی۔ اس وقت ڈھائی بج رہے تھے۔ ہمیں اس سڑک پر لفٹ ملنے کی توقع بھی نہیں تھی۔

ہم نے ایک چھوٹے سے ریسٹورنٹ میں کھانا کھایا اور ایک رہائشی ہوٹل میں آگئے۔ نہایت گھٹیا ہوٹل تھا۔ کمرے مرغی کے دڑبوں کی طرح چھوٹے تھے۔ سنگل بیڈ کے کمرے کا کرایہ بھی ڈبل بیڈ کے برابر وصول کیا گیا۔ بہرحال، ہماری مجبوری تھی۔ ہمیں آج کا دن اور رات گزارنی تھی۔ یہاں بھی میں نے بملا کو اپنی پتنی ہی بتلایا تھا۔

بملا کمرے میں داخل ہوتے ہی بستر پر گر گئی۔ میں نے دروازہ بند کردیا۔ کمرے میں ایک چھوٹی تپائی اور دو کرسیاں بھی تھیں۔ میں نے تھیلا اور کمبل ایک کرسی پر رکھ دیے اور خود دوسری کرسی پر بیٹھ گیا۔

تھوڑی دیر بعد ہی بملا سو چکی تھی۔ میں بھی کرسی پر بیٹھے بیٹھے اونگھنے لگا۔ ایک جھٹکے سے میری آنکھ کھلی تو ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ کرسیوں اور بیڈ کے درمیان فرش پر اتنی جگہ نہیں تھی کہ میں کمبل بچھا کر سوجاتا۔ یوں بھی فرش اتنا گندہ تھا کہ کمبل بچھانے کو بھی دل نہیں چاہتا تھا۔ نیند بڑی شدت سے آرہی تھی۔ میرے لیے کرسی پر بیٹھنا مشکل ہورہا تھا اور پھر میں کرسی سے اٹھ کر بملا کے ساتھ بیڈ پر لیٹ گیا۔ میں نے دوسری طرف کروٹ لے لی اور آنکھیں بند کرتے ہی نیند کی آغوش میں پہنچ گیا۔ اس کے بعد مجھے کچھ بھی ہوش نہیں رہا۔

○☆○

دروازہ دھڑدھڑائے جانے کی آواز سے میری آنکھ کھل گئی۔ کمرے میں گھپ اندھیرا تھا۔ میں نے اٹھ کر ٹٹولتے ہوئے پہلے بجلی کا سوئچ آن کیا اور پھر دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ اسی دوران دروازہ ایک بار پھر دھڑدھڑایا گیا تھا۔ میں نے اوپر کی کنڈی گرا کر دروازہ کھولا تو سامنے ہوٹل کے بیرے کو دیکھ کر میرا دماغ بھنّا گیا۔

"کیا بات ہے؟" میں نے غصے پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "کیوں اتنی زور سے دروازہ پیٹ رہے ہو۔"

"سرکار۔ دو گھنٹوں میں چھ بار دروجا بجایا ہوں۔" بیرے نے ہاتھ جوڑتے ہوئے جواب دیا "سیٹھ بولا ایک بار اور کو سس کرو پھر پولیس کو بلالو۔ سرکار۔ ادھر لوگ آتا ہے۔ نسہ کرکے سوتا ہے تو پھر اس کا لاس اٹھانا پڑتا ہے۔"

"اوہ!" میرے منہ سے بے اختیار نکلا "ٹائم کیا ہوا ہے؟"

"آٹھ بجا ہے نا سرکار۔" بیرے نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے۔ ہم زندہ ہیں۔ سیٹھ کو بولو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں اور باتھ روم کہاں ہے؟" میں نے کہا۔

"وہ ادھر۔ آخر میں۔" بیرے نے راہداری میں ایک طرف اشارہ کردیا پھر بولا "چائے وائے پینے کا ہے یا نہیں۔"

"میں بتا دوں گا۔" میں نے یہ کہتے ہوئے دروازہ بند کردیا اور کرسی پر بیٹھ گیا۔ میرا دماغ گھوم رہا تھا۔ سناٹا ہورہی تھی جیسے آندھیاں چل رہی ہوں۔ ہم تین بجے اس کمرے میں آئے تھے اور ایسے غافل ہو کر سوئے تھے کہ کسی

مشورہ دوں گا کہ تم واپس چلی جاؤ۔ اس سے پہلے کہ واپسی کے تمام راستے بند ہوجائیں تم۔"

"مجھے اس کی پروا نہیں کہ تمہارے ساتھ اٹھنے والے پگ مجھے کہاں لے جائیں گے۔" بملا نے میری بات کاٹ دی "آئندہ مجھے واپس جانے کے لیے مت کہنا۔ میں نے تمہیں اپنا جیون ساتھی مان لیا ہے۔ میں تمہیں نہیں چھوڑ سکتی۔"

"تم تو سیریس ہوگئیں۔" میں نے اسے گھورا۔

"تم بھی تو ہر جگہ مجھے اپنی پتنی بتا رہے ہو۔" وہ مسکرا دی۔

"اس لیے کہ لوگ ہم پر کسی قسم کا شبہ نہ کرسکیں۔" میں نے جواب دیا۔

"مجھے یہ سمبندھ (تعلق) اچھا لگتا ہے۔ اگر یہ سدا رہے تو۔"

"اگر تمہارے قبیل کے لوگوں کو پتا چل گیا کہ ایک مسلمان ایک ہندو لڑکی کو بغل میں لیے گھوم رہا ہے تو جانتی ہو کیا ہوگا۔" میں نے کہا۔

"مجھے اس کی پروا نہیں۔" اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

میں اس بات کو طول نہیں دینا چاہتا تھا۔ اسی لیے موضوع بدل دیا۔ ایک دکان سے میں نے کچھ پھل خریدے اور ہم ہوٹل واپس آگئے۔

ہوٹل میں داخل ہوتے ہی میں اس لمبے تڑنگے شخص کو استقبالیہ کاؤنٹر کے سامنے کھڑے دیکھ کر چونک گیا۔ جو بس میں بھی مجھ سے الٹے سیدھے سوالات کرتا رہا تھا۔ اس نے اس وقت بڑی معنی خیز نظروں سے ہماری طرف دیکھا تھا۔ میرے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی۔ میرا یہ شبہ اب یقین میں بدلتا جارہا تھا کہ اس کا تعلق خفیہ پولیس سے ہے۔ اچانک ہی میرے ذہن میں ایک اور خیال ابھرا۔ رشی کیش جانے سے پہلے ہردوار میں میرے ہاتھوں کئی لوگ مارے گئے تھے۔ چترا پریتم کے جلے ہوئے کاٹیج سے دو جلی ہوئی لاشیں ملی تھیں جن کے بارے میں یہ تصور کرلیا گیا تھا کہ وہ میری اور چترا کی لاشیں ہیں اور پھر اس کے چند روز بعد پولیس کو شہر سے چند میل دور پہاڑوں میں واقع مندر سے پنڈت پرگھیا راج، ایک اور پجاری اور چترا پریتم کی لاشیں بھی مل گئی تھیں اور پولیس کو ہمارے آگ میں جل کر مرجانے کے حوالے سے ہمارے بارے میں اپنا نظریہ بدلنا پڑا تھا اور پھر تین چار روز پہلے بھی ہردوار میں رادھن بدمعاش اور اس کے تین ساتھی میرے ہاتھوں مارے گئے تھے اور اس وقت میرے ذہن میں یہ خیال آیا تھا کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ خفیہ پولیس کا یہ لمبا تڑنگا آدمی میری ہی تلاش میں نکلا ہو اور اتفاق سے میں اس کی نظروں میں آگیا۔ شاید وہ مجھ پر ہاتھ ڈالنے سے پہلے میرے بارے میں تصدیق کرلینا چاہتا تھا اور اس وقت ہوٹل کے منیجر یا مالک سے میرے بارے میں پوچھ رہا ہو۔

میں نے کمرے میں داخل ہوتے ہی دروازہ اندر سے بند کرلیا۔ بملا کے چہرے پر بھی میں نے تشویش کے آثار دیکھے تھے۔

"تم نے اس آدمی کو دیکھا تھا۔" بملا نے سرگوشیانہ لہجے میں کہا "وہی جو ہمیں بس میں ملا تھا اور اوٹ پٹانگ باتیں کرتا رہا تھا۔ وہ اس ہوٹل میں بھی تھا۔ جہاں ہم نے کھانا کھایا تھا اور اب یہاں بھی موجود ہے۔ مجھے تو لگتا ہے وہ پولیس کا آدمی ہے۔"

"مجھے بھی اس پر یہی شبہ ہے۔" میں نے جواب دیا "یہاں سے بھاگنے کی کوئی کوشش بے کار ہوگی۔ ہمیں بہرحال محتاط رہنا پڑے گا۔"

میرا خیال تھا کہ وہ شخص ہمارے کمرے تک آنے کی کوشش کرے گا۔ الٹے سیدھے سوالات کرکے ہمارے بارے میں جاننے کی کوشش کرے گا لیکن ایسا نہیں ہوا۔

میں نے خنجر نکال کر ایک سیب کاٹا اور دو ٹکڑے بملا کی طرف بڑھا دیے۔ بملا بیڈ پر بیٹھ گئی تھی اور میں کرسی پر۔ پھل کھاتے اور مدھم لہجے میں باتیں کرتے رہے۔

اس رات بملا کبھی دیر تک جاگتی رہی۔ جیسے اسے یہ اندیشہ ہو کہ رات کو کسی وقت ہمیں گھیرنے کی کوشش کی جائے گی لیکن ایسا نہیں ہوا اور وقت دھیرے دھیرے گزرتا رہا۔

رات کے دو بج گئے تھے۔ بملا بیڈ پر اونگھ رہی تھی اور میں اب بھی کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ گہرا سناٹا تھا۔ کسی طرف سے کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔

❖ اس دلچسپ ترین داستان کے بقیہ واقعات چھٹے حصے میں ملاحظہ فرمائیں ❖
جو کہ ساتھ ہی شائع کیا جارہا ہے

آدمی تھا۔ اس نے گرے کلر کا سفاری سوٹ پہن رکھا تھا۔ مجھے اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ اس کا تعلق پولیس یا کسی خفیہ ایجنسی سے ہے۔ وہ مشتبہ نظروں سے کبھی میری طرف دیکھتا اور کبھی بلا کی طرف اور پھر اس نے مجھ سے باتیں شروع کردیں۔ وہ جس طرح مجھ سے سوالات کررہا تھا اس سے میرے اس شک کو تقویت مل رہی تھی کہ اس کا تعلق پولیس ہی سے ہے۔

میں نے اسے بتایا کہ بلا میری پتنی ہے۔ اپنا نام میں نے ہمت سنگھ ہی بتایا تھا۔ میں اسے بتا رہا تھا کہ ہماری شادی چند مہینے پہلے ہوئی تھی اور ہم تین ہفتے پہلے سیرو تفریح کے لیے نکلے تھے کہ آج یہ حادثہ پیش آگیا۔

لیکن میرا خیال ہے کہ میری باتوں سے وہ مطمئن نہیں ہوا تھا۔ وہ کرید کرید کر پوچھتا رہا اور میں مناسب جواب دیتا رہا۔

بس پہاڑوں میں آباد مختلف چھوٹی چھوٹی بستیوں میں رکتی ہوئی کاٹھ گودام پہنچ گئی۔

میں بس سے اتر کر بلا کے ساتھ ایک طرف چل پڑا۔ میں جگہ جگہ لوگوں سے سرخ کار کے بارے میں بھی پوچھتا رہا اور بالآخر ایک پیٹرول پمپ سے مجھے یہ پتا چل گیا کہ سرخ رنگ کی وہ کار، جس میں پچھلی سیٹ پر ایک بیمار عورت بھی پڑی تھی، نیپال کی سرحد پر واقع تنک پور نامی گاؤں کی طرف گئی ہے۔ میں نے دیش مکھ اور شوبھا کے حلیے بتائے تو پیٹرول پمپ کے سروس بوائے نے اس کی تصدیق کردی۔ اس کار میں اس نے پیٹرول بھرا تھا۔

تنک پور یہاں سے چونسٹھ کلو میٹر کے فاصلے پر تھا لیکن نیپال کی سرحد سے چند کلو میٹر کے فاصلے پر تنک پور ایک چھوٹی بستی تھی۔ کاٹھ گودام سے تنک پور کے لیے صرف دو بسیں چلتی تھیں۔ ایک صبح آٹھ بجے اور دوسری دوپہر دو بجے۔ دوسری بس آدھا گھنٹا پہلے نکل چکی تھی۔ اس وقت ڈھائی بج رہے تھے۔ ہمیں اس سڑک پر لفٹ ملنے کی توقع بھی نہیں تھی۔

ہم نے ایک چھوٹے سے ریسٹورنٹ میں کھانا کھایا اور ایک رہائشی ہوٹل میں آگئے۔ نہایت گھٹیا ہوٹل تھا۔ کمرے مرغی کے دڑبوں کی طرح چھوٹے تھے۔ سنگل بیڈ کے کمرے کا کرایہ بھی ڈبل بیڈ کے برابر وصول کیا گیا۔ بہرحال، ہماری مجبوری تھی۔ ہمیں آج کا دن اور رات گزارنی تھی۔ یہاں بھی میں نے بلا کو اپنی پتنی ہی بتلایا تھا۔

بلا کمرے میں داخل ہوتے ہی بستر پر گر گئی۔ میں نے دروازہ بند کردیا۔ کمرے میں ایک چھوٹی تپائی اور دو کرسیاں بھی تھیں۔ میں نے تھیلا اور کمبل ایک کرسی پر رکھ دیے اور خود دوسری کرسی پر بیٹھ گیا۔

تھوڑی دیر بعد ہی بلا سو چکی تھی۔ میں بھی کرسی پر بیٹھے بیٹھے اونگھنے لگا۔ ایک جھٹکے سے میری آنکھ کھلی تو ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔ کرسیوں اور بیڈ کے درمیان فرش پر اتنی جگہ نہیں تھی کہ میں کمبل بچھا کر سو جاتا۔ یوں بھی فرش اتنا گندہ تھا کہ کمبل بچھانے کو بھی دل نہیں چاہتا تھا۔ نیند بڑی شدت سے آرہی تھی۔ میرے لیے کرسی پر بیٹھنا مشکل ہو رہا تھا اور پھر میں کرسی سے اٹھ کر بلا کے ساتھ بیڈ پر لیٹ گیا۔ میں نے دوسری طرف کروٹ لے لی اور آنکھیں بند کرتے ہی نیند کی آغوش میں پہنچ گیا۔ اس کے بعد مجھے کچھ بھی ہوش نہیں رہا۔

○☆○

دروازہ دھڑدھڑائے جانے کی آواز سے میری آنکھ کھل گئی۔ کمرے میں گھپ اندھیرا تھا۔ میں نے اٹھ کر ٹٹولتے ہوئے پہلے بجلی کا سوئچ آن کیا اور پھر دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ اسی دوران دروازہ ایک بار پھر دھڑدھڑایا گیا تھا۔ میں نے اوپر کی کنڈی گرا کر دروازہ کھولا تو سامنے ہوٹل کے بیرے کو دیکھ کر میرا دماغ بھنّا گیا۔

"کیا بات ہے؟" میں نے غصے پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "کیوں اتنی زور سے دروازہ پیٹ رہے ہو۔"

"سرکار۔ دو گھنٹوں میں چھ بار دروجا بجایا ہوں۔" ویٹر نے ہاتھ جوڑتے ہوئے جواب دیا "سیٹھ بولا ایک بار اور کو سس کرو پھر پولیس کو بلالو۔ سرکار۔ ادھر لوگ آتا ہے۔ نسہ کرکے سوتا ہے تو پھر اس کا لاس اٹھانا پڑتا ہے۔"

"اوہ!" میرے منہ سے بے اختیار نکلا "ٹائم کیا ہوا ہے؟"

"آٹھ بجا ہے نا سرکار۔" بیرے نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے۔ ہم زندہ ہیں۔ سیٹھ کو بولو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں اور باتھ روم کہاں ہے؟" میں نے کہا۔

"وہ ادھر۔ آخر میں۔" ویٹر نے راہداری میں ایک طرف اشارہ کردیا پھر بولا "چائے وائے پینے کا ہے یا نہیں۔"

"میں بتا دوں گا۔" میں نے یہ کہتے ہوئے دروازہ بند کردیا اور کرسی پر بیٹھ گیا۔ میرا دماغ گھوم رہا تھا۔ سناٹا ہو رہی تھی جیسے آندھیاں چل رہی ہوں۔ ہم تین بچے اس کمرے میں آئے تھے اور ایسے غافل ہو کر سوئے تھے کہ کسی

مشورہ دوں گا کہ تم واپس چلی جاؤ۔ اس سے پہلے کہ واپسی کے تمام راستے بند ہو جائیں تم۔"

"مجھے اس کی پروا نہیں کہ تمہارے ساتھ اٹھنے والے پگ مجھے کہاں لے جائیں گے۔" بلا نے میری بات کاٹ دی "آئندہ مجھے واپس جانے کے لیے مت کہنا۔ میں نے تمہیں اپنا جیون ساتھی مان لیا ہے۔ میں تمہیں نہیں چھوڑ سکتی۔"

"تم تو سیریس ہو گئیں۔" میں نے اسے گھورا۔

"تم بھی تو ہر جگہ مجھے اپنی پتنی بتا رہے ہو۔" وہ مسکرا دی۔

"اس لیے کہ لوگ ہم پر کسی قسم کا شبہ نہ کرسکیں۔" میں نے جواب دیا۔

"مجھے یہ سمبندھ (تعلق) اچھا لگتا ہے۔ اگر یہ سدا رہے تو۔"

"اگر تمہارے قبیل کے لوگوں کو پتا چل گیا کہ ایک مسلمان ایک ہندو لڑکی کو بغل میں لیے گھوم رہا ہے تو جانتی ہو کیا ہوگا۔" میں نے کہا۔

"مجھے اس کی پروا نہیں۔" اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

میں اس بات کو طول نہیں دینا چاہتا تھا۔ اسی لیے موضوع بدل دیا۔ ایک دکان سے میں نے کچھ پھل خریدے اور ہم ہوٹل واپس آگئے۔

ہوٹل میں داخل ہوتے ہی میں اس لمبے تڑنگے شخص کو استقبالیہ کاؤنٹر کے سامنے کھڑے دیکھ کر چونک گیا۔ جو بس میں بھی مجھ سے الٹے سیدھے سوالات کرتا رہا تھا۔ اس نے اس وقت بڑی معنی خیز نظروں سے ہماری طرف دیکھا تھا۔ میرے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی۔ میرا یہ شبہ اب یقین میں بدلتا جا رہا تھا کہ اس کا تعلق خفیہ پولیس سے ہے۔ اچانک ہی میرے ذہن میں ایک اور خیال ابھرا۔ رشی کیش جانے سے پہلے ہردوار میں میرے ہاتھوں کئی لوگ مارے گئے تھے۔ پرتاپ پریتم کے جلے ہوئے کائیچ سے دو جلی ہوئی لاشیں ملی تھیں جن کے بارے میں یہ تصور کرلیا گیا تھا کہ وہ میری اور چترا کی لاشیں ہیں اور پھر اس کے چند روز بعد پولیس کو شہر سے چند میل دور پہاڑوں میں واقع مندر سے پنڈت یرگھیا راج، ایک اور پجاری اور چترا پریتم کی لاشیں بھی مل گئی تھیں اور پولیس کو ہمارے آگ میں جل کر مرجانے کے حوالے سے ہمارے بارے میں اپنا نظریہ بدلنا پڑا تھا اور پھر تین چار روز پہلے بھی ہردوار میں رادھن بدمعاش اور اس کے تین ساتھی میرے ہاتھوں مارے گئے تھے اور اس وقت میرے ذہن میں یہ خیال آیا تھا کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ خفیہ پولیس کا یہ لمبا تڑنگا آدمی میری ہی تلاش میں نکلا ہو اور اتفاق سے میں اس کی نظروں میں آگیا۔ شاید وہ مجھ پر ہاتھ ڈالنے سے پہلے میرے بارے میں تصدیق کرلینا چاہتا تھا اور اس وقت ہوٹل کے منیجر یا مالک سے میرے بارے میں پوچھ رہا ہو۔

میں نے کمرے میں داخل ہوتے ہی دروازہ اندر سے بند کرلیا۔ بلا کے چہرے پر بھی میں نے تشویش کے آثار دیکھے تھے۔

"تم نے اس آدمی کو دیکھا تھا۔" بلا نے سرگوشیانہ لہجے میں کہا "وہی جو ہمیں بس میں ملا تھا اور اوٹ پٹانگ باتیں کرتا رہا تھا۔ وہ اس ہوٹل میں بھی تھا۔ جہاں ہم نے کھانا کھایا تھا اور اب یہاں بھی موجود ہے۔ مجھے تو لگتا ہے وہ پولیس کا آدمی ہے۔"

"مجھے بھی اس پر یہی شبہ ہے۔" میں نے جواب دیا "یہاں سے بھاگنے کی کوئی کوشش بے کار ہوگی۔ ہمیں بہرحال محتاط رہنا پڑے گا۔"

میرا خیال تھا کہ وہ شخص ہمارے کمرے تک آنے کی کوشش کرے گا۔ الٹے سیدھے سوالات کرکے ہمارے بارے میں جاننے کی کوشش کرے گا لیکن ایسا نہیں ہوا۔

میں نے خنجر نکال کر ایک سیب کاٹا اور دو ٹکڑے بلا کی طرف بڑھا دیے۔ بلا بیڈ پر بیٹھ گئی تھی اور میں کرسی پر۔ پھل کھاتے اور مدھم لہجے میں باتیں کرتے رہے۔

اس رات بلا بھی دیر تک جاگتی رہی۔ جیسے اسے یہ اندیشہ ہو کہ رات کو کسی وقت ہمیں گھیرنے کی کوشش جائے گی لیکن ایسا نہیں ہوا اور وقت دھیرے دھیرے گزرتا رہا۔

رات کے دو بج گئے تھے۔ بلا بیڈ پر اونگھ رہی تھی اور میں اب بھی کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ گہرا سناٹا تھا۔ کسی طرف سے کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔

❖ اس دلچسپ تین داستان کے بقیہ واقعات چھٹے حصے میں ملاحظہ فرمائیں ❖
جو کہ ساتھ ہی شائع کیا جا رہا ہے